فہرستِ مضامین

یادگار مولانا شرر مرحوم

دو سالانہ انعام

زبان اُردو کے محسن مولانا محمد عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم کی یادگار میں جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے، سکرٹری انجمن ترقی اُردو، اور جناب مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ نے حسب ذیل دو سالانہ انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے —

(۱) "عطیۂ عبدالحق"

رسالۂ اُردو کے سال بھر کے مضامین نثر میں اول درجے کے سب سے اچھے مضمون پر ۱۰۰ روپیہ ملدار کا انعام جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے عطا فرمائیں گے —

(۲) "عطیۂ ہاشمی"

دوسرا انعام ۱۰۰ روپیہ ملدار کا مولوی سید ہاشمی صاحب اُن صاحب کی نذر کریں گے جن کی نظم رسالۂ اُردو کے سال بھر کی نظموں میں سب سے اچھی اور اعلیٰ درجہ کی ہوگی —

ہر سال کے اخیر مہینے میں جو حضرات اہل سمجھے جائیں گے اُن کی خدمت میں رقم ارسال کر دی جائے گی اور رسالے میں اس کا اعلان ہوتا رہے گا۔ انعام کی اہلیت کا فیصلہ صرف معطیان کی متفقہ رائے پر منحصر ہوگا —

المعلن
مدیر رسالۂ اُردو اورنگ آباد دکن

سائنس

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جاے ' دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جد ید انکشافات وقتاً فوقتاً ہونگے ' ان کو کسی قدر تفصل سے بیان کیا جائے - ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کر نے کی کوشش کی جائے گی - اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے سائنس دانوں کے علاوہ یورپ کے فضلا نے بھی اس رسالے میں مضمون لکھنا منظور فرمایا ہے - اس رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوا کریں گے —

سالانہ چندہ آٹھ روپے سکۂ انگریزی (نو روپیہ چار آ نے سکۂ عثمانیہ) —

امید ہے کہ اردو زبان کے بھی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے —

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

خواجه حافظ شیرازی

از

(جناب بشیر احمد ڈار صاحب، بی اے کلاس، اسلامیہ کالج لاهور)

خواجه حافظ کے حالات باوجود ان کی بے انتہا شہرت کے پردۂ تاریکی میں چھپے ہوے ہیں - ہمیں ان کی زندگی کے کئی ایک پہلوؤں سے بالکل ناواقفیت ہے، چنانچه میں مندرجۂ ذیل صفحات میں ان میں سے چند ایک پہلوؤں پر اپنی وسعت کے مطابق روشنی ڈالتا ہوں —

خواجه حافظ کے متعلق آج تک جتنی کتابیں نکل چکی ہیں، ان میں سے سب سے زیادہ اچھی حافظ اسلم کی کتاب " حیات حافظ " ہے - اس کتاب میں مصنف نے نہایت محنت سے تمام مواد کو یکجا جمع کر دیا ہے، لیکن باوجود اس محنت و کاوش کے اس میں چند ایک غلطیاں موجود ہیں —

پھر اس کے بعد مولانا شبلی مرحوم نے خواجه حافظ کے حالات شعرالعجم جلد دوم میں لکھے ہیں - اگرچه " شعرالعجم " " حیات حافظ " سے پہلے کی تصنیف ہے لیکن چونکه مؤخرالذکر میں شعرالعجم سے زیادہ وضاحت سے حالات لکھے گئے ہیں، اس لئے میں نے اسے مقدم سمجھا —

انگریزی میں مسٹر براؤن نے اپنی تاریخ ادب ایران کی تیسری جلد میں " حافظ " کی زندگی کے حالات درج کئے ہیں لیکن ہماری موجودہ معلومات میں کچھ زیادہ اضافه نہیں ہوتا - بلکه وہ تمام کا تمام شعرالعجم سے ماخوذ ہے، جیسا که خود مصنف نے تصریحاً بیان کر دیا ہے —

ان کتابوں کے علاوہ چند اور کتابیں یا رسالے موجود ہیں جو زیادہ قابل ذکر نہیں —

(۱) خواجہ حافظ کی تاریخ پیدایش و عمر

خواجہ حافظ کی ولادت کے متعلق ہمارے پاس کوئی مسلم رائے موجود نہیں' اگر چہ یہ اب مانا جاچکا ہے کہ ان کی وفات سنہ ۷۹۱ ھ میں ہوئی * —

---

* ان کی وفات کے متعلق دو قول مشہور ہیں - (۱) ایک گروہ سنہ ۷۹۱ ھ کہتا ہے اس میں دیباچۂ محمد گلندام سب سے زیادہ قابل ذکر ہے (۲) دوسرا گروہ سنہ ۷۹۲ ھ قرار دیتا ہے - اس میں حبیب السیر' نفحات الانس وغیرہ شامل ہیں - اگرچہ ایک سال کے فرق سے کچھ زیادہ نقصان نہیں' لیکن کوشش کرنی چاہئے کہ کونسی تاریخ زیادہ اصح ہے - بعض لوگوں کے خیال کے مطابق ہمیں دیباچۂ محمد گلندام میں دونوں تاریخیں ملتی ہیں —

(۱) چراغ اهل معنی خواجہ حافظ — کہ شمعے بود از نور تجلی
چودر خاک مصلی یافت منزل — بجو تاریخش از خاک مصلی

حساب ابجد کے لحاظ سے مصلی کی یا تو ے گنی جائیگی یا الف اگر الف گنا جاے توسنہ ۷۸۲ ھ ہوتے ہیں جو ٹھیک نہیں کیونکہ 'حافظ' منصور کی تخت نشینی کے وقت جو سنہ ۷۸۹ ھ میں ہوی ہے' موجود تھا - اگر (ے) گنی جاے تو سنہ ۷۹۱ ھ ملتے ہیں —

(۲) بہ سال باو صاد و ذال ابجد — ز دور هجرت میمون احمد
بہ سوے جنت اعلیٰ رواں شد — فرید عہد شمس الدین محمد

اس حساب سے اس کی تاریخ وفات سنہ ۷۹۲ ھ نکلتی ہے —

لیکن کیا یہ امر قابل غور نہیں کہ ایک ہی شخص جس نے خود اپنی آنکھوں سے خواجہ حافظ کا جنازہ نکلتے دیکھا ہو وہ ہمیں دو مختلف تاریخیں بتاے - اس لئے ہمیں یقین ہے کہ دوسرا قطعۂ تاریخ غلط ہے اور بعد میں دیباچے میں داخل ہوگیا ہے - اس بیان کے لئے ہمارے پاس تین شہادتیں موجود ہیں —

(۱) ایک تو خود صاحب دیباچہ کی' جس نے ان دونوں قطعات تاریخ سے پہلے صاف طورپر عبارت میں لکھا ہے کہ "......تادر تاریخ احدی و تسعین و سبعمائۃ' هجری دو یعت حیات بہ موکلان قضا و قدر سپرد" اب اس سے خود اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ قطعۂ

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

(۱) میرزا فرصت شیرازی اپنی کتاب تاریخ ایران مسمی آثار عجم میں رقمطراز ھیں کہ حافظ نے چھیالیس برس کی عمر پائی۔اس حساب سے ان کی تاریخ پیدائش سنہ ۷۴۵ ھ ھوتی ھے —

لیکن یہ تاریخ کسی طرح بھی قابل تسلیم نہیں - ھمیں دیوان میں ایک قطعہ ملتا ھے :—

سرور اھل غنائم ' شمع جمع انجمن ' صاحب صاحبقران حاجی قوام الدین حسن

ھفصد وپنجاہ وچار ازھجرت خیرالبشر مہر را جوزا مکان و ماہ راخوشہ وطن *

یہ قطعہ جیسا کہ اس سے ظاھر ھے ' سنہ ۷۵۴ ھ کی تصنیف ھے ' جب کہ حاجی قوام الدین حسن ' وزیر ابواسحق ' عین لڑائی کے موقع پر فوت ھوا تھا —

پس مرزا صاحب کے خیال کے مطابق خواجہ حافظ نے یہ قطعہ نو برس کی عمر میں تصنیف کیا ' جو بالکل خلاف قیاس ھے - اس کے علاوہ دیوان میں کئی ایک غزلیں سنہ ۷۵۴ ھ سے پہلے کی موجود ھیں - جن کا ذکر بعد میں آئیگا —

(۲) حافظ محمداسلم ' خواجہ صاحب کی تاریخ پیدائش سنہ ۷۱۵ ھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵۴)

تاریخ زیادہ اھمیت رکھتا ھے یا اسی مصنف کی یہ عبارت (ب) -ھمیں اسی تاریخ کی گواھی دو اور کتابوں سے بھی ملتی ھے - دونوں کتابیں ' روایت کے لحاظ سے صحیح کا درجہ رکھتی ھیں- ان میں سے پہلی کتاب میخانہ ھے ' جس میں صاف طور پر تاریخ وفات " خاک مصلیٰ " درج ھے ' دوسری کتاب ھفت اقلیم امین رازی ھے ' جس کا ایک صاف اور صحیح نسخہ پروفیسر ھمرانی صاحب کے کتب خانے میں موجود ھے۔ اس میں بھی حافظ کی تاریخ وفات سنہ ۷۹۱ ھ موجود ھے —

* دیکھو دیوان حافظ مطبوعہ نامی پریس کانپور سنہ ۱۹۲۰ ھ - صفحہ ۴۴۸ —

تحریر فرماتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں :—

" ان کی زندگی کے حالات پر نظر ڈالتے ہوے یہ تخمینہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی ولادت سنہ ۷۱۵ ھ میں ہوئی ہوگی ۔ کیونکہ جس وقت وہ تعلیم سے فارغ ہوے اور شیراز میں ان کی علمی لیاقت کا شہرہ ہوا تو حاجی قوام‌الدین حسن وزیر نے ایک مدرسہ خاص انھیں کے لئے قائم کیا تا کہ اس میں وہ طلبا کو فقہ و تفسیر پڑھائیں ۔ یہ مدرسہ سنہ ۷۴۵ ھ میں قائم ہوا تھا ۔ اس لئے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ایسی لیاقت اور شہرت کے لئے جو ایک مدرسہ بنا نے کی سفارش کرے کم سے کم تیس برس کی عمر چاہئے " —

حیات حافظ با رسوم مطبوعۂ فیض عام علیگڈھ ۔ صفحہ ۷ و ۸ —

اس بیان میں تاریخ ولادت کی غلطی کے علاوہ ایک اور غلطی بھی موجود ہے ۔ یہ واقعی مشہور ہے کہ حاجی قوام نے خواجہ صاحب کے لئے ایک مدرسہ شیراز میں بنایا تھا ۔ لیکن یہ غلط محض ہے ۔ روضۃ الصفا اور حبیب السیر میں سنہ ۷۴۵ ھ کے واقعات کے تحت میں کوئی بات ایسی نہیں ملتی ۔ دونوں مصنف خواجہ صاحب سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں ۔ کیونکہ روضۃ الصفا میں کئی جگہ حافظ کے شعر ان کے نام سے درج ہیں ' اور حبیب السیر میں با قاعدہ حافظ کا حال لکھا ہے —

اس مدرسے کا حال البتہ دیباچۂ محمد گلندام میں ضرور ملتا ہے ۔ صاحب دیباچہ لکھتا ہے: —

"ولے محافظت درس قرآن و ملازمت شغل سلطان و تحشیۂ کشاف و مصباح و مطالعۂ مطالع و مفتاح و تحصیل قوانین ادب و تجسس دواوین عرب از جمع

ابیات و غزلیاتش مانع آمدے .... مسود این اوراق عفی الله عنه ما سبق اقل انام محمد گلندام در درس گاہ مولانا و سید نا استاد البشر قوام الملة و الدین عبدالله اعلی‌الله تعالی در جاته فی اعلی علیین بکرات و مرات که بمذاکرہ رفتے‘در اثنائے محاورہ (به حافظ) گفتے که این فوائد فرائد را همه در یک عقد می باید کشید ...... “

اس بیان سے معلوم ہو تا ہے که خواجه حافظ کا تعلق واقعی ایک مدرسه سے تھا - لیکن وہ مدرسه حاجی قوام کا بنایا ہوا نه تھا - حاجی قوام الدین حسن اور مولانا قوام الدین عبدالله دو مختلف اشخاص ہیں - پہلا شخص شاہ ابواسحق (سنه ۷۴۲ ھ ـ سنه ۷۵۴ ھ) کا وزیر تھا‘ جو سنه ۷۵۴ ھ میں فوت ہو جاتا ہے - یه خواجه صاحب کے پہلے مربی تھے - اور خواجه صاحب نے ان کی وفات پر ایک قطعه تصنیف کیا تھا جس کا ذکر اوپر ہوچکا ہے —

مولانا قوام‌الدین عبدالله شاہ شجاع (سنه ۷۶۰ھ - سنه ۷۸۶ ھ) پسر مبارزالدین مظفر کے عہد میں تھے‘ جن کو شاہ شجاع نے شیراز میں اس متذکرۂ بالا مدرسے کی باگ عنایت فرمائی تھی - اور محمد گلندام اسی مدرسے میں حافظ کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں —

روضة‌الصفا میں سنه ۷۷۰ ھ کے واقعات کے تحت میں لکھا ہے :—

” ... و(شجاع) پیش ‘ استاد البشر مولانا قوام‌الدین عبدالله ‘ فقیه شرح مختصر ابن حاجب افتتاح کرد “ —

اس بیان سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے که مولانا قوام‌الدین عبدالله جن کا ذکر صاحب دیباچه کر رہا ہے ‘ وہی شخص ہے جس کا ذکر صاحب روضة‌الصفا نے سنه۷۷۰ھ کے واقعات میں کیا ہے - کیونکه دونوں ‘ استاد البشر ‘ کا لقب استعمال کرتے ہیں *—

اب ہمیں اصل واقعے کی طرف رجوع کرنا چاہئیے —

---

* نیز دیکھو حبیب السیر صفحۂ ۳۷ بعد از وفات شاہ شجاع —

جیسا کہ مولانا ' اسلم ' کے بیان سے معلوم ہوتا ہے ' ان کی تاریخ ولادت محض ایک قیاس پر مبنی ہے - اور تاریخ میں قیاس کا کچھہ کام نہیں —

اب ہمیں تاریخ اور دیوان دونوں سے مدد لینی چاہئے —

جیسا کہ تواریخ (مثلاً روضۃ الصفا - فارس نامۂ ناصری - شیراز نامہ • وغیرہ) سے معلوم ہوتا ہے ' شیراز میں سنہ ۷۴۲ ھ (یا بقول بعضے سنہ ۷۴۳ ھ) سے پہلے وہ ہنگام اور شور و شر تھا کہ خدا کی امان- خاندان ' اِنجو ' کے شہزادے آپس میں لڑ رہے تھے - حتیٰ کہ سنہ ۷۴۳ ھ میں میر حسین ' جوبانی ' اور ملک اشرف (بن تیمور تاش بن امیر چوبان) کا فتنہ بر پا ہوتا ہے اور آخر کار شیخ ابواسحق پسر محمود اِنجو شیرازپر مکمل طور سے حکمراں ہو جاتا ہے - اور پھر سنہ ۷۵۴ ھ تک شیراز میں پورا امن رہتا ہے - یہ تمام فسادات سلطان ' ابوسعید ' کی وفات کے بعد جو سنہ ۷۳۶ ھ میں ہوتی ہے ' واقع ہوتے ہیں —

اب اگر ہم جیسا کہ ' حافظ اسلم ' کا خیال ہے ' حافظ کی پیدائش سنہ ۷۱۵ ھ تسلیم کرلیں تو ہمیں ایک دقت پیش آتی ہے - سنہ ۷۳۵ ھ میں اس لحاظ سے حافظ کی عمر بیس برس کی ہوگی - اور تمام دنیا کے جوان آدمی بیس برس کی عمر میں بخوبی سمجھہ دار ہوتے ہیں اور خاص کر حافظ جیسا شخص جو قدرت سے شاعر بنا یا گیا تھا - اس لئے ضروری ہے کہ ' حافظ ' ان واقعات کی طرف اشارہ کرتے - پھر سنہ ۷۳۵ ھ سے لے کر ۷۴۲ ھ تک سات سال کا وقفہ ہوتا ہے - اس عرصے میں بھی شیراز میں بے انتہا شور و شر موجود تھا - لیکن دیوان حافظ میں ہمیں ان واقعات کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا ہے ' اس لئے صاف ظاہر ہے کہ ' حافظ ' کی پیدائش سنہ ۷۱۵ ھ کے بہت عرصے بعد ہوئی ہوگی —

اب ہم دیوان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں - دیوان میں دو غزلیں ہیں —

• بہ حوالۂ انسا ئکلو پیڈیا اسلام —

(۱) دیدم بخواب خوش که بدستم پیاله بود — تعبیر رفت و کار بدولت حواله بود
چل سال رنج و غصه کشیدیم و عاقبت — تدبیر ما بدست شراب دو ساله بود
آن شاه تند حمله که خورشید شیر گیر — پیشش بروز معرکه کمتر غزاله بود
دیدم که شعر دلکش 'حافظ' به مدح شاه — هر بیت زاں سفینه به از صد رساله بود

(دیوان حافظ صفحه ۱۵۳)

(۲) چل سال رفت و بیش که من لاف می زنم — کز چاکران پیر مغاں کمترین منم
در شان من به درد کشی ظن بد مبر — کالوده گشت خرقه ولے پاک دامنم
آب و هوائے پارس عجب سفله پرورست — کو همرهے؟ که خیمه ازیں خاک بر کنم
توران شه خجسته که در من مزید فضل — شد منت مواهب او طوق گردنم

(دیوان حافظ صفحه ۲۸۳)

ان دونوں غزلوں کی تصنیف میں چند سال کا فرق ہے' کیونکہ ایک میں وہ اپنی عمر چالیس سال بتارہے ہیں اور دوسری میں چالیس سے کچھ زیادہ —

جلال الدین توران شاہ' شاہ شجاع (۷۶۰ - ۷۸۶ھ) کے وزیر تھے —

خواجہ قوام الدین المتوفی سنہ ۷۶۴ھ شاہ شجاع کے پہلے وزیر کی وفات کے بعد خواجہ کمال الدین وزیر ہوتے ہیں اور خواجہ کمال الدین کے بعد جلال الدین کی وزارت شروع ہوتی ہے' ان کا زمانۂ وزارت * سنہ ۷۷۰ھ سے لے کر ۷۸۶ھ تک ہے اور سنہ ۷۸۷ھ میں فوت ہوتے ہیں' جیسا کہ خود خواجہ حافظ کہتے ہیں:-

آصف عہد زماں' جاں جہاں توران شاہ
آنکہ میلش سوے حق بینی و حق گوئی بود — سال تاریخ وفاتش طلب از "میل بہشت" ۷۶۸ھ

(دیکھو دیوان حافظ صفحہ ۴۴۸)

---

* دیکھو فارس نامۂ ناصری —

اس لحاظ سے صاف ظاہر ہے کہ دوسری غزل جس میں توران شاہ کا ذکر ملتا ہے سنہ ۷۷۰ھ کے بعد کی تصنیف ہے —

لیکن اگر مولانا اسلم کے بیان کو ٹھیک سمجھا جائے تو اس غزل کی تاریخ ۷۱۵ + ۴۵ (یا ۴۴ چونکہ "چل سال بیش" سے یہی مراد ہوسکتی ہے) یعنی سنہ ۷۶۰ھ نکلتی ہے' جو بلحاظ تاریخ بالکل غلط ہے —

لیکن ہم پورے طور سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ غزل سنہ ۷۷۰ھ اورسنہ ۷۸۷ھ کے درمیانی عرصے میں کسی خاص سن میں لکھی گئی ہے - اگر فرض کرلیا جائے کہ یہ غزل کم از کم ۷۷۰ھی کی ہے تو پینتالیس منہا کرنے سے ۷۲۵ھ کا سن نکلتا ہے - بس اس سے صاف ظاہر ہے کہ حافظ کسی طرح بھی سنہ ۷۲۵ھ سے پہلے پیدا نہیں ہوے —

دوسری طرف جیسا کہ پہلے دکھایا جاچکا ہے سنہ ۷۷۴۵ ان کی تاریخ پیدائش قائم کرنا غلط ہے - اسی طرح اگر ۷۴۰ھ مانا جائے تو وہ قطعہ جو حافظ نے حاجی قوام کی وفات پر لکھا ہے چودہ برس کی عمر کا ہوگا' اس کو بھی ہم مان نہیں سکتے ' کیونکہ ہمیں دیوان میں دو تین غزلیں ایسی ملتی ہیں جو انھوں نے حاجی قوام کی زندگی ہی میں لکھیں اور پھر ان غزلوں کی زبان صاف بتائے دیتی ہے کہ یہ کسی مبتدی کی نہیں - میں ان دونوں غزلوں کو ذیل میں درج کرتا ہوں :-

(۱) ساقی بہ نور بادہ بر افروز جام ما — مطرب بگو کہ کار جہاں شد بہ کام ما
ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم — اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما
ترسم کہ صرفۂ نبرد روز باز خواست — نان حلال شیخ ز آب حرام ما
اے باد اگر بہ گلشن احباب بگذری — زنہار عرضہ دہ بر جاناں پیام ما
دریاے اخضر فلک و کشتی ہلال — ہستند غرق نعمت "حاجی قوام" ما

(دیکھو دیوان حافظ صفحہ ۳۸ - ۳۹)

(۲) عشق بازي و جوانی و شراب لعل فام — مجلس انس وحریف ہمدم و شرب مدام

ساقی شکر دهان و مطرب شیرین سخن | هم نشینی نیک کردار و ندیم نیکنام
شاهدے در لطف پاکی همچو آب زندگی | دلبرے در حسن و خوبی غیرت ماه تمام
بادهاگلرنگ وتلخ وتر وخوشخوار وسبک | نقلی از لعل نگار و نقلے از یاقوت جام
بزمگاه دل نشین چون قصر فردوس برین | گلشنے پیرامنش چون روضهٔ دارالسلام
غمزهٔ ساقی به یغماے خرد آهخته تیغ | زلف دلبر از براے صید دل گسترده دام
هر کهاین صحبت بجوید خوشدلی بروے حلال | وانکهاین عشرت نخواهد زندگی بروے حرام
نکته دانے بذله گو چون 'حافظ' شیرین سخن | بخشش آموزے جهان افروز چون 'حاجی قوام'

(دیکھو دیوان صفحہ ۳۰۱، ۳۰۲)

یہ غزلیں دیکھتے ہوے کوئی شخص یہ قیاس نہیں کرسکتا کہ یہ دس یا بارہ برس کی عمر کی تصنیف ہوں گی - کیونکہ ان کی تصنیف کا زمانہ سنہ ۷۵۰ھ کے لگ بھگ ہونا چاہیے- لیکن اگر ہم دس برس اور پیچھے ہوجائیں اور خیال کریں کہ ان کی تاریخ ولادت سنہ ۷۳۰ ھ کو ہوئی تو اس لحاظ سے ان دونوں غزلوں کی تصنیف کا زمانہ وہ وقت ہوگا جب کہ حافظ کی عمر بیس برس کے لگ بھگ ہوگی - کیونکہ ہم ان غزلوں کو حافظ کی ابتدائی مشقوں سے بھی نہیں کہہ سکتے- اور جب ہم ان کا مقابلہ ان کی پہلی ابتدائی غزل سے' جو اتفاق سے ہمیں ان کے دیوان میں ملتی ہے * کرتے ہیں تو فوراً معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزلیں اچھی عمر میں یعنی بیس یا پچیس سال کی عمر میں لکھی گئی ہوں گی—

چنانچہ اب ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حافظ کی تاریخ ولادت سنہ ۷۲۵ ھ اور سنہ ۷۳۰ ھ کے درمیان کسی سال میں ہوی ہوگی —

اس نتیجے کی شہادت کے لئے ہمارے پاس سب سے زیادہ زور آور تائید میخانہ کی ہے اس میں حافظ کی عمر پینسٹھ برس کی لکھی ہے' یعنی اس لحاظ

---

* دیکھو صفحہ ۳۵ دیوان حافظ

سے حافظ کی تاریخ ولادت سنہ ۷۲۶ ھ نکلتی ھے - جو میرے خیال میں بالکل ٹھیک ھے —

(۲) خواجہ حافظ اور شاخ نبات

تعجب یہ ھے کہ ایشیا کے لوگ خواجہ صاحب کو مقدس بزرگ سمجھتے ھیں اور پھر ان کے نام وہ وہ قصے مشہور کئے ھیں کہ توبہ - ان سے معلوم ھوتا ھے کہ خواجہ صاحب شاید رند دامن آلودہ تھے —

منجملہ ان قصص کے ایک قصہ شاخ نبات کا ھے - یہ قصہ اتنا مشہور ھوا ھے کہ عام لغت کی کتابوں میں شاخ نبات کو شیرازی معشوقہ قرار دیا گیا ھے ایک دفعہ رسالۂ مخزن میں کسی شخص نے شاخ نبات کے متعلق مضمون لکھا تھا جسے میں مختصر کر کے ذیل میں لکھتا ھوں :—

خواجہ صاحب کی اصل ' سرکان ' سے ھے جو ' نہاوند ' کے قریب ایک مشہور قصبہ ھے• - ان کے جد امجد سرکان سے آکر شیراز میں بسے - ان کا پوتا شمس الدین محمد جنوری سنہ ۱۳۰۰ عیسوی میں پیدا ھوا - ان کے باپ دادا شیراز کے قاضی تھے - اس لئے بچپن ھی میں عربی علوم و فنون اور قرآن مجید کے حفظ کرنے میں جان لڑادی اور ابھی اچھی طرح جوان بھی نہ ھوے تھے کہ سب علمی مدارج طے کرلیے - ان کے والد بہت خوش ھوے اور انھیں اجازت دی کہ چند دن کے لئے سیر و تفریح کرلیں - اسی اثنا میں ان کی نظر ایک رنگنی شاخ نبات پر جا پڑی

• قوے اور سرکان اُس وقت ایک مختصر آبادی کا نام تھا جو شہر نہاوند سے شمال کی جانب واقع تھی' نہاوند حدود ھمدان میں اس وقت تک موجود ھے —

جس کو دیکھتے ھی ان کا دل قابو سے جا تا رھا ' پہلے تو کچھہ دن تک خاموش رھے لیکن تا کے ؟ آخر ایک دن رندوں کی طرح اوپر چڑہ گئے اور اپنا عشق جتا نے لگے —

ش -ن - میاں ھم تو بازار کی مٹھائی ھیں جو پیسہ ڈالے کا مزہ پاے گا—

حافظ - پھر آپ کی قیمت کیا ھے ؟ —

ش - ن دیکھئے - میرے دروازے کے سامنے جو بڑی ساری چار فرلانگ کے پھیر میں ڈگی ھے - اس کو اشرفیوں سے بھردیجے' بس پھر میں آپ کی لونڈی ھوں —

حافظ بہت بہترکہہکر نیچے اُترآے-اور اب انکو اشرفیوں کے جمع کرنے کی فکر لگی- شیراز کی گلیوں میں بھیک مانگنے لگے - جو کچھہ حاصل ھوتا تھا اس میں آ کر ڈال دیتے تھے - لوگ کف افسوس ملتے کہ ایسے شریف خاندان کا لڑکا ایک رنڈی کے ناپاک حسن پر فریفتہ ھوگیا ھے - ھو تے ھو تے وہ قیس عامری کی طرح لاغر ھوگئے -

ایک دن وہ اسی ڈگی کے کنارے پر بیٹھے رو رھے تھے کہ ایک پیر مرد آے اور کہا : - اے حافظ ! تو دیوانہ ھوگیا ھے ' جو اس ڈگی کو سونے سے پر کرنا چاھتا ھے - یہ کبھی پر نہ ھوگی کیونکہ اس کا پردہ پھٹا ھوا اور گہرائی کی کوئی تھاہ نہیں-

حافظ : - حضور کا ارشاد بجا ھے - مگر یار کے کہنے کو نیچے ڈالنا عاشقوں کا کام نہیں —

بزرگ : - اچھا -لیکن اگر بغیر کسی شرط کے تمھیں شاخ نبات مل جاے تو پھر کیا ؟

حافظ : - بس میں آپ کا غلام ھوجاؤں گا —

بزرگ :- اچھا تم با با کوھی * کے ٹیلے پر جو شہر سے چار میل کے فاصلے پر ھے ' جاؤ

---

* بابا کو ھی : شیخ علی بابا متخلص بہ ' کوھی ' شیخ ابوعبداللہ محمد خفیف شیرازی (الملقب بہ شیخ کبیر المتوفی سنہ ۳۷۱ ھ) کے مرید تھے - اور سنہ ۴۴۲ ھ میں فوت اور شیراز میں دفن ھوے - ان کا دیوان برٹش میوزیم میں ھے - دیکھو حواشی میخانہ صفحہ ۱۶ —

اور متواتر اکتالیس رات تک وہاں چراغ جلاتےرہو —

حافظ : - بہت اچھا —

غرضکہ وہ اسی طرح چالیس دن تک با با کوہی کے ٹیلے پر جا تے رہے - اکتالیسویں دن شاخ نبات دوڑتی ہوی آ ئی اور اُنھیں اپنے گھر لے گئی - ان کی بھی یہی تمنا تھی ' لیکن ابھی زیادہ بڑھے نہیں تھے کہ انھوں نے دیکھا وہی بزرگ کھڑے ہیں - انھوں نے حافظ کو اکتالیس روز یاد کروائے - حافظ فوراً بھاگ گئے - اس رات بھی معمول کے مطابق وہاں بیٹھے رہے - آ دھی رات کو آپ نے دیکھا کہ آسمان سے دروازہ کھلا اور پہاڑ پر مسند آرائی ہوی - پھر ایک سواری آ ئی اور اس میں حضور پر نور حضرت محمد صلعم بر آمد ہو کر آفتاب جہاں آرا کی طرح اس تخت پر جلوہ افروز ہوے اور حافظ کو بلا کر مبارک باد دی —

جب آ پ نے آ نکھ کھولی تو دیکھا کہ شاخ نبات آ پ کے پہلو میں بیٹھی ہے - خواجہ صاحب نے بیتاب ہو کر گلے میں ھاتھ ڈال دئیے مگر خدا جا نے اس ہم آ غوشی میں کیا اثر تھا کہ آن واحد میں شاخ نبات اور خواجہ کے حواس ٹھکا نے نہ رہے- شراب پینے کا شوق زیادہ بڑہ گیا - پھر اسی ہم آ غوشی کی حالت میں شراب خا نوں میں جا کر شراب پیتے رہے—

اسی حال میں آپ ایک دن کسی مرغزار میں بیٹھے شاخ نبات کے ساتھ صبوحی اُڑارہے تھے ' کہ سامنے سے ایک بزرگ تشریف لا ے - جس کو دیکھنے کی خواجہ کو تاب نہ ہوی - اور آپ بے قرار ہو کر کھڑے ہو گئے - جب انھوں نے دیکھا کہ وہ بھی انھی کی طرت آ رہے ہیں تو خواجہ بھی استقبال کے لئے اٹھے- دونوں ہم آغوش ہوے جب علیحدہ ہوے تو دیکھا کہ وہ بزرگ رحلت کر چکے تھے - ان کی وفات کے بعد ہی خواجہ صاحب کا اس آن واحد میں جذب سلب ہو گیا - اور سلوک کے ٹھنڈے دائرے میں آ گئے - ہوش و حواس ' عقل و خرد سب درست ہو گئے - شاخ نبات کے اوسان بھی ٹھکانے لگے - خواجہ صاحب نے مسجد کے حجرے میں بیٹھ کر یاد الھی

میں مشغول ہونا چاہا تو شاخ بنات نے ان کا دامن پکڑ لیا اور کہا کہ میں آپ کے قدموں کو چھوڑ کر کہاں جاسکتی ہوں - مجھے آپ نے نفسانی خواہشات سے پاک کر دیا ، بس اب میری یہی آرزو ہے کہ جب تک جیوں ، آپ کی خدمت بجا لاؤں —

اکتالیس دنوں میں جب وہ پہاڑ پر تمام رات جاگا کرتے تھے ، حافظ ایک غزل پڑھا کرتے تھے جس کا مطلع یہ ہے :—

دوش وقت سحراز غصہ نجاتم دادند   وندراں ظلمت شب آب حیا تم دادند

دیوان حافظ صفحہ ۱۴۶

لیکن اس تمام قصے کی حقیقت محض افسانہ هي افسانہ ہے - کوئی تاریخی ثبوت اس کے لئے مہیا نہیں کیا جاسکتا - شاید یہ خیال اسی غزل کے اس شعر سے ماخوذ ہے —

ایں همه شهد و شکر کزسخنم می ریزد   اجر صبر یست کزاں شاخ نباتم دادند

لیکن اس جگہ ، شاخ نبات ، سے کوئی عورت مراد نہیں بلکہ شیرینی مراد ہے جو ، حافظ ، اپنے شعروں میں پاتے ہیں - اسی طرح ، حافظ ، نے دو اور جگهوں پر بهی اس لفظ کا استعمال کیا ہے :—

کلک حافظ شکریں شاخ نبا تست ببیں   کہ دریں باغ خز ینی ثمرے بہتر ازیں

دیگر :- 'حافظ' چه طرفه شاخ نبات ست کلک‌تو   کش میوه دلپذیر تراز شهدوشکرست

ان دونوں شعروں سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ حافظ کی مراد صرف ، شیرینی قلم ، ہے - ان شعروں کی روشنی میں ہم کسی‌طرح بھی 'شاخ بنات' کو عورت نہیں تسلیم کر سکتے —

اس کے علاوہ ہمیں یہ الفاظ دوسرے شاعروں کے ہاں بھی ملتے ہیں مثلاً مولانا روم ، رح ، فرماتے ہیں :—

بلبل از عشق ز گل بوسه طمع کردو بگفت   بشکن ایں شاخ بنات و دل مارا مشکن

گل بگفتا لب من در خود طفلان نبوده   بچه را ابجد و هوّز به و حطی ز کلمن*

(۲) شاخ نبات کی طرح شاخ قند بھی استعمال ھوتا ھے - مثلاً امیر خسرو (المتوفی سنه ۷۲۵) فرماتے ھیں :—

به هنگام لب ساغر مزیدن   نسیم خلق آیدد ر دمیدن

بهصحرائےشکرنے بندگردد   نباتزهر 'شاخ قند' گردد

(۳) مرزا محسن 'تاثیر' (سنه ۱۱۳۰ ھ) :—

دل خویش رابه آں بت شیریں بهانه بست

بلبل مگر به 'شاخ نبات' آشیانه بست

دیگر :- سردر هوا مباش که خالیست از نبات   چوب برون شیشه ز شاخ نبا تها

(۴) میرزا عبدالغنی 'قبول' —

خط چرا از لب لعل تو دمید   گردداورد بت من شاخ نبات

(۵) 'زبور عجم' میں ھے:—

از محبتجذبهها گردد بلند   درج می گیرداز ونا ارجمند

اهل دل را سینهٔ 'سینا' دهد   با هنر منداں ید بیضا دهد

پیش اوبرممکنوموجودمات   جمله عالم تلخ و او شاخنبات

دیکھو صفحه ۲۶۴ —

اب اگر ھم شاخ نبات کو صرف حافظ ھی کا معشوق ٹھہرائیں تو بڑی بے انصافی ھوگی- یه وہ معشوقه ھے جس کے عاشق مولانا روم ساتویں صدی میں' امیر خسرو اور حافظ آٹھویں صدی میں ' محسن' تاثیر ' بارھویں صدی میں اور' اقبال ' موجودہ زمانے میں ھیں —

---

*دیکھو دیوان شمس تبریز لکھنؤ سنه ۱۳۲۶ ھ - صفحه ۲۸۳ —

(۳) حافظ اور تیمور

کہا جاتا ہے کہ جب 'تیمور' شیراز میں آیا تو اس نے خواجہ صاحب کو بلاکر پوچھا کہ میں نے تمام دنیا کو فتح کرنے کا عزم اس لئے کیا ہے کہ اپنے شہر سمرقند کو سنواروں اور تم اسے اپنے دوست کے ایک خال کے بدلے دئے ڈالتے ہو - چنانچہ تمھارا یہ شعر ہے :—

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
به خال هندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اس کی کیا وجہ ہے؟ خواجہ صاحب پکار اُٹھے کہ حضور اسی غلط بخشی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ میں اس غربت میں پھنسا ہوا ہوں - تیمور اس حاضر جوابی سے بہت خوش ہوا اور اُنھیں معاف کردیا - لیکن یہ واقعہ قابل غور ہے —

سب سے پہلے یہ واقعہ دولت شاہ کے تذکرے میں درج ہوا - اس کے بعد عموماً تمام تذکروں نے اسی کی پیروی کی - 'آتشکدے' میں بھی اسی طرح یہ قصہ ملتا ہے - لیکن کئی تذکروں میں کچھ اور اضافہ بھی کیا گیا ہے - نگارستان فارس میں لکھا ہے کہ امیر تیمور نے چاہا تھا کہ میرے وقائع تاریخ کو حافظ صاحب اپنے قلم فصاحت سے تحریر کریں لیکن اُن کی آزادی طبیعت نے گوارا نہ کیا * —

میخانے میں لکھا ہے :—

" دیگر به تحقیق پیوسته که بخدمت امیر کبیر امیر تیمور رسیده اند و امیر را با ایشاں التفات بے نهایت بوده † " —

قصے کی بابت کوئی اشارہ نہیں کیا گیا —

موجودہ زمانے میں صرف انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مؤلف نے اس قصے سے

---

* نگارستان فارس - صفحہ ۷۹ — تذکرۂ حافظ —

† میخانہ صفحہ ۸۳ - تذکرۂ حافظ —

انکار کیا ھے - لیکن اس کے انکار کی وجہ بالکل بے سروپا ھے - وہ کہتا ھے کہ تیمور نے شیراز پرسنہ ۷۹۵ ھ میں حملہ کیا' لیکن حافظ سنہ ۷۹۱ ھ میں فوت ھوچکے تھے - لیکن تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ تیمور نے سنہ ۷۸۹ ھ میں بھی شیراز پر حملہ کیا تھا —

چنانچہ حافظ اسلم نے اسی بنا پر اس قصے کو تسلیم کیا ھے —

لیکن اگر ذرا زیادہ غور کیا جائے تو اس قصے کی اصلیت ظاھر ھو جائے گی -

تیمور کے حالات معلوم کرنے کے لئے ھمارے پاس حبیب السیر' روضۃ الصفا' ظفر نامہ شرف‌الدین یزدی اور تزک تیموری ابو طالب * ھیں - ان تمام کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ یہ قصہ محض یار لوگوں کی دل لگی کے لئے لکھا گیا ھے - سنہ ۷۸۹ ھ کے تحت میں نہ روضۃ الصفا اور نہ ظفر نامہ میں کسی قسم کی ملاقات کا ذکر ھے - تزک تیموری کے واقعات کو اگرچہ ھم اچھی طرح تسلیم نہیں کرسکتے † ' لیکن اس میں بھی یہ واقعہ درج نہیں - اس لئے زیادہ صحیح یہی ھو گا کہ ھم اس واقعے کی اصلیت سے انکار کردیں —

اس کے علاوہ اگر امیر تیمور اور حافظ کے تعلقات جیسا کہ میخانے میں ھے ' خوش گوار ھوتے تو یقینی بات ھے کہ حافظ اس کا تذکرہ کرتے - لیکن دیوان میں کہیں اس کا ذکر نہیں ملتا —

مولانا شبلی بھی اسی غلطی میں مبتلا ھو گئے - چنانچہ اُنھوں نے بھی شعرالعجم میں اس واقعے کو درج کیا ھے' لیکن اُن سے بڑی غلطی یہ واقع ھوئی ھے کہ اُنھوں نے اس واقعے کو منصور کی وفات کے بعد درج کیا - جو سنہ ۷۹۵ ھ میں ھوئی اور یہ کسی طرح بھی قابل قبول نہیں —

---

* ان دونوں کتابوں کے قلمی نسخے پنجاب پبلک لائبریری لاھور میں موجود ھیں —

† یہ کتاب ابو طالب نے تیمور کو شیعہ ثابت کرنے کے لئے لکھی تھی —

(۴) حافظ کا مذھب

حافظ کے مذھب کے متعلق بھی آج تک کسی نے تشفی آمیز فیصلہ نہیں کیا۔ ایران میں کسی شخص ' محمد دارابی ' نے ایک رسالہ ' لطائف غیبیہ ' میں لوگوں کے اعتراضات کو جو انھوں نے ' حافظ ' پر کئے تھے ' رد کیا ھے - لیکن یہ رسالہ میری نظر سے نہیں گزرا - صرف مسٹر ' براؤن ' نے اپنی تاریخ میں اس کا حوالہ دیا ھے —

مجالس المؤمنین مصنفۂ 'قاضی نوراللہ شوستری' میں 'حافظ' کو شیعہ لکھا گیا ھے۔

شیعوں کا فرقہ اس وقت سے شروع ھوتا ھے جبکہ ' حضرت علی کرم اللہ وجہہ ' اور ' حضرت معاویہ ' کے درمیان جنگ ھوئی - پہلے پہل تو یہ فرقہ کچھ نمایاں حیثیت نہیں رکھتا تھا - تمام ایران میں صرف چند جگہیں تھیں جہاں ' شیعہ موجود تھے - چونکہ یہ اصحاب رسول میں سے ' حضرت علی ' کو بر تر سمجھتے تھے ' جو اسلام کے اصلی راستے سے دور تھا ' اس لئے ان کے ساتھ لوگ بہت کم ملتے جلتے تھے —

بعد میں جب منگول حکمراں ھوے تو اُنھوں نے شیعوں کو بالکل کمزوری کی حالت میں دیکھا - انھوں نے ایک مدبر حکمراں کی طرح سلطنت کے بڑے بڑے عہدے اِن کو دیے - یہ شیعوں کی ترقی کا پہلا موقع ھے - بعد میں جب ' غازان خاں ' مسلمان ھوا تو وہ بھی شیعہ ھو گیا - جس کی وجہ سے شیعوں نے اور زور پکڑنا شروع کیا - اگرچہ وہ بعد میں اھل سنت و جماعت میں داخل ھو گیا تھا * - لیکن اس کے بعد' الجاتیو' یقینی شیعہ تھا - چنانچہ ' الجایتو ' کے وہ سکّے ھمارے پروفیسر ' شیرانی صاحب ' کے پاس موجود ھیں - ان پر صاف " علی ولی اللہ " کے لفظ لکھے ھوے ھیں —

پھر صفوی خاندان نے شیعہ مذھب کو ایران میں اچھی طرح مضبوط کردیا —

' قاضی صاحب ' لکھتے ھیں کہ جب ' شاہ اسمعیل صفوی' (سنہ ۹۰۶ھ - ۹۳۰ ھ)

---

* دیکھو ترجمہ اردو سفرنامۂ ابن بطوطہ جلد اول صفحہ ۲۱۷ - ۸ —

تخت پر بیٹھا تو کسی ملا کے کہنے سے اس نے تمام سنیوں کو شیعہ بنانا شروع کیا۔ اس جوش کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس نے مشہور سنّیوں کی قبروں کو بھی اکھڑوا دیا - اسی ضمن میں ایک دن 'حافظ' کی بھی باری آگئی' لیکن کسی نے کہا کہ 'حافظ' سنی نہ تھے بلکہ شیعہ تھے' اور ثبوت میں یہ غزل پیش کی :—

(۱) جوزا سحر نہاد حمائل برابرم — یعنی غلام شاہم و سوگند می خورم
(۲) ساقی بیا کہ از مدد بخت کارساز — کارے کہ خواستم زخدا شد میسرم
(۳) جامے بدہ کہ باز بشادی روے شاہ — پیرانہ سر ہواے جوانی ست بر سرم
(۴) راہم مزن بہ وصف زلال خضر کہ من — از جام شاہ جرعہ کش حوض کوثرم
(۵) من جرعہ نوش بزم تو بودم ہزار سال — کے ترک آبخور کند ایں طبع خوگرم
(۶) گر باورت نمی شود از بندہ ایں حدیث — از گفتۂ کمال • حدیثے بیاورم
(۷) گر برکنم دل از تو و بردارم از تو مہر — آں مہر بر کہ افگنم آں دل کجا برم
(۸) نام محمد ست و علی در زجان من — وزایں دو نام نیک بر اعدا مظفرم
(۹) عہد الست من ہمہ با مہر شاہ بود — در شاہراہ عمر ازیں عہد نگزرم
(۱۰) شاہیں صفت چو طعمہ چشیدم ز دست شاہ — کے باشد التفات بہ صید کبوترم
(۱۱) اے شاہ شیرگیر چہ کم گردد ار شود — در سایۂ تو ملک فراغت میسرم
(۱۲) بال و پرے ندارم و ایں طرفہ ترکہ نیست — غیر از ہواے منزل سیمرغ در سرم
(۱۳) شکر خدا کہ باز دریں اوج بارگاہ — طاؤس عرش می شنود صیت شہپرم
(۱۴) نامم ز کارخانۂ عشاق محو باد — گر جز محبّت تو بود شغل دیگرم
(۱۵) اے عاشقان روے تو از ذرّہ بیشتر — من کے رسم بہ وصل تو کز ذرہ کمترم
(۱۶) بنما بمن کہ منکر حسن رخ تو کیست — تا دیدہ اش بگزلک غیرت بر آورم
(۱۷) حافظ ز جان محب رسول ست و آل او — برایں سخن گواست خداوند اکبرم

• کمال اسمعیل اصفہانی المتوفی سنہ ۶۳۵ ھ دیکھو شعرالعجم جلد دوم -
+ دیکھو مجالس المومنین ترجمۂ حافظ ' زیرعنوان " صوفیاں " —

چنانچہ جب شاہ ' اسمعیل ' نے یہ غزل سنی تو اس نے ' حافظ ' کو شیعہ تسلیم کر لیا —

اس کے علاوہ ہمیں دیوان میں دو قصیدے اور دوغزلیں اور بھی ملتی ہیں جن سے ' حافظ ' کا شیعہ ہونا معلوم ہوتا ہے —

ایک قصیدہ یہ ہے :—

مقدر یکہ زآثار صنع کرد اظہار — سپہر و مہر و مہ و سال و ماہ و لیل و نہار

مدار سیر کوا کب بامر کن فیکون — قرار داد بریں طاق گنبد دوّار

نہ آسمان و ملائک بامر حق مشغول — بسجدہ درگہ تسبیم وذ کرو استغفار

چہار عنصر از و مختلف پدید آورد — مدار آتش و آب و غبار و خاک مجار

....

اگر نہ ذات نبی و ولی بدے مقصود — جہاں بہ کتم عدم رفتے ہمچو اوّل بار

نوشتہ بر در فردوس کا تبان قضا — نبی رسول و ولی عہد حیدر کرار

امام جنّی وانسی علی بود کہ علی — زکل خلق فزوں ست از صغار و کبار

علی امام و علی ایمن و علی ایمان — علی امین و علی سرور و علی سردار

علی علیم و علی عالم و علی اعلم — علی قسیم قصور و علی ست قاسم نار

....

بہ گاہ هفصد و هفتاد نہکہ در شیراز — تمام گشت بیک روز جمع ایں اشعار

بہ دشمناں منشیں ' حافظا ' توزّکن — نجات خویش طلب کن بجان هشت و چہار

حرام زادۂ بد فعل و شوم بے بنیاد — بہدم شاہ جہاں کے بجا کند اقرار

دوسرا قصیدہ بھی اسی قبیل کا ہے - میں اسے بخوف طوالت نظر انداز کر تا ہوں * غزلوں میں سب سے زیادہ مشہور غزل یہ ہے :—

---

* اس قصیدے کا مطلع یہ ہے :

آں گلبن باغ وفا ' آں سرو بستان وفا - خورشید برج ارتضی ، اعلی علی مرتضی

لے دل غلام شاہ نجف باش و شاد باش — پیوستہ در حمایت لطف اله باش
از خارجی هزار به یک جو نمی برند — گو کوه تا بکوه منافق سپاه باش
چوں احمدم شفیع بود روز رستخیز — گو ایں تن بلاکش من پُر گناہ باش
آں را که دوستیء علی نیست ' کافراست — گو زاهد زمانه و گو شیخ راہ باش
امروز زندہ ام به ولاے تو یا علی — فردا به روح پاک اماماں گواہ باش
قبر امام هشتم سلطان دیں رضا * — از جاں ببوس بر در آں بارگاہ باش
' حافظ ' طریق بندگیء شاہ پیشه کن — وانگاہ در طریق چو مردان راہ باش

اسی طرح تمام مطبوعه دیوانوں میں' غزلیات میں کئی جگه ایسے شعر ملتے هیں' جن سے ان کا شیعه هونا ظاهر هوتا هے - مثلاً ایک غزل میں یه شعر ملتا هے :-

'حافظ' اگر قدم زنی در رہ خاندان‌عشق — بدرقۂ رهت شود همت شحنۂ نجف

وغیرہ وغیرہ

غرضکه یہی وہ تمام چیزیں هیں' جن سے هم ' حافظ ' کو شیعه کہه سکتے هیں - اب همیں ان تمام چیزوں کو غور سے دیکھنا چاهئے —

(۱) مجالس‌المؤمنین کے قصے کے متعلق هم کچھه نهیں کہه سکتے - همیں یه دیکھنا چاهئے که وہ قصیدہ جو قاضی صاحب نے ' حافظ کی طرف منسوب کیا هے' واقعی اُن کا هے یا نهیں —

یه قصیدہ واقعی ' دیوان حافظ ' کے تمام مطبوعه نسخوں میں موجود هے -

---

* بعض قلمی نسخوں میں , حافظ ' کے نام کا ایک مسدس بھی ملتا هے جو انهوں نے امام رضا کی مدح میں لکھا هے :—

دوش بودم در طواف روضۂ خیرالانام — شاہ سلطان خراساں آں امام ابن امام
آں‌امامے کز شرف دانش بود دردیں تمام — کعبۂ اهل خراساں قبلۂ هر خاص و عام
بودم اندر روضه اش آمد بگوشم ایں پیام — کا لسلام اے شاہ سلطان خرساں السلام

یه مسدس دراصل شاہ نعمت الله کے دیوان سے لیا گیا هے (دیکھو ریو - ضمیمۂ فهرست)

' پروکہاس ' نے اسے غزلوں میں لکھا ہے - لیکن بہ حیثیت مجموعی مجالس المؤمنین میں اس قصیدے کو بہت کچھ تبدیل کیا گیا ہے — آٹھواں شعر یہ ہے :—

نام محمدست و علی حرز جان من   وز این دو نام نیک بر اعدا مظفرم

لیکن دیوان کے پرانے قلمی نسخوں میں یہ شعریوں درج ہے :—

منصور بن محمد غازیست حرز من   وز این خجستہ نام بر اعدا مظفرم

اس شعر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ در حقیقت " حضرت علی " کی مدح میں نہیں لکھا گیا' بلکہ " منصور " کی تعریف میں لکھا گیا ہے —

" منصور " شاہان آل مظفر کا آخری بادشاہ ہے - تیمور نے جب سنہ ۷۸۹ ھ میں شیراز پر حملہ کیا تو کسی وجہ سے وہ واپس چلاگیا اورجاتی دفعہ نصرالدین یحییٰ کو گورنر مقرر کر گیا —

شاہ " منصور " اس وقت شوستر کا حکمراں تھا اور شاہ " یحییٰ " کا حقیقی بھائی تھا - اس نے " تیمور " کے واپس جاتے ہی " شیراز " پر حملہ کیا- شاہ " یحییٰ " بھاگ گیا اور " منصور " نے شیراز پر قبضہ کر لیا —

" حافظ " نے شاہ " منصور " کی تمام بادشاہوں سے زیادہ تعریف کی ہے ' چنانچہ کہتے ہیں : —

بیا کہ رایت منصور بادشاہ رسید   نوید فتح والبشارت بہ مہر و ماہ رسید

ایک اور جگہہ کہتے ہیں : —

من غلام شاہ منصورم' نباشد دوراگر   از سر تمکیں' تفاخر بر شہ خاورم کنم

چنانچہ ساقی نامے میں جو انھوں نے شاہ " منصور " کی تعریف کی ہے'. وہ ان کے تعلقات کی خوشگواری پر دلالت کرتی ہے —

اسی طرح مصنف " مجالس " نے قصیدے کا مقطع بھی بدل دیا ہے - چنانچہ

" حافظ " ز جاں محب رسول ست و آل او   بر این سخن گواست خداوند اکبرم

کی جگہہ ایک بہت پُرانے قلمی نسخے میں یہ شعر درج ھے : —

" حافظ " زجان دعاے تو گوید بہ صبح و شام   بوا ین سخن گواست خدا وند اکبرم

جو متن کے ساتھہ زیادہ مطابقت رکھتا ھے —

اس کے علاوہ ایک اور بات قابل غور ھے " مجالس المؤمنین میں اس قصیدے کے وہ شعر جن سے کسی بادشاہ وقت کی تعریف جو زندہ ھے ، پائی جاتی ھو ، اُڑادیے گئے ھیں کیونکہ انھیں یہ ثابت کرنا تھا کہ یہ قصیدہ حضرت علی کی تعریف میں لکھا گیا ھے - مثلاً : —

شاہا من ار بہ عرض رسانم سریر فضل   مملوک آں جنابم و مسکین این درم

(چوتھے شعر کے بعد) اس شعر سے معلوم ھوتا ھے کہ کہنے والا کسی ایسے بادشاہ کو مخاطب کررھا ھے ، جو ابھی زندہ ھے چنانچہ اگلے شعر سے واضح ھے : —

من جرعہ نوش بزم تو بودم ھزار سال   کے ترک آبخورکند این طبع خو گرم

(۲) گردوں چو کرد نظم ثریا بنام شاہ   من نظم خود چرانکنم از کہ کمترم

(نویں شعر کے بعد)

(۳) مقصود از این معاملہ بازار تیزتست   نہ جلوہ می فروشم و نہ عشوہ می خرم

بر من فتادہ سایۂ خورشید سلطنت   اکنوں فراغتست ز خورشید خاورم

شعرم بہ یمن مدح کہ صد ملک دل کشاد   گوئی کہ تیغ تست زبان سخنورم

(سولھویں شعر کے بعد)

ان سب شعروں سے صاف ظاھر ھے کہ حافظ کسی زندہ بادشاہ کو مخاطب کرکے اس کی تعریف کر رھا ھے -

اس کے علاوہ مجالس المؤمنین ایک ایسی کتاب ھے ، جس میں بڑے بڑے سنیوں کو شیعہ بنانے کے لئے کبھی تو ان کے اپنے اشعار ھی کو توڑ مروڑ کر شیعیت کی طرف لے گئے ھیں اور کبھی بالکل الحاقی قصیدے اور غزلیں ان کی طرف

منسوب کردی گئی ھیں، جس نے شیخ سعدی* (المتوفی سنه ۶۹۱ھ)- مولانا روم (المتوفی سنه ۶۷۲ھ) حکیم سنائی (سنه ۵۲۵ ھ) اور عطار (سنه ۶۲۷ ھ) کو نہیں چھوڑا تو ان کے نزدیک حافظ کس قطار میں تھے —

(ب) دوسرے قصیدے کے متعلق کچھہ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں - وہ صاف بتا رھا ھے کہ وہ حافظ کی طرز میں نہیں - وہ شخص جس کا یہ اصول ھو کہ :-

آسایش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف ست   با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

کیا ایسے اشعار لکھہ سکتا ھے کہ : —

حرام زادۂ بد فعل و شوم بے بنیاد   یہ مدح شاہ جہاں کے لجا کند اقرار

حافظ نے کبھی مذھبی جھگڑوں میں قدم نہیں رکھا، چنانچہ وہ خود کہتا ھے :-

جنگ ھفتاد و دو ملت ھمہ را عذر بنہ   چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

سب سے بڑہ کر یہ بات ھے کہ یہ قصیدہ کسی پرانے قلمی نسخے میں موجود نہیں - البتہ بعد کے نسخوں میں ان کی بہت بہتات ھے - کئی پرانے نسخوں میں یہ قصیدے متن کی بجائے کسی دوسرے خط میں حاشیے پر لکھے ھوے ھیں جو صاف بتلا رھا ھے کہ بعد کا اضافہ ھے —

---

* مثال کی طور پر میں شیخ سعدی کے وہ اشعار جن سے مصنف نے ان کو شیعہ قرار دیا ھے، درج کرتا ھوں —

غیر از علی کہ لائق پیغمبری بدے   گر خواجۂ رسل نہ بدے ختم انبیا
فردا کہ ھر کسے بہ شفیعے زنند دست   دست من ست و دامن معصوم مرتضی

لیکن جب ھم کلیات سعدی کے قصائد میں دیکھتے ھیں تو یہ شعر اس طرح درج ھیں : —

• دیگر عمر کہ لائق پیغمبری بدے   گر خواجۂ رسل نہ بدے ختم انبیا

دیکھو کلیات قصائد - صفحہ ۱۳ — ۱۴

اس سے صاف ظاھر ھے کہ شیخ سعدی نے یہ شعر حضرت عمر کے متعلق لکھا اور مصنف نے حضرت علی کا نام لکھکر ان کو شیعہ ثابت کردیا —

اسی طرح تمام غزلیں جو اوپر لکھی جاچکی ہیں، سب کی سب العاقی ہیں —

یہاں ایک اور بات قابل غور ہے - حافظ کے دیوان کا پہلا شعر یہ ہے :-

الا یا ایها الساقی ادر کأساً و ناولها — که عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلها

اس شعر کا پہلا مصرع یزید کے اس شعر سے ماخوذ ہے :-

انا المسموم ماعندي بترياق ولاراقی — ادر کأساً و ناولها الا یا ایها الساقی

اور یہ وہی یزید ہے جس نے حضرت امام حسین کو قتل کروایا تھا - ظاہر ہے کہ شیعوں کے نزدیک یزید کی کیا عزت ہوسکتی ہے - لیکن جب انہوں نے حافظ کو شیعہ ثابت کیا تو وہ بہت حیران ہوے کہ یہ کیا سبب ہے کہ حافظ نے اپنے دیوان میں یزید جیسے خبیث آدمی کے شعر کو سب سے پہلے جگہہ دی - چنانچہ اهلي شیرازي* کہتا ہے :-

خواجه حافظ را شبے دیدم به خواب — گفتم اے در فضل و دانش بے مثال

از چه بستی بر خود این شعر یزید — باوجود این همه فضل و کمال

گفت واقف نیستی زاں مسئله — مال کافر هست بر مؤمن حلال

کاتبی نیشاپوری کہتا ہے :-

عجب در حیرتم از خواجه 'حافظ' — بنوعے کش خرد زاں عاجز آید

چه حکمت دید در شعر یزید او — که در دیوان نخست از وے سراید

اگرچه مال کافر بر مسلماں — حلالست و درو قولے نشاید

ولے از شیر عیبے بس بزرگ ست — که لقمه از دهان سگ رباید*

لیکن شاید ان لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ 'دیوان حافظ' حافظ نے مرتب نہیں

• اهلی شیرازی - شاہ اسمعیل صفوی کی ملازمت میں تھے - شیراز میں حافظ کے مزار کے پاس دفن ہیں - ان کی مثنوی ''سحر حلال'' مشہور ہے - سنہ ۹۴۲ھ میں وفات پائی -

• یہ تمام بیان مولانا سودی شارح (ترکی) دیوان حافظ کی شرح سے لیا گیا ہے - جسے بروکھاس نے بھی اپنے نسخے میں نقل کیا ہے -

کیا تھا' بلکہ اُس کی وفات کے بعد اُس کے دوست گل‌اندام نے مرتب کیا تھا - جس طرح اس نے چاھا' ترتیب دے دی —

حافظ کا تسنن

ھمیں دیوان میں حافظ کے تسنن کا کوئی ظاھر ثبوت نہیں ملتا - البتہ اندرونی شہادت جو مہیّا ھوسکتی ھے' لکھی جاتی ھے —

(۱) اشاعرہ قائل ھیں کہ قیامت کے دن ھم کو خدا کا دیدار ھوگا' اور حضرات شیعہ' معتزلہ کی طرح اس سے منکر ھیں - لیکن خواجہ صاحب فرماتے ھیں :-

این جان عاریت کہ بہ 'حافظ' سپرد دوست

روزے رخش بہ بینم و تسلیم وے کنم†

(۲) اشاعرہ اور معتزلہ کا ایک متنازعہ فیہ مسئلہ قرآن کی قدامت اور حداثت کے متعلق ھے- معتزلہ کہتے ھیں کہ قرآن مجید حادث ھے- امام احمد بن حنبل رح (سنہ ۱۹۴ ھ - ۲۴۱ھ) کو صرف اسی وجہ سے کہ انھوں نے قرآن کو حادث نہیں مانا تھا' مامون‌الرشید (المتوفی ۲۱۸ ھ) نے قید کرنے کا حکم دیا تھا ‡ - یہ مسئلہ بہت مدت تک زیر بحث رھا ھے - لیکن اشاعرہ کہتے ھیں کہ قرآن مجید قدیم ھے - اب اشعری اور اھل سنت اکثر عقائد میں ملتے ھیں - اسی طرح معتزلی اور شیعہ —

چنانچہ جب ھم دیوان کو دیکھتے ھیں تو معلوم ھوتا ھے کہ خواجہ صاحب قرآن مجید کو قدیم مانتے ھیں' جو شیعوں کے نقطۂ نظر کے خلاف ھے :-

برآرم بہ اخلاص دست دعا کنم روے در حضرت کبریا

کہ یارب بہ آلائے و نعمائے تو باسرار اسمائے حسنائے تو

بہ حق کلامت کہ آمد قدیم بہ حق عظیم و بہ خالق کریم

---

† لطائف غیبیہ بہ حوالۂ تاریخ براؤن —

‡ مذاھب الاسلام - صفحہ ۱۰۳' ۱۰۴ بار اول —

که شاہ جہاں باد فیروز بخت به اقبالش آراسته تاج و تخت *

(۲) مسئلۂ جبرو قدر میں بھی اسی طرح اشاعرہ اور معتزلہ کا میدان گرم رہا ہے - اشاعرہ کہتے ھیں کہ جو کچھہ ھوتا ھے سب خدا کی طرف سے ھے - انسان میں کچھہ قدرت نہیں - لیکن معتزلہ کہتے ھیں کہ انسان اپنے افعال کا خود مختار ھے جو چاھے سو کرسکتا ھے - اور ھر ایک گروہ اپنی اپنی تائید میں قرآن مجید سے آئتیں پیش کرتا ھے —

ایک فریق کہتا ھے :- " لیس للانسان الاما سعیٰ " یعنی خدا کہتا ھے کہ انسان کا ھر ایک کام سعی پہ منحصر ھے - پھر فرماتا ھے :- " ذلک بان اللہ لم یکن مغیرا نعمةالنعمہا علی قوم حتیٰ یغیرو اما بانفسہم " " سورۂ انفال " وغیرہ —

مصنف حق الیقین کہتا ھے † :—

" و بندگان در فعل خود مختارند و خود فاعل و فعل خود اند ' خواہ اطاعت باشد خواہ معصیت ' و اکثر امامیه و معتزله بایں قول قائل اند ' اشاعرہ که اکثر اهل سنت اند می گویند فاعل همه افعال بندہ خداست و بندگان مطلق در آنها اختیار ندارند - بلکه خدا بردست ایشاں افعال را جاری می کند و در آں فعل مجبور اند ' اما بعضے از ایشاں می گویند که ارادہ از بندہ مقارن آں فعل می باشد اما آں ارادہ مطلقاً دخلے در وجود آں فعل ندارد و ایں مذهب باطلست " —

اب جب ' حافظ کی طرف دیکھتے ھیں تو بخلاف معتزلہ اور امامیہ کے وہ اپنے آپ کو مجبور محض مانتا ھے - یہ ھماری تقدیر ھی میں نہیں کہ ھم یوں

---

* دیکھو ساقی نامۂ حافظ - مے خانۂ عبدالنبی صفحہ ۸۵ - ۸۶ ' دیوان حافظ مطبوعۂ نامی پریس سنہ ۱۹۲۱ ع صفحہ ۴۲۸ وغیرہ —

† اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ ھمارے پروفیسر شیرانی صاحب کے کتب خانے میں موجود ھے اور انہوں نے اپنے مضمون " فردوسی کے مذھب " میں اسی کتاب سے اقتباسات لئے ھیں —

کرتے یا یوں نہ کرتے مثلاً :—

(۱) در کوے نیکنامی مارا گزر ندادند — گر تو نمی پسندی تغییر کن قضارا

(۲) در خرابات مغاں ما نیز ھم منزل شویم — کیں چنیں رفتست در روز ازل تقدیرما

(۳) رضا بدادہ بدہ وز جبیں گرہ بکشا — کہ بر من و تو در اختیار نکشادست

(۴) بروا ے زاھد و بر دردکشاں خردہ مگیر — کہ ندادند جز یں تحفہ بما روز الست

(۵) مکن بہ نامہ سیاھی ملامت من مست — کہ آگہ ست کہ تقدیر بر سرش چہ نوشت

(۶) انچہ سعی ست من اندر صدد بنمودم — ایں قدر ھست کہ تغییر قضا نتواں کرد

(۷) ساقیا مے دہ کہ با حکم ازل تدبیر نیست — قابل تغییر نبود انچہ تعیین کردہ اند

(۸) بارھا گفتہ ام و بار دگر می گویم — کہ من دل شدہ ایں رہ نہ بخود می پویم

(۹) مرا روز ازل کارے بجز رندی نفر مودند — بر آں قسمت کہ آنجا شد کم وافزوں نخواھد شد

(۱۰) در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — آنچہ استاد ازل گفت ' ھماں می گویم

(۱۱) بروا ے زاھد و بر دردکشاں خوردہ مگیر — کار فرما ے قدر می کند ایں من چہ کنم

(۱۲) مرا مہر نکو رویاں ز سر بیروں نخواھد شد
قضا ے آسماں ایں ست و دیگر گوں نخواھد شد

اس کے علاوہ تمام دیوان ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ھے —

(۳) معتزلہ اپنے آپ کو عدلی کہتے ھیں' اس کی وجہ یہ ھے کہ ان کے نزدیک برائی صرف انسان سے سرزد ھوتی ھے ' خدا کی ذات برائی کرنے سے منزہ ھے - جو کچھہ برائی ھم پر آتی ھے ' ھمیں اسے خدا کی طرف منسوب نہیں کرنا چاھئے ' لیکن برخلاف اس کے اشاعرہ برائی اور نیکی دونوں کو خدا کی طرف منسوب کرتے ھیں - اور کہتے ھیں کہ برائی صرف ھمیں برائی لگتی ھے' لیکن در حقیقت اس میں کچھہ خدا کا بھید مضمر ھوتا ھے اور اس سے بھی صرف ھماری بہتری منظور ھوتی ھے مصنف حق الیقین کہتا ھے :—

"حق تعالیٰ حکیمست و کارھاے او منوط بہ حکمت و مصلحت ست و فعل عبث

و بے فائدہ ازو صادر نمی شود - او را در افعال اغراض صحیح و حکمت ھاے عظیمہ ملحوظ می باشد ولیکن غرض در افعال الٰہی عائد بہ بندگاں می گردد - غرض او تحصیل نفع از براے خود نیست - و بریں قول اتفاق کردہ اند امامیہ و معتزلہ و حکماء- و اشاعرہ گفتہ اند کہ افعال خدا معلل بہ اغراض نیست و آیات و احادیث بسیار بر بطلان ایں قول دلالت می کند - و اکثر امامیہ را اعتقاد آنست کہ انچہ اصلح باشد از براے خلق و نظام عالم' فعلش بر حق تعالیٰ واجب ست —

حافظ کہتا ہے :—

گر رنج پیشت آید و گر راحت اے حکیم
نسبت مکن بہ غیر کہ ایں ھا خدا کند

یہ شعر ایسا صاف ہے کہ معلوم ھوتا ہے کہ شاید 'حافظ' نے صرف اسی مسئلے کے فیصلے کے لئے لکھا تھا —

گناہ اگرچہ نبود اختیار ما ' حافظ ' تو در طریق ادب کوش و گو گناہ من ست

یعنی در حقیقت ھم مجبور محض ھیں اور جو کچھہ گناہ یا ثواب ' نیکی یا برائی ھم سے سرزد ھوتی ہے وہ ھماری طاقت میں نہیں - لیکن پھر بھی ادب اس بات کا مقتضی ہے کہ اگرچہ یہ اسی خداے مطلق کا کام ہے ' مگر ھم ان کو اس کی طرف منسوب نہ کریں —

بخور ھرچہ آید ز دست حبیب نہ بیمار دانا ترست از طبیب

دنیا میں انسان بسا اوقات اپنی تنگدستی ' شکستہ حالی اور دیگر مصائب کا شاکی رھتا ہے اور آرام کا خواھش مند ' مگر حکیم مطلق کا فعل خالی از حکمت نہیں ھوتا - وہ اپنے بندوں پر مہربان ہے اور جو کچھہ کرتا ہے ' آدمی کے فائدے کے لئے کرتا ہے - انسان ناقص‌العقل ھونے کی وجہ سے نہیں سمجھتا * —

در طریقت ھر چہ پیش سالک آید خیر اوست
در صراط‌المستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

---

* لسان‌الغیب شرح دیوان حافظ جلد اول —

صوفیائے کرام کے نزدیک انسان کو دنیا میں جو کچھہ پیش آتا ہے اور جو افعال اس سے سرزد ہوتے ہیں ان سب میں حکمت الٰہی موجود ہے - اور سب مصلحت ہیں پر مبنی ، گویا ان کے نزدیک تمام دنیا صراط المستقیم پر جاری ہے اور جو کچھہ ہو رہا ہے حکیم مطلق کی حکمت کے مطابق ہو رہا ہے —

(۴) مولانا اسلم نے اسی سلسلے میں ایک اور وجہ پیش کی ہے، جس سے اس بحث کا قطعی فیصلہ ہو جاتا ہے —

حضرات شیعہ کو لفظ چار سے بہت نفرت ہے (بوجہ خلفائے اربعہ) اسی لئے بجائے چار تکبیروں کے وہ جنازے میں پانچ تکبیریں کہتے ہیں، لیکن خواجہ ' حافظ' بر خلاف شیعوں کے چار تکبیریں کہتے ہیں —

من همان دم که وضو ساختم از چشمهٔ عشق
چار تکبیر زدم یکسره بر هر چه که هست

(۵) اهل تشیع تمام اماموں کو معصوم مانتے ہیں اور چونکہ نبیوں کا درجہ اماموں سے بر تر ہے اس لئے نبی بھی معصوم ہوے - اور چونکہ فرشتے بھی اماموں سے بر تر ہیں اس لئے وہ بھی معصوم ہوے - اسی بنا پر وہ ہاروت و ماروت کے قصے اور حضرت یوسف کے زلیخا کے دام میں آجانے کو نہیں مانتے - لیکن ' حافظ ' نے ہاروت و ماروت کی تلمیح کو استعمال کیا ہے - اگر وہ شیعہ ہوتے تو کبھی ایسی تلمیح استعمال نہ کرتے —

گر بیادم شدن سوے هاروت بابلی
صد گونه ساحری بکنم تا بیارمت *

---

* عام چھپے ہوے دیوان میں ایک اور غزل بھی ہے، جس میں حافظ نے یہ تلمیح استعمال کی ہے :—

همچو هاروتیم دائم در بلاے عشق زار ، کاش که هرگز ندیدے دیدهٔ ما ' روت را
کے شدے هاروت درچاه زنخدانش اسیر ، گر نه گفتے شمهٔ از حسن او ماروت را

(۹) ان سب باتوں کے علاوہ صحبت اور سو سائٹی کا لحاظ بھی مد نظر رکھنا چاھئے ' جس زما نے میں ' حافظ ' نے شیراز میں ھوش سنبھا لا - اس وقت سے لے کر آ خر تک تمام بادشاہ اھل سنت تھے - یعنی ' ابو اسحاق ' ' ابو مظفر ' - ' شاہ شجاع ' اور ' شاہ منصور - تمام علماء سنی تھے - قاضی مولا نائے معظم مجد الدین ' اسمعیل ' اس زما نے میں سنیو ں کی بر گزیدہ ہستیوں میں سے تھے اور سلطان محمد ' خدا بندہ ' جس نے مسلمان ھوکر شیعہ مذھب اختیار کر لیا تھا - انھیں کے ھاتھوں سے اھل سنت کے فرقے میں داخل ھوے * —

ان کی وفات سنہ ۷۵۶ ھ میں ھوئی ھے - ' حافظ ' نے ان کی وفات پر یہ قطعہ لکھا :—

مجد دیں سر ور سلطان قضا اسمعیل — کہ زدے کلک زباں آ ورش از شرع نطق
ذات ھفتہ بد واز ماہ رجب پنجم روز — کہ بروں رفت از ایں منزل بے ضبط و نسق
کنف رحمت حق منزل اوداں ا نگہ — سال تاریخ وفاتش طلب از ' رحمت حق '

(دیکھو دیوان حافظ صفحہ ۴۴۸ - ۴۴۹)

کیا کوئی شیعہ ایسے پکے سنی عالم کی تعریف کر سکتا ھے ؟ —

پھر ان کے علاوہ ' بہاءالدین' شیراز کے قاضی تھے ' جب انھوں نے وفات پائی تو حافظ نے مندرجۂ ذیل قطعہ لکھا :—

بہاءالحق ' والدیں ' طاب مثواہ — امام سنت و شیخ جماعت
چومی رفت ازجہاں ایں بیت می خواند — بر اھل فضل و ارباب براعت
بطاعت قرب ایزدی تواں یافت — قدم در نہ گرت ھست استطاعت

....

* دیکھو اردو ترجمہ سفر نامۂ ابن بطوطہ جلد اول صفحہ ۲۱۷ - ۱۸ —

ایک شیعہ ایسے لفظ کبھی نہیں کہہ سکتا ۔ " امام سنت و شیخ جماعت " کا مصرع اس بات کا صاف صاف فیصلہ کئے دیتا ہے ــــ

مگر ان کا حافظ قرآن ہونا ہی سب سے بڑی دلیل ہے کہ وہ شیعہ نہیں تھے ۔ شیعوں کے نزدیک قرآن مجید کو حفظ کرنا' قرآن مجید کی بے ادبی کرنا ہے ۔ دوسری یہ دلیل ہے کہ وہ صوفی تھے ۔ اگرچہ بعض لوگوں کے نزدیک انہوں نے جوانی کی عمر میں رنگ رلیاں منائی ہیں لیکن اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ کسی نہ کسی وقت تصوف کے دائرے میں ضرور داخل ہوے ہیں ۔ شیعوں کے نزدیک تصوف بالکل الحاد کا حکم رکھتا ہے ۔ سلطنت صفویہ میں یہ خیال کم ہو گیا تھا' کیونکہ سلطنت صفویہ کے بانی کے اجداد صوفی ہی تھے ۔ تاہم اسی زمانے میں ایک شاعر نے یہ شعر لکھا ہے :ــ

این کلام صوفیان شوم نیست ۔ مثنوی مولوی روم نیست

لیکن' حافظ' صفوی خاندان سے ایک ڈیڑھ صدی پہلے ہوے تھے ۔ اس وقت تو صوفی اور ملحد ایک ہی سمجھے جاتے تھے ۔ اس لئے حافظ کسی طرح بھی شیعہ نہیں کہے جا سکتے ــ

ــــ:*:ــــ

مولانا وحید الدین "سلیم" مرحوم

مولانا سلیم کے انتقال سے اُردو ادب کی صف میں ایک ایسی جگہ خالی ہوگئی ہے جس کا پر کرنا آسان نہیں - جامعۂ عثمانیہ ہی کو اُن کا جانشین ملنا مشکل نہیں بلکہ اب اُن جیسا ادیب سارے ملک میں کوی نظر نہیں آتا - وہ ایک جامع حیثیات شخص تھے - عربی اور فارسی کے جیّد عالم تھے ' اُردو زبان پر ان کی وسیع نظر تھی؛ خاص کر نئے الفاظ کے بنانے میں اُنھیں بہت بڑا ملکہ تھا - اُن کی کتاب "وضع اصطلات علمیہ" ایک حد تک ان کی وسعت نظری اور تبحر کی شاھد ہے - وہ اعلیٰ درجے کے نثار تھے اور شعر بھی خوب کہتے تھے - شاعری اُن کی زور طبیعت کا نتیجہ تھی' بعینہ جیسی مولوی نذیراحمد مرحوم کی شاعری' لیکن "سلیم" مرحوم ان سے سبقت لے گئے تھے - اُن کی قلم اور آواز میں بڑا زور تھا - اُن کے چہرے سے اُن کی طباعی اور ذھانت معلوم ھوتی تھی - یہ سب باتیں بھی مولوی نذیر احمد سے ملتی جلتی تھیں —

مرحوم نے عمر بھر یاتو طالب علمی کی یا علم و ادب کی خدمت - علاوہ ایک بلند پا یہ ادیب ھرنے کے وہ اعلیٰ درجے کے اخبار نویس بھی تھے - مسلم گزٹ کے پرچے جن صاحبوں نے بہ غور پڑھے ھیں ' انھیں معلوم ھے کہ ایسے زبردست مضامین معاملات وقت پر کسی دوسرے اخبار میں نہیں نکلے - علی گڑہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ
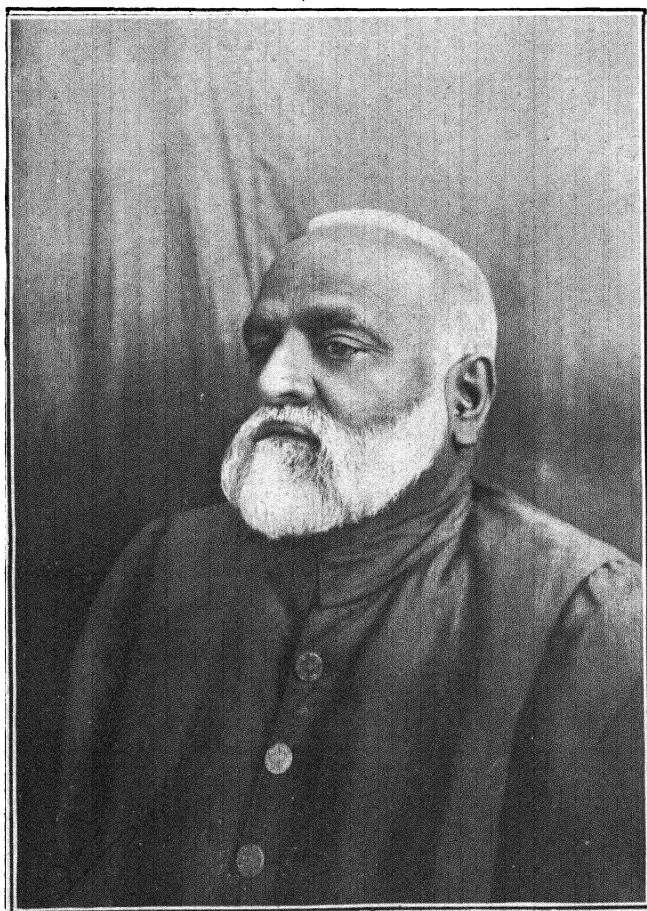
مولوی وحیدالدین ' سلیم ' مرحوم

کو جب انھوں نے اپنے هاتهه میں لیا تو اُس کی کایاپلٹ دی ؛ یاتو وہ ایک مردہ اخبار تھا یا دفعةً زندہ ھو گیا - اُن کا رسالۂ معارف اُردو کے اُن چند رسالوں میں ھے جنھوں نے ملک میں علمی ذوق پیدا کر کے زبان کی حقیقی خدمت کی ھے - وہ کسی رنگ میں ھوں ، تھے وہ ادیب ھی : سیاسیات کا انھیں کوئی ذوق نہ تھا ؛ البتہ ھندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے —

مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف‌الطبع تھے ، یہاں تک کہ بعض اوقات ظرافت میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے - مگر بڑے سادہ طبیعت کے آدمی تھے - مصلحت ، سلیقے اور صفائی کا داغ ان کے دامن پرنہ تھا ، جو جی میں آتا کہہ بیٹھتے تھے اور جو چاھتے کر گزر تے تھے ، جہاں کسی نے غلطی کی فوراً ٹوک دیتے تھے - کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کا محل و موقع بھی ھے یا نہیں - یہی وجہ ھے کہ جو لوگ ان کی طبیعت سے واقف نہ تھے ، اُن کی باتوں سے اکثر ناراض ھو جاتے تھے - جس طرح باوجود زبردست اخبار نویس ھونے کے سیاسیات کا ذوق نہ تھا ، اسی طرح باوجود زبردست عالم وفاضل ھونے کے مذھب سے بیگا نہ تھے - یہ ذوقی چیز ھے اسے علم و فضل سے کوی واسطہ نہیں —

جس طرح اُنھیں طالب علمی میں مولانا فیض الحسن جیسے بے مثل ادیب اُستاد ملے ، اسی طرح اس کے بعد سرسید اور مولانا حالی جیسے عالی خیال پیشوا بھی نصیب ھوے - ان بزرگوں نے اُن کے خیالات اور ادب پر بہت بڑا اثر ڈالا - مگر وہ عمر بھر طالب علم ھی رھے ؛ مصلحت وقت اور زمانہ شناسی اُن کے نصیب میں نہ تھی اور جو کبھی بد نصیبی سے انھوں نے اس کوچے میں قدم رکھا تو پہلے ھی قدم میں لغزش کھای - اس چیز کے لئے کچھہ تو فطری مناسبت ھونی چاھئے اور کچھہ صحبت اور تجربہ - ان میں سے اُن کے پاس کچھہ بھی نہ تھا —

اُن کے دوست بہت کم تھے ' شاید دو چار ہی ہوں ' مگر جن کے دوست تھے دل سے تھے - لیکن ساتھ ہی بہت سرنج و سرنجاں تھے ' کسی کو حتی المقدور ناراض نہیں ہونے دیتے تھے - خود خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھنا چاہتے تھے - بہت بے تکلف تھے اور خوب باتیں کرتے تھے اور خوب ہنستے اور ہنساتے تھے —

اس میں شک نہیں کہ جامعۂ عثمانیہ کو مولانا سے بہتر پروفیسر نہیں مل سکتا تھا - شاید قدرت کو یہ منظور تھا کہ جس یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہے وہاں اُردو کا پرو فیسر بھی ایسا ہی ہونا چاہئیے جو اس کی شان اور ضرورت کے مناسب ہو - انہوں نے اس جامعہ کے طلبہ میں جو علمی اور ادبی ذوق پیدا کیا ہے وہ انہیں کا کام تھا ' اور یہ بہت بڑا احسان ہے - تعلیم کا اصل منشا ذوق پیدا کرنا ہے اور پھر وہ اپنا رستہ خود نکال لیتا ہے —

مرحوم کی طالب علمی کا زمانہ بہت عسرت میں گزرا اور آخری زمانہ جو فارغ البالی کا تھا وہ بھی ' افسوس ہے کہ عسرت ہی میں بسر ہوا - اُنھیں اپنی فارغ البالی سے کچھ لہنا نہ تھا -گو ان کی عمر زیادہ تھی' شاید (اڑستھہ - کے لگ بھگ) لیکن اُن کے قویٰ ایسے اچھے تھے کہ بہت دنوں اور جی سکتے تھے' لیکن - انہوں نے کبھی صحت وصفائی کا خیال نہ رکھا اور نہ کبھی اپنے کھانے پینے کا کوی معقول انتظام کیا - وہ ان چیزوں کو جانتے ہی نہ تھے - یہی اُن کی بیماری اور بالآخر ان کی موت کا باعث ہوا —

انجمن ترقی اُردو اور خاص کر رسالۂ اُردو سے انھیں خاص لگاؤ تھا - اُن کے بعض بہترین مضامین " اُردو " میں شائع ہوے ہیں - مولانا شرر مرحوم کے انتقال پر جب انجمن نے مرحوم کے نام سے " اُردو " کے بہترین مضامین کے لئے مستقل طور پر سالانہ تین انعامات کی تجویز کی تو سب سے پہلا انعام جو دوسو روپے کا تھا' مولانا نے خود ہرسال دینا منظور فرمایا - وہ صرف ایک سال دینے پائے تھے کہ دوسرے سال

خود اس دنیا سے منہ موڑ کر چلے گئے - قطع نظر اس کے کہ وہ میرے مہربان اور شفیق دوست تھے اور مجھے ان کی موت کا بیحد رنج ہے، میں اُن کی موت کو قومی حادثہ سمجھتا ہوں- اُن کے ہونے سے ہمیں بڑا سہارا تھا - ہر علمی اور ادبی کام میں ہم ان کا نام سب سے پہلے شریک کرتے تھے، اب جو وہ نہیں ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوت کم ہوگئی ہے —

حقیقت یہ ہے کے مولانا جیسی طبیعت اور ذہانت اور جدت کے بہت کم لوگ ہوتے ہیں - اُن کی تحریر میں بڑی قوت تھی اور حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا، بات کی تہ کو خوب پہنچتے تھے اور زبان کے تو استاد تھے -جدید تعلیم نہیں پائی تھی، مگر مغربی تعلیم کا جو منشا ہے اُس سے ایسے واقف تھے کہ بہت کم جدید تعلیم یافتہ واقف ہونگے - انگریزی نہیں جانتے تھے، مگر جب انگریزی سے اردو میں اصطلاحات یا الفاظ ترجمہ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی تو انگریزی داں بھی اُن کی واقفیت کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے - وہ الفاظ کے کینڈوں اور اُن کی فطرت کو خوب سمجھتے تھے اور لفظوں کی تلاش یا نئے لفظوں کے بنانے میں کمال رکھتے تھے - اور لفظ ایسے موزوں اور جملے بناتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے دماغ میں سانچے بنے بنائے رکھے ہیں، جن میں سے الفاظ ڈھلتے چلے آرہے ہیں —

ہمیں ان کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہئے - ہم میں سے کتنے ہیں جنھوں نے مرحوم کی طرح اپنی ساری عمر علم و ادب کی خدمت میں وقف کردی ہو - اس راہ میں مخدوم بننا آسان ہے، مگر خادم ہونا بہت دشوار - انھوں نے محض اپنی محنت اور قابلیت سے یہ درجہ پایا - ایک غریب لڑکا جس کے پاس پڑھنے کو کتابیں اور بھر پیٹ کھانے کو روٹی نہ تھی، وہ اپنی ہمت اور شوق اور اپنے علم و فضل کے زور

سے ایسا ہوا کہ آج اس کی موت پر ایک بڑے طبقے کو حقیقی رنج اور افسوس ہے' اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو علم ادب کا ایک ستون گر گیا ۔ اُن کی زندگی صاف بتاتی ہے کہ شوق اور محنت عجیب چیز ہیں - جسے ہم کمال کہتے ہیں وہ انھیں دونوں کا خانہ زاد ہے —
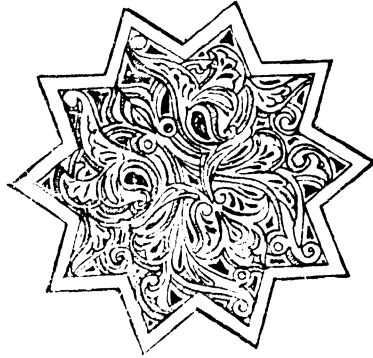
آفتاب ادب کا غروب

از

(جناب مولوی سید سراج الحسن ترمذی صاحب)

باغ جہاں میں کھلتے ہیں گل کتنے جا بجا
بو بھی نہیں سنگھا تی ہے جن کی کبھی صبا
کتنے گہر ہیں گرد یتیمی میں مبتلا
آئینے خاک میں ہیں پڑے کتنے بے بہا
ہیں بے نشان کتنے نگیں ہائے نام دار
حیران جن کو دیکھہ کے ہو عقل سادہ کار

(بشن نرائن در)

جنگل اور باغ کے درختوں کو قدرت خوبصورت پھولوں اور پھلوں سے مزین کرتی ہے - رنگ برنگ کے طیور شاخوں پر نغمہ خوانی کر تے ہیں - سیپیوں کے اندر سے بے بہا موتی اور پتھروں سے بیش قیمت جوا ہرات نکلتے ہیں - علم و فضل کے معدن سے بڑے بڑے عالم ' فلسفی اور شاعر پیدا ہو تے ہیں - کائنات نت نئے روپ میں نظر آ تی ہے 'لیکن یہ سب نظر کا تماشا ہے ' اس سرائے فانی کی ہر شے آنی جانی ہے ' بقا صرف اُس ایک ہستی کو ہے ' جس کا ملک قدیم اور جس کی ذات بے پروا ہے —

اس میں شک نہیں کہ دنیا نے بے شمار لباس اس وقت تک اتارے اور معلوم نہیں یہ لیل و نہار کب تک رہے، لیکن اس زال کی آغوش میں جو واقعات کہ خاکی سرشت انسان کو پیش آئے اور آتے ہیں، اپنے ادراک و فہم کے لحاظ سے ان پر ہنستا اور روتا ہے اور یہ سلسلہ تا قیام ارض و سما یوں ہی رہے گا —

تاریخ عالم پر اگر نظر ڈالی جائے اور اقوام دہر کی ساخت اور اُن کے عروج و زوال کا انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو رنج و الم، مسرت و انبساط کی تصویریں دوش بدوش نظر آئیں گی —

قوموں کی بیداری کو شاعری اور ادب سے گہرا تعلق رہا ہے - یونان کی تاریخ اگر ملاحظہ فرمائینگے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ قوم کے رزم و بزم دونوں میں انہیں کی جلوہ گری رہی ہے - دور کیوں جائیے خود عربوں کو دیکھہ لیجئے، زمانۂ جاہلیت اور نیز بعثت کے بعد سے عرب کے شعرا اور فصحا نے قوم کو اُبھار نے اور زندہ کر نے میں جو نمایاں کام کئے ہیں اگر اُن پر فلسفیانہ نظر ڈالی جائے تو ایک مبسوط تاریخ مرتب ہو سکتی ہے - ہر قوم اپنے فرزندان نامور کی مفارقت دائمی پر جس کا واسطہ در اصل اس کی حیات و ممات سے ہو تا ہے، اُن کے کا رنامے یاد کر کے آنسو بہاتی اور یادگاریں قائم کر تی ہے - یہ رسم نئی نہیں ہے بلکہ قدیم الایام سے چلی آ تی ہے —

ہم جس بزرگ ہستی کے متعلق یہ سطریں حوالۂ قلم کر رہے ہیں، اس کے احسانات ہندی لٹریچر یعنی ادب اُردو پر بہت ہیں - یہ ہماری قومی بد نصیبی ہے کہ اس قحط رجال کے دور میں مولانا سید وحید الدین صاحب ' سلیم ' پانی پتی رحمۃاللہ علیہ، جن کی ذات گرامی سے تشنہ کام اُردو کو بہت تقویت تھی، ہم سے ایسے وقت جدا ہوے جب کہ ہمیں ان کی سخت ضرورت تھی —

ہندوستان کے ادیب اور اُردو انجمنیں جس قدر اس قومی نقصان پر

ماتم کریں کم ہے - بزم اردو کا یہ صدر نشین جس کے قلم کی جنبش نے ملک میں ایک غلغلہ بلند کر رکھا تھا اعزا اور احباب سے رخصت ہو کر سلیم آباد کی وادی خموشاں میں آرام فرما ہے - سر سید، حالی، محسن الملک، شبلی اور نذیر احمد کی روحیں اس سے بغلگیر ہو رہی ہونگی - گو وہ بظاہر ہم میں نہیں لیکن اُس کی زندگی کا اٹل اور غیر فانی کا رنامہ مرور ایام سے بے خطر ہے —

ادب اردو سے ذوق رکھنے والوں میں کون ایسا ہے جو مولانا 'سلیم' کے نام نامی سے واقف نہ ہو - مولانا کی تاریخ ولادت تو ہمیں معلوم نہیں البتہ اتنا علم ہے کہ وہ پانی پت میں پیدا ہوے تھے - غریب مگر شریف خاندان کے فرزند تھے - نسباً آپ سید تھے - آپ کے والد حاجی سید فریدالدین صاحب بڑے عابد و زاہد بزرگ تھے- فقرا سے خاص عقیدت رکھتے تھے - حضرت بوعلی شاہ صاحب قلندر رحمۃاللہعلیہ کےمزار اقدس کی تو لیت بھی آپ کے سپرد تھی، جب مولاناغوث علی شاہ صاحب بہاری وارد پانی پت ہوےتو حاجی صاحب نے ان کو اپنا مہمان بنایا اور خوب خدمت کی- اسی نسبت سے حاجی صاحب کے انتقال کے بعد حضرت غوث علی شاہ رحمۃاللہعلیہ نے جناب 'سلیم' کو اپنے آغوش عاطفت میں لےلیا اور آپ کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ فرمائی—

طفولیت ہی سے آپ کی پیشانی پر ستارۂ علم و فضل روشن تھا - قدرت نے وہ ذہانت و فراست عطا کی تھی کہ کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے - قدیم زمانے میں تعلیم و تربیت کا گہوارہ مکتب ہوا کرتے تھے، اور اُستاد و شاگرد کا تعلق باپ بیٹے کاسا ہوتا تھا - جتنے اُستاد اس جوہر قابل کو ملے سب نے اُسے آنکھوں میں جگہ دی - نہایت کم عمری میں قرآن حفظ کیا، شفیق اُستادوں سے مکتب میں اُردو فارسی پڑھی، بارہ برس کی عمر میں خدا داد ذہانت اور محنت شاقہ سے فارسی میں اتنی استعداد حاصل کرلی تھی کہ آج کل کے بی - اے اور ایم - اے کے طلبہ کو بھی کم نصیب ہوتی ہے - اُردو کی چھٹی جماعت میں اتنی قابلیت تھی کہ مڈل اورانٹرینس کے طالب علم مکان پر آکر حضرت 'سلیم' سے فارسی میں درس لیتے تھے - درجہ بدرجہ ترقی

کرکے جب مڈل میں پہنچے تو یونیورسٹی کے امتحان میں سارے صوبے میں اول آئے۔

صغر سنی سے شعر و شاعری کے ساتھہ فطری لگاؤ تھا اور گیارہ برس کی عمر میں خاصے شعر موزوں کر لیتے تھے - اُس زمانے میں پانی پت میں شعر و سخن کا چرچا گھر گھر تھا ' آئے دن شہر میں مشاعرے ہوا کرتے تھے ' سلیم صاحب کی دھوم مچی ہوئی تھی ' اپنے ہم عمر لڑکوں کو غزلیں لکھہ کر دے دیا کرتے تھے ' خود بھی مشاعروں میں جاتے اور اپنی ٹولی والوں کو بھی لے جایا کرتے تھے' مشاعرے اچھے خاصے دنگل ہوا کرتے تھے' جہاں پہلوانان سخن اپنے اپنے زور دکھاتے تھے —

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ بعض اوقات ایک ایک نشست میں سو سو دو دو سو شعر کہہ ڈالتے تھے ' اور انھیں اشعار میں سے دوسروں کا تخلص ڈال کر غزلیں نکال کر دے دیتے تھے - تیرہ برس کی عمر میں عام شعرا میں ممتاز حیثیت پیدا کرلی تھی - ھنوز چودھواں سال تھا کہ ایک شب حضرت مولانا غوث علی شاہ صاحب قدس سرہ کی شان میں قصیدہ لکھنے بیٹھے ' مگر کوئی شعر موزوں نہ ھوسکا ' بالآخر چہارشنبے کی شب میں قصیدے کی پھر فکر کی اور واردات کا یہ عالم تھا کہ دو بجے رات تک ایک سو ایک شعر کا نہایت فصیح و بلیغ قصیدہ فارسی میں تصنیف کرلیا - صبح کو جب مریدین اور معتقدین دربار غوثیہ میں حاضر ہوے' سلیم‌صاحب بھی اپنا قصیدہ جیب میں ڈال کر پہنچے ' تقاضاے عمر کی وجہ سے جھجکنے لگے - حضرت نے فرمایا کہ " بھئی ! تم اپنا قصیدہ کیوں نہیں پڑھتے - جیب میں کب تک رکھوگے ؟ اس اشارے پر قصیدہ جیب سے نکالا ' اور بہ آواز بلند پڑھنا شروع کیا -

اس بزم میں بڑے بڑے ادیب اور علما موجود تھے ' کبھی مولانا سلیم کا چہرہ دیکھتے اور کبھی اشعار کی بلاغت پر غور کرتے ان کی حیرت بھی بجا تھی 'چودہ سال کی عمر کا لڑکا اور ایسے زبردست قصیدے کی تصنیف ! حضرت نے مکاشفے سے دریافت فرمالیا کہ لوگوں کو اس کمسن لڑکے کی تصنیف میں شک ھے ' اس قصیدے میں فلسفہ 'ھیئت ' اور دیگر علوم کی زبردست اصطلاحیں ھیں' حسب الارشاد

جناب سلیم نے جب اصطلاحوں کی تشریح ' اور نکات بلاغت بیان کرنا شروع کئے ' تو لوگوں کی زبان سے احسنت و مرحبا کی صدائیں بلند ہوئیں —

یہ قصیدہ تذکرۂ غوثیہ میں من و عن موجود ہے —

سایۂ پدری سر سے اُٹھ چکا تھا ' قصیدہ پڑھ کر آبدیدہ ہوے دل میں خیال آیا کہ باپ زندہ ہوتے تو آج دیکھ کر باغ باغ ہوتے ' حضرت پر یہ منکشف ہوگیا اور آپ نے فرمایا " بیٹا خدا تو نہیں مرا " دست شفقت سر پر پھیرا جس سے سکون ہوگیا ' ایک اشرفی ہتیلی پر رکھ کر ' سلیم ' صاحب کو نذر دی ' اور ایک زرتار بنارسی چادر بھی عطا فرمائی - نیز مٹھائی کا ایک دونا اُن کے ساتھ کردیا ۔

خاندان پر عسرت کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں ' شوق علم سینے میں موجزن تھا ' کچھ بندوبست کرکے گھر سے باہر قدم نکالے ' سیدھے لاہور پہنچے ' ایک مدرسے میں نام لکھا لیا ' دو روپے وظیفہ ملنے لگا ' ماں کی محبت غالب تھی ' ایک روپیہ ماں کو بھیج دیتے اور اپنے ہفتے بھر کی غذا کا یہ انتظام کرتے کہ تنور کی جلی ہوئی روٹیاں جو نان بائی بے کار سمجھ کر علحدہ رکھ دیتے ہیں ' دو آنے میں خرید لاتے ' اور چاقو سے جلا ہوا حصہ کھرچ کھرچ کر پانی میں بھگو لیتے ' اور نمک ڈال کر صبر و شکر کے ساتھ کھا لیتے تھے - یہ کیفیت تقریباً سال ڈیڑھ سال تک رہی ' جماعت کے سالانہ امتحان میں اول آے ' پانچ روپےوظیفہ ملنے لگا ' دو روپے خود رکھ لیتے اور تین اپنی ماں کو بھیج دیتے تھے ۔ ارزانی کا زمانہ تھا ' دوپیسے کی روٹی ایک وقت اور دو پیسے کی دوسرے وقت نان بائی کی دکان سے خرید کر کھا لیتے تھے ' روٹی کے ساتھ اکثر دال اور کبھی کبھی کوئی اور سالن بھی مل جاتا تھا - کپڑے اپنے ہاتھ سے نہر پر جاکر دھو لیتے تھے ' طالب علمی کا ابتدائی دور حضرت ' سلیم ' نے اس طرح ختم کیا —

ذہانت و قابلیت قدرت نے ودیعت کی تھی ' حوصلہ بلند تھا ' "منشی فاضل" کا امتحان دیا ' تمام پنجاب میں اول آے - اُردو میں مضمون نگاری کا جو پرچہ

آیاتھا - اس کا جواب نہایت بلیغ نظم میں لکھ دیا ، فاضل ممتحن بہت مسرور ہوا اور یہ نظم اس نے اخبار میں شائع کرادی ، اور لکھا کہ "دنیا میں اس قابلیت کے لوگ بھی موجود ہیں کہ " منشی فاضل " کے امتحان میں مضمون کے جواب میں ایسی پاکیزہ اور برجستہ نظم لکھ سکتے ہیں " —

درس نظامیہ کی تکمیل کا شوق ہوا تو مشہور علماء سے (جن میں مولانا فیض الحسن صاحب سہارن پوری اور مولانا عبد اللہ صاحب ٹونکی کے نام نامی بھی شریک ہیں) مختلف علوم حاصل کئے ، اور پانی پت کے مشہور محدث مولانا راغب اللہ صاحب سے بھی حدیث کا درس لیا ، طب کی بھی تکمیل کی —

اس زمانے میں ڈاکٹری اردو میں پڑھائی جاتی تھی ، کچھ دنوں تک ڈاکٹری بھی پڑھی - انھیں ایام میں آپ کے ماموں گورکھپور میں سب انسپکٹر ہو گئے تھے ، انھوں نے " قانون " کی طرف راغب کیا ، ذہن رسا تھا ، دماغ میں کسی شے کی کمی نہ تھی ، قانون بھی پڑھنے لگے - ہنوز یہ شغل جاری تھا کہ ماموں کا سایۂ عاطفت بھی سرسے اُٹھ گیا ، بالآخر وطن کی راہ لینی پڑی —

ایک دوست کی سعی و وساطت سے " ایجرٹن کالج " بھاولپور کے اسٹاف میں شریک ہو گئے اور کئی سال تک قابلیت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے - جنرل عظیم الدین خاں نے جو مولانا کے بڑے قدر داں تھے ، انھیں رام پور بلا لیا ، اور ہائی سکول میں ہیڈ مولوی کی خدمت سپرد کی . یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہ چلا ، اس لئے کہ جنرل صاحب کے دفعۃً قتل ہوجانے کے سبب سے جلد مراجعت کرنی پڑی - گردش تقدیر سے یہاں سے جاکر مولانا تشنج کے مرض میں مبتلا ہوے اور کئی سال فریش رہے - بعد صحت مولانا حالی انھیں اپنے ہمراہ علی گڑھ لے آے —

اُن ایام میں سر سید کو اپنی تفسیر اور دیگر قسم کے علمی کاموں کے لئے ایک قابل نوجوان کی ضرورت تھی ، مولانا 'حالی' نے سلک سید میں اس دُرِ بےبہا کا اضافہ کرادیا - چھ سال تک شب و روز سید صاحب کی خدمت میں لٹیریری اسسٹنٹ کی حیثیت

سے رھے اور تفسیر کے لکھنے میں اُنھیں خوب مدد دی - بزم سید میں خاص وقعت اور ممتاز نظروں سے دیکھے جاتے تھے —

تصنیف و تالیف کے سلسلے کے علاوہ مسلمانوں کی دنیوی ترقی کو معراج پر پہچانا ' سید صاحب کا خاص نصب العین تھا - ضرورت داعی ہوئی کہ اس مقصد کی اشاعت کی جاے ' غدر کے بعد سر سید نے تہذیب الاخلاق پھر جاری کیا - یوں تو اس رسالے میں لکھنے والے بہت سے تھے ' مگر سرگرم لکھنے والوں میں سر سید' محسن الملک ' اور چراغ علی' کے ساتھہ حضرت 'سلیم' کا بھی نام نامی آتا ھے - تہذیب الاخلاق کے فائل آج بھی مولانا کے مضامین سے مزین ھیں —

تہذیب الاخلاق کی وفات کے بعد ' جس نے قوم کی سوتی ہوئی دماغی اور اخلاقی قابلیتوں میں ایک تحریک پیدا کردی تھی ' ایک ایسے رسالے کے وجود کی ضرورت تھی ؛ جو زور اور صداقت ' آزادی اور متانت کے ساتھہ قوم کی ترجمانی کرے - یہ معمولی کام نہ تھا ' اِس کے لئے ایک قابل ' تجربہ کار ' اور قوم پرست اڈیٹر کی ضرورت تھی ' چنانچہ اس کا قرعہ جناب ' سلیم ' کے نام پر پڑا ' اور اُفق علیگڈھ پر 'معارف' جلوہ گر ھوا ' جس نے اپنی قوت جاذبہ سے سارے ملک کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور سنہ ۱۸۹۸ ع سے لے کر کئی سال تک آب و تاب کے ساتھہ ضو فشاں رھا—

'معارف' نے قوم کی اندرونی خرابیوں' اور بیماریوں کا بہترین طریقے پر علاج کیا' اُردو ادب ' اور شاعری سے صحیح طور پر روشناس کیا ' اور ملک میں ' ادب کا اعلیٰ مذاق پیدا کیا —

اگر سرسید نے ایک خاص 'انشا' کی بنا ڈالی تھی ' تو یہ کہنا بیجا نہ ھوگا کہ اُس پر عمارت حضرت ' سلیم ' نے تعمیر کی تھی - گُلشن اُردو کی کیاریاں سینچنے میں 'معارف' نے بڑی عرق‌ریزی کی ھے' آج جو ھم میں انشا پرداز اور شاعر نظر آتے ھیں ' یہ سب اسی شجر کہنہ کے شاخ و ثمر ھیں —

' معارف ' کا علم جب سرنگوں ہوا تو محسن الملک نے مولانا کی خدمت میں علی گڈھ گزٹ کی ادارت پیش کی اور یہ خدمت بھی قابلیت و مستعدی کے ساتھہ سالہا سال تک مرحوم نے انجام دی ' کالج میں بھی کچھہ دنوں تک فارسی کے اُستاد رہے - غرضکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں 'سلیم' نے نا موری حاصل کی ' اور ان کا شمار ہندوستان کی یگانۂ روز گار ہستیوں میں ہونے لگا —

'شبلی ' اور 'سلیم ' کالج میں تقریباً ایک ہی جگہ رہتے تھے اور 'حالی' بھی کبھی کبھی آ جا تے تھے ' آ پس میں تعلقات بھی خوشگوار تھے - ' سلیم ' مرحوم مولوی شبلی کی مورخانہ تحقیقات پر اکثر نقد فرمایا کر تے تھے ' پہلے تو مولانا چیں بجبیں ہو تے مگر بحث و مباحثہ کے بعد جو بات سچ ہوتی ' اس کا اعتراف بھی فرما لیتے تھے ' حیف اب نہ وہ ساقی ہے نہ وہ مے نوش' اس بزم کی 'سلیم' آخری شمع تھے' افسوس وہ بھی نہ رہے! —

حضرت ' سلیم ' بےشک وریب ادب کے آ فتاب تھے' وہ اس زمانے کی یاد گار تھے جسے آ سمان نے بہت سی گردشوں کے بعد پیدا کیا تھا —

نثر و نظم دونوں پر انھیں ایک ہی سی قدرت حاصل تھی ' ایسے ایسے نادر مضامین ' اور پاکیزہ نظمیں مرحوم کی قلم سے نکلی ہیں جنھیں " روح ادب " کہنازیبا ہے - مرحوم زبان اردو کے محقق ہی نہ تھے' بلکہ سیاسیات کے بھی زبردست معلم تھے - جب کبھی کسی سیاسی مسئلے میں ان سے گفتگو ہوتی تو ان کے تبحر علمی اور اصابت رائے کا صحیح حال معلوم ہوتا تھا —

" کان پور " کی مچھلی بازار والی مسجد کے واقعے کو ابھی بہت دن نہیں گزرے ' اُس پر آشوب زمانے میں بڑے بڑے لوگوں کا ایمان متزلزل ہوگیا تھا ' مگر مولانا ' سلیم ' ایک سخت چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے ' —

سنہ ۱۹۱۳ ع میں جب مسلم گزٹ مرحوم کا قلمدان ادارت مولانا کو تفویض ہوا تو مسلمانوں کی پولیٹیکل روش کے متعلق کوئی انقلابی خیال اُن کے پیش نظر

نه تھا؛ لیکن اُس وقت ایسے اسباب جمع ہوگئے تھے که مولانا کو رفتار زمانه کے ساتھه اصلاح و تغیر کی صدا بلند کرنی پڑی' اور بالآخر مسلم گزٹ کے اسلحه خانه سے آزادی رائے اور حریت فکر کی ایسی خون آ شام تلواریں نکلیں' جنھوں نے باطل پرستوں کی صفوں کو اُلٹ دیا —

''مسلم گزٹ'' نے اپنی یک ساله زندگی میں ایسی مقبولیت حاصل کرلی تھی که اس کی اشاعت برق کی طرح تمام اکناف ملک میں پھیل گئی تھی' اور اس کی آمد کے انتظار میں لوگ بے چین رہا کرتے تھے —

صداقت پرستی' اور قوم کی صحیح نمایندگی کی بدولت حکومت کے زبردست پنجوں نے ''مسلم گزٹ'' کی ادارت ان کے هاتھه سے چھین لی تھی' لیکن جب تک عنان ادارت اُن کے هاتھه میں رهی' ملک و ملت کی وہ ترجمانی کی' جس کی نظیر آسانی سے نہیں مل سکتی —

''مسلم گزٹ'' مرحوم اُن کے جذبات حریت اور انشاپردازی کا بہترین آئینه هے' جب کبھی اُردو کے اسالیب پر کسی محقق کا قلم اُٹھے گا تو 'سلیم' کی انشا اُسے بہت بلند نظر آئے گی —

''مسلم گزٹ'' سے تعلق منقطع هونے کے تھوڑے دنوں بعد مولانا کی خدمت میں ''زمیندار'' کی چیف اڈیٹری پیش کی گئی' اور اُس کے هاتھه میں لیتے هی مولانا نے ''زمیندار'' کو چار چاند لگادیے! - کلک سلیم نے وہ جولانیاں دکھائیں که چند هی روز میں ''زمیندار'' کی اشاعت بیس هزار روزانه تک پہنچ گئی' اور اسٹیٹسمین کے بعد ''هندوستان'' کے تمام اردو' هندی' اور انگریزی' جرائد سے نمبر لے گیا' مگر گردش فلک کب چین لینے دیتی هے' باد سموم کے جھونکے چلنے لگے' صداقت و حریت کے باغ پر خزاں حمله آور هوئی' ''زمیندار'' ''استبداد'' کے شکنجے میں کسا گیا' مطبع پر ضابطۂ تعزیرات قابض هو گیا' مولانا نے لاهور کو الوداع کہا' اور پانی پت واپس تشریف لے آئے —

جناب "سلیم" نے اردو کی ٹکسال سے ایسے بے مثل سکے ڈھال کر چلائے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ یہ سکے دلی کے ہیں یا لکھنؤ کے؟ نئے الفاظ کا ذخیرہ جو اُردو کے روزمرہ میں شیر و شکر ہو رہا ہے اور جسے بے تکلف ہم استعمال کرتے ہیں، حضرت "سلیم" کا بہت کچھ رہین منت ہے! معلوم نہیں کتنے الفاظ انہوں نے وضع کئے اور چلادیے —

وضع "اصطلاحات علمیہ" جو "انجمن ترقی اُردو" کی ملک ہے، مولانائے مرحوم کی چہل سالہ کاوش دماغی کا نتیجہ ہے - جو زرین اصول اُس میں ثبت ہیں، ذوق ادب رکھنے والوں کے لئے مشعل ہدایت کا حکم رکھتے ہیں—

علم و فضل کا یہ گوہر شب چراغ اگر سر زمین یورپ میں ضیاگستر ہوتا تو آج اس کی حیات و ممات پر اخبارات کے سیکڑوں صفحات ماتم میں سیاہ کیے جاتے اور معلوم نہیں کس کس طرح سے یادگاریں قائم کی جاتیں، مگر افسوس! "ہندوستان" جہاں اہل ہنر کے منہ موتیوں سے بھرے جاتے تھے، آج ایسا بے حس ہوگیا ہے کہ اپنے لائق ترین فرزندوں کی بھی قدر نہیں جانتا، خدا بھلا کرے مولوی عبدالحق صاحب کا، کہ ان کی توجہ سے مرحوم کی یہ بے مثل کتاب طبع ہوگئی، ورنہ صدہا نادر کتابوں کی طرح یہ بھی کیڑوں کی نذر ہوجاتی —

"سلیم" صاحب کی تمنا تھی کہ "فرہنگ آصفیہ" کی از سر نو ترتیب دی جاے اور ہندوستان کے مشہور ادیب اس کام میں شریک ہوکر، اس کے رطب و یابس پر غور کریں، اور حشو و زوائد سے پاک کرکے، کتاب کو جدید و قدیم الفاظ اور بہت سے محاورات سے جو نظر انداز ہوگئے ہیں، مزین کرکے از سر نو طبع کرایا جاے - اس میں شک نہیں کہ تجویز خوب تھی، مگر وقت اور سرمایے کا سوال تھا، "سرکار آصفیہ" اگر سرپرستی نہ فرماتی تو یہ فرہنگ موجودہ خط و خال کے ساتھ منصۂ شہود ہی پر نہ آتی —

شاعری مولانا "سلیم" کے لئے ذریعۂ عزت نہ تھی، اپنے نام کے ساتھ اُسے منسوب

کرنا فخر نہ سمجھتے تھے، در حقیقت وہ جامع حیثیت بزرگ تھے۔ ادب، فلسفہ، تاریخ، جغرافیۂ اسلام، اور دیگر علوم میں اُنھیں کامل دستگاہ تھی، اور یہی وجہ ہے کہ جب کبھی کسی علمی بحث پر تقریر فرماتے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بحر زخار اُمڈا چلا آرہا ہے —

بے شمار نظمیں "سلیم" نے لکھیں، اُن میں سے کے نام سے اکثر بے نام اور بعض اُن ہندوستان کے مشہور جرائد و رسائل میں شائع ہوچکی ہیں، اس دور ترقیات میں مولانا نے ایسی ایسی نظمیں لکھی ہیں، جو نہ محض ادب اردو کی زیب و زینت رہیں گی، بلکہ اُن میں وہ لطیف اشارے ہیں، جن سے سیاست حاضرہ پر ایک دفتر تیار ہوسکتا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ مرحوم کی نظموں کا مجموعہ اور "نام نامہ" کا مسودہ "انجمن ترقی اُردو" کے روح رواں اور ہندوستان کے مشہور ادیب جناب مولانا عبدالحق صاحب کے قبضے میں آگیا ہے، یقین ہے کہ یہ جواہر ریز، "وضع اصطلاحات علمیہ" کی طرح پبلک کے ہاتوں میں جلد آجائیں گے —

چند سال سے بلدۂ حیدرآباد میں جناب باغ شاگرد حضرت داغ ایک مشاعرہ ترتیب دیتے ہیں، اس مشاعرے میں خاص احباب کے اصرار سے مولانا بھی شرکت فرمایا کرتے تھے، مولانا کی شاعری، گل و بلبل سے بہت دور تھی، اس میں مناظر قدرت، اور معارف ملت کے نمونے بہت ہوتے تھے، بزم مشاعرہ میں جناب سلیم، مولانا علی حیدر طباطبائی، اور مرزا لبیب، خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں، گو اور خوشگو شعرا بھی مشاعرے کو اپنے کلام سے مزین فرماتے تھے، مگر سلیم صاحب کی شاعری اپنے اچھوتے خیال اور پاکیزہ جذبات کے لحاظ سے نہایت بلند پایہ ہوتی تھی —

مولانا زبردست سے زبردست قصائد اُردو، اور فارسی میں لکھکر لوگوں کو دے دیا کرتے تھے، سید علی اکبر بلگرامی مرحوم نے جو 'جشن' بلگرامی کے خلف اکبر تھے، جتنے فارسی کے قصائد حضور نظام (خلداللہ ملکہ) کی بارگاہ میں پیش کئے وہ سب مولانا 'سلیم' کے رشحات قلم کا نتیجہ تھے۔ معتبر ذریعے سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ

بندگان عالی بھی اُن قصائد کو پڑھ کر لطف اندوز ہوتے تھے' کسی کو کیا معلوم کہ پس پردہ ان قصائد کا کون مصنف ہے؟ مجھے مولانا کی خدمت میں تقرب حاصل تھا' میں اس راز سے واقف ہوں' انھیں قصائد کے طفیل میں مرحوم علی اکبر کو تحصیلداری کی مستقل خدمت ملی تھی - سچ یہ ہے کہ مولانا مرحوم بڑے قادرالکلام تھے - مولانا حالی مرحوم' اُن کے طرز بیان اور ندرت خیالات پر اکثر محو ہوجاتے تھے' اور اُنھیں شاعری کا دیوتا فرمایا کرتے تھے' افسوس ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے نہ تو مولانا کی کوئی بیاض ہے اور نہ اُن کے وہ جگر پارے ہیں' جنھیں ہم نے اپنے مخزن میں جمع کر رکھا تھا - ایک کرم فرمانے' جو ہماری کشکول عاریتاً لے گئے تھے' باوجود تقاضوں کے آج تک واپس نہیں کی - مجبوری ہے ورنہ ہم ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے مولانا کا کچھہ کلام ہدیۃً پیش کرتے - انشاءالله مولانا عبدالحق صاحب کی توجہ سے حضرت 'سلیم' کا کلام جلد زیور طبع سے آراستہ ہوجاے گا —

جس طرح جناب "غالب" کا کلام مرنے کے بعد بلند ہوا' اُسی طرح "سلیم" کی شاعری بھی دلچسپی اور قدر سے دیکھی جاے گی' "قدر مردم بعد مردن" —

مولانا کی نثر اُن کی زندگی میں سند مانی جاتی تھی' ان کی شاعری کی کرنیں ہنوز کافی طور سے پھیلنے نہ پائی تھیں کہ ہم سے چھین لئے گئے' جو کچھہ بھی اُنھوں نے کہا ہے وہ ادب اُردو کا لاثانی ذخیرہ ہے —

مولانا اپنے علم و فضل کے ساتھہ' نہایت ہی بزلہ سنج واقع ہوے تھے - طبیعت میں بے ساختگی اور روانی تھی' کہیں رکتے ہی نہ تھے' برجستہ ایسے بلیغ اور تیز فقرے چست کرتے تھے کہ حریف منہ دیکھتا رہ جاتا تھا' ظرافت کس و ناکس کا حصہ نہیں' یہ بڑی خدا کی دین ہے' معانی کا وہ خزانہ قدرت نے اُن کے سینے میں جمع کیا تھا کہ مضامین اور فقرات کا قلزم اُبلتا تھا - "جامعۂ عثمانیہ" کے احباب بالخصوص ڈاکٹر عبدالحکیم جن کی تواضع مولانا اکثر ظرافت سے فرمایا کرتے تھے - ہم سے زیادہ لذت آشنا ہیں - جاہ و شہرت کے طالب نہ تھے' مزاج میں سادگی اور

طبیعت میں استغنا تھا، کبھی کسی کے پاس اپنی حاجت نہیں لے گئے، عہدہ داروں کی دربار داری سے ہمیشہ دور رہے، اُن میں وہ جاذب قوت تھی کہ بڑے اور چھوٹے سب کھنچکر ان کے دروازے پر آجاتے تھے —

پان اور چاے سے مولانا کو بہت شوق تھا، جو آتا تھا اس کی تواضع انھیں دو چیزوں سے فرماتے تھے - پان کھانے کا یہ عالم تھا کہ دمبدم کتھے اور چونے کی چمچیاں چلتی رہتی تھیں، پان کھاتے جاتے تھے اور پیک ان کی قمیص اور اچکن کو رنگین بناتی رہتی تھی - بجاے دھونے کے، پان کے سرخ دھبوں پر اکثر چونہ لے کر اُنگلیوں سے قلعی کردیتے تھے، جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ قمیص اور اچکن میں سفید تھگلیاں لگی ہوئی ہیں - جب کوئی ہندوستان جاتا تو لکھنؤ کے پان اور الہ آباد کے امرودوں کی فرمائش ضرور کردیا کرتے تھے —

چاے پینے کی شان یہ تھی کہ نمک کا ایک ڈلا چاے کی پیالی میں کئی بار گھولا جاتا تھا، اور جب اس میں نمک کی چاشنی آجاتی تو نکال لیتے اور اسی طرح کا جام بہ اصرار ہمنشینوں کو بھی عطا ہوتا تھا، اللہ رے سادگی، جس خلوص اور محبت سے یہ تحفے احباب کی نذر کئے جاتے تھے، اس کی قدر و قیمت کچھ محبت والے ہی جانتے ہیں —

"جامعۂ عثمانیہ" کی تعلیمی کونسل میں جب مسئلہ پیش ہوا کہ ادیب اُردو کی کرسی کس کو دی جاے ؟ تو بالاتفاق یہ طے ہوا کہ بجز مولوی سلیم کے اور کوئی اس کا اہل نہیں ہے —

مولانا کی سعی اور درخواست بغیر، یہ ممتاز خدمت بارگاہ خسروی سے، انھیں کو عطا فرمائی گئی —

نواب سرحیدر نواز جنگ قدر شناس، اور علم دوست بزرگ ہیں، ان کی مساعی جمیلہ، اور مولانا عبدالحق صاحب کے قیمتی مشوروں سے عثمانیہ یونیورسٹی اس آب و تاب کے ساتھہ نظر آتی ہے - حیدری صاحب جانتے تھے اور سمجھتے تھے

کہ حضرت سلیم کی ذات، نہ محض اردو کے لئے مایۂ افتخار ہے، بلکہ وہ اپنی جامعیت کے لحاظ سے یورپ کے بڑے سے بڑے پروفیسر کے ہم پلہ ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب "سیڈلر کمیشن" حیدرآباد میں آیا، اور اُس نے جامعۂ عثمانیہ کی تعلیم وتربیت کا مشاہدہ کیا تو مسٹر سیڈلر کی نظر انتخاب بھی مولانا ہی پرپڑی تھی، اور جب مولانا کلاس میں لیکچر دے رہے تھے، تو بے اختیار اُن کی زبان سے یہ جملہ نکلا تھا "اس شخص کا طریقۂ تعلیم نہایت سائنٹیفک ہے"۔ یہ معمولی ریمارک نہ تھا، حیدری صاحب یوں تو پہلے ہی سے مولانا کا لوہا مانے ہوئے تھے مگر اس تاریخ سے انھیں اور بھی زیادہ شیفتگی ہو گئی تھی —

"اصطلاحات علمیہ" پر مولانا 'سلیم' کے زبردست لیکچر آج بھی "رسالۂ اُردو" میں محفوظ ہیں، یہ وہ لیکچر ہیں جو فارمولوں اور اصطلاحات انگریزی کو زبان اُردو کا قالب پہنانے کے متعلق ہیں، مولانا کے مسکت دلائل جو اس خصوص میں اُنھوں نے بیان فرمائے تھے، مخالفین کو بھی تسلیم کرنے پڑے —

"جامعۂ عثمانیہ" کے طلبہ میں قومیت، اور ادبیت، کی جو روح حضرت 'سلیم' نے پھونکی ہے، ہمیں یقین ہے کہ اُس کا نقش موجودہ اور آنے والے طالب علموں کی نسل میں زندہ رہے گا —

حقیقت یہ ہے کہ اُردو کا صحیح مذاق، دکن کے طالب علموں میں اس جامعہ اور اس کے پروفیسر مولانا وحیدالدین 'سلیم' ہی نے پیدا کیا ہے۔ اُن کے بہت سے شاگرد اس وقت خوشگو شاعر، اور اچھے انشا پرداز ہیں، جن کے مضامین ہندوستان کے جرائد میں اکثر و بیشتر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مولانا کے وہ نوٹس جو طلبہ کو کالج میں لکھاتے تھے، معلومات کی انسائکلو پیڈیا ہیں، جن طلبہ نے اُنھیں احتیاط سے جمع کیا اور غور سے پڑھا، امتحان کی کامیابی اور ترقی استعداد میں اُن کے ممد و معاون ہوئے!

"جامعۂ عثمانیہ" کی بد قسمتی ہے کہ حلقۂ اساتذہ سے ایک زبردست حکیم

ادیب ، فلسفی ، اور شاعر اُٹھ گیا ، اُردو کا یہ قافلہ سالار آج آسودۂ خاک ہے ، اور ہندوستان اُس کے ماتم میں سوگوار —

مولانا کی ذات بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھی ، احباب انھیں یاد کریں گے اور روئیں گے، جو صدمۂ جانکاہ اِس سانحے سے ہمیں پہنچا ہے ، اُس کے بیان کی تاب ہم میں نہیں ہے --

مرحوم کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی ، مگر اُن کے پہلو میں جوان دل ، اور جوان ہمت تھی، اُن کی اُمنگیں زندہ تھیں ، سینے میں بہت سے ارادے اور بہت سی قوّتیں رکھتے تھے، سخت سے سخت آزمایش کے وقت بھی ہم نے اُنھیں ثابت قدم پایا، مرحوم میں خاص خوبی تھی کہ وہ مرنج و مرنجاں تھے ، اُن میں اُس خلوص و محبت کی بو آتی تھی، جس کے قصے ہم نے بزرگوں سے سنے ہیں —

مولانا مذہباً حنفی تھے ، مگر غیر متعصب اور آزاد منش مسلمان تھے ، بعض مخاصمین اُن پر دہریت کا الزام لگاتے ہیں، مگر وہ پکّے موحد تھے اور سردار دو جہاں (روحی فداہ) کے ذکر پاک پر اُن کی آنکھیں پر نم ہوجاتی تھیں- اُن میں "قل اعوذیت" نہ تھی، وہ نہایت سنجیدہ خیال مسلمان تھے، علی گڑہ والوں کے شیدائی تھے ، اور " ہند سلم اتحاد " کے دل سے حامی تھے —

مولانا سلیم صاحب سے اُن کی تاریخ ورود حیدرآباد سے ، جب وہ اول اول یہاں آکر الحاج مولانا حمیدالدین صاحب فراھی کے ہاں مقیم ہوے ، ہمیں شرف ملازمت حاصل تھا ، اُن کے چند ماہ کے قیام کے بعد ، جب میں معتمدی فوج میں منتظم تھا ، میرے ہمراہ دفتر کی عمارت کے اُس حصے میں، جو مجھے قیام کے لئے نواب نذیر جنگ بہادر معتمد وقت نے مرحمت فرمایا تھا ، اور جہاں حیدرآباد میں جسٹس محمود بھی مقیم رہے تھے، مولانا اُٹھ آے اور عمارت کے زیریں حصے میں قیام فرمایا، چار سال تک شب و روز مولانا کی خدمت کا مجھے موقع ملا —

" جامعۂ عثمانیہ " کی داغ بیل پڑ چکی تھی ، مترجمین اور پروفیسروں

کی تلاش تھی ' مولانا عبدالحق صاحب جن کے ھاتھ میں سرشتۂ تالیف و ترجمہ کی اُس وقت باگ تھی' چیدہ آدمیوں کی جستجو کر رھے تھے - ھندوستان سے مراسلت جاری تھی ' مولانا سلیم اس سلسلے کی پہلی کڑی تھے ' جو مولوی عبدالحق صاحب کی مساعی سے " جامعہ " کی سلک میں داخل کرلیے گئے - جامعہ کے ساتھہ ساتھہ سرشتۂ تالیف و ترجمہ بھی معرض وجود میں آیا ' اور وضع اصطلاحات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ' جس کے ارکان میں مولانا وحیدالدین صاحب ' سلیم ' خاص طور پر قابل ذکر ھیں - حضرت ' سلیم ' نے اپنے ذھن رسا اور تبحر علمی سے اصطلاحات سازی میں وہ بیش بہا خدمات انجام دیں ' جو کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں- جملہ علوم و فنون کی اصطلاحات اس کمیٹی کے اراکین کے مشوروں سے بنائی جاتی ھیں ' اور غلبۂ آرا سے فیصلہ ھوتا ھے - یہ بات بھی قابل ذکر ھے کہ اکثر و بیشتر مولانا سلیم ھی کے مشورے کو فوقیت حاصل ھوتی تھی --

وہ ھٹ دھرم نہ تھے ' اگر کسی کا مشورہ اُن سے بہتر ھوتا تو اُسے خوشی سے قبول فرمالیتے تھے - مولانا کی صحبت فیض اثر سے مستفید ھونے کا ھمیں دس سال تک موقع ملا ھے ' اس مضمون میں جو باتیں مولانا سے سنیں ' اور اپنی آنکھوں سے مشاھدہ کیں وھی لکھی گئی ھیں - اساتذۂ فارسی کی چند مشہور اور ممتاز تصانیف کے درس لینے کا شرف ھمیں بھی حاصل ھے ' ھمارے لیے مولانا کی صحبت آغوش ادب سے کم نہ تھی --

جامعۂ عثمانیہ کے اکثر پروفیسر مولانا کی وسیع معلومات علمی سے فائدہ اُٹھانے کے لئے آتے تھے اور بعض تو اُن سے پڑھ کر کالج میں درس دیتے تھے ' یہ ھمارے عینی مشاھدات ھیں --

ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی جو اُس وقت پرنسپل تھے ' اور جنھیں پہلے سے مولانا کی خدمت میں نیاز حاصل تھا ' مولانا کی معلومات علمی کے سامنے دنگ رہ جاتے تھے' اور جس مضمون لسانیات (فلالوجی) میں اُنھوں نے جرمنی سے ڈگری

حاصل کی تھی، اُس کی نسبت مولانا سے جب کبھی تبادلۂ خیالات ہوتے تو یہ کہتے تھے کہ "مولوی صاحب ! یہی مطالب میرے جرمن استاد نے مجھے بتائے تھے"—

بعض الفاظ کے متعلق ڈاکٹر صاحب یہ کہتے تھے کہ "مولوی صاحب ! آپ کی نظر بہت وسیع ہے، جو میری تحقیقات ہے وہی آپ فرما رہے ہیں"- غور فرمائیے! جناب 'سلیم' جرمنی اور انگریزی زبان سے واقف نہ تھے ' مگر اُن کے تبحر علمی کا یہ عالم تھا کہ تحقیقات لسانی میں بھی اُنھیں ید طولیٰ حاصل تھا—

بارہا علمی اور سیاسی مسائل پر ہم سے اور اُن سے گفتگو ہوتی تھی، مگر کبھی سطحی بات اُن کی زبان سے نہیں سنی- آہ! حضرت سلیم اب کہاں؟ اُن کے واقعات افسانہ ہیں-

اس محسن اور مربی اُردو کی ہندوستان بالخصوص "جامعۂ عثمانیہ" میں یادگار کا قائم ہونا ضروری ہے- امید ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے ارباب حل و عقد یونیورسٹی میں "سلیم چیر" قائم کر کے حضرت سلیم کی قدر اور اپنی علم دوستی کا ثبوت پیش کریں گے—

مولانا دانتوں کے مرض میں عرصے سے مبتلا تھے، ڈاکٹروں کے مشوروں سے دانت نکلوائے، بائیں جانب کی ڈاڑھ نے بہت ستایا ' ڈاکٹر عثمان رکن دارالترجمہ اور ہم نے اُن کے علاج میں امکان بھر کوشش کی، مختلف ڈاکٹروں کے پاس اُنھیں لیکر گئے ' علاج کرایا ' ہر طرح کے علاج میں سہولت فراہم کی، مگر (ع) مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی —

سکندر آباد کے اسپتال میں ہم نے داخل کرایا ' ایک ماہ تک وہاں رہے ' مرض میں کبھی کمی اور کبھی زیادتی ہوتی رہی، بالآخر وہاں سے چلے آئے- ڈاکٹر خورشید حسن صاحب کے پاس جو افضل گنج اسپتال کے بہترین سرجن ہیں، اُنھیں لیکر گیا، اُنھوں نے دو چار دن علاج کے بعد یہ مشورہ دیا کہ "آپ مولانا کو رانچی بھیجدیجیے ! وہاں اس مرض کا ریڈیم کے ذریعے سے علاج ہوتا ہے، اگر اچھے ہوئے تو وہیں سے اچھے ہوسکیں گے"- ڈاکٹر صاحب کے مشورے کے بعد ہمارے دل میں ایک

خلش پیدا ہوگئی تھی کہ مرض سخت ہے ' خدا ہی ہے جو مولانا کو صحت ہو —

ڈاکٹر صاحب کے مشورے کے بعد مولانا رانچی گئے' مگر وہاں ازالۂ مرض تو کجا اور زیادہ نحیف ہو گئے - جب مولانا کے پاس سے عرصے تک کوئی خط نہیں آیا تو رانچی انسٹیٹیوٹ کے سرجن کو ہم نے ایک خط لکھا اور مولانا کی صحت دریافت کی' مگر جو خط اُس کے پاس سے جواب میں آیا تھا ' وہ نہایت مایوس کُن تھا ' ہمیں معلوم ہوا کہ مولانا نے اپنے عزیز دوست ڈاکٹر عبدالکریم صاحب کو لکھا تھا کہ اپنے پاس ' ملیح آباد ' کسی آدمی کو بھیجکر بلا لیں - ڈاکٹر صاحب نے آدمی بھیجا' ملیح آباد آے' علاج کیا' کچھ فائدہ نہ ہوا' میڈیکل کالج لکھنؤ میں علاج کے لئے گئے' مگر قسمت نے وہاں بھی یاوری نہ کی ' حالت یوماً فیوماً زار ہوتی گئی —

مولانا کی آرزو تھی کہ یا تو ڈاکٹر عبدالکریم صاحب کے پاس ' یا ہمارے پاس ان کی آخری منزل ہو - حیف ہماری قسمت میں یہ سعادت نہ تھی کہ ہم مولانا ے مرحوم کی' آخری خدمت انجام دیتے' یہ نصیب ڈاکٹر صاحب کا تھا —

دنیا کے بڑے بڑے ناموروں کی طرح حضرت ' سلیم ' کو بھی عشرۂ قتالہ میں سفر آخرت طے کرنے کا مرتبہ ملا ہے - کئی ماہ کی علالت کے بعد گیارہ صفر سنہ ۱۳۴۷ ھ کو شب کے آخر حصے میں وہ آفتاب علم و فضل ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا-

" انا للہ و انا الیہ راجعون " —

ایک وصیت کی تعمیل

از

(جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب، بی اے)

خدا بخشے - مولوی وحیدالدین 'سلیم' بھی ایک عجب چیز تھے - ایک نگینہ سمجھیئے کہ برسوں ناترا شیدہ رہا - جب ترا شا گیا - پہل نکلے - چمک بڑھی - اہل نظر میں قدر ہوئی - اُس وقت چھت سے ٹوٹ گیا - شہرت بھی 'غالب' کے قصیدے کی طرح آج کل کسی کو راس نہیں آتی - اِدھر نام بڑھا اور اُدھر مرا - صف سے آگے نکلا اور تیر قضا کا نشانہ ہوا - چل چلاؤ کا زور ہے - آج یہ گیا ، کل وہ گیا - مولوی نذیر احمد گئے ، شبلی گئے ، حالی گئے ، وحیدالدین گئے - اب بڑوں میں مولوی عبدالحق رہ گئے ہیں - ان کو بھی شہرت کی ریہ لگ گئی ہے، سوکھے چلے جا رہے ہیں - کسی دن یہ بھی خشک ہو کر رہ جائینگے - یہ تو جو کچھ تھا سو تھا ، ایک نئی بات یہ ہے کہ آج کل کا مرنا بھی کچھ عجب مرنا ہوگیا ہے - پہلے زندگی کو چراغ سے تشبیہ دیتے تھے ، بتی جلتی، تیل خرچ ہوتا ، تیل ختم ہونے کے بعد چراغ جھلملاتا ، ٹمٹماتا ، لو بیٹھنی شروع ہوتی اور آخر رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہو جاتا - اب چراغ کی جگہ زندگی بجلی کا لیمپ ہو گئی ہے - ادھر بٹن دبا اور اُدھر اندھیرا گھپ - 'عظمت اللہ خاں' اسی طرح مرے، مولوی وحیدالدین اسی طرح رخصت ہوے ، اب دیکھیں کس کی باری ہے - اردو کی مجلس میں دوچار لیمپ جل رہے ہیں، وہ بھی کسی وقت کھٹ سے گل ہو جائینگے، اس کے بعد بس اللہ ہی اللہ ہے -

میں مدت سے حیدرآباد میں ہوں - مولوی وحیدالدین بھی برسوں سے یہاں تھے ' لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا - انہیں ملنے سے فرصت نہ تھی ' مجھے ملنے کی فرصت نہ تھی - آخر ملے تو کب ملے کہ مولوی صاحب مرنے کو تیار بیٹھے تھے - گزشتہ سال کالج کے جلسے میں مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے اورنگ آباد کھینچ بلایا - روانہ ہونے کے لئے جو حیدرآباد کے اسٹیشن پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسٹیشن کا اسٹیشن اورنگ آباد جانے والوں سے بھرا پڑا ہے - طالب علم بھی ہیں ماسٹر بھی ہیں - کچھ ضرورت سے جارہے ہیں ' کچھ بے ضرورت چلے جارہے ہیں - کچھ واقعی مہمان ہیں ' کچھ بن بلائے مہمان ہیں - غرض یہ کہ آدھی ریل انھی اورنگ آباد کے مسافروں نے گھیر رکھی ہے - ریل کی روانگی میں دیر تھی - سب کے سب پلیٹ فارم پر کھڑے غپیں مار رہے تھے - میں بھی ایک صاحب سے کھڑا باتیں کررہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے بڑے بڑے ڈگ بھرتے میری طرف چلے آرہے ہیں - متوسط قد ' بھاری گٹھیلا بدن ' بڑی سی توند ' کالی سیاہ فام رنگت ' اس پر سفید چھوٹی سی گول ڈاڑھی ' چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں ' شرعی سفید پاجامہ ' کتھئی رنگ کے کشمیرے کی شیروانی ' سر پر عنابی ترکی ٹوپی ' پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتہ - آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگالیا - حیران تھا کہ یا الہی یہ کیا ماجرا ہے - کیا امیرحبیب اللہ خاں اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا سین ہونے والا ہے - جب ان کی اور میری ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے ملتے تھک کر چور ہوگئیں ' اس وقت انہوں نے فرمایا "میاں فرحت! مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا - جب سے تمھارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے ' کئی دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آکر ملوں مگر موقعہ نہ ملا - قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا - بھئی! مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا ' مرنے کے بعد بھی اُن کا نام زندہ کردیا ' افسوس ہے ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا جو مرنے کے بعد اسی رنگ میں ھمارا حال بھی لکھتا "

میں پریشان تھا کہ یا اللہ یہ ہیں کون اور کیا کہہ رہے ہیں ۔ مگر میری زبان کب رکتی ہے میں نے کہا "مولوی صاحب! آپ گھبراتے کیوں ہیں، بسم اللہ کیجئے مرجائیے، مضمون میں لکھ دوں گا "۔ کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب مرجائیں گے اور مجھے ان کی وصیت کو پورا کرنا پڑے گا ۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولوی وحیدالدین 'سلیم' ہیں تو واقعی مجھے بہت پشیمانی ہوئی ۔ میں نے معذرت کی، وہ خود شگفتہ طبیعت لےکر آئے تھے، رنج تو کجا بڑی دیر تک ہنستے اور اس جملے کے مزے لیتے رہے ۔ سر ہوگئے کہ جس گاڑی میں تو ہے، میں بھی اسی میں بیٹھوں گا ۔ شاگردوں کی طرف دیکھا، انھوں نے ان کا سامان لا میرے درجے میں رکھ دیا ۔ ادھر ریل چلی اور ادھر ان کی زبان چلی ۔ رات کے بارہ بجے، ایک بجا، دو بج گئے، مولوی صاحب نہ خود سوتے ہیں اور نہ سونے دیتے ہیں ۔ درجۂ اول میں ہم تین آدمی تھے ۔ مولوی صاحب، میں، اور رفیق بیگ، رفیق تو سوگئے، ہم دو نے باتوں میں صبح کردی ۔ اپنی زندگی کے حالات بیان کئے، اپنے علمی کارناموں کا ذکر چھیڑا، اصطلاحات زبان اُردو پر بحث ہوتی رہی، شعر و شاعری ہوئی؛ دوسروں کی خوب خوب برائیاں ہوئیں، اپنی تعریفیں ہوئیں ۔ مولوی عبدالحق کو برا بھلا کہا کہ اس بیماری میں مجھے زبردستی کھینچ بلایا ۔ غرض چند گھنٹے بڑے مزے سے گزر گئے ۔ صبح ہوتے ہوتے کہیں جاکر آنکھ لگی ۔ شاید ہی کوئی گھنٹہ بھر سوے ہوں گے کہ ان کے شاگردوں اور ساتھیوں نے گاڑی پر یورش کردی ۔ پھر اٹھ بیٹھے اور پھر وہی علمی مباحث شروع ہوے ۔ پھبتیاں اُڑیں، اس کو بے وقوف بنایا، اس کی تعریف کی ۔ ہنسی اور قہقہوں کا وہ زور تھا کہ درجے کی چھت اُڑی جاتی تھی ۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ کو تو نواب مسعود جنگ اپنے پاس لے گئے اور یہاں اورنگ آباد تک وہی غل غپاڑہ رہا —

میں شاعر نہیں ہوں، ہاں بعض دفعہ دوستوں کی فرمائش سے زبردستی شعر کہتا ہوں ۔ مجھے بڑا تعجب ہوا، جب مولوی صاحب نے کہا " فرحت تو شاعر ہے،

کیوں اس جوهر کو خاک میں ملا رها هے ' هو سکے تو کچھه کهه لیا کر'' - میرے ایک قطعهٔ تاریخ سے ایسے خوش هوے که اُسی وقت اُٹهه قلم دوات نکال وہ قطعه لکهه لیا - آپ بهی سن لیجئیے ' کہتے هیں که نئی طرز کی تاریخ هے ' هوگی - هم کو تو نه اس کے لکھنے میں دماغ سوزی کرنی پڑی اور نه اس کی کوی قدر هے ' هاں قطعے سے پہلے اس کی شان نزول سن لیجے واقعه یه هے کے میرے ایک نهایت عزیز دوست کے دماغ میں یورپ جانے کے خیالات همیشه چکر لگا تے تهے ' پیسه پاس نهیں-تها ' مگر چاهتے تهے کد ساری دنیا میں پهریں اور وہ بهی اس طرح نهیں جس طرح امریکه والے پهر تے هیں ' بلکه اس طرح جیسے پہلے زمانے کے سیاح پهر تے تهے - ادهر کوشش کی اُدهر کوشش کی 'آخر سر کار سے منظوری هوهی گئی - ڈهائی تین برس میں سارا یورپ چهان مارا - شمالی افریقه کے سب ملک دیکهه لئے - عراق ' عرب ' شام ' ترکی غرض سینکڑوں ملکوں کی سیر کی - آئے اور بڑی دهوم دهام سے آئے - وہ نام پیدا کیا که خدا سب کو نصیب کرے - دوستوں نے مجهه سے تاریخ کهنے کا تقاضا کیا - مار مار کر شاعر بنا یا- تاریخ هوئی هے : —

پهر پهرا کر مرے اک دوست سفر سے آئے
بار تاریخ کا ڈالا گیا میرے سر پر

دوستوں کا هے تقاضا که لکهو جلد لکهو
میں بهی شاعر هوا الله کی قدرت هے مگر

میرے انکار سے احباب نه رنجیده هوں
اس لئے لکهتا هوں تاریخ بهت ترتر کر

ایک طائر کو قفس میں تها خیا ل گلشن
پر سمیٹے هوے بیٹها تها جهکائے هوے سر

رحم کچهه آگیا صیّا د کے دل میں شاید
هٹ گیا سامنے سے ایک طرف کهول کے در

در کهلا پا یا تو آهسته سے طائر نکلا
پهر چلا تیرسا گلشن کی طرف مارکے پر

خوب دل بهر کے مزے زمزمه سنجی کے لئے
خوب دل کهول کے باغوں میں لگا ئے چکر

بچتا وہ گردش افلاک سے آخر کب تک
هوتا کب تک نه زمانے کے تغیر کا اثر

آب و دانه اسے پهر کهینچ کے لا یا سوے دام
باندهے صیاد نے پهر طائر آزاد کے پر

لکهی ''فرحت'' نے هے کس زور سے فصلی تاریخ
پهر وهی کنج قفس پهر * وهی صیّاد کا گهر

۲۱۳ ۱۱۲۰

میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کوشش کی کہ مولوی صاحب کی طبیعت کا اندازہ لگاؤں ' پہلے تو ذرا بند بند رہے - لیکن آخر میں بالکل کھل گئے - میں نے جو رائے ان کے متعلق قائم کی ہے وہ سن لیجئے - سب سے پہلے تو یہ ہے کہ اُن میں ظرافت کا مادہ بہت تھا - لیکن یہ ظرافت اکثر رکاکت کی صورت اختیار کر لیتی تھی - کسی کو برا بھلا بھی کہتے تو ایسے الفاظ میں کہتے کہ سننے سے تکلیف ہوتی - اور جب کہنے پر آتے تو پھر یہ نہ دیکھتے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کس کے سامنے کہہ رہا ہوں - نتیجہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ لوگ ادھر سے اُدھر لگا دیتے اور مولوی صاحب کی کسی نہ کسی سے بگڑ جاتی - شاید ہی کوئی بھلا آدمی ہوگا جو سچے دل سے اُن کو چاہتا ہو - ان کے علم ' ان کی سمجھ ' ان کی زود فہمی اور ان کی طبع رسا کی سب تعریف کرتے ہیں ' لیکن ان کی طبیعت کے سب شاکی ہیں - اور وہ خود بھی اس سے بیزار ' اُس سے بیزار ' مجھ سے بیزار ' تم سے بیزار - غرض اپنے سوا ساری دنیا سے بیزار تھے - بات یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کی وہ وہ ٹھوکریں اُٹھائی تھیں کہ خدا کی پناہ - خاصا بھلا چنگا آدمی دیوانہ ہو جائے - اگر .... مولوی صاحب کی طبیعت پر ان مصیبتوں نے اتنا اثر کیا تو کیا تعجب ہے - جب کسی نا اہل کو بڑی خدمت پر دیکھتے تو ان کے آگ لگ جاتی - ریل میں دو ایک بڑے شخصوں کا ذکر آیا - انھوں نے ہر دفعہ یہی کہا " ارے میاں گدھا ہے ' ایک سطر صحیح نہیں لکھ سکتا - اور دیکھو تو کون ہیں کہ نواب صاحب ' ہم کو دیکھو تمام عمر علم حاصل کرنے میں گذار دی ' اس اخبار کی اڈیٹری کی ' اُس رسالے کے منیجر ہوے ' سر سید کی خدمت میں سر گاڑی پاؤں پہیہ کیا ' اب جو چند روپلی مل رہے ہیں تو فلاں صاحب جلے جا تے ہیں ' خبر نہیں کچھ ہوتے تو گلا ہی گھونٹ دیتے -

میں نے کہا " مولوی صاحب! یہ دنیا ہے آخرت نہیں ہے کہ جیسے بو گے ویسا پھل ملیگا - یہاں اہل کہاں ہمیشہ آشفتہ حال رہے ہیں - آپ کیوں خواہ مخواہ اپنا دل جلا تے ہیں - جو اللہ نے دیا ہے بہت ہے " نہ آگے نا تھ نہ پیچھے پگا " مزے کیجئے

بہت گئی ہے تھوڑی رہی ہے - ہنسی خوشی یہ بھی گذار دیجئے''۔ وہ بولا میری باتوں کو کیا سننے والے تھے - اُن کے تو دل میں زخم تھے - تمام عمر مصیبت اٹھائی تھی، نا اہالوں کو آرام و آسایش میں دیکھ کر وہ زخم ہرے ہو جاتے تھے - زبان اپنی تھی ' کسی کا دینا نہیں آتا تھا - بے نقط سنا کر دل ٹھنڈا کرتے تھے -

زمانے کے ہاتھوں ان کی طبیعت میں ایک دوسرا انقلاب یہ بھی ہو گیا تھا کہ جتنی ان کی نگاہ وسیع ہوئی ' اتنا اِن کا دل تنگ ہوا ' جتنی ان قلم میں روانی ہوئی' اتنی ان کی مٹھی بند ہوئی - میں ان کے پیٹھ پیچھے نہیں کہتا - جب ان کے منہ پر لکھ چکا ہوں کہ مولوی صاحب ' آپ کی کفایت شعاری نے بڑھتے بڑھتے کنجوسی کی شکل اختیار کرلی ہے تو اب لکھتے کیوں ڈروں ' واقعی بڑے ہی کنجوس تھے - ہزار روپے کے گریڈ میں تھے' دارالترجمہ سے بہت کچھ مل‌جاتا تھا ' مگر خرچ کی پوچھو تو صفر سے کچھ ہی زیادہ ہوگا - اس کی صراحت میں آگے چلکر کرونگا - ہاں ان کا یہ عذر سب کو ماننا پڑے گا کہ مفلسی کے پے درپے حملوں نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں - ان کو یہ بھی یقین نہ تھا کہ وہ اس خدمت پر کب تک ہیں اور کب نکال دیے جائینگے - خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کھتے بھرنے کی فکر میں رہے - خود چل بسے جمع پونجی دوسروں کے لئے چھوڑ گئے - اور چھوڑ بھی اتنا گئے کہ بعض لوگوں کو افسوس ہوا کہ میں ان کا بیٹا کیوں نہ ہوا —

بہرحال یونہی ہنستے بولتے دو بجے اورنگ آباد پہنچ گئے-بڑے زورکااستقبال ہوا موٹروں میں لدکر اورنگ آباد کالج پہنچے - کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں سے وہاں تک خیمے ہی خیمے لگے ہیں - خیموں کے سامنے جلسے کا منڈوا ہے - منڈوے کے سامنے جو خیمہ تھا ' اس میں مجھے اور مولوی صاحب کو جگہہ ملی - مولوی صاحب کی طبیعت پہلے سے بد مزہ تھی - راستے کی تکان اور رات بھر جاگنے سے اور خراب ہوگئی - بخار چڑہ آیا - دو وقت کھانا نہیں کھایا ' تیسرے وقت بڑے کہنے سننے سے تھوڑا سا دودہ پیا - دوسرے روز ان کا لکچر تھا - طبیعت صاف نہیں تھی ' پھر

بھی بڑے میاں کو جوش آگیا - ٹرنک میں سے نیا جوڑا نکالا ' ریشمی شیروانی نکالی ' نئی ترکی ٹوپی نکالی ' اپنا میلا کچیلا جوڑا پھینک نیا پہن اس ٹھاٹھ سے جلسے میں آئے کہ واہ واہ - کھڑے ہو کر لکچر دینے کا دم نہ تھا - اسٹیج پر کرسی بچھا دی گئی - انہوں نے جیب میں سے چھوٹے چھوٹے نیلے کاغذ کے پرچوں کی ایک گڈی نکالی اور لکچر پڑھنا شروع کیا - میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ اسپیچ کے پڑھنے میں الفاظ کا زور کم ہو جاتا ہے ' مگر مولوی صاحب کے طرز ادانے میرا خیال بالکل بدل دیا - ان کے پڑھنے میں بھی وہی بلکہ اس سے زیادہ زور تھا' جتنا بولنے میں ہوتا ہے - معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے - تقریباً دو ہزار آدمی کا مجمع تھا' مگر سناٹے کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے تو آواز سن لو - لفظوں کی نشست ' زبان کی روانی اور آواز کے اُتار چڑھاؤ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آرہا ہے' یا ایک برقی رو ہے کہ کانوں سے گزرکر دل و دماغ پر اثر کررہی ہے - برس روز ہوچکا ہے مگر اب تک وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے - میں نے بڑے بڑے لکچر دینے والوں کو سنا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ لکچر پڑھ کر ایسا اثر پیدا کرنے والا میری نظر سے کوئی نہیں گزرا - کچھ تو بات تھی کہ آخر آخر زمانے میں سرسید مرحوم اپنے اکثر لکچر انہی سے پڑھوا یا کرتے تھے - یا تو لکچر پڑھتے پڑھتے یہ خود منجھ گئے تھے یا یہ ان کی خدا داد قابلیت تھی جس کو دیکھ کر سرسید مرحوم نے اس کام کے لئے ان کا انتخاب کیا تھا - غرض کچھ ہی ہو اس میدان میں ان کا مد مقابل نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے—

اسی روز ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ اُس کا خیال کر کے اب تک مجھے ہنسی آتی ہے - " ١٢٦١ ہجری میں دہلی کا ایک مشاعرہ " اس جلسے میں زندہ کیا گیا تھا - وہی ساز و سامان ' وہی کپڑے اور وہی لوگ ' سوبرس کے بعد پھر سامنے لائے گئے تھے - اسٹیج کے انتظام ہی کے لئے مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے پکڑ بلایا تھا - پہلے بہروپ اور نقلیں ہوتی رہیں - آخر پردہ گرا اور مشاعرے کا نمبر آیا -

تھوڑی دیر میں اسٹیج کا رنگ بدلنا کچھہ آسان کام نہ تھا ۔ دریاں ' چاندنیاں '
قالین بچھانا ' گاؤ تکئے لگانا ' سامان جمانا ' مشعلیں جلانا ' غرض اتنا کام تھا کہ
پردہ گرے گرے بڑی دیر ھوگئی - اور لوگوں میں ذرا ھل چل ھونے لگی - مجھے
اس وقت سوا اس کے اور کچھہ نہ سوجھا کہ ایک چھوٹی سی تقریر کرکے اس بے
چینی کوکم کروں ' - میں نے کہا " یارو ! ذرا جلدی کرو - دیر ھور ھی ھے - مزا کرکرا
ھوجاےگا - میں باھر جا کر کچھہ بولنا شروع کرتا ھوں - تمھارا کام جب ختم ھو جاے
تو سیٹی بجا دینا - میں اپنی اسپیچ ختم کردوں گا " - اتنا کہہ میں چٹ باھر پردے
کے سامنے آگیا - مضمون سوچنے کا موقعہ نہیں ملاتھا' اس وقت یہی سمجھہ میں آیا
کہ اپنے مضمون کی تمہید کو ذرا مذاق میں ادا کردوں - جن صاحبوں نے وہ مضمون
پڑھا ھے' وہ واقف ھیں کہ میں نے اس مضمون کو مولوی کریم الدین صاحب مؤلف
" طبقات شعراء " سے منسوب کر کے یہ ظاھر کیا ھے کہ یہ مشاعرہ انھی کے مکان پر
نواب زین‌العابدین خاں کی مدد سے ھوا تھا - چنانچہ میں نے اپنے لکچر میں ابتداً
اس زمانے کی دھلی کا نقشہ کھینچا اور پھر مولوی کریم‌الدین صاحب کا پانی پت
سے دھلی آنا مذاقیہ پیرایے میں بیان کیا ۔ ان کی پھٹی ھوئی جوتیوں ' ان کے خاک
آلودہ کپڑوں ' ان کی وحشت زدہ شکل اور ان کی مفلسی کا نقشہ خدا جانے کن کن
الفاظ میں کھینچ دیا - پھر اِن کے دھلی میں آکر تعلیم پانے' مسجد کی روٹیوں پر پڑے
رھنے' دوسروں کی مدد سے مطبع کھو لنے کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ آخر کس طرح اس
مشاعرے کی اجازت ھوئی اور کس طرح دھلی کے تمام شعراء اس میں جمع ھوے ۔ میں اسپیچ
دینے میں سیدھا کھڑا نہیں رھتا' کچھہ ھاتھہ پاؤں بھی ھلاتاھوں - خدا معلوم مولوی
کریم الدین کا حال بیان کر نے میں کیوں میرے ھاتھہ کا اشارہ کئی دفعہ مولوی
وحیدالدین 'سلیم' کی طرف ھو گیا - مجھے تو معلوم نہیں' مگر جلسے میں اس نے کچھہ
اور ھی معنی پیدا کر لئے - مولوی صاحب کے والد بھی پانی پت سے دھلی آئے تھے۔
کتابوں کا بیوپار کرتے تھے - لوگ سمجھے کہ مولوی کریم‌الدین ھی مولوی وحیدالدین

کے والد تھے - ناموں کے ایک ساں ہونے نے اس خیال کو اور تقویت دی - اب جوھے وہ وہ مولوی صاحب سے پوچھتا ہے " مولوی صاحب ! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے " - مولوی صاحب کے تاؤ کی کچھ نہ پوچھو ' دل ہی دل میں اونٹتے رہے' خدا خدا کر کے ڈیڑھ بجے مشاعرہ ختم ہوا - اسٹیج کے دروازے سے جو نکلتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب دیوار سے چپکے کھڑے ہیں ' مجھے دیکھتے ہی بپھر گئے - کہنے لگے " فرحت ! یہ سب تیری شرارت ہے - کریم الدین کو میرا باپ بنادیا " - میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کہہ کیا رہے ہیں - بڑی مشکل سے مولوی صاحب کو ٹھنڈا کیا - وہاں سے لےجا کر خیمے میں بٹھایا ' پان بنا کر دیا' سگریٹ پیش کیا ' جب جاکر ذرا نرم پڑے - اور واقعہ بیان کیا - میں نے کہا " مولوی صاحب ! بھلا مجھ سے ایسی گستاخی ہوسکتی تھی - اول تو اس مذاق کا یہ موقعہ ہی کیا تھا - دوسرے مجھے کیا معلوم کہ آپ کے والد کون تھے ' کہاں کے تھے ' دھلی آے بھی تھےنہیں کتابیں بیچتے تھے یاکیا کرتے تھے" - کہنے لگے " تو گھڑی گھڑی ھاتھ سے میری طرف کیوں اشارہ کرتا تھا " - میں نے کہا "مولوی صاحب ! اسپیچ دینے میں ھاتھ کا اشارہ خود بہ خود اسی طرح ہوتا ہے - اب اگر اگلی صف میں بیٹھکر آپ اس اشارے کو اپنے سے متعلق کرلیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے " بہر حال یہ بات لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسی جم گئی کہ مٹائے نہ مٹی - جب تک اور نگ آباد میں رہے' ہرشخص مولوی صاحب سے یہی سوال کر تا تھا " مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے" -یہ کبھی تو ہنس کرچپ ہوجاتے کبھی صرف جھڑک دیتے ' کبھی جل کر کہتے " جی ہاں میرے والد تھے ' کچھ آپ کا دینا آتا ہے " - —

اورنگ آباد واپس آنے کے بعد میرا ان کے ہاں آنا جانا بہت ہو گیا تھا - جب کچھ لکھتا ' پہلے ان کو جا کر سنا تا - بڑے خوش ہوتے ' تعریفیں کر تے ' دل بڑھاتے ' ھاے اِن کے گھر کا نقشہ اِس وقت آنکھوں میں پھر گیا - گھر بہت بڑا تھا' مگر خالی

ٹھنڈار ' ساٹھہ روپے مہینا کرایہ دیتے اور اپنی اکیلی جان سے رہتے - نہ بال نہ بچہ نہ نوکر نہ ماما - میں گیا ' باہر کا دروازہ کھٹکھٹا یا ' آواز آئی " کون " - میں نے کہا " فرحت" - اُسی وقت کرتہ پہنتے ہوے آئے' دروازہ کھولا ' اندر لے گئے - برآمدے میں ایک بان کی چار پائی پڑی ہے' دو تین تختے جڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں-اندر ایک ذراسی دری بچھی ہے'اس پر میلی چاندنی ہے' دو چار چوھاچکٹ تکئے اورایک سڑی ہوی رضائی رکھی ہے-دیواروں پر ایک دو سگریٹ کے اشتہاروں کی تصویریں اور تین چارپرانے کیلنڈر لٹکے ہیں - سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھہ کُنڈاٹوٹی چاے کی پیالیاں ' کنارے جھڑی رکابیاں ' ایک دو چاے کے ڈبے رکھے ہیں - سامنے کے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں' دوتین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں - نیچے دو تین پرانے کھڑنگ جوتیوں کے جوڑے پڑے ہیں - لیجئے ' مولوی صاحب کے گھر بار کا یہ خلاصہ ہے - مولوی صاحب بیٹھے ہیں' سامنے دو انگیٹھیاں رکھی ہیں - ایک پر پانی' دوسری پر دودھ جوش ہو رہا ہے - چاے بن رہی ہے - خود پی رہے ہیں ' دوسروں کو پلا رہے ہیں - ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے - چاے بنائی ' نمک کے ڈلے کو ڈال دو ایک چکر دے نکال لیا - بس سارے دن ان کا یہی شغل تھا - گھر میں برتن ہی نہیں تھے ' کھانا کیسے پکتا اور کون پکا تا - خبر نہیں کہاں جا کر کھا پی آتے تھے ' کبھی میں گیا دیکھا کہ دروازے میں یہ بڑا قفل لٹک رہا ہے' سمجھہ گیا کہ مولوی صاحب کہیں چرنے چگنے تشریف لے گئے ہیں - میں نے کئی دفعہ پوچھا بھئی کہ مولوی صاحب!آپ کے ہاں کچھہ پکتا پکا تا نہیں - کہنے لگے "نہیں بھئی ' میں نے تو مدتوں سے کھانا چھوڑ دیا ہے - صرف چاے پر گزران ہے " - تم مان لو ' میں تو نہیں مانتا میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کو کھاتے اور خوب کھاتے دیکھا ہے - ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنے گھر کا پکا نہیں کھاتے تھے اور کھاتے تو کیونکر کھاتے - پکا نے کا انتظام کر نا کوئی آسان کام نہیں تھا - ماما رکھنی پڑتی ' سامان منگوانا ہوتا ' لکڑی کا خرچ ' تیل کا خرچ ' نون کا خرچ - غرض اتنے خرچ کون اپنے سر باندھے اور اپنی بھلی چنگی جان

کو بیٹھے بٹھائے روگ لگائے - چائے بنائی اور پی لی - اِدھر اُدھر گئے، پیٹ بھر لیا گھر آئے، بان کی کھری چارپائی پر لوٹ ماری - چلو زندگی کا ایک دن کٹ گیا ان کی بان کی چار پائی بھی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی - ننگی پیٹھ اس پر اتا لوٹتے تھے کے بان صاف اور چمکدار ہو کر کالی اطلس ہو گیا تھا - ادوان خود کھینچتے تھے اور ایسی کھینچتے تھے کہ ہاتھ مارو تو طبلے کی آواز دے - خدا معلوم اب یہ چار پائی کس کے قبضے میں ہے - کسی کے پاس ہو، سونے میں تو بڑا آرام دیگی —

مولوی صاحب کو مٹھاس کا بڑا شوق تھا - خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے ان کے بھی یار دوست شاگرد غرض کوئی نہ کوئی ان کو مٹھائی پہنچاهی دیتا تھا - یہ کچھ کھاتے ، کچھ رکھ چھوڑتے مٹھائی، کی ٹوکریوں میں جو کاغذ آتے ، ان کو پونچھ پانچھ صاف کر جمع کرتے جاتے، انھی کاغذوں پر خط لکھتے ، مضمون لکھتے، غزلیں لکھتے - غرض جو کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا بس انھیں کاغذوں پر ہوتا - خدا معلوم ایسے جھرجھرے کاغذ پر یہ لکھتے کیونکر تھے —

مولوی صاحب دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے، ہاں ڈرتے تھے تو مولوی عبدالحق صاحب سے - میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق ان کی رائے معلوم کروں - مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹال گئے - تھوڑے دن اور جیتے تو پوچھ ھی لیتا - دوسروں کے متعلق مجھے ان کی رائے معلوم ہے - اگر انھی کے الفاظ میں لکھوں تو ابھی فوجداری ہوجائے —

مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع کرنے کا خاص ملکہ تھا - ایسے ایسے لفظ دماغ سے اتارتے کہ باید و شاید - جہاں ثبوت طلب کیا اور انھوں نے شعر پڑھا - پڑھا اور کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کر دیا - اب خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ خود ان کا شعر ہوتا تھا یا واقعی اُس شاعر کا - بھلا ایک ایک لفظ کے لئے کون دیوان ڈھونڈتا بیٹھے اگر کوئی تلاش بھی کرتا اور وہ شعر دیوان میں نہ ملتا تو یہ کہدینا کیا مشکل تھا کہ یہ غیر مطبوعہ کلام ہے - انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے - مگر انگریزی اصطلاحات پر
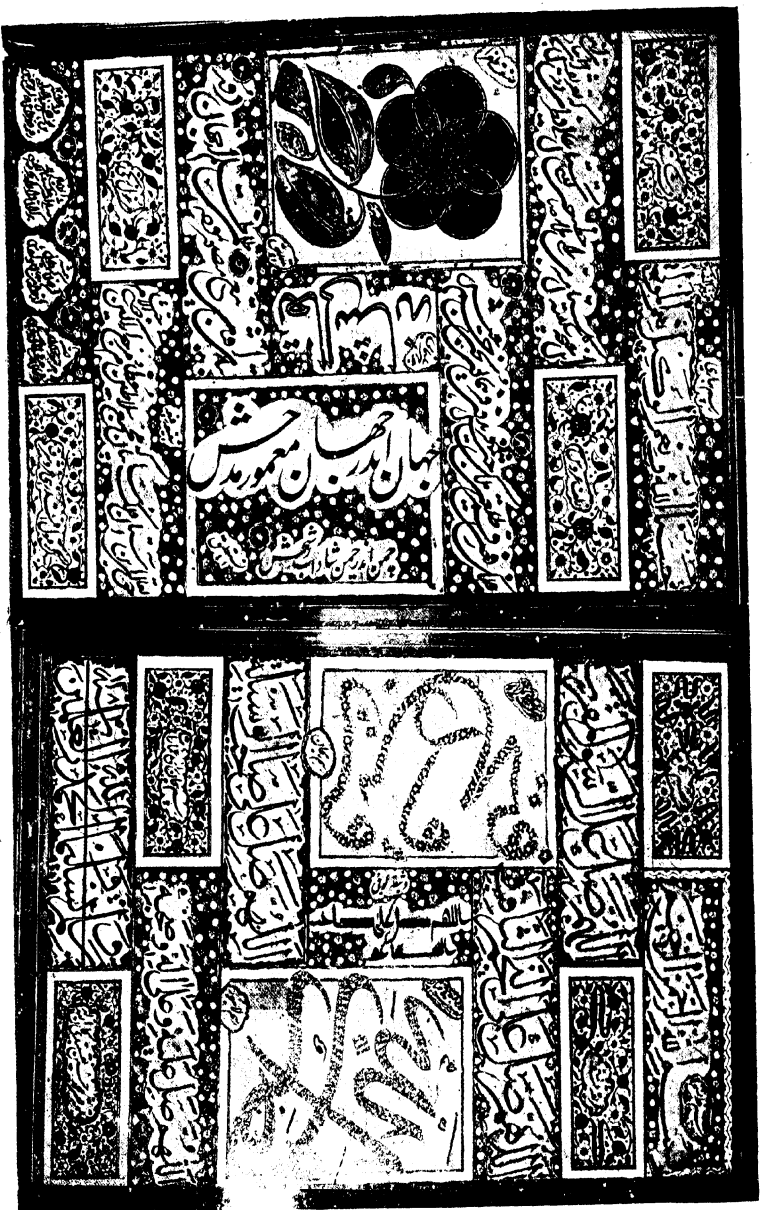
۱۸ قسم کے مختلف خطاطی کا ایک قطعہ — از کتب خانۂ عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر

معیاری علم کے مقابلے میں ایجابی علم کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے - جب تک ہم کو کسی چیز کے متعلق پورے طور سے یہ واقفیت نہ ہو جاے اور یہ نہ معلوم ہولے کہ " وہ کیا ہے " ہم ہرگز یہ کہنے کے قابل نہیں ہوں گے کہ " اس کو کیا ہونا چاہئیے " - ہماری پستی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے (اور اس میں ہمارے اکثر لیڈر اور قومی اخبارات بھی مبتلا ہیں) کہ مشاہدہ اور مطالعہ اور اصل مرض کی پوری تشخیص کی کوشش کئے بغیر اصلاح کی طرف قدم بڑھاتے ہیں - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑے اصلاحی اور تعمیری منصوبے نا کام رہ جاتے ہیں - جس قدر بھی رزو لیوشن وغیرہ منظور ہوتے ہیں ' وہ چونکہ زیادہ تر اسی طریقے پر ہوتے ہیں ' اس لئے بہت کم زیر عمل رہتے ہیں —

اعتراض یا تنقید کرنا بہت اچھا کام ہے بشرطیکہ نیک نیتی سے ہو اور معترض یا ناقد کو اس امر کے متعلق جس پر وہ اعتراض کرتا ہے پوری واقفیت ہو - محض شہرت حاصل کرنے کے لئے یا بد نیتی سے اعتراض کرنا نہایت قبیح مفعل ہے اور اس کا نتیجہ آخر میں ہمیشہ ندامت ہوتا ہے - اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ اعتراض کرنے والا پہلے خود اپنی اصلاح کرے - یعنے اس کی نیت نیک ہو ' جس چیز پر اعتراض کرتا ہے اس سے پوری واقفیت رکھتا ہو ' اعتراض سے اس کا مقصد کسی کو ضرر پہنچانا نہیں بلکہ فائدہ پہنچانا مقصود ہو - اس کے بعد اگر تنقید یا اعتراض کیا جاے تو وہ حقیقی معنوں میں تنقید ہوگی ' ورنہ اہل نظر کی نگاہ میں بے وقعت خیال کی جاے گی —

نستعلیق ٹائپ کا مسئلہ کچھ ایسا آسان مسئلہ نہیں ہے کہ بغیر سوچے سمجھے محض جذبات سے متأثر ہوکر اس پر قلم اٹھایا جاے - جو چیز جس قدر اہم اور دشوار ہوتی ہے ' اتنی ہی اہمیت اور دشواری اس کے متعلق قطعی راے قائم کرنے میں بھی پیش آتی ہے - اب تک مقامی اخبارات میں نستعلیق ٹائپ کے متعلق مخالف اور موافق مضامین مسلسل شائع ہوچکے ہیں - میں ان تمام مضامین

نستعلیق ٹائپ

از

(جناب مرزا رفیق بیگ صاحب)

علم کی منجملہ اور اقسام کے دو قسمیں ایجابی اور معیاری بھی ہیں - اول الذکر کے ذریعے ہم اشیا ' واقعات اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی حالت و کیفیت موجودہ سے باقاعدہ طور پر واقف ہوتے ہیں - اور ثانی الذکر کے توسط سے ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کوئی شے یا واقعہ کس حالت اور صورت میں اصلی معنوں میں شے اور واقعے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے - گویا ایجابی علم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز " کیا ہے " اور معیاری علم یہ بتاتا ہے کہ اس چیز کو " کیا ہونا چاہئیے " - مثلاً ایک ڈاکٹر ایک مریض کا علاج کر رہا ہے ' وہ پہلے تشخیص مرض کرتا ہے ' یعنی یہ معلوم کرتا ہے کہ مریض کی صحت میں کیا خرابی ہے یا بہ الفاظ دیگر اس کی موجودہ حالت " کیا ہے " - تشخیص مرض یا مریض کی موجودہ حالت معلوم کرنے کے بعد وہ یہ دیکھتا ہے کہ وہ کونسی صورت حال ہے ' جس کے پیدا ہوجانے کی بنا پر مریض کی صحت کو اصلی معنی میں صحت کہا جاسکتا ہے - گویا اس طرح وہ ازالۂ مرض کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ مریض اچھا ہوجاے - اگر تشخیص غلط ہوئی ہے تو کوئی علاج خواہ وہ اکسیر ہی کیوں نہ کیا جاے ' بالکل کار گر نہیں ہوتا - علاج کی بہ نسبت تشخیص زیادہ ضروری ہے - اس لئے

کو ٹھنڈے دل سے پڑھتا رہا ہوں - اور اس امر کا متلاشی رہا ہوں کہ ان مضامین میں کوئی ایسی مفید بات میرے ہاتھہ لگے جو کام میں میری ممد و معاون ہو - مگر مجھے افسوس کے ساتھہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر ایک طرف محض بدگمانی سے کام لیا گیا ہے تو دوسری طرف انتہائی خوش اعتقادی کا اظہار ہوا ہے - ایک طرف بے صبری کا جلوہ نظر آ رہا ہے تو دوسری طرف جلد بازی اپنے کرشمے دکھا رہی ہے - یہ صورت حال تخلیقی کام کی حد تک جس قدر نقصان رساں ہے اس کا اعادہ تحصیل حاصل ہے - کیونکہ اس میں علاوہ بے حد صبر کے بہت کچھہ قربانیاں بھی کرنی پڑتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ میں نستعلیق ٹائپ کے متعلق اپنی معلومات اور اس حیثیت سے کہ میں ایک حد تک اس میں کافی طور پر مہارت رکھتا ہوں اپنے خیالات کا اظہار کروں - تاکہ مخالف اور موافق حضرات اس کے متعلق پورے طور پر واقف ہو جانے کے بعد اپنے اپنے قیمتی خیالات کا اظہار فرمائیں اور اس طرح ممکن ہے کہ کوئی کام کی بات میرے ہاتھہ لگ جاے - میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ میں جو کچھہ لکھنے والا ہوں اس کی حیثیت "حکم قطعی" کی ہوگی ' بلکہ میں خود اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ میری واقفیت اس میں اتنی بھی نہیں ہے جتنی سمندر میں سے ایک قطرہ - مگر چونکہ ہر فرد قوم کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی واقفیت سے حتی المقدور قوم و ملک کی خدمت کرے ' اس لئے میں بھی کوشش کرتا ہوں کہ ہر معاملے کو آسانی کے ساتھہ سلجھا دیا جاے اور کوئی پیچیدگی باقی نہ رہے —

اصل مضمون کی طرف رجوع کرنے سے پہلے میں یہ امر بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد اس مضمون سے یہ نہیں ہے کہ میں خدا نخواستہ کسی کی ذات پر حملہ کروں یا یہ بتاؤں کہ کس ٹائپ میں کیا کیا محاسن ہیں ' بلکہ میں مختصراً یہ بتاؤں گا کہ اب تک جو ٹائپ بنے ہیں ان میں بڑے بڑے کیا نقائص ہیں اور یہ کہ انہی نقائص کے مد نظر میں اپنے

ٹائپ کی خامیوں کو رفع کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، اور یہی چیزیں دوسروں کے لئے بھی رہبری کا کام دے سکتی ہیں۔ میں فی الحال یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ ان کوششوں کے اختتام پر میرے یا کسی اور ٹائپ کی کیا صورت ہو جائے گی —

ہماری خطاطی اور اُس کی اہمیت

قبل اس کے کہ میں ٹائپ کے متعلق کچھ عرض کروں۔ یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں خطاطی کو تمام دنیا سے زیادہ کیوں ترقی ہوئی۔ آخر دنیا میں اور قومیں بھی تھیں اور ہیں۔ مگر کسی قوم میں مسلمانوں سے بہتر اور زیادہ دلکش خطاطی آپ کو نہیں ملیگی۔ کیا کبھی آپ نے اس پر غور کیا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ —

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اور ایک عرصے بعد تک عرب میں صرف خط کوفی کا رواج تھا۔ اس کے آس پاس کے ملکوں میں اُس وقت تک ترمیم شدہ خط تصویر، خط میخ وغیرہ وغیرہ رائج تھے۔ یہ پتہ لگانا کہ خط کوفی کی ابتدا کب اور کس طرح ہوئی، بہت دشوار ہے۔ اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس کا مأخذ ایک بڑی حد تک سریانی خط ہے۔ نقطے پہلے اس کے حروف میں نہیں تھے یہ بعد میں شامل کئے گئے ہیں۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اس میں ترمیمیں ہو کر خوبصورتی پیدا ہوتی رہی۔ ان ترمیموں کی وجہ سے خوبصورتی میں تو اضافہ ہوتا گیا مگر آسانی پیدا ہونے کی بجائے مشکلات حائل ہو گئیں، یہاں تک کہ خط کوفی جو پہلے کسی قدر آسان تھا، ترمیمات کے بعد عوام کے واسطے نہ رہا، بلکہ اُس کو خاص خاص ہی لوگ پڑھ سکتے تھے۔ یہ صورت حال بنی عباس کی خلافت تک باقی رہی۔ سلاطین عباسیہ کو علم سے جس قدر ذوق اور شوق تھا، اُس کا اندازہ تاریخ کے صفحات سے اچھی طرح ہوسکتا ہے۔ توسیع علم نے خط کوفی کی خرابیوں کو

لوگوں پر ظاہر کیا - اور ضرورت ہوئی کہ اس میں کچھ اصلاح کی جائے - اُس وقت کے مسلمان اس قدر قدامت پسند نہ تھے کہ وہ اس خط کی دقتوں کو محسوس کرنے کے بعد بھی قدیم طرز تحریر کو نہ چھوڑتے - انھوں نے ضرورت دیکھی، لہذا اس کو فوراً ترک کردیا اور خط نسخ ایجاد ہوا - ایک عرصے تک یہ دونوں ساتھ ساتھ رائج رہے - مگر ساتویں صدی ہجری کے شروع تک خط کوفی محض نمائشی خط رہ گیا اور اس کی جگہ نسخ عام طور پر رائج ہوگیا - گو اور مختلف قسم کے خط بعد میں ایجاد ہوتے رہے، مثلاً ثلث، شفیعہ، ریحان، طغرا، غبار وغیرہ وغیرہ، مگر چونکہ ان سب خطوں میں اس وقت تک خط نسخ ہی زیادہ آسانی سے پڑھا جانے والا خط تھا اس لئے عام رواج اسی کا رہا اور ہر شخص آسانی کے خیال سے اُسی کو پسند کرتا تھا - یہاں تک کہ ایران میں بھی خط نسخ ہی رائج تھا، حالانکہ وہاں کی زبان عربی نہ تھی —

میں یہاں "آسان" اور "عام پسند" کو ذرا وضاحت سے بیان کردینا چاہتا ہوں تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ خط کوفی کے مقابلے میں خط نسخ کیوں آسان اور کیوں عام پسند ہوا - آسانی اور عام پسندی کا تعلق محض انسان کی "آسائش پسندی" اور "سہولت اجرائے کار" سے ہے - جب تمدن اور علم ترقی کرجاتا ہے تو اس وقت لازماً جلد بازی بھی آجاتی ہے - انسان ہمیشہ سہولت اور آسانی کی طرف دوڑتا ہے - آپ خط کوفی کی ایک عبارت کو سامنے رکھئے اور اسی عبارت کو نسخ میں لکھواکر دونوں کو پڑھئے - دیکھئے کہ آپ کس کو جلد پڑھ لیتے ہیں، یقیناً آپ خط نسخ زیادہ آسانی سے اور جلدی پڑھ لیں گے - اس کی تمام تر وجہ یہی نہیں ہے کہ آپ ہمیشہ سے نسخ پڑھتے آئے ہیں - اور خط کوفی سے مانوس نہیں ہیں، بلکہ در اصل اس کا تعلق آنکھ اور دماغ سے ہے - یعنی آپ خود محسوس کریں گے کہ جس قدر جلد آپ کی نگاہ نسخ کے ہر ہر جوڑ پر سے گزرتی جاتی ہے اسی قدر جلد آپ کا دماغ اس کو اپنے میں جذب کرلیتا ہے - یا یہ کہئے کہ آپ اسے سمجھ جاتے ہیں، حتیٰ کہ

آپ اس عبارت کو پڑھ لیتے ھیں' برخلاف اس کے خط کوفی کے توڑ جوڑ میں نگاہ کو ضرورت سے زیادہ چکر لگانا پڑتا ھے یا بالفاظ دیگر آپ کی نگاہ کو بہ نسبت نسخ کے جوڑوں کے خط کوفی کے جوڑوں کو دیکھنے کے لئے زیادہ سفر کرنا پڑتا ھے۔ اور اسی قدر دیر سے آپ کا دماغ بھی اس کو قبول کرتا ھے' اسی لئے آپ اس کو ذرا تکلف سے پڑھتے ھیں اور دیر میں سمجھتے ھیں - اسی کو نگاہ اور دماغ پر بار پڑنا کہتے ھیں - جب لکھنے پڑھنے والے زیادہ ھوے تو اتنی ھی زیادہ نوشت و خواند ھر وقت کی ضروریات میں داخل ھوئی۔ اور اب خط کوفی کا دیر میں پڑھا جانا لوگوں کے لئے تکلیف دہ ھونے لگا - آخر خط نسخ کے موجدوں نے اسی چیز کو محسوس کرکے خط کوفی میں سے یہ چیزیں نکال دیں اور اس ترمیم شدہ خط کا نام خط نسخ رکھا گیا —

یہی اصول آپ کو انگریزی زبان میں بھی نظر آئے گا - قدیم انگریزی کے حروف دیکھئے اور آج کل کے دیکھئے۔ مثال کے طور پر آپ اخبار ٹائمز آف انڈیا ملاحظہ فرماسکتے ھیں' اخبار کے سرنامے پر جو اس کا نام بڑے بڑے حروف میں پہلے ھی صفحے پرھوتا ھے اس کو ذرا غور سے دیکھئے کہ اس میں سے کتنے حروف آپ پڑھ سکتے ھیں؟ قدیم انگریزی خط میں بھی یہی خرابیاں تھیں اور اسی لئے اس کو مجبوراً آسانی کی خاطر تبدیل کردینا پڑا - اگر یورپ کی موجودہ زبانوں کے چھپنے والے حرفوں کو آپ ملاحظہ کریں گے تو خفیف خفیف فرق کے ساتھہ ھزاروں شکلیں نظر آئیں گی' جن کو Fa ces کہا جاتا ھے' ان کا فرق عام طور پر اس وقت تک سمجھہ میں نہیں آسکتا جب تک خاص طور پر اِس کا علم حاصل نہ کیا جاے - اگر زمانے نے فرصت دی تو میں اس کے متعلق آئندہ کسی مضمون میں بحث کروں گا - بہر حال محض اس وجہ سے کہ نگاہ اور دماغ پر بار نہ پڑے حرفوں کی کوئی لکیر موٹی کردی جاتی ھے اور کوئی باریک' تاکہ نگاہ اس جگہ آکر رک نہ جاے بلکہ ایک طرح سے پھسل جاے - لیکن یہ چیزیں اس وقت ظہور پذیر ھوتی ھیں جب کوئی قوم اور ملک اتنی ھی

ترقی کرلیتا ہے جتنی یورپ نے اس خصوص میں کی ہے - ہم ان چیزوں سے ابھی بہت دور ہیں - ہمارے ہاں اب تک ٹائپ ہی نہیں بنا ہے تو بھلا یہ چیزیں تو اس کے بھی بہت بعد کی ہیں —

غرض آسانی ہی ایک ایسی چیز تھی جس کی وجہ سے لوگوں نے اپنے ایک قدیم ترین خط کو بہت جلد ترک کردیا اور نسخ کو بخوشی قبول کرلیا - ورنہ یہ یاد رکھئے کہ کوئی قوم اپنی قدیم روایات اور رسوم کو ہرگز اس وقت تک چھوڑنا پسند نہیں کرتی جب تک اس میں ان کو صریح نقصان نظر نہ آے - دوسرے ضروریات زندگی روز بروز بدل رہی ہیں' قوم وہی زندہ کہے جانے کی مستحق ہوسکتی ہے جو زمانے کے ساتھہ ساتھہ چلتی رہے - موجودہ زمانے میں برہنہ رہنے والی قوموں کو آپ صرف اس واسطے غیر متمدن کہتے ہیں کہ وہ آپ کے برابر برابر نہیں چل رہی ہیں- لیکن کیا وہ اپنے قدیم رسم و رواج کو آج تک لئے نہیں بیٹھی ہیں؟ کیا آپ سے زیادہ انھوں نے اپنے آبا و اجداد کی میراث کی حفاظت نہیں کی ہے ؟ مگر نہیں ' خدا نے انسان کو عقل دی ہے تا کہ اس کے ذریعے سے اپنی ترقی میں سر گرم رہے - خدا کی خدائی کو آنکھیں کھول کر دیکھئے کہ اس میں کیا ہو رہا ہے - مسلمانوں نے بھی تقریباً ہزار سال تک برابر ترقی کی ' مگر جب سے " پدرم سلطاں بود " پر عمل کرنا شروع کیا اس وقت سے آج تک کے نتائج ہمارے سامنے ہیں - اب زمانہ ہم کو اچھی طرح پیس رہا ہے اور ہم مجبور ہو کر اب وہی چیزیں قبول کرتے جارہے ہیں جن کو بوجہ قدامت پسندی ہم نفرت سے دیکھتے تھے - مگر اللہ اکبر ' باوجود پے درپے ذلتوں کے اب تک بھی ہم خوشی سے ایسی چیزیں قبول نہیں کرتے ہیں جو ہماری فلاح و بہبود کا باعث ہوں - اگر مجبوری ہوتی ہے تو خیر طوعاً و کرہاً سب ہی کچھہ کرنا پڑتا ہے —

یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ خطاطی کیا چیز ہے ' اس میں کیوں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور خط نسخ کی کیوں ضرورت ہوی - اب یہ بھی سن لیجئے

کہ مسلمانوں میں فن خطاطی کو اس‌قدر کیوں ترقی ہوی ـــ

منجملہ اور جذبات فطرت کے تصویر کشی اور نقاشی بھی انسان کا ایک فطری جذبہ ہے اور یہی حالت موسیقی کی ہے - مگر چونکہ مسلمانوں میں موسیقی اور تصویر کشی جائز نہیں ہے' اس لئے ان لوگوں نے جن میں یہ جذبہ موجود تھا پہلے تو انتہائی جرأت سے اس کے دبانے کی کوشش کی ' مگر قدرتی اور فطری چیزوں کا دبانا کوئی آسان کام نہیں ہے ' انسان پھر انسان ہے اور قدرت کا مقابلہ اس کے امکان سے باہر ہے ' آخر یہ جذبات ابھر ہی آے - موسیقی کا بدل انہوں نے یہ نکالا کہ کلام مجید کو طرح طرح کے لہجوں اور قرأت سے پڑھنے لگے اور تجوید کا ایک مستقل فن ایجاد ہو گیا ـــ

اب رہی تصویر کشی اور نقاشی یا پینٹنگ ' تو اس جذبے کو انہوں نے اول اول پھل ' پھول ' درخت اور مختلف قسم کے بیل بوٹوں کی صورت میں ظاہر کیا ' مگر جب اس طرح بھی ان کی پیاس نہ بجھی تو سب سے زیادہ زور انہوں نے خوش نویسی میں دکھایا - آج جو آپ بہترین خوش نویسی کے نمونے دیکھتے ہیں ' یہ وہی قوت اور جذبہ ہے - ادھر فطرت کا تقاضا تھا کہ وہ تصویر کشی پر آمادہ کرے' اُدھر شرع کی ممانعت تھی کہ وہ اس سے پرہیز کریں - اس کشمکش کا یہ نتیجہ ہے کہ آپ جذبۂ نقاشی کو حروف کی شکل میں دیکھ رہے ہیں - خوش نویسی ایک قسم کی پینٹنگ یا تصویر کشی ہے جس میں مسلمانوں نے اپنا کمال دکھایا ہے اور اسی وجہ سے آج ان کی خطاطی کے قطعات و غیرہ اُسی طرح اپنی قدر و قیمت رکھتے ہیں ' جس طرح اور قوموں کی تصاویر وغیرہ - اگر دنیا میں کسی مصور کی تصویر کی نقل کوئی دوسرا مصور کر سکتا ہے تو خوش نویسی کے بہترین نمونوں کی بھی نقل اُتاری جاسکتی ہے' ورنہ جس طرح ان کی نقل نہیں ہوسکتی ہے اسی طرح

اب دنیا میں میر عماد اور عبدالرشید کے خط کی بھی نقل نہیں ہوسکتی - اور جس طرح ہر ایک اپنا اپنا جدا جدا رنگ رکھتا ہے، اسی طرح اس میں بھی سب کے رنگ بالکل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں اور الگ الگ رہینگے - اب سوال یہ ہوتا ہے کہ جس طرح نقاشی میں روزانہ حسب ضرورت رد و بدل ہوتا رہتا ہے، کیا وجہ ہے کہ اسی طرح خطاطی میں بھی ضرورت کے لحاظ سے رد و بدل نہ ہو ؟ اور کیوں اُس میں بصورت مجبوری تھوڑی بہت ترمیم نہ کریں ؟ اور کیوں ان مشکلات کو جو ہماری ترقی میں حائل ہوتی ہیں، نہایت دلیری کے ساتھ راستے میں سے نکال کر نہ پھینک دیا جاے - میرامطلب اس سے خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ آپ کسی بہترین چیز کو اپنے ہاں باقی ہی نہ رکھیں نہیں، بلکہ اُس کو اُسی طرح رکھئے اور اگر ہوسکے تو اس سے بھی بہتر صورت میں رکھئے - مگر جو چیزیں آپ کو کسی خاص کام میں آگے بڑھنے سے روک رہی ہیں، اُن کے لئے ضرورت ہے کہ تھوڑے سے ایثار سے بھی کام لیا جاے —

خط نستعلیق کی مختصر تاریخ

خط نستعلیق کی ایجاد کا سہرا ایران کے سر ہے - علامہ ابوالفضل کے قول کے مطابق اس کے موجد خواجہ میر علی تبریزی ہیں، جن کا زمانہ امیر تیمور کا زمانہ ہے (سنہ ۱۳۶۹ ع سے سنہ ۱۴۰۴ ع تک) مگر یہ غلط معلوم ہوتا ہے، اس واسطے کہ امیر تیمور سے پہلے کی نستعلیق میں لکھی ہوي کتابیں مل چکی ہیں (ملاحظہ ہو موئرز آف آرکیولوجی کل سروے آف انڈیا نمبر ۲۹) اس لئے غالباً ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں ہی یہ خط ایجاد ہو چکا تھا - میر علی تبریزی کا زمانہ اس کے بہت بعد کا ہے - اس کا ثبوت

مولاناغلام محمد ہفت قلم دہلوی کی کتاب " تذکرۂ خوشنویساں" سے بھی ملتا ھے - خواجه میر علی کے بیان میں انھوں نے لکھا ھے " پیشتر ہم خط نستعلیق می نوشتند لیکن ایں مرد بزرگوار قواعد درخط نستعلیق مقرر نمودہ و نزاکتے بہم رسانیدہ " - مزید ثبوت خود اس واقعے سے بھی اچھی طرح مل سکتا ھے که خواجه میر علی کا خط انتہائی خوبیوں کے ساتھه مکمل اور عروجی شان لئے ھوے ھے - اور ایسا آج تک نہیں ھوا که جو چیز آج ھی ایجاد ھوئی ھو وہ فوراً ھی تمام تدریجی منزلیں طے کر کے ایک مکمل شکل پیدا کر لے - خط کو فی ' خط نسخ وغیرہ سب نے اسی طرح بتدریج کئی کئی صدیوں میں جاکر موجودہ صورتیں اختیار کی ھیں - اس لئے یه ھرگز یقین نہیں کیا جاسکتا که میر علی تبریزی اس کے موجد ھوں - البته یه ضرورھے که انھوں نے اس کی ترقی میں چار چاند لگا دیے - مگر موجد کون ھے اس کا پته شاید کبھی نه لگ سکے ––

یه خط جیسا که اس کے نام سے ظاھر ھے ' نسخ اور تعلیق سے ملکر بنا ھے - سلطان علی مشہدی جو علاوہ ایک اچھے شاعر ھونے کے فن خطاطی میں استاد کامل کا درجه رکھتے تھے ' ایک جگه خواجه میرعلی کو ھی موجد مانتے ھوے فرما تے ھیں :––

نسخ و تعلیق گر خفی و جلی است
واضع الاصل خواجه میر علی است

تاکه بود است عالم و آدم
ھرگز ایں خط نبود در عالم

وضع فرمود او ز ذھن دقیق
از خط نسخ و از خط تعلیق

ذیل میں میں ایک ایک لفظ بطور نمونه نسخ 'تعلیق اور نستعلیق میں لکھ کر فرق بتاتا ھوں - جس کے دیکھنے کے بعد غالباً ناظرین بخوبی اندازہ کرسکیں گے

که ان دونوں کو کس طرح ملایا گیا ہے —

نستعلیق تعلیق نسخ

ازجہان - ازجہان - ازجہان

اس کے علاوہ ابتدا میں جس قطعے * کی تصویر دی گئی ہے اُس سے ظاہر ہوگا که اب سے کئی صدی پہلے کتنے مختلف قسم کے خط رائج تھے اور یہ که اگر ان مختلف خطوط کو ایک دوسرے سے ملایا جائے ' جس طرح که نسخ اور تعلیق کو ملا کر نستعلیق بنایا گیا ہے ' تو اب کتنے مختلف قسموں کے خطوں کی ایجاد ہونے کا امکان باقی ہے ' اور نستعلیق ٹائپ بنانے میں (بشرطیکه لوگ منظور کریں) اس صورت حال سے کتنی آسانیاں پیدا ہوسکتی ہیں —

ہر زبان کی تحریر یا حروف جو لکھے جاتے ہیں ' کسی نه کسی اصول کے تحت ہوتے ہیں - ثلث اور نسخ میں $\frac{1}{3}$ گولائی اور $\frac{2}{3}$ سیدھی لکیریں ہیں اور نستعلیق میں ہر چیز گول ہوتی ہے - زمانۂ موجودہ کے انگریزی ٹائپ کے حروف بھی اسی اصول پر مبنی ہیں - یہ طریقه انگریزی میں مجبوراً اختیار کرنا پڑا ہے - ورنه جیسا که میں پہلے کہه آیا ہوں حقیقت میں ایسا نه تھا ' بلکه حروف عجیب عجیب طرح سے لکھے جاتے تھے - اب انھوں نے اپنے ہاں تین چیزیں لے لی ہیں - ایک خط مستقیم " —— | " وہ چاہے عمودی ہو یا افقی - دوسرا خط منحنی ")("

---

* میں عالی جناب نواب سالار جنگ بہادر کا بے حد ممنون ہوں کہ جنھوں نے از راہ علم پروری اس قطعے کی تصویر عنایت فرمائی اور ساتھه ہی حامد علی صاحب اور مولوی مرزا فرحت الله بیگ صاحب بی اے - کا بھی شکر گذار ہوں - جنھوں نے اس کے حاصل کرنے میں مدد فرمائی —

تیسرے دائرہ " ○ " - اب آپ انگریزی کے تمام حروف کو انہی چیزوں سے بنائیے اور دیکھئے کہ ہر ایک انہی اصول کے تحت آتا ہے یا نہیں - یہی صورت ہمارے ہاں بھی اختیار کی گئی ہے - فرق صرف یہ ہے کہ اُنھوں نے اس طریقے سے اپنے ہاں آسانی پیدا کرلی ہے اور آپ اپنی ضروریات کو قدامت پسندی پر قربان کر رہے ہیں - اگر آپ آسانی کے لحاظ سے کچھ ترمیم کرسکتے ہیں تو بسم‌اللہ —

بہرحال نستعلیق کی یہ ایجاد ایران میں بہت مقبول ہوئی - دن بدن اس کا رواج بلحاظ سہولت بڑھتا گیا - اس فن لطیف کے بڑے بڑے استاد پیدا ہوے اور انھوں نے خطاطی کے میدان میں خوب خوب زور قلم دکھایا - یہاں تک کہ دسویں صدی ہجری میں میر عمادالحسینی * اور عبدالرشید دیلمی نے اسے کمال پر پہنچا دیا —

---

* میر عمادالحسینی قزوینی ایران میں ہوے ہیں - جن کی بابۃ یہ مشہور ہے کہ ان کا ایک لفظ ان کی زندگی میں ہی ایک تومان کو فروخت ہوا کرتا تھا - غالباً ایک خوش نویس عمادالحسنی ہندوستان میں بھی ہوے ہیں - یہ حسنی ہیں اور وہ حسینی ہیں - مگر عماد حسنی کا تذکرہ نہ تو علامہ ابوالفضل نے اپنے ہاں کیا ہے اور نہ " تذکرۂ خوشنویساں " میں ہے - مگر میں اپنے اور چند اہل ذوق کے یقین اور اعتماد پر کہہ سکتا ہوں کہ عمادالحسنی کوئی اور ہی صاحب تھے - اس واسطے کہ اگر ان دونوں کے خط کا مقابلہ کیا جاے تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے - عمادالحسنی کے قطعات ہندوستان میں بکثرت ملتے ہیں اور عمادالحسینی کے قطعات میں نے باوجود تلاش کے اب تک تین ہی دیکھے ہیں - البتہ یہ سنا ہے کہ عالی جناب نواب سالار جنگ بہادر کے ہاں قطعات کے علاوہ کتابیں بھی ان کے ہاتھہ کی موجود ہیں - مگر اب تک میری نظر سے ان کی لکھی ہوئی کوئی کتاب نہیں گذری- لوگ عمادالحسنی کو بھی عمادالحسینی خیال کرلیتے ہیں' حالانکہ ان کے خطوں میں بہت بڑا فرق ہے —

غالباً شاهنشاہ اکبر کے زمانے میں یہ خط شمالی ہندوستان میں آیا - یہاں بھی یہ بے انتہا مقبول ہوا اور رفتہ رفتہ اس کا رواج عام ہو گیا - مگر استادوں میں جو سب سے پہلے اُستاد کامل اس خط کے ہندوستان میں آئے وہ عبدالرشید دیلمی تھے - یہ زمانہ شاہ جہاں بادشاہ کا تھا (سنہ ۱۶۲۸ ع سے سنہ ۱۶۵۸ ع تک) بادشاہ نے ان کی بہت قدر کی اور شہزادہ دارا شکوہ کی اُستادی پر مقرر کردیا - ان کے بعد ہر بادشاہ کے دربار میں بڑے بڑے خوش نویس گذرے ہیں - اس زمانے میں خوش نویسی ایک اعلیٰ اور شریف ترین فن سمجھا جاتا تھا - بادشاہ سے لے کر ہر ادنیٰ صاحب ذوق تک اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا - بادشاہوں میں داراشکوہ اورنگ زیب، شاہ شجاع اور بہادر شاہ قابل‌ذکر ہیں - اس فن کے آخری مشہور اُستاد سید محمد امیر رضوی دہلوی ہوے ہیں - یہ " میر پنجہ کش " کے نام سے زیادہ مشہور ہیں - کہا جاتا ہے کہ (۹۱) سال کی عمر میں سنہ ۱۸۵۷ ع کے غدر میں اپنے مکان کی حفاظت کرتے ہوے شہید ہوے —

یہاں تک تو شمالی ہندوستان کا ذکر تھا؛ مگر دکن میں اس سے بھی پہلے سے خط نستعلیق کا وجود ملتا ہے اور 'بیدر' کے اکثر کتبات اس کا ثبوت دیتے ہیں - مثلاً علی برید بادشاہ 'بیدر' نے جو ایک شہ نشین قلعے کے اندر بنایا تھا، اُس پر خط نستعلیق میں یہ شعر اب تک لکھا ہوا ہے :—

شاہ نشین چشم من تکیہ گہِ خیال تو   جاے دعاست شاہ من بے تو مبادا جاے تو

اور خود علی برید کے مقبرے کے اندر جس قدر بھی اشعار لکھے ہوے ہیں وہ سب نستعلیق میں ہیں - علی برید کا زمانہ سنہ ۱۵۴۲ ع سے ۱۵۷۹ ع تک ہے - یعنی اکبر بادشاہ کے تخت نشین ہونے کے چند سال کے بعد اس کا انتقال ہوا - اور شہ نشین اُس نے اپنے ابتدائی زمانے میں بنوایا تھا —

دکن میں بھی بڑے بڑے اُستاد گذرے ہیں - مگر افسوس ہے کہ مجھکو کوئی ایسا تذکرہ نہیں ملا جس سے میں کچھ مدد لے سکتا - یہاں اب تک بھی اس کا شوق اُمرا

میں باقی ہے - مثلاً نواب خان‌خاناں بہادر ' نواب لطف الدولہ بہادر اور مہاراجہ یمین‌السلطنت سرکشن پرشاد بہادر اچھے خوشنویس ہیں - مہاراجہ بہادر کے ۲۵ - ۳۰ سال پہلے کے لکھے ہوے قطعات میں نے بھی دیکھے ہیں —

جب اُردو زبان گفتگو سے بڑھ کر تحریر میں آنے لگی تو اس نے بھی فطرتاً وہی خط اختیار کیا ' جو اُس زمانے کا پسندیدہ ترین بلکہ ایک حدتک رائج‌الوقت خط تھا - اور سچ پوچھئے تو اُردو بیچاری نے تو آنکھہ کھول کر کوئی دوسرا خط دیکھا ہی نہیں - ابتدا سے جس خط کو دیکھا اسی کو جانا اور اپنے لئے اسی کو پسند کیا —

نسخ اور نستعلیق میں فرق

نسخ اور نستعلیق کا وہ فرق جس پر ان کی بنیادیں قائم ہیں ' الفاظ میں بیان کرنا کم از کم میرے لئے بہت مشکل کام ہے - اس لئے میں جو کچھہ بھی بیان کرونگا وہ زیادہ تر اسی حد تک ہوگا جس حد تک کہ ٹائپ سے اس کا تعلق ہے - مولانا سلطان علی مشہدی کہتے ہیں کہ نسخ اور تعلیق خفی اور جلی ہیں - اور چونکہ ان دونوں سے نستعلیق بنایا گیا ہے' مطلب یہ ہوا کہ خفی اور جلی دونوں کا اس‌میں‌استعمال ہے۔یعنی میرے حساب‌سےنسخ‌کےلکھنے‌میں قلم $\frac{1}{7}$ حصہ ذرا خفی لگتا ہے اور باقی میں پورا قلم ہوتا ہے - تعلیق میں $\frac{1}{4}$ حصے میں بہت ہی خفی قلم‌لگایا جاتا ہے اور باقی میں پورا - مگر نستعلیق میں قریب نصف حصے کے کہیں خفی اور کہیں بہت ہی خفی قلم کا استعمال کیا جاتا ہے - مگر یہ فرق صرف موجدوں کے لئے موزوں ہو سکتا ہے ' ٹائپ بنانے والوں کے نقطۂ نظر سے حسب ذیل تین اہم فرق ہونگے : —

(۱) نستعلیق کے حرفوں کی شکل نسخ کے حرفوں کی شکل سے مختلف ہے اور جیسا کہ علامۂ ابوالفضل نے صراحت کی ہے ' خط نسخ میں لکیریں $\frac{1}{3}$ گول اور $\frac{2}{3}$

سیدھی ہوتی ہیں ' در آنحا لیکہ نستعلیق میں ہر لکیر اگول ہوتی ہے' حتیٰ کہ الف بھی پورا سیدھا نہیں ہوتا' حالانکہ الف کی مثال تیر سے دی جاتی ہے - مثلاً : —

(۲) چھوٹے سے چھوٹے جوڑوں کا بھی مختلف اُنچائی پر ملنا نستعلیق کی امتیازی خصوصیت ہے - مثلاً " منجملہ " اور "لیس" کو لیجئے - اس کو ہم نستعلیق اور نسخ دونوں میں لکھتے ہیں —

اس میں آپ دیکھینگے کہ نستعلیق لکھنے میں ایک جوڑ کے بعد دوسرا جوڑ کچھہ نہ کچھہ نیچے کر کے لگایا جاتا ہے اور ہر حرف جوڑ ملنے کے بعد کچھہ نہ کچھہ ڈھلتا ہوا لکھا جاتا ہے - اوپر کے نمونے میں نسخ لکھنے میں سوائے بیچ کے جیم کے بقیہ جوڑوں کو اگر ایک ہی خط پر ملایا جاے تو نسخ کی خطاطی میں کچھہ زیادہ فرق نہیں پڑتا - لیکن اگر نستعلیق میں کہیں بھی اس چیز کو کم کر دیا جاےتو وہ بہت بدنما ہو جاتا ہے —

(۳) نسخ میں تمام جوڑ قریب قریب ایک ہی موٹائی سے لگاے جاتے ہیں - برخلاف اس کے نستعلیق میں کہیں باریک جوڑ لگایا جاتا ہے اور کہیں موٹا - مثلاً

نسخ نستعلیق

سد سد

سن سن

اس کے علاوہ ہر خوشنویس اپنا اپنا طرز علحدہ رکھتا ہے - اگر ایک شخص شروع کا میم اور عین پورے قلم سے لکھتا ہےتو دوسرا پون یا نصف قلم سے ہی اُس میں خوبصورتی پیدا کردیتا ہے - بہر حال ہزاروں قدیم اسا تذہ کے قطعات وغیرہ دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نستعلیق خط میں باوجود قواعد ہونے کے " ہر کہ آمد عمارت نو ساخت " والا مضمون ہے - دائرہ کوئی بیضوی لکھتا ہے کوئی شمسی، اور کوئی ان دونوں کے بین بین - مطلب اس کا یہ ہوا کہ گو قواعد ہیں، مگر اس پر بہت کم لوگ چلتے ہیں - اور میں تو یہ کہوں گا کہ نستعلیق میں وہی قاعدہ ہے جو آنکھوں کو بھلا معلوم ہو —

ٹائپ کی ضرورت اور لیتھو کے مقابلے میں اُس کی خوبیاں

ٹائپ کی ضرورت کا مسئلہ میرے خیال میں اردو داں ہندی پبلک کے دماغ میں شاید ابھی تیس فی صدی سے زیادہ نہیں ہے ' اُس ضرورت کا احساس کہ ٹائپ کے بغیر ہمارے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہورہی ہے یا نہیں ' سوائے چند فی صدی سمجھ دار دماغوں کے اور کسی کو بھی نہیں ہے - میرے خیال میں پچاس فی صدی تو لوگ ایسے ہیں کہ وہ اب تک یہ بھی نہیں جانتے کہ ٹائپ اور لیتھو کی چھپائی میں کیا فرق ہے چہ جائیکہ ان دونوں کے حسن و قبح سے واقفیت ہو - کہا یہ جاتا ہے کہ " اُردو طباعت باوجود اپنی اس شدید آرزو کے کہ نستعلیقی آہنی حروف کے سانچوں میں ڈھل جائے' اپنی خوبصورتی کو کھونے

کے لئے ہرگز راضی نہ ہوگی" - لیکن اگر غور کیا جاے تو معلوم ہوگا کہ ٹائپ کی چھپائی مزیل حسن ہرگز نہیں ہوسکتی - کیونکہ اگر ٹائپ کی ضرورت ہم کو اس پر مجبور کر رہی ہے کہ ہم اپنے خط میں کچھ رد و بدل بھی کرلیں تو اس سے ہمارے نستعلیق کی خوبصورتی زائل نہیں ہوتی - بلکہ اس دلیل کی بنا پر کہ ہر استاد فن اپنی ایک جدید طرز کا موجد ہوا ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ زمانۂ موجودہ میں جس طرح اور تمام چیزوں میں ترمیم و تنسیخ اور اضافے کا عمل جاری ہے، اسی طرح نستعلیق میں بھی بہ لحاظ ضرورت ایک خفیف حد تک تصرف کیا گیا ہے اور یہ تصرف یافتہ صورت بجاے خود نستعلیق کے ایک جدید طرز کا آغاز کرتی ہے - کیونکہ ہر جدید طرز کسی خاص سہولت اور آسانی کے لحاظ سے نکالی گئی ہے اِس لئے یہ بات نستعلیق ٹائپ میں بدرجۂ اتم موجود ہوگی - اس کی زندہ مثال انگریزی کا ٹائپ ہے - یہ نہیں کہا جا سکتاکہ انگلستان میں اب ہاتھ سے لکھنا کوئی جانتا ہی نہیں - اسی طرح گو نسخ کا ٹائپ بن گیا ہے اور باوجودیکہ اس میں وہ اصلیت بالکل باقی نہیں ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ نسخ کا لکھنے والا اب دنیا میں کوئی رہا ہی نہ ہو - ہیں اور بہت کثرت سے ہیں - کیونکہ ٹائپ کے علاوہ بھی تو دنیا میں رات دن بہت سے کام ہوتے رہتے ہیں - خصوصاً اِس زمانے میں اشتہاری کام میں جس کی طباعت کا کام دنیا میں سب سے زیادہ ہے، ہاتھ کی لکھائی کی بے حد ضرورت ہوتی ہے - ہر ضرورت کے لئے اس کے مطابق سامان فراہم کئے جاتے ہیں - ہم کو جب طباعت کی ضرورت ہے تو ٹائپ ضروری ہے - اور جب ضرورت ہاتھ کی لکھائی کی ہو تو خطاطی ضروری ہے - بہر حال جس طرح ہر کام اپنی اپنی علحدہ علحدہ نوعیت رکھتا ہے - اسی طرح اس کے لئے سامان بھی فراہم کئے جاتے ہیں - لہذا یہ کہنا کہ اِدھر ٹائپ بنا اور اُدھر خوشنویس اور خوشنویسی دونوں مٹ جائیں گے ایک مہمل سی بات ہے - بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ موجودہ خوشنویسوں کی قدر بڑھ جائے گی —

کیا میں یہ دریافت کرسکتا ہوں کہ آج کل جو عام طور پر (خاص کو چھوڑ دیجئے کہ وہ ہر ایک طباعت کے لئے ہر کس و ناکس کو میسر نہیں آسکتی) لکھائی ہو رہی ہے۔ اس میں کتنے فی صدی لکھنے والے ایسے ہیں جو خوشنویسوں کے زمرے میں شامل کئے جاسکتے ہیں - میں تو یہی کہوں گا کہ اس موجودہ "خوشنویسی" کا تو استیصال ہی اچھا ہے کہ نہ اس قسم کی لکھائی ہوگی اور نہ ہماری اُردو بدنام ہوگی۔

آپ کو معلوم ہے کہ ٹائپ نہ ہونے سے اردو کو کیا کیا نقصان پہنچ رہا ہے - اگر ہمارے ہاں ٹائپ ہوتا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت جس قدر لوگ اردو جانتے ہیں ان سے دس گنا زیادہ جانتے- کیونکہ دوسری قوم والے جب آپ کی آج کل کی چھپی ہوئی کتابیں ہاتھہ میں لیتے ہیں تو ان کو اس قدر کراہت آتی ہے کہ پڑھنا تو درکنار ورق گردانی بھی پسند نہیں کرتے - آپ کے ہاں تصاویر نہیں چھپ سکتی ہیں - صحیح نہیں چھپتا ہے - اس کے علاوہ بہت سی ایسی باتیں (جن کا ذکر آگے آئے گا) مل گئی ہیں کہ جن کو ذراسی بھی انگریزی آتی ہے وہ کبھی اُردو کا اخبار تک بھی نہیں دیکھتے —

یہ یاد رکھئے کہ موجودہ ضروریات کے مد نظر آج نہیں تو کل، اور کل نہیں تو پرسوں، حیدرآباد میں ہو یا دنیا کے کسی اور گوشے میں، اگر اردو کو دنیا میں زندہ رہنا ہے تو وہ اپنا ٹائپ بناکر رہے گی (خواہ وہ نستعلیق ہو یا مخالفتوں سے مجبور ہوکر نسخ یا ہندی کیریکٹر اختیار کرلیا جائے - اور اگر ٹائپ نہیں بنا یا اختیار نہیں کیا گیا تو وہ زمانہ دور نہیں ہے کہ اردو فنا ہوجاے، کیونکہ تعلیم روزانہ ترقی کر رہی ہے، جب آج تعلیم یافتہ دوسری زبانوں کی بہترین مطبوعات دیکھتے ہیں تو اپنی طباعت پر آنسو بہاتے ہیں، تو کل تو یہ رونا اور بھی زیادہ ہوجاے گا - بہر کیف ٹائپ ضرور بن کر رہے گا اور ہمارا آج کل کا یہ قول کہ "ہم کو ایسے ویسے ٹائپ کی ضرورت نہیں ہے" آئندہ آنے والی نسلوں کے ہاتھہ میں ہم کو مورد ملامت بنانے کا ایک اچھا آلہ ہوگا۔

اس واسطے کہ ان کی ضرورتیں ہم سے بدرجہا زیادہ ہوں گی ۔ دنیا کے ہر مذہب اور متمدن قوم کی زبان کا ایک ٹائپ موجود ہے، مگر نہیں ہے تو ہماری اُردو کا۔ اس سے غالباً یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ ہم اب تک مہذب قوم کہلانے کے مستحق نہیں ہیں ۔ اس زمانے کی تعلیمی اور کاروباری زندگی میں طباعت کی جس قدر ضرورتیں بڑھ گئی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں —

آج کل طباعت کے عام طور پر دو طریقے رائج ہیں ۔ ایک لیتھو پریس* اور دوسرا ٹائپ پریس ۔ ثانی الذکر طریقہ اول الذکر کی نسبت بہت بہتر، آسان، ارزاں اور تیز کام کرنے والا ہے ۔ اس واسطے یہی طریقہ سوائے ہندوستان کے جہاں خط نستعلیق کی اب تک پوجا کی جارہی ہے، باقی تمام دنیا میں رائج ہے ۔ یہ میں مانتا ہوں کہ نستعلیق خط دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت خط ہے، مگر "پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان"—

ٹائپ کے طریقۂ طباعت کو جو ترجیح ہمارے موجودہ لیتھو کے طریقۂ طباعت پر ہے، اسے واضح کرنے کے لئے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر ان دونوں طریقوں کا مقابلہ کرکے دکھا دیا جائے تاکہ پبلک کو یہ تو معلوم ہوجائے کہ لیتھو کی چھپائی سے جو نفرت کی جارہی ہے اس کے کیا اسباب ہیں اور ٹائپ پریس میں ایسی کیا خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے اس کا استعمال ناگزیر ہوگیا ہے ۔ ان میں سے چند سطور ذیل میں عرض کرتا ہوں :-

* یہاں میں یہ بتادینا مناسب سمجھتا ہوں کہ لیتھو کا جو جدید طریقہ آج کل یورپ میں خاص خاص کاموں کے لئے رائج ہے ۔ وہ ٹائپ سے بہت خوبصورت اور بہت بہتر ہے ۔ مگر اول تو اس پر خاص خاص کام ہی کئے جاتے ہیں، دوسرے وہاں اس طرح سے پتھر نہیں استعمال کئے جاتے، جیسے کہ ہندوستان میں ہوتے ہیں ۔ بلکہ وہاں یہی کام الیومونیم کی پلیٹوں پر کیا جاتا ہے ۔ اس کی مشنری بھی خاص ہوتی ہے اور میرے خیال میں ایسی مشین ہندوستان میں کوئی نہیں ہے، مگر یہ خیال رہے کہ وہ اس لیتھو پریس سے ٹائپ کا کام نہیں لے رہے ہیں، بلکہ اس کا استعمال خاص نوعیت رکھتا ہے جن کو ہم ابھی سمجھ بھی نہیں سکتے ہیں —

(۱)اُردو مصنفین کو اگر ذرا بھی اچھی چھپائی کی ضرورت ہوتی ہے تو سب سے پہلے ان کو اچھا کاتب تلاش کرنا پڑتا ہے - قسمت سے اگر اچھا مل گیا تو فبہا ورنہ وہی عام بازاری خط اُن کو ملے گا اور مجبوراً اُن کو قبول کرنا پڑے گا- بر خلاف اس کے ٹائپ کا خط اچھا ہو یا برا یکساں ہوگا اور ہر جگہ آپ کو اور ہر کس و ناکس کو بغیر کسی خاص جستجو یا منت و سماجت کے مل جاے گا —

(۲) قسمت سے کہئے یا بد قسمتی سے اگر کوئی اچھے کاتب صاحب مل بھی گئے اور آپ نے اپنا کام اُن کو دے بھی دیا تو بس اب آپ پر ایک مصیبت نازل ہوگئی روزانہ صبح و شام اُن کے در دولت کی حاضری آپ کے فرائض میں داخل ہوگئی - پھر اُن کی عشوہ طرازیاں ' پیشگی مطالبات ' غرض ایک عذاب ہے ' جس سے خدا ہی نجات دے سکتا ہے ۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ " زر دادن و درد سر خریدن " کی مثل ایسی ہی صورتوں پر صادق آتی ہے اس پر بھی ظالم اکتفا نہیں کرتے - زیادتی اجرت کے علاوہ وعدہ خلافی تو اُن کے آگے کوئی چیز ہی نہیں - وقت پر کام نہ دینا وہ اپنی شان سمجھتے ہیں - بر خلاف اس کے ٹائپ پریس میں معمولی آٹھ بارہ آنے روز کا مزدور وہی خط کمپوز کرتا ہے جو ایک اعلیٰ خوش نویس نے ایک مرتبہ بنادیا ہے

(۳) لیتھو پریس کی چھپائی ہندوستان میں جیسی کچھ ہورہی ہے ' ظاہر ہے -اگر علی الکاتب اور عبدالرشید بھی زندہ ہو کر آجائیں اور کاپیاں لکھنی شروع کردیں تو بھی سنگ سازی اور چھپائی کے مرحلوں کے طے کرنے کے بعد نتیجہ برابر ہی رہیگا - اور اُن کی اور موجودہ خوشنویسوں کی کتابت میں سر مو فرق نہ ہوگا ۔ کاتب بیچارہ کتنی ہی محنت کیوں نہ کرے' چھپائی سے سب پرپانی پھر جاےگا اور کتاب چھپ کر ایسی شکل سے آپ کے ہاتھ میں آئیگی کہ آپ اپنا سر پیٹ پیٹ لینگے - کاپی کا پتھر پر جمانا اور پھر ہر ہر کاغذ کے لئے مختلف ہلکی اور بھاری داب کا دینا بھی ایک مستقل فن ہے ۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن پر طباعت کی اچھائی اور برائی کا انحصار ہے - لہذا بہترین پریس مین کی آپ کو ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ

" بہترین " ہوتے ہیں اس لئے ان میں بھی بفضلہ تعالیٰ وہ تمام باتیں موجود ہوتی ہیں جو کاتب صاحب میں پائی جاتی ہیں اور یہ دوسرا عذاب ہے ۔ اس کے مقابلے میں ٹائپ پریس میں معمولی کام جاننے والا بھی بخوبی کام چلا سکتا ہے —

(۴) لیتھو کی کاپیوں میں جس رنگ کی روشنائی اور کاغذ استعمال کیا جاتا ہے ان کا دیکھنا اور تصحیح کرنا ایک بڑا مرحلہ ہے ۔ میرے خیال میں ان کی تصحیح سے تصنیف کا کام زیادہ آسان ہے ۔ ان کاپیوں میں الف اور نقطے تو بعض اوقات دکھائی ہی نہیں دیتے ۔ اسی سبب سے باوجود دیدہ ریزی کے غلطیاں رہ جاتی ہیں۔

(۵) تصحیح کی مصیبت یہیں ختم نہیں ہوتی ، بلکہ اگر آپ نے پنسل سے تصحیح کر کے کاپی کاتب صاحب کو واپس کردی ہے تو اب وہ جو اس کی درستی کرینگے تو آپ ملاحظہ فرمائینگے کہ انشاءاللہ جس قدر غلطیاں آپ نے درست کی تھیں اُس سے زیادہ ہی کاپی میں اور موجود ہیں، دو چار مرتبہ کی الٹ پھیر میں سخت محنت اُٹھانے اور آنکھوں کا تیل نکالنے کے بعد جب ان کا پروف مطبع سے آئیگا تو کیا مجال ہے کہ غلطیاں باقی نہوں ۔ اگر ڈرتے ڈرتے کاتب صاحب کی توجہات عالیہ کو اس طرف مبذول کرایا گیا تو جواب ملتا ہے کہ "آپ نے درست ٹھیک طرح سے نہیں کیا ہوگا"

(۶) ان کاپیوں کے ساتھ ایک مصیبت یہ بھی ہے ۔ یعنی اگر آپ کی تصحیح وغیرہ میں کچھ دیر ہوجائے تو پھر پتھر پر کاپی اچھی نہیں اُٹھتی اور تازہ کاپی میں جوبات ہوتی ہے وہ اس میں باقی نہیں رہتی —

(۷) ان تمام مراحل کے بعد سنگ ساز صاحب " نوبت مجنوں برفت و نوبت ماست " کے نعرے لگاتے ہوے میدان طباعت میں گامزن ہوتے ہیں ۔ آپ اگر پروف میں خدانخواستہ ایک آدھ لفظ بنا دیں تو وہ اس کو یقیناً الٹا لکھینگے جو قطعی خوبصورت نہیں ہوسکتا ۔ اس پر بھی اگر آپ نے " رضینا با لقضینا " کہدیا تو یقین جانئے کہ آس پاس کا ایک نہ ایک حرف یا نقطہ ضرور سنگ ساز صاحب کے بھینٹ چڑھ جائیگا ۔ اور جب کتاب چھپ کر تیار ہوگی تو آپ کو ایک غلط نامہ الگ چھپوا نے

کی ضرورت پڑیگی - اور غلط نامہ بھی الله چاھے تو غلطیوں سے مبراند ھوگا - کیا ٹائپ کی چھپی ھوی کتابوں میں بھی آپ اس قدر غلطیاں دیکھتے ھیں —

(۸) لیتھو کی سیا ھي کے پھیلن کو غلط لگانے یا غلط داب دینے میں کسی جگہ سے نقطے یا صفر کا اُڑ جانا یا بلا ضرورت کسی جگہ ان کا بڑہ جانا تو کوئی بڑی بات ھی نہیں ھے - مثلاً اگر آپ نےکہیں ھندسوں میں (۱۰۰) لکھدیا ھے تو اُس کا (۱۰) رہ جانا یا (۱۰۰۰) ھو جانا نہایت آسان ھے - یہ دوسری بات ھے کہ اس حذف یا ایزاد سے آپ کی ذمہ داری میں کمي یا بیشی ھو جاے - یا اسی طرح بابو کا یا بو ا اور یابو کا بابوھو جاے اور آپ حیران ھوں کہ آخر ان دونوں میں سے یہاں کون سے جانور کا ذکر ھے —

(۹) لطف تو اُس وقت آتا ھے جب کہیں سے کاتب صاحب ایک آدہ سطر کھا جاتے ھیں - اب جو اِدھر اُدھر سے چھیل چھال کر جگہ نکالی جاتی ھے اور غائب شدہ مضمون بڑھا یا جاتا ھے تو بس پھر کیا ھے ' لکھیں موسیٰ پڑھیں خدا —

(۱۰) لیتھو کی چھپائی میں بلاک یا تصاویر کی چھپائی غیر ممکن ھے - اگر دوھری چھپائی کی جاے تو اخراجات نا قابل برداشت ھو جاتے ھیں —

(۱۱) سب سے بڑی خرا بی جو لیتھو میں پڑتی ھے وہ مطبوعات پر لاگتکی زیادتی ھے - یہ سچ ھے کہ دو چار سو کی تعداد تک تو لیتھو کا مقابلہ ٹائپ نہیں کرسکتا مگر جہاں دو چار ھزار کی چھپائی ھو وھاں لیتھو کی لاگت ٹائپ سے سہ گنا زیادہ ھو جاتی ھے - مگر چھپائی پر خیال نہ کر کے لوگ کتابت اور کمپوزنگ کا مقابلہ کرتے ھیں - گوکمپوزنگ میں دونی لاگتآتی ھے مگر چھپائی میں چار چند زیادہ خرچ ھو جاتا ھے - مثال کے طور پر ھم ٹائپ کے پرانے قسم کے دستی پریس سے مقابلہ کرکے بتاتے ھیں کہ لیتھو کے دستی پریس میں $\frac{20 \times 30}{8}$ کے سائز کے چار صفحوں سے زیادہ نہیں چھپ سکتے - ٹائپ کےعام پرانےقسم کےدستی پریس * میں ایسےچھ صفحے آتے

* اس میں ایسے پریس بھی آتے ھیں جس میں ایسے آٹھ صفحے آسانی سے چھپ سکتے ھیں - مگر چونکہ وہ عام طو پر نہیں ھیں اس لئے ھم انکو چھوڑ دیتے ھیں- ورنہ اگر اُن سے مقابلہ کیا جائیگا تو اس سے بھی دو گنا فرق آئیگا —

ھیں ، مگر چار صفحے ھی طبع کئے جاتے ھیں - لیتھو کی چھپائی سستی سے سستی چار روپے ھزار داب مل سکے گی اور ٹائپ پریس میں صرف دو روپے صرف ھونگے، اب حساب لگا لیجئے کہ ھر ھزار پر اتنا فرق پڑتا جاے تو پوری کتاب پر کتنا فرق آجائیگا - اِس کے کئی وجوہ ھیں - ایک تو لیتھو کی سیاھی گراں ھے، دوم لیتھو پریس پر تین آدمی کام کرتے ھیں اور اس پر دو - سوم لیتھو میں پریس مین کی خاص ھوشیاری کی اور ٹائپ میں معمولی واقفیت کی ضرورت ھے —

اگر رنگین کام کا مقابلہ کیا جاے تو آٹھ گنا فرق پڑ جاتا ھے - لیتھو کی رنگین سیاھیاں بہت ھی گراں ھوتی ھیں - اسی وجہ سے آپ دیکھتے ھیں کہ ھمارے ھاں رنگین چھپائی بہت کم دکھائی دیتی ھے - مزید برآں ٹائپ کی جدید ترین دستی مشینیں Treadle اگر استعمال کی جائیں جو ھاتھ کی طاقت سے ھی چلتی ھیں تو اس پر کام کرنے کے لئے صرف ایک لڑکے کی ضرورت ھوتی ھے جو دن بھر میں دو تین ھزار داب نہایت آسانی سے نکال دیتا ھے اور آپ کو صرف ایک روپیہ آٹھ آنے فی ھزار داب مل سکتی ھے - بر خلاف اس کے لیتھو میں تین اچھے قوی مضبوط آدمی سارا دن محنت کر کے بھی بارا سو سے زیادہ داب نہیں نکال سکتے - اس سے مزدوری کا حساب آپ خود ھی کرسکتے ھیں - ستم ظریفی یہ ھے کہ ھر ھزار داب کے بعد دو بارہ سنگ ساز صاحب کی "نوبت" تشریف آتی ھے - اگر چہ لیتھو میں آپ کا خط بہتر سے بہتر آسکتا ھے، مگر سب سے بڑی بات تو یہ ھے کہ لیتھو میں لاکھ کوشش کی جاے وہ صفائی اور پاکیزگی ھرگز ھرگز نہیں آتی جو ٹائپ کی معمولی چھپائی میں ھوتی ھے - اس لئے ھم مجبور ھیں کہ ٹائپ کا طریقۂ طباعت اختیار کریں اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں کہ یا تو نسخ اختیار کرلیا جاے یا پھر کسی قدر ایثار سے کام لے کر نستعلیق کا ٹائپ تیار کیا جاے —

نسخ ٹائپ کی ایجاد

نسخ ٹائپ کی سب سے پہلی کتاب کا پتہ چلانے کی میں نے بہت کوشش کی - مجھکو جو مواد مل سکا ہے وہ یہ ہےکہ اس ٹائپ میں کتاب " فی ذکر امیر تیمور " تالیف احمد بن عربشاہ سب سے پہلے سنہ ۱۶۳۶ ء میں اٹلی میں طبع ہوی ہے- میں نے یہ معلوم کرنے کی بے حد کوشش کی کہ سب سے پہلا نسخ ٹائپ کہاں بنا اور کب بنا ، لیکن افسوس کہ میں اس میں کامیاب نہ ہوسکا —

اس کتاب کے ٹائپ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ ابتدائی کوشش نہیں ہے تو کم از کم اُس کے قریب کی ضرور ہے - کیونکہ حروف کی شکل بھدی اور جوڑ اچھی طرح نہیں ملے ہوے ہیں - دوم اس میں کوشش کی گئی ہے کہ کرسیاں بھی دی جائیں - یہ کرسیاں کہیں تو خاصی آگئی ہیں . اور کہیں اگر نہیں آسکی ہیں تو ان کی شکل کچھہ عجیب ہوگئی ہے . سوم حروف کے جوڑ بہ صورت الفاظ اور بھی زیادہ برے معلوم ہوتے ہیں - جہاں ایک کرسی ہے وہ لفظ خاص ہے مگر جہاں دو کرسیاں دینی پڑی ہیں - وہاں نیچے کی کرسی کو نشست سے بھی نیچے گرا کر استعمال کیا گیا ہے - بہرحال چونکہ وہ ابتدائی کوشش تھی، اس لئے ہم اعتراض کی بجاے تعریف کریں گے کہ باوجود مشکلات کے اس کے بنانے والوں نے ہمت نہ ہاری - اور یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج نسخ کا بہترین ٹائپ بتدریج ترقی کر کے دنیا کو میسر آرہا ہے - اگر اسی وقت اُس کی یہ خرابیاں دیکھہ کر " ہم کو نہیں چاہئے " کے نعرے لگادیے جاتے تو نسخ کا بھی آج وہی حشر ہوتا جو نستعلیق کا ہے، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نسخ ٹائپ کے استعمال کر نے والے ہم سے زیادہ سمجھدار تھے اور اپنی بھلائی برائی اچھی طرح جاننے والے تھے —

ذیل میں ابتدائی ٹائپ اور موجودہ ٹائپ کے نمونے دیے جاتے ہیں ، جس سے ناظرین بخوبی اندازہ کرسکیں گے . کرسیوں کی جو مشکلات نسخ میں پیش آئی تھیں

اُن کو کس طرح ضرورت اور آسانی کے لحاظ سے نکال دیا گیا - اگر وہ ایسا نہ کرتے تو آج جو نسخ ٹائپ کی عمدہ عمدہ خود بخود کمپوز کرنے والی (Mechanical Composing) مشینیں کام کر رہی ہیں وہ صرف خواب و خیال ہی ہوتیں- اور عربی بولنے والی قومیں ہرگز اس قابل نہ ہوسکتیں کہ ایک بڑے سے بڑے اخبار کے دن بھر میں صباحی اور مسائی در دو ایڈیشن معہ تصاویر کے نہایت اطمینان کے ساتھ نکال دیں

جدید نسخ ٹائپ

قدیم نسخ ٹائپ

الحجر

نسخ ٹائپ کے ہندوستان میں رواج نہ پانے کے اسباب

میں اوپر کہیں بیان کرچکا ہوں کہ خط نستعلیق ہندوستان میں اردو زبان کے پیدا ہونے سے پہلے رائج ہوچکا تھا - اور یہ بھی مسلم ہے کہ ہندوستان کی معاشرت اور تمدن پر ایران کی معاشرت اور تمدن کا بہت زیادہ اثر تھا - اس لئے جب اُردو پیدا ہوئی تو وہی ایران کا پسندیدہ خط نستعلیق اُردو میں بھی رائج ہوگیا - اس خط سے عام طور پر یہاں کے لوگ مانوس ہوچکے تھے - ہندوستان کو جب طباعت کی ضرورت محسوس ہوی تو اس وقت لیتھو پریس بھی ایجاد ہوچکا تھا - اور چونکہ لیتھو میں نستعلیق خط آسانی سے لکھا جاسکتا تھا اور خط نسخ یا نسخ کے ٹائپ سے ان کی طبیعتیں قطعی

مانوس نہ تھیں اس لئے لیتھو کو انھوں نے غنیمت سمجھ کر قبول کرلیا - دوسرے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ لیتھو کا پریس بہت سستے داموں میں قائم ہوجاتا تھا۔ بہر حال سب سے زیادہ قابل لحاظ جو چیز ہوسکتی تھی وہ نسخ اور نستعلیق کا وہی فرق ہے جس کا میں اوپر نسخ اور کوفی کے مقابلے میں ذکر کرچکا ہوں' یعنی نگاہ اور دماغ پر نسخ ٹائپ کے پڑھنے میں بہ نسبت نستعلیق کے زیادہ بار پڑتا ہے۔ اس کے امتحان کا نہایت آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ نسخ کی لکھی ہوی ایک عبارت کو اچھی طرح حفظ کرلیجئے اور ایک نستعلیق تحریر لیجئے جو بالکل نئی ہو اور آپ نے اس کو پہلے کبھی دیکھا بھی نہ ہو۔ اب آپ نسخ کی حفظ شدہ تحریر کو دیکھ کر پڑھیے اور اس کے مقابلے میں نستعلیق کی بالکل نئی عبارت کو پڑھئے - آپ کو خود ہی معلوم ہوجاے گا کہ باوجودیکہ نسخ کی عبارت کو آپ نے حفظ کرلیا تھا تاہم اس کے پڑھنے سے آپ کے دماغ اور آنکھوں پر زیادہ بار پڑتا ہے - بہرحال میری دانست میں یہی صورت حال نسخ ٹائپ کے ہندوستان میں رائج نہ ہوسکنے کی وجہ موجب تھی - یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ اردو زبان کو اب تک ایسی شدید ضرورت لاحق نہیں ہوی تھی جیسی کہ اب ہے' اس لئے نسخ کی طرف کوئی اعتنا نہیں کیا گیا' ورنہ شاید "قہر درویش بر جان درویش" کا فلسفہ یہاں بھی اثر دکھلا جاتا —

نستعلیق ٹائپ کی مختصر تاریخ

لیتھو چھپائی کی خرابیاں ہم کو (یعنی ان لوگوں کو جن کو دعوی ہے کہ اُردو اُن کی مادری زبان ہے) اب کچھ روز سے محسوس ہو رہی ہیں - مگر آج سے سوا سو سال پہلے ہمارے غیر ملکی حکمراں ان سے اچھی طرح واقف تھے - اسی بنا پر اُنھوں نے کوششیں کیں کہ ہمارے جاگنے سے پہلے ہی ہمارے واسطے یہ نعمت تیار کر رکھیں - مگر ہر کام کے لئے قدرت نے ایک وقت مقرر کردیا ہے - جس حد تک نستعلیق ٹائپ کا تعلق ہے' خدا ہی جانے کہ وہ وقت کب آئے گا' یہ بھی کچھ کم خوش نصیبی نہیں ہے کہ ہمارے ذمہ دار اور اردو کے ترقی خواہ افراد اب کچھ

روز سے کوشش کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح لیتھو کے طریقۂ طباعت کی مصیبت سے ان کو آزادی مل جائے - مگر یہ آزادی کسی طرح حاصل ہی نہیں ہوچکتی - سوال یہ ہے کہ آخر کوئی صورت بھی ایسی ہوسکتی ہے کہ لیتھو کی بلائے مبرم سے اردو کی جان زار کو چھٹکارا نصیب ہو تو اُس کی وہی دو چار صورتیں ہوسکتی ہیں کہ یا تو نسخ یا ہندی یا رومن وغیرہ اختیار کرلئے جائیں یا نستعلیق کا ٹائپ جلد سے جلد تیار ہو جائے —

اب تک جس قدر بھی نستعلیق ٹائپ تیار ہوے اور ان میں سے جن جن کا مواد مجھے مل سکا وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) کسی صاحب نے اخبار رعیت میں نستعلیق ٹائپ کی کچھہ تاریخ لکھی ہے کہ سنہ ۱۸۰۵ ء میں سب سے پہلے ٹائپ کی کوشش کی گئی تھی' یہ واقعہ صحیح ہے- یہ ٹائپ سرکاری مطبع میں تیار کیا گیا تھا - اس مطبع کا نام ہندوستانی پریس تھا- اس پریس میں بہت سے آدمی کام کرتے تھے - جہاں تک اس کا حال معلوم ہوسکا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ نستعلیق ٹائپ بنانے کے لئے کئی خوشنویس اور کاریگر وغیرہ تھے - یہ عملہ تقریباً چالیس برس تک قائم رہا اور برابر کوشش کرتا رہا کہ اس میں آسانی کے ساتھہ ساتھہ خوبیاں بھی پیدا ہوجائیں - گویا سنہ ۱۸۰۵ ء میں جس کوشش کا آغاز ہوا تھا اور جو برابر چالیس برس تک جاری رہی وہ کوئی انفرادی کوشش نہ تھی بلکہ اس میں وہی شان موجود تھی جو ایک اجتماعی کوشش اور مشترکہ کاروبار میں ہونا چاہئے- کیونکہ جس تک حد انتظام کا تعلق ہے 'خود حکومت اس کی منتظم تھی - جس حد تک خط کی عمدگی کا تعلق تھا متعدد خوشنویس ملازم تھے اور یہ ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ کس طرح آسانی کے ساتھہ کسی نقطے کی نشست یا طرزتحریر میں اس طرح اصلاح کی جا سکتی ہے کہ خوبصورتی بھی باقی رہے اور ٹائپ کی ضروریات بھی پوری ہو جائیں اسی طرح ہر ہر کام کے لئے ماہرین کا ایک پورا عملہ موجود تھا - اور پھر جب

یہ صورت تھی تو یہ کہدینا کہ اب تک اس سلسلے میں " جس قدر کوششیں ہوئیں وہ سب انفرادی حیثیت رکھتی ہیں"۔ درست نہ ہوگا ۔ سنہ ۱۸۴۸ ء میں جو کتابیں اس ٹائپ میں طبع کی گیئں ان میں بہت کچھہ اصلاح کرلی گئی تھی۔ کاش ہمارا ملک اس وقت اس قدر بیدار ہوچکا ہوتا کہ وہ اس کی ضرورت کا احساس کر لیتا تو آج ہم کو یہ افسوس نہ کرنا پڑتا کہ وہ تباہ ہوگیا اور اگر اس سے کچھہ بھی دلچسپی ملک کی طرف سے ظاہر کی جاتی تو اس میں لازمی طور پر بہت کچھہ ترقی ہوجاتی۔ اس ٹائپ کی چھپی ہوئی کتابیں اب بھی مل جاتی ہیں۔

(۲) اس کے بعد مصر اور ایران * نے کوششیں کیں ۔ مصر کی کوشش کا نمونہ تلاش کرنے پر بھی میں اب تک نہیں دیکھہ سکا ۔ البتہ ایران میں ملکم خاں نے جو ٹائپ تیار کیا تھا اس کی چھپی ہوئی گلستاں میں نے دیکھی ہے یہ انگریزی حروف کی طرح علحدہ علحدہ حروف ہیں ۔ مثلاً گلستاں کو اس طرح لکھا گیا ہے کہ ہر ہر حرف ایک دوسرے سے بالکل جدا جدا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایسے انفرادی حروف کہاں تک مقبول عام ہوسکتے تھے —

(۳) کچھہ عرصہ ہوا کہ الہ آباد † میں بھی ایک نستعلیق ٹائپ میں کچھہ کتابیں چھپی تھیں ۔ یہ ٹائپ غالباً الہ آباد والوں نے اکانو میکل پریس لاہور سے خریدا تھا ۔ مگر نہ اب لاہور کا اکانو میکل پریس ہی باقی ہے اور نہ الہ آباد

---

* میں نے سنا ہے کہ پیرس میں بھی ایک نستعلیق ٹائپ تیار کیا گیا تھا ۔ اور کچھہ کتابیں بھی اس سے طبع ہوئی تھیں مگر میں نے کوئی کتاب باوجود تلاش کے اب تک نہیں دیکھی ہے ۔ اس لئے میں کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا ۔ کہ وہ ٹائپ کیسا تھا اور کیوں رائج نہ ہوسکا ۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ اور ملکوں میں بھی نستعلیق ٹائپ بنا ہو ۔ لیکن میرے پاس کوئی مواد نہیں ہے —

† مجھے معلوم ہوا ہے کہ الہ آباد میں آج کل پھر اس کی کوشش کی جارہی ہے ۔ لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ کن اصول کے تحت یہ نیا ٹائپ تیار ہو رہا ہے ۔ اس امر کا بہر حال ہم کو یقین رکھنا چاہئے کہ گذشتہ خرابیوں کو دور کرتے ہوئے نیا ٹائپ تیار کیا جاے گا ۔ اور گذشتہ ٹائپوں سے یقیناً بدرجہا بہتر ہو گا —

ھی میں کوئی ٹائپ موجود ھے —

(۴) ازاں بعد حیدر آباد کا نمبر آتا ھے - اس میں سب سے پہلی کوشش مولوی نظام‌الدین حسن صاحب مرحوم کی ھے - ان کی کوشش یہ تھی کہ حروف انگریزی ٹائپ کی طرح علحدہ علحدہ لکھے جائیں —

(۵) و (۶) ان کے بعد مولوی یوسف‌الدین صاحب مرحوم اور راجہ صاحب دوم کنندہ ھیں - ان ھر دو اصحاب کی کوششیں قریب قریب یکساں ھیں - یعنی دونوں نے اول تو حرفوں کو علحدہ علحدہ کیا ھے پھر اُس پر شکلیں بھی بدلی ھیں اور ایسا معلوم ھوتا ھے کہ گویا پھر دو ھزار سال پہلے کا خط رائج کرنا چاھتے ھیں -

(۷) راجہ صاحب دوم کنندہ کی مذکورۂ بالا پہلی کوشش تھی - اس کے بعد انھوں نے غالباً جب یہ دیکھا کہ یہ تو ایک عجیب چیز بن گئی ھے تو اُن کا خیال نسخ کے اصول کی طرف پلٹا - تقریباً دو تھائی سال کا عرصہ ھوتا ھے کہ مجھے بھی راجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ھونے کا شرف حاصل ھوا تھا - راجہ صاحب نے نہایت مہربانی سے اپنی تمام کاوشیں مجھے دکھائیں - اُن کی آخری کوشش یعنے اصول نسخ کا اختیار کرنا ذرا بہتر ھے - اس کے اُنھوں نے لکڑی کے حروف بنا رکھے ھیں - حروف کی شکلوں میں صرف اس قدر ترمیم کی ھے کہ وہ نستعلیق کے حروف معلوم ھوتے ھیں - تمام جوڑ ایک ھی لائن پر ملتے ھیں اور یہ بالکل ایسا ھی ھے جیسا کہ مولوی عبدالکریم حسین صاحب نے جرمنی * کا بنا ھوا نمونہ کھینتی ٹائپ

---

* جرمنی کا بنا ھوا ایک نستعلیق ٹائپ دھلی میں بھی آگیا ھے میں نے اس کو بھی دیکھا ھے - نہایت بدصورت اور بے قاعدہ ھے - بلکہ یہ کہنا چاھئے کہ اب تک جس قدر بھی نستعلیق کے متعلق تجربے کئے گئے اس نے اُن سب پر بدصورتی میں فوقیت حاصل کرلی ھے - موتے اور پتلے جوڑ جو نستعلیق کی خصوصیت تامہ ھے بالکل نظر انداز کردی گئی ھے - کرسیاں بھی صرف دوھی دی گئی ھیں ؛ نشست اچھی نہیں ھے - آخر میں ملنے والی یاے مجہول (انگچرز کے علاوہ) اور یاے معروف میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا ھے - بر حال یہ ایک بالکل ھی بےکار چیز ھے —

میں پیش کیا تھا - اگر اس‌کو نستعلیق کہا جاسکتاہے تو میرے خیال‌میں اس کو ضرور اختیار کرلینا چاھئے - کیونکہ اس کی وجہ سے سیکڑوں مشکلات سے بچ سکتے ہیں -

(۸) میں نے ایک کتاب " انگریزی محاورات نمبرا " پنجاب اکانو میکل پریس لاھور کی چھپی ھوئی دیکھی ھے' جو سنہ ۱۹۰۶ ع کی مطبوعہ ھے - اس میں جو نستعلیق ٹائپ استعمال کیا گیا ھے' میرے خیال میں اُس وقت تک کی جس قدر بھی کوششیں ھوئی تھیں سب سے بہتر ھے - البتہ خوش خطی میں دارالطبع سرکار عالی کے برابر نہیں آتا - اس میں غالباً پانچ سو سے لے کر چھہ سو تک جوڑ اور لیگچرز * ھیں - کرسیاں بھی گو صرف دو ھی دی گئی ھیں اور نشست بھی خراب ھے مگر اس طرح سے یہ دی گئی ھیں کہ نشست کی یا کرسیوں کی خرابی سر سری نگاہ میں بری نہیں معلوم ھوتی - البتہ جوڑ بہت خراب ملے ھوے ھیں اور نقطے بھی علحدہ ھیں - پھر بھی یہ ایک بہت کامیاب ٹائپ ھے - میں نہیں کہہ‌سکتا کہ یہ ٹائپ کہاں گیا اور کیوں اس کو بے کار کردیا گیا —

(۹) چند سال ھوے کہ بمبئی کی گجراتی ٹائپ فاؤنڈری نے ایک نستعلیق ٹائپ تیار کیا ھے - یہ اس وقت حیدرآباد میں دو جگہ موجود بھی ھے - حروف سے نقطے علحدہ ھیں ؛ خط بھی اچھا نہیں ھے ؛ میں اس فاؤنڈری میں جا کر مالک سے مل چکا ھوں ' میں نے اس کے متعلق کچھہ گفتگو بھی کی ' مگر اس کے مالک اور کار کن سب کے سب نستعلیق سے واقفیت تو در کنار اُردو بھی بہت کم بول سکتے ھیں - میں نے اُن سے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ وہ کیوں اس میں ذرا سی ترقی اور نہیں کرتے ھیں - مگر انھوں نے مجبوری کا اظہار کیا - اس کے جوڑ نے میں

---

* لیگچر Ligature ایسے حرفوں کے مجموعے کو کہتے ھیں ' جس میں ایک سے زیادہ حروف ایک ھی ٹکڑے میں ملے ھوے ھوں - انگریزی میں fi یا ff وغیرہ ھوتے ھیں اسی طرح نسخ یا نستعلیق میں بھی کے یا کا وغیرہ بنالئے جاتے ھیں -

نقطے اگانا ' جوے شیر لانے سے کم نہیں ھے —

(۱۰) پانچ چھہ سال کا عرصہ ھوتا ھےکہ بیروت کی ایک فاؤنڈری سے نستعلیق ٹائپ کا چھپا ھوا ایک نمونہ آیا تھا - دیکھنے سے بہت خوبصورت معلوم ھوتا تھا - مگر بقول مشہور " جو گرجتے ھیں وہ برستے نہیں " یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ بمبئی والے ٹائپ سے بھی زیادہ مشکل ھے - دارالطبع سرکار عالی نے اس کی خوبصورتی اور اپنی ضروریات کو دیکھتے ھوے اُس کا آرڈر دیدیا - جب وہ یہاں پہنچا تو معلوم ھوا کہ یہ تو ایک اچھا خاصا کھلونا ھے اس میں اُنھوں نے یہ ترکیب رکھی ھے کہ مثلاً شروع کی (ب) ھے ' اس کے اُوپر تین نقطے اور نیچے دو نقطے دیدئے ھیں - اب اگر آپ کو (ب) کا استعمال مقصود ھے تو نیچے کا ایک نقطہ اور اوپر کے سب نقطے چھیل ڈالیے ' (ب) کا جوڑ باقی رہ جاے گا - اسی طرح اگر (ت) کی ضرورت ھے تو اوپر کا ایک نقطہ اور نیچے کے دونوں نقطوں کو چھیل دیجئے (ت) ھو جاے گی' علی ھذاالقیاس ھر کام کے لئے حسب منشا نقطوں کے کم کردینے سے ایک ھی جوڑ مختلف کام دیتا ھے - اس قسم کی دردسری کو بھلا سوا اس کے کہ کمپوزیٹر سارا دن بیٹھا ھوا حجامت کرے اور کیا کہا جاسکتا ھے - یہ ھے بیروت کا نستعلیق ٹائپ جس کا دنیا میں اتنا شہرہ ھو رھا تھا —

اس کے بعد دارالطبع سرکار عالی کا ٹائپ اور پھر میری کوشش ھے - یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ھے کہ حیدر آباد میں ٹائپ کے متعلق مصروفیات کے آغاز کی اصلی وجہ بیان کردی جاے --

سنہ ۱۳۲۱ ف میں جب مسٹر حیدری (نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر) نے معتمدی عدالت و کوتوالی و امور عامہ کا جائزہ لیا تو دارالطبع سرکارعالی کی اصلاح کے ضمن میں اُردو ٹائپ کی طرف توجہ دلائی - کچھہ دنوں بعد آپ کی صدارت میں ایک کمیٹی اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے قائم کی گئی جس نے مختلف اھل الراے سے اس معاملے میں مشورہ لیا اور ان کی رائیں طلب کیں - بعد

غور و فکر رائے یہ قرار پائی کہ فی الحال اُردو کے لئے کوئی نفیس اور بہتر نسخ ٹائپ رائج کیا جائے کیوں کہ نستعلیق کا ٹائپ بننا نہایت دشوار ہے - جب عرض داشت اعلیٰ حضرت خلداللہ ملکہ کے حضور میں پیش ہوئی تو حسب ارشاد مزید رائیں طلب ہوئیں - بعد ازاں یہ مسئلہ کونسل میں پیش ہوا اور رائے یہ قرار پائی کہ اُردو کے لئے نستعلیق ٹائپ مناسب اور موزوں ہے - اعلیٰ حضرت و اقدس نے بذریعہ فرمان مترشدہ ۲۹ جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۳۹ ھ حکم فرمایا کہ لیتھو کے بجائے ٹائپ اختیار کیا جائے مگر ٹائپ نستعلیق ہو - ارشاد مبارک کی بنا پر دارالطبع سرکار عالی میں نستعلیق ٹائپ کے بنانے کا انتظام شروع ہوا - چونکہ اس عرصے میں جامعۂ عثمانیہ کا بھی قیام ہو چکا تھا اس لئے اس مسئلے کی اهمیت اور بڑھ گئی - نواب سر حیدر نوازجنگ بہادر نے اس بارے میں جس سعی اور سرگرمی کا اظہار فرمایا ہے اور جس شوق اور دلچسپی سے آپ نے نستعلیق ٹائپ کے لئے ہر قسم کی سہولتوں کو بہم پہنچایا ہے وہ نہایت درجہ قابل شکریہ ہے - اسی ضمن میں ناانصافی ہوگی اگر نواب مسعودجنگ بہادر اور مولوی عبدالحق صاحب کے نام نامی بھی نہ لئے جائیں - کیوں کہ اس خصوص میں آپ لوگوں کی مساعی اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو آسانی کے ساتھ فراموش کردیا جائے - مگر قبل اس کے کہ میں یہاں کی کوششوں کا ذکر کروں بہتر معلوم ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا ٹائپوں کی خامیوں کے متعلق جس کی وجہ سے وہ رواج نہ پاسکے میں جن نتائج پر اپنے خیال کے مطابق پہنچا ہوں وہ سلسلہ وار عرض کردوں :—

(۱) سنہ ۱۸۰۵ ع کا ٹائپ یہ ٹائپ :- تیار ہوا اور مسلسل چالیس سال تک اس میں ترمیم ہوتی رہی - میں نے اس کی کتابیں چھپی ہوئی دیکھی ہیں - ایک عرصہ تک محنت کرنے کے بعد میں پتہ چلا سکا کہ اس کے بھی بارہ سو سے لے کر پندرہ سو تک جوڑ تھے - انیسویں صدی کا درمیانی زمانہ هندوستان کے لئے بہت ہی نامبارک گزرا ہے - اول تو اُردو دانوں پر پہلے ہی سے نکبت چھارہی

تھی ' علم کا شوق بھی نہیں رہا تھا اور جو کچھ تھا بھی تو وہ صرف شاعروں اور شاعری کی حد تک تھا ' پھر ملک میں اس قدر عام بے چینی تھی کہ اپنی جانیں ھی سلامت رکھنا غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ ایجادیں فرصت اور اطمینان کی باتیں ھیں ' اس ایجاد کے متعلق سب سے بڑی مشکل یہ آن پڑی کہ نستعلیق ٹائپ کی تیاری کا کام سرکار کمپنی کر رھی تھی ' اس کے بعد ھی کمپنی بادشاھت سے بدل گئی ' ساتھ ھی ساتھ سرکار کی پالیسی میں بھی غالباً اُردو کی حد تک انقلاب پیدا ھوگیا۔ ایسے زمانے میں جب کہ مسلمانوں کو اپنے سر و پا تک کا ھوش نہ تھا ' ھمارے ٹائپ کو کون پوچھتا۔ نتیجہ یہ ھوا کہ اتنے عرصے کی محنت دم بھر میں تباہ و برباد ھوگئی اور اس کا اب پتہ ونشان بھی ملنا دشوار ھے - لیکن دراصل اس ٹائپ میں مشکل چیز یہی تھی کہ جوڑ بہت کثرت سے تھے —

(۲) مصر اور ایران کا ٹائپ :- مصر کی کوشش چونکہ میں نے دیکھی نہیں اس لئے میں کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا۔ البتہ ملکم خاں کی کوشش اس وقت سب کے سامنے موجود ھے۔ نسخ یا نستعلیق کے مفرد الفاظ کبھی موجودہ رسم‌الخط کی جگہ نہیں لے سکتے۔ اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کی گئی —

(۳) ملاحظہ ھو نمبر ۸ —

(۴) (۵) اور (۶) تقریباً ایک ھی قسم کی کوششیں تھیں۔ یعنی حروف کو بالکل الگ الگ کردیا گیا تھا۔ پھر طرہ یہ ھے کہ اُن کی اصلی شکلیں بھی مسخ ھو گئی تھیں۔ بھلا ایسی حالت میں کون اس کو پسند کرسکتا تھا —

(۷) راجہ صاحب دوم کندہ کی دوسری کوشش :- یہ کوشش البتہ ایک حد تک ٹھیک کہی جاسکتی ھے۔ مگر نستعلیق کی جو اصلی چیز کرسیاں ھیں جب وھی باقی نہ رھی تو پھر اس میں اور نسخ ٹائپ میں کیا فرق رہ گیا۔ صرف دائروں اور چند جوڑوں کی شکل بدل کر اُن کو نستعلیق نما بنا دینے سے وہ نستعلیق نہیں ھوسکتا۔ مجھے جس قدر یاد ھے اُس کی بنا پر میں ذیل

میں اس کا نمونہ پیش کرتا ہوں :—

ممتحن ممتحن

اصل نستعلیق میں کس طرح لکھا ہونا چاہیے — رائے صاحب کا بنایا ہوا نستعلیق ٹائپ

(۸) اکانو میکل پریس لاہور کا ٹائپ :— اس ٹائپ کے متعلق میرا اندازہ ہے کہ اس میں پانچ چھ سو جوڑ تھے - مگر حقیقت میں کتنے ہیں کچھ پتہ نہیں چل سکتا - نقطے بھی حروف سے جدا ہیں - غالباً یہ بھی کمپوزنگ کی دقت اور زیادتی جوڑوں کی وجہ سے نا قابل استعمال متصور ہوا ہوگا ورنہ اور تمام لحاظ سے بہترین ہے —

میرا یہاں شاید یہ بیان کردینا بیجا نہ ہوگا کہ جوڑوں کی زیادتی کچھ ایسی ہی خرابی اور نقصان کا باعث ہوتی ہے کہ جس سے نستعلیق ٹائپ کامیاب نہیں ہوسکتا - ان کی زیادتی سے بڑے بڑے نقصانات حسب ذیل ہیں :—

(ا) ہمارے ملک میں ہر کام انفرادی ہوتا ہے - پریس بھی جس قدر قائم ہوتے ہیں وہ سب انفرادی حیثیت رکھتے ہیں ؛ اس لئے یقیناً سرمایہ کی کمی ہوتی ہے - اُن میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ وہ اس قدر سرمایہ فراہم کر کے ٹائپ کا سلسلہ جاری رکھہ سکیں —

(ب) جوڑوں کی زیادتی کی وجہ سے کیس (جس میں ٹائپ رکھا جاتا ہے) اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ اُس پر کام کرنے میں وقت بہت زیادہ خرچ ہوتا ہے - وقت کی زیادتی دوسرے الفاظ میں مطبوعات پر لاگت کی زیادتی ہے —

(ج) ایک تو جوڑ اس قدر، دوسرے مطبوعات پر لاگت زیادہ، اس پر بھی نستعلیق خط کی اصلی شان اور کیفیت نہ آسکے تو آپ خود ہی خیال فرمائیے کہ مذکورۂ بالا دونوں خرابیوں کو برداشت کر اپنے پر بھی مرضی کے مطابق کام

نہ ہونے کے کیا کیا اثرات ہوسکتے ہیں —

---

(۹) گجراتی ٹائپ فاؤنڈری بمبئی کا ٹائپ حیدرآباد میں دو جگہ موجود ہے - اس میں صرف دو ہی کرسیاں دی گئی ہیں اور نقطے بڑی علحدہ ہیں - دو کرسیوں کی وجہ سے نستعلیق کی پوری شان نہیں آتی - خط بھی خراب ہے - اُس پر نقطے علحدہ جمانا بہت ہی مشکل کام ہے - اسی وجہ سے پسند نہیں کیا جاتا۔

(۱۰) بیروت کے ٹائپ کے متعلق میں اُس کے بیان میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں - اب مزید صراحت کی ضرورت نہیں ہے —

---

(۱۱) بیروت کے ٹائپ کے آنے اور کام نہ دینے پر دارالطبع میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہیں کیوں نہ ٹائپ تیار کیا جاے - خیال کا آنا تھا کہ وہ مثل ہوگئی " کاتا اور لے دوڑی " - ٹائپ بننا شروع ہو گیا - اس ٹائپ کی تیاری کے لئے مولوی سراج الدین صاحب جو ایک اچھے خوش نویس ہیں مقرر کئے گئے - انھوں نے جس قدر محنت کی اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا - حقیقت میں یہ انھیں کا کام تھا کہ وہ اس قدر لا متناہی کوشش اور دیدہ ریزی کو مسلسل چار سال تک تن تنہا قائم رکھ سکے - لغت ' خیال اور ضرورت کے مطابق جوڑ تیار ہوتے رہے - مگر بطور جملۂ معترضہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب تک سوا سو برس کے اندر جس قدر بھی ٹائپ بنے وہ نا کامیاب کیوں رہے اور دارالطبع نے ان تمام خرابیوں کو کہاں تک دور کرتے ہوے یقینی کامیابی کے خیال میں جو مزید کوشش شروع کی وہ کن کن اصول کے تحت تھی - آیا گزشتہ ٹائپوں کی خرابیوں اور کمزوریوں پر کافی غور کرنے کے بعد کوئی اصول مقرر کیا گیا تھا - اگر ایسا کیا گیا تھا تو پھر آخر ویسے ہی عیب دار ٹائپ تیار کرنے کے کیا وجوہ تھے- میرے خیال میں اگر ٹائپ کے کار کن اور تنقید کرنے والے اس پر ذرا بڑی غور فرمالیتے تو یقیناً منزل مقصود

قریب سے قریب تر ہو جاتی اور جو غلط فہمیاں اس وقت پھیل رہی ہیں، اُن کی نوبت نہ آتی —

دار الطبع میں ٹائپ بنتا رہا اور یہ کام تقریباً چار سال تک جاری رہا۔ چار سال کے بعد جب نواب مسعود جنگ بہادر کی کتاب " روح جاپان " چھپ کر نکلی، تب کہیں پبلک کو معلوم ہوا کہ دارالطبع کا ٹائپ ابھی تک نامکمل ہے۔ یعنی " سمجھتے" اور " چمکتے " جیسے معمولی الفاظ بھی ملا کر نہیں لکھے جا سکے اور ان کے ٹکڑے کرنے پڑے - با وجود گیارہ بارہ سو جوڑ اور لگیچروں کے ایسا کیوں ہوا ؟ اس کا جواب ذیل کی سطور میں بہت اختصار کے ساتھ عرض کرتا ہوں —

میں نے اپنی رپورٹ (پیش کردہ کمیٹی ٹائپ منعقدہ ۲۲ جولائی سنہ ۲۸ ء) میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ جوڑوں کی زیادتی کے با وجود پورے الفاظ کا نہ بننا محض اس لئے ہے کہ دارالطبع نے ٹائپ میں جوڑوں کے ملنے کا کوئی اصول مقرر نہیں کیا تھا۔ اب سنا جاتا ہے کہ گذشتہ تجربے کی بنا پر دارالطبع کے ٹائپ میں اس امر پر غور ہو رہا ہے کہ کون سا جوڑ کس قدر اونچائی سے کن کن حالتوں میں کن کن حروف سے ملے گا - اگر یہ اصول پہلے ہی سے مقرر کر لیا جاتا تو خواہ کرسیاں دو ہو تین یا پانچ کسی حال میں کوئی لفظ اس کے باہر نہیں جاسکتا تھا - کوئی ایجاد یا اسکیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کی بنیاد کسی اصول کے تحت نہ ڈالی گئی ہو - اگر اس قسم کا اصول بنا لیا جا تا تو میری دانست میں دارالطبع کے مقابلے میں کوئی ٹائپ نہیں آ سکتا تھا - بہر حال مختلف الفاظ کو لے لےکر حسب ضرورت جوڑ تیار ہوتے رہے آ خر اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئیے تھا - یعنی وہ ایک ایسی چیز ہو گیا کہ اس کو نہ تو دوسرا خرید سکتا ہے اور نہ وہ خود استعمال کے قابل ہے - سب سے بڑی خرابی یہ ہوی کہ ٹائپ جو ایک مرتبہ جوڑ کر چھاپا جاچکا ہے آئندہ اس سے کام نہیں لیا جاسکتا اور گلا دیا جاتا ہے - دوسرے کیس بہت بڑا ہے، جس کو خرید نے کے واسطے کافی سرمائے کی بھی ضرورت ہوگی —

گو دارالطبع نے فورٹ ولیم والے ٹائپ کی طرح کام کیا مگر غالباً وہ ایسا ناکارہ نہ تھا کہ ایک مرتبہ کی چھپائی کے بعد بے کار ہو جاتا ہو - کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو نہ وہ مسلسل چالیس سال تک کام دیتا اور نہ مرشد آباد اور لکھنو کے پریس اس کو خرید سکتے - البتہ یہ ضرور ہے کہ کرسیوں کے زیادہ ہونے کی وجہ سے دارالطبع کا ٹائپ اس سے بدرجہا خوبصورت ہے —

" روح جاپان " کی اشاعت نے ارباب صدر کی توجہ کو اس طرف پھر متوجہ کیا - اور یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ ٹائپ کہاں تک کارآمد ہے، مولوی عبدالحق صاحب پرنسپال اورنگ باد کالج وسکریٹری انجمن ترقی اردو کو مقرر فرمایا گیا۔ انہوں نے مذکورۂ بالا نقائص معلوم کئے - دارالطبع کی یہ گیارھویں کوشش تھی - اب بارھویں کا نمبر آیا " قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند" کی صورت ہوی، اور میں اس دلدل میں پھنس گیا۔ کیونکر پھنسا اس کی بھی کیفیت عرض کئے دیتا ہوں —

آذر سنہ ۱۳۳۱ ف (اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ ع) سے میں نے ایک ماہانہ رسالہ "نمائش" نکالنا شروع کیا - جو اب تک بفضل خدا جاری ہے - رسالہ کی اس قدر آمدنی تو تھی نہیں کہ میں صرف بحیثیت ایڈیٹر کاغذ کے لمبے لمبے سلپوں کو اپنے ' زشت خط سے رنگنے پر اکتفا کرتا ' میں خود ہی ایڈیٹر تھا ' خود ہی منیجر اور خود ہی مصحح تھا - جب کاپیوں کی تصحیح کرنی پڑی یا کاتبوں اور مالکان مطابع سے معاملات پڑے (میں نے اپنا ذاتی پریس بھی رکھا تھا مگر وہ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا) تو وہ تمام مراحل مجھے طے کرنے پڑے جو قبل ازیں لیتھو طباعت کے سلسلے میں لکھ آیا ہوں - میں نے اس میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ سب آپ بیتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر اردو مصنف کو یہی روزبد دیکھنا پڑتا ہوگا - انہی مصیبتوں کی وجہ سے مجھے خیال پیدا ہوا کہ نستعلیق ٹائپ کی کوشش کی جائے - اس کے متعلق پرانی کتابیں وغیرہ دیکھیں، تمام مواد فراہم کیا - اور جو کچھ اس بارے میں اب تک دنیا میں ہو چکا تھا اس پر غور کیا اور یہ معلوم کرنے

کی کوشش کی کہ آخر کیا وجوہ ھیں جو باوجود ٹائپ بن جانے کے رائج نہ ھو سکا۔ میں نے ان سے جو کچھ اخذ کیا اُن کا اظہار میں اوپر کرچکا ھوں - اب میں نے کوشش کرنی شروع کی کہ دیکھوں میں کہاں تک جوڑوں میں کمی کرسکتا ھوں ـ پانچ سال کی مسلسل کوشش کے بعد میں جس نتیجے پر پہنچا تھا اس کو میں نے ٹائپ کی صورت میں بنا کر پیش کر دیا ـ اس قسم کا ٹائپ میں نے کیونکر بنایا' اس کی وجہ بھی سن لیجئے' ایک مدت کے ارادے کی ناکامی مجھکو مختلف ٹائپ پریسوں میں لے گئی' میں نے ھر قسم کے ٹائپ دیکھے' آخر تلنگی و مرھٹی کے ٹائپ دیکھنے کے بعد ایک خیال آگیا اور اسی کو میں نے اپنا اصول قرار دے لیا - اسی اصول کو لے کر میں نے نستعلیق میں حروف ملانے کی کوشش کی (خدا کا شکر ھے کہ وہ کامیاب ثابت ھوئی)۔ جب یہ ٹائپ کا نمونہ کاغذ کے ٹکڑوں پر بن گیا تو (خدا مغفرت کرے) مولوی عظمت اللہ خاں صاحب نے میری بڑی ھمت افزائی کی - ان کی رائے ھوی کہ میں کہیں سے بھی فاونڈری کا کام سیکھہ کر آؤں - میں بمبئی گیا - دو ایک جگہ ھاتھہ پھیلائے کہ مجھے کام سکھادیں - مگر اس معاملے میں ھندی خبث سے کام لیا گیا اور کسی نے میری ھمت افزائی نہ کی - مختصر یہ کہ جیسا گیا تھا ویسا ھی چلا آیا - اور یہ معاملہ کچھہ عرصے کے لئے بالکل ھی ختم ھو گیا ــــ

جب مولوی عبدالحق صاحب دارالطبع کے ٹائپ کی تنقیح کے لئے مقرر ھوے تو میں نے اپنا طریقہ ان کے سامنے پیش کیا ـ مولوی صاحب نے اس کو اچھی طرح سمجھہ کر میرے متعلق گورنمنٹ سے درخواست کی کہ ان کو ایک موقع دیا جاے - چنانچہ مجھے موقع دیا گیا ــــ

میرے پاس ٹائپ کے متعلق جو کچھہ بھی سرمایہ تھا' وہ صرف کاغذ کے ٹکڑوں کی شکل میں تھا - مجھے کوئی عملی تجربہ فاؤنڈری کے متعلق اس وقت تک نہیں تھا - بلکہ مجھہ پر ھی کیا منحصر ھے خود دارالطبع میں نستعلیق ٹائپ بننے سے پہلے کوئی اس کام سے واقف نہ تھا - یہ صرف آر - وی - پلے صاحب مہتمم دارالطبع

کی ہی انتھک کوشش کا نتیجہ تھا کہ اُنھوں نے مدراس وغیرہ سے ایسے آدمی فراہم کرائے تھے جو اس کام کو چلا سکتے ہیں اور جن کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی تیار ہوگئے تھے۔ میں پلے صاحب کا بے حد مرہون منت ہوں کہ ان کی انھی کوششوں کی وجہ سے مجھے بھی سیکھے ہوئے آدمی آسانی سے مل گئے اور میں ٹائپ بنا سکا۔ اب جس طرح سے کہ دارالطبع کے لوگ فاؤنڈری کا کام نستعلیق ٹائپ کا کام کرنے سے سیکھ گئے ہیں، اسی طرح شاید میں بھی تھوڑا بہت ضرور سیکھ گیا ہوں گا۔

میں صرف اس دعوے سے دارالطبع میں پہنچا تھا کہ اپنے ٹائپ کو ڈھائی سو جوڑوں میں ختم کردوں گا۔ سچ پوچھئے تو یہی چیز ایسی تھی جو اب تک ناممکن خیال کی جاتی تھی۔ باقی سب فروعات تھے۔ میں نے کوئی دعویٰ خط کی خوبصورتی یا بد صورتی کا ہرگز نہیں کیا تھا۔ اس واسطے کہ میں جانتا تھا کہ نہ معلوم ان جوڑوں کے آپس میں ملنے کے بعد کیا کیا شکل ہوجائے گی۔ جتنا میں نے دعویٰ کیا تھا، خدا نے مجھے اس میں کامیاب بھی کردیا۔ عبدالقیوم صاحب پر خط کی خرابی کا جو الزام تھوپا گیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ اس واسطے کہ قیوم صاحب میرے قاعدوں کے پابند تھے، نہ کہ اپنی خطاطی کے۔ مثلاً اصول نستعلیق کے تحت ایک جوڑ اگر صرف $\frac{1}{2}$ انچ جگہ چاہتا ہے اور میرے اصول کے لحاظ سے اُس کو $\frac{3}{5}$ انچ میں آنا چاہئے تو ایسی صورت میں قیوم صاحب مجبور تھے کہ میری ہدایت کے بموجب اتنی ہی جگہ میں اس جوڑ کو لکھدیں۔ اس میں ان کے خط یا خطاطی کو کہاں تک دخل تھا۔ اس کا الزام تو سب میرے سر پر ہے، اور جس قدر بھی مجھ کو برا بھلا کہا جائے میں اُس کا سزاوار ہوں۔ اس کے علاوہ میں ایک اور طرح سے بھی مورد الزام قرار پاتا ہوں کہ دراصل دارالطبع کے نستعلیق ٹائپ کے راز کی پردہ دری صرف میری وجہ سے ہوی۔ ورنہ غالباً یہ آج تک اُسی طرح سر بستہ رہتا جیسا کہ چل رہا تھا اور اخبارات وغیرہ کسی کو بھی اعتراضات کا

موقع نہ ملتا - خیر، میں نے ٹائپ بنا دیا - اور جو کچھ وقت کہ مجھ کو دیا گیا تھا وہ دارالطبع کی تیاری ٹائپ کے وقت کا تقریباً $\frac{1}{8}$ حصے تھا، تاہم وہ تیار ہو گیا - خط خراب اور بہت خراب ہے - ٹائپ فل باڈی Full Body نہیں بلکہ موھنی اور تلنگی کی طرح سے ٹکڑے دار Fraction Body ہے - جس کی وجہ سے علاوہ خط کی خرابی کے حسب ذیل اعتراضات قائم ہوتے ہیں :—

(ا) ٹکڑے دار ٹائپ اصول ٹائپو گرافی Typography کے بالکل خلاف ہے -

(ب) اس کا جوڑنا بہت مشکل ہے —

(ج) غلطیوں کی درستی کے وقت مصیبت پڑتی ہے —

(د) ٹکڑے دار ہونے کی وجہ سے اس کو کوئی نہیں خریدے گا —

(س) اسپیسس Spaces اور ٹائپ دونوں کو ملایا جاے تو تقریباً آٹھ سو جوڑ ہو جاتے ہیں —

(ص) اس کے کمپوز کرنے میں بہت وقت خرچ ہوتا ہے —

میں اس وقت نہ کسی کی تردید کروں گا نہ اعتراضوں کا جواب دوں گا، کیونکہ اس کے لئے علحدہ وقت کی ضرورت ہے - میں نے اس مضمون میں صرف اس امر کی کوشش کی ہے کہ ہر ایک ٹائپ کی ضروری خرابیاں بتا دی جائیں اور اپنے ٹائپ کی تمام وہ خرابیاں جو اس وقت تک اکثر لوگ ظاہر کر چکے ہیں بیان کردی جائیں - بہر حال میرے اور دارالطبع دونوں کے ٹائپ میں خامیاں تھیں، اور اسی پر غور کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے ملک کے آٹھ اعلیٰ عہدے دار اور ایک ماہر فن کی کمیٹی منعقد ہوئی تھی - کمیٹی کی راے میں دونوں ٹائپ اس کی اہلیت رکھتے ہیں کہ اُن کی خامیوں کو دور کیا جاسکے - یہی وجہ ہے کہ مزید ایک سال کی مدت عطا فرمائی گئی ہے —

میں اس حسن ظن کا مشکور ہوں کہ "کرسیوں کا ٹھیک کر لینا ذرا سی یا معمولی بات نہیں" - اس کا جواب اس وقت دینا بالکل قبل از وقت ہے،

کیونکہ اول تو ہر شخص اپنی چیز کو اچھا سمجھتا ہے ' مگر دیکھنا یہ ہے کہ دوسرے اُس کو کس نظر سے دیکھتے ہیں ' یا دوسروں کے لئے وہ چیز کہاں تک کار آمد ہوسکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر اِس وقت میں کہوں کہ میں ہر خرابی کو نہایت آسانی سے دور کردوں گا یا تنقید کرنے والے کہیں کہ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا تو حقیقت میں ہم دونوں غلطی پر ہوں گے - تھوڑا اور انتظار کیجئے ' ایک سال کے بعد خود ہی ہر چیز پبلک کے سامنے آ جائے گی —

اب میں ناظرین کی توجہ تھوڑی دیر کے لئے معزز اخبار رہبر دکن کی حسب ذیل اشاعتوں کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں - جس میں ایک مضمون بحیثیت ایڈیٹوریل کے اور ایک مضمون ناقد صاحب کا طبع ہوا ہے (رہبر دکن مورخہ یکم و ۲ و ۹ و ۱۰ شہریور سنہ ۱۳۳۷ ف) —

مجھے اس کا بالکل افسوس نہیں کہ ہر دو اصحاب نے میری ذات سے متعلق کیا لکھا ہے' بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو کچھ لکھا وہ بہت کم اور بالکل صحیح ہے۔ میں ان کا اس لئے بھی شکر گذار ہوں کہ مجھے اپنی ذات کے متعلق شاید جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو گئی - البتہ اتنا افسوس ہے کہ فاضل ایڈیٹر صاحب نے بغیر تحقیقات کے غیر ذمہ دارانہ بیانوں پر میرے تائپ کے جوڑوں کی تعداد چار سو تحریر فرما دی - پبلک کی صحیح اطلاعات کی تمام تر ذمہ داری ملک کے اخبارات پر ہے - جب خود اخبارات کی یہ حالت ہو تو بھلا پبلک میں غلط فہمی کیوں نہ پیدا ہو - اس سے بھی زیادہ افسوس مجھے اس بات کا ہوا کہ جب میں نے ایک خط کے ذریعے ان کو اطلاع دی تھی کہ جوڑوں کی تعداد اور اخراجات کی رقم دونوں کے اعداد بالکل غلط ہیں تو انھوں نے اپنی سابقہ غلطی کے اعتراف سے اپنا اخلاقی فرض ادا نہ کیا اور یہ معلوم نہ ہوا کہ اُن کا ایسا نہ کرنے سے کیا مقصد تھا۔ خیر ' میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید اس میں بھی ان کو میری کچھ بھلائی منظور ہوگی ' اور میں ہی غلطی پر ہوں گا —

اِسی مضمون میں فاضل ایڈیٹر صاحب جب مولوی عبد الکریم حسینی صاحب کی تعریف پر آئے تو بغیر کافی غور کے کہ ان کا پیش کیا ہوا نمونہ کیا ہے اور نستعلیق کے کم از کم کس قدر جوڑ ہو سکتے ہیں * نہایت وثوق کے ساتھ تحریر

---

* اُردو کے حروف اگر دو چشمی ھ ' لا ' ء ' اور یائے مجہول کو حساب میں لگایا جائے تو (۳۹) ہوتے ہیں - ان میں ا ' د ' ڈ ' ذ ' ر ' ڑ ' ز ' ژ ' و ' لا ' کو نکال کر بقیہ (۲۹) حروف ایسے ہیں جن کی لکھنے میں چارچار شکلیں ہوتی ہیں - یعنی الفاظ کے شروع میں ' بیچ میں ' آخر میں اور علحدہ جو سب مل کر (۲۹ × ۴ = ۱۱۶) ہوی - الف ممدودہ ' تلویلی اور سادہ علحدہ اور آخر میں جملہ (۹) قسم کے ہوتے ہیں - لا - سادہ اور تلویلی ' علحدہ اور آخر میں جملہ (۴) قسم کے ہوتے ہیں و ہمزہ والا اور و سادہ علحدہ اور آخر میں جملہ (۳) قسم کے ہوتے ہیں - (ر ' ڑ ' ز ' ژ ' کی علحدہ اور آخر میں (آخر میں ان کی کئی کئی شکلیں ہیں مگر صرف دوں ہی قسم کا حساب لگایا گیا ہے چار چار قسم سے آتے ہیں - اس طرح ان کی (۱۶) شکلیں ہو گئیں - اب بقیہ (۳) ایسے ہیں جن کی دو ہی دو شکلیں ہوتی ہیں - اس حساب سے اس کی (۹) شکلیں ہوئیں - مذکورہ بالا شروع کے (۲۹) حروف ایسے ہیں جو پتلے اور موٹے جوڑ دونوں قسم کے ہوتے ہیں - یہ حالت اُن کی شروع اور بیچ میں ہوتی ہے - اس لئے ۲۹ × ۲ = ۵۸ ہوے - ان تمام کو ملا یا جائے تو (۲۰۹) ہوجاتے ہیں - اس کے علاوہ یائے مجہول اور معروف ہمزہ اور الف کے ساتھ ہوتی ہیں - ک - گ جب ام سے ملتے ہیں تو ان کی شکل اور ہی ہو جاتی ہے - ب - پ - ت - ٹ - ث - ن اور ی کے شروع اور بیچ کے جوڑ مختلف الفاظ میں مختلف شکلیں رکھتے ہیں - ان کو بھی (۲۰۹) میں ملایا جائے تو رہبر دکن کے اعلان کردہ سوا دوسو جوڑوں سے کہیں زیادہ ہو جاتے ہیں - اور یہ ابھی تک صرف ایک ہی لائن پر ملنے والے ہوے (جیسا کہ جرمنی کا بنا ہوا نستعلیق نما ٹائپ نسخ ٹائپ کے اصول پر آج کل آرہا ہے اور کوی تعجب نہیں کہ نمونۂ مذکور بھی وہی ہو) - ان میں ابھی نستعلیق کی اصلی کرسیاں جو بعض الفاظ میں چار چار پانچ پانچ تک ہوتی ہیں باقی ہیں - دوسرے کشش جو اشعار لکھنے کے لئے ناگزیر چیز ہے ' وہ بھی باقی ہے - ان سب کو اس میں شامل کیا جائے تو تعداد کم از کم چھہ سے سات سو تک پہنچتی ہے - پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سوا دوسو کا اعلان بغیر حساب کئے کس بنا پر کردیا گیا - اگر بغرض محال یہ خیال کر لیا جائے کہ حروف سے نقطے علحدہ کردیے گئے ہیں تو گجراتی ٹائپ یہاں موجود ہے ' اُس کی دقتوں کو پہلے دیکھہ لیا جاتا اور پھر کوئی رائے دی جاتی —

فرما دیا کہ صرف سوا دو سو جوڑوں میں مولوی صاحب نے نستعلیق ٹائپ ختم کردیا۔ حالانکہ کھیتی ٹائپ میں جب سخت اصرار کیا گیا تب کہیں پانچ سو جوڑوں پر انہوں نے رضامندی ظاہر کی - اگر سوا دو سو جوڑوں میں مولوی عبدالکریم صاحب اپنا ٹائپ ختم کرچکے تھے ' بلکہ تین قسم کے نمونے رہبر دکن کے دفتر میں بغرض اشتہار بھیج بھی چکے تھے تو پھر (۲۲۵) کے یک دم (۵۰۰) کس طرح ہوگئے - میرا تو تمام کاغذی عمل تھا اور مولوی صاحب ٹائپ بھی بنوالائے تھے - پھر یہ کایا پلٹ کیسے ہوگئی - خیر ' اس کا جواب بھی میں کسی آئندہ وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں - میرے اس لکھنے سے مقصد یہ ہے کہ اس قسم کی غلط اطلاعات سے پبلک میں جو مختلف قسم کے خیالات پیدا ہو گئے ہیں ان کی ایک حد تک اصلاح ہوجاے اور بس —

اب ذرا " ناقد صاحب " کے مضامین بھی ملاحظہ فرمائیے ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب واقعات سے تو ضرور واقف ہیں مگر عملی کام سے بالکل ہی ناواقف ہیں - اور شاید کچھ باتیں کسی غیر متعلقہ ہستی سے معلوم بھی ہوگئی ہوں گی ' جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ " ایک لاکھ اٹھانوے ہزار کی بربادی پر آنسو بہاے جائیں " حالانکہ ۳۵ - ۴۰ ہزار روپے کی مشنری وغیرہ کی قیمت ملاکر میری اور دارالطبع دونوں کی کوششوں پر اب تک تقریباً ساٹھ ستر ہزار روپے صرف ہوے ہیں - نہ معلوم ناقد صاحب کو یہ اعداد کہاں سے معلوم ہوگئے - ایک جگہ لکھتے ہیں کہ نستعلیق ٹائپ کی ناکامیابی کے اسباب میں منجملہ اور چیزوں کے " ایک خود نستعلیق کی میکانیکل Mechanical ناقابلیت ہوسکتی ہے " - میں نے ٹائپ بنایا ' تقریباً دس مہینے فاؤنڈری میں کام بھی کیا ' مگر اس چیز کو آج تک باوجود غور کرنے کے میں نہ سمجھ سکا کہ میکانیکل ناقابلیت نستعلیق میں کیا ہوسکتی ہے - میری سمجھ سے یہ مسئلہ بہت بالاتر ہے - ماسوا اس کے اس چیز کو میں نے بمبئی کے ٹائپ بنانے والوں سے بھی دریافت کیا مگر

وہ بھی اس کے سمجھنے سے قاصر رہے - کیا اس سے ناقد صاحب کا یہ مقصد ہے کہ :-

(۱) نستعلیق حروف کے جوڑوں کے ملنے میں کوئی خاص قسم کی مشین وغیرہ کام کرتی رہتی ہے - یا یہ کہ

(۲) یہ خط مشین میں ڈھل نہیں سکتا - یا اُن کا مقصود یہ ہے کہ

(۳) نستعلیق خط میں Mechanical Composing نہیں ہوسکتی —

نمبر (۱) بالکل مہمل ہے - نمبر (۲) کے متعلق ناقد صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کا خیال غلط ہے - نستعلیق ڈھل سکتا ہے اور اچھی طرح ڈھل جاتا ہے - تمام وہ چیزیں جو باڈی کے باہر نکلی ہوی ہوتی ہیں، نہایت آسانی سے باڈی کے باہر نکل سکتی ہیں - رہا تیسرا سوال تو یہ بھی ہوسکتا ہے، بشرطیکہ رقم اور وقت کافی ہو - بہرحال ان کا اصل اعتراض میں بالکل نہیں سمجھ سکا ہوں - البتہ اگر اتنے بھاری بھاری الفاظ سے خواہ مخواہ لوگوں پر رعب بٹھانا مقصود ہے تو اور بات ہے - ورنہ میرے خیال میں ایک مہمل اعتراض سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا —

ایک اور جگہ بھی اس کی تائید میں لکھتے لکھتے تحریر فرماتے ہیں: "مختلف زبانوں کے حروف کے الفاظ اور ان کے میکا نیکل شکل و صورت کی باہمی مناسبت کا تقابلی علم" ——— میں کم از کم اس سے بھی کوئی نتیجہ نہیں نکال سکا ہوں - اگر ناظرین میں سے کوئی صاحب مجھے اس کا مفہوم سمجھائیں تو میں بے حد مشکور ہوں گا - اور ممکن ہے کہ سمجھنے کے بعد میں کوئی جواب پیش کر سکوں —

معیار قابلیت کی شرائط کے متعلق ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ " نستعلیق کے اصول رسم الخط کے تدریجی ارتقا، تغیرات اور اساتذہ کی اصلاحیں " بھی نستعلیق ٹائپ کے بنانے والوں کے علم میں ہونی چاہئیں ——— میں خود خوش نویس نہیں ہوں، مگر کیا یہ دریافت کرنے کی میں جرأت کرسکتا ہوں کہ اس سے نستعلیق

ٹائپ بنانے میں کیا امداد پہنچ سکتی ہے - مثلاً خط نسخ اور تعلیق سے خط نستعلیق بنا ہے - اب کیا ناقد صاحب ان اصلاحات سے یہ کام لینا چاہتے ہیں کہ جہاں ضرورت ہو وہاں نسخ، تعلیق، شکستہ یا کسی اور خط کا جوڑ اُس میں کام لایا جاے یا کیا - اگر ایسا ہے تو صاحب موصوف کو معلوم ہونا چاہئیے کہ اول تو دنیا اس پر تیار نہیں ہے کہ بجاے آگے بڑھنے کے پیچھے ہٹتے - دوم نستعلیق میں ذرا سی رد و بدل بھی نستعلیق کو نستعلیق نہیں رکھتی - دور کیوں جائیے، میں نے اپنے ٹائپ میں محض ٹائپ کی سہولتوں کے مدنظر چند ایسی ہی باتیں کرلی تھیں، جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ یائے مجہول کو میں نے تعلیق اور شکستہ کی طرز میں اس طرح (ی) بنایا تھا، مگر کسی نے اُس کو پسند نہیں کیا - اس لئے نستعلیق کا تدریجی ارتقا اب کوئی کام نہیں دے سکتا اور اس قسم کے غلط راستوں سے کوئی نتیجہ نہیں —

مضمون کی طوالت کے اندیشہ سے میں نے ہر چیز کو بہت مختصر لکھا ہے - ناقد صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب موصوف مجھ سے ضرور واقف ہیں - اس لئے میں ان سے نہایت عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھے اپنے نام نامی سے مطلع کریں - میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہوکر جو کچھ میں جانتا ہوں تفصیل سے عرض کرکے اُن کی تشفی کر دینے کی کوشش کروں گا اور ممکن ہے کہ اُن کی تنقید سے مجھے بھی کوئی فائدہ پہنچ جائے —

میں نے اس مضمون میں کوشش کی ہے کہ نستعلیق ٹائپ کے لئے ابتک جو کچھ ہوا ہے وہ بطور ایک تاریخ کے ایک جگہ جمع کردیا جاے - رہا آئندہ کے متعلق، تو اس کے لئے بہترین چیز یہ ہے کہ ہم کو نہایت اطمینان سے نتیجے کا انتظار کرنا چاہئیے - میں اور دارالطبع دونوں اس معاملے میں ایک دوسرے کے مقابل کوشش میں لگے ہوے ہیں - اور یہ بھی ایک یقینی چیز ہے کہ جب دو لڑتے ہیں تو تیسرے کا فائدہ ضرور ہوتا ہے - گو دو جگہ کام ہونے کی وجہ سے پندرہ

بیس ہزار کا خرچ سرکار پر زاید پڑرہا ہے مگر میں تو یہ کہونگا کہ پندرہ لاکھہ میں بھی اگر سرکار کو نستعلیق ٹائپ جیسی کامیاب چیز مل جائے تو بہت سستی ہے - ایک سال کے بعد ان دونوں میں سے ایک نہ ایک ٹائپ پبلک کے سامنے ضرور آجائیگا - اس لئے یہ کہنا کہ فلاں اچھا ہے اور فلاں خراب ہے بالکل قبل از وقت ہے - ایک سال آنکھہ بند کرتے گذر جائیگا اس وقت اگر اس قسم کے اعتراضات کئے جائیں تو میرے خیال میں ایک حد تک درست بھی ہونگے - مگر اس وقت کا کچھہ کہنا بالکل بے نتیجہ ہے —

آخر میں میں تنقید کرنے والوں سے پھر استدعا کرتا ہوں کہ وہ جب کبھی تنقید فرمائیں تو براہ‌کرم صحیح حالات معلوم کرنے کے بعد تنقید کریں - غیر ذمہ دارانہ بیانات کو مستند خیال کرکے اُن پر غل مچانا بالکل بے کار ہے کیونکہ اس سے خود لکھنے والوں کی ذاتی وقعت واقف کار لوگوں کی نگاہوں میں باقی نہیں رہتی —

سعدی

از

(جناب سید حسن برنی صاحب بی اے؛ ال ال بی)

[خیام اور حافظ کے بعد کرا دے وو (Carra de Vaux) نے سعدی پر لکھا ہے ' اور سعدی کے بعد عطار اور رومی کا نمبرہے۔
یہ مختصر مضمون بھی جو " محققین اسلام " (Les Penseurs de l' Islam) جلد چہارم (ص۲۹۳ - ۳۰۴) سے ماخوذ اور براہ راست فرانسیسی زبان سے ترجمہ کیا گیا ہے ' حسب معمول مختصر ' مگر دلچسپ و پر مغز ہے —

سعدی پر اس وقت تک جو بہترین کتاب لکھی گئی ہے وہ بھی فرانسیسی زبان میں ہے (Essai sur le Poete Saadi Suivi d' une Bibliography , Paris ; Librarie Paul Geuthner 1919) " مقالہ بر حالات سعدی مع فہرست کتب " اس کتاب کا مصنف ڈاکٹر ماسے (Henri Masse (Docteur es lettres ہے ' اور اُس کی ضخامت سوا تین سو صفحات ہے - کتاب چار حصوں میں منقسم ہے - حصہ اول (ص ۱ تا ۱۳۰) کے باب اول میں سعدی کے حالات زندگی اور باب دوم میں اُس کی تصانیف سے بحث کی گئی ہے - حصہ دوم (ص ۱۰۳ - ۱۹۶) میں سعدی کا مرتبہ بحیثیت ایک متفکر و معلم (Le Penseur) کے دکھایا گیا ' اور تین جداگانہ ابواب میں اُس کی تمدنی ' اخلاقی اور دینی افکار و

تعلیمات سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرے حصے (ص ۱۹۹ - ۲۶۸) میں سعدی پر بحیثیت فن لطیف کے استاد کامل (L'Artiste) کے تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس حصے میں چار باب ہیں۔ پہلے اور چوتھے بابوں میں سعدی کے طرز بیان، دوسرے باب میں اُس کے مضامین شاعرانہ اور تیسرے باب میں اُس کے تجربات عالم سے بحث کی گئی ہے - خاتمے میں سعدی کے متعلق ایک مجموعی اور اختتامی تبصرہ قلمبند کیا ہے - حصۂ چہارم (۵۷ صفحات) میں مفصل فہرست کتب ہے جس میں تصانیف سعدی کے طبعات و تراجم اور اُس کے حالات زندگی کے مشرقی و مغربی مآخذ و مصادر درج ہیں - اخیر میں سعدی کے متعلق بعض سربرآوردہ مغربی ادیبوں کے خیالات و آرا نقل کی گئی ہیں - الغرض یہ کتاب ہر طرح مکمل اور اُردو میں ترجمہ کئے جانے کے قابل ہے —

حال ہی میں سعدی کی گلستان کا ایک جدید فرانسیسی ترجمہ با تصویر بڑے اہتمام سے پیرس میں شائع ہوا ہے، جس کی قیمت تین سو فرنک (تقریباً ۳۵ روپے) ہے ۔ مفصل پتہ حسب ذیل ہے :-

(Saadi – Le Jardin des Roses et des Fruits. Tradint du Persan par Franz Toussaint. Illustre par Desligneres. P P. 248, Paris, 1928.)

[سید حسن برنی]

سعدی، شیریں ناصح اور خوشنام شاعر، بمقام شیراز سنہ ۱۱۸۴ ع میں بعہد اتابک پنجم فارس پیدا ہوا*۔ یہ زمانہ پر آشوب تھا - اتابکان فارس مسلسل طور پر

---

* سعدی کے حالات کے لئے دیکھو دیباچہ ترجمہ بوستان نوشتہ بارلی اے دی میینار (Barlier de Meynard) و نیز "مقالۂ بر سعدی" (Essai sur le Poet Saadi) نگاشتہ ماسے (H. Masse) مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۱۹ع جس کے اخیر میں مفصل فہرست کتب بھی ہے —

(بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

۲اتابکان عراق و سلاطین خوارزم سے جنگ و جدل میں مصروف رهتے تھے - مغل بھی میدان میں آچکے تھے —

سعدی کے خاندان کے متعلق بہت کم حالات معلوم هیں- اُس کا باپ ایک سربرآوردہ شخص تھا - وہ سعدی کی کم سنی هی میں انتقال کرگیا - نو عمر سعدی تکمیل تعلیم کے لئے نظامیۂ بغداد میں آیا اور علامہ ابن الجوزی کے تلامذہ میں داخل هوا - خیال کیا جاتا هے کہ وہ نامور صوفی سہروردی متوفی سنہ ۶۳۲ھ کے درس میں بھی شریک هوا

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

تصانیف سعدی کے تراجم و طبعات بکثرت هیں جن میں سے هم حسب ذیل درج کرتے هیں —

(ا) ترجمہاے فرانسیسی :-

ترجمۂ بوستان نوشتہ بارلی اے مینار سنہ ۱۸۸۰ ع - ترجمہاے گلستان نوشتہ سیمیلے(Semelet)سنہ ۱۸۳۷ع و دے فرے مری (Ch: Defremery) سنہ ۱۸۵۸ ع

ایک گمنام شخص ساکن علی گڈہ (؟) (MXd' Aligare) مطبوعہ پیرس سنہ ۱۷۰۴ع

حال هی میں گلستان کا ایک فرانسیسی ترجمہ ارہتم فیار (Artheme Fayard) نے کیا هے جو مدام دے نوئیل (Mme. la Casse de Noailles) کے دیباچہ کے ساتھہ پیرس سے سنہ ۱۹۱۳ ع میں شائع هوا هے —

(ب) ترجمہاے انگریزی :-

ترجمۂ گلستان نوشتہ پلیٹس (J. L Platts) مطبوعہ لندن ۱۹۰۴ ع (طبع سوم)

(ج) ترجمہاے جرمنی :-

قدیم ترجمہ گلستان نوشتہ سیاح اولیاریوس (Olearius) مطبوعہ سنہ ۱۶۵۴ع و سنہ ۱۶۶۰ ع —

ترجمہاے بوستان نوشتہ گراف (Graf) مطبوعہ جینا - سنہ ۱۸۵۰ ع و شلختا وزهرد (Schlechta Wssehrd) ویانا سنہ ۱۸۵۲ ع و رو کرٹ (Ruckert) مطبوعہ لائپزک سنہ ۱۸۸۲ ع و نیز حسب ذیل کتب :-

سعدی کے سیاسی اشعار (Ruckert , Saadis Politische Gedichte) مطبوعہ برلن سنہ ۱۸۹۴ع

یعنی نصایح و اشعار سعدی- (Bacher, Aphorismen and Siugle dechte)

کلیات سعدی کلکتہ میں سنہ ۱۷۹۱ع میں اور طہران میں سنہ ۱۲۵۹ھ و سنہ ۱۳۶۷ھ میں طبع هوچکی هے - ترکی زبان میں بوستان سعدی کی ایک عمدہ شرح لکھی گئی هے جس کا لکھنے والا سوری هے اور یہ شرح سنہ ۱۸۷۱ع میں قسطنطنیہ میں شایع هوچکی هے—

اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی تعلیمات کا سعدی پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑا - بعد ازاں سعدی نے سیر و سیاحت کی - اس کے قدیم ترین تذکرہ نویس کا بیان ہے کہ اُس نے تیس برس سیر و سیاحت میں صرف کئے - سفر کا باعث کچھ تو صوفیانہ میلان طبع اور کچھ ذاتی شوق ہوا - اس سیر و سیاحت کا کوئی گہرا اثر سعدی کی طبیعت پر نہیں پڑا، نہ اُس کے تصانیف میں اُس کے نمایاں آثار نظر آتے ہیں —

اس جہاں نوردی کے دوران میں سعدی کو بعض حوادث البتہ پیش آئے - دمشق کے بعض فقرا کی ملاقات سے واپس آتے ہوے وہ نواحی بیت المقدس کے صحرا میں اہل فرنگ کے ہاتھوں میں پڑگیا اور قید کرلیا گیا - یہودی قیدیوں کے ساتھ اُسے بھی حصار طرابلس پر کام کرنا پڑا - اُس کے ایک دوست نے جو حلب کا رہنے والا متمول حبشی تھا اُسے دس دینار میں خرید کیا اور اُس کی شادی اپنی لڑکی سےکردی - لیکن یہ عورت ایسی بد مزاج ثابت ہوئیکہ غریب سعدی کو اپنی اسیری کا زمانہ بہتر معلوم ہوتا تھا - بالآخر سعدی نے اپنا پیچھا چھڑا کر پھر سیر و سیاحت کا راستہ لیا -

وہ ترکستان بھی گیا - کاشغر پہنچا اور چینی ترکستان میں دور تک سیاحت کی - ممکن ہے کہ ہندوستان بھی گیا ہو، لیکن بت سومنات کا قصہ جو سعدی نے بوستان میں لکھا ہے سچا نہیں معلوم ہوتا - اُس قصے میں سعدی ہندو پجاریوں سے دوستی پیدا کرتا، بتکدہ کے اندر پہونچتا اور بت کی کل چلانے کی حالت میں پجاریوں کو پکڑلیتا ہے - یہ دلچسپ قصہ جو جھوٹی کرامات کے متعلق (اطالین افسانہ نگار) بوکاکس (Boccace) کے دل خوش کُن حکایات کو یاد دلاتا ہے بہت اغلاط سے پر ہے اور کسی طرح باور نہیں کیا جا سکتا —

ایشیاے کوچک، بصرہ، حجاز، حبش میں سیاحت کرنے کے بعد سعدی سنہ ۱۲۵۶ ع میں شیراز میں واپس پہونچا - سیاسی حالات میں کچھ سکون پیدا ہوگیا اور اتابک ابوبکر تخت نشین ہوچکا تھا - اس نے مغل بادشاہوں کو خراج دینا قبول کرلیا تھا

اور ان کی حمایت میں امن پاکر عمارات کی تعمیر اور علوم و فنون کی سرپرستی میں مصروف تھا - سعدی بھی اُس کے کرم سے مستفید ہوا اور اُس نے سنہ ۱۲۵۷ ع میں بوستان اور اگلے برس گلستان تصنیف کرکے اتابک مذکور کے نام سے معنون کیں۔ اُس وقت سعدی کی عمر تقریباً ۷۵ برس کی تھی —

لیکن تھوڑے ہی دن بعد فارس کے صوبہ پر نئی مصیبتیں نازل ہونی شروع ہوئیں - ابوبکر کی وفات کے بعد اتابکاں فارس کا چند ناکام مقابلوں کے بعد مغلوں کے ہاتھوں ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا - مغل پادشاہ اباقا ایلخاں پسر ہولاگو (ہلاکو خاں) نے شیراز میں اپنا عامل مقرر کر دیا - یہ دیکھہ کر افسوس ہوتا ہے کہ سعدی نے بلاکسی پس و پیش کے نئے حاکموں کا خیر مقدم کر لیا - اُس نےہولا کو کی فتوحات کو سراہا اور مغلوں کی مدح میں ایسے قصاید تصنیف کئے جو اس سے پیشتر شاید ہی اتابکوں کی شان میں لکھے ہوں - وہ مغل خان کی خدمت میں تبریز میں بھی حاضر ہوا - ممکن ہے کہ اس طرز عمل سے سعدی نے اپنے ملک کو کچھہ فایدے پہونچائے ہوں اور اُس کے لئے آزادی حاصل کرلی ہو —

سعدی کے اخیر ایام زندگی ایک دلکش خانقاہ میں گذرے جو شیراز کی رود رکناباد کے کنارے پر واقع تھی - بعض حاسدوں کی فتنہ پردازیوں کے باوجود وہ عزت کے ساتھہ اُس خانقاہ میں بسر اوقات کرتا رہا - لوگ گروہا گروہ اُسے ایک بڑا شاعر اور صوفي سمجھہ کر اُس کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اُس کی برکت حاصل کرتے تھے - رفتہ رفتہ سعدی کے متعلق طرح طرح کی روایات پیدا ہو گیئں - مشہور ہوگیا کہ خضر نبی سعدی سے ملنے کے لئے آئے اور آب حیات کے کچھہ قطرے سعدی کے ہونٹوں پر ڈال گئے - سعدی نے نہایت سن رسیدہ ہو کر ایک سو بیس برس کی عمر میں خریف سنہ ۱۲۹۲ ع میں وفات پائی - اُس کے رہنے کی جگہ اُس کے وفات کے بعد ہی زیارت گاہ بن گئی۔اُس کا مزار شیراز کے باہر تقریباً ایک فرسخ کے فاصلے پر واقع ہے —

باوجود اُس تقدس کے جو سعدی کے ساتھہ منسوب کیا جاتا ھے ' سعدی ایک ایک خشک مزاج صوفی نہیں ھے - وہ کبھی انتہا پسندی سے کام نہیں لیتا - اُس کے پندو نصایح بہ نسبت صوفیوں کے حکایات و قصص لکھنے والوں کے خیالات و موعظت سے زیادہ ملتے ھیں —

اُس کی طبیعت معتدل ھے ' جو زندگی کے لطف اور لذتوں سے واقف ھے - دو مشہور و مقبول عام تصانیف بوستان و گلستان کے علاوہ سعدی نے مجموعہھاے نظم معروف بہ " طیبات " و " بدایع " اور کچھہ سیاسی نظمیں اور رندانہ هزلیات بھی لکھی ھیں-اُس کی تمام کتابیں " کلیات سعدی " کے نام سے بار ھا مشرق میں طبع ھو چکی ھیں - یہ بھی قابل توجہ ھے ' اور آج کل خاص طور پر جبکہ مقامی زبانوں کی طرف توجہ کی جارھی ھے ' کہ سعدی اُن ملکوں کی زبانوں میں جہاں وہ گیا دلچسپی رکھتا تھا - وہ ترکی اور عربی بخوبی جانتا اور ایران کی مقامی زبانوں سے بھی پورے طور پر واقف تھا - حافظ کی طرح وہ بھی بعض اوقات شیراز کی مقامی زبانوں میں لکھتا رھتا تھا —

سعدی کی جس چیز کو هم پسند کرتے ھیں وہ صرف اُس کے معتدل ' معقول اور ھمدردانہ نصایح اور شیریں و تبسم آمیز حکمت ھی نہیں ھیں ' بلکہ اُس کا دلکش پیرایۂ بیان اور بامزہ تشبیہات واستعارات و کنایات بھی ھیں جو اُس نے اپنے پند و نصایح میں اختیار کئے ھیں اور نیز مناظر قدرت کا ذوق جن کا بیان اُس نے نہایت نزاکت و دل بستگی کے ساتھہ کیا ھے ' جس طرح کہ کوئی اپنے زیبا اور عزیز محبوب کا کرے گا - ذیل میں ایک حمد نقل کرتا ھوں ' جو ایک گیت ھے جس میں خدا ئے تعالیٰ کے فضل و کرم کو مناظر قدرت کے اندر دکھا یا ھے - یہ نظم فراخ و باوسعت ھے جس میں ساتھہ ھی ایک قسم کی نزاکت و صفائی ھے اور پھر محکم و دل نشین بھی ھے —

"کمالات ایزدی کو کون شمار کر سکتا ھے - اُس کی بےشمار نعمتوں میں سے کسی

نے ایک نعمت کا بھی پورا شکر ادا کیا ہے ؟ اُس نے سراپردۂ عالم کو کھڑا کیا اور مختلف و دلفریب رنگ اس میں پھیلا دیے - زمین ' سمندر ' جنگل ' سورج ' چاند ' ستارے سب اُس کے هاتھه کے بنائے هوے هیں - اُس کی بے نہایت فیاضی نے تمام عالم کو گھیر رکھا ہے ' اور آسمان کاگُمبد اُس کے فضل کے سامنے گرد ہے - نازک اور آسانی سے توٹ جا نے والی لکڑی میں وہ خوشنما پھول لگا تا ' شاخ گلاب میں شکر بھر تا اور قطرۂ آب سے لو لوے درخشاں پیدا کر تا ہے - پہاڑوں کو زمین پر بطور میخوں کے قایم کر رکھا ہے ' تا کہ پانی پر زمین تھیری رہے - سورج کے عمدہ اثر سے وہ زمین شور کو سبزہ زار بنا تا ہے اور صحرا کو نرگس و گلاب کا باغ - بادلوں کے سینے سے وہ باران بے حساب برسا تا ہے ' جو مردہ پودوں کو از سر نو زندہ کر تی ہے ' اور فصل بہار میں وہ برهنه شاخوں کو سبز اور چمکتا هوا لباس پہنا تا ہے - ایسا کونسا انعام ہے ' جس کا انسان نے کبھی پورا پورا شکریہ ادا کیا ہے .وہ اپنے انعامات بے دریغ بخشتا ہے ' لیکن سب سے بڑا ' سب سے زیادہ نہ مٹنے والا انعام یہ ہے کہ اس نے همارے دلوں میں خوش بختانہ زندگی کی امید پیدا کردی ہے "—

بوستان کے آٹھویں باب میں شکر الہی پر مندرجۂ بالا اقتباس کے مضمون کو مختلف پیرایہ میں ادا کیا ہے:—

" رات ' دن ' مہ روشن اور مہر گیتی افروز تیری آسایش کے لئے بنے هیں - آسمان فراش کی طرح تیرے لئے بساط بہار بچھا تا ہے-باد و بوت اور باران و میغ' رعدغراں اور برق درخشندہ سب کار پرداز و فرماں بردار هیں ' جو تیرے تخم کو خاک میں پالتے هیں - اگر تو پیا سا ہے تو تکلیف سے مت گھبرا کہ سقاے ابر تیرے لئے اپنے کاندھے پر پانی لائےگا .. .. خاک سے رنگ ' بو اور طعام پیدا کر تا ہے جو آنکھه دماغ اور حلق کے لئے تماشا گاہ هیں - مکھی کے

ذریعے سے شہد اور ھوا سے من پہنچاتا ' اور درخت نخل سے خرما اور گٹھلی سے نخل خرما پیدا کرتا ھے - تمام نخلبند حیرت سے ھاتھ ملتے ھیں کہ ایسا نخل کسی نے نہیں بنایا - سورج ' چاند اور پروین تیرے لئے ھیں - اور تیرے مکان کی چھت کی قندیلین ھیں - تیرے لئے خار سے گل ' نافے سے مشک ' کان سے زر اور چوب خشک سے برگ تر پیدا کیا ھے اے خدا! میرا دل خون ھوگیا اور آنکھیں زخمی ھو گیئں کہ بیان سے بڑھکر تیرے انعامات دیکھتا ھوں .... آ اے سعدی اپنا دفتر بند کر اور ھاتھ کو روک۔ایسے راستے میں‌کہ جس کی انتہا نہیں مت دوڑ '' —

سعدی نے کمال لطف کے ساتھ گلستاں کے دیباچے میں اس مشہور کتاب کا سبب تالیف اس طرح بیان کیا ھے :—

" ایک رات گذرے ھوے دنوں کا خیال اور تلف شدہ عمر کا افسوس کر رھا تھا ' اور سراچۂ دل کے پتھر کو آب دیدہ کے الماس سے پروتا اور چند ابیات مناسب حال پڑھتا تھا .... غور کرنے کے بعد یہ مناسب معلوم ھوا کہ نشیمن عزلت میں بیٹھہ رھوں ' اور دامن کو صحبت سے کھینچ لوں اور دفتر کو پریشاں بیانی سے روک لوں اور اس کے بعد پریشاں بیانی سے کام نہ لوں........... یکا یک ایک دوست جو کجاوہ غم میں میرا انیس رھتا تھا اور حجرہ میں ھم جلیس ' بر سم قدیم دروازے میں داخل ھوا - ھر چند اس نے چھیڑ چھاڑ کی لیکن میں نے بات نہ کی —

سعدی کے دوست نے اسے بات کرنے کی خوبیاں بتلائیں اور کہا " دو چیزیں تیرہ عقلی کی علامت ھیں - ایک تو بات کرنے کے وقت چپ رھنا اور دوسرے چپ رھنے کے وقت بولنا " - اس کے بعد سعدی کو اپنا ھم خیال بنا کر دونوں دوست تفریح کناں باھر کو روانہ ھوے- " موسم بہار تھاموسم‌سرما کی سختی‌کے نشان مفقود تھے ' اور گلاب‌کے ایام دولت پیدا ھو چکے تھے - درختوں‌پر پیراھن سبز چڑھا ھواتھا'

جو نیک بختوں کے عید کے کپڑوں سے ملتا تھا - سنہ جلالی کے ۶۱۰ اردی بہشت کا پہلا دن تھا - بلبل شاخوں پر چہک رہے تھے - گل سرخ پر شبنم کے موتی پڑے ہوے تھے، جس طرح کے شاہدان غضب ناک کے چہرہ پر پسینہ .... سعدی اور اس کے دوست نے ایک پر بہار باغ میں رات گذاری، جہاں درختاں دلکش کا ہجوم تھا، گویا کہ مینا کے ٹکڑے اس کی خاک پر بچھے تھے اور عقد ثریا تاک سے لٹکے ہوے........علی الصباح جب واپسی کا ارادہ ہواتو سعدی نے دیکھا کہ اس کے دوست نے اپنا دامن گل و ریحان اور سنبل و ضیمراں سے بھر رکھا تھا - سعدی نے اس سے کہا کہ " گلہاے بوستاں کو بقا نہیں ہے اور نہ عہد گلستاں کو وفا - کتاب زیادہ دیرپا چیز ہے - میں گلستاں تصنیف کروں گا جس کے اوراق پر باد خزاں کا دست تطاول نہ پہنچ سکے گا اور جس کی بہار کو گردش زمانہ خزاں سے مبدل نہ کر سکے گی " - اس کے دوست نے فوراً دامن گل چھوڑ دیا اور سعدی نے گلستاں لکھنی شروع کر دی —

گلستاں متفرق چیزوں کا مجموعہ ہے - جس میں اخلاقی حکایات و پند ونصایح درج ہیں - حکایات بالعموم نثر میں ہیں اور پندو نصایح نظم میں - حکایات کہانیاں نہیں ہیں، بلکہ اکثر خیالی یا تقریباً تاریخی قصص ہیں - جن سے اخلاقی نتایج نکلتے ہیں اور موعظت درج ہو تی ہے - وہ کلمات طرب انگیز و طیب آمیز سے پر ہیں، جو کبھی متانت لئے ہوے ہیں تو کبھی درد آمیز ہیں اور کبھی ظریفانہ —

یہ کتاب آٹھ بابوں میں تقسیم ہے - پہلے دو بابوں میں پادشاہوں کی سیرت اور درویشوں کے اخلاق و عادات سے بحث کی ہے - اس کے بعد ان خصایل کا بیان ہے، جن کی ضرب الامثال و حکایات میں اکثر تعریف ہوتی ہے یعنی قناعت و خاموشی - بعد ازاں جوانی و پیری کا ایک ایک جدا باب میں ذکر ہے - دو سب سے اخیر بابوں میں تاثیر تربیت اور آداب صحبت کا بیان ہے —

بوستاں کی ترتیب بھی ایسی ہی ہے - اس میں دس باب ہیں۔ پہلے باب میں بادشاہوں کی سیرت کا بیان ہے بقیہ ابوب میں احسان ' صوفیانہ زندگی ' تواضع ' رضا ' قناعت ' تربیت ' شکر الہی اور توبہ کا بیان ہے - اخیر میں دو مناجاتوں اور تین حکایتوں پر کتاب کا خاتمہ ہے - بوستاں کے ابواب سے خیال ہو تا ہے کہ وہ گلستاں کے مقابلے میں زیادہ صوفیانہ خیالات سے پر ہو گی لیکن درحقیقت دونوں کتابوں میں بہت کم فرق ہے —

سعدی کے نصایح کی معتدل و عملی نوعیت واضح کر نے کے لئے ہم وہ مقام نقل کر تے ہیں جس میں سعدی نے توانگری کی درویشی کے مقابلے میں حمایت کی ہے - تمام صوفی فقر کی مدح و ستایش کر تے ہیں اور سعدی بھی اس کی خوبیوں سے واقف ہے ' لیکن وہ نہیں چاہتا کہ فقر کو توانگری پر فوقیت دے یا توانگری سوتا ہے - چیونٹی تابستان میں اپنا سامان مہیا کرتی ہے کہ زمستان میں بفراغت بسر کرسکے - خداوند مکنت حق تعالی میں مصروف رهتا ہے ' لیکن وہ شخص جس کی روزی کا کوئی انتظام نہیں پراگندہ دل رھتا ہے - عربی کی ایک ضرب المثل ہے " میں خدا سے فقر سے جو سرنگوں کر نے والی چیز ہے اور ایسے همسایہ سے جو محبت نہیں کرتا پناہ مانگتا ہوں " —

یہ الفاظ شاندار نہ ہوں ' لیکن صحیح جذبات انسانی سے مملو اور خوشگوار ہیں - ایک دوسری جگہ سعدی ایک ایسے شخص کا قصہ بیان کرتا ہے جو فقیری سے امیری کے درجہ کو پہنچ جا تا ہے - ایک راہگیر جو اسے پہلے برھنہ و نادار دیکھ چکاتھاآتا اور اُسے سپاھیوں کے ھاتھوں میں گرفتار اور ایک بھیڑ میں گھرا ھوا پاتاھے - وہ پو چھتا ہے کہ اس کا کیا سبب ہے تو معلوم ھو تا ہے کہ شراب پی اور مستی کی حالت میں کسی کو مارڈالا ہے - اسی حالت میں اُس کی خوب زدو کوب کی جارھی‌ھے- " اگر کمزور کو طاقت حاصل ھوجاے تو وہ اندھا ھو جا تا اور ضعیفوں کے ھاتھ توڑ ڈالتا ہے - کسی حکیم کا قول ہے کہ یہی بہتر ہے کہ چیونٹی کے پر نہ‌ھوں - اگر بلی

کے پر ہوتے تو وہ دنیا سے چڑیوں کا بیج ناپید کردیتی " —

الغرض سعدی کے اخلاقی مواعظ قدامت پسند ہیں - وہ ہرشخص کو اس کی حالت کے مطابق دیکھنا چاہتا ہے - وہ قناعت کے فواید کی تلقین کرتا اور شکایات و ناشکیبائی سے روکتا ہے —

کے اخلاقی فواید کو نظر انداز کر دے - ایک درویش اسی غلط فہمی میں مبتلا تھا - وہ دفتر شکایت کھولے ہوے توانگری کی مذمت میں مصروف تھا اور کہہ رہا تھا " درویش کا دست قدرت بندھا ہوا ہے اور توانگروں کا پاے ارادات ٹوٹا ہوا - فیاض لوگوں کے ہاتھ میں درم نہیں اور خداوندان نعمت کے پاس کرم نہیں " - یہ الفاظ مجھے گراں گذرے ' اس لئے کہ میں بزرگوں کی نعمت سے پلا ہوں - میں نے کہا " اے یار - توانگر دخل مسکیناں و ذخیرہ گوشہ نشیناں و مقصید زایران و ملجاو ماواے مسافراں ہیں - توانگروں کے لئے وقف نذر و مہمانی ' زکواۃ و فطرہ ' اعتاق ہدی و قربانی ہیں-تو اُن کی دولت کو کیسے پہنچ سکتا ہے-تیرے پاس صرف یہ دو رکعت ہیں-اور وہ بھی بصد پریشانی " غریب ہمیشہ پریشان رہتے ہیں — فراغت فاقہ کے ساتھ پیوند نہیں کھاتی اور جمعیت تنگدستی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی - وہ شخص جسے کل کے کھانے کا سامان نہ دکھائی دے شب کو پراگندہ
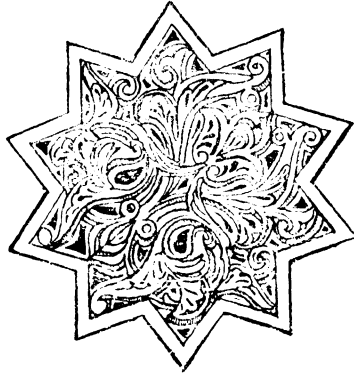
قدیم اُردو

گجری (گجراتی) زبان

میاں شیخ خوب محمد چشتی

از

[ایڈیٹر]

اس سے قبل میں شاہ علی محمدجیو گام دھنی کے حال اور کلام کے متعلق لکھہ چکا ہوں۔ اسی زبان کے ایک دوسرے مصنف شیخ خوب محمد چشتی بھی گزرے ھیں۔ یہ بھی احمدآباد گجرات کے رھنے والے تھے اور ان کا کلام وھیں کی مقامی زبان میں ھے جو گجری کہلاتی تھی۔ صاحب تحفةالکرام لکھتے ھیں کہ وہ "درویش کامل و صاحب لسان و صاحب سخن بودند و در تصوف دست رسا داشتہ"۔ اور اس پر اُن کا کلام شاھد ھے۔ اُن کی مشہور تصنیف "خوب ترنگ" ھے۔ اسی کی شرح انھوں نے فارسی زبان میں لکھی ھے جس کا نام "امواج خوبی" ھے—

میاں صاحب شیخ کمال محمد سیستانی کے مرید تھے، چنانچہ فرماتے ھیں :-

وارث محمدی ہر تھانوں　　　　شیخ کمال محمد نانوں

کیا عروج مقام اقدم　　　　اللھم اغفر و ارحم

پھر اگلے شعر میں اُن کی تاریخ بیان کی ھے —

کہہ تاریخ تنھوں کی خوب　　　　جن عدد ذاکر محبوب

"ذاکر محبوب" سے ۹۷۹ ھ نکلتے ھیں —

یہ کتاب (خوب ترنگ) انھیں کے فیض تربیت کا نتیجہ ھے۔ چنانچہ کہتے ھیں:-

ان ذوں تھا یہ علم کمال　　　　خذ العلم افواہ رجال

انتھیں میں سنیا دن رات　　　اس میں یاد رھی کچھ بات

وہ جیوں منجھ کوں آئی ترنگ　　　جمع کئے لی تس تس تھنگ

کتاب کی زبان کے متعلق تحریر فرماتے ھیں :-

جیوں میری بولی منہ بات　　　عرب عجم مل ایک سنگھات

اس کی شرح "امواج خوبی" میں یوں کی ھے' "ھر یک شعرے بزبان خود تصنیف کردہ اند و می کنند' من بزبان گجرات (گجراتی) کہ بالفاظ عربی و عجمی آمیزاست گفتہ ام" - یعنی وہ اپنی زبان کو عربی عجمی آمیز گجراتی بتاتے ھیں - در حقیقت یہ اُردو کی ایک صورت ھے جو گجرات میں رائج تھی اور گُجری کہلاتی تھی اور اسی کی بہن دکنی تھی جو اس کے پڑوس دکن میں بولی جاتی تھی بلکہ یہ کہنا درست ھو کہ دونوں ایک ھی زبانیں ھیں صرف مقامی رنگ کی کہیں کہیں جھلک نظر آجاتی ھے - ایک دوسری جگہ فرماتے ھیں :-

جیوں دل عرب عجم کی بات　　　سن بولے بولی گجرات

یہاں بھی اپنی زبان کو گجراتی ھی کہا ھے- شرح میں اس کا ترجمہ ھندی کیا ھے- اس سے بھی ظاھر ھے کہ ان کی زبان گجری اُردو تھی —

یہ کتاب سنہ ۹۸۶ھ میں تصنیف ھوی جیسا کہ خود کہتے ھیں :-

نسخہ کی تاریخ اس ٹھانہ　　　پائے عدد ھر مصرع مانہ

خوب محمد گنے بچار　　　چودہ گھات اوس برس ھزار

یعنے ھزار میں سے چودہ کم یعنی ۹۸۶ - جیسا کہ پہلے شعر میں اشارہ کیا ھے دوسرے شعر کے ھر مصرعہ سے بحساب ابجد یہی سنہ نکلتا ھے —

سنہ کے ساتھہ تاریخ اور دن بھی بتادیا ھے —

دوجا چاند سو تھا شعبان　　　دیس دوشنبہ کیا بیان

اور اس کتاب کی شرح "امواج خوبی" کی تکمیل کی تاریخ پورے ایک ھزار

سنہ ھجری ھے - یہ عین وہ زمانہ تھا جب شاھان گجرات پر زوال آچکا تھا، امرا خود سر تھے اور سارے ملک میں طوائف الملوکی کی شان نظر آتی تھی - اکبر نے اسی زمانے میں گجرات کو فتح کرکے ممالک محروسہ میں شامل کرلیا تھا —

اس زمانے میں علمائے سوء اور صوفیائے زور کا بھی بڑا زور تھا اور طرح طرح کی بدعتیں اور بے اعتدالیاں مروج ھوگئی تھیں، لیکن اسی گروہ میں ایسے لوگ بھی حق کی حمایت اور اعلان میں بے خوف کام کر رھے تھے —

خوب ترنگ خالص تصوف کی کتاب ھے اس میں شروع سے لےکر آخر تک مسائل تصوف سے بحث کی گئی ھے - مسائل اس قسم کے ھیں :-

مرتبۂ لاتعین، حضرت وحدت، حضرت الھیت، مراتب وجود، مقدمۂ فاعل مختار، مرتبۂ محمدیت مرقبۂ روح، دائرۂ عشق، مرتبۂ عبودیت، مرتبۂ قلب، مرتبۂ سلوک، شرط ذکر، مراقبہ در شغل علم، مراقبہ در شغل سمع، مرتبۂ حیرت، مقامات معراج، مرتبۂ نبوت، مرتبۂ رسالت وغیرہ —

لیکن یہ سب علمی بحثیں ھیں - شاہ علی محمد جیو کی کتاب جواھر اسرار اللہ اس سے مختلف ھے - اُس میں عشق و محبت کا رنگ ھے اور قلبی واردات کا ذکر ھے - خوب ترنگ ایک خشک کتاب ھے جس میں تصوف کی اصطلاحات میں تصوف کے مقامات کا بیان ھے - وہ حال ھے اور یہ قال ھے - علاوہ اس کے شاہ علی محمد جیو کے کلام میں جو گرمی اور حلاوت ھے وہ اس میں نہیں - شاہ علی جیو شاعرانہ طبیعت رکھتے ھیں اور اس میں عشق و محبت کی آگ ھے - میاں خوب محمد عالم اور سالک ھیں، تصوف کے نکات کے ماھر اور بہت اچھے ناظم ھیں - بڑے بڑے مسائل چند لفظوں میں نہایت اختصار سے بیان کردیتے ھیں، یہی وجہ ھے کہ انھیں خود ھی شرح لکھنی پڑی - ذیل کے نمونے سے ان کی طبیعت کا رنگ معلوم ھو جائے گا —

ابتدا (در حمد)

بسم اللہ کہوں چھت * ذات جس رحمن رحیم صفات

ذات صفات اسما افعال جمع مفصل چند اک حال

فانو محمد تس کوں دیت اوس تفصیل سو عالم کیت

اوسی روح ارواح تمام اوسی جوس کے سب اجسام

سارے نسخے منہ یہ بات سنیں کہوں گا بکت سنگہات

بکت‡سو اس تھیں سمجھے جاے جے حضرات سو خمس کلھاے $

جوں کھلھلیا سمند چھپاے جانے سب دریا لے جاے

(جس طرح ماھی گیر پرندہ اس زور سے سمندر میں ڈبکی مارتا ھے کہ گویا سارے سمندر کو لے اُڑے گا) -

نوک ننھیں دریا بن پار بھری تو نوکچ کی مقدار

(اس کی نوک تو اتنی ننھی سی اور دریا بے پایاں، تو سوائے اس کے کہ نوک کی مقدار بھر پانی لے اور کیا کر سکتا ھے) -

جیوں ظاھر بھنتیاں کھلائیں پن اینٹاں اس بھانت دکھائیں

(ظاھر میں دیوار کھلاتی ھیں لیکن اصل میں اینٹیں ھیں جو دیوار نظر آتی ھیں) -

ذرے مل اک تولا تھا نہ نانوں دھریا ھے اینٹ سوتا نہ

(اور یہ ذروں کا ایک انبار ھے جس کا نام اینٹ رکھہ لیا گیا ھے) -

جوھر عرض سو ذرا جان تلتل پھرے عرض من آن

(ذرہ عبارت ھے عرض و جوھر سے اور عرض کو ایک لمحہ قرار نہیں) -

جس کو وھم کرے نہیں دوے تاوا جنماں جسے نہ ھوے

---

* ھستی † جثہ، جسم ‡ تفصیل $ کہلاے -

(اور جوھر جزء لایجزیٰ ھے کہ جس کی تقسیم ھو ھی نہیں سکتی اور نہ جس کا کوئي بایاں دایاں ھے) -

---

پانیں پرب بھرے جیوں ھوے پانیں اس منہ پئے جو کو ے

(جیسے سبیل میں پانی بھرا رکھا ھوتا ھے اور رہ چلتے اس سے مستفید ھوتے ھیں) -

اس کا ھوے ثواب تس جن پانوں بھر یا اس مس

(اس کا ثواب اسے ھوگا جس نے پانی بھر کر رکھا ھے) -

عالم حق کے پرب سو جیوں علم بھر یا جیو ں پانیں تیوں

(اھل علم بھی حق کی سبیل ھیں اور علم پانی کی طرح ان میں بھرا ھے) -

اوس سیکھیں جے ھوے ثواب سوے ثواب سو ذات کے باب

(اور اس کے سیکھنے میں ثواب اس کو ملے گا جس نے علم بھرا) -

جسے ثواب اسیچ ثواب اوسیچ لذت سمجھہ شتاب

(پس جس کسی کو ثواب ھے اسے محنت و عذاب بھی ھے اور لذت اسی کو ھے جس میں سمجھہ ھے) -

---

بھری طشت میں ماتی جب دوجے ماتی ماے نہ تب

(جس وقت طشت کو مٹی سے بھر دیتے ھیں تو پھر اس میں دوسري مٹي نہیں سما سکتی) -

پانیں جب ریزو اس ما نہ پچھیں سماوے پانیں تا نہ

(لیکن جب اس میں پانی ڈالتے ھیں تو پانی اس میں سما جاتا ھے) -

جس باتیں پانی سوس جاے پانی میں باؤ سماے

(جس طرح پانی مٹي میں مل گیا اُسی طرح ھوا پانی میں سما جاتي ھے)

پچھویں سماوے آگ بسیکھہ   پانی آگ تتا کر دیکھہ

(اگر طشت کو آگ سے گرم کریں تو آگ سماجاتی ہے) —

جی کو ہوے بہت لطیف   ماے لطیف سو سانجہ کثیف

(جو چیز کہ لطیف ہے اس کی گنجائش کثیف میں نکل آتی ہے) -

خدا لطیف سو جس کا ناٹوں   اہے محیط سو وے ہر ٹھانوں

(خدا لطیف ہے اور وہ ہر شے میں ہے) -

کلام کے اس مختصر نمونے سے ان کی شاعری اور زبان کی حالت معلوم ہوتی ہے —

میں اس سے قبل لکھہ چکا ہوں کہ گجری اردو میں گجراتی کے لفظ ملے ہیں چنانچہ اس زبان کے الفاظ شیخ علی جیو اور میاں خوب ترنگ کے کلام میں جا بجا پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند لفظ یہاں لکھے جاتے ہیں —

لفظ	معنے	لفظ	معنے
ہوں	میں	ہب یا ہبیں	اب
ڈوسی	بڑھیا	جھنا	دایاں
بکت	تفصیل	چھیلا (چھیلی)	آخری
اونڈا	گہرا	ٹونکا	مختصر ' تھوڑا
ماں	میں	پپوتے	حباب
چھولی	چھوٹی موج		

دکنی میں " ہی " کے لئے " چ " کا حرف آتا ہے اور گجری میں اسی معنے میں " ج " استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً دکنی میں " اس ہی " کو " اسیچ " کہیں گے اور گجری میں " اسیج "۔ اسی طرح ایکچ اور ایکج وغیرہ —

تحفة الکریم میں میاں خوب محمد کا سنہ وفات سنہ ۱۱۰۳ ھ لکھا ھے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ خوب ترنگ کا سنہ تصنیف سنہ ۹۸۶ ھ اور شرح کی تکمیل کا سنہ ۱۰۰۰ ھ ھے - یہ قرین قیاس نہیں کہ ان کی عمر اس قدر ھو - علاوہ اس کے ان کی تاریخ وفات " خوب تھے " سے نکلتی ھے جس کے عدد بحساب ابجد ۱۰۲۳ ھوتے ھیں اور یہی ان کا سنہ وفات ھے —

میاں صاحب کا انتقال گجرات ھی میں ھوا اور ان کی قبر چوک احمد آباد متصل مسجد فرحت الملک دروازہ خارو میں ھے —
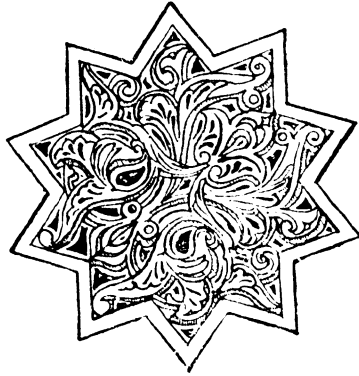
مقدمۂ السنۂ عالم

(مرتبۂ ا - می لے و مارسل کوهن)

[یه ایک عالمانه اور محققانه کتاب کا مقدمه هے جو یورپ کے نامور محققین السنه کی کاوشوں کا نتیجه هے - مقدمے کا ترجمه فرانسیسی سے هماری درخواست پر پروفیسر اِی - اِی اسمتھ (جامعهٔ عثمانیه حیدرآباد) نے انگریزی میں کرکے عنایت فرمایا هے - انگریزی کا ترجمه اُردو میں همارے دوست مولوی سید وهاج الدین صاحب پروفیسر اورنگ آباد کالج نے کیا هے - هم دونوں صاحبوں کا ته دل سے شکریه اداکرتے هیں — ایڈیٹر]

زبانوں کی سب سے زیادہ مشہور تقسیم جو انفرادی *، اتصالی † اورتصریفی‡ زبانوں میں کی گئی هے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی ، اور اس سے کوئی علمی یا عملی فایدہ نہیں حاصل هوتا - اگر زبانوں کی کوئی تقسیم کار آمد اور مفید

* انفرادی زبانیں ، مثلاً چینی ، وہ زبانیں هوتی هیں جن میں حروف نہیں هوتے اور هر شکل مختلف مستقل لفظ هوتی هے اور هر لفظ مفرد آواز هوتا - ان الفاظ میں تبدیلی نہیں هوتی - الفاظ کے معنی محض ان کی ترتیب اور نشست سے نکلتے هیں —

† اتصالی زبانیں جیسے ترکی ، ان زبانوں میں بقول وهٹنی Whitney کے اجزاے الفاظ کا اتصال ادنیٰ درجه کا هوتا هے ، اور ان کے سابقے اور لاحقے ایک دوسرے سے ، اور خود اصل لفظ سے بے نیاز هوتے هیں —

‡ تصریفی زبانیں جیسےلاطینی ، عربی ، سنسکرت وغیرہ ، ان میں محض لاحقوں اور خاتمے کے رد و بدل سے زمانه ، تذکیر و تانیث ، واحد و جمع کے اختلافات پیدا هو جاتے هیں —

ہوسکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ انہیں خاندان اور شجرے کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے اور ان کی تاریخ کو مد نظر رکھا جائے - یہی تقسیم موجودہ کتاب کی اساس ہے —

اس تقسیم کا اصول ہر شخص کا جانا بوجھا ہے - جب کوئی زبان کسی وسیع حلقے میں بولی جاتی ہے ' اور اس کے بولنے والے افراد میں وہ با قاعدہ اور مسلسل تعلقات باقی نہیں رہتے جن کی وجہ سے اس زبان کی وحدت قائم تھی ' تو ایسی صورت میں اس وسیع حلقے کے مختلف حصوں میں جو لسانی تغیرات پیدا ہوجاتے ہیں وہ ایک سے نہیں ہوتے ؛ اور ایک خاص زمانے کے گزرنے کے بعد (جس کی مدت حالات کے ساتھہ بدلتی رہتی ہے) ان مختلف مقامی بولیوں میں جو اب سابقہ عام زبان کی یادگاریں ہیں ' کچھہ ایسے اختلافات پیدا ہوجاتے ہیں کہ مختلف اضلاع کے باشندوں کے لئے ایک دوسرے کی گفتگو سمجھنا محال ہوجاتا ہے - پس جس حد تک کہ مختلف صوبوں کے باشندے ایک دوسرے کی گفتگو سمجھنے سے قاصر رہیں ' اسی حد تک یہ کہنا بجا ہے کہ سابقہ عام زبان کی جگہ اب کئی نئی زبانوں نے لے لی ہے —

مثال کے طور پر لاطینی زبان کو لیجئے - یہ ایک زمانے میں سلطنت روما کے مغربی حصوں کی عام زبان تھی ' لیکن جب قدیم تہذیب کے پاؤں اُکھڑے تو اس زبان کا نشو و نما اطالیہ کے مختلف حصوں ' جزیرہ نمائے اندلس ' اور گال (قدیم فرانس) میں مختلف نہج پر ہوا - نتیجہ یہ ہوا کہ ان مختلف حصوں کے باشندے اگرچہ کسی وقت یہ قطعی دعوی نہ کرسکتے تھے کہ ہم اب لاطینی نہیں بولتے ' لیکن پھر بھی نویں صدی عیسوی کے آغاز تک ان باشندوں کی زبانیں ایک دوسرے سے الگ ' اور لاطینی سے بالکل مختلف ہوگئی تھیں ؛ چنانچہ اطالوی ' ہسپانوی ' فرانسیسی ۸ رومی (Gallo Romanic) ' رہتیے ۸ رومانی • (Rheto Romanic) اور

• Rehto-Romanic یا Romansch وہ زبان جو بحیرۂ اڈریاٹک میں Grisons سے Friuli تک بولی جاتی ہے —

رومانوی (Rumanian) زبانیں سب کی سب لاطینی ھی سے نکلی ھیں ' لیکن ایسی لاطینی سے جس کا ارتقا مختلف مقامات میں مختلف طریقوں پر ھوا ھے —

لاطینی زبان میں جو کچھہ مختلف تدریجی تغیرات رونما ھوے ' وہ خاص خاص تاریخی دوروں میں ھوے - بعض تغیرات تو ایسے زمانوں میں ھوے جن کے متعلق ھمارے پاس ایک بھی تاریخی شہادت نہیں ھے ' لیکن اکثر صورتوں میں خود الفاظ اپنے اصل کا پتہ دے دیا کرتے ھیں - چنانچہ سنسکرت ' ژند ' قدیم یونانی ' لاطینی ' قدیم آئرش (Irish) ' گاتھک ' قدیم سلافی Slavonic ' قدیم ارمنی وغیرہ میں جو گہری مشابہت پائی جاتی ھے ' وہ اس صورت میں ھرگز نہ ھوتی اگر یہ مختلف زبانیں ایک ھی زبان یعنی ھندی یوروپی (Indo European) کے مختلف تغیرات کا نتیجہ نہ ھوتیں —

مذکورۂ بالا بحث سے ھمارا ذھن دو اصطلاحات (۱) خاندان السنہ (۲) اور السنۂ متعلقہ کی تعریف کی طرف منتقل ھوتا ھے —

' خاندان السنہ ' سے ایسی زبانوں کا مجموعہ مراد ھوتا ھے جن میں اگرچہ کم و بیش ردوبدل ضرور ھوگیا ھے ' لیکن سب کی سب ایک ھی عام زبان کا سلسلہ ھیں -

' السنۂ متعلقہ ' وہ زبانیں ھوتی ھیں جو ایک ھی خاندان السنہ کی رکن ھوں - واضح ھو کہ اس تعریف کی حیثیت محض تاریخی ھے ' اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ان سب زبانوں میں کوئی عام یا تفصیلی مشابہت ضرور پائی جاے گی - کچھہ نہ کچھہ عام مشابہت اس سے ضرور معلوم ھوتی ھے ' اور اکثر یہ مشابہت بہت کچھہ زیادہ بھی ھوتی ھے ' لیکن محض اس تعریف کی بنا پر کوئی شخص یہ پیشین گوئی نہیں کرسکتا کہ السنۂ متعلقہ کی مشابہت کی ٹھیک ٹھیک کمیت اور کیفیت کیا ھے —

جن زبانوں کو " السنۂ متعلقہ " کہا جاتا ھے ان کی مغائرت بعض اوقات اس

درجه تک پہنچ جاتی ہے کہ ان کی کسی خصوصیت سے بھی باہمی تعلق کا پتہ نہیں چلتا مثلاً پولش اور انگریزی زبانوں کی عام ساخت اور تفصیلی خصوصیات میں بہت کم مشابہت پائی جاتی ہے ' حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی مجموعے یعنی ہندی۸یوروپی سے تعلق رکھتی ہیں - اس امر کا بالواسطہ ثبوت فراہم کیا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں زبانیں نتیجہ ہیں ان مسلسل تبدیلیوں کا جو ہندی۸یوروپی زبان میں ہوئیں اور جو اسے ایک طرف پولش اور دوسری جانب انگریزی کی طرف لے گئیں —

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی ایک خاندان السنہ میں دوسرے نئے خاندان بھی پائے جاتے ہیں ایک زبان جو کسی سابقہ زبان کی ترقی یافتہ شکل ہے ' خود اپنی نوبت میں درہم برہم ہوکر مختلف زبانوں کو پیدا کردیتی ہے - مثلاً ہندی۸یوروپی خاندان کی تقسیم ہندی' ایرانی' یونانی' لاطینی' جرمانی وغیرہ میں ہوتی ہے - لاطینی تقسیم ہوکر اطالوی' ہسپانی' پرتگالی' پراونسی* (Provencal) فرانسیسی اور دوسری زبانیں پیدا کرتی ہے - جرمانی زبان گاتھک' اس کینڈی نے وی (Scandinavian) المانی ' انگریزی وغیرہ میں تقسیم ہوجاتی ہے —

مختصر یہ ہے کہ یہ ثابت کرنا کہ دو زبانیں آپس میں کوئی تعلق نہیں رکھتیں' ناممکن ہے - مثلاً یہ تو آسانی سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ فلےمش Flemish† میں رومانی‡ خاندان السنہ کی کوئی خصوصیت بھی نہیں پائی جاتی لیکن

---

* یعنی Provence کی زبان ' یہ فرانس کا ایک حصہ ہے — (و)

† Flandars کی زبان — (و)

‡ Romance Language (رومانی زبان) سے مراد بالعموم فرانسیسی یا وہ دوسری زبانیں لی جاتی ہیں جو جنوبی یورپ میں بولی جاتی ہیں اور رومی زبان یا لاطینی سے نکلی ہیں مثلاً پراونسال' اطالوی' ہسپانی' پرتگالی' رومانوی (Rumanian) وغیرہ سب کی سب Romance Languages کہلاتی ہیں — (و)

فلے مش جرمانی زبان ہے ' اور اس اعتبار سے ہندی۸یورپی زبانوں میں سے ہے '
لہذا ان دوسری رومی زبانوں کی طرح جو لاطینی سے نکلی ہیں فلے مش بھی ہندی
یورپی ہے - اتنا ضرور صحیح ہے کہ اس کا رشتہ اتنا نزدیک کا نہیں ہے جتنا کہ رومی
زبانوں کا ' بلکہ بہت دور کا رشتہ ہے ' یعنی ہندی۸یورپی تعلق سے - یہی حال
فنی۸یوگری * (Finno - Ugrie) زبان کا ہے ' جو اگرچہ ہندی۸یوروپی خاندان سے
بہت مختلف ہے ' لیکن پھر بھی اس اختلاف سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دونوں
مجموعے بہت قدیم زمانے کی ایک ہی اصل زبان سے نہیں نکلے ہیں —

خاندان واری تقسیم السنہ سے صرف اتنی سی تاریخی بات ثابت ہوسکتی
ہے کہ کسی زمانۂ قدیم میں زبانوں کی ایک برادری قائم تھی - پس ہمیں ہمیشہ
اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ اگر زمانۂ ماضی کے متعلق زیادہ گہری تحقیق
سے کام لیا جاے تو یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ کوئی سی دو زبانیں یا زبانوں کے
مجموعے جن میں ہم آج اپنی موجودہ تحقیق سے کوئی تعلق دریافت نہیں کرسکے
ہیں ' ضرور زبانوں کی کسی نہ کسی ایک ہی برادری کے ارکان رہ چکے ہیں -
لیکن سب سے بڑی دقت تو ثابت کرنے کی ہے —

السنۂ متعلقہ کی نسبت یہ قیاس قائم کیا جاسکتا ہے کہ اگر دوسرے حالات
اور واقعات وہی رہیں ' تو جتنی زیادہ مدت تک متعلقہ زبانیں ایک دوسرے
سے بچھڑی ہوئی رہیں گی ' اتنے ہی زیادہ ان میں اختلافات پیدا ہوتے جائیں گے -
اسی طرح سے جتنا زیادہ فاصلہ دو زبانوں اور ان کی مشترک اصل زبان کے عہدوں
میں ہوگا ' اتنا ہی زیادہ ان کا تعلق ثابت کرنا مشکل ہوگا —

• رومی زبانوں کا آپس کا تعلق ثابت کرنا آسان ہے ' اور یہ اس لئے کہ اس زمانے
میں جب کہ لاطینی کئی زبانوں میں منقسم ہونا شروع ہوئی ' اور اس زمانے
میں جب کہ مختلف رومی زبانوں کی قدیم ترین کتابیں تصنیف ہونے لگیں '

---

* Fino-Ugrie وہ زبان ہے جو یورال اور الطائی پہاڑوں کے درمیان بولی جاتی ہے - (و)

چند ھی صدیوں کا فرق ھے ۔ اسی طرح سے ھندی یورپی زبانوں کے باھمی رشتے کے ثبوت میں ھمارے پاس جو کچھہ کافی معلومات ھے وہ صرف اس وجہ سے ھے کہ اس خاندان کی اکثر زبانوں کے متعلق ھمارے پاس زمانۂ مسیح سے کئی صدی پہلے کا اور تقریباً سب زبانوں کے متعلق دسویں صدی عیسوی تک کا مواد موجود ھے - اگر ھمیں صرف ھندی یورپی زبانوں کا نظریہ قائم کرنا ھوتا تو ان زبانوں کی موجودہ ساخت ھی سے ان کا باھمی تعلق ثابت ھو سکتا تھا ، لیکن اس صورت میں ھم ان کی وہ کامل تقابلی صرف و نحو نہ تیار کرسکتے جو آج ان کی قدیم یادگاروں کی بنا پر تیار ھوسکی ھے —

لیکن (ھندی یورپی زبانوں کے بر خلاف) دنیا کی زیادہ تر زبانیں ایسی ھیں جن کے متعلق ھمارے پاس مواد یا تو بہت کم قدیم زمانے کا ھے ، اور یا پھر تمام تر زمانۂ جدید کا ھے - اس مواد کی بنا پر صرف چند ھی صدی قبل کی " زبانوں کی برادری " کا تعین ھوسکتا ھے - لیکن جہاں زبانوں کی ایسی برادریوں کی تحقیق مطلوب ھو جو ھندی یورپی یا سامی برادریوں سے بہت پہلے کی ھیں وھاں ان کے قدیم ترین زمانے (یعنے مسیح سے کئی صدی پہلے کے) اور حقیقی زمانے کے درمیان کچھہ ایسے انقلابات اور تغیرات حایل ھیں کہ تحقیق کی حیثیت محض خیالی اور قیاسی رہ جاتی ھے —

علاوہ بریں کسی زیر بحث زبان میں عام خصائص کی جتنی کمی ھوگی اتنی ھی اس کی خاندان واری تقسیم ، خواہ زبانوں کے تاریخی مطالعہ کے لئے ھو یا ان کے سمجھنے کی سہولت کے لئے کم مفید ھوگی - اگر کوئی شخص صرف انگریزی فرانسیسی ، پراھش اور ارمنی زبانوں کی اصلی ساخت کی بنا پر اور ان کا مقابلہ اور موازنہ کر کے ان کی تاریخ مرتب کرنا چاھے تو اسے زیادہ کامیابی نہ ھوگی ، اور ان کے متعلق محض یہ جان لینا کہ یہ سب کی سب ایک ھی زبان کی مختلف شکلیں ھیں جو آج سے چار پانچ ھزار برس پہلے رائج تھی ، نہ

تو ان کے بولنے میں کچھ زیادہ مدد دے گا ' اور نہ ان کے ارتقا کی تحقیق میں مذکورۂ بالا واقفیت چاہے مورخ کے لئے دلچسپ ہو ' لیکن ماہر لسانیات کے لئے اس کا براہ راست فائدہ کچھ بھی نہیں ہے - اور بفرض محال اگر یہ بھی مسلم مان لیا جاے کہ بعض زبانوں کا کسی ایک عام زبان کے صدیوں کے تغیرات کا نتیجہ ثابت ہونا تاریخ داں کے لئے ضروری مواد کا حکم رکھتا ہے تو بھی اس کی اہمیت کو بڑھا چڑھا کر ظاہر کرنا غیر ضروری ہے —

ہر زبان کی تحقیق میں ' اس ذخیرۂ مواد کے علاوہ جو صدیوں سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے ان عوامل اور موثرات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے ' جو اکثر صورتوں میں غیر معلوم ہیں ' اور جنھوں نے اس کے تغیرات میں حصہ لیا ہے - فرانسیسی لاطینی کی بدلی ہوئی شکل ضرور ہے ' لیکن یہ تبدیلی انتہائی درجہ کی ہے ' اور عام ساخت نیز جزئیات دونوں حیثیتوں سے فرانسیسی اور لاطینی میں زمین آسمان کا فرق ہے - پس ظاہر ہے کہ جن عوامل نے اس تبدیلی میں حصہ لیا وہ فرانسیسی زبان کی اصلی ساخت میں کچھ ایسے رچ پچ گئے ہیں کہ ناپ جوک تو در کنار ' ان کا صحیح تخمینہ تک نہیں کیا جاسکتا حالانکہ اگر دیکھا جاے تو فرانسیسی زبان کی تشکیل میں ان عوامل کی اہمیت قدیم لاطینی عنصر کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہے - ماہرین لسانیات زبانوں کی تحقیق میں ہمیشہ ابتدائی صورت حالات پر زیادہ زور دیا کرتے ہیں (مثلاً فرانسیسی کی تحقیق میں لاطینی عنصر پر زور دینا) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خواہ براہ راست شہادت کی بنا پر ہو (جیسے لاطینی میں) یا موازنے اور مقابلے سے غرض کہ کسی نہ کسی طرح ابتدائی صورت حالات سے وہ تھوڑے بہت واقف ضرور ہوتے ہیں ' لیکن ان موثرات کا ذکر جن کی وجہ سے تشکیل یا تبدیلی ہوئی ہے ماہرین لسانیات بہت کم کرتے ہیں ' اور یہ اس لئے کہ ان کے متعلق ان کی معلومات قطعی نہیں ہوتی ' لیکن ظاہر ہے کہ محض نقص واقفیت کی وجہ سے کسی شخص کو اپنے نفس کو دھوکا نہ دینا چاہئے-

اگر مذکورۂ بالا بیان سے بھی قطع نظر کرلی جاے تو بھی معلوم ھوتا ھے کہ ھر زبان کا ایک حصہ اور اکثر صورتوں میں بہت بڑا حصہ ایسا ھوتا ھے جس کا خاندان واری تقسیم السنہ میں بالکل لحاظ نہیں کیا جاتا - یعنی مستعار الفاظ کا حصہ - اگر کوئی شخص یہ کوشش کرے کہ فرانسیسی زبان کے سارے سرمایۂ لفظی کی تحقیق قیصری (Caeser) زمانے کی تقریری لاطینی کے ارتقاء سے کی جاے تو اسے فرانسیسی الفاظ کا بہت بڑا فاضل حصہ ایسا نظر آے گا جس کے متعلق وہ کسی قسم کی تحقیق نہ کر سکے گا - بات یہ ھے کہ فرانسیسی الفاظ کا بہت بڑا حصہ مختلف زبانوں مثلاً المانی ، عربی ، اطالوی ، ھسپانی، انگریزی وغیرہ سے مستعار لیا گیا ھے - جب کبھی اندرونی لسانی تغیرات کی وجہ سے یا نئے خیالات کے اظہار کے لئے فرانسیسی زبان کو نئے الفاظ کی ضرورت داعی ھوئی ، تو اس نے انھیں باقاعدہ طور پر تحریری لاطینی سے مستعار لے کر ان کے اشکال اور معانی کو " اپنا لیا " - چنانچہ زمانۂ قدیم اور ازمنۂ وسطی کی تحریری لاطینی کا دخل جدید فرانسیسی الفاظ کی ساخت میں اتنا یا اس سے زیادہ ھی ھے جتنا کہ روسی ماھرین لسانیات کی فصیح تقریری لاطینی کا اور ابھی حال میں تو یونانی ذخیرۂ لفظی سے بھی بہت کچھ مستعار لیا گیا ھے —

لفظی سرمایہ کے علاوہ جملوں کی ساخت پر بھی غیر ملکی اثرات خاص کر تحریری لاطینی کے پڑے ھیں —

لفظوں کا مستعار لینا سب سے زیادہ اس صورت میں نمایاں ھوتا ھے جہاں کسی بالکل ھی مختلف زبان سے لفظ لئے جائیں - مثلاً فارسی ایک ھندی۸یوروپی زبان ھے ، لیکن مذھبی امور کے متعلق اس کا تمام تر سرمایہ عربی سے لیا گیا ھے جو سامی زبان ھے —

زبان کا وہ حصہ جو عہد بہ عہد ، اور تدریجی تغیر اور تشکیل کے زمانے

میں بھی اپنی حالت پر بر قرار رھتا ھے ' صرفی اور نحوی قواعد کا حصہ ھوتا ھے - اس میں کوئی شک نہیں کہ لاطینی کی ساخت ھندی۸یورپی کی ساخت سے اور فرانسیسی کی ساخت لاطینی زبانوں کی ھیئت سے بہت کچھہ مختلف ھے - لیکن لاطینی نظام السنہ کی بہت سی خصوصیات فرانسیسی میں اور ھندی۸یورپی نظام کے خصائص لاطینی میں دوبارہ ظاھر ھوتے ھیں - بات یہ ھے کہ زبانوں کی ھیئت میں ایک طرح کا تسلسل پایا جاتا ھے اور اسی وجہ سے ان کی تقسیم اور درجہ بندی ممکن ھوتی ھے - خاندان واری تقسیم السنہ کی اصلی بنیادی تسلسل ھیئت ھے —

جزئیات کی مطابقت سے مثلاً فرانسیسی زبان کے il est (وہ ھے) اور ils sout (وے ھیں) کو المانی زبان کے er ist (وہ ھے) اور sie sind (وے ھیں) سے مطابق پاکر ان زبانوں کے آپس کے رشتے کے متعلق جو ثبوت ملتا ھے اتنا محض عام ساخت کی مشابہت سے نہیں فراھم ھوتا - پس اگر ھندی۸یورپی خاندان السنہ کے عام قاعدے دریافت ھوسکتے ھیں تو اُن زبانوں کی گردانوں یا خاص کر بے قاعدہ الفاظ کی تحقیق سے دریافت ھوسکتے ھیں جن کا ھندی۸یورپی ھونا متحقق ھے ' اور اسی بنا پر اس کل مجموعے کی تقابلی صرف و نحو بھی تیار ھوسکتی ھے - باقی رھا عام ساخت یا نظام کی بنا پر کوئی تحقیق کرنا ' تو واضح رھے کہ اثرات کی وجہ سے زبانوں کی ظاھری ھیئت بالکل بدل جایا کرتی ھے - فرانسیسی یا انگریزی کی ساخت ھندی۸یورپی کی بہ نسبت چینی زبان سے زیادہ ملتی ھے - پس معلوم ھوا کہ محض زبانوں کے عام نمونے کی تحقیق کی بنا پر ان کی خاندان واری تقسیم نہیں کی جاسکتی ' زیادہ سے زیادہ ایک عام اشارہ مل جاتا ھے —

یہی وجہ ھے کہ ھم ترکی۸منگولی اور فنی۸یوگری زبانوں کو ایک ھی خاندان میں شامل نہیں کرسکتے حالانکہ عام نمونے کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ان دونوں میں بہت کافی مشابہت پائی جاتی - ھر زبان کا طریقۂ اصوات

(Phonetic System) اگرچه اس کی عام ساخت کے مقابلے میں نسبتاً کم پائدار ہوا کرتا ہے لیکن پھر بھی اس میں کسی قدر ثبات موجود رہتا ہے اور زبانوں کی تحقیق میں اس سے مفید اشارے ہاتھ آ جاتے ہیں —

ہر زبان کے ذخیرۂ لفظی میں عجیب و غریب تغیرات ہوتے رہتے ہیں - سرمایۂ لفظی بجاے اس کے کہ اس لسانی تسلسل کا مظہر ہو جو خاندان واری تقسیم میں ظاہر کیا جاتا ہے زیادہ تر تہذیب کے اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے - اس میں شک نہیں کہ عام طور پر ہر زبان میں پرانے الفاظ کا ذخیرہ کم و بیش باقی رہتا ہے خاص کر ایسے الفاظ جن کے معنے کھانے ' پینے ' جانے ' آنے کے ہوتے ہیں ' نیز صفات ' اور اسماء جیسے رشتوں کے نام ' عام جانوروں کے نام وغیرہ یہ سب کے سب زیادہ تر پرانے ہی ہوتے ہیں' لیکن زبان کا وہ حصہ جس کا تعلق معاشرتی یا ذہنی زندگی سے ہوتا ہے ضرور خارجی اثرات سے متاثر ہوتا ہے - تہذیب و تمدن کی اصطلاحیں زیادہ تر اُن تہذیب یافتہ زبانوں سے مستعار لی جاتی ہیں جن کا اثر دنیا کے وسیع قطعوں پر ہوتا ہے اور جو اکثر صورتوں میں اس خاندان کی رکن نہیں ہو تیں ' جس کے لئے وہ الفاظ فراہم کرتی ہیں مثلاً یونانی تہذیب نے جو جدید مغربی تمدن کی اساس اولیں ہے ' کثرت سے لاطینی کو الفاظ مستعار دیے ہیں ' علاوہ بریں جس ادبی حلقے نے تحریری لاطینی کو رواج دیا اس کے پیش نظر بھی یونانی زبان ہی کا نمونہ تھا - سنہ عیسوی کے آغاز سے جتنے علمی زبانوں کے ذخیرے وجود میں آے اور بحر قلزم کے گردوپیش پھیلے ان سب کا براہ راست یا بالواسطہ یونانی زبان ہی سر چشمہ بنی - اسی طرح سے تمام دنیاے اسلام کے لفظی ذخیرے عربی سے ماخوذ ہیں —

بدھ مت کی نشرو اشاعت کی وجہ سے ہندوستان کی زبان کا اثر وسط ایشیا ' ہندی چین اور ملایا کی زبانوں پر پڑا ہے —

دسویں صدی عیسوی سے فارسی کا اثر وسط ایشیا پر ' بلکہ ہندوستان

تک ، پڑا ھے —

مشرق بعید میں ھم دیکھتے ھیں کہ چین نے انام ، کوریا اور جاپان کے لئے تہذیب و تمدن کے الفاظ فراھم کئے —

مختصر یہ کہ تہذیب و تمدن کی ان سب بڑی بڑی زبانوں کی تعداد اگرچہ کم ھے ، لیکن ان کے اثرات بہت وسیع ھوے ھیں - مستعملہ حروف تہجی کی تحقیق سے بھی ان کے اثرات کا عام اندازہ ھوجاتا ھے - میخی*(Cuneiform) ، یونانی (اوراسی سے ماخوذ کردہ لاطینی) ، اُرمی † (Aramaic) ، عربی ، ھندی ، اور چینی حروف تہجی کے وسیع استعمال سے اس امر کا ثبوت ملتا ھے کہ ان سب تمدنی زبانوں میں سے ھر ایک کا حلقۂ اثر کیا تھا —

مختصر یہ ھے کہ زبانوں کی تحقیق میں ھم جن تین قسموں کے واقعات پر نظر ڈالتے ھیں وہ حسب ذیل ھیں - سب سے پہلی چیز ھر زبان کا تسلسل ھے جو اس کی ھیئت ظاھری میں نظر آتا ھے ، اور جس کی بنا پر زبانوں کی خاندان واری تقسیم کی جاتی ھے - دوسری بات وہ اثرات ھیں جن کی وجہ سے لسانی تغیرات پیدا ھوے (اس میں شک نہیں کہ ان اثرات کا اب تک کوئی کامل احصاء نہیں ھوسکا ھے ، اور زیر بحث تصنیف سے بھی یہ کمی پوری نہ ھوسکے گی ، لیکن ان اثرات کی اھمیت بہت زیادہ ھے) تیسری چیز تہذیب و تمدن کی زبانوں کا اثر ھے - دوسری زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ کے متعلق زیادہ تر معلومات ان زبانوں ھی سے فراھم ھوتی ھے —

---

* قدیم بابلی اور آشوری حروف تہجی جو صورت میں میخوں کی طرح ھوتے ھیں ایران میں استخر اور تخت جمشید کے اکثر کتبے اسی زبان میں ھیں ، اور جرمنی کے مستشرقین نے انھیں شناخت کرلیا ھے (و)

† اُرمی - یعنی اُرمیا کی زبان یہ ملک فلسطین کے شمال و مشرق میں تھا - (و)

زبانوں کی تحقیق میں خواہ یہ فرض کرلیا جاے کہ ابتدا میں مشترکہ زبانوں کی توسیع ہوئی اور انھیں سے خاص خاص خاندان السنہ وجود میں آئے ' یا چاہے یہ تسلیم کیا جاے کہ زبانوں میں مستعار اجزا کا ایک طویل سلسلہ پایا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس کس تمدن نے کیا کیا اثرات چھوڑے ' لیکن واقعہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کی معلومات کو ایک زبان سے دوسری زبانوں تک لے جانے والے دو زبردست عامل وہی ہیں جن کی طرف پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے ؛ یعنی ایک ابتدائی مشترکہ زبان ' اور ایک ایسی زبان جس سے الفاظ مستعار لئے گئے -

جو زبان عام طور پر پھیلتی ہے وہ اس جماعت کی زبان ہوتی ہے جس میں نظام معاشرت ابتداءً موجود ہوتا ہے ' اور جس زبان (یا زبانوں) سے الفاظ مستعار لئے جاتے ہیں وہ ایسی زبانیں ہوتی ہیں جن کے ذریعے سے تہذیب و تمدن کی بولیاں سنی جاتی ہیں —

زبانوں کی تمام واضح اور بین مثالوں میں ہمیں یہی مذکورۂ بالا دو عوامل کام کرتے نظر آتے ہیں - تہذیب کا اثر انہی کی وساطت سے منتقل ہوتا ہے اور شدت اور کثرت کے ساتھہ عمل کرتا ہے لیکن زبانوں کی تمام مثالیں واضح نہیں ہوتیں ' اور پیچیدہ تر زبانوں سے بھی سابقہ ہوسکتا ہے —

زبانوں کے جتنے خاندان مرتب کئے گئے ہیں ان سب میں ایک ہی قسم کا تاریخی ارتقا فرض کیا گیا ہے ' یعنی کسی مشترکہ زبان کا وسیع حلقے میں پھیلنا اور ربط قائم رکھنے والے اثرات کے کمزور ہوتے ہی اس زبان کی تقسیم - مشترکہ زبان کی توسیع کا نظریہ اس قیاس پر مبنی ہے کہ ایک ایسی قوم جو اپنی مخصوص تہذیب رکھتی ہو اور اپنی قوت اور جدت سے واقف ہو ' پہلے سے موجود تھی ' اور اس کی شہرت اور سطوت اس کی زبان کے پھیلنے کا سبب بنی تھی —

اس قسم کے واقعات (یعنی کسی قوم کی شہرت کی وجہ سے اس کی زبان کی اشاعت) پہلے بھی دیکھے جاچکے ہیں ' اور آج بھی نظر آتے ہیں . مشترکہ زبانوں

کا پھیلنا خصوصیات عالم میں داخل ہے - مثلاً عام فرانسیسی زبان نے پرانی بولیوں کومیدان سے ھٹا کر انھیں مٹا دیا ہے - انگریزی زبان ساری دنیامیں پھیلتی جا رہی ہے - ھندی۸یوروپی زبانوں کی زبردست توسیع کا خاص سبب یہ ہے کہ ان زبانوں کی بولنے والی آبادیاں تنظیم اور تفوق کی خاص حس رکھتی ھیں ' اور اسی سبب سے ان کی زبانوں نے دوسری زبانوں کی بہت بڑی تعداد کی جگہ خود لے لی ہے ' جیسا کہ اطالیہ میں لاطینی زبان کا حشر ھوا - اسی طرح سے اگر کوئی شخص تاریخ کا مطالعہ کرے تو وہ سامی زبانوں مثلاً آشوری ' بابلی ' عبری ' فنیقی ' آرمی زبانوں اور (ساتویں صدی عیسوی سے) عربی زبان کی توسیع کی وجہ سمجھہ سکتا ہے —

لیکن یہ ثابت نہیں ھوتا کہ زبانوں کی توسیع ھر جگہ اسی اصول پر ھوی ہے- یہ بھی ممکن ہے کہ مصائب کے زمانوں میں آبادیوں کے خلط ملط ' (مثلاً حملوں ' جنگوں وغیرہ میں ' ۱۲ - مترجم) اور زیادہ پیچیدہ حالات کی وجہ سے زبانوں کی توسیع معمل میں آئے - علاوہ بریں موازنے اور مقابلے سے جو اعمال کسی ایک عام زبان کی توسیع میں کام دیتے ھیں ' مثلاً ھندی۸یوروپی ' سامی ' فنی - یوگری ' ھندی۸ایشیائی (Indonesian) ' بانتو * (Bantu) وغیرہ میں ' ان کا ھر زبان کی توسیع پر انطباق کرنا درست نہیں ہے - مثلاً یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا کبھی امریکی زبانوں کی ' جنھیں اب تک بہت کم لوگ جانتے ھیں ' اور جن کی تقابلی تحقیق بہت کم کی گئی ہے ' کوی مکمل اور جامع تقابلی صرف و نحو تیار ھوسکے گی ؟ اب تک جو کچھہ تحقیق ان زبانوں کے متعلق کی گئی ہے ' اس کا نتیجہ تو کچھہ زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے —

جن زبانوں کا ظاھری نظام اس قسم کا ھوتا ہے کہ ان کے الفاظ سے پیچیدہ مشتقات نہیں بنائے جاسکتے مثلاً مشرق بعید کی زبانیں ' یا بعض سوڈانی بولیاں '

* بانتو = جنوبی افریقہ کی زبانوں کا خاندانی نام- (و)

اُن میں ہمیں کئی کئی زبانوں کے غلط ملط کی سچی مثال نظرآتی ہے - بر خلاف اس کے لاطینی کی طرح کی کوئی زبان دوسری زبانوں میں خلط ملط نہیں ہو سکتی - لاطینی نظام کا استعمال یا تو پوری طرح ہوگا ' یا سرے ہی سے نہوگا - اگر لاطینی نظام کا استعمال کیا جاے گا ' تو چاہے کسی زبان کا ذخیرہ لفظی اس میں شریک کر دیا جاے ' زبان لاطینی ہی کہلاے گی - اگر یہ نظام استعمال نہ کیا جاے تو چاہے لفظی ذخیرہ سارا لاطینی ہی کا کیوں نہ ہو' پھر بھی زبان ہر گز لاطینی نہ کہلائے گی. ہاں اگر انامی * (Annamese) زبان کی طرح کی کوئی زبان ہو ' جس کے صرف و نحو کی ساری کائنات یہ ہے کہ نہ بدلنے والے الفاظ کو کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ جمع کردیا جاے ' تو اس کا کسی دوسری زبان کے ساتھ خلط ملط ہو جانا بے شک قرین قیاس ہو سکتا ہے - پس معلوم ہوا کہ بعض زبانیں ایسی ہوتی ہیں جن کی خاندان واری تقسیم اصلی ثبوت (یعنی نظام زبان کے متعلق مواد اور معلومات) کی کمی کی وجہ کے نا ممکن ہوتی ہے' بلکہ اس اصول کا انطباق تک نہیں ہو سکتا - ہم نے یہی مناسب خیال کیا کے اپنے ناظرین کا ذہن خاندان واری تقسیم کی اس کوتاہی کی طرف مبذول کرا دیں ' ورنہ اصلیت یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس مواد کافی ہو ' تو سب زبانیں ' بلا لحاظ اس امر کے کہ ان کے بولنے والے تہذیب و تمدن کے کن مدارج میں ہیں ' سمٹ کر چند ابتدائی مشترکہ زبانوں کے ذیل میں آجاتی ہیں' اور جتنی زیادہ ان کی تحقیق کی جاے' اتنی ہی زیادہ یہ بات نظر آتی ہے-

---

چونکہ خاندان واری تقسیم السنہ میں مختلف اقسام کے تاریخی واقعات کے اظہار کی کوشش کی جاتی ہے اس لئے اس میں یک جنسی اور یکسانیت نہیں پائی جاسکتی اور اسی وجہ سے " تعلق " السنہ " یا " السنہ متعلقہ " کا مفہوم ایک لسانی مجموعے

---

* انام کی زبان - انام ہندوستان کے مشرق میں ایک جزیرہ ہے ' - (و)

یا بولی میں کچھہ ہو تا ہے ' تو دوسرے انسانی مجموعے یا بولی میں کچھہ اور - زبانوں کی ایک جامع اور مانع تقسیم کر کے انہیں علحدہ علحدہ خاندانوں میں رکھنے کی کوشش کر نا خود اس امر کی دلیل ہے کہ ایسی کوشش کر نے والا شخص اب تک خاندان واری تقسیم السنہ کا اصول ہی نہیں سمجھا ہے —

علاوہ بریں اکثر صورتوں میں ' جو مواد ہمارے پاس موجود ہے وہ نا کافی ہے - چاہے افریقہ ' امریکہ یا آسٹریلیا کی بحث درپیش ہو ' ہمیں کثرت سے ایسی زبانیں نظر آئیں گی جن کے نظام کو بہت ناقص طریقے سے بیان کیا گیا ہے ' یا سرے سے بیان ہی نہیں کیا گیا ہے - پس ان زبانوں کی تقسیم اور درجہ بندی کا اگر کوئی ذریعہ ہمارے پاس باقی رہتا ہے تو وہ صرف ذخیرۂ الفاظ یا اصوات کی مشابہت ہے ' اور ظاہر ہے کہ ثبوت کی حیثیت سے یہ آخرالذ کر طریقہ اتنا مفید نہیں ہے جتنا کہ مخصوص نحوی اور صرفی جزئیات کی مشابہت ' جس کے ذریعہ سے ہم ہندی ' یورپی ' سامی ' فنی ' یوگری ' بانتو ' اور دیگر خاندان السنہ کی حقیقی اور اصلی تشخیص کرچکے ہیں - بعض اوقات طریقۂ اصوات کی یکسانی سے بھی زبانوں کا تعلق ظاہر ہو تا ہے - مثلاً ہندی۸یورپی خاندان میں وہ حروف حلقی (Laryngal Consonants) بہت کم پائے جاتے ہیں جو سامی زبانوں میں بہت عام ہیں - اس قسم کی مشابہت سے اگرچہ کوئی حقیقی ثبوت نہیں ملتا ' لیکن کچھہ نہ کچھہ اشارے ضرور ملتے ہیں - اور جب صوتی اشاروں کے ثبوت کی تائید مزید ذخیرۂ الفاظ خصوصاً ایسے الفاظ کی مشابہت سے ہو جو پرانے ہیں ' اور مستعار نہ لئے گئے ہوں ' تو اس صورت میں تعلق السنہ بہت ممکن اور قرین قیاس ہو تا ہے —

خاندان واری تقسیم السنہ میں جا بجا جو جگہیں چھوٹی ہوی نظر آتی ہیں ان کا سبب زیادہ تر بیان کا نقص اور تقابلی تحقیق کی کو تا ہی ہے -

اس تقسیم کی اصلی اہمیت اسی صورت میں ظاہر ہو سکتی ہے جب زیادہ گہری تحقیق کی جاے —

مکمل اور گہری تحقیق کے نہ ہونے کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زبانوں کے اکثر تعلقات جو آج محض قیاس کی بنا پر قائم کر لئے گئے ہیں، اب تک ثبوت طلب ہیں - علاوہ بریں بہت سی زبانوں کا جو بیان کیا گیا ہے وہ ناقص ہے - افریقہ، امریکہ، اور آسٹریلیا کی بہت سی زبانوں کے متعلق تو ہمارے پاس ذخیرۂ الفاظ کے سوا اور کچھ موادھی نہیں ہے - ان کی صرف ونحو سے اب تک کوئی واقف ھی نہیں ہے - اور اگر کہیں کہیں بیانات ذرا مکمل نظر آجاتے ہیں، تو وہاں مقابلے اور موازنے کا کام اب تک شروع نہیں ہوا ہے —

زبانوں کے جو بڑے بڑے خاندان اب تک قائم کئے جا چکے ہیں، ان کے تعلق کے متعلق بحث و تمحیص اس موجودہ کتاب کی حد نظر سے باہر ہے - ایسے واقعات فراہم کئے جا چکے ہیں جن سے سامی اور ہندی۸یورپی، فنی۸یوگری اور ہندی۸یورپی خاندانوں کا باہمی تعلق ثابت ہوتا ہے - ان دونوں صورتوں میں مشابہت اور موافقت اصلی معنوں میں نظامات السنہ میں نہیں بلکہ ذخیرۂ الفاظ میں پائی جاتی ہے . یہ نظریہ کہ ہندی۸یورپی زبانوں، قدیم ایشیائی زبانوں مثلاً لیشیا اور کےریا (Lycian and Carian) کی زبانیں، قات کی بولیوں، فنی یوگری، حامی۸سامی * (Hamito-Semitic) زبانوں وغیرہ میں دور کا

---

* حام (Ham) حضرت نوح کے فرزند تھے، حامی زبانوں سے زبانوں کا وہ مجموعہ مراد لیا جاتا ہے جو شمالی افریقہ میں پایا جاتا ہے مثلاً بربری، فلاحی زبانیں — (و)

رشتہ پایا جاتا ہے بعید از قیاس نہیں ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سب زبانیں ایک ہی عام زبان کی بدلی ہوئی شکلیں ہوں —

لیکن اس مفروضۂ عام زبان کی خصوصیات اس قدر مبہم طور پر ظاہر ہوتی ہیں کہ کوئی قطعی دعویٰ کرنا اور اس موقع پر اس کی بحث اٹھانا قبل از وقت ہے۔ اس کا ثبوت اس وجہ سے اور مشکل ہو جاتا ہے کہ بعض خاندانوں (مثلاً ہندی۸یورپی) کا پیچیدہ نظام نسبتً ایک جدید تر زمانے کی چیز ہے، اور سامی یا فنی۸یوگری خاندانوں میں اس کے اجزا کا موجود ہونا بہت بعید از قیاس ہے۔ یہ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ اگر دو زبانوں میں نحوی اور صرفی اشکال کا تسلسل نہ پایا جائے تو ان کے لئے "السنۂ متعلقہ" کی اصطلاح استعمال کرنا ایک بے معنی چیز ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ، ایک اور پر زور وجہ اس بات کی موجود ہے کہ انسانی زبان کے وحدت آغاز، اور خود ابتدائے زبان کے مسئلہ کو یونہی غیر فیصل چھوڑدیا جائے —

انسانوں کے مختلف مجموعوں میں، بدنی، عضویاتی اور نفسی حالات کچھ ایسے یکساں ہیں کہ ہمیں ہر جگہ انسانی ساخت کی وہی نمایاں خصوصیتیں موجود نظر آتی ہیں — سب انسان، بحیثیت مجموعی ایک سے صوتی طریقے کام میں لاتے ہیں، اور مختلف طریقوں سے لفظوں کے مجموعے بنا کر بات چیت کرتے ہیں۔ جزئیات میں البتہ فرق ہوتا ہے، لیکن لسانی طریقوں کی اساس کل جنس انسانی میں ایک ہی ہے۔ مگر یہ ثابت کرنا کسی قدر دشوار ہے کہ ایسی جزوی مشابہتیں جو خاص خاص واقعات کی بنا پر ہمیں ماضی کے خاص خاص نظامات کی طرف نہیں لے جاتی ہیں، زبانوں کا تعلق اور رشتہ ثابت کر سکتی ہیں یا نہیں۔ موجودہ کتاب میں ہم صرف اسی تعلق کو مستند سمجھیں گے جو تقابلی صرف ونحو کی بنا پر یا کم از کم عام صرفی اور نحوی خاکوں کی بنا پر قائم کیا گیا ہو، یا پھر اگر قطعی نحوی ثبوت فراہم نہ ہوسکے، تو طریقۂ اصوات کے مربوط اور نمایاں

مشابہت رکھنے والے مجموعوں سے ثابت ہوتاہو —

کم از کم اتنی بات تو اب بھی ثابت ہو سکتی ہے کہ اکثر زبانیں خاص خاص خاندانوں کی تھوڑی سی تعداد میں آجاتی ہیں - مثلاً تمام یورپ اور ایشیا کے کچھہ حصے کی تقریباً سب زبانیں ہندی۸یوروپی مجموعے میں آ جاتی ہیں - ہاٹن ٹاٹ * (Hottentot) کو چھوڑ کر' افریقہ کی اور سب زبانیں بانٹو خاندان کی رکن ہیں ؛ اسی طرح سے تمام حبشی اقوام کی زبانوں کے باہمی تعلق کا کچھہ نہ کچھہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے - اسی کو دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ تاریخی زمانے † میں ' یا تاریخی زمانے کے آس پاس ' عام اور مشترکہ زبانوں کی ایک مختصر سی تعداد بڑے بڑے حصوں میں رائج تھی - اس امر پر متعجب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے - زبانیں ترسیل خیال کی غرض سے بنتی ہیں ' اور جتنے زیادہ لوگ آپس میں ان کے ذریعے سے تبادلۂ خیال کر سکیں ' اتنی ہی زیادہ زبانیں مفید سمجھی جاتی ہیں اور جب تاریخی تغیرات اور نئی زبانوں کےاستعمال کی وجہ سے لسانی افتشار ‡ واقع ہوتا ہے تو لوگ برابر اس کی مخالفت کرتے رہتے ہیں —

علاوہ بریں یہ نہیں کہا جاسکتا کے جو زبانیں فی الحقیقت باقی ہیں ' یا جن کے متعلق تحریری شہادتیں موجود ہیں ' صرف وہی رائج تھیں ' اور ان کے علاوہ اور زبانیں موجود ہی نہ تھیں - بعض کم و بیش ضخیم کتابوں سے یا بعض

---

* Hottentot جنوبی مغربی افریقہ کی ایک دہقانی قوم'اور اس کی زبان- یہ نسل اب ناپید ہوتی جارہی ہے - (و)۔

† تاریخی زمانہ = وہ زمانہ جس کے متعلق تاریخی شہادتیں موجود ہوں ' تازہ ترین تحقیق نے تاریخی زمانہ ۶۰۰۰ سال قبل مسیح کو قرار دیا ہے ' اور سمیری قوم کے آثار دریافت کئے ہیں ' اس سے پہلے کا زمانہ " زمانۂ ماقبل تاریخ "کہلاتا ہے - (و)

‡ یعنی کسی رائج الوقت زبان کا میدان سے ہٹنا اور ترسیل و تبادلۂ خیال میں رکاوٹوں کا پیدا ہونا - (و)

دوسری شہادتوں سے اس امر کا پتہ ملتا ھے کہ بہت سی زبانیں جو پہلے بولی جاتی تھیں ' تاریخی زمانے میں مٹ گئیں - اطالیہ میں آسکن (Oscan) اور امبرین (Umbrian) * کی طرح جو دونوں لاطینی زبان سے تعلق رکھنے والی بولیاں تھیں اور بہت سی زبانیں جن کے کتبے آج تک موجود ھیں ' مٹ گئیں مثلاً اترسکن (Etruscan) + ' ونی‌شین (Venetian) ‡ ' میسے پی ین (Messapian) $ ' صقلی (Sicilian) § وغیرہ —

ایشیاے کوچک کی تمام قدیم زبانیں جو اپنی تصنیفات کی وجہ سے کم و بیش معروف ھیں مثلاً بابلی زبان ' حطیمی ¶ زبان (Hittite) کے ریا (Caria) ' لیڈیا (Lydia) ' لیشیا (Lycia) اور فریجیا (Phrygia) ‖ کی زبانیں سب کی سب فنا ھوگئیں اور کسی ایک نے بھی اپنی یاد گار نہ چھوڑی ' شامی زبان (Syriac) کی یاد گار کے طور پر البتہ کچھہ بولیاں باقی ھیں جو کہیں کہیں بولی جاتی ھیں جس طرح سے بعض نسلیں مٹ گئیں ' اسی طرح سے اکثر خاندان السنہ بھی فنا ھو گئے ' اور ان کے فنا ھونے کے ساتھہ ساتھہ وہ قدیم روایتیں بھی مٹ گئیں جن کی مدد سے ان مردہ زبانوں کی پسماندہ زبانوں کے باھمی تعلق کا کچھہ پتہ ملتا —

---

* یہ دونوں زبانیں پہلے اطالیہ میں بولی جاتی تھیں ' آسکن جنوبی اطالیہ میں اور امبرین وسط اطالیہ میں رائج تھی ' یہ دونوں لاطینی الاصل ھیں - (و)

+ Etruria کی زبان (و)

‡ وینس (بندقیہ) کی زبان - (و)

$ Messapia کی زبانیں (و)

§ جزیرہ صقلیہ کی زبان- یہ سب زبانیں سلطنت روم کے مختلف حصوں میں رائج تھیں -

¶ حطیمی (عبرانی لفظ ھے) - ایک طاقتور قوم تھی جو شمالی شام میں آباد تھی ' یہ غالباً سامی الاصل نہ تھی - اس قوم کی زبان حطیمی کہلاتی ھے - (و)

‖ یہ سب کے سب ایشیاے کوچک کے حصے تھے - (و)

زبانوں کے شجرے کا آج ہمیں پتہ نہیں چلتا ممکن ہے کہ وہ کسی ایسے قدیم مجموعے کی باقیات ہوں جس کے دوسرے اجزا اور نمائندے آج موجود نہیں ہیں ، اور جس کے متعلق سوائے ایک زبان کے جو اتفاقاً باقی رہ گئی ہے اور کوئی یادگار بھی باقی نہیں ہے - یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ زمانۂ ما قبل تاریخ کو دیکھتے ہوے زمانۂ تاریخی بہت ہی تھوڑا ہے - خاندان واری تقسیم السنہ میں زبانوں کے ان مجموعوں کو جو گزشتہ چند ہزار سال کے تاریخی تغیرات کا نتیجہ ہیں ، از سر نو ترتیب دیا جاتا ہے —

اس قسم کی ترتیب اور تقسیم سے ہمیں اس بات کا خفیف سا خفیف اندازہ بھی تو نہیں ہوتا کہ زمانۂ تاریخی سے پہلے جو ہزاروں سال گزرے ہیں : یعنی اس قدیم زمانے میں جب انسان نے پہلے پہل زبان کو حیات اجتماعی اور صنعتی اور ذہنی ارتقاء کا وسیلہ بنایا تھا ، کیا واقعات پیش آے تھے ۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ ہم تمام مشتر کہ زبانوں کی درجہ بندی نہیں کرسکتے ؛ اور ہماری تحقیق اگر کہیں تھوڑی بہت کام آئی ہے تو صرف مختلف مجموعوں کی تقابلی صرف و نحو کے مطالعہ میں اور اس صنف میں بھی ہم بجز سامی ، فنی ۸ یوگری ہندی ۸ ایشیای اور بانتو خاندانوں کے اور کسی کے متعلق کچھہ نہیں کرسکے ہیں ـ تو ان سب باتوں سے یہ لازم آتا ہے کہ انسانی زبانوں کی وحدت یا کم از کم ان زبانوں کے جو آج معروف ہیں ، آغاز اور ابتدا کے مسئلہ کو اٹھانا کچھہ زیادہ سود مند نہیں ہوسکتا —

لسانیات کی اصطلاحیں بھی اکثر واضح اور مستقل نہیں ہیں ، اور مناسب یہ ہے کہ پہلے حسب ذیل اصطلاحات کی تعریف کردی جاے - زبان ، مقامی بولی ، یا محاورہ یا گفتگو ، خاص زبان ، بازاری بولی (Slang) —

مذکورۂ بالا اصطلاحات میں ، معنوں کے اعتبار سے عام تر اصطلاح " زبان " کی ہے - اس اصطلاح کے مفہوم میں وہ تمام لسانی ذرایع اور وسائل داخل ہیں جو

انسانوں کا ایک خاص گروہ استعمال کرتا ہے' اب چاہے اس گروہ کی کثرت یا تمدن اور معاشرت کے اعتبار سے اس کی اہمیت کچھ ہی کیوں نہ ہو - اب ایسے مجمعوں کی تعداد جن کے افراد بغیر سیکھے ہوے دوسرے مجمع کی زبان نہ سمجھ سکیں جتنی ہوگی اتنی ہی زبانیں بھی ہوں گی - افہام کی یہ حد اکثر صورتوں میں قطعی بھی ہوا کرتی ہے - چینی ' عربی ' یا انگریزی بولنے والا شخص ایسے شخص کے لئے جو صرف فرانسیسی جانتا ہو ناقابل فہم ہے ' لیکن برخلاف اس کے پکارتی (Picardy) * کے کسی دیہات کی طرز گفتگو پیرس کے رہنے والوں کے لئے پوری نہیں تو کم از کم آدھی قابل فہم ضرور ہے- ظاہر ہے کہ " پوری طرح قابل فہم " اور " قطعی ناقابل فہم " ان دونوں حدوں کے درمیان بے شمار مدارج ہوسکتے ہیں - اگر ایک ایسا گروہ ہو جو دور دور تک پھیلا ہوا ہو (مثلاً مقامی فرانسیسی بولیاں استعمال کرنے والا گروہ) تو اس صورت میں قرب و جوار کے باشندے ایک دوسرے کی گفتگو کو اگر بالکل نہیں تو کم و بیش ضرور سمجھ لیتے ہیں ' لیکن دور دراز کے علاقوں کے باشندے ایک دوسرے کی بولی بالکل نہیں سمجھتے - جو شخص نارمن † زبان بولتا ہو وہ ‡ Franc Comtois یا $ Walloon زبان ہرگز نہیں سمجھ سکتا —

محاورہ یا گفتگو سے وہ لسانی ذرایع مراد ہوتے ہیں جو کسی ایسے مقامی گروہ میں مستعمل ہوں جو خود کسی بڑے اور وسیع گروہ کا جز ہو - اس کی مثال وہ فرانسیسی محاورے اور بولیاں ہیں جو شمالی فرانس' جنوبی فرانس' پراولساں (Provencal)' گیس کن (Gascon) وغیرہ میں بولی جاتی ہیں جیسے

---

* فرانس کا ایک صوبہ ہے— (و)

† فرانس کے صوبہ Normandy کی زبان — (و)

‡ ایک قدیم فرانسیسی صوبے Franche Compte کی زبان — (و)

$ بلجیم کے وہ باشندے جو فرانسیسی الاصل ہیں* نیز اُن کی زبان — (و)

اٹلی کے مختلف حصوں میں استعمال ہونے والی اطالی زبان —

زبان اور مقامی محاورہ - ان دونوں اصطلاحوں میں یہ فرق ہے کہ زبان کے معنوں میں ایسے مستقل اسانی طریقے داخل ہوتے ہیں جو تمام تر ہمارے علم میں ہوں - مقامی محاورے میں یہ نہیں ہوتا - مثلاً فرانس کی مقامی بولیوں میں سے ہر بولی ایک مقامی طرز ادا رکھتی ہے ' اور یہ طرز ادا مختلف افراد میں مختلف ہوتا ہے - یہ مقامی بولیاں ایک اوسط یا درمیانی حد کے اِدھر اُدھر ڈھلکتی رہتی ہیں - کچھ نہ کچھ قواعد کی پیروی تو ان میں بھی کی جاتی ہے' لیکن یہ قواعد منضبط نہیں ہوتے - بر خلاف اس کے فرانسیسی زبان ایک عام یا مشترکہ زبان ہے ' جس کے قواعد منضبط ہوچکے ہیں ' اور جو اپنی مخصوص ادبی روایات بھی رکھتی ہے - اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اصطلاح " زبان " کتنے مختلف مفاهیم پر حاوی ہے —

جب کوئی زبان چل نکلتی ہے تو مشق اور تکرار کی بدولت اس میں بولنے والوں کی معاشرتی حیثیت ' پیشے وغیرہ کے اعتبار سے بھی اختلافات پیدا ہوجاتے ہیں (مثلاً بول چال کی زبان' تحریری زبان وغیرہ) —

اس امر پر عام طور سے سب متفق ہیں کہ اگر ایک لسانی گروہ بہت وسیع ہو ' تو اس کی خاص خاص بولیوں میں کچھ نہ کچھ عام خصوصیتیں ضرور پائی جاتی ہیں ' اور جو لوگ اس حلقے کے چند علاقوں کی زبان بولتے ہیں ' وہ خود کو اسی ایک ذیلی گروہ میں داخل سمجھتے ہیں - ایسی صورت میں یہ کیا جاتا ہے کہ یہ مختلف مقامی بولیاں ایک ہی مجموعے کے اجزا ہیں - مثلاً مختلف فرانسیسی بولیوں کو جیسے Norman ؛ Champenois ‘ Lorranie ؛ Picard ؛ Walloon ؛ Bowigignon ؛ Comptois ؛ France ؛ وغیرہ ایک ہی حلقہ میں داخل کیا جاتا ہے۔

لیکن یہ درجہ بندی مبہم ہے' اس لئے کے عام طور پر ہم کسی مقامی بولی کی حد متعین

نہیں کرسکتے اس لئے کہ مقامی بولیوں کی ہر خصوصیت اپنی اپنی جگہ پر نرالی ہوتی ہے۔ مقامی بولی کی پہچان یہ ہے کہ اس کی بعض بعض خصوصیتیں اگرچہ ایک دوسرے سے مشابہت تام نہیں رکھتیں ، لیکن کچھ کچھ ملتی جلتی ہیں - دوسری پہچان یہ ہے کہ خود اس مقامی بولی میں جو مختلف اب و لہجے داخل ہیں ان سب میں کچھ نہ کچھ مشترک خصوصیتیں ضرور ہوتی ہیں —

کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی زبان ، یا ایک ہی بولی بولنے والے لوگوں میں مقامی اختلافات کے علاوہ ایسے افراد کے مجموعے بھی موجود ہوتے ہیں جو الگ خصوصیتیں رکھتے ہیں ، مثلاً ایک پیشے کے افراد، یا ایک درجہ کے افراد - ان کی زبان کو ہم نے "مخصوص یا خاص زبان" کہا ہے - اس قسم کی " خاص زبانیں " ویسے عام طور پر اپنی ساخت یا تلفظ کے اعتبار سے معمولی زبان سے الگ نہیں ہوتیں ، اور اگر ان کی کچھ علحدہ خصوصیتیں ہوتی بھی ہیں تو تمام تر ان کے ذخیرۂ لفظی میں ۔

زبانوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے لفظی ذخائر کو جن میں اصل یا مشترک زبان کے لفظی ذخائر بھی مسخ ہو کر شامل ہوتے ہیں ، بازاری بولی (Slang) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے - یہ اصطلاح عام طور پر جرائم پیشہ لوگوں یا مشتبہ افراد کی زبان کے لئے استعمال کی جاتی ہے ، لیکن کبھی کبھی اس کے مفہوم کو وسیع بھی کردیا جاتا ہے ، مثلاً فوجی بارکوں ، اور مدرسوں کی مخصوص بولیوں کو بھی بازاری کہہ دیا جاتا ہے - جب کسی پیشے یا خاص خاص گروہوں کے افراد اپنی اپنی الگ اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں تو انہیں بھی ' خاص زبان ' کہا جاتا ہے ، جیسے خاص خاص پیشوں یا کھیلوں کی اصطلاحیں - اسی طرح سے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زبانوں کو معمولی صحت کے ساتھ نہیں بولتے بلکہ ناقص طور پر استعمال کرتے ہیں - ان کی وجہ سے زبانوں کی جو مسخ شدہ اشکال پیدا ہو جاتی ہیں ، ان کا احاطہ بھی ہمیں کرنا چاہئیے - مثلاً نو آبادیات کے حبشی غلام اپنے آقاؤں کی ہسپانوی یا فرانسیسی زبان کو کبھی صحیح طریقے سے ادا کرنے کی کوشش نہیں

کرتے - جزائر مغربی کی زبانیں صرف برائے نام فرانسیسی یا ہسپانوی ہیں - انہیں ایسی ہسپانوی یا فرانسیسی زبان کہنا چاہئے جو صرف و نحو سے بے نیاز ہوگئی ہے ' جس کا تلفظ کمزور ہو گیا ہے اور جس کا ذخیرۂ لفظی گھٹ کر بہت تھوڑا رہ گیا ہے - مشرق اقصیٰ کے مختلف بولیاں بولنے والے لوگ جب یورپی لوگوں کے ساتھ تعلقات رکھتے ہیں تو ایک طرح کی مسخ شدہ انگریزی بولتے ہیں جسے 'پی جن' (Pidgin) انگریزی کہا جاتا ہے - سواحل بحر قلزم پر بھی اسی قسم کی مختصر اور مسخ شدہ زبانیں بولی جاتی ہیں ' جنھیں سابر (Sabir) کہتے ہیں --

اس قسم کی زبانوں میں صرف و نحو کا حصہ کم سے کم ہوتا ہے' اور ان میں ہر قسم کا خلط ملط پایا جاتا ہے - ایسی زبانوں کو ' اگر وہ رواج اور استعمال میں آکر متعین ہوچکی ہوں تو خاندان واری تقسیم السنہ میں ایک علحدہ حیثیت دینی چاہئے - اس تقسیم کی بنیاد تاریخی مواد پر رکھی جائے اور مختلف صورت حالات کے اعتبار سے اس کے بیانات بھی مختلف ہونے چاہئیں -

اس موقع پر مصنوعی زبانوں جیسے ولا پک (Volapuck) * اسپرانٹو (Esperanto) ' ایدو (Ido) وغیرہ کی بحث نامکن ہے - ان زبانوں میں سے کوی بھی اب تک نہیں چلی ہے ' اور اگر کہیں انھیں کچھ کامیابی ہوی بھی ہے تو صرف وہاں جہاں کہ یہ ایسی زبانوں کے بولنے والوں کے درمیان وسیلہ بنی ہیں ' جن میں یہ ایک درمیانی واسطہ کی حیثیت رکھتی ہیں - ان تینوں میں سے صرف اسپرانٹو اور ایدو ہی کسی قدر ترقی یافتہ ہیں ' اور ان کا ذخیرۂ لفظی ایسا رکھا گیا ہے جو یورپ کی بڑی بڑی زبانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد میں مشترکہ طور پر پایا جاتا ہے - اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا سرمایۂ لفظی در اصل تمام تر

---

* یہ زبانیں "جگت بھاشا ئیں" (Universal languages) کہلاتی ہیں ' ان کے متعلق ملاحظہ ہو مترجم کا مضمون " جگت بھاشا" جو رسالۂ اُردو کی کسی گذشتہ اشاعت میں شایع ہوا تھا - (و)

لاطینی الاصل ھے ' اور یہ مصنوعی زبانیں ' رومانی زبانوں کے بہت لگ بھگ ھیں غرض کہ ھرجگہ سے ھرپھر کر ھم اسی خاندان واری تقسیم السنہ ھی کی طرف آجاتے ھیں۔

آئندہ صفحوں میں جو بیانات ملیں گئے ان سے ثابت ھوجاے گا کہ اس قسم کی تقسیم اب تک ناقص اور غیر مکمل ھے ' نیز اس کی وجہ بھی معلوم ھو جاے گی کہ یہ ھمیشہ ایسی ناقص کیوں رھے گی - زبانوں کی کوی اچھی ' خاندان واری تقسیم کرنے کے لئے ' سب سے پہلی ضروری چیز یہ ھے کہ ھم ھر علاقے کی لسانی تاریخ سے واقف ھوں اور ان تمام اثرات پر ھماری نظر ھو جو کسی زبان کے رائج ھونے کے وقت سے لے کر اب تک اپنا اپنا کام کرتے رھے ھیں - اس واقفیت کے باوجود ' اب تک لسانی تاریخ کے بعض جدید ترین واقعات کے متعلق ھماری معلومات بہت مبہم اور سرسری ھے ۔ مثلاً فرانس ھی کو لیجیے ' ھم سب جانتے ھیں کہ گالش (Gaulish) زبان کلت (Kelt) قوم کی فتوحات کی وجہ سے پھیلی ' اور ایک ھزار سال قبل مسیح سے اس کا رواج ھے- اسی طرح سے ' ھم یہ بھی جانتے ھیں کہ اس ملک (فرانس) میں لاطینی زبان کا رواج سن مسیحی کے ابتدائی سالوں سے شروع ھوا ' لیکن یہ ھم بالکل نہیں جانتے کہ گالش نے کن کن زبانوں کو بے دخل کیا اور رومن فتوحات کے وقت اس کے علاوہ اور کون کون سی زبانیں بولی جاتی تھیں - ان زبانوں کے بارے میں جو گال قوم کی فتوحات سے پہلے رائج تھیں ھمیں مطلق کسی قسم کا علم ھی نہیں ھے ' اور اس بات کا ثبوت کہ گال (Gaul) میں گالش زبان سے پہلے بھی کچھہ زبانیں رائج تھیں صرف اسی قدر ھے کہ گال میں بعض بعض مقامات کے نام ایسے ھیں جن کی تعبیر کلتی (Keltic) زبان سے نہیں کی جاتی ' اور دراصل وہ کلتک ھیں بھی نہیں --

۔ ھندی یوروپی السنہ کی جو تقابلی صرف و نحو تیار ھوی ھے ' وہ فی الحقیقت ایک نمونہ ھے اس بات کا کہ لسانیات کے تاریخی مواد کس ترتیب کے ساتھہ منظم کرنے چاھئیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں بعض نمایاں خامیاں ضرور ھیں ' اور لسانی تاریخ میں

جابجا ایسی جگہیں اب تک چھوٹی ہوئی ہیں ' جنہیں پر کرنا پڑے گا ' لیکن ان خرابیوں کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ ھندی یورپی السنہ کے متعلق جو تحقیقی اور قابل قدر کام اب تک ہوچکا ہے ' وہ کہیں اور ابھی ممکن نہیں ہے ۔ اور (اسانی تاریخ میں) تقریباً ہر طرف ابھی بہت کچھ کام باقی ہے ۔ چنانچہ ہماری اس موجودہ کتاب کو بھی نتائج کے خلاصے کی بجائے تحقیق کا ایک طرح کا نقطۂ العمل سمجھنا چاہئیے ۔ جو کام ابھی باقی ہے وہ بہت بڑا اور عظیم الشان ہے' اور اس کا سرانجام پانا صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ ماہرین لسانیات کے لئے معتد بہ وسائل اور ذرائع مہیا کئے جائیں ۔۔

ادب

مذہب و اخلاق

تعلیم

تاریخ و معاشیات

متفرقات

جدید رسالے

ادب

مضامین چک بست

(پنڈت برج نراین چک بست لکھنؤی کے مضامین کا مجموعہ -
انڈین پریس الہ آباد - صفحات ۳۴۳ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے)

اس سے قبل مرحوم کی نظموں کا مجموعہ شائع ہوچکا ہے' اب یہ مجموعۂ مضامین اُسی مطبع نے صفائی اور خوش اسلوبی کے ساتھ شایع کیا ہے انڈین پریس الہ آباد کی یہ ادبی خدمت قابل شکر گزاری ہے کہ اس نے یہ پاکیزہ اور قابل قدر مضامین تلف ہونے سے بچائے ورنہ ان کا تلف ہونا اردو زبان کا صریح نقصان تھا -

پنڈت برج نرائن چک بست صرف اہل زبان ہی نہ تھے بلکہ انہوں نے زبان کا غور سے مطالعہ کیا تھا - اُردو زبان اور شاعری کے دلدادہ تھے' خود بہت اچھا کہتے اور اچھے کہنے والوں کی قدر کرتے تھے - اردو میں آتش' میر انیس اور غالب کے بیحد مداح تھے - ان کے دل میں اپنے وطن کا درد بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ان مضامین میں بعض مقامات پر اپنے زمانے کے نوجوانوں کی حالت پر افسوس کرتے ہیں کہ وہ فیشن کے دلدادہ ہیں اور سنجیدہ مضامین پر غور نہیں کرتے - مگر اُن کا اصل ذوق ادبی ہے - اس مجموعے میں سوائے تین مضمونوں کے جو دادا بھائی نوروجی' تاریخ اور ذات کی تفریق پر ہیں' باقی تمام مضامین اہل قلم اور اہل سخن پر ہیں - ایک اچھا کام یہ کیا ہے کہ بعض کشمیری شعرا اور مصنفین پر بھی تنقیدی اور تحسینی مضمون لکھے ہیں - اس سے اُن کی قوم پرستی ہی نہیں ظاہر ہوتی بلکہ یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ

کشمیری حضرات نے اردو زبان کی نظم و نثر میں بھی وہی کام کیا ہے جو فارسی میں کیا تھا اور اس سے اُردو زبان کی ہر دل عزیزی ثابت ہوتی ہے ۔ یہ مضامین پنڈت دیا شنکر کول ' نسیم ' پنڈت تربھون ناتھہ سپرو ' ہجر ' پنڈت رتن ناتھہ در ' سرشار ' لچھمی رام سرور ' پنڈت بشن نراین در ' پنڈت پران ناتھہ سرسوتی پر ہیں - ان میں سے بعض اصحاب اُردو کے نامور اہل قلم گزرے ہیں - جن کا کلام ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاے گا - ان کے علاوہ باقی مضامین داغ ' گلزار نسیم ' اودھ پنچ ' منشی سید محمد سجاد حسین ' مرزا مچھو بیگ ستم ظریف ' نواب سید محمد آزاد ' منشی جوالا پرشاد برق ' بھارت درپن (تصنیف پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی) اُردو شاعری پر ہیں ' یہ سارا مجموعہ بہت ہی اچھا اور پڑھنے کے لائق ہے —

چک بست مرحوم کو زبان پر بڑی قدرت ہے ' اپنے مطالب بہت صفائی اور بعض اوقات رنگینی سے بہت اچھی زبان میں بیان کرتے ہیں - طرز بیان دلکش ہے ' اُردو کے شعرا کا بہت اثر معلوم ہوتا ہے - تنقید نگاری کا بہت اچھا سلیقہ ہے اور اس مجموعے میں زیادہ تر تنقیدی مضامین ہیں - لیکن چک بست کا زمانہ اودھ پنچ کے زور شور کا زمانہ تھا اور اس کا اثر اُن پر آخر دم تک رہا اور یہی وجہ ہے کہ وہ تنقید میں اس سے آگے نہ بڑھ سکے - چنانچہ پنڈت تربھون ناتھہ سپرو ' ہجر ' کے حال میں انھوں نے اُن کے مسدس " کچا چٹھا " کا ذکر کیا ہے اور اس کے شکوہ الفاظ ' ترکیب کی چستی ' گرمیء تاثیر وغیرہ کی بے انتہا تعریف کی ہے اور اسی ضمن میں فرماتے ہیں :—

" مولانا حالی کا مسدس بھی اسی رنگ میں ہے ' مگر چونکہ مولانا ممدوح کے دل میں شاعری کی آگ نہیں روشن ہے ' لہذا ان کے مسدس میں اس جوش و خروش کا اظہار نہیں جو کچے چٹھے کا خاص جوہر ہے " —

ایک تو اس سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ مولانا حالی نے ' ہجر ' کی تقلید میں اپنا مسدس لکھا تھا حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ' ہجر ' نے اپنا مسدس مولانا حالی کے مسدس کے اتباع اور تقلید میں لکھا - دوسرے جب ہم ان بندوں کو پڑھتے ہیں جو اس تعریف کی تائید میں پیش کئے گئے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ حضرت چک بست نے یہ کیسے لکھہ دیا اور اُس وقت وہ کس عالم میں تھے - لیکن یہ کچھہ تعجب کی بات نہیں ہے ' اچھے اچھے صاحب بصیرت مقامی اور وقتی حالات سے ایسے متاثر ہوجاتے ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے گویا آنکھوں پر پردہ پڑگیا ہے —

———

لسان و مطالعۂ لسان

(مترجمۂ جناب حمیداللہ خاں صاحب یوسف زئی '
پروفیسر فارسی' گورنمنٹ کالج اجمیر - صفحات ۳۳۹
قیمت چار روپے آٹھ آنے)

لسانیات پر اُردو میں کوئی کتاب نہیں - انگریزی زبان میں بھی جو کتابیں ہیں وہ بھی کسی قدر پرانی ہیں - اس علم کے حاصل کرنے کے لئے جرمن زبان کا جاننا ضروری ہے - پروفیسر حمیداللہ خاں صاحب کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے پروفیسر 'وھٹنی' کی کتاب کا ترجمہ اُردو زبان میں کردیا - یہ اُس کتاب کا صرف پہلا حصہ ہے - ترجمہ بہت صاف ہے اور بلا تکلف سمجھ میں آتا ہے' البتہ بعض بعض جگہ جملوں کی ساخت انگریزی ہوگئی ہے اور سمجھنے میں الجھن پیدا ہوتی ہے' لیکن ایسے مقامات بہت کم ہیں اور اس میں بہت کچھ مجبوری بھی ہے - اصطلاحات بھی وہی ہیں جو انجمن ترقی اُردو نے وضع کی ہیں یا اُن اصول پر وضع کی گئی ہیں جو انجمن نے قائم کئے ہیں —

پڑھنے والوں کی نظر میں ایک بات ضرور کھٹکے گی کہ کتاب میں ہر جگہ مثالیں انگریزی زبان کی ہیں جو لامحالہ انگریزی حروف میں لکھنی پڑی ہیں- اس لئے اردو داں اصحاب اس سے مستفید نہیں ہوسکتے - فاضل مترجم کو بھی اس بات کا خیال تھا اور انہوں نے بطور دفع دخل مقدر اس کا جواب اِن الفاظ میں دیا ہے :—

" اس ترجمے پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جو مثالیں دی گئی ہیں اور اُن سے جو اصول اخذ کئے گئے ہیں اُن کو اردو سے کوئی تعلق نہیں - یہ اعتراض تمام و کمال صحیح نہیں - مثالیں بے شک انگریزی سے لی گئی ہیں' لیکن جو نتیجے نکالے گئے ہیں وہ ہمہ گیر و جامع ہیں......... یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب اصول ہمہ گیر ہیں تو پھر مثالیں ہی کیوں نہ بدل دی گئیں کہ اس وقت جو غرابت و تنافر پایا جاتا ہے دور ہوجاتا ' مگر ترجمے کی نسبت میرا اصول جداگانہ ہے - میں اس کو خلاف دیانت سمجھتا ہوں کہ ترجمے میں دخل دے کر اصل کی صورت مسخ کردی جائے" —

ہمارے خیال میں یہ جواب بھی تمام و کمال صحیح نہیں- مثالیں اُصول کی جان ہیں ' کیونکہ مثالوں ہی سے اصول اخذ کئے گئے ہیں اور پڑھنے والا جب تک مثالیں

نہ سمجھنے کا اُصول کے سمجھنے میں اُسے ضرور دقت ہوگی۔ اور یہ خلاف دیانت نہیں بلکہ عین دیانت داری ہے کہ اس سے مصنف کا منشا زیادہ واضح اور صاف ہوجاتا ہے اور ترجمہ مسخ نہیں ہوتا بلکہ اس کی خوبی اور افادے میں اضافہ ہوتا ہے۔ بہر حال کام بہت اچھا ہے اور لائق قدر ہے اور امید ہے کہ جن لوگوں کو زبان کی تحقیق کا شوق ہے وہ اس کے مطالعے سے ضرور حظ اُٹھائیں گے —

کتاب مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ میں ٹائپ (لوہے کے حروف) میں چھپی ہے۔

طرۂ امیر

(مؤلفۂ جناب مولوی امیر احمد صاحب علوی، بی۔ اے، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ و جج نیمچ چھاؤنی۔ صفحات ۱۸۴ — قیمت ایک روپیہ)

مولوی امیر احمد صاحب علوی کی یہ نئی تالیف ہے۔ اس میں منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی کا منتخب کلام اور اُن کی شاعری پر تبصرہ ہے اور شروع میں مختصر سی سوانح عمری ہے۔ اگرچہ منشی صاحب مرحوم خاندان صوفیا سے تعلق رکھتے تھے اور درویش صفت آدمی تھے، لیکن اودھ کی شاہی کے آخری زمانے میں شاعری کا خاص رنگ ایسا چھایا ہوا تھا کہ وہ اس سے بچ نہ سکے۔ قابل مؤلف نے اس کتاب میں اُن حضرات کے اعتراض کی تردید کرنےکی کوشش کی ہے جو لکھنؤ کی شاعری کو مبتذل کہتے ہیں نیز بڑے شدو مد سے اس خیال کی بھی تردید کی ہے کہ منشی صاحب نے آخر میں اپنی قدیم روش کو چھوڑ کر داغ کا رنگ اختیار کرنا چاہا۔ اس ضمن میں داغ اور امیر کی شاعری کا پرانا قضیہ نکل آیا ہے اور دونوں کی ہم قافیہ و ردیف غزلیں اور ہم مضمون اشعار پیش کر کے تنقید کی ہے۔ منشی صاحب کے کلام پر جو بھرتی کے اشعار کا اعتراض تھا اُس کے جواب کی لپیٹ میں دوسرے نامور شاعر بھی آگئے ہیں۔ اگرچہ یہ مباحثہ اور مقابلہ بہت دلچسپ ہے لیکن اِن تردیدوں سے کسی ایک شاعر کی فضیلت دوسرے پر ثابت نہیں ہوسکتی۔ اصل معیار ہر شاعر کا منتخب کلام ہے اور فاضل مولف نے یہ بڑا اچھا کام کیا ہے کہ آخر میں منشی صاحب کا منتخب کلام درج کردیا ہے جو تقریباً کتاب کا نصف حصہ ہے، اس کے علاوہ یوں بھی کتاب کے ضمن میں بہت سا کلام آگیا ہے۔ اس کے مطالعے سے حضرت امیر کی شاعری کا بہت صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ مولف کتاب کی رائے آپ کی شاعری کے متعلق یہ معلوم ہوتی ہے:—

" منشی صاحب کے قصائد کی بابت صرف اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ خاقانی ہند حضرت ذوق دہلوی کے قصیدوں کے بعد اِنھیں کا درجہ ہے۔ غزلیات میں تصوف کی چاشنی تیز ہے۔ صفائی بندش کی حلاوت سے کوئی شعر خالی نہیں۔ نازک تشبیہات اور استعارات سے دیوان لبریز ہے۔ زلف و کاکل، خط و خال کی طرف اپنے ہم عصروں کی طرح کافی توجہ ہے، لیکن جذبات اور واردات سے بیگانگی نہیں۔ متانت و تہذیب کے ساتھ معاملہ بندی ہے۔ رندی وسیہ مستی کے افسانے ہیں، لیکن حد اعتدال سے تجاوز نہیں۔ صحت زبان سارے دیوان کا طرۂ امتیاز ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں اشہب قلم کو جولاں کیا ہے اور قادرالکلامی کا معجزہ دکھایا ہے " —

گو یہ رائے دیوان مراۃالغیب کے متعلق ہے۔ مگر اُن کی تمام شاعری کے متعلق سمجھنی چاہئے۔ اس میں مبالغہ ضرور ہے، لیکن امیر کے مداح اس سے کم پر کبھی راضی نہ ہوں گے —

غالب

(یعنی مرزا غالب کی زندگی اور کلام کی تنقید۔ تالیف جناب ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ بزبان انگریزی۔ صفحات ۹۹، قیمت ۳ روپے)

کسی شاعر نے جل کے کہا تھا کہ " شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد " - آج اگر مرزا غالب زندہ ہوتے تو اس کتاب کو دیکھ کر ضرور کہہ اٹھتے کہ " شعر مرا بہ ڈاکٹر کہ برد " تنقید کیا ہے، اچھا خاصا پرسہ ماتم ہے — جن لوگوں نے مرزا صاحب کی شاعری کی داد دی ہے اُن سے سخت بیزار ہیں اور یہ گویا اُن کا جواب اور مرزا کی شاعری کا صحیح موازنہ ہے —

کتاب کے سات باب ہیں۔ جن میں سے کئی باب اس سے قبل کئی اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوچکے ہیں —

پہلا باب جو نو صفحے کا ہے بطور مقدمے کے ہے۔ اس کے شروع ہی میں فرماتے ہیں کہ غالب کے اُردو کلام کی ساری کائنات کچھ اوپر اٹھارہ سو مصرعے ہیں، جو بہت ہی قلیل ہے اور دوسرے نامور شعرا کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ تاہم موجودہ نسل نے اُسے وہ درجہ عطا کیا ہے جو کسی دوسرے شاعر کو نہیں دیا " - ہے تو بڑی

ناانصافی! اس کے بعد انہوں نے بجنوری اور حالی کی خبر لی ہے - بجنوری کی تحریر کو وہ یاوہ گوئی سے زیادہ نہیں سمجھتے - رہے مولانا حالی' ان کی نسبت ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال ہے کہ وہ سوانح عمری لکھنا نہیں جانتے' ترتیب غلط' نتائج غلط' اور پھر وہ اردو شعراء میں غالب کا درجہ قائم نہیں کرسکے اور نہ غالب کی حقیقت کو پہنچے- اس تمام بحث کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس کام میں بہت مشکلات ہیں لہذا متعدد اہل علم مل کر اسے انجام دیں تو غالب کی زندگی اور کلام کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے —

دوسرے باب میں اس کام کے لئے سامان فراہم کرنے سے بحث کی ہے- مثلاً دیوان کے مختلف اڈیشن' اردوے معلی اور دیگر خطوط جو انہوں نے اپنے احباب کو لکھے اوروہ خطوط جو ان لوگوں نے غالب کے نام لکھے (وہ کیا ہوے ؟) سب وشتم کے وہ خط جو خاص کر قاطع برہان کی طبع کے بعد وصول ہوے' کہاں گئے - دہلی اور لکھنؤ اُس وقت ادب کے مرکز تھے' انہوں نے اپنی تصانیف میں غالب کا کہاں کہاں ذکر کیا ' آپس کی تحریروں میں انہوں نے مرزا صاحب کے متعلق کیا کیا لکھا - غالب کے سفر کلکتہ اور وہاں کے ناگوار واقعے کے متعلق اس وقت کی تحریریں فراہم کی جائیں - غالب کی وفات پر اخبارات وغیرہ نے جو جو لکھا وہ جمع کیا جاے - اس کے علاوہ اُس زمانے کے لوگوں یا اہل ذوق کی ادبی تاریخ اور ادبی تنقید کے اصول سے واقف ہونا بھی ضروری ہے - غرض غالب پر لکھنے کے لئے اس قسم کا تمام سامان مہیا ہونا چاہئے- نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی—

تیسرے باب میں یہ بحث ہے کہ یہ تمام سامان جس کا ذکر دوسرے باب میں ہے سنہ وار جمع کیا جاے اور دیوان کی بھی یہی ترتیب ہونی چاہئے - اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مرزا صاحب کا دیوان اسی اصول پر مرتب کیا ہے جو زیر طبع ہے - انہوں نے اس کے چار دور قائم کئے ہیں - پہلے دور کا کلام بھوپال کے نسخے تک (۱۸۲۱ع) ہے ؛ دوسرے دور کا کلام وہ ہے جو اس نسخے کے حاشیے پر درج ہے (۱۸۲۲ - ۱۸۳۲)؛ تیسرے دور کا کلام جو رام پور کے نسخے میں ہے (۱۸۳۳-۱۸۵۵)؛ چوتھا دور سنہ ۱۸۵۶ - ۱۸۶۱ - یہی تقسیم اُن کے رقعات کی بتائی گئی ہے اور ایک نقشہ دیا ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس کس کو کتنے خط لکھے گئے اور جن کا سنہ معلوم ہوسکا ہے ان کے سنہ کا بھی اشارہ کردیا گیا ہے —

چوتھے باب میں غالب کی سوانح عمری کے متعلق جو مسائل پیدا ہوتے ہیں اُن پر بحث کی ہے - اس میں کوئی نئی بات نہیں- وہی باتیں ہیں جو پہلے آچکی ہیں - چونکہ غالب کی شاعری پر بحث کرنے کے لئے اس بات کا جاننا ضروری ہے کہ شاعری کیا چیز ہے - اس لئے آپ نے انگریز مصنفین اور شعرا کی تعریفات شعر بھی

جمع کردی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ شعر کسے کہتے ہیں اور اسی پر باب ختم کر دیا ہے ــــ

پانچویں باب میں غالب کی بعض خصوصیات کا ذکر ہے - مثلاً اُن کے ذاتی خصائل، ان کا مذہب، حب وطن، تصوف - ڈاکٹر صاحب اس بات سے بہت خفا ہیں کہ غالب کو صوفی (یا شیخ وقت) یا منجم یا محب وطن کیوں کہتے ہیں - کون کہتا ہے ؟ ڈاکٹر صاحب ہوا سے لڑتے ہیں - کوئی بھی مرزا صاحب کو صوفی یا شیخ وقت نہیں مانتا، ہاں اس سے انکار نہیں کہ اُن کے کلام میں تصوف کی چاشنی ضرور ہے - نہ کوئی انہیں منجم یا عالم یا محب وطن خیال کرتا ہے - ڈاکٹر سید محمود نے اپنے ایک مقدمے میں محب وطن ثابت کیا ہے لیکن اس پر کسی نے اعتنا نہ کی اور اسے محض تفنن سمجھے - اس پر قابل مصنف نے وہ طومار باندھا ہے کہ خدا کی پناہ - اور اسی کتاب میں نہیں بلکہ اس سے قبل اخبارات اور رسالوں میں کئی لوگ خامہ فرسائی فرماچکے ہیں - ہماری رائے میں تو یہ محض تضیع اوقات ہے - یہ امر سرے سے قابل اعتنا ہی نہیں ــــ

چھٹے باب میں شاعری کی عظمت پر بحث کی ہے اور انگریزی شعرا کے کلام کے نمونے دیے ہیں - یہاں ڈاکٹر صاحب بھٹک گئے ہیں - اس کی ضرورت اس موقع پر مطلق سمجھ میں نہیں آئی ــــ

ساتویں باب میں غالب کے کلام کی تنقید ہے - جس کا خلاصہ یہ ہے کہ غالب کو عمر بھر جدت کا لپکا رہا اور اس کی صرف یہی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ اپنے طرز بیان اور خیال میں جدت کا اظہار کرے - اس کی شاعری تمام تر عقلی ہے یعنے اس کا تعلق دماغ سے ہے نہ دل سے - اس نے یہ مقصد حاصل کیا مگر شاعری کو غارت کرکے - اس کے اردو کلام میں صناعی ہے شاعری نہیں ، جذبات سے خالی اور تخیل اور خیال بلندی سے معمور ہے - اپنے دعوے کی تائید میں اشعار بھی نقل کئے ہیں - کہتے ہیں کہ لوگ سمجھتے نہیں اور لفظوں کو دیکھ کر واہ واہ کرنے لگتے ہیں - چنانچہ مثال کے طور پر چار شعر لکھے ہیں :-

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

اور لکھا ہے کہ ان اشعار کو پڑھ کر بعض معصوم صفت حضرات وجد میں آجاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان میں بڑا فلسفہ ہے - اس کے بعد سوال کرتے ہیں ' " کیا درحقیقت ان اشعار میں فلسفہ یا کوئی چیز نئی ہے " - اس سوال پر سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں کہ فلسفہ کیا ہے اور نئی چیز کسے کہتے ہیں ؟ پھر ان اشعار کی انگریزی میں تشریح کی ہے ' جو بہت ہی پر لطف ہے - افسوس ہے کہ جگہ کی قلت مانع ہے ورنہ وہ نقل کرنے کے قابل ہے - پھر ایک شعر لکھا ہے :—

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

فرماتے ہیں کہ اس میں سوائے لفظوں کے گورکھ دھندے کے اور کیا رکھا ہے - ایک صوفی کہے گا کہ اس میں اس کا کوئی صوفیانہ عقیدہ نہیں اور ایک منطقی کہے گا کہ اس میں منطق کا نام نہیں —

" رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو " - اس قطعے کو نقل کرکے فرماتے ہیں کہ یہ ایک مخبوط الحواس شخص کی بہشت ہے —

غرض یہ کہ نہ اس میں دنیا کے سمجھنے کی قابلیت تھی اور نہ زندگی یا خدا کی مخلوق میں حسن کے سمجھنے کا مادہ تھا - اس نے شاعر کی حیثیت سے اپنے آپ کو دھوکا دے رکھا تھا - اس کے کلام میں نہ معنویت ہے نہ تناسب ہے ' اس کی زندگی بے معنی اور بے ترتیب تھی اور وہ ایک ایسا کلام چھوڑ گیا ہے جس میں کسی قسم کا کوئی تناسب نہیں —

اس تمام کتاب میں کہیں اُردو شاعری اور اردو شعرا سے بحث نہیں کی گئی ہے اور نہ اس کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی کوئی راے یا خیال معلوم ہوتا ہے - انھوں نے شاعری اور شعر کی تعریف میں سب انگریزی اقوال نقل کئے ہیں ' نمونے بھی انگریزی کلام کے دئے ہیں ' جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے اُردو شعرا کے کلام کو مطالعہ کرنے کی کبھی زحمت نہیں فرمائی - اُردو شاعری سے غالب کو الگ کرکے بحث کرنا اور پھر اُردو شاعری میں اس کا درجہ بھی قائم کرنا ایک مجنونانہ خیال ہے - ڈاکٹر صاحب نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ غالب کے نقادوں کی تحریریں " زیادہ تر ایسے ہی لوگوں کی پسند خاطر ہوئی ہیں جن کی تعلیم دیسی طریقے پر ہوئی ہے اور جن کی حس جمالیات پر مغربی ادب کی چھینٹ تک نہیں پڑی " - بے ادبی معاف ! ہمارا بھی خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ تحریر اگر ہوئی تو ایسے ہی لوگوں کی دلچسپی کا موجب ہوگی جو آپ کی طرح مغربی ادب کے تو رسیا ہیں مگر اُردو شاعری اور اس کے مختلف رنگوں اور اسلوبوں اور اس کی اندرونی حقیقت اور زبان کی نزاکتوں سے بالکل کورے ہیں۔

غالب کے متعلق صحیح رائے وهی شخص قائم کرسکتا هے جو غالب کے هم عصروں اور اُن کے خیالات اور اس وقت کے حالات سے بخوبی واقف هو - نیز جس نے اس سے قبل کی اُردو شاعری کا مطالعہ غور سے کیا هو اور ساتھ هی زبان کے عیب و صواب اور اس کی خوبیوں اور نزاکتوں کو بخوبی سمجھتا هو - ورنہ غالب پر کچھ لکھنا چاند پر خاک ڈالنا هے —

بلقیس

(مصنفۂ جناب سید محمد رشیدالملک صاحب - ملیح آبادی - ملنے کا پتہ :- دفتر ملیح آباد گزٹ - ملیح آباد ضلع لکھنؤ ' قیمت فی جلد چار آنے - حجم ۵۴ صفحات ' لکھائی ' چھپائی ' کاغذ معمولی - سائز ۱۸ × ۲۲)

یہ ایک نتیجہ خیز افسانہ هے - جس میں تعلیم نسواں کے فوائد اور نتائج دکھائے گئے هیں - جناب مصنف کا پیرایۂ بیان مؤثر اور بہت سلیس و سادہ هے ' زبان کی غلطیاں البتہ پائی جاتی هیں - اور بعض جگہ طرز تحریر میں قدامت نمایاں هے - مگر نتیجہ بہت اچھا نکلا هے - بلقیس ایک زنانہ اسکول کھولتی هے اور اصلاح معاشرت کا بیڑا اُٹھاتی هے - قصہ دل چسپ اور مفید هے —

کلیات وطن

(مرتبۂ غلام معین‌الدین صاحب ' یوسفی ' ملنے کا پتہ :- مکتبۂ ابراهیمیہ اسٹیشن روڈ نام پلی حیدرآباد دکن - لکھائی چھپائی ' کاغذ عمدہ حجم سو صفحے - سائز ۲۰ × ۳۰ - قیمت ایک روپیہ سکۂ عثمانیہ -)

یہ جناب سید افتخار علی شاہ صاحب مدنی - چشتی - قادری - صابری متخلص بہ ' وطن ' کا مجموعۂ کلام هے - جو اُن کے خادم و مرید جناب یوسفی نے چھپوایا هے - شروع میں شاہ صاحب مرحوم کی تصویر اور اُن کے حالات و تبصرۂ کلام پر ایک

۲۲ صفحے کا مقدمہ بھی ہے - جو مرتب صاحب نے نہایت محنت و جانفشانی سے قلم بند کیا ہے - شاہ صاحب ایک صوفی اور اللہ والے بزرگ تھے ' ان کا تمام کلام اس رنگ سے لبریز ہے - زبان صاف اور بندش چست ہے - اگرچہ زبان میں بعض الفاظ اور ترکیبیں دکھنی آگئی ہیں ' مگر یہ اس وجہ سے قابل التفات نہیں کہ شاہ صاحب خود دکھنی تھے اور صرف اپنے حال کو قال کی صورت میں ظاہر کردیتے تھے - عقیدت مندان ' وطن ' کے لئے خاص کر یہ مجموعہ قابل قدر اور وطن کی بہترین یادگار ہے —

مذہب و اخلاق

حزب اللہ

(مولفۂ ابوالبرکات جناب سید محمد فضل شاہ صاحب
سجادہ نشین جلال پور و امیر حزب اللہ - حجم ۱۲۴
صفحات - لکھائی ' چھپائی ' کاغذ عمدہ - سائز ۲۰ × ۲۶
قیمت اور ملنے کا پتہ کہیں درج نہیں

سید صاحب موصوف الذکر ایک پر جوش مسلمان صوفی ہیں - انہوں نے اسلام کی تبلیغ اور خدمت کا عزم بالجزم کرکے ایک جماعت سچے کارکنوں کی قائم کی ہے ' جس کا نام انہوں نے ' حزب اللہ ' رکھا ہے - یہ رسالہ اسی جماعت کے اغراض و مقاصد اور شرائط و فوائد پر قلم بند کیا ہے - شروع میں بتایا ہے کہ اس قسم کی جماعت کے قیام کی دنیا میں کیا ضرورت داعی ہوی اور دنیا میں جو قومیں زندہ رہنا چاہتی ہیں اُن کے لئے کیا طرز عمل اختیار کرنا لازمی ہے - مسلمانوں کے لئے کونسی شاہ راہ مفید اور قابل اختیار ہے - قرآنی آیات و احادیث سے جا بجا استدلال کیا گیا ہے -

عبارت میں ثقاہت اور بلند آہنگی پائی جاتی ہے - اہل دین اور اپنے مذہب سے محبت و عقیدت رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں —

تحفۂ خادم خلق

(مرتبۂ و مؤلفۂ جناب سیدن صاحب خادم خلق۔ ملنے کا پتہ :-
گجرات پنجاب - قیمت ایک روپیہ - حجم ۱۵۲ صفحات - لکھائی '
چھپائی ' کاغذ معمولی - تقطیع ۱۸ × ۲۲

مؤلف صاحب جلال پور کی جماعت حزب اللہ سے تعلق رکھتے ہیں - اسی سلسلے میں انہوں نے ایسے رسالے وقتاً فوقتاً شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے جو اخلاقی و مذہبی طورپر مفید ہوں اور یہ رسالہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔خدا' وحدانیت' برکات روحانی' وجود باری پر استدلال' ہمت ' جفاکشی وغیرہ مختلف عنوانات قائم کرکے اُن پر بحثیں کی ہیں - مختصر نظمیں اور غزلیں بھی کہیں کہیں ہیں ' غرض چھوٹے چھوٹے اخلاقی و مذہبی مضامین کا ایک کشکول ہے - مسلمانوں کے لئے اس قسم کے رسالوں کے سود مند ہونے میں شک نہیں —

تعلیم

اُردو کا قاعدہ

مرتبۂ قومی کتب خانہ - ریلوے روڈ لاہور - حجم ۲۰ صفحے
سائز چھوٹا - کاغذ رنگین اور موٹا - قلم واضح - قیمت سوا آنہ

اُردو کا یہ قاعدہ محمد نصیر صاحب ہمایوں بی - اے نے چھپوایا ہے - قلم جلی

اور واضح ہے - عام قاعدوں سے کوئی خاص بات اس میں نہیں ہے' البتہ مختصر ہے خط اور کاغذ دونوں اچھے اور موزوں ہیں —

مبادیء نباتات

(مؤلفۂ جناب جگ موہن لال صاحب' بی' ایس' سی' ایل' ٹی
صفحات ۱۰۳' قیمت ایک روپیہ - مکتبۂ ابراھیمیہ' حیدرآباد دکن

علم نباتات پر یہ ابتدائی رسالہ کار آمد معلوم ہوتا ہے - قابل مؤلف نے کوشش کی ہے کہ مطالب صاف زبان میں ادا کئے جائیں اور جہاں تک ممکن ہو اصطلاحات زیادہ نہ آنے پائیں - شکلیں بھی دی ہیں اور تجربوں کو تحریر کے ساتھہ اشکال میں بھی دکھایا گیا ہے - لیکن ظاہر ہے کہ پتھر کے چھاپے میں یہ چیزیں اچھی نہیں آتیں - چھپائی بھی زیادہ اچھی نہیں- ابتدائی کتابوں کی چھپائی لکھائی اچھی ہونی چاھئے-

---

تاریخ و معاشیات

وقائع عالم گیر

(مرتبۂ جناب چودھری نبی احمد صاحب سندیلوی -
مجلد - صفحات تقریباً ۲۵۰ - قیمت دو روپے -
انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد سے مل سکتی ہے)

عالم گیر کے متعلق عجیب اختلاف ہے' ایک گروہ تو اُسے ظالم' جابر' متعصب تنگ نظر اور تنگ دل کہتا ہے اور دوسرا اُسے اولیاء اللہ میں شمار کرتا ہے - دونوں

اپنی راے میں اعتدال سے گزر گئے ہیں - چودھری نبی احمد صاحب نے تاریخی لحاظ سے بہت اچھا کام کیا ہے - جس سے بعض غلط فہمیاں خود بخود رفع ہوجاتی ہیں - انہوں نے خود عالم گیر ہی کے رقعات لئے ہیں اور اُن سے اس کے خصائل و عادات اور اس کا طرز انتظام دکھایا ہے - ہر رقعہ یا فرمان کے ساتھہ قابل مؤلف نے تمہید کے طور پر اُردو میں واقعۂ متعلقہ کا خلاصہ لکھہ دیا ہے - جس سے رقعے یا فرمان کے سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے - رقعات میں جو جو نام اشخاص یا مقامات کے آے ہیں' اُن کے متعلق بہت مفید تاریخی حاشیے لکھہ دیے ہیں - اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم گیر کس قدر باخبر ' تیز نظر ' شجاع ' عفو کرنے والا ' قواعد اور قانون کی سختی سے پابندی کرنے والا ' عادل اور بے لوث تھا —

کتاب کے ساتھہ ایک سو چار صفحے کا ضمیمہ بھی ہے ' جو تاریخی معلومات کا مخزن ہے - اس میں مختصر طور پر شاہجہاں ' اورنگ زیب عالم گیر ' داراشکوہ ' کام بخش ' شاہزادۂ معظم ' شاہزادۂ اعظم اور عالمگیر کے بعض امراے عظام کے حالات ہیں - اس کے بعد عالم گیر کے مدارالمہاموں کا تذکرہ ہے - اس ذکر کے بعد عالم گیری امراے دکن کی فہرست مع منصب و خدمات و دیگر مختصر حالات کے درج ہے - پھر ایک فہرست صوبجات مع آمدنی کی ہے - اس کے بعد اس عہد کی اصلاحات کی ایک فہرست ہے - سب سے آخر میں مذہبی روا داری کے متعلق چند بیانات ہیں —

فاضل مؤلف نے ایک تاریخی خدمت کی ہے' جو قابل شکرگزاری ہے - اگرچہ اپنی تحریر میں ایک آدہ مقام پر کنایۃً بعض بے باک مصنفوں پر چوٹ کر گئے ہیں ' لیکن کہیں کوئی ایسی بات ان کی قلم سے نہیں نکلی جو دل آزار یا پایۂ تہذیب سے خارج ہو - کتاب مخالفین اور موافقین دونوں کے مطالعے کے قابل ہے —

هندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کے معاشرتی حالات

(سلسلۂ لکچر ہندوستانی اکاڈیمی از جناب علامہ عبدالله یوسف علی صاحب سی - بی - ای ' ایم - اے ' ایل ایل - ایم - صفحات ۱۱۴
قیمت ایک روپیہ)

ہندوستانی اکاڈیمی (صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ) کا مقصد ہندی اور اُردو زبانوں کے ادبوں کو ترقی دینا ہے - اس مقصد کے حصول کے لئے منجملہ دیگر ذرائع کے

ایک ذریعہ لکچروں کا سلسلہ ہے۔ چنانچہ یہ کتاب ان لکچروں کا مجموعہ ہے ' جو علامہ عبداللہ یوسف علی نے اس اکاڈیمی کی سر پرستی میں دیے - فاضل مقرر نے ہندوستان کا از منۂ وسطیٰ راجہ ہرش کے انتقال یعنی تقریباً ساتویں صدی کے وسط سے سلطنت مغلیہ کے قیام یعنی تقریباً سولھویں صدی کے وسط تک قرار دیا ہے —

پہلا لکچر تمہیدی ہے - دوسرا لکچر ساتویں صدی کے معاشرتی اور اقتصادی کوائف پر ہے - تیسرے لکچر میں دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی اور چوتھے لکچر میں چودھویں صدی کی معاشرتی خصوصیات ہیں —

ان لکچروں میں فاضل لکچرار نے سنسکرت' عربی' انگریزی کتابوں سے مدد لی ہے اور ان کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد اس زمانے کے حکومتی ' معاشرتی ' ادبی اور انتظامی حالات اور کوائف کو بڑی خوبی سے سلسلہ وار بیان کیا ہے - اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو محققانہ طور پر اس طرح مرتب کی گئی ہے - یہ لکچر بہت دلچسپ اور مفید ہیں اور صاف زبان میں ادا کئے گئے ہیں - علامہ عبداللہ یوسف علی ایک نامور ادیب اور وسیع النظر فاضل ہیں - اکاڈیمی بھی قابل تعریف ہے کہ اس نے ان سے یہ کام لیا - لکچر اگرچہ مختصر ہیں مگر کام کے ہیں - اکاڈیمی کی یہ پہلی کتاب ہے جو شائع ہوی ہے- ہمیں امید ہے کہ اس کی سر پرستی میں ایسے بہت سے مفید کام ہونگے —

متفرقات

آل پارٹیز کانفرنس کی رپوٹ

(اردو ترجمہ جو مکتبۂ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دہلی نے شائع کیا- صفحات ۲۰۸ قیمت ایک روپیہ چار آنے - تتمۂ رپوٹ قیمت ۸ آنے)

اس رپوٹ پر جو نہرو رپوٹ کے نام سے مشہور ہے ' اس قدر بحث ہو چکی ہے کہ اب اس پر کچھ لکھنا لا حاصل ہے - اس رپوٹ کا نتیجہ کچھ ہی ہو لیکن یہ پڑھنے

کے قابل ہے کیوں کہ یہ پہلا دستور ہے جو ایک موثر مجلس نے ملک کی حکومت کے لئے مرتب کیا ہے - مکتبۂ جامعۂ ملیہ کے کارکن قابل شکر گزاری ہیں کہ انہوں نے ایسا اچھا ترجمہ اس قدر جلد شائع کردیا اور کانگریس کے اجلاس سے بہت قبل اردو خواں طبقے تک پہنچ گیا —

مادر ہند

(اردو ترجمۂ مدر انڈیا ' مصنفۂ مس میو ' از خالد کے - بیگ - جلد دوم
مطبوعۂ مطبع یوسفی فرنگی محل' لکھنؤ - قیمت ایک روپیہ)

مس میو کی کتاب اس قدر شہرت پا چکی ہے اور اس کے اس قدر پر زور اور دنداں شکن جواب لکھے جاچکے ہیں کہ اب اس پر کچھہ لکھنا فضول ہے - لیکن یہ کتاب ہندوستانیوں کے پڑھنے کے قابل ہے اور ضرور پڑھنی چاہئے - لکھنے والے کی نیت خراب ہو مگر اس میں اکثر واقعات صحیح ہیں - جنھیں پڑہ کر اپنی حالت پر شرم آتی ہے - اس کتاب کے مطالعے سے ہمیں بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو اب تک ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھیں - جواب لکھنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم اپنی برائیوں کی اصلاح کریں —

فارسی بلگرام

لکچر از مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی مددگار معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ حیدرآباد دکن - حجم ۵٦ صفحات - لکھائی ' چھپائی ' کاغذ متوسط - سائز ۱۸ × ۲۲ - قیمت چھہ آنے

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے - فارسی زبان میں ایک لکچر ہے - جو جناب سید علی اصغر صاحب نے بلگرام کے فارسی ادب پر دیا ہے - بلگرام ایک زمانے

تک ہندوستان میں گہوارۂ علم و ادب اور علما و شعراء ' ادباء کا مولد رہا ہے - یہاں بڑے بڑے نامور شاعر ' مصنف ' علماء پیدا ہوے اسی وجہ سے خطۂ بلگرام یونان ہند کہا جاتا ہے - اب اگرچہ اس کی عظمت براے نام رہ گئی ہے پھر بھی موجودہ زمانے میں اس نے اچھے اچھے لوگ پیدا کئے یہاں فارسی ادب کے دونوں شعبوں نظم و نثر کے بڑے بڑے نامور علم بردار گزرے ہیں ان کے مختصر حالات اور تاریخ پر یہ لکچر مشتمل ہے - حیدرآباد کے شعبہ جامعہ معارف کے ایک جلسے میں پڑھا گیا تھا —

رپوٹ آل انڈیا مسلم ایجو کیشنل کانفرس علی گڈھ

متعلق اجلاس چہلم

سنہ ۱۹۲۷ ع میں آل انڈیا مسلم ایجو کیشنل کانفرس کا چالیسواں اجلاس مدراس میں زیر صدارت جناب سر شیخ عبدالقادر ہوا تھا - یہ اس کی مکمل رپوٹ ہے - ضمیمے میں جسٹس شاہ سلیمان صاحب کا طویل خطبہ بھی درج ہے - جو شعبۂ معاشرت کے صدر تھے —

جدید رسالے

فردوس

(ایڈیٹر جناب شیخ غلام مصطفیٰ صاحب حیرت - ملنے کا پتہ:- کوچۂ چابک سواران لاھور - حجم ۴۰ صفحے - لکھائی چھپائی متوسط ' کاغذ معمولی ' سائز ۲۲ × ۱۸ - قیمت سالانہ ایک روپیہ آٹھ آنے - فی پرچہ چار آنے)

یوں تو یہ رسالہ تین سال سے نکل رہا ہے - مگر ہمیں ریویو کے لئے جو پرچہ موصول ہوا ہے وہ تیسری جلد کا چھٹا نمبر ہے - یعنی بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ع - اس دوران میں اس نے بہت سے انقلابات کا مقابلہ کیا - ایڈیٹر صاحب کو بہت سی

پریشانیوں کا سامنا رہا - لیکن یہ سخت جان زندہ رہا اور ہے - شذرات کے بعد سب سے پہلے غزلیں اس میں جگہ پاتی ہیں ' اور پھر دو ایک افسانوں اور ادب لطیف کے چند نمونوں اور غزلوں کے بعد یہ ختم ہوجاتا ہے - غزلیں اور مضمون متوسط درجے کے ہیں۔

کیمیا

(ایڈیٹر سید عشرت حسین صاحب ' نقوی ' ملنے کا پتہ :- نمبر ۱۳۳ ایبٹ روڈ لکھنؤ - لکھائی چھپائی متوسط - کاغذ معمولی - سائز اردو رسالے کا - حجم ۷۲ صفحے - قیمت سالانہ چار روپے - فی پرچہ آٹھ آنے)

شکر ہے کہ ادب اُردو سے دلچسپی رکھنے والوں میں اب عملی فنون اور کار آمد ادب کا مذاق پیدا ہو گیا ہے - اور اہل قلم حضرات بھی اِدھر متوجہ ہو ے ہیں - یہ رسالہ لکھنؤ سے ملک کے نامور ادیب و اخبار نویس جناب سید جالب دہلوی ایڈیٹر روزنامۂ ہمدم کی نگرانی میں نکلنا شروع ہوا ہے - پیش نظر رسالہ اس کا دوسرا نمبر اور جون سنہ ۱۹۲۸ ع کا ہے - اس میں اکثر مضامین مفید اور کار آمد ہیں - ہندوستان میں کاروباری زندگی بسر کرنے والوں کو مفید مشورے دیے گئے ہیں ' عملی تجاویز بتائی گئی ہیں - مضامین عام فہم اور سلیس زبان میں ہیں —

(تاریخ اخلاق یورپ)

اس کتاب کے اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم و تبحر - تحقیق و صداقت کا مرادف ہے - یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن - اصول اخلاق - مذاہب و خیالات کا مرقع ہے - مترجمۂ مولوی عبدالماجد صاحب بی - اے' جلد اول مجلد ۳ روپے جلد دوم مجلد دو روپے' ۸ آنے —

(ہماری شاعری)

مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب' ایم - اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی نے رسالۂ اُردو میں شاعری پر ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جو عام طور پر بہت پسند کیا گیا تھا اب رضوی صاحب نے اس میں بہت کچھ اضافہ کرکے کتابی صورت میں کردیا ہے - اور انجمن ترقی اُردو نے اسے نہایت عمدہ طور پرپوری کتاب دو رنگوں میں (لیتھو میں) طبع کرائی ہے - پورے کپڑے کی خوشنما جلد ہے - حجم دو سو صفحے' قیمت دو روپے —

(کلیات ولی)

ولی دکنی کے نام سے کون اُردو داں واقف نہ ہوگا - اسے اُردو شاعری کا باوا آدم کہتے ہیں اور یہی گویا ہماری شاعری کا قدیم اور ممتاز ترین علم بردار ہے - اس کا کلام اس زمانے کی زبان اور شاعری کا بہترین اور کامل مرقع ہے —

یہ کلیات جناب 'احسن' مارہروی نے نہایت محنت اور قابلیت سے مرتب کیا ہے - اور انجمن ترقی اردو کے جدید ترین مطبوعات میں ہے - اب تک ولی کے جو دیوان کہیں کہیں چھپے اور ملتے ہیں - اکثر غلط اور نامکمل ہیں - یہ کلیات ۱۷-۱۸ قدیم' قلمی' نایاب نسخوں سے مقابلہ اور صحیح کرکے کئی سال کی لگاتار محنت و کاوش سے مرتب کیا گیا ہے —

اس قادرالکلام اُستاد کا کلیات تقریباً تمام اصناف سخن پر حاوی اور چار سو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے - شروع میں مرتب صاحب کا ایک بسیط اور قابل قدر مقدمہ ہے جس میں موصوف نے صاحب دیوان کے حالات و سوانح نہایت تحقیق اور کمال محنت سے فراہم کرکے جمع کئے ہیں اور کلام پر تبصرہ بھی فرمایا ہے -

کلیات کے آخر میں ایک بسیط فرہنگ ہے جس میں ان تمام قدیم' متروک' اجنبی' ہندی' دکنی الفاظ کا حل ہے جو کلام ولی میں جا بجا آئے ہیں - آخر میں پونے دو سو صفحے کا ایک ضمیمہ اختلاف نسخ ہے جو نہایت محنت و عرق ریزی سے مرتب کیا گیا ہے اس میں تمام نسخوں سے مقابلہ کرنے پر جو جو اختلاف نظر آیا ہے' دیوان کی

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

ہر غزل کے نمبر کا حوالہ دے کر بتادیا ہے - یہ ضمیمہ ارباب فن و تحقیق کے لئے خاص طور سے قدر کی چیز ہے - اور کئی ماہ کی مسلسل محنت سے تیار ہوا ہے - ان تمام خوبیوں کے علاوہ انجمن نے اپنے مشہور عمدہ ٹائپ میں مضبوط سفید چکنے کاغذ پر طبع کیا ہے ' قابل دید اور اس لائق ہے کہ ہر لائبریری اور قدر دانان اردو کے ہر کتب خانے میں اس کا ایک ایک نسخہ موجود رہے - حجم تقریباً آٹھ سو صفحات ' قیمت مجلد ۵ روپے غیر مجلد ۴ روپے —

—— (مثنوی خواب و خیال) ——

حضرت میر درد دہلوی (رح) کے چھوٹے بھائی میر اثر کی یہ لاجواب مثنوی نایاب تھی ' بہت کوششوں کے بعد بھی پتہ نہ چلتا تھا ' اُردو کی خوش نصیبی سے انجمن ترقی اردو کو دستیاب ہوگئی ' اور اب خاص اہتمام کے ساتھ عمدہ ٹائپ میں اعلیٰ درجے کے کاغذ پر ' طبع کی گئی ہے ' جس پر انجمن کے فاضل معتمد جناب مولوی عبدالحق صاحب نے ایک زبردست ناقدانہ مقدمہ تحریر فرما کر اس مثنوی کے خصوصیات اور محاسن کو نمایاں کیا ہے - یہ نادر مثنوی آج تک ناپید تھی ' تذکروں میں کہیں کہیں اس کا ذکر آ جاتا ہے ' حضرت میر درد کے اشعار اور کلام کے علاوہ اس میں مصنف کی غزلیں بھی جا بجا آ ئی ہیں ' جو قابل دید اور نہایت لطیف و پاکیزہ ہیں - یہ مثنوی اُردو میں ایک قابل قدر اضافہ اور انجمن کی طرف سے قدر دانان اردو کی خدمت میں اس سال کا جدید علمی ہدیہ ہے ' جلد بھی مضبوط عمدہ اور جدید طرز کی بنوائی گئی ہے - حجم دو سو صفحے سے زائد ' قیمت مجلد ڈیڑہ روپیہ —

—— (انتخاب کلام میر) ——

ملک الشعرا میر تقی میر کے نام اور کلام سے کون قدر دان اردو واقف نہیں ' یہ انہیں کے کلام کا بہترین انتخاب ہے - جو جناب مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سارے کلیات کا عطر کھینچ لیا ہے ' یہ انتخاب ملک میں بہت مقبول ہو چکا ہے اور کئی یونیورسٹیوں نے اپنے نصاب تعلیم میں شامل کر لیا ہے —

مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اب تیسری بار انجمن ترقی اردو پریس نے اپنے مشہور ' نفیس ٹائپ میں چھاپ کر شائع کیا ہے - کاغذ چکنا ' نہایت عمدہ ' حجم دو سو صفحات سے زیادہ ' جلد نفیس اور مضبوط - شروع میں فاضل مرتب کا زبردست و دلچسپ مقدمہ ہے ' قیمت مجلد دو روپے آ ٹھ آ نے —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

——(قواعد اُردو)——

یہ کتاب جناب معتمد صاحب انجمن ترقی اُردو کی بیش بہا تالیف ہے ' اور بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ زبان اُردو کے قواعد پر اب تک اس سے بہتر ' سہل ' جامع کتاب تصنیف نہیں ہوی - ملک میں بیحد پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی اور نہایت مقبول ہوی - جامعۂ عثمانیہ کے نصاب ایف اے میں داخل ہے - اب جناب مولف و مرتب کی بیحد کاوش اور غور سے نظر ثانی ' ترمیم و اضافہ کے بعد دوبارہ چھاپی گئی ہے - شروع میں اُردو زبان اور اس کے ادب پر لا جواب بسیط مقدمہ بجائے خود قابل دید ہے- انجمن نے اپنے پریس میں ' عمدہ ٹائپ میں چھپوائی ہے ' کاغذ بہت عمدہ جلد نہایت نفیس اور مضبوط ' قیمت مجلد دو روپے ۸ آنے —

——(جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق)——

سرکار نظام نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات ممالک محروسۂ سرکار عالی و جاپان کے تعلیمی نظام کے مطالعے اور تحقیق کے لئے بھیجا تھا- نواب صاحب موصوف نے وہاں رہ کر اس عجیب و غریب ملک کے حالات اور خاص کر تعلیمی نظم و نسق کو نہایت غور اور تحقیق سے مطالعہ فرمایا - کتاب کے ابتدائی حصے میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دلچسپ اور فاضلانہ بحث کی ہے - جو ہمارے اهل وطن کے لئے سبق آموز ہے - اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو جاپان پر اس طرز میں لکھی گئی ہے — ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھے جو علاوہ دلچسپ ہونے کے پراز معلومات بھی ہے- خاص کر ان لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے جو ملک کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں - حجم ۴۸۲ صفحے - قیمت فی جلد مجلد ۳ روپے —

——(سرگذشت حیات (یا) آپ بیتی)——

اس کتاب میں حیات کے آغاز اور اس کے نشو و نما کی داستان نہایت دلچسپ طرز پر بہت ہی سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے- حیات کی ابتدائی حالت سے لیکر اس کا ارتقا انسان تک پہنچایا گیا ہے اور تمام تاریخی مدارج کو اس سہل طریقے سے بتایا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سمجھہ سکے اگرچہ جدید سے جدید علمی تحقیقات بھی اس میں آ گئی ہے مگر بیان کی سلاست میں فرق نہیں آیا — یہ کتاب جدید معلومات سے لبریز ہے اور ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا لازم ہے (حجم ۳۰۰ صفحے) قیمت فی جلد مجلد ۲ روپے ۸ آنے —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

(تذکرۂ شعرائے اُردو)

مولفۂ میر حسن دھلوی - میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں - اُن کی مثنوی 'بدرمنیر' کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ھی اُردو کی کسی کتاب کو نصیب ھوا ھو - یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف ھے - یہ کتاب بالکل نایاب تھی' بڑی کوشش سے بہم پہنچا کر طبع کی گئی ھے - مہر صاحب کا نام اس تذکرے کی کافی شہادت ھے - اس پر مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ھے جو قابل پڑھنے کے ھے - قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ ۱۴ آنے غیر مجلد ایک روپیہ ۹ آنے —

(تاریخ تمدن)

سرتامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ھے - الف سے (ی) تک تمدن کے ھر مسئلے پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ھے اور ھر اصول کی تائید میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ھے. اس کے مطالعے سے معلومات میں انقلاب اور ذھن میں وسعت پیدا ھوتی ھے - حصۂ اول غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنے - مجلد دو روپے - حصۂ دوم مجلد دو روپے —

(مقدمات الطبیعات)

یہ ترجمہ ھے مگر انگلستان کے مشہور سائنس داں حکیم ھکسلے کی کتاب کا جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ھے - اس میں بظاھر فطرت کی بحث درج ھے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ھے - قیمت غیر مجلد ۲ روپے - مجلد ۲ روپے ۸ آنے —

(القول الاظہر)

امام ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف (فوزالاصغر) کا اُردو ترجمہ ھے - یہ کتاب فلسفۂ الٰھیین کے اصول پر لکھی گئی ھے اور مذھب اسلام پر انھیں اصول کو منطبق کیا گیا ھے - قیمت غیر مجلد ۸ آنے - مجلد ایک روپیہ —

(القمر)

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ھیں —

جدید انکشافات ہوئے ہیں ، ان سب کو جمع کردیا ہے - طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے - قیمت غیر مجلد ۱۰ آنے مجلد ایک روپیہ ----

—— (فلسفۂ تعلیم) ——

ہر برٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلۂ تعلیم کی آخری کتاب ہے - غور و فکر کا بہترین کار نامہ - والدین و معلم کے لئے چراغ ہدایت - تربیت کے قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھہ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے - اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے - قیمت مجلد ۲ روپے - غیر مجلد ایک روپیہ ۱۲ آنے —

—— (دریائے لطافت) ——

ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاء اللہ خاں کی تصنیف ہے - اردو صرف و نحو اور محاورات اور الفاظ کی پہلی کتاب ہے ، اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں - قیمت غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنے مجلد ۲ روپے —

—— (طبقات الارض) ——

اس فن کی پہلی کتاب ہے - (۳۰۰) صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلم بند کئے ہیں - کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے – قیمت غیر مجلد ۲ روپے - مجلد دو روپے ۸ آنے —

—— (مشاہیر یونان و روما) ——

ترجمہ ہے – سیرت نگاری اور انشا پردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے - ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمے سے فیض حاصل کیا ہے - وطن پرستی اور بے نفسی عزم و جواں مردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے – قیمت جلد اول غیر مجلد ۳ روپے – مجلد ۴ روپے جلد دوم مجلد ۲ روپے ۸ آنے —

—— (اسباق النحو) ——

ملک کے ادیب کامل مولانا حمید الدین صاحب بی – اے کی تالیف ہے – اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے – قیمت حصۂ اول غیر مجلد ۶ آنے – حصۂ دوم مجلد ۴ آنے —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

(علم المعیشت)

اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم - اے نے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ھے - معیشت پر یہ کتاب جامع ومانع ھے - مبہم و مشکل مسائل کو پانی کردیا ھے ' اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ھیں - اشتراکیت کا باب قابل دید ھے ' حجم ۸۸۵ صفحے ' قیمت مجلد ۵ روپے آٹھ آنے —

(تاریخ یونان)

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ھے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ - اس کا نقطۂ خیال خالصاً ھندوستانی ھے - ایف اے کلاس کے طلبا جو یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ھیں ' اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے قیمت مجلد ۲ روپے —

(رسالۂ نباتات)

اس موضوع کا پہلا رسالہ ھے - علمی اصلاحات سے معرا - طلبائے نباتات جس مسئلے کو انگریزی میں نہ سمجھہ سکیں وہ اس رسالے میں مطالعہ کریں - قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے —

(دیباچۂ صحت)

اس کتاب میں مطالبات صحت پر مثلاً (ھوا ' پانی ' غذا ' لباس ' مکان وغیرہ) مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ھے - زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دلپذیر ھے ' ملک کی بہترین تصنیف ھے - اس کا مطالعہ کئی ھزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ھوگا - حجم ایک ھزار صفحے - قیمت مجلد چار روپے —

(نکات الشعراء)

یہ اُردو کا تذکرہ استادالشعرا میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ھے - اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں - نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ھیں- مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدرالصدور امور مذھبی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ھے - قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ھیں —

(فلسفۂ جذبات)

کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے - جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھہ بحث کی گئی ہے - متعلمان نفسیات اسے مفید پائیں گے - قیمت مجلد دو روپے آٹھہ آنے - غیر مجلد دو روپے —

(وضع اصطلاحات)

یہ کتاب ملک کے نامور انشا پرداز اور عالم مولوی وحیدالدین 'سلیم' مرحوم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعے کے بعد تالیف کی ہے بقول فاضل مولف " یہ بالکل نیا موضوع ہے - میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی زبان میں" - اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھہ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں — مخالف و موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی ' مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے سابقوں اور لاحقوں - اُردو مصادر اور ان کے مشتقات - غرض سیکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آ گئی ہیں - اُردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان میں ان کی نظیر نہیں - لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کردی ہیں- اور ہمارے حوصلے بلند کردیے ہیں — اس سے پہلے ہم اُردو کو علمی زبان کہتے ہوے جھجکتے اور اس کی آئندہ ترقی کے متعلق دعوی کرتے ہوے ہچکچاتے تھے - مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا - اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے- تعداد صفحات (۳۰۵) قیمت مجلد تین روپے ۱۲ آنے —

(محاسن کلام غالب)

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا معرکۃالآرا مضمون ہے- اُردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے - جو اس شان کی لکھی گئی ہے - یہ مضمون اُردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا - صاحب‌نظر قدر دانوں کے اصرار سے الگ بھی طبع کیا گیا ہے- قیمت مجلد ایک روپیہ

(ملل قدیمہ)

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے - اس میں بعض قدیم اقوام ' سلطنت کلدانی ' آشوری ' بابل - بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت - عقائد - او صنعت و حرفت وغیرہ

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھہ دیے ہیں - اردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہو سکیں اس لئے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے - حالات کی وضاحت کے لئے جابجا تصویریں دی گئی ہیں - صفحہ ۲۸۴ قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے —

—— (بجلی کے کرشمے) ——

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خانصاحب بی' اے - نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعے کے بعد لکھی ہے - برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی گئی ہے - ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے' کہاں سے آتی ہے' کیا کام آسکتی ہے - یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے - لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے بھی مفید ہے - قیمت ایک روپیہ بارہ آنے —

——(البیرونی) ——

مصنفۂ مولوی سید حسن برنی صاحب بی اے - اس کتاب میں علامۂ ابوریحان بیرونی کے سوانحی حالات ہیں اور ان کی مشہور و معروف تصنیف کتاب الہند اور دیگر تصانیف پر تفصیل کے ساتھہ تبصرہ کیا گیا ہے - یہ کتاب انجمن ترقی اردو میں باقی نہیں رہی تھی اب دوسرا ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی اور اضافۂ مضامین کے ساتھہ نہایت عمدہ کاغذ پر چھپ کے تیار ہوا ہے - قیمت فی جلد مجلد دو روپے - غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ —

——(تاریخ ہند) ——

ہندوستان کی یہ تاریخ مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے محکمۂ تعلیمات سرکار نظام کی فرمایش پر لکھی ہے اور مڈل اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے - اس وقت تک کوئی اور مختصر تاریخ ہند اس نقطۂ نظر اور ایسی خوبی سے نہیں لکھی گئی ہے - تعلیمی حلقوں کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اسے بہت پسند کیا ہے - چھوٹے سائز کے ۲۸۴ صفحے - قیمت ایک روپیہ ایک آنہ —

—— (لغت اصطلاحات علمیہ) ——

جملہ اہم علوم کی اصطلاحوں کا ترجمہ ' جس میں حسب ذیل علوم داخل ہیں:

Astronomy , Botany ' Economics, History, (Constitutional,Greece

---

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

England'etc, Logic, Algebra, Conics, Solid Geometry, Trigonometry, Differential Equations, Statics, Metaphysics, Psychology, Physics, Political Science, Archælogy, Biology -

کئی سال کی مسلسل محنت اور مختلف ماہرین فن و ماہرین لسان کی کاوش و کوشش کا نتیجہ ہے - مصنفین و مترجمین کے لئے نا گزیر ہے —

حجم ۵۳۸ صفحے - قیمت مجلد چھ روپے —

——(تاریخ زوال روما)——

یہ گبن کی مشہور تاریخ کے ابتدائی (۷) ابواب کا ترجمہ ہے - اصل کتاب اپنی خوبیوں کے اعتبار سے محتاج تعریف نہیں - قیمت فی جلد غیر مجلد سوا روپیہ ——

——(تاریخ عرب) ——

مصنفۂ موسیو سدیو فرانسیسی - عربوں کے متعلق یہ کتاب ان تمام تاریخوں کا نچوڑ ہے جو یورپ و ایشیا کے کتب خانوں کی زینت ہیں مسلمانوں کی ترقیوں اور عربوں کے کمالات کا آئینہ ہے - ساتھ ہی یورپ کے کذب و افترا کا بہترین جواب - قیمت مجلد چرمی ۷ روپے ۸ آنے ——

——(یاد گار غالب)——

یعنی مرزا اسداللہ غالب دہلوی کے مفصل حالات زندگی اور ان کے اقسام نظم و نثر ' اُردو فارسی پر تفصیلی ریویو اور انتخاب - مولفۂ شمس العلما مولانا الطاف حسین صاحب ' حالی ' مرحوم - قیمت مجلد ۳ روپے ——

——(شعر و شاعری)——

شمس العلما خواجہ الطاف حسین ' حالی ' مرحوم کے اُردو دیوان کا لا جواب مقدمہ جس میں شعر و ' شاعری ' پر نقادانہ بحث کی گئی ہے - تنقیدی حیثیت سے اُردو زبان میں اب تک ایسا مضمون نہیں لکھا گیا ہے - قیمت مجلد ۲ روپے ' غیرمجلدسوا روپیہ -

——(موازنۂ انیس و دبیر)——

میر انیس کی شاعری پر تفصیلی ریویو اور میر انیس ومرزا دبیر کا موازنہ - مؤلفۂ مولانا شبلی نعمانی ' قیمت فی جلد مجلد چار روپے - غیر مجلد تین روپے ——

——(وکرم اُروسی)——

کالیداس کے مشہور ناٹک کا اُردو ترجمہ مع ایک بسیط مقدمہ کے جس میں ہندو ڈرامے کی تاریخ اور نوعیت پر مفصل بحث کی گئی ہے - مرتبۂ مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی - اے مرحوم - قیمت مجلد دو روپے - غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ ——

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں ——

——— (خطوط شبلی) ———

علامۂ شبلی مرحوم کے یہ وہ لاجواب اور نادر خطوط ہیں جو موصوف نے بمبئی کی مشہور تعلیم یافتہ خواتین عطیہ بیگم صاحبہ فیضی اور زہرا بیگم صاحبہ فیضی کے نام وقتاً فوقتاً کمال اخلاص و محبت اور انداز خاص کے ساتھ لکھے تھے۔ یہ جواہر پارے اُردو میں مولانا کے کمال انشا پردازی کی نایاب یادگار ہیں - طرز نگارش اس قدر لطیف اور پاکیزہ ہے کہ شروع کرکے ختم کئے بغیر کتاب کو چھوڑنا دشوار ہے - شروع میں جناب مولوی عبدالحق صاحب، بی۔اے معتمد انجمن ترقی اُردو کا ایک نہایت لطیف و سخن گسترانہ مقدمہ بھی شامل ہے - جس نے ان خطوط کے جذبات اخلاص و محبت اور نکات ادبی کو بے نقاب کردیا ہے - مرتبۂ مولوی محمد امین صاحب مارہروی و جناب قیصر بھوپالی - قیمت ایک روپیہ —

——— (دیوان غالب مطبوعۂ جرمنی) ———

غالب کے کلام کی قدر اور جو مانگ ہے ہر صاحب ذوق جانتا ہے، اُن کے دیوان کا ایک اڈیشن نفاست پسند طبائع کے لئے جرمنی کے مشہور کاویانی پریس میں جامعۂ ملیہ نے چھپوایا تھا جو ہاتھوں ہاتھ نکل گیا - دوسری بار پھر اسی اہتمام و نفاست سے طبع ہوا ہے - ٹائپ، کاغذ، چھپائی، جلد، سائز ہر چیز دیدہ زیب و دلفریب ہے۔ قیمت چار روپیہ —

——— (محشر خیال) ———

یہ سید سجاد انصاری مرحوم وکیل بارہ بنکی کے چند دلکش ادبی و اصلاحی مضامین اور نظموں کا مجموعہ ہے جو شرکت ادبیہ دہلی نے خاص اہتمام سے چھپوایا ہے - سجاد انصاری صاحب خوش فکر و خوش گفتار ادیب تھے، اُن کے مضامین میں خاص قدرت و ادبیت اور کلام میں خاص کیف اور بلند خیالی و جذبات نگاری ہوتی ہے - یہ مجموعہ مرحوم کی جوانمرگی کی یادگار ہے، جس کو سید منظور حسین صاحب نے مرتب کیا ہے - لکھائی چھپائی بہت پاکیزہ، سائز مختصر، جلد نہایت نفیس، اوپر سنہری حروف میں کتاب کا نام بھی لکھا ہے - قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ —

——— (چمن) ———

یہ نہایت چھوٹا سا حسین و جمیل مجموعہ اساتذۂ اُردو کے پاکیزہ کلام کا انتخاب ہے - کارڈ سائز پر نہایت اعلیٰ طباعت و نفاست کے ساتھ عید کے موقعہ پر دوست احباب کو پیش کرنے کے لئے بہترین ادبی تحفہ ہے - قیمت ۵ آنہ —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

——(دیوان حالی)——

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی مرحوم کے قطعات غزلیات ' قصیدے ' مرثیے ' ترکیب بند ' رباعیاں ' تاریخیں اور متفرق اشعار قیمت تیرہ روپیہ —

——(میٹریکولیشن کا نصاب اُردو)——

مجلس نصاب اردو جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد دکن کی ہدایت کے مطابق مولانا مولوی عبدالحق صاحب بی - اے (علیگ) آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو نے مرتب کیا - قیمت دو روپے —

——(معراج العاشقین)——

حضرت مخدوم ابوالفتاح صدرالدین سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نواز (رح) کی تصنیف ہے - اس میں حضرت کے بعض مواعظ و ارشادات قدیم اردو یعنی دکنی اردو میں لکھے ہیں- مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کی تصحیح و ترتیب اور مقدمے کے ساتھہ چھپی ہے - قیمت ۶ آنے —

——(وقائع عالمگیر)——

حضرت اورنگ زیب سلطان ہند عالمگیر کے وقائع زندگی جو خود ان کے مکاتب اور مستند مورخین کی روایات پر مبنی ہیں - اور جن سے ان کے حقیقی کیرکٹر رواداری ' عدل جوئی اور تشرع مذہبی کا کافی ثبوت ملتا ہے - مرتبۂ چودھری نبی احمد صاحب سندیلوی - مجلد ۲ روپے —

——(افغان بادشاہ)——

اعلیٰ حضرت غازی امان اللہ خاں کی عظیم الشان جدید داستان حیات اس کتاب لاجواب کو محمد حسین خاں بی - اے (علیگ) ڈائرکٹر جنرل پبلک انسٹرکشن افغانستان نے بڑی عرق ریزی سے مرتب کیا ہے' شائقین سیر و تاریخ کے لئے خصوصاً اور کافۂ مسلمین کو عموماً لازم ہے کہ اس کتاب کو غور سے مطالعہ فرما کر استفادہ کریں - قیمت فی جلد دو روپے آتھہ آنے —

——(پریم پچیسی)——

ملک کے مشہور انشا پرداز منشی پریم چند صاحب کے نہایت دلچسپ افسانوں

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

کا مجموعہ ۔ حصۂ اول ڈیڑہ روپیہ حصۂ دوم ڈیڑہ روپیہ —

——(عروس ادب) ——

مولوی سید ناظرالحسن صاحب هوش بلگرامی کے اخلاقی ادبی تاریخی اور سیاسی مضامین کا مجموعہ - حجم ۲۲۴ صفحہ ۔ سایز ۲۶ × ۲۰ کاغذ عمدہ سفید - لکھائی چھپائی بہت خوشنما - قیمت فی جلد دو روپے —

—— (خیالات ارونگ) ——

مشہور امریکن مصنف واشنگٹن ارونگ کے بعض دلچسپ مضامین کا بامحاورہ اردو ترجمہ از مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا وکیل غازی آباد ضلع میرٹھہ ۔ قیمت ۸ آنے —

—— (سیر المصنفین) ——

جس میں نثاران اردو کے حالات زندگی اور اردو زبان کی عہد بعہد کی ترقی و تبدیلی کا ذکر کیا گیا ہے مصنفہ مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی اے ملیگ قیمت دو روپے --

—— (مصنوعی بیوی) ——

مشہور هردلعزیز مغربی ناولسٹ آر ' ایچ 'پول کے ایک نہایت دلچسپ انگریزی ناول ' هزبیک بی لیو وائف' کا اردو ترجمہ مولوی از عباس حسین صاحب 'لطفی' قیمت ۱۲ آنے —

—— (خواتین انگورہ) ——

مولفۂ ملا توحیدی صاحب ۔ ترکی کی مشہور و معروف خواتین کے کارنامے ۔ اس کتاب سے آپ کو معلوم هوگا کہ موجودہ جد و جہد میں ترکی خواتین نے کس جوش اور قابلیت سے حصہ لیا ہے - قیمت ۱ روپیہ —

—— (جہاں آرا بیگم) ——

جہاں آرا بیگم بنت شاہجہان کی سوانح عمری جو نہایت مستند تاریخوں سے لکھی گئی ہے - مولفۂ مولوی ضیاءالدین احمد برنی صاحب بی - اے قیمت ۸ آنے —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

(دارالمصنفین اعظم گڑھ)

کتاب	قیمت
تاریخ فقه	۴ روپیه
خلفاے راشدین	۳ روپیه ۸ آنه
مهاجرین	۴ روپیه
سیرۃالنبی حصۂ اول	۴ روپیه
سیرۃالنبی حصۂ دوم	۳ روپیه ۸ آنه
سیرۃالنبی حصۂ سوم	۶ روپیه
شعرالعجم مکمل ۵ حصے	۱۳ روپیه
الکلام	۲ روپیه
اسوۂ صحابه مکمل دوحصے	۸ روپیه
انقلاب الامم	۲ روپیه
مکالمات برکلے	ڈیڑھ روپیه
سیرالصحابیات	۲ روپیه ۴ آنه
روح الاجتماع	۲ روپیه
ابن رشد	۳ روپیه
گل رعنا	۵ روپیه
سیرالانصار حصۂ اول	۳ روپیه ۸ آنه
سیرالانصار حصۂ دوم	۳ روپیه ۸ آنه
شعرالهند حصۂ اول	۴ روپیه
شعرالهند حصۂ دوم	۴ روپیه

(جامعه ملیه دهلی)

کتاب	قیمت
تاریخ نجد	۱ روپیه
عربوں کا تمدن	۲ روپیه ۸ آنے
تاریخ فلسفۂ اسلام	۳ روپیه
تاریخ الدولتین	۲.۰ روپیه
سیرۃالرسول	ڈیڑھ روپیه
خلافت راشده	۲ روپیه
خلافت بنی امیه	ڈیڑھ روپیه
	۲ روپیه
خلافت عباسیه	
خلافت عباسیۂ بغداد	۲ روپیه
خلافت عباسیۂ مصر	۲ روپیه
مبادی معاشیات	۱ روپیه
دنیاکے بسنے والے	۴ آنه
قواعد عربی	۲ روپیه
اسلامی تهذیب و قومی تعلیم	۴ آنه
ترکوں کی کهانیاں	۴ آنه
تاریخ هند قدیم	۱ روپیه

(الناظر پریس - لکهنؤ)

کتاب	قیمت
فسانه جوش	۱ روپیه
مجموعه قصائد مومن	۱۲ آنه
گوتم بده	۴ آنه
مسالک النظر فی نبوت	
سیدالبشر	۴ آنه
حکایۃ لیلی مجنوں	۴ آنه
مقتل فریب مغربی معمل خانے	۴ آنه
وکرم اُروسی	۱ روپیه ۸ آنه
فلسفیانه مضامین عبدالماجد صاحب	۱ روپیه ۸ آنه
تاریخ عرب مجلد	۷ روپیه ۸ آنے
موازنۂ انیس و دبیر	۳ روپیه
مقدمۂ شعر و شاعری	۱ روپیه ۴ آنه
اصول النسخ	۹ آنه
مسلمانان اندلس	۱ روپیه
اسرار رنگون	۱ روپیه
خوان دعوت	۱ روپیه
مصنوعی شوهر	۲ آنه

نوٹ کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں هیں—

الاحسان	٨ آنه
ارض نهرین	۴ آنه
حیات نظامی	۴ آنه
خطاب	۴ آنه
میلاد نبوی	۴ آنه
فریاد اُمت	۳ آنه

(نظامی پریس بدایوں)

قاموس المشاهیر جلد اول	۲ روپیه
قاموس المشاهیر جلد دوم	۲ روپیه
نکات غالب مجلد	۱ روپیه
دیوان غالب شرح مجلد	۲ روپیه ۸ آنه
دیوان جان صاحب مجلد	ڈیڑھ روپیه
دیوان درد	۱ روپیه ۴ آنه
دیوان غالب (البیرونی ایڈیشن)	ڈیڑھ روپیه
خطوط سر سید قسم اول	۳ روپیه
خطوط سر سید قسم دوم	۲ روپیه
اوٹھو گرانی مجلد	۲ روپیه ۸ آنه
انتخاب زرین مجلد	۲ روپیه
قصائد ذوق	۳ روپیه
مراثی انیس جلد اول مجلد	۱۰ روپیه
مراثی انیس جلد دوم قسم دوم	۸ روپیه

(تصانیف نورالهی و محمد عمر صاحبان)

موجودہ لندن کے اسرار	۱ روپیه

ناٹک ساگر (یعنی دنیائے ڈراما کی تاریخ)
مجلد ۳ روپیه غیر مجلد ۳ روپیه ۲ ۸ آنے

تین ٹوپیاں	۸ آنه
ظفر کی موت	۴ آنه
قزاق	۸ آنه
بگڑے دل	۸ آنه

نوٹ کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ھیں—

اردو

جلد ۹ — اپریل سنہ ۱۹۲۹ ع — حصہ ۳۴

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

مرزا نوشہ غالب کا آخری خط

دیگر از خویشم خبر نبود تکلف بر طرف
این قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

ہجوم غم سے فراغ نہیں - عبارت آرائی کا دماغ نہیں اگرچہ گوشہ نشین و خانماں خراب ہوں لیکن بحسب رابطہ ازلی کثیرالاحباب ہوں - اطراف و جوانب سے خطوط آتے ہیں اِدھر سے بھی ان کے جواب لکھے جاتے ہیں جو اشعار واسطے اصلاح کے آتے ہیں بعد اصلاح بھیجدیے جاتے ہیں —

ان صاحبوں میں سے اکثر ایسے ہیں کہ نہ میں نے انہیں نہ انہوں نے مجھے دیکھا ہے - محبت دلی و نسبت روحانی سہی لیکن صاحبان بلاد دور دست کیا جانیں میرا حال کیا ہے- ہفتاد و یک سالہ عمر کی کتاب میں سے فصل آخر کی حقیقت یہ ہے کہ دس پندرہ برس سے ضعف سامعہ اور قلت اشتہا میں مبتلا ہوا اور یہ دونوں علتیں روز افزوں رہیں - حسن حافظہ کا بطلان علاوہ، جوں جوں عمر بڑھتی گئی یہ امراض بھی بڑھتے گئے - قصہ مختصر اب سامعہ کا حال یہ ہے کہ ایک تختہ کاغذ کا مع دوات، قلم سامنے دھرا رہتا ہے، جو دوست آتے ہیں پرسش مزاج کے سوا

اور کچھ کہنا ہوتا ہے وہ لکھ دیتے ۔ میں ان کی تحریر کا جواب زبانی دیتا ہوں۔ غذا کی حقیقت یہ ہے کہ صبح کو آٹھ دس بادام کا شیرہ، دو پہر کو سیر بھر گوشت کا پانی، دو گھڑی دن رہے دو یا تین تلے ہوے کباب۔ نسیان حد سے گذر گیا، رعشہ، دوران و ضعف بصر یہ باران نو آمدہ سے ہیں۔ میر تقی مرحوم کا مطلع ورد زبان ہے —

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

خط بکس میں یا کتاب میں رکھ دیتا ہوں اور بھول جاتا ہوں آگے اپنے لیئے خط لکھتا تھا اب رعشہ یوں بھی نہیں لکھنے دیتا ۔

صاحب اکمل الاخبار اور صاحب اشرف الاخبار نے جو ہمیشہ مجھ سے ملتے جلتے رہتے ہیں اور میرا حال جانتے ہیں از روے مشاہدہ میرے کلام کی تصدیق کر کے اسی اعتذار کو اپنے اخبار میں چھاپا ہے ۔ کل دیگر صاحبان مطبع اور راقمان اخبار اگر اسی عبارت کو اپنے اخبار کے اوراق میں درج کریں گے تو فقیر ان کا احسانمند ہوگا ۔ اس نگارش کی شہرت سے مقصود یہ ہے کہ میرے احباب میرے حال سے اطلاع پائیں اگر خط کا جواب یا اصلاحی غزل دیر میں پہونچے تو تقاضا اور اگر نہ پہونچے تو شکایت نہ فرمائیں ۔ میں دوستوں کی خدمت گزاری میں کبھی قاصر نہیں رہا اور خوشی خوشنودی سے کام کرتا رہا جب بالکل نکما ہوگیا نہ حواس باقی نہ طاقت، پھر اب کیا کروں بقول خواجہ وزیر م :-

میں وفا کرتا ہوں لیکن دل وفا کرتا نہیں

اگر کسی صاحب کو میری طرف سے کچھ رنج و ملال ہو تو خالصاً لِلّٰہ معاف فرمائیں - اگر جوان ہوتا تو احباب سے دعاے صحت کا طلبگار ہوتا ، اب جو بوڑھا ہوں تو دعائے مغفرت کا خواہاں ہوں) —

غالب

[یہ خط ہمیں جناب صفدر مرزا پوری نے عنایت فرمایا ہے جس کے ہم بہت شکر گزار ہیں]—

مرزا غالب کی تصویر جو اس کے ساتھ دی گئی وہ دہلی کے عجائب خانے سے (جو قلعۂ معلی) میں ہے حاصل کی گئی ہے ہم جناب اشفاق علی صاحب سپرنٹنڈنٹ عجائب خانہ کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اس کی نقل دینے میں ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی - یہ تصویر مرزا غالب کے کسی ہم عصر مصور نے کھینچی ہے اور بالکل صحیح تصویر ہے اب تک جو تصویریں مرزا صاحب کی طبع ہوئی ہیں وہ زیادہ قابل اعتماد نہیں] -

دکھنی کا اثر شمالی ھند پر

از

(جناب مولوی سید محی الدین قادری صاحب 'زور')

[یہ مضمون اس پرچے کا پانچواں حصہ ہے جس کا خلاصہ اس سال "حیدرآباد کانفرنس" کے سالانہ اجلاس میں (بمقام ہوں لے ان ٹیمز - انگلستان) دکھنی زبان اور "ادب" پر پڑھا گیا تھا اور جو حسب ذیل سات حصوں پر منقسم ہے - (۱) دکھنی کا آغاز (۲) شمالی اور دکھنی ہندلسانیوں کی علیحدگی (۳) شمالی اور دکھنی کے اختلافات کا آغاز اور اس کے نتائج (۴) دکھنی کا عہد زرین (۵) دکھنی کا اثر شمالی ھند پر (۶) دکن میں دکھنی کی بے وقعتی (۷) دکھنی کا مستقبل] —

اورنگ زیب کی فتح دکن کے بعد جب کچھہ عرصے کے لئے شمال اور دکن میں ملاپ ہوگیا اور دکن کے لوگ شمال اور شمال کے دکن آنے جانے لگے تو دونوں کو اپنی زبانوں کے اختلاف کا احساس ہوا - لیکن چونکہ دکن والوں نے اس میں خاصہ ادبی کام کیا تھا، شمال والوں نے معلوم کیا کہ ہم اس بارے میں دکن سے بہت پیچھے ہیں - وہاں کسی شخص نے بھی بول چال کی زبان میں شعر شاعری کی طرف توجہ نہیں کی تھی اور جو ایک دو مثالیں ملتی ہیں انہیں اُس زمانے کے قدیم تذکرہ نویس سنجیدہ اور صحیح شاعری کا نمونہ نہیں سمجھتے، بلکہ کہتے

هیں کہ تفنن کے طور پر لکھے گئے تھے —

مرزا معز موسوی خاں فطرت، اورنگ زیب کے زمانے کے ایک فارسی شاعر تھے، ان کا یہ اُردو شعر تذکروں میں ملتا ہے۔

از زلف سیاہ تو بدل دوم پڑی ہے — در خانہ آئینہ گٹا جوم پڑی ہے

مرزا معز کے ساتھ ایک اور شاعر قزلباش خاں 'امید' کے بھی اردو شعر ملتے ہیں جس کا ایک نمونہ یہ ہے —

باسن کی بیٹی آج مری انگدموں پڑی — غصہ کیا و گالی دیا اور دگر لڑی

اس قسم کے شعروں کے علاوہ اورنگ زیب کے زمانے کے چند اور اردو شعر بھی ملتے ہیں جو جعفر علی (زٹلی) کی تصنیف ہیں۔ یہ زیادہ تر فحش ہیں تاہم کتب خانۂ انڈیا آفس (لندن) کے ایک مخطوطہ میں بعض ایسے بھی پائے گئے ہیں جنہیں کوئی سنجیدہ کہہ سکتا ہے۔ ان کی چند مثالیں ہم یہاں درج کرتے ہیں تاکہ دکن کے اثر سے پہلے کی اردو شاعری کی نوعیت معلوم ہو سکے —

اورنگ زیب کی مدح میں لکھا ہے —

زہے دھاک اورنگ شاہ ولی — در اقلیم دکھن پڑی کھل بلی
دریں پیر سال و ضعیف بدن — مچائی دھما چو کڑی در دکھن
زہے شاہ شاہان کہ گاہ وغا — نہ ھاد نہ آاد نہ جنبد زجائے
برآورد لشکر بسا دھوم دھام — کہ ھل چل پڑی بر سر روم و شام
مہا سور جودھا بلی بے بدل — چو البرز قایم چو پربت اٹل

اورنگ زیب کی وفات کا مرثیہ —

اکل بے کل ھوا سنسار سارا — بخوں طیار شد مریخ تارا
کہاں اب پائیے ایسا شہنشاہ — مکمل اکمل و کامل دل آگاہ
صدائے توپ و بندوق است ہرسو — چھٹتا چھٹ و پھٹتا پھٹ است ہرسو
بہر سو مار مار و دھاڑ است — اچھل چال و تبر خنجر گذار است

غرض شمال کے اہل سخن کو دکھنی ادب سے مرعوب ہونا پڑا اور چونکہ اس اثنا میں

۱ - وہ فارسی شاعری کی تقلید سے اُکتا گئے تھے ' ایک غیر ملک کی زبان میں کمال حاصل کرنے کے لئے انھیں خاصی محنتیں کرنی پڑتی تھیں اور اس کے بعد بھی وہ ایرانی شاعروں کے مقابلے میں خود کو ہمیشہ کمزور پاتے تھے - ساتھ ہی چونکہ فارسی ان کی اپنی زبان نہ رہی تھی وہ اپنی طرف سے ادائے خیال کے نئے نئے طریقے اختیار کرنے سے قاصر تھے - انھیں ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہ کہیں ایرانی استاد اُن کی شاعری کو غلط نہ قرار دیں - چنانچہ اس زمانے میں محاوروں وغیرہ کے استعمال پر اکثر ایرانی اور ہندوستانی شاعروں میں جھگڑے رہتے تھے جن کی مثالیں قدیم تذکروں میں کثرت سے موجود ہیں --

۲ - فارسی کی قدر کرنے والی سلطنتیں کمزور ہوتی جارہی تھیں ' خود حکمران شاعر نہیں تھے ' اورنہ سیاسی کمزوریوں کی وجہ سے شاعروں کی قدر کرنے کے قابل رہے تھے - اگر اکبر کے درباری امیروں کی طرح اورنگ زیب اور اس کے بعد کے امیر فارسی شاعروں کی خاطر خواہ قدر کرتے تو بہت ممکن تھا کہ فارسی پھر کچھ زمانے کے لئے چل نکلتی --

۳ - چونکہ فارسی میں ہندوستانی شاعروں کے لئے خیالات ادا کرنے کے لئے نئے طریقے مسدود تھے اور اس کے علاوہ اس میں اپنی مقامی خصوصیات اور فطری حالات کو بے دھڑک ظاہر کرنا معیوب سمجھتے تھے اس لئے وہ فطرتاً کسی ایسی چیز کے متلاشی تھے جس کے ذریعے سے وہ بے تکلفی کے ساتھ اپنے مطالب ادا کر سکیں --

چنانچہ جب انھوں نے دکھنی کو دیکھا جو ان کے لئے فارسی سے زیادہ قریب تھی اور جن کے ذریعے سے ان کی تمام فطری خواہشیں پوری ہو سکتی تھیں تو فارسی کو چھوڑنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ اس سے اس قدر بیزار ہو گئے اور

حقارت کی نظروں سے دیکھنا شروع کیا کہ جب کوئی سودا یا میر جیسا بڑا شاعر فارسی میں لکھتا تو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے رتبے سے اتر کر یہ کام کر رہا ہے —

شمالی ہند میں ریختہ گوئی کی ابتدا اور فارسی کے ترک کرنے کا سبب میر نے شاعرانہ طریقے سے بڑا پراطف پیش کیا ہے - وہ کہتے ہیں —

خوگر نہیں کچھ یو نہیں ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اس زمانے میں جو دکھنی شاعر شمال گئے ان کی ٹھیک مقدار فی الحال نہیں معلوم کی جا سکتی - اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کافی مقدار وہاں گئی تھی - چنانچہ صرف ایک ' مصحفی ' کے تذکرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ چودہ پندرہ دکھنی شاعر شمال آئے تھے - جہاں انھوں نے خاصی قدر و منزلت حاصل کی - اس کا ثبوت تذکرہ اعظم الدولہ ' سرور ' سے بھی حاصل ہوتا ہے —

' مصحفی ' کے تذکرے سے تیس کے قریب شمالی ہند کے ایسے شاعروں کے نام ملتے ہیں جو دکھن گئے تھے - اگر اس زمانے کے اور تذکروں کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے تو یقین ہے ' کہ اس مقدار میں اور بھی اضافہ ہو سکے گا - تاہم یہاں اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شمالی ہند میں شاعروں کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں سے جتنے بھی اس وقت تک نظر سے گذرے ہیں ان میں ڈیڑھ سو کے قریب ایسے شاعروں کے نام ملتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح دکھن سے تعلق رکھتے ہیں —

یہ تو شاعروں کا ذکر تھا ' اُس زمانے میں دکن کے بہت سے ایسے لوگ بھی شمال گئے جو شاعر نہیں بلکہ اہل ذوق تھے - یہ لوگ دکھنی کی بہت سی کتابیں

اپنے ساتھ شمال لے گئے - چنانچہ تھوڑے ھی عرصے میں شاھان اودھ کے کتب خانوں میں دکھنی کی اچھی خاصی کتابیں جمع ھوگئیں جن سے ظاھر ھوتا ھے کہ کس قدر جلد دکھنی ادب شمال میں مقبول ھوگیا تھا کہ اُس کے بعض اجزا شاھی کتب خانوں تک بھی پہونچ سکے - اس کا ثبوت اس طرح سے بھی ملتا ھے کہ یورپ کے مختلف کتب خانوں میں جو قدیم دکھنی مخطوطے ھیں اُن میں بعض ایسے بھی ھیں جن کے کاتب شمالی ھند کے باشندے تھے اور جنھوں نے وھیں محمد شاہ کے ابتدائی زمانے میں ان دکھنی کتابوں کو نقل کیا تھا —

قدیم تذکروں سے یہ بھی معلوم ھوتا ھے کہ دھلی کی مجلسوں میں دکھنیوں کے اشعار عام طور پر قدر کی نگاھوں سے دیکھے جاتے تھے - لوگ دکھنی شاعروں کی اتنی آوبھگت کرتے تھے کہ انھیں ایک دفعہ سے زیادہ وھاں جانے کی خوھش رھتی تھی - ولی نے تین دفعہ سے زیادہ دھلی کا سفر کیا اور پھر بھی جی نھیں بھرا - وہ ایک جگہ پکار اٹھتے ھیں کہ —

دل 'ولی' کا لے لیا دلی نے چھین　　جا کہو کوئی محمد شـاہ سوں

دھلی کے شاعر ولی کی غزلوں پر غزلیں لکھنا باعث کمال سمجھتے تھے - اور اُنھی کے مشورے سے اپنے مشاعروں کے لئے مصرع طرح حاصل کرتے تھے - اگر چہ اب شمال کے اُس زمانے کے شاعروں کے کلام عام طور پر دستیاب نھیں ھوتے تا ھم دیوان زادۂ حاتم سے (جو اس زمانہ کی تنھا یادگار ھے اور جس کا ایک نفیس بلکہ اصلی نسخہ اس وقت انڈیا آفس میں محفوظ ھے) اس کی شھادت ملتی ھے - خود دیباچے میں 'حاتم' نے ' ولی ' کی استادی کا ذکر کردیا ھے اور لکھا ھے کہ میں انھیں کی طرز پر لکھتا ھوں - اس کے علاوہ اشعار میں متعدد جگہ ولی کی استادی کا اعتراف کرتے ھیں - اُن کے موجودہ مختصر سے انتخاب میں بھی تیرہ غزلیں ایسی ھیں جن پر صراحت سے لکھدیا ھے کہ ' ولی ' کی طرز اور تقلید میں لکھی گئی ھیں - بعض شعروں میں وہ ' ولی ' سے مخاطب بھی ھیں جن سے ظاھر ھوتا ھے کہ وہ ' ولی '

کی موجودگی ہی میں لکھے گئے ہیں —

تذکرہ قاسم (مخطوطہ انڈیا آفس) میں 'ولی' کی تعریف کرنے کے بعد اُس زمانے کے ایک شاعر کا مصرعہ اپنے خیالات کی شہادت کے طور پر نقل کیا گیا ہے - لکھا ہے :-

" پیرخان' کمترین' کہ خدایش بیا مرزد بسیار بہ موقع و بجا گفتہ کہ

" ولی پر جو سخن لاوے اُسے شیطان کہتے ہیں "

معلوم ہوتا ہے کہ اول اول شمال کے فارسی شاعروں نے 'ولی' کی مخالفت بھی کی تھی - چنانچہ ناصر علی کے متعلق 'ولی' لکھتے ہیں —

اُچھل کر جا پڑے جوں مصرع برق اگر مطلع لکھوں ناصر علی کوں

اُسی زمانے کے ایک اور تذکرے میں (یعنے تذکرہ ' بے جگر' جس کا مخطوط - جو غالباً مصنف ہی کا مسودہ ہے - انڈیا آفس (لنڈن) میں موجود ہے) ولی کی نسبت لکھا ہے :—

" در حقیقت کسے کہ اسپ در میدان ہندی دوایند آں بود و فی‌الواقع شخصے کہ آپ رفتہ باز در جوے ایں زبان ہندی رسایند ' ہماں بود - چوں در سنہ اثنا جلوس محمد شاہی دیوان او بدہلی رسید موزوں طبعاں بلند فکر و عالی‌تلاشان ہمعصر مثل حاتم و آبرو و فغاں وغیرہ بہ تبتع زبانش پیرو و ہمزباں شدند " —

ایک اور تذکرہ " طبقات سخن " میں ' آبرو ' کے ذکر میں لکھا ہے کہ :—

" چوں دیوان ہندی شاہ ولی‌اللہ گجراتی بہ عصر محمد شاہ بدہلی رسید تتبع آں شد "

' مصحفی ' نے اپنے تذکرے میں خود حاتم کا قول اُن کے ذکر میں نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ 'ولی' کا کلام دہلی میں بے حد مقبول ہوگیا تھا وہ کہتے ہیں:-

" روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سنہ دویم فردوس

آرام‌گاہ دیوان ' ولی ' در شاہجہاں‌آباد آمدہ ' و اشعارش
بر زبان خوردو بزرگ جاری گشتہ ' بادوسہ کس کہ مراد از
' ناجی ' و مضمون و ' مضمون ' و ' آبرو ' باشد 'بنائے شعر
ہندی را بایہام گوئی نہادہ داد معنی یابی و تلاش
مضامین تازہ میدادیم " —

' ولی ' کے علاوہ جن دکھنیوں نے دلی میں شہرت حاصل کی اُن میں فقیراللہ ' آزاد ' اور ' فراقی ' دکھنی بھی شامل ھیں - میر حسن اپنے تذکرے کے آغاز میں یہ لکھنے کے بعد کہ :—

" باید دانست کہ ریختہ اول از زبان دکھنی است "

فقیراللہ آزاد کا حال لکھتے ھیں اور پھر اُس کی شاعری کی تعریف یوں کرتے ھیں :—

" ھمراہ فراقی دکھنی در شاہجہاں اباد آمدہ بود ' طبع
درد مندے داشت ' و بسیار بہ صفا حرف می زند -
خدا یش بیامرزد "

غرض شمال والوں نے بہت جلد فارسی شاعری کو ترک کردیا اور دکھنیوں کی تقلید شروع کی - اُن کے شاعروں کو استاد مانا ' اُن کی غزلوں پر غزلیں لکھیں ' اور حتی‌الامکان اس بات کی کوشش کی کہ دکنی زبان اور محاورے میں شاعری کریں اور نہ صرف یہی ' جو شخص دکھنی طرز کے خلاف لکھتا اس کو زجرو توبیخ کی جاتی اور اُس کی شاعری غلط سمجھی جاتی - چنانچہ اُس زمانے کے ایک مشہور دھلوی شاعر ...... شاہ مبارک ' آبرو ' ...... نے اس کے متعلق جو نصیحت کی تھی اس کو حاتم نے اپنے " دیوان زادہ " کے دیباچے میں نقل کیا ھے :—

وقت جن کا ریختہ کی شاعری میں صرف ھے
ان ستی کہتا ھوں بوجھو صرف میرا ژرف ھے

جو کہ لاوے ریختہ میں فارسی کے فعل و حرف
لغو ہیں گے فعل، اُس کے ریختہ میں حرف ہے

دکھنی اثر کے بعد شمال میں جن ہندو اور مسلمان شاعروں نے فارسی شاعری ترک کرکے فوراً دکھنی طرز میں شروع کردی اُن کی تعداد خاصی ہے اور تذکروں میں جن کے متعلق خاصہ مواد موجود ہے --

لیکن شمال والوں کا یہ رجحان زیادہ دیر تک نہیں قائم رہ سکا - دکھنی بھی فارسی کی طرح اُن کی اپنی زبان نہ تھی - اُس میں بھی خیال ادا کرنے کے لئے اُنھیں تکلف کرنا پڑتا تھا - اب انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنی مادری اور بول چال کی زبان میں فارسی اجزا ملاکر شاعری کریں - اگرچہ پہلے پہلے بعضوں نے اس کی مخالفت بھی کی لیکن چونکہ یہاں کے لئے فطری چیز تھی وہ اس تبدیلی میں کامیاب ہوگئے اور بہت جلد اردوے معلی کی زبان میں شعر و شاعری شروع ہوگئی۔ اس کا آغاز 'مظہر' نے کیا اور اس کی ترقی 'ناسخ' کے زمانے تک جاری رہی - اس تبدیلی کا ذکر 'حاتم' نے جن کو شمال میں دکھنی کے عروج اور زوال دونوں کا دیکھنا نصیب ہوا تھا، اپنے دیوان کے دیباچے میں وضاحت سے بیان کردیا ہے کہ :-

''دریں ولا این تربیت طلب از دہ دوازدہ سال .... اکثر الفاظ را از نظر انداختہ لسان عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد، و روزمرۂ دھلی کہ میرزایان ہند و فصیح گویان اند در محاورہ دارند منظور دانستہ۔ سوائے آن، زبان ہر دیار تا بہندوی کہ آن را بھاکا گویند موقوف نمودہ، فقط روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند بود اختیار کردہ''۔

اور اس کے بعد لکھا ہے کہ اس انتخاب میں قدیم (دکھنی) طرز کے اشعار میں نے نہیں درج کئے ہیں، اگر کوئی ملیں تو مجھے معاف کیجئے -

اس تبدیلی کو بعض لوگوں نے پسند نہیں کیا - تذکرہ مخزن نکات میں خود

قایم نے جن کا ایک شعر ریختے کو دکھنی زبان کی ایک اچر سی بات ظاہر کرنے میں مشہور ہے اور جو آئندہ نقل کیا جائے گا، اس تبدیلی کے متعلق اپنے خیالات کا جس طرح اظہار کیا ہے وہ قابل عفو ہیں - وہ پہلے ان شاعروں کے نقائص اس طرح ظاہر کرتے ہیں جنہوں نے دکھنی کی تقلید کا آغاز کیا تھا -

"بر شناساے سلوک سخن مخفی و محتجب نیست که از عہد عبدالله قطب شاہ گرفته تا زمانهٔ بہادر شاہ (اول) کسانے که شعر ریخته گفته اند نسق کلام این ها بسیار مربوط و معقول است - هر چند اکثر الفاظ غیر مانوس گوش ما مردم مستعمل ایشان است لیکن چونکه موافق زبان دکھن راست و راست است پیش همه کس راه بده دارد - و نه این ستم که بعضے از شعراے ابتداے زمانهٔ محمد شاہ باعتقاد خود تلاش الفاظ تازه و ایہام نموده شعر را از مرتبه بلاغت انداختند تا بمعنی چه رسد - غرض نا گفته به ، مصرعه، "خطاے بزرگان گرفتن خطا است"-

طبقه دوم کے شاعروں مثلاً 'حاتم' و 'ناجی' و 'مظہر' کے ذکر کے بعد طبقه سوم یعنے میر، سودا اور سوز وغیرہ کا ذکر شروع کرنے سے پہلے ان کے فارسی کی طرف توجه کرنے کی نسبت حسب ذیل خیالات کا اظہار کرتے ہیں :-

'مخفی و محتجب نماند که انچه الحال اشعار و احوال شعراے متاخرین نوشته می آید طرز کلام این‌ها مانا بروبه شعر فارسی است - چنانچه جمیع صنایع شعری قرار دادهٔ اساتذه اسلاف است بکار می برند و اکثرے از ترکیبات فرس که موافق محاوره اردوے معلیٰ مانوس گوش می نمایند جوازالانیان* (۹)

---

* جوازالبیان (اڈیٹر)

می دانند - الا ترجمه زبان مغل به ریختہ کردن مفہوم است چه درین صورت صحت زبان یکے از هر دو نمی ماند - اگر بعضے از اصطلاح که زبان زد مردم فصحاے این دیار بود کردہ آمد چندان مضائقه ندارد - اما اتباع و تقلید کسان طبقهٔاولی که یک مصرعۂ شان ریختہ و دیگرے فارسی است و در بعضے مقام ریختہ و فارسی را بالغاظ غیر مانوس مخلوط هم مذموم ساخته محض می نگارند - بهر حال حواله این مبحث طویل الذیل موقوف بر سلیقۂ شاعر باید نمود - بیش ازین بر صداع ساسان نباید افزود که اگر در خانه کس است اشارتے هم بس است'' -

مظہر نے جو دکھنی اثر کو دور کرکے فارسی آمیز زبان میں شاعری شروع کی اس کے بہت سے ثبوت تذکروں میں ملتے ہیں جن کا تفصیلی بیان 'مظہر' کی شاعری کے ذکر میں کسی اور موقع پر کیا جائے گا - یہاں اس امر کا اظہار غالباً ضروری ہے کہ دکھنی کے رواج کی طرح دکھنی کا رد عمل بھی بڑی سرعت سے شروع ہوگیا - شمال والوں کو دکھنی اثر کے زایل کرنے میں جلد کامیابی اس لئے بھی حاصل ہو گئی کہ اس کو زایل کرکے شمال کے روز مرہ میں شاعری کرنے کی کوشش میں حصہ لینے والے 'میر' 'سودا' اور 'قایم' جیسے بڑے بڑے شاعر بھی تھے - چنانچہ ان تینوں کے بعض وہ شعر ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں جن میں اس امر کی طرف اشارے ہیں —

'سودا' :-

کبھی تھا ریختہ کہنے کو عیب ناداں بھی
سویوں کہا میں کہ دانا ہنر لگا کہنے
یسان مہر یہ روشن ہے سارے عالم پر
جہاں میں جیسے کہ میں شعر تر لگا کہنے

سخن کو ریختے کے پوچھے تھا کو ئی 'سودا'
پسند خاطر دلہا ہوا یہ فن مجھہ سے
کب اس کو گوش کرے تھا جہاں میں اهل کمال
یہ سنگ ریزہ ہوا ہے در عدن مجھہ سے

'میر' :- دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو هنر سے
ریختہ کا ہے کو تھا اس رتبۂ عالی میں 'میر'
جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا

'قایم' :- 'قایم' میں ریختہ کو دیا خلعت قبول
ورنہ یہ پیش اهل سخن کیا کمال تھا
'قایم' میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی

اُردو کا ایک سندھی شاعر

از

(جناب محمود احمد صاحب عباسی)

سندھ کے سفر کا یوں تو پہلے بھی کئی مرتبہ مجھے اتفاق ہوا تھا' پرانی بستیوں کی سیر بھی کی تھی اور آثار قدیمہ کی زیارت بھی' لیکن ٹھٹھہ اس مرتبہ سے پہلے کبھی نہ جاسکا تھا - اب جو کراچی کا سفر پیش آیا' واپسی میں ٹھٹہ بھی جانا ہوا - صوبۂ سندھ میں شاید یہ سب سے زیادہ قدیم بستی ہے ' کراچی سے اس طرف تقریباً ۶۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے —

پہلی صدی ہجری کے آخر میں محمد بن قاسم ثقفی نے جب سندھ فتح کیا ہے تو غالباً سنہ ۹۴ ھ میں ٹھٹہ پر قبضہ ہوا .... اسلامی تسلط کے بعد ہی سے یہ شہر اسلامی علوم اور تمدن کا گہوارہ رہا - بڑے بڑے صاحب کمال' علما و فضلا' محدثین و مصنفین اس کی خاک سے اٹھے - جس طرح عربی کتابوں میں 'کچھہ' کو 'قصہ' 'بھروچ' کو 'بروص' لکھا گیا ہے اس کا نام بھی عربی کتابوں میں آپ کو ططہ یا ططا اور فارسی کتب میں تتہ یا تہتہا لکھا ہوا ملے گا - جن محدثین و مصنفین کے ناموں کے ساتھہ قدیم کتب تاریخ وغیرہ میں طھطاوی یا تتوی آپ کو ملتے ہیں وہ اسی ٹھٹہ کی سکونت کا پتہ دیتے ہیں —

آج ٹھٹھہ اگرچہ ایک چھوٹے سے قصبے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اپنے زمانہ عروج میں یہ بہت بڑا اور مشہور شہر' مختلف حکمران خاندانوں کا پایہ تخت

اور علما و فضلا کا مسکن تھا - اب تو دریاے سندھ بھی بستی سے کئی میل کے فاصلے پر بہتا ہے لیکن آثار بتاتے ہیں کہ چند صدی پیشتر آبادی سے بالکل متصل موجیں مارتا تھا جس سے اُس زمانے کے مقام آبادی کی رونق اور باغات کی سرسبزی و شادابی دوبالا ہوگی —

تھٹہ سے زیادہ سندھ کے کسی اور مقام پر شاید اس کثرت سے آثار قدیمہ نہ ہوں گے - کوہ مکلی آبادی سے متصل ایک مرتفع پہاڑی مقام ہے، جس کا سلسلہ میلوں تک چلا گیا ہے - یہ مقام آثار قدیمہ کے شائقین کا زیارت گاہ اور چشم بینا کے لئے عبرت پذیری کا نہایت متاثر کن موقع ہے - قبروں، تربتوں اور مقبروں کا کوسوں تک ایک شہر خموشاں بسا ہوا ہے - فن تعمیر، سنگ تراشی اور کاشی کے کام (Encaustic tiles) کے، جس کے لئے سندھ مشہور ہے، یہاں اچھے نمونے ملتے ہیں- سندھی زبان میں مکلی کے لغوی معنی "مکہ خورد" کے ہیں، اس کا دور چھہ میل سے کم نہیں، عام شہرت کے اعتبار سے اس شہر خموشاں کے ساکنین کی تعداد ایک لاکھہ سے زائد ہے - چوتھی صدی ہجری تک کی قبر تو نظر سے گذری، معلوم نہیں کون کون اور کیسے کیسے ارباب فضل و کمال، صاحبان تاج و تخت یہاں منتظر نفخ صور ہیں، بعض کے سنگ تعویذ پر نام کندہ ہیں، بعض کے مقبرے عالیشان ہیں لیکن اکثر گمنام و بے نشان - ان میں ایک مقبرہ حضرت سید محمد حسین المعروف بہ مردان شاہ بن سید محمد الحسینی الشیرازی المتوفی سنہ ۸۹۳ ھ کا ہے جن کے اخلاف میں اردو کے ایک سندھی شاعر سید ضیاءالدین متخلص بہ 'ضیا' کا کچھہ نمونۂ کلام قارئین اردو کی ضیافت طبع کے لئے ذیل میں درج کیا جاتا ہے —

سید ضیاءالدین 'ضیا' گیارھویں صدی ہجری کے اوائل میں سادات تھٹہ کے ایسے خاندان میں پیدا ہوے جو خوش حالی و فارغ البالی کے ساتھہ دولت علم و فضل سے بھی مالا مال تھا - میر علی شیر قانع مصنف تحفۃالکرام جو اس زمانے کے ایک مشہور مصنف تھے اور جن کی مختلف تصانیف کی تعداد ۴۲ تک بتائی جاتی ہے،

ضیاء کے برادر عمزاد تھے - خاندانی رواج کے مطابق ضیاء نے عربی فارسی کی مروجہ تعلیم پائی - طبیعت کو شعر سے مناسبت تھی فارسی میں مشق سخن کرنے لگے - "دیوان ھندی" کے دیباچے میں خود فرماتے ھیں :-

"فقیر اضعف العباد ضیاء الدین المتخلص به 'ضیا' ولد سید عزت اللہ شیرازی ساکن بلدہ تھتھا ...... از دیوان غزلیات در زبان فارسی و قصائد و مناقب بسیار که هنوز اورا ترتیب دیوان نداده و یک مثنوی در عشقیه رانجهن وهیر تصنیف کرده در حضور گزرانیده* بالفعل دیوان بزبان هندی تصنیف نموده الخ" —

'ضیاء' کے کلام اور تحریرات سے معلوم ھوتا ھے که وہ میران سندہ میں سے میر تہارہ خاں کے درباری شاعر تھے اکثر غزلوں تک میں کوئی نہ کوئی شعر اس کی تعریف میں ضرور ھوتا ھے۔ اپنا یہ "دیوان ھندی" بھی میر موصوف کے حضور میں پیش کیا ھے - ان کا یہ دیوان ھندی غزلیات، مستزاد، ترجیع بند، قصائد، مخمس، مسدس وغیرہ پر مشتمل ھے - تاریخ اتمام گیارھویں صدی کے آخری سنین ھے - ضیاء کے کلام میں کوئی خاص ندرت، چاشنی یا سلاست نہیں، زبان بھی اسی عہد کی زبان ھے، متروک اور ثقیل الفاظ بھی کثرت سے ھیں لیکن اس اعتبار سے کہ دو ڈھائی صدی پیشتر اردو زبان کا سکہ سندہ جیسے دور دراز صوبے میں بھی چلتا تھا اور ایک سندھی نژاد شاھجہان آباد دھلی کی پرورش یافتہ زبان میں کلام موزوں کرتا ھے ضرور قابل قدر ھے - نمونہ کلام ملاحظہ ھو لیکن یہ اشعار میں نے سرسری طور سے لکھ لئے تھے، انتخاب میں کوئی خاص کوشش نہیں کی —

آج گلشن میں نو بہار آیا | مت کہو کس کوں اپنا یار آیا

---

* مراد میر تہارہ خاں میر سندہ سے ھے —

کس کی طاقت نہیں ھے دیکھے اسے   جن نے دیکھا ھے ' بیقرار آ یا
عشق بازوں میں بے نظیر ھے گا   مثل فرھاد شیریں کار آ یا
نام ھے گا دو جگ میں اس کا بلند   حسن کے بن میں شہسوار آ یا
نے فراموش ھے گا دل سوں وہ   نام اس کا جو یاد کار آ یا
کشور حسن کا ھے منصب دار   زلف کے دیس کا فوجدار آ یا
نظم روشن ' ضیاء ' کا معنی سنج
گوھر حرت آبدار آ یا

(دیگر)

رات دلبر کو خواب میں دیکھا   جلوہ تھا ماھتاب میں دیکھا
دن سا روشن دو جگ میں ھو گا عیاں   ذرہ سا آفتاب میں دیکھا
ھے گی اس کی حدیث طولانی   نسخۂ انتخاب میں دیکھا
جو کیا ھوں سوال خرت اس سے   معنی اس کا جواب میں دیکھا
ھوں پریشان مو بمو اس کا   زلف کو پیچ و تاب میں دیکھا
مصحف روے اس سے نکلی فال   حال دل کا کتاب میں دیکھا
بیخودی دل کی ذوق بہ مستی   نشہ اس کا شراب میں دیکھا
نور از جبہ میر تہارہ خان*   جلوہ گر ماھتاب میں دیکھا
شیخ سب ھیں 'ضیاء' جو دیتا کے
معنیٔ حق بو تراب میں دیکھا

(دیگر)

خاموش کیا بلبل از نالۂ جانکاہ   گلشن میں ھوا شور کسی غنچہ دھاں کا
باریک ھوا برگ سمن کا زخجالت   جب ذکر ھوا اسکے کبھو ھوئے میاں کا

---

* نام والیٔ سلدہ —

ہر وقت ضیا رنگ دگر دور جہاں کا | یکجا ہے کہاں فصل بہار اور خزاں کا

(دیگر)

عشق کی رہ میں جو کہ باز ہوا | آ کے عشاق سر فراز ہوا
ہو کے پروانہ سان بمحفل راز | شمع مانند ' جان گداز ہوا
عاشقان جان نثار کی تعریف | روح مجنوں چارہ ساز ہوا
ہے وہ خلوت نشین محفل قدس | عاشقاں میں جو با نیاز ہوا
بہرہ ور ہے گا عیشق کی رہ میں | جیو نکہ محمود یا ایاز ہوا

عطار

از

(جناب سید حسن برنی صاحب بی اے - ال ال بی)

[یہ فرانسیسی مشرق کرادے وو (Carra De Vaux) کی کتاب محققین اسلام (Les Penseurs de Islam) سے چوتھا مضمون ہے جو ہم نے رسالہ اردو کے لئے براہ راست فرانسیسی زبان سے ترجمہ کیا ہے - اس سے پیشتر خیام ، حافظ اور سعدی پر جو مضامین شایع ہو چکے ہیں ناظرین کی نظر سے گذر چکے ہیں - ہمیں امید ہے کہ یہ مضمون بھی ان سے کم مفید و دلچسپ ثابت نہ ہو گا —

عام طور پر عطار کی تصانیف کے متعلق مصنفین کے بیانات میں سخت اختلافات پائے جاتے ہیں - ہمارے فاضل دوست پروفیسر محمود خاں صاحب شیرانی نے اپنے مبسوط اور عالمانہ مقالہ ''تصانیف فرید الدین عطار'' مطبوعہ جلد ۷ حصہ ۲۵ رسالہ اردو بابت جنوری سنہ ۱۹۲۷ ع میں کامل تحقیقات کے بعد دکھایا ہے کہ بہت سی کتابیں جو فی الواقع دوسروں کی لکھی ہوئی ہیں غلطی سے عطار کے نام سے منسوب ہو کر اس کی کلیات میں شامل ہو گئی اور اس کے نام سے شہرت اور رواج پاگئی ہیں —

پروفیسر صاحب موصوف کا یہ خیال البتہ صحیح نہیں ہے کہ ''شیخ عطار کا کلام خود ان کے اپنے زمانہ میں مدون نہیں ہوا تھا'' —

خوش قسمتی سے ہمارے ہاتھ میں خود عطار کا بیان اس کے متعلق

موجود ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عطار نے اپنی حیات ہی میں اپنا ہر قسم کا کلام مدون کردیا تھا —

ہمارے کتب خانہ میں کلیات عطار کا ایک مکمل نسخہ محفوظ ہے، جس میں ہمارے خیال میں عطار کی تمام صحیح اور حقیقی تصنیفات شامل ہیں - اور برخلاف اکثر دیگر متداول مجموعوں کے اس مجموعے میں کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو فی الواقع عطار کی تصنیف سے نہ ہو یہ نسخہ نہایت اہتمام سے لکھا گیا اور شاندار اور قیمتی لوحوں اور خوشنما سنہری جدولوں سے آراستہ ہے - دیوان کے اخیر میں کاتب کا نام فیروز محمد بن سلیمان ساکن احمدآباد تحریر ہے اور سر ورق پر کسی صاحب نے اپنی خرید کی تاریخ سنہ ۱۰۲۲ ھ لکھی ہے - نسخے میں سنہ کتابت کہیں درج نہیں ہے، لیکن رسم الخط کو مد نظر رکھتے ہوے دسویں صدی ہجری کے شروع زمانہ کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے —

اس مجموعہ کی ترتیب اس طرح پر ہے :—

(۱) تذکرۃالاولیاء جلد اول - (۲) تذکرۃالاولیاء جلد دوم - (۳) اسرار نامہ (۴) الہی نامہ (۵) منطق الطیر (۶) مصیبت نامہ (۷) خسرو و گل (۸)دیوان (۹) مختار نامہ —

اس مجموعے کے علاوہ ہمارے کتب خانے میں مختارنامہ کا ایک دوسرا نسخہ جو "رباعیات عطار" کے نام سے موسوم ہے، موجود ہے - مقابلہ کرنے سے معلوم ہوا کہ مختار نامہ کے دونوں نسخے با ہم موافق نہیں ہیں "رباعیات" کے نسخے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عطار نے ردوبدل اور اضافے کے بعد مختار نامہ کو دوبارہ ترتیب دیا تھا —

مختار نامہ کے دونوں نسخوں کے شروع میں دیباچۂ نثر پایا جاتا ہے جس میں عطار نے اپنی تصانیف کی ترتیب و تدوین بیان کی ہے - "رباعیات" کا پہلا صفحہ تلف ہوگیا ہے، لیکن خوش قسمتی سے وہ کلام جہاں تصانیف کا ذکر آتا ہے محفوظ ہے —

نسخه مختار نامه مشموله کلیات

" اما بعد جمع از صدقاے مخلص
واحباے همدم و موافقاں هم نشیں
و قریباں دوربیں که چوں آفتاب
دل روشن داشتند و چوں صبح
نفس از سر صدق می زدند ' و چوں
آیینه روے صافی می نمودند التماس
کردند که چوں سلطنت خسرونامه '
در عالم ظاهر گشت ' و ' اسرارنامه '
در جهاں منکشف شد ' و ' منطق
الطیر ' بزبان مرغان الهی بمحل
ناطقه رسید و بصیت مصیبت‌نامه '
از حدود غایت در گذشت و ضابطۀ
شناختن ' جواهر نامه ' و دیوان تمام
دانسته اند (آمد) و ' جواهر نامه
و ' شرح القلب که هردو کسوت نظم
پوشیده حرف علت بداں راه نیافت
و ابیاتے که در دیوان است بسیار
است و ضبط آں دشوار و از زهور
تربیت (زهور ترتیب) عطل هرچند
ترکیب آرد (دارد) تزیین ندارد و
وجویندگان از نصیب آں بے بهره ماندند '
و طالباں بے مقصود باز می گردند
اگر انتخابے کرده شود اختیارے دست
دهد از نظم و ترتیب جمال دیگر
گیرد و نظام ایں بیفزاید و از لطف
ایجاز رونق او زیاده گردد و بحکم
دواعی اخواں ایں رباعیات گفته آمد
و شش هزاربود و قریب هزار وبیست

نسخه مختارنامه موسومه "رباعیات"

......" و چوں صبح نفس ازصدق می
زدند و چوں شمع ازسرسوزمی خندیدند
و چوں آئنه روے از صفا دریں ضعیف
آورده بودند التماس کردند که چوں
سلطنت ' خسرو نامه ' در عالم ظاهر
گشت و ' اسرار نامه ' در عالم ظاهر
شد ' و زبان مرغان طیور ناطقۀ ارواح
رابمحل کشف رسید ' و 'مصیبت نامه '
از حد غایت درگذشت ' و ' دیوان '
ساخص تمام داشته اند (آمد)
و ' جواهر نامه ' و ' شرح القلب ' که
هردو منظوم بودند از سر سودا نا
منظوم ماند که حرفے و فصلے دراں
راه یافت ' ابیاتے که در ' دیوان '
است بسیار است و ضبط آں دشوار
و از زهور ترتیب عاطل و از خلاصه
ایجاز واثل اگرچه ترکیبیے داردترتیبے
ندارد که جویندگاں از نصیب بے بهره
مانند و طالباں بے مقصود باز می
گردند - اگر انتخابےکرده‌شوداختیارے
دست دهد از نظم و ترتیب نظام
او بیفزاید و از حسن ایجاز رونق او
زیاده گردد - بر حکم دواعی اخوان ایں
رباعیات که گفته اند (آمد) شش
هزار بود - احفظ سرک و لوعن زرک
و ناشسته روے ر هسل ناداده بداں
عالم تواں فرستاد پس هزار را بداں
عالم شسته فرستادیم و از پنج هزار

و شش دانند که لایق این عالم نبود بداں عالم فرستادہ شد که گفتہ اند احفظ سرک ولوعن رهک چونا شسته روے و ناکردہ فسل بداں عالم تواں فرستاد و پنج ہزار که باقی ماند دریں مجموعہ ثبت گردانیدم و این را مختار نامہ نام نہاد و گماں آں ست که ہیچ گویندہ را مثل این ابیات دست نداد که اگر دست دادے ہر آئینہ روے نمودے و برجراید روزگار ثبت بودے - و این بیتها از سرکار افتادگی آمدہ است نہ ازکار ساختگی و نہ تکلفانہ چناں که آمد بسودا رسیدہ ——

......دو مثلث عطر مقالات اوراسباب روح و روح عالمیان کناد ......

که باقی ماند این قدر که دریں مجموعہ است اختیار کردیم و باقی ابیات در دیوان است من طلب وجد و جد نام این ' مختار نامہ ' نہادیم و گماں آں است و این یقین است که ہیچ گویندہ را مثل این مجموعہ دست ندادہ است و اگر دست دادے روے نمودے و این ابیات از سرکار افتادگی در آمد است و از سرکار ساختگی و از تکلف مبرا است چناں که درآمدہ است می نوشتہ ایم ...... این دو مثلث که از عطار یادگار ماند یکے ' خسرو نامہ و 'اسرارنامہ' و مقالات طہور روم 'دیوان' و مصیبت نامہ ' و ' مختار نامہ ' ....

دونوں نسخوں کی عبارتیں مختلف ہونے کے علاوہ تحریف و تصحیف و دیگر اغلاط کتابت سے محفوظ نہیں ہیں - ان پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے اپنی رباعیات کو مضامین کے لحاظ سے مختلف عنوانات کے تحت میں ترتیب دیا تھا - ان کے علاوہ کچھہ رباعیات دیوان میں شامل تھیں - رباعیات کی مجموعی تعداد چھہ ہزار تھی- ایک ہزار سے زیادہ انتخاب کی قابل نہیں سمجھی گئیں - پانچ ہزار میں سے بھی انتخاب کیا گیا اور اس انتخاب کا نام مختار نامہ رکھا گیا ہماری شمار سے مختار نامہ کی رباعیات کی تعداد ڈیڑہ دو ہزار ہے ——

مختار نامہ کی ترتیب سے پہلے حسب ذیل کتابیں تصنیف ہوچکی تھیں :—

(۱) خسرو نامہ (۲) اسرارنامہ (۳) منطق الطیر (۴) مصیبت نامہ (۵) دیوان (۶) جواہر نامہ (۷) شرح القلب ——

تذکرۃ الاولیا اور الہی نامہ کا اس میں ذکر نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں بعد میں لکھی گئیں - جواہر نامہ شرح القلب

کو صاف کرنے کی نوبت نہیں آئی اور جہاں تک تحقیق کیا گیا ہے جواہر نامہ اور شرح القلب کسی مجموعۂ کلیات میں یا علاحدہ دستیاب نہیں ہوتے - ہمارا خیال ہے کہ کسی وجہ سے جسے ہم نہیں جانتے ان کے صاف ہونے اور شایع ہونے کی نوبت نہیں آئی —

دیباچۂ مختار نامہ کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مختار نامہ کی تصنیف کے وقت عطار نے اپنی تصنیفات دو مثلثوں (یعنی تین تین کتابوں کے مجموعوں) میں ترتیب دی تھیں - ایک مثلث میں (۱) خسرونامہ (۲) اسرار نامہ اور (۳) منطق الطیر (یا "مقامات طیور") اور دوسرے مثلث میں (۱)دیوان (۲) مصیبت نامہ اور (۳) مختار نامہ شامل تھے - الٰہی نامہ اور تذکرۃالاولیا کی دونوں جلدوں کو بھی شمار کرتے ہوے عطار کی کلیات تین مثلثوں یعنی کُل نو کتابوں پر شامل ہوجاتی ہے اور یہ ترتیب خود عطار کی دی ہوی ہے —

ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ عطار نے اپنے زمانۂ حیات ہی میں اپنے ہر قسم کے کلام کو مرتب و مدون کردیا تھا حتیٰ کہ رباعیات کو بھی مناسب عنوانات کے تحت میں یک جا کر دیا تھا —

عطار کی تصانیف میں اُس کا دیوان نہایت کمیاب ہے - نولکشور نے ایک مجموعہ سنہ ۱۸۸۷ ع میں کلیات عطار کے نام سے طبع کیا تھا ' جس میں بعض فرضی تصانیف بھی شامل ہیں لیکن دیوان موجود نہیں ہے - پروفیسر شیرانی نے اپنے مضمون محولہ بالا میں مختلف کتب خانوں سے تصانیف عطار کے قلمی نسخوں کی فہرستیں درج کردی ہیں ' جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان عطار کا ایک نسخہ انڈیا آفس میں محفوظ ہے اور اُس کے علاوہ ہندوستان میں پروفیسر آذر کے مجموعۂ کلیات عطار میں دیوان بھی شامل ہے . ممکن ہے کہ کسی اور کتب خانہ میں بھی دیوان دستیاب ہو سکے —

بہر حال کلیات کا وہ مجموعہ جو ہمارے کتب خانہ میں موجود ہے گو نہایت قدیم اور بہت زیادہ صحیح نہیں لیکن کسی معتبر اور قدیم ترین اصل پر مبنی معلوم ہوتا ہے - ہم چاہتے ہیں کہ کسی آئندہ اشاعت میں عطار کی تصانیف پر ایک مفصل اور مبسوط مقالہ قلمبند کردیں ' فی الحال کرادے وو کے خیالات ناظرین کے روبرو پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں]

عطار (فریدالدین) جو ممتاز شعراء اور عہد وسطی کی اعلی ہستیوں میں شمار ہوتا ہے ، سنہ ۱۱۱۹ ع سے سنہ ۱۲۳۰ ع تک زندہ رہا اور اس طرح اُس نے ایک سو دس سال مسیحی یا ایک سو چودہ سال ہجری کی عمر پائی - ٭ اُس کی زندگی عبادت اور تصانیف کے شغل میں گذری - اُس نے بہت کچھ لکھا ہے :بیس ضخیم کتابیں ہیں اور ایک مشہور دیوان ہے جس میں چھوٹی چھوٹی نظمیں یکجا کردی گئی ہیں - سن رسیدہ ہو جانے اور شہرت پا چکنے کے بعد عطار مغلوں کے حملے میں شہید ہوا - پند نامہ عطار کے ایک ترکی ناشر نے شہادت کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے :—

" شیخ عطار کا مولد و مدفن شہر نیشا پور ہے - ایک روایت کی رو سے اُس کی عمر ایک سو گیارہ برس اور دوسری روایت کی رو سے ۱۲۳ برس ہوئی - جب مغل کفار نیشا پور پر قابض ہوگئے تو عطار مثل طوطی کے شکرستان جانے کا آرزو مند ہوا - مغلوں نے مسلمانوں پر ہر طرح کے ظلم و تشدد کئے - ایک مغل سپاهی نے شیخ عالی مقام کو بھی گرفتار کرلیا - ایک مسلمان نے شیخ بلند مرتبت کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ میں اس کے بدلے میں تجھے ایک ہزار دینار سرخ دیتا ہوں" - لیکن شیخ نے سپاهی سے کہا " میں مسلمانوں میں بڑے رتبہ کا آدمی ہوں وہ مجھے چھوڑانے کے لئے بڑی قیمت دیں گے" - مغل سپاهی نے انکار کردیا - اس کے بعد کئی شخص گذرے اور سپاهی نے ان کے سامنے شیخ کو پیش کیا لیکن کوئی آمادہ نہیں ہوا - مغل متعجب ہوا - اتنے میں ایک شخص آیا' جس نے کہا کہ " میں تجھے اس کے بدلے ایک توبرہ گھاس دوں گا تو اسے مجھے دے دے - اس پر شیخ نے کہا " میرے یہی دام ہیں " اس پر مغل کو طیش آگیا اور اس نے شیخ کو جام شہادت پلا دیا اور

٭ دیکھو هارن کی تاریخ ادبیات فارسیہ مطبوعہ لائپزگ سنہ ۱۹۰۱ ع ص ۱۵۸ :—
(P.Horn, Gesch. der Persichen Litteratur)

مطبوعہ استنبول سنہ ۱۳۰۴ ھ صفحہ ۳

اس طرح شیخ کا خاتمہ ہوا'' - ایک مجذوب نے جو وہاں موجود تھا اور جس نے یہ سب ماجرا دیکھا تھا بحالت جذبہ خدائے تعالیٰ کو مخاطب کرکے کہا ''اے اللہ! بزرگان دین اور حق پرست یکے بعد دیگرے حوالہ آوروں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو رہے اور قتل کئے جارہے ہیں ' تو انہیں بچانے کے لئے کچھہ نہیں کرتا لیکن میں غصے سے بے تاب ہوں'' - یہ کہکر اس نے خنجر ہاتھہ میں لیا - بہت سے مسلمان اس کی ہمت سے متاثر ہوکر اور ہاتھہ میں تلوار لے کر مغلوں پر حملہ آور ہوے انہوں نے عثمانی قوم کو بد ترین مصیبت سے بچا لیا'' —

جس کامیابی کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ محض مقامی اور عارضی تھی - اس شہر کو جو ادبی تاریخ میں مشہور ہے فتح کے بعد مسمار کر دیا گیا اور باشندے قتل کر دیے گئے - یاقوت نے جوکہ معاصر ہے لکھا ہے :- '' بیان کیا جاتا ہے کہ ترکوں (مغلوں) نے ایک بھی دیوار سالم نہیں چھوڑی - اس شہر کو تولی خاں پسر چنگیز خاں نے فتح کیا تھا - مورخ میر خاوند (مصنف روضۃالصفا) نے دو سنجیدہ اور پر زور صفحات شاپور کے محاصرے اور لوٹ کے متعلق تحریر کئے ہیں - یہ واقعہ کافی اہم تھا ' شہر کے محاصرے کے وقت کئی سو مشینیں استعمال کی گئی تھیں - جو لوگ اُس وقت مارے گئے اُن کی بہت بڑی تعداد لکھی ہے ' لیکن عطار کا کوئی ذکر نہیں ہے —

پند نامہ ایک چھوٹی سے کتاب اخلاق و نصایح کی ہے جو سادگی و اختصار میں شاعر کی دیگر تصانیف سے جن میں طول اور تشبیہات و استعارات پائے جاتے ہیں مختلف ہے - اس کتاب کا انداز تحریر یہ ہے کہ مختصر عنوانات کے تحت میں ابیات لکھے گئے ہیں لیکن خیالات کی ترتیب میں کوئی شدید اہتمام نہیں رکھا گیا ہے - اس کتاب کے مواعظ تمام تر صوفیانہ نہیں ہیں - مصنف نے عملی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے بعض اجزاء میں خوش خلقی تربیت ' صحت کی نگہداشت تقریباً علم حفظا لصحت ' مہمان نوازی ماں باپ کی تعظیم و توقیر سے بحث کی گئی ہے - متبعین فیثا غورث

کی طرح وہ اعداد کے استعمال کا بہت کچھ دلدادہ ہے مثلاً پانچ چیزیں شوم ہیں، تین خصلتیں بد ہیں، تین علامتیں جن سے جاہل پہچانا جاتا ہے، تین عادتیں جو نیک بختی کی علامت ہیں، پانچ چیزیں جو ہمیشہ پانچ آدمیوں میں پائی جاتی ہیں - جن عادات کی وہ تلقین کرتا ہے وہ تقریباً ہمیشہ یکساں ہیں یعنی خاموشی یا کم از کم گفتگو میں احتیاط، دنیا سے گوشہ گیری، قناعت - وہ تمام پند نگاروں سے بڑھ کر فیاضی کی تعلیم دیتا ہے: "خدا نے آسمان کے دروازے پر لکھ دیا ہے یہاں سخی کا گذر ہے" —

اس چھوٹی سی کتاب پر ترکی زبان میں اسماعیل حقی اور شیخ ملا مراد نے شرحیں لکھی ہیں - (استنبول سنہ ۱۲۰۳ ھ) یہ کتاب ترکی مکتبوں میں تعلیم میں بہت زیادہ مروج ہے • میں ذیل میں پند نامہ سے چند ابیات جو قناعت پر لکھے گئے ہیں درج کرتا ہوں :—

"اے میرے بیٹے! ہمیشہ اپنی حالت پر قانع رہ - غریبی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز اچھی نہیں ہے - ہر صبح و شام خدا سے عفو کی طلب کر، اور جس حال میں اپنے آپ کو پاے اپنا کام کئے جا - اپنے ساتھیوں کی غیبت نہ کر، اور نہ کسی کی برائی سوائے شیطان کے- چونکہ ہر روز دنیا میں نیا ہے اس لئے ہر روز اپنے گناہوں کی مغفرت مانگ - جو خدا سے نہیں ڈرتا، اُسے خدا ہر چیز سے ڈراتا ہے -

---

• پند نامہ کا ہمارے یہاں (فرانسیسی زبان میں) اب سے ایک صدی قبل سلویسٹر دساسی (پیرس سنہ ۱۸۱۹ع ترجمہ کرچکا ہے (LePend Nemk Silvstre desacy) اسماعیل حقی اٹھارویں صدی عیسوی کا ایک ممتاز مصنف ہے جو سنہ ۱۰۶۳ ھ میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۳۲۷ ھ میں وفات پاگیا - اُس نے ترکی اور عربی زبانوں میں متعدد کتابیں اور بعض قدیم تصانیف پر شرحیں لکھی ہیں - ملا مراد سلسلۂ نقشبندیہ کا شیخ تھا اُس نے اپنی شرح شاگردوں کی تعلیم کے لئے لکھی تھی - میں نے خود بھی عرصہ ہوا پند نامہ ایک خلاصہ کے ذریعہ سے جو براہ کرم میرے لئے حسن فہمی نے طیار کیا تھا مطالعہ کیا تھا —

جہاں تک ہوسکے فریبوں کی حاجت روائی کر - روپیہ جو تیرے پاس ہے وہ صرف عارضی ہے ' اگر تو اُسے اپنے پاس رکھیگا وہ تجھے رنج دیگا ' جو تو خدا کی راہ میں دیگا وہی تیرا ہے ' جو تو بچا کر رکھیگا وہ تیری روح کے لئے نقصان کا موجب ہوگا - دنیا کاروانسرائے ہے ' اگر ہمت رکھتا ہے تو اُس سے نکل جا - دنیا ایک پل ہے ' اگر تو راستہ سے گذرنا چاہتا ہے تو اُس پر سے پار اُتر جا - جو شخص کہ اپنا مکان پل پر بناتا ہے عقلمند نہیں ہے بلکہ احمق ہے - خدا سے دولت نہ مانگ ' اس لئے کہ مومن کے لئے مال و دولت زحمت و الم ہیں - مال اور اولاد (قرآن میں لکھا ہے) دشمن ہیں اگرچہ وہ تجھے اپنی آنکھوں کی روشنی معلوم ہوتے ہیں - اس آیت قرآنی پر غور کر ' اور اُنہیں ہوا سمجھ " —

تیسری بیت پر شارح نے ان شکیہ خیالات کا اظہار کیا ہے : یہ ضروری نہیں کہ بجز شیطاں کے اور کسی کو نہ برا کہا جاے نہ کسی پر لعنت کی جاے - مثلاً نمرود ' فرعون ' شداد ' ہامان ' اور ابوجہل - شیطان دراصل ایک اسم ہے ' جو بد دینی کو ظاہر کرتا ہے - خلیفہ یزید اس شعر کو پڑھ کر شراب پیتا تھا " اگر شراب مذہب احمد میں حرام ہے ' تو عیسیٰ بن مریم کے مذہب میں جایز ہے "- * شارح سودی آفندی لکھتا ہے " میں نے حافظ کو خواب میں دیکھا اور اُس سے کہا اےحافظ توجو اپنی قابلیت اور معرفت میں بے نظیر ہے ' تونے یزیدکے شعرکو کیوں لیا ؟- حافظ نے جواب دیا "اس کی فکر مت کر - مال کافر مسلمان کے لئے حلال ہے " * —

---

* موسیو کرادے وو کو غالباً اس موقع پر کچھہ غلط فہمی ہوگئی ہے - واقعہ یہ ہے کہ دیوان حافظ کے پہلے بیت کا عربی مصرعہ " الایا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا " یزید کے ایک شعر سے ماخوذ ہونا بتایا جاتا ہے - اس پر اعتراض تھا کہ حافظ نے یزید جیسے شخص کا کلام کیوں لیا - اُس کے جواب میں اہلی شیرازی کا ایک قطعہ ہے ' جس میں اس نے حافظ کو خواب میں دیکھنا اور اس سے سوال کرنا اور بالآخر حافظ کا جواب دینا " مال کافرہست بر مومن حلال " بیان کیا ہے - (دیکھو مسٹر بشیر احمد صاحب ڈار کا مضمون حافظ شیرازی مطبوعہ رسالۂ اردو جنوری سنہ ۱۹۲۹ ع ص ۳۴) سید حسن برنی

موسیو حسین آزاد نے اپنے مجموعۂ انتخابات " صبح اُمید " (L' Aube de l' Esperance) (متن فارسی مع تراجم فرانسیسی مطبوعۂ لائیڈن و پیرس سنہ ۱۹۰۶ع میں چند انتخابات عطار کے کلام کے بھی درج کئے ھیں - ازاں جملہ اٹھارہ اسرار نامہ سے ھیں - وہ بالعموم نہایت عمدہ ' اور ھمارے بعض سربراوردہ مغربی شعراء کے کلام کے ھم پلہ ھیں - بعض متداول و معروف تشبیہات کے ساتھہ بعض عالی شان و جلیل‌القدر خیالات پائے جاتے ھیں - پہلا اقتباس' جو اس کتاب سے لیا گیا ھے انسان کی حقیر و بیمقدار حیثیت اور عالم کی جو کہ خدا کی صنعت ھے' عظیم و پر جلال ھستی کو دکھاتا ھے :—

" مکھی سمجھتی ھے کہ قصاب اپنی دکان کا دروازہ اُسی کے لئے کھولتا ھے"-

یہ مکھی (فرانسیسی امثال نگار) لافانتین (La Fontaine) کے خنزیرہ کی پیشرو معلوم ھوتی ھے - اس اقتباس میں بعض عجیب و غریب حکیمانہ خیالات پائے جاتے ھیں - " بیرونی فلک کے بعض اجرام سماوی ھمارے کرۂ ارض سے ایک سو دس گنا ھیں - تیس ھزار برس میں منطق‌البروج اپنی جگہ پر لوٹتا ھے - اگر کوئی شخص فلک بیرونی سے ھمارے کرۂ ارض پر پتھر پھینکے تو پانچ سو برس میں زمین پر پہنچیگا" - اسی قسم کے خیالات گلیلیو (Galilee) نے اور بعد ازاں نیوتن (Newton) نے چاند سے گیند پھینکنے کے متعلق ظاھر کئے تھے - " زمین بمقابلہ ان نونیلے گنبدوں کے ایسی ھے جیسے ایک خشخاش کا دانہ سمندر کی سطح پر اور تو اس دانے کے مقابلے میں کیا ھے ؟ " - یہ ایک ایسا مقابلہ ھے ' جو تقریباً (فرانسیسی مفکر) پسکل (Pascal) کے خیالات سے ملتا ھے —

" میں کہتا ھوں : انسان کیا ھے ؟ وہ ایک حقیر چیز ھے ایک مشت خاک اور حیات دو روزہ ' ایک سانس اُسے زندگی اور موت کے درمیان روکے ھوے ھے "- اسی خیال کو پسکل نے ریگ ذرہ اور قطرۂ آب سے ظاھر کیا ھے - نظامی کے اس مصرع پر بھی غور کرو " ھستی اور غیر ھستی کے مابین ایک بال ھے " —

علاوہ ازیں انسان کے ضعف و عجز کا حسب ذیل پر لطف وجدت آمیز مقابلہ بھی قابل دید ہے :—

" آدمی یقین کرتا ہے کہ وہ بڑھ رہا ہے - محض دھوکا - اُس کی مثال ایک ایسے اونٹ کی ہے ' جو بندھی ہوی آنکھوں سے چکی کے گرد گھومتا ہے ' اور جب اُس کی آنکھیں کھولی جاتی ہیں ' تو اپنے آپ کو وہیں پاتا ہے - ایسی ہی ایک یہودی کی حکایت ہے جو جوا کھیلتا اور ہار جاتا ہے ' اور بالآخر اپنی آنکھوں کی بازی لگاتا ہے لیکن جب کہا جاتا ہے کہ وعدہ ایفا کرو تو بگڑ جاتا ہے - یہ یہودی شاید شائی لاک کا بھائی ہے - موت کے متعلق ان خیالات جمیلہ کو بھی دیکھئے :—

" اس لمحہ پر جب کہ روح جسم سے جدا ہوتی ہے ' دو عالم ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں - ایک طرف جسم بیحس ہوکر گرتا ہے دوسری طرف روح سکوت میں گرتی ہے - کون جانتا ہے کہ وہ کیسے جدا ہوتے ہیں ؟ کہاں ہیں ؟ کہاں گئے ؟ اور کہاں آتے ہیں ؟ " —

عظیم و فاخر متصوفانہ نظم " چڑیوں کی بولی " منطق الطیر ایک ایسے پلاٹ پر مبنی ہے جو تمام نظم پر حاوی ہے ' اور جس کا خلاصہ ہم نے ایک دوسری جگہ کیا ہے —

یہ نظم فی الواقع طیور کی ' جن سے روح مراد ہے ' سیاحت کو بیان کرتی ہے ' جو میدانوں کو عبور کرتی ' سفر میں زحمتیں برداشت کرتی ' اپنے آپ کو پاک کرتی اور بالآخر طے مراحل کے بعد سیمرغ کی خدمت میں بار یاب ہوتی ہیں ' جن سے مراد پرند آلہی یا فنا ہے - یہ قصہ جسے علحدہ کرلینا اور جداگانہ شایع کرنا مفید ہوگا جابجا جداگانہ حکایات سے بھرا ہوا ہے ' جن میں اخلاقی یا روحانی تعلیمات دی گئی ہیں - پرندوں کے ہر قصے کے ساتھہ ساتھہ چھہ یا سات دلچسپ حکایات

بیان کی گئی ھیں، یہ حکایات اُس روح میں نہیں لکھی گئی ھیں ' جو سعدی میں پائی جاتی ھے - عطار کی حکایات ایک ایسے اخلاقی تصور کو جو زیادہ سخت ھے اور ایک ایسے مزاج کو جوکہ روحانیت میں انتہا سے بڑہ گیا ھے ظاھر کرتی ھیں - عطار کی تصنیف کو سمجھنے کے لئے ضروري ھے کہ اس کے پڑھنے والے کی قوت ادراک قدرے نشو و نما اور تربیت پائے ھوے ھو باوجود اس کے اس کتاب میں ایسے مقامات کافی تعداد میں دستیاب ھوتے ھیں جن کے شاعرانہ اور اخلاقی حسن کو اکثر ذھن محسوس کرسکتے ھیں :—

نظام الملک طوسی حالت نزع میں کہتا ھے " اے میرے خدا ' میں اپنے آپ کو ھوا کے ھاتھوں میں چھوڑ تا ھوں " شاعر نے اس قول کی تائید میں ایک علحدہ خطبہ قلمبند کیا ھے ' جسے میں کسی قدر مختصر پیرایہ میں درج کرتا ھوں - یہ واضح ھوگا کہ یہ مضمون تقریباً مسیحی تعلیمات سے ملتا ھے - " اے میرے آقا ! میں تجھ سے اس شخص کے وسیلے سے دعا کرتا ھوں جس نے تیرا کلام پھونچایا ھے ' جس کی شریعت کو میں نے قبول کیا ھے ' جس کا میں متبع ھوں - جس سے میں محبت کرتا ھوں - میں نے تیری خوشنودی کو خریدنا چاھا ھے ' لیکن تجھے کبھی نہیں بیچا - میری اخیر گھڑی میں مجھے پھر خرید لے - اے ان کے مددگار جو بے یارو مددگار ھیں ' میری مدد کر - اے میرے خدا اس اخیر گھڑی میں اپنی مدد عطا فرما ' اس لئے کہ اس وقت کوئی میرا مددگار نہیں ھوسکتا - میرے دوستوں کی آنکھیں اس وقت آنسوؤں سے بھری ھونگی ' جب کہ وہ اپنے ھاتھوں سے مجھے سپرد خاک کرینگے - اس وقت مجھہ پر مہر کا ھاتھہ رکھہ ' اور اپنی بخشش کے دامن میں چھپا لے —

ذوالنون ایک دن صحرا میں کچھ مردہ فقیر دیکھتا ہے * - ایک آسمانی ندا اس سے کہتی ہے —

---

* کراڈے وو نے اس اقتباس میں لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے ، بلکہ بعض اجزاے حکایت کا نفس مطلب لے لیا اور اکثر اجزا کا ملخص ترجمہ کردیا ہے - ہم نے اس سلسلۂ مضامین کے ترجمہ میں اب تک اصل متون کے عبارات اپنی طرف سے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی - لیکن عطار کی منطق الطیر سے ذوالنون اور ققنس کی امثال کو ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کرتے ہیں - یہ دونوں اقتباسات ہم نے اپنے قلمی نسخے سے لئے ہیں :—

گفت ذوالنون می شدم در بادیہ ــ بر توکل بے عصا و زاد رہ

چل مرقع پوش را دیدم براہ ــ جاں بدادہ جملہ بر یکجا یگاہ

شور شے در عقل بیہوشم فتاد ــ آتشے بر جاں پر جوشم فتاد

گفتم آخر این چہ کار است اے خداے ــ سروراں را صید اندازی زپاے

'ہاتفے' گفتا کزیں کار آگہم ــ خود کشیم و خود دیت شاں می دہیم

گفت آخر چند خواہی گشت زار ــ گفت تا داریم دیت ایں است کار

در خزانہ تا دیت می ماندم ــ می کشم تا تعزیت می ماندم

بکشتہ کش ، و نگہ بخونش درکشم ــ گرد عالم سر نگونش درکشم

بعدازاں چوں محو شد اجزاے او ــ پاے سر گم شد ز سر تا پاے او

عرضہ دارم آفتاب طلعتش ــ وز جمال خویش سازم خلعتش

خون او گلگونۂ رویش کنم ــ معتکف بر خاک ایں کویش کنم

سایۂ گر دانمش در کوے خویش ــ پس بر آرم آفتاب روے خویش

چوں بر آمد آفتاب روے من ــ کے بماند سایۂ در کوے من

سایہ خود ناچیز شد در آفتاب ــ نیز چہ واللہ اعلم بالصواب

ہرکہ در روے محو شد از خود برست ــ زانکہ نتواں برد جز با او بدست

محو شد از محو چند بیتے مگوے ــ صرف کن جان خود و چیزے مگوے

مردمی باید نہ سر او را نہ پاے ــ جملہ گم گشتہ در او خود خداے

می ندانم دولتے زیں بیش من ــ مرد را کو گم شود از خویشتن

'' میں اُس شخص کو ' جسے دوست رکھتا ہوں ' اسی طرح مارتا' خون میں ڈالتا ' اور دنیا کے چاروں طرف کھینچتا ہوں - جب کہ اُس کے جسم کے اجزا محو اور اس کے ہاتھ پیر گم ہوجاتے ہیں ' تو میں اسے اپنے چہرے کا آفتاب دکھاتا ' اور اپنے جمال کی خلعت سے ڈھک دیتا ہوں - اُسی کے خون کو اُس کے چہرے کا گلگونہ بناتا ہوں - میں اُسے اپنے کوچے کی خاک پر معتکف کردیتا ' اور اپنے کوچے میں سایہ بنادیتا ہوں - تب میں اُسے اپنے چہرے کا آفتاب دکھاتا ہوں ' اور اُس کی روشنی میں وہ سایہ جاتا رہتا ہے - جو شخص اپنے آپ کو محو کردیتا ہے ' اپنے آپ کوبچا لیتا ہے - اپنی جان کو محو کردے اور کسی دوسری چیز کو مت ڈھونڈہ - اپنی ہستی کو گُم کرنے سے بڑھکر مجھے کوئی دولت معلوم نہیں '' —

یہ انجیل کی اس ضرب‌المثل کی توضیح ہے :—

'' جو اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے ' اپنے آپ کو گُم کردیتا ہے ''

'' جب کہ زمین ثور کی پشت پر قائم ہوئی ' تو ثور ماہی پر اور ماہی ہواپر ٹھہرے - لیکن ہوا کس چیز پر قائم ہے ؟ وہ لاشے یا عدم پر قائم ہے' اور یہ کافی ہے- اس طرح عدم پر عدم قائم کیا گیا ہے' اور یہ سب‌کچھہ عدم‌محض‌ہے'اورکچھہ‌نہیں''—

اسی نظم میں ایک ققنس کی موت کی ایک دلچسپ حکایت درج ہے * اس

عطار نے اس دلکش حکایت کو منطق الطیر میں اس طرح لکھا ہے :—

هست ققنس فرد مرغے دلستاں ‏ ‏ موضع آں مرغ در هندوستاں

سخت منقار عجب دارد دراز ‏ ‏ همچونے دروے بسے سوراخ باز

هست در هر ثقبہ آواز دگر ‏ ‏ زیر هر آواز او ساز دگر

چوں بهر ثقبہ بنالد زار زار ‏ ‏ مرغ ماهی گردد ازوے بیقرار

جملہ درندگاں خاموش شوند ‏ ‏ وز خوشی بانگ او بے هوش شوند

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

حکایت میں ہمیں ایک خالص یونانی روایت بازیاب ہوتی ہے —

ققنس ایک دلکش پرند ہے ' جو ہندوستان میں رہتا ہے اُس کے جفت نہیں ہوتی بلکہ وہ تنہا رہتا ہے - اُس کے ایک لمبی اور سخت منقار ہوتی ہے ' جس میں بہت سے سوراخ مثل نے کے بنے ہوتے ہیں ' اور جن کی تعداد تقریباً ایک سو ہوتی ہے - ہر سوراخ میں سے ایک جدا آواز نکلتی ہے ' اور اُس کے راگ سے مرغ و ماہی اور درندے محو ہو کر رہ جاتے ہیں - ایک فیلسوف نے اُس کی آواز سے علم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۹)

فیلسوفے بود دمسازش گرفت — علم موسیقی ز آوازش گرفت
سال عمر او بود قرب صد ہزار — وقت مرگ خود بداند آشکار
چوں بود وقت مرگ او دل زخویش (؟) — ہیزم آرد گرد خود چند حصہ بیش
در میان ہیزم آید بیقرار — در دہد صد نوحۂ خود زار زار
پس بداں ہر ثقبۂ از جاں چاک (؟) — نوحۂ دیگر کند نوع دگر
درمیاں نوحہ از اندوہ مرگ — ہر زماں برخود بلرزد ہم چو برگ
از نفیر او ہمہ پرندگاں — وز خروش او ہمہ درندگاں
سوے او آیند چوں نظارگی — دل ببرند از جہاں یکبارگی
از غمش آں روز درخون جگر — پیش او بسیار میرد جانور
جملہ از زاری او حیراں شوند — بعضے از بے قوتئے بیجاں شوند
پس عجب روزے بود آں روز او — خوں جگر از نالۂ و سوز او
باز چوں عمرش رسد با یک نفس — بال و پر برہم زند از پیش و پس
آتشے بیروں جہد از بال او — بعد ازاں آتش بگردد حال او
زود در ہیزم فتد آتش ہمی — پس بسوزد ہیزمش خوش خوش ہمی
مرغ و ہیزم ہر دو چوں اخگر شوند — بعد اخگر نیز خاکستر شوند

موسیقی نکالا - ققنس ایک ہزار برس تک زندہ رہتا ہے - جب اس کی موت کا وقت قریب آتا ہے ، جس کا اُسے پہلے سے حال معلوم ہوجاتا ہے ، تو وہ ہر سوراخ سے ایک جدا نوحہ نکالتا ہے - اس نغمہ کو سن کر تمام وحوش جمع ہوجاتے ہیں - سب اُس کی موت میں مدد کرتے ہیں ، اور اُس سے مرنا سیکھتے ہیں - جب اُس کی زندگی میں صرف ایک سانس باقی رہ جاتا ہے ، تو وہ اپنے بال و پر ہلاتا ہے - اُس کی جنبش سے آگ پیدا ہوتی ہے اور وہ آگ فوراً ایندھن میں ، جو ققنس نے جمع کرلیا ہے ، لگ جاتی ہے ، اور ہلکے ہلکے اسے جلا دیتی ہے - تھوڑی دیر میں لکڑیاں اور پرند جل کر اخگر ہوجاتے ہیں - جب چنگاری کا ذرہ بھی نہیں رہتا ، تو ایک نیا چھوٹا سا ققنس خاکستر سے نمودار ہوتا ہے —

ذیل میں دو اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں ، جن میں مذہبی رسوم سے ایک گونہ بے پروائی کا اظہار کیا گیا ہے ، اس قسم کے جذبات ان تمام شعرا میں عام طور پر پائے جاتے ہیں —

ایک صوفی جس کا نام واسطی تھا ، ایک مرتبہ گورستان یہود سے گذرا - اُس نے اُن میں سے اُن لوگوں کا خیال کیا جو نیک تھے - اُس نے بآواز بلند کہا " یہ یہود مغفرت کے مستحق ہیں ، گو اس خیال کا اظہار ہر شخص کے سامنے نہیں کیا جا سکتا " - ایک قاضی نے صوفی کو یہ کہتے سن لیا اور اپنے روبرو طلب کرکے حکم دیا کہ وہ ان الفاظ سے توبہ کرے - لیکن صوفی نے انکار کردیا ، اور کہا اگر تو ان لوگوں کو راہ اسلام میں داخل کرنا نہیں چاہتا ، تو کم از کم ان میں سے وہ جو وہاں ہیں (یعنی مرگئے) خداوند سماوی کے ہاتھ میں ہیں (یعنی تیرا اُن پر کیا اختیار ہے) " —

امام احمد بن حنبل ایک فقیر کے پاس بیٹھے ہوے پاے جا تے ہیں اس پر لوگ متعجب ہو تے ہیں ' تو امام کہتے ہیں کہ " میں حدیث و سنت کا ثمرہ حاصل کر رہا ہوں - میں اس سے زیادہ باعلم ہوں ' لیکن وہ مجھہ سے بہتر خدا سے واقف ہے " —

ہارن (Horn) عطار کو ہفت وادی یا منازل روحی کا جنھیں طیور عبور کر تے ہیں موجد بتاتا ہے - واقعی دوسرے صوفیوں ' مثلاً قشیری و ہجویری کی (جو عطار سے مقدم ہیں) اور سہر وردی کی (جو اس کا معاصر ہے ') تصانیف میں اس قسم کا نظام نہیں پایا جا تا - اور اس وجہ سے کوئی سبب نہیں معلوم ہو تا کہ اسے عطار سے کیوں نہ منسوب کیا جاے —

یہ خیالات کا نظام سات کے عدد اور عام دلفریبی کے لحاظ سے سینٹ تیریس (St. Therese) کے خیالات سے ملتا ہے - عطار کے وادیوں کے نام لکھتا ہوں :—

طلب ' عشق ' علم ' بے تعلقی ' وحدت ' حیرت ' عدم اور فنا —

میں اس جگہ اس روحانی موت یا فنا کی حقیقی نوعیت پر بحث نہیں کرنا چاہتا - میں اس کے متعلق اپنے آرا اپنی کتاب " غزالی " میں ظاہر کر چکا ہوں - اور ان آرا میں اس وقت تک کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی ہے —

میں آخیر میں عطار کے چند لطیف ابیات پر اکتفا کر تا ہوں ' جن میں اس نے اس کیفیت کو بیان کر نے کی کوشش کی ہے ' جہاں روح کی زندگی اور شخصیت کے تمام عوارض و تفصیلات محو ہو کر رہ جا تے ہیں ' اور صرف وصال خداوندی کا احساس باقی رہ جاتا ہے —

" وہاں تو ایک روحانی شعاع کے سامنے ہزاروں تاریکیوں کو جو تجھے گھیرے ہوے ہیں غایب ہو تے دیکھیگا - جب کہ بحر ذخار کی موجیں ساکن ہو جاتی ہیں تو وہ نقوش جو پانی پر پڑتے ہیں غایب ہو جا تے ہیں - یہ نقوش محض عالمہاے

موجودہ و آئندہ ہیں - جس شخص کا دل اس سمندر میں گم ہو جاتا ہے ' وہ ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جاتا ' اور سکون پالیتا ہے - اس بحر ساکن میں بجز فناکے اور کچھہ نہیں ملتا - اگر کوئی پاک شے اس سمندر میں گر جا تی ہے تو وہ اپنی مخصوص ہستی کو گم کر دیتی ہے - اپنا جداگانہ وجود کھود ینے پر وہ آ یندہ بھلی ہو جاتی ہے- وہ موجود ہوتی ہے' اور نہیں ہو تی ہے - یہ کیسے ممکن ہے ؟ ذہن اسے سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا " —

قاضی محمود بحری (صوفی شاعر) اور اُن کا کلام

از

(جناب سید محمد حفیظ صاحب بی - اے بی ٹی-لکچرار الہ آباد یونیورسٹی)

اس مصنف کے معتبر سوانح ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکے - بعض اہل علم حضرات سے اس کے متعلق یہ درخواست کی گئی کہ اگر قاضی صاحب کے حالات زندگی انہیں معلوم ہوں تو براہ کرم خاکسار کو مطلع فرمائیں لیکن سب نے لا علمی ظاہر کی ان میں سے کچھ صاحب ایسے بھی ہیں جو علم و فضل میں یکتا نے روز گار ہیں اور علاوہ اس کے اپنے یہاں قلمی نسخوں کے نادر کتب خانے بھی رکھتے ہیں اور قدیم اردو کے مستند عالم سمجھے جاتے ہیں - لالہ سریرام مصنف خم خانہ جاوید بھی جن کے یہاں قلمی نسخوں کا ایک نادر کتب خانہ ہے اور جو اس وقت ہندوستان کے زبردست انشا پرداز ہیں بحری کے سوانح حیات پر کوئی روشنی نہ ڈال سکے - کچھ زمانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ دکن کالج میں ایک پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز ہیں ان کے یہاں بھی ایک زبردست لائبریری ہے ' بہت ممکن ہے کہ ان کے یہاں بحری کے متعلق کچھ مواد مل سکے - یہ خیال آتے ہی میں نے ان کو بھی لکھا لیکن ان سے بھی وہی مایوسانہ جواب ملا - غرضکہ بحری کے سوانح حیات کے متعلق باہر سے مجھے کچھ نہیں مل سکا' البتہ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو سے جو قدیم و جدید اردو کے مستند عالم ہیں کچھ مختصر حالات معلوم ہوئے—

بحری جیساکہ مولانا عبدالحق صاحب سے معلوم ہوا ملک حضور نظام کے ایک موضع گوگی کے رہنے والے تھے جو واڑی اسٹیشن کے قریب شاہ پور سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے جہاں قاضی صاحب کا مزار شریف اب بھی موجود ہے - سالانہ ۱۰ شوال تاریخ وصال قاضی صاحب کا عرس نہایت تزک و احتشام سے کیا جاتا ہے - قاضی صاحب کا انتقال ۱۰ شوال سنہ ۱۱۳۰ مطابق ۱۵ اگست سنہ ۱۷۱۸ ء کو ہوا تھا --

قاضی صاحب کے والد بزرگوار کا نام بحرالدین تھا - یہ گوگی کے قاضی تھے انھیں کی یادگار میں قاضی صاحب نے اپنا تخلص بحری رکھا تھا - قاضی صاحب شیخ محمد باقر (رح) کے مرید تھے - کسی مکتب میں رواج قدیم کے مطابق انھوں نے تعلیم نہیں پائی - قاضی صاحب ولی کے ہم عصر تھے - یہی وجہ ہے کہ دونوں کے انداز بیان اور زبان میں بہت کچھ مشابہت ہے - بحری نے شاعری کسی استاد سے نہیں سیکھی - ولی سے زیادہ انھوں نے سنسکرت الفاظ اپنے کلام میں استعمال کئے ہیں- اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت بیجاپور اور اس کے گرد و نواح میں سنسکرت کے الفاظ بمقابلہ عربی و فارسی الفاظ کے زیادہ مستعمل تھے-اسی حالت میں اورنگ آباد اور بیجاپور کے شاعروں کی زبانوں میں فرق ہونا لا بدی تھا —

ایک روشن خیال صوفی ہو نے کی وجہ سے ان کے کلام میں بسا اوقات ایسے الفاظ ملیں گے جو عام طور سے صوفیائے کرام کی تصانیف میں پائے جاتے ہیں —

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ باہر سے ہمیں بحری کے واقعات زندگی کے متعلق خارجی شہادت بہت کم دستیاب ہوسکی لیکن ابھی ہمارے پاس ایک ذریعہ اور ہے ممکن ہے کہ اس ذریعہ سے ہم بحری کے واقعات زندگی پر کچھ روشنی ڈال سکیں —

ان کی مشہور مثنوی من لگن کے بعض مقامات قاضی صاحب کے سوانح پر روشنی ڈالتے ہیں —

چنانچہ "درسبب تصنیف ایں کتاب" (مثنوی) قاضی صاحب رقم طراز ہیں کہ چار برس کی عمر میں انہیں مکتب میں بھٹایا گیا - بسم اللہ شروع کرتے وقت ان سے کہا گیا بھئی خدا کے نام سے پڑھنا شروع کرو - لیکن ہمارے قاضی کی زبان پر رحمان اور رحیم کی رٹ لگی تھی - غرضکہ مہربانی کرنے والے اور رحم کرنے والے کا بیان ہمارے مصنف کو شروع ہی سے تھا - اوائل عمری ہی سے وہ بہت ذہین اور طباع تھے - لڑکپن ہی سے محبت کی آگ دل میں بھڑکنے لگی چنانچہ مثنوی میں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں —

اس عمر میں عشق جیو میں جاگ یوں گھیر لیا جیوں بھیڑ کوں باگ

عہد طفلی میں جب بچے عام طور سے گھروندے بنا بنا کر بگاڑتے ہیں، مختلف مشغلوں سے اپنا دل بہلاتے ہیں، دنیا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اس وقت سے ہمارے قاضی صاحب ان تمام لہو و لعب سے بے نیاز ہو کر پریم کی دھکتی ہوئی آگ میں کود کر اپنا تن من جلا رہے تھے —

آگ عشق کی دل منے لگی تھی پھر تن میں تمام تک پکی تھی

بس انہیں صرف اتنا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شے ان کے خانہ دل کو جلا جلا کر خاک سیاہ کر رہی ہے - وہ آخر ہے کیا ؟ اس کا علم انہیں کچھ نہ تھا صرف اس سوز دروں کا انہیں احساس ہی احساس تھا - وہ نہیں جانتے تھے کہ دنیا والے اس کو پریم کی آگ کہتے ہیں - انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ یہ وہی شے ہے جس کے لئے انسان اس عالم وجود میں آیا ہے - چنانچہ جب اس عشق سے وہ پریشان ہو جاتے ہیں اور اس کی اصلیت ان کے سمجھ میں نہیں آتی تو وہ فرماتے ہیں —

یو عشق برا ہے یا بھلا ہے یہ دیو ہے بھوت یا بلا ہے

لڑکائی تھی مجھ اوپر مسلم ہو لوں تو یہی جو عشق کا غم

یا مجھ میں نوا ہوا ہے پیدا یا جگ میں اول سے ہے ہو یدا

لیکن اس سوز پنہاں کا عیاں ہونا نہایت ضروری ہے - اس کے اندر ہی اندر

سلگنا زیبا نہیں اس لئے اب انہیں شاعری کرنی چاہئے تا کہ وہ جذبات پنہاں کا اظہار کر کے سکون حاصل کر سکیں - یہ بھی خدا کا احسان تھا کہ انہوں نے شاعری شروع کر دی ورنہ یہ درد نہاں خدا جانے انہیں کہاں لیجاتا —

گر بیچ کبیشری نہ آتی   والد یہ آگ مجھے جلاتی

چالیس برس کی عمر تک قاضی صاحب کی یہی حالت رہی - درد محبت انہیں دم بھر بھی چین نہیں لینے دیتا تھا - جب کسی کا درد محبت انہیں بہت زیادہ بیچین کرتا تو کچھ اشعار کہہ کر وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے قاضی صاحب کی مادری زبان ہندی تھی ' اور اس وقت تک شاعری کی ہر صنف میں قسمت آزمائی کر چکے تھے - اگر چہ وہ خود شاعری ہندی ہی میں کرتے تھے تاہم ان کا خیال تھا کہ فارسی بلحاظ زبان اور اسلوب بیان کے ہندی سے اعلے وارفع ہے —

ان کی تصانیف اور بہت سی چیزیں جو ایک بڑے صندوق میں مقفل تھیں سبھاگ نگر میں چوری چلی گئیں —

گانو کے مکھیا نے قاضی صاحب سے اظہار ہمدردی کی اور کہا جو کچھہ ہونا تھا ہوچکا اب آپ ایک ایسی کتاب لکھیں جو آپ کی یادگار بنے اور آپ کا نام دنیا میں روشن کرے کیوں کہ یہ زندگی عارضی ہے - قاضی صاحب نے بہت معذرت کی - کہنے لگے اب میں کسی قابل نہیں رہا کتابیں تصنیف کرنے کی سکت مجھہ میں قطعی نہیں ' ضعیفی کا عالم ہے ہاتھہ پیر اب اس قابل نہیں رہے - حاکم نے کہا یہ سب صحیح ' لیکن آپ کوشش کریں خدا آپ کی مدد کریگا ' آپ لکھئے با معنی ہو یا بے معنی آپ کی بلا سے - قاضی صاحب نے کہا اچھا لیجئے کوشش کروں گا ' تمہاری بات نہ ٹالوں گا ' وعدہ کرنے کو تو کرلیا لیکن اب فکر یہ ہوی کہ کیا لکھنا چاہئے —

آخر کار مثنوی من لگن کی ٹھہری اور یہ فیصلہ کیا کہ اس کا موضوع ایسا ہو

جوشمع هدایت بنکر طالبان حق کی رهنمائی کرے اور خود ان کے درد کا یہی مداوا هو —

میں کوتھری چھوڑ بھار آیا	دالان میں اس دنی کے دھایا
جب برس چھار گئی گذر تب	آ سامنے مکھہ دکھا یا مکتب
بسم الله مجھے کہے کھو هان	میں بول اٹھا رحیم رحمان
اس عمر میں عشق جیو میں جاگ	یوں گھیر لیا جیوں بھیڑ کو باگ
آگ عشق کی دل منے دھکی تھی	بھر تن میں تمام تک پکی تھی
پن مجکو سمجھہ نہیں جو یہ کیا	یونار یوناز یونگہ کیا
یو درد سے کیا یو دل جلے کیوں	تن آنچ سے عشق کی گلے کیوں
لڑکای تھی مجھے اوپر مسلم	بولوں تو یہی جو عشق کا غم
یا مجھہ میں نوا هوا هے پیدا	یا جگ میں اول تی هے هویدا
چالیس برس یہی تھی مستی	یو شعر یو شاهداں پرستی
هندی تو زبانچہ هے هماری	کہنے نہ لگے همیں کو بھاری
اور فارسی اس تی ات رسیلا	هر حرف میں عشق هے نہ حیلا
تھا یو جو یک بڑا پتارا	سو بھاگ نگر میں کھو ے سارا
هور اور بھی یادگار چیزان	تس پر او چرائے بے تمیزاں
اس کھو ے پرا کھی کیتک بار	جو تھا سوگیا پھر آپنے تیار
اس پنط کو نین هے پائداری	بارے رهی کچھہ ڈو یادگاری
دی جس میں اچھے بیان بالا	سفسار کے هات اک رسالہ
بولیا نہ بوڑھا هواهوں بیہوش	نا تن میں ترنگ جیو میں جوش
نا چک میں هے جگ هات میں هیر	اب مجکو رکھو معاف اے میر
بولے جو نہیں هے طبع پربل	موزوں کو بسار بول مہمل
اس بات کو جب کچھہ بک دیا گوش	تب من میں لیا یہ من لکن جوش
دستور عمل هے عاملاں کو	دارو هے دکھی پڑے دلاں کو

دیباچہ " درمدح پادشاہ دین پناہ سلطان اورنگ‌زیب " سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی صاحب اورنگ‌زیب کے زمانے میں تھے - وہ اورنگ‌زیب کے علمی قابلیت کے بہت مداح ہیں وہ بادشاہ وقت کو دوسرے بادشاہوں سے اعلیٰ وارفع سمجھتے ہیں بحری کے نزدیک اورنگ‌زیب جیسے ذہین اور طباع بادشاہ بہت کم ہوتے ہیں - بحری کا بادشاہ علم کے ہر شعبہ پر حاوی ہے - وہ عالم ہے ' فاضل ہے ' پابند مذہب ہے ' خدانے اس کو عقل سلیم عطا کی ہے - بہادری میں اپنا نظیر نہیں رکھتا - ہندوستان کے چپے چپے پر اس کا قبضہ ہوچکا ہے ' وہ بہت ہی ایماندار اور خدا شناس بادشاہ ہے - اپنے فرایض کی انجام دہی میں نہایت مستعد ہے' اشعار —

اک سلک نہیں جو اُن لیا نیں   یک نیں نہیں جو اُن کیا نیں

ایسا نہ ہوا کسی شہاں میں   نا بلکہ بڑے مشایخاں میں

جس ناؤں اہے ابوالمغازی   سلطان اورنگ‌زیب غازی

دیندار دلیر اور دانا   یک علم نا سب منے سیانا

در منقبت مربینا مولانا حضرت شیخ محمد باقر قادری نور محمد کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بحری مولانا باقر (رح) کے مرید تھے - جیسا مریدوں کا دستور ہوتا ہے بحری بھی اپنے پیرو مرشد کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں - ان کے پیر صاحب کو خدا کا قرب حاصل ہوچکا ہے - وہ آن حضرت کے نائب ہو کر دنیا میں لوگوں کو شمع ہدایت دکھاتے ہیں - ان کے پیر صاحب مظہر العجائب بھی ہیں اور مافوق الفطرت صفات سے متصف ہیں - صاحب معرفت ہیں - خدا کے برگزیدہ بندوں میں سے ہیں اگر بایزید بسطائی ہی بقید حیات ہوتے تو وہ بحری کے پیر ومرشد سے فیضیاب ہوتے اور ان کے سامنے زانوے ادب تہ کر کے بیٹھنا عین سعادت سمجھتے حضرت بحری خود بھی استاد کو مخاطب کر کے طالب دعا ہوتے ہیں - کہتے ہیں اے پیر و مرشد تمھاری مدد درکار ہے تمھارے بغیر زندگی بیکار ہے - پیر صاحب سے

درخواست کی جاتی ھے کہ وہ خدا سے ان کی بلند نگاھی کے لئے دعا کریں اور صراط مستقیم کی ھدایت کریں - اشعار :—

مولا کے محب نبی کے نائب — مانس نہیں مظہر العجائب
ساگر میں سپور معرفت کے — بل عین ھیں نور معرفت کے
اس دور جو بایزید ھوتے — مل شیخ سوں مستفید ھوتے
تر لوگ اوپر تری امیری — در حال کرے تو دستگیری
سب چھوڑ پکڑ پڑا ھوں کونا — یا پیر تو دستگیر ھونا

اردو فارسی شعرا کا قاعدہ ھے کہ وہ زمانے کی شکایت ضرور کرتے ھیں وہ بھی اس سنت دیرینہ پر عمل کرتے ھوے بہ ضمن در شکایت روزگار اس وقت کی اخلاقی حالت پر بھی روشنی ڈالتے ھیں- بارھویں صدی کے وہ بہت شاکی ھیں اس صدی میں اچھے آدمی نام کو نہیں ' ھر طرف شور و شر کا بازار گرم ھے' کفر و ضلالت کا دور دورہ ھے ' نیکی کی بوچھہ کچھہ بالکل نہیں - جدھر دیکھو برائی' متقی اور پرھزگاروں کا پتہ نہیں - خدا کے نام لیوا بہت مگر اس کے احکام ماننے والے کم - بھائی بھائی کا گلا کاٹتا ھے - شرم و حیا کی رسم دنیا سے مفقود ھوگئی ھے ' نہ بڑوں کا ادب ھے نہ چھوٹوں کا لحاظ- یہ اُن کی بد قسمتی تھی جو وہ اس زمانے میں پیدا ھوے-

اے بھائی یہ بارھویں صدی ھے — نیکی کو دبا بدی بدی ھے
ھے آج تو قحط سال ست کا — چھٹ گیا ھے دھرم سوں دل جگت کا
اس دور منے جو ھے کمی کا — دبلا ھے یا دیانت آدمی کا
دھرتی پہ ادھرم ادک ھوا ھے — امرت کی بجائے بکھہ ھوا ھے
اک جیو پہ درد دین کا نہیں — اک دل پہ اثر یقین کا نہیں
نا جاے کو مائی کا بھروسہ — نا بھائی کو بھائی کا بھروسہ
نا شرم کی خوھی یک نین میں — نا دھرم کی لوھی یک بدن میں
اس حول میں تو ھوا ھے پیدا — اس ڈول میں تو ھوا ھویدا

اگر چه اپنے متعلق جو کچھ بیان ھے اس سے اُن کی زندگی کے واقعات کچھ زیادہ نہیں معلوم ھوتے مگر کم سے کم اس سے اُن کی روحانی ریاضت کی کیفیت ضرور معلوم ھوتی ھے —

لکھتے ھیں کہ ایک رات کو اُنھوں نے خواب دیکھا کہ اُن کے شیخ نے انھیں اسرار الہی کا جلوہ دکھایا - کیا دیکھتے ھیں کہ نوکھنڈ (نو فلک) میں نور ھی نور پھیلا ھوا ھے - یہ دیکھ کر بحری نے شیخ سے التجا کی کہ مجھے کوئی ایسی روحانی ریاضت فرمائیے کہ جس سے میں نہ صرف اعلی مقام پر پہنچ جاوں بلکہ اپنے تئیں بالکل بھول جاوں- شیخ نے فرمایا کہ تصور شیخ کیا کرو اور اس کی مشق یہاں تک بہم پہنچاؤ کہ "من تو شدم تو من شدی" کا قول صادق آجائے اور مرید اورشیخ میں وھی رشتہ اور تعلق نہ پیدا ھو جاے جو جسم کو روح سے ھے - بحری نے ریاضت شروع کردی - انجام کار اسی ریاض سے پاک محبت اس کے دل میں لہریں لینے لگی - اس تصنیف کے وقت وہ بالکل بحر محبت میں ڈوبا ھوا تھا - محبت ھی اس کی انیس تھی اور وہ اسی کے اشارے پر چلتا تھا - پھر آخر میں تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود فراموشی طاری ھو گئی اور ان کے سر میں وصل حقیقی کا سودا سمایا - نوے برس کی عمر میں اُسے احساس ھوا کہ اگر اس میں پریم اور محبت کی قوت نہ پیدا ھوئی ھوتی تو وہ پاک محبت سے بالکل نا آشنا ھوتا اور وہ بالکل دس سال کے بچے کی طرح ھوتا - اہل شناسان محبت ھی اس کی خصوصیات سے بخوبی واقف ھیں ، درد کا مارا ھی کچھ درد کو سمجھ سکتا ھے لہذا اس کے نزدیک بھی روحانی تعلیم بغیر عشق کے فضول اور لاحاصل ھے -

حضرت کئے مجھکو یکشب ارشاد　　اوشب نہ تھی سرتی یک سب ارشاد
جو بھید اتھا انوپ امانت　　تس کے دئے مجھ کچھک پچھانت
یک جوت دسیا تمام نو کھنڈ　　یک نور دسیا سکل یو بھر منڈ

اس بعد کیا دھنی سوں بنتی ۔۔۔ اتنی نہ کروں تو بول کنتی
اے پیر اپس کرم سوں غائت ۔۔۔ اک شغل کرو مجھے عنایت
جس شغل میں ہوے جیو سہد جوش ۔۔۔ چھک جاے مجھے جو مست مد ہوش
فرماے کہ مجھکو دیکھہ دن رات ۔۔۔ کر سہل ہی دن و کر کٹھن رات
یوں رکھہ تو اپس کے تن میں مجھکوں ۔۔۔ تنہا چھ نہ تن میں میں میں مجھکوں
اس شغل کو بولتے ہیں روحی ۔۔۔ یو صبح سنبھال یو صبوحی
ہر عفو اوپر ہزار زاری ۔۔۔ ہر بال پو لاک بیقراری
بن یار نہ کوی اور ہے یار ۔۔۔ بن دوست نہ دوّسرا ہے غم خوار
اب لگ ہے وہی جلن وہ ہی جاج ۔۔۔ یو عشق جدھر لیگیا اودھر کاج
ہے عمر مرا نو دس برس کا ۔۔۔ جس عشق کو کچھہ پچھانتا ہے
بن عشق مرا برس ہے دس کا ۔۔۔ معشوق ہے کیا سو جانتا ہے

جیسا کہ وہ خود آخر میں لکھتا ہے یہ مثنوی سن لگن سنہ ۱۱۱۲ ھ میں ختم ہوئی - وہ نہایت ایمانداری سے اپنی بے بضاعتی اور کم مایگی کا اعتراف کرتا ہے اور صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ وہ اصول شعر اور فن شاعری سے نا بلد ہے- انھوں کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا نہ کسی شاعر اور عالم کی صحبت سے مستفیض ہوا نہ دور دراز کا سفر کیا اور نہ تجربہ حاصل کیا اور عمر بھر گوگی میں رہا ان کے والد بحر الدین برھان الدین اولیا چشتی کے مرید تھے (اشعار)

میں شعر تو بول جاننا نیں ۔۔۔ یو پت نپت پچھانتا نیں
مجھکو نہ سفر سبق نہ صحبت ۔۔۔ گوگی منے کی یہ عمر اکارت
یک حرف مجھے نہ کن پڑھایا ۔۔۔ قالی چھاڑیا نہ چھر چھرایا
جس فی الھذل انتہے اول پان ۔۔۔ دیویں تو سری تو شاہ برھان
تھا باپ مرا مرید اس گھر ۔۔۔ اس گھر سوں کیا آپس کوں گوھر
اس گھر سوں مجھے بھی بندگی ہے ۔۔۔ مجھہ جیو میں جوت ہوچکی ہے

ایک دیوان ' ایک مثنوی من لگن ' جس کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے اور ایک نظم ھنگاب نامہ بحری سے یادگار ھیں - ایک قلمی نسخے کی صورت میں یہ کل کتابیں میرے پاس موجود ھیں - ان صفحات میں آئندہ میں اسی قلمی نسخے کو الف سے تعبیر کروں گا - بدقسمتی سے کتاب کا آخری حصہ جس میں تاریخ تصنیف کتاب ضرور رھی ھوگی اور جس سے بہت ممکن تھا کہ تاریخ تالیف کتاب معلوم ھوجاتی ضائع ھو گیا ھے - دوسرا قلمی نسخہ (ب) جو صرف مثنوی من لگن پر مشتمل ھے مولانا عبدالحق نے از راہ کرم مجھے عنایت فرمایا ھے اس نسخہ پر سنہ ۱۲۵۰ ھ کا سنہ پڑا ھے - من لگن کا ایک بہت پرانا چھپا ھوا نسخہ بھی دستیاب ھوا ھے جسے میں ان صفحات میں " ج " سے تعبیر کروں گا - یہ نسخہ بمقام مدراس سنہ ۷۲ - ۱۲۷۱ ھ میں چھپا ھے اور حسب ذیل الفاظ پر ختم ھوتا ھے —

الحمدللہ کتاب من لگن بتاریخ بست ھشتم رمضان‌المبارک سنہ ۱۲۷۱ ھ ھجری در مطبعہ عظیم‌الاخباریہ بہ اھتمام ھمام جناب منشی غلام حسین صاحب بزیور طبع مزین گردید - اس کے ساتھ ھی ساتھ کاتب کا قطعہ تاریخ بھی موجود ھے —

ازیں دو گنجینۂ حقائق نقد   پایۂ عارفان بود مرفوع
گفت سالش دلم ز رائے ثبات   منطق و من لگن مطبوع

من لگن در حقیقت ایک طویل مثنوی ھے جو نسخہ الف کے ۱۱۰ صفحات پر' نسخہ (ب) کے ۱۴۴ صفحات پر ختم ھوتی ھے - نسخہ " ج " میں تو یہ مثنوی ۲۲۳ صفحوں پر آئی ھے —

اھل تصوف کے نزدیک پہلی منزل تزکیہ اخلاق کی ھے - ان کے نزدیک صاحب اخلاق وھی ھیں جو خواھشات نفسانی اور حرص وآز کے پھندے سے نکل کر مکارم اخلاق کے خواھاں ھوں - اپنے دلوں سے جھوٹ' کبرونخوت' ایذا رسانی' غیبت دور کر کے اخلاق حسنہ کی طرف رجوع ھوجائیں - بحری کے نزدیک بھی ایک متلاشی

خدا کے لئے تزکیہ نفس پر زور دینا نہایت ضروری ہے - اخلاق کی درستگی اور پاکیزگی کی نہایت ضروری ہے - جذبات لطیف کے اظہار نے پر وہ بھی بہت زور دیتا ہے - سچائی انسان کا جوہر ہے اس لئے اس کا حاصل کرنا ضروری ہے - خود اعتمادی - عدل و انصاف پسندی صلح جوئی انسان کے لئے ضروری ہیں کیونکہ ان کے بغیر زندگی مکمل نہیں ہو سکتی اور فنافی اللہ کا رتبہ نہیں حاصل ہو سکتا یہ مادی دنیا ایک قسم کی بھول بھلیاں ہے جو اس میں پڑا غارت ہو - اعمر عزیز کو تلاش معاش میں بیکار صرف کرنا عقلمندی کی نشانی نہیں —

ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

کچھ خوب نہیں یہ بے لگامی لےکچھ بھی تو بختگی نہ خامی

ہاں خیر کو چاہ چھوڑ دے شر یو خیر یو شر ہے تا کہ محشر

رکھہ نیت اول آپسکی نیت آپس کی سنبھال آدمیت

مت کھول اگر جو کھو لنا ہے تب کھول جو سانچھ بولنا ہے

ایک جھوٹ سوں دوجہاں لرزتا دھرتی سوں مل آسماں لرزتا ہے

غیبت نکو سن بری بنا تی غیبت کو برا وکھے زنا تی

گر کوی تری سوں رنج پائیگا تو ھات میں ہے سو گنج جائیگا

پڑ رہ نہ پکڑ سرا کسی کا فا آس نہ آسرا کسی کا

یو ظلم فنا بقا ہے انصاف ہر بات کو بد رقہ ہے انصاف

ہر بھانت بچن اپر اُڑا دھول اللہ کے کلام سوں ہو مشغول

اس ناں کے تیں ہواہے لت پت سب عمراسی رھت میں گئی گھت

ایک مرتبہ بحری کے پیر ومرشد نے اس سے کہا - اس سو سال کی ریاضت اور محنت کے بعد مجھے صرف دو سبق ملے ہیں - ایک قناعت کا دوسرا ترک دنیا کا - ہاں ایک بات ہمیں اور معلوم ہوئی ہے وہ یہ کہ روزی کا دینے والا صرف رزاق مطلق ہی ہے،

اسی پر ہماری روزی کا انحصار ہے اور دوسرا روزی دینے والا یہاں کوئی نہیں -
اگر قابل قدر کوئی شے ہے تو وہ راست بازی ہے ' اگر محبت کے قابل کوئی چیز ہے
تو وہ عرفان ہے جس کی بدولت دنیا حقیقی بہشت ہوجاتی ہے --

تا دوست نہ یار آشنا پر ہے رزق تیرا سرے خدا پر
ہونا ہے جو دوست دھرم کا ہو ہونا جو شریک شرم کا ہو
ہونا تو عزیز بس ہے عرفان جس تیج تی یو سکل گلستان

طلب حق پر بحث کرتے ہوے پہلے تو وہ عمر گذشتہ پر کف افسوس ملتا
ہے لیکن بعد میں سنبھل کر کہتا ہے اب پچتائے کیا ہوتا جو کچھہ ہونا تھا ہو گیا -
اب ہماری عاقبت بس اسی میں ہے کہ یہ جو گنتی کے چار دن رہ گئے وہ خدا کی
معرفت حاصل کرنے میں صرف کریں کیونکہ وہی پھول اور کانٹے دونوں کی پرورش
کرنے والا ہے اور باغ عالم کے چپے چپے کو روشن اور منورکرتا ہے --

جو شخص محبوب حقیقی سے منحرف ہو کر لذات نفسانی میں پڑ جاتا ہے
وہ دامن انسانیت پر ایک بد نما داغ ہے اس کو انسان کہنا انسان کی تذلیل کرنا ہے -
بحری کے نزدیک بہترین انسان وہی ہے جو محبت کی چتا میں جل کر ستی ہو جاے
کیونکہ ایسے ہی لوگ حیات ابدی کے مستحق ہیں --

لہذا ہماری بہتری بس اسی میں ہے کہ ہم اس سے پریم بیوھار کریں متلاشی
حق کو سب سے پہلے اپنی معرفت ضروری ہے میں کون ہوں - ' کیا ہوں ' ' کہاں سے
آیا ہوں ' ' کہاں جاؤنگا ایسے سولات ہیں جو اپنی معرفت کے لئے لازم ہیں
اگر کوئی واقعی معرفت خدا وندی کا حقیقی متلاش ہے تو اسے نا امید نہ ہونا چاہئے
خدا کے لطف و کرم پر اس کو ایمان لانا ضروری ہے اس کے ساتھہ ہی ساتھہ اس کی
کوشش یہ ہونی چاہئے کہ وہ اس زندگی کو بہترین طریقے سے صرف کرے --

وہ پیو جو پا لیا ہے کل کون کانٹے کو کرم کرے جو گل کون
جی من جر پیاسو مکہ موڑ یا پر پنچ لیا پیا کو چھوڑ یا

اس من نہ کہوں اوس نہ تن ہے　　اس من کو کہوں جس جو من مہن ہے
اس دو ست تی دوستی رکھاے من　　جس دوست کوں دوست دوست دشمن
یعنے تو اپس پچھاں بارے　　تو کون ہے کیا سو جان بارے
رکھنا نیں گر جو تو ہے بیہدی　　رحمت سوں خدا کی نا امیدی
یوں عمر کہیں ہے تو کہیں ہے　　اس عمر کی تجھہ قدر نہیں ہے

فضیلت انسان

کل صوفیائے کرام ' و ہدانتی اورسچ پوچھئے تو ہر عارف خواہ وہ کسی قوم یا ملت کا ہو انسان کو ابدی سمجھتا ہے - یہ درست ہے کہ اس کی ظاہرا شکل و صورت میں تبدیلی ہوتی رہتی اور وہ قانون قدرت کے مطابق پیدائش با لید گی 'انحطاط' ضعیفی اور موت کے مختلف مدارج طے کرتا رہے لیکن باوجود ان سب باتوں کے اس کی روح پھر بھی ان تمام ردوبدل سے بری ہے روح کو کسی حال میں زوال نہیں - یہ ہمیشہ سے رہی ہے اور ہمیشہ رہیگی —

دوسرے عارفان خدا کی طرح بھرتری کا بھی خیال ہے کہ اگرچہ انسان کا تعلق جسم فانی سے ہے جو نحیف و زار ہے ' زوال پذیر ہے اور جو ظاہرا دنیا وی علائق میں بہت جکڑ دیا گیا ہے لیکن فی الحقیقت پھر بھی وہ کسی کا پابند نہیں - یہ تمام قیود اور پابندیاں اس کی آ زاد روح کو پابند علائق نہیں کر سکتی یہ وہ طایر نہیں جو اسیری میں پرواز سے محروم ہو جاے - روح لازوال ہے ابدی ہے خدا نے اس کو قدامت بخشی ہے ' اس لئے کوئی شے اسے پابند سلاسل نہیں کر سکتی —

انسان نور قدیم ہے - وہ اشرف المخلوقات ہے - اور وہی کل مقدس کتابوں کا سرچشمہ ہے - نہ تو وہ جسم ہے اور نہ خواہشات انسانی کا مجموعہ اور نہ وہ دنیائے موہوم کا عکس ہے اس کا درجہ ان سب سے کہیں زیادہ' اعلا و ارفع ہے —

یو جگ ہے جدید آدمی آد　　اس گھر کو یو آدمی ہے بنیاد

اس آدمی بیچ کیا کہوں ہے   سدگیان کی صورت آدمی ہے
تھا آدمی آد میں مکرم   اب کیا تو کہو طلسم اعظم
یو بید پران لے سگھڑ پن   سب من سوں ترے ہوے ہیں اتپن

موت انسان کا انجام نہیں ہوسکتی نہ قیامت اس نور قدیم کو فنا کرسکتی ہے۔ وہ ہمیشہ سے ایک ہی رنگ میں رہا ہے - نہ تو وہ چاند ہے اور نہ سورج ' وہ ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہیگا - اس کی زندگی خدا کے کلام سے وابستہ ہے لہذا اس کا فنا کرنے والا اس زمانے میں کوئی نہیں —

آیانہ کہیں سوجان ہے تان ہے   اک دشت پلیت درمیان ہے
انجام کہے تو اے برادر   نامرگ اسے ہوسکے نہ محشر
یعنی نہ یو شمس نا قمر ہے   اللہ کے امرسوں امر ہے

عرفان

صوفیائے کرام نے عرفان کی اہمیت اور قدرمنزلت پر بہت زور دیا ہے ان کی تصانیف میں اس موضوع پر نہایت وضاحت سے بحث کی گئی ہے - بحری نے بھی اس موضوع پر خوب خامہ فرسائی کی ہے - من لگن کے آٹھ صفحے اس موضوع سے رنگ دئے ہیں۔ سب سے پہلے وہ "عرفان" کی تشریح کرتا ہے اس کے خیال میں عرفان اور گیان میں کوئی فرق نہیں —

کہتے ہیں عرب اگر چہ عرفان   پن ہند کے لوگ بولتے گیان

عرفان ہی سے امرشناسی نصیب ہوتی ہے - جس نے عرفان کو سمجھ لیا اس نے گویا تمام دنیا کے علوم و فنون سے واقفیت حاصل کرلی - عرفان ہی سے مخلوقات کی اصلیت و ماہیت معلوم ہوتی ہے - گیان خواہ ظاہر ہو یا نہاں فوائد سے خالی نہیں — عرفان ہی کی مدد سے انسان زمین آسمان کوہ دشت کے رازہائے سربستہ کو منکشف کرسکتا ہے - عرفان کا تذکرہ متبرک کتابوں میں کیا گیا ہے - لیکن اس کا حاصل کرنا معمولی کام نہیں - صرف وہی عرفانی اور گیانی کہے جاسکتے ہیں جو

زندگی کے اعلیٰ مدارج کو طے کرکے اس کے نشیب و فراز سے خوب واقف ھوچکے ھیں۔ خدا نے جنھیں چشم بصیرت عطا کی ھے وہ دنیا میں گیان ھی سے سروکار رکھتے ھیں اسی پرمرتے ھیں اُسی سے جیتے ھیں دنیا کی اور دوسری چیزیں ان کے نزدیک فضول اور لاطائل ھوتی ھیں - گیانیوں ھی سے انھیں محبت ھوتی ھے اور وہ گیان ھی حاصل کرنےکی کوشش کرتے ھیں - گیان کے حاصل ھوتے ھی انسان تارک الدنیا ھوکر پریم کی آگ میں بھسم ھوجاتا ھے - آرزوؤں کا فقدان ھوجاتا ھے - تمنائیں گھٹ گھٹ کر مرجاتی ھیں - دل میں صرف ایک شے باقی رهجاتی ھے اور وہ خدا کی محبت ھے - یہی سچے گیانی کی نشانی ھے —

غرضکہ اس تمام بحث سے یہ ظاھر ھوگیا ھے کہ عرفان بنائے محبت ھے اور محبت بنائے کو نین ھے اور ھر زمانے میں متلاشیان حق نے گیان حاصل کیا ھے انھیں عارفوں نے سچی روشنی ھمیشہ حاصل کی ھے۔

اشعار

یو گیان گپت یو گیان پرکھت — کیتا ھے یو گیان کھو ر کھٹی کھٹ
یو بید پران شاستر گیان — ابرا اچھو بھرتے آستر گیان
اس گیان کو گیان ھی رجھاوے — اس گیان کو گیان ھی کھجاوے
گیانی ھوتو گیان کو پکڑ خوب — گیانی ھے محب توگیان محبوب
گیانی منے جب یو گیان آوے — ویران کرکے اپس بساوے
اے عشق تو کاں گیا شتاب آ — ات گرم ھو جیوں کہ آفتاب آ
ھر دور میں ایک دوج گیانی — اس گیان کو پھوڑ کر پچھانی

دوسرے سیاروں کے رهنے والے بھی اکتساب علم حقیقی (عرفان) کو اپنی زندگی کا مقصد واحد سمجھتے ھیں - ملائک تک علم حقیقی کے سامنے سرنیاز خم کرتے ھیں صرف انسان ھی نہیں بلکہ کل موجودات عالم عرفان کے حکم ناطقہ پر چلنے کی کوشش کرتی ھے—

یو گیان ھوا فلک کوں مقصود   یو گیان ھوا ملک کوں مسجود
آدم کی اگی نہ سر دھری او   اس گیان کو سب سرن کری او

وجود ملکوتی

کل عارفان خدا ایک وجود ملکوتی کے قائل ھیں سبھوں کا خیال ھے کہ اس عالم سفلی کے علاوہ ایک عالم اور بھی ھے جو اس سے کہیں زیادہ بالاوبرتر ھے- بحری اُس ان دیکھی دنیا کا معتقد ھے - اس کے نزدیک جسم ایک غلاف ھے جس میں ایک لطیف شے (روح) مسکن گزیں ھے یا یوں خیال کرو کہ جسم کھال یا چھلکا ھے - گودا یا گری اس کے اندر پنھاں ھے - روح قدیم ھے اور جسم جدید اول الذکر قوی ھے مگر موخرالذکر ضعیف موت اور نیند سے اس کا کوئی تعلق نہیں - بدن کثیف ھے مگر روح صاف شفاف ھے صرف محبت اور غور و فکر کی مدد سے ھم اس لطیف شے کو پروان چڑھا سکتے ھیں - پھر اس کی تہ میں ایک لطیف شے اور ھے - اس کا نام ' کارن ' ھے یہ چیز لطیف تریں ھے اور اس کا سمجھنا ذرا بہت مشکل ھے -

اے دوست او تن جو جیو میں جوی ھے   کچھہ بول جو سکشمی ھے
ناموت کو ستے سروت   نا نیند کو اس اوپر ھے قوت
میلا ھے یو تن او صاف سمجھو   اس تن کو یو تن غلاف سمجھو
او دیہہ قدیم یو نوی ھے   یہ دیہہ ضعف او قوی ھے
اس سول کے بیچ اور کارن   برزخ سوتو سوکشم بھی ھاں گن

صاحب بینش اور وحدت وجود

بحری کے نزدیک صاحب بینش وہ ھے جو موجودات عالم میں اتحاد اور یگانگت دیکھہ سکے - دودہ ' دھی ' مکھن ' مٹھا سب میں دودہ کا عنصر غالب ھے اور ایک ھی چیز مختلف طریقوں سے ھمارے سامنے آتی ھے - اسی طرح خدا ھر شے میں ساری و طاري ھے - اور وہ مختلف شکلوں میں انسان کو اپنا جلوہ دکھاتا

رهتا هے- هر شے کو مظهر ذات باري سمجهو "هرچه بینی بدان که مظهر اوست" - انسان وهی هے جو نیرنگی عالم کو دیکهتے هوے بهی یکرنگی کو فرو گذاشت نه کرے اور فنا فی الله کا درجه حاصل کرنا عین سعادت سمجهے- فی الواقعی صاحب بینش وهی هے جو حسن مطلق میں جذب هو کر اپنی هستی متاوے - جس طرح شکر پانی میں مل کر اپنی هستی فنا کر دیتی هے ویسے هی انسان کو چاهئیے که ذات باري میں محو هو کر اپنی هستی فراموش کردے کیونکه یهی راز زندگی هے اور یهی اصول حیات هے —

هر کار منے هے نور اس کا　　　هر بار منے ظهور اس کا
یو گیاں نوا هے یا پرانا　　　هوتا نه ادک نه کم هو جانا
الله سوں کل نبی هیں شکر　　　تو جان کرو کوں کلشکر کر

فضائل روح

دنیا کی ساری زیبائش اور حسن محض روح سے هے - روح جسم پر حکمراں هے روح عکس عالم هے جنهیں منعم حقیقی نے چشم بصیرت دی هے اس کے فضائل سے متاثر هوتے هیں —

عاشقان روح شاهدان خوش رو سے دل نهیں لگاتے انسان روح کی اهمیت اور اس کی قدر و منزلت نهیں سمجهه سکتا - صرف خدا هی کو روح کی ماهیت معلوم هے —

۱- اس روح نے هے جگت کو رونق　　　بهرام سواد یو جیو کی خورنق
۲- اس پند پتن کو روح راجا　　　پت اس کوں نظر نه دوسراجا
۳- یو جیو تر انچه آئنه هے　　　سب اس میں جوتجهه معائنه هے
۴ دیکها هے جهاں جیو کا جن　　　جانے هے کهاں پیو کا تن
۵- جس بهید کهیں سو او هے اولا　　　جانے وه هے ایک حق تعالی

اسرار نفس

دل خدا کا مقام ھے اور پیغمبر کا مسکن - محبوب ازلی ھمیشہ ھمارے دلوں میں رھتا ھے پھر ایسی حالت میں سوال یہ پیدا ھوتا ھے کہ باوجود اس حقیقت کے ھمارا دل اس کی تلاش و جستجو میں کیوں سرگرداں اور پریشان رھتا ھے -

روح جمیل بھی ھے اور مظہرالعجائب بھی- دل خدا کا عرش بریں ھے ' اس میں مصطفیٰ کا نور ھے - یہ فضائل علم سے مالا مال ھے - اس کو زوال نہیں - روح دانا ھے عقلمند ھے- اس کی قسمت میں قسام ازل نے " (ابدی) " لکھدیا ھے- اگر روح کا وجود نہ ھوتا تو کوہ اور آسمان کا وجود کہاں سے ھوتا - روح ھر قسم کے علم سے متصف ھے لہذا ھمیں کبھی اس کے خلاف عمل نہ کرنا چاھئے —

۱- اودل کہ جو عرش ھے خدا کا منظور نظر ھے مصطفیٰ کا

۲- مادام او دست دل میں بستا یہ کیا جو دل اس لئے ترستا

۳- یو جیو جمیل تن ھے تائب یو من اھے مظہر العجائب

۴- من کیا تو محل ھے خوش خدا کا من نور ھے پاک مصطفیٰ کا

۵- جگ جام منے یو من ھے جیوں مد من عین حقیقت محمد

۶- دانا ھے یو دل یو روح بیدا اس نفس کے تیں لکھا ھے جینا

اسرار بیخودی و ذکر منصورانالحق

صوفیوں کے نزدیک وجود انسانی جسم' روح اور حواس خمسہ پر مشتمل ھے : یہ اشیائے ثلاثہ وصل و اتحاد میں رکاوٹیں پیش کرتی ھیں - دلیل یہ پیش کی جاتی ھے کہ انسان در حقیقت روح ھے اور خصوصیات خداوندی کا شریک ھے ' لہذا یہ ضروری ھے کہ طالبان صراط مستقیم رفتہ رفتہ خواھشات نفسانی پر قابو پالیں ورنہ خدا کا دیدار نہیں نصیب ھوسکتا اور نہ وہ حقیقی معنوں میں خود بھی طالب وصل ھوسکتے ھیں - روح انسانی اور روح اعلیٰ میں کوئی خاص فرق نہیں ھے' دونوں قریب قریب ایک ھی ھیں جو لوگ روحانی زندگی پر ایمان لاکر اُس کے مطابق اپنی زندگی کی نشو و نما چاھتے ھیں وہ مجبور ھو کر

علی الا علان پردہ دوی کے ٹکڑے ٹکڑے کردیتے ھیں اور من وتو سے بے نیاز ھوکر اتحاد وصل کا راگ الاپتے ھیں - ان کے نغموں میں دل کشی ھو تی ھے ' دنیا ان کی قدر کر تی ھے کیو نکہ انوہیں کے باعث تو دنیا کا وجود ھے - اسی کو بحری راز خودی اور اناالحق کے نام سے تعبیر کر تا ھے —

۱ - اس وقت میں بیخودی سوجھے گا　　یو خود نین نور ھے خدا کا

۲ - کر مجھکو توپوچھتاھےکچھہ پسند　　تو لے یہ خودی خدا کی سوگند

۳ - جس خاص خودي سوں آ شنا ھے　　تس پاس خودی نہیں خدا ھے

عارفان خدا اور ان کی چشم بصیرت کا تذکرہ کر تے ھوے بحری رقم طراز ھے کہ ان کی نشانیاں عجیب ھیں اور اس قدر کثرت سے ھیں کہ ان کا امتیاز کر نا بھی ذرا مشکل ھے - ان کے عادات و اطوار عام لوگوں سے بالکل مختلف ھیں ذات باری میں وہ اس طرح محو اور مستغرق ھیں کہ انھیں دنیا و مافیہا کی با لکل خبر نہیں - دنیا ان کو خدا کے سچے بھگت کہہ کر یاد کرتی ھے - بیشک یہی خدا کے دوست ھیں اور رسول کے محبوب سارا جہاں ان سے محبت رکھتا ھے - جہاں جا تے ھیں ان کی قدر ھوتی ھے - دکھہ سکھہ میں وہ ایک ھی طرح رھتے ھیں - خدا نے ان کو مستقل مزاجی کی نعمت عظمیٰ سے بہرہ اندوز کر رکھا ھے -

۱- پورا جو ھوا ھے گیان جن کا　　تت کر جو گیا گمان جن کا

۲- ھیں ان کی علا متاں بھی نیا رے　　اس راہ سوں رسم سوں کنا رے

۳- سپنا چھپے جاگرت کے تن میں　　ھو روونچھ بی جاگرت سیں من میں

۴- کارن رھے سوکشم سوں مل جو ل　　استھول میں جویکہ پیت میں سول

۵- نہ ان منے نا و ھے نہ تاڑا　　اک جانتے نرم اور کڑا ڑا

۶- کس پاس نہ دان مانگتے ھیں　　مانس سوں نہ مان مانگتے ھیں

۷- نا لاگ رھے نہ چھوڑ دیوے　　مکھہ اننکا یار طرف مڑ وڑے

۸- میں توں سوں ھے توں نیں تومیں‌نیں　　بن دو سرے کیوں کلاویکا میں

۹- گر اپنے حق کی ذات میں محو   نا بول بیچار بات میں محو

' سماع '

راگ سے محبت رکھنے والے رشی ہوتے ہیں - نغمہ صرف آگ ہی نہیں روشن کرسکتا بلکہ اس کی مدد سے شیر کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کئے جاسکتے ہیں - نغمہ تفکرات دنیوی سے بچاتا ہے - انسان کے دل میں پریم کی آگ بھڑکاتا ہے - ہر شخص نغمے سے متاثر ہوتا ہے- زیادہ تر وہ لوگ جو پہلے ہی کسی کے تیر نظر کے شکار ہوکر محبت کی دیوی کو سجدہ کر چکے ہیں - نغمہ انسان کو آلائش دنیوی سے بچاتا ہے نغمۂ حقیقی خواہشات نفسانی کو دور کرتا ہے —

یہ وہ لوگ ہیں جو ہر حال میں شکرایزدی بجا لاتے ہیں یہ آرام اور تکالیف دونوں سے بے نیاز ہیں - ان کو نہ مرنے کا غم ہے نہ جینے کی شادی - وہ کسی کے سامنے دست طمع نہیں دراز کرتے نہ تو خود ان کی یہ خواہش ہے کہ لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سرنیاز خم کریں - یہ وہ لوگ ہیں جو ہر قسم کے معائب سے بری ہیں - ان پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا صرف خدا ہی ان کا مرجع ہے- یہ وہ لوگ ہیں جو ہروقت خدا کے گیان میں محو اور مستغرق رہتے ہیں - انھیں اتنی فرصت کہاں جو دنیا کے جھگڑے بکھیڑوں میں پڑ کر عمر عزیز کو ضائع کریں - ان کے نزدیک وصل ہی بہترین زندگی ہے - خدا کی محبت میں ہر وقت مست رہنا اور اس کے نام کی مالا جپنا ہی ان کے لئے اصلی زندگی ہے - یہی وجہ ہے کہ لوگ رشیوں اور فقرا کو لا زوال اور بقائے دوام کا مالک سمجھتے ہیں - باد مخالف ان کے شمع حیات کو گل نہیں کر سکتی - یہ دنیا میں رہبر ازل ہو کر آئے ہیں - اگر تم کبھی ان سے باتیں کرو گے تو تمھیں معلوم ہو گا کہ وہ کہاں تک خدا کے سچے شیدائی اور بھگت ہیں - " ذرہ ذرہ میں ہے جلوہ تیرا " کی صدائیں ان کے رونگٹے رونگٹے سے بلند ہوتی ہیں - ہر شے کو وہ مظہرذات باری سمجھتے

ھیں- "جدھر دیکھتا ھوں اُدھر تو ھی تو ھے" کے نعروں سے دنیا کو سکوں دے رکھا ھے- ان کا عدم دنیا کا عدم ھے - ان کے بغیر دنیا ایک تودۂ خاک ھے اور کچھہ نہیں ترک دنیا نغمہ کا بدل ھے - نغمہ پتھر کو پگھلا کر موم کر تا ھے - بجھے ھوے کوئلوں کو چنگاری میں تبدیل کر تا ھے - مو سیقی غذاے ر و حا نی ھے ' یہ محبوب کو بھی پسند ھے —

دنیا موسیقی ھی سے قایم ھے - اگر موسیقی نہ ھوتی تو دنیا کی ساری چہل پہل دست برد زمانہ کے نذر ھو جا تی - بیکار وقتوں میں بادشاہ کی انیس ھے راگ روح کی زندگی قایم رکھتا ھے - راز ھاے سربستہ اس سے منکشف ھو تے ھیں موسیقی اتحاد کا پہلا زینہ ھے - راگ سے متاثر نہ ھو نے والے آ گ میں جھونک دینے کے قابل ھیں - وہ فی الحقیقت انسان نہیں کہے جا سکتے ' ان لو گوں کو خدا نے درد مند دل نہیں عطا کیا - یہی سنگدل اور جفا پیشہ کہلا تے ھیں لحن داؤدی اھل درد کی غذا ھے - اسی کی بدولت وہ حسن و عشق کی دشوار گذار گھا ٹیاں خوشی خوشی دم کے دم میں پار کر لیتے ھیں - نغمے سے عشق کی نشوونما ھے- اگر نغمہ نہ ھو تو عشق کی شوریدگی میں کمی آجاے - اور اھل دل لذت عشق سے عاری ھو جائیں- نغمہ ھی سے جوش و خروش عشق میں اضافہ ھو تا رھتا ھے اور ایسے ھی لوگ تو اولیا ھو تے ھیں —

۱- جون راگ کو دوست کر لیا ھے	توں بوج او بیشک اولیا ھے
۲- یو راگ نہ آ گ ھے جلا تی	یو راگ نے باگ پہاڑ کھا تی
۳- یوں راگ سوں روگ تن تی بھا گے	اس راگ سوں بھوگ من میں جاگے
۴- ھر تن کو لگے یو راگ آ لا	یو جیو جلیاں کی دل دو بالا
۵- بیرا گ لا و تا ھے یو راگ	اس راگ کوں مول کیا تو بیراگ
۶- یو راگ خوراک جیو کا ھے	یو راگ خوراک پیو کا ھے
۷- اس راگ سوں رنگ ھے جہاں کو	اس راگ سوں سنگ ھے شہاں کو

۸- اس راگ سوں رشد روح کوں ہے یو راگ سبب فتوح کو ہے

۹- جس جیو کے تیں نہ راگ لاگے تس جیو بھلا جو آگ لاگے

۱۰- مانس نہیں مانس ھاڑ ہے او پولاد ' پتھر ' پہاڑ ہے او

۱۱- اس راگ سوں جوش دردکو ہے ہور اونچہ خروش مرد کو ہے

غزلیات

اس مجموعہ میں کُل ایک سو گیارہ غزلیں ھیں - موضوع محبت ہے - عشق مجازی و عشق حقیقی پر نہایت زوروں کے ساتھہ بحث کی گئی ہے- غزلوں کے بعض بعض اشعار تو حقائق و معارف سے مالا مال ھیں - ان اشعار میں عشق حقیقی کا وصل ترک دنیا' ترک آرزو پر نہایت قرینے کے ساتھہ روشنی ڈالی گئی ہے - بعض بعض اشعار ذومعنی ھیں لیکن- تاویل سے عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں پر روشنی پڑتی ہے 'بحری' نے غزلوں میں جدت طرازی نہیں کی - اور یہ تو ھمیں بخوبی معلوم ہے کہ اُردو اور فارسی شاعری میں ھمیشہ اس قسم کے اشعار ھوتے ھیں' جو عشق کے دونوں رخوں کو ظاھر کرتے ھیں - طالب حق انہیں شعروں کو پڑھکر عشق حقیقی سے بہرہ اندوز ھوتا ہے- عاشق مجازی انھیں اشعار کو پڑھ کر معشوق مجازی کی یاد تازہ کرتا ہے —

پانچویں غزل جو کُل دیوان میں اپنی قسم کی ایک ھی غزل ہے بے نقط ہے- فارسی زبان کے ۳۲ حروف تہجی میں ۱۵ حروف بے نقط ھیں ھرشخص‌میں یہ قابلیت نہیں ہے کہ غزل کی غزل بے نقط کہہ سکے اور پھر ایسے زمانہ میں جب اردو ابھی اپنے پیروں پر کھڑی ھی نہیں ھوئی تھی اور چند لوگوں کے سایۂ عاطفت میں گمنام پر ورش پارھی تھی - اس سے 'بحری' کے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے - اس سے صاف ظاھر ھوتا ہے کہ بحری کو اُردو زبان پر کس قدر قدرت حاصل تھی - وہ غزل پوری ھوبہو درج کی جاتی ہے —

۱- محمد کر مدد ھوگا ھمارا سکل دکھہ درد رد ھوگا ھمارا

۲۔ اگر صحرا رھو مل دام ھور دد   او سارا دام دد ھوگا ھمارا

۳۔ اگر عالم سکل آکا عدو ھو   او اللہ الصمد ھوگا ھمارا

۴۔ کرم اس کا دس آکا کم ھوھرگاہ   اگر کو لا اسد ھوگا ھمارا

۵۔ موحد کا معما کھول محمود   او احمد کر احد ھوگا ھمارا

ایک غزل میں وہ ترک وطن کا ارادہ کرتا ھے لیکن جب گھرکی محبت بہت ستاتی ھے تو 'بحری' اپنا ارادہ فسخ کردیتا ھے - اور پھر تو دکن کی محبت کی تشبیہہ نل اور دمن کی محبت سے دی جاتی ھے —

بحری کو دکھن یوں ھے کہ جیو نل کوں دمن ھے

پس نل کوں ھے لازم جو دمن چھوڑ نہ جانا

ایک غزل میں اپنی معصیت کا بڑی اعتراف کیا جاتا ھے اور اس کا تذکرہ نہایت گریہ و زاری کے ساتھہ ھوتا ھے - جب مایوسی بہت زیادہ ستاتی ھے پیر سے دعا کے طالب ھوتے ھیں - کہتے ھیں پیر و مرشد میری مدد کیجئے - میں نے اپنی تمام عمر لہولعب میں ضایع کردی ھے' تمھارے ھی وسیلے سے نجات ھوتو ھو اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں دکھائی دیتا' اگر تم میری مدد کرو تو کیا عجب میرا دامن معصیت بالکل دھل جاے - مدد کا وقت ھے' مدد کیجئے - ورنہ میری زندگی گئی اور میں بے موت مرا —

لیکن احساس کمزوری و معصیت سے ھمیں یہ نہ خیال کرنا چاھئےکہ ھمارا مصنف واقعی آلودہ دامن تھا - یہ تو قریب قریب ھر بزرگ کا وطیرہ ھے- جب کبھی انہیں کچھہ سپرد قلم کرنا ھوتا ھے تو وہ سب سے پہلے اپنی عبدیت اور معصیت کا اظہار کرتے ھیں --

اچھا اب سوال یہ پیدا ھوتاھے کہ آخراس اظہار عبدیت و معصیت کی کوئی وجہ بھی ھے-کیا وہ اپنی معصیت عظیم کی وجہ سے استغفار کر تے ھیں- نہیں نہیں وہ لوگ اظہار معصیت محض اس لئے کرتے ھیں تا کہ وہ اپنی عبادت' زھد و تقویٰ پر تکیہ

کرکے بیٹھہ نہ جائیں-انہیں کہیں اپنی پارسائی پر غرور نہ آجاے کیوں کہ دنیامیں ان لوگوں سے زیادہ بیوقوت اور نادان اورکوئی نہیں ھے جواکتساب فضل پر قانع ھوجائیں۔ عزازیل کی مثال ان کے سامنے موجودھے-وہ خوب سمجھتے ھیں کہ انسان کو ھر وقت اپنے گناھوں کی معافی مانگتے رھنا چاھئے کیوں کہ اسی میں اُن کی فلاح ھے —

سنت دیرینہ کے مطابق ھمارا مصنف بھی اپنے لئے ایک تخلص تلاش کرتاھے اوربڑی چھان بین کے بعد تخلص 'بحری' کا اپنے لئے انتخاب کرتا ھے-جیسا کہ عام اُردو اورفارسی شعرا کا دستور ھے ' بحری' بھی غزل کے آخر میں تخلص لانے کی کوشش کرتا ھے لیکن دکھن کے دستور کے مطابق کہیں کہیں وہ اپنا تخلص بدل بھی دیتا ھے۔ چنانچہ ھر غزل کے آخر شعر میں 'بحری' تخلص کرتے کرتے کبھی کبھی محمود بھی لکھہ جاتا ھے جو اس کا اصلی نام ھے —

..وحد کا معما کھول 'محمود' او احمد گر احد ھوگا ھمارا

بعض بعض غزلوں میں تو ضرورت شعری کی وجہ سے مقطع میں تخلص بجاے 'بحری' کے 'بحریا' باندھا ھے —

اس فنا میں جی بقا کا بھید ھے سو بحریا جیوتی مرکے جیا اسی وجیان کو پوچھنا

شعراے فارسی کے نزدیک تو یہ جایز ھے لیکن زمانۂ حال کے شعرا اسے معیوب سمجھتے ھیں —

ایک غزل کے مقطع میں وہ اپنا نام اور تخلص دونوں بڑی خوبی سے لاتا ھے —

محمود کوں بحری جو لقب ھے یارب ... ...

اگرچہ عام طور سے بحری معارت نگار ھے کیونکہ فی الحقیقت اس کی شاعری میں تصوت کا رنگ زیادہ غالب ھے ' لیکن بعض بعض موقعوں پر اس نے عشق مجازی کے مختلف مرحلوں کو بھی نہایت کامیابی کے ساتھہ دکھایا ھے عشق مجازی کو نہایت وضاحت سے بیان کرتا ھے - وہ بھی معترت ھے کہ عشق مجازی عشق حقیقی کا پیش خیمہ ھے - عشق مجازی ھی سے وہ عشق حقیقی کی طرت

رجوع ہوا ہے، وہ کثرت ہی سے وحدت کی طرف آیا ہے - عشق مجازی ہی کے طفیل میں مایا کے مختلف منازل مراحل طے کر کے وہ اب اس قابل ہوا ہے کہ خدا کا گیان حاصل کر کے اس پر اپنا تن من دھن سب نچھاور کردے - وہ مایا سے پریشان ہوکر پریم کی اس دھکتی ہوئی آگ میں کودنا چاہتا ہے کیونکہ اس پریم کی آگ سے حقائق و معارف کے شعلے بلند ہو ہو کر انسان کو روحانیت کی طرف لےجاتے ہیں —

۱- مجھ اس مکتب مجازی میں جو عشق استاد نا ہوتا
تو میرے دل سوں کثرت کا سبق برباد نا ہوتا

۲- جیوں کو ماتی میں ست اس من کو نیچایا سو تو نچھ
اد مورت پرورش پانے کوں من معد ہوا

۳- تن کو کھو اس من میں من ہونا یکایک مفت میں
جیو اپنے جیو کوں ماتی ملایا من ہوا

مراثی

اس مجموعے میں چار مراثی ہیں - لیکن ایک مرثیہ بھی واقعات کربلا کو جانگداز وضاحت کے ساتھ نہیں بیان کرتا ، اگرچہ بعض بعض جگہ شہادت حسین کی طرف اشارہ ضرور کیا جاتا ہے - ایک مرثئے میں تو صرف فضائل محرم سے بحث کی گئی ہے - شروع شروع میں مرثیہ چو مصرع ہوا کرتا تھا لیکن بعد میں وہ مسدس کی شکل میں آ گیا - مگر ' بحری ' اس روش سے بیگانہ ہوکر غزلوں اور سلاموں میں مرثیہ گوئی کرتا ہے - ایک مرثیے کے شروع اور آخر کا شعر ملاحظہ ہو -

یو محرم کچھ آج کام کیا — سواو کیا جگ پر سکہ حرام کیا
شہ سوں پایا شفاعت اے بحری — جب توں یو مرثیہ تمام کیا

دوسرے مرثیے کے چند اشعار بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے —

۱- جب شاہ کے وجود مبارک پہ غم ہوا — تب سب جہاں تی حرف خوشی کا عدم ہوا

۲- پیغمبراں میں جیوں کہ محمد سوں ختم ہے — یوں غازیاں میں شہ کی عزا سوں ختم ہوا

۳- جے کوئی دل میں شاہ کے غم کا نہال لایا — اودل یقیں کہ حشر کوں باغ ارم ہوا

۴- 'بحری' مدام شاہ کے ماتم میں یوں گلے — جیوں چاند آسمان پہ گل گل کے کم ہوا

قصائد

اس نسخے میں صرف دو قصائد ہیں اور دونوں شیخ محمد باقر (رح) کی تعریف میں لکھے گئے ہیں - پہلے قصیدے کا آخری شعر نہایت معنی خیز ہے —

سچ کہنا سچ میں رہنا — سچ سہنا سچ میں بہنا

مثلث یا سہ مصرعہ تین ہیں - ناظرین کی تفریح طبع کے لئے ایک درج ذیل کیا جاتا ہے —

مرشد مرا مجھ کو حق کی مارگ لایا
حق کی نظر سوں شاہ اپنا منجی حق سمجھایا
دو پن تھا سو دور کر حق میں سمایا

بنگاب نامہ

میرے خیال میں کسی دوسرے شاعر نے بنگاب کو شراب معرفت کے معنی میں استعمال نہیں کیا - اہل تصوف تو اس کو شراب ہی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 'بحری' نے بجائے لفظ شراب استعمال کرنے کے بنگاب کیوں استعمال کیا - اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ وہ شیو بھگتوں سے زیادہ میل جول رکھتا تھا اور یہ شو بھگت وہ لوگ ہیں جو بنگاب کو شراب معرفت سے تعبیر کرتے ہیں - 'بحری' ان لوگوں سے مراسم رکھتا تھا اور یہ لفظ اس نے انہیں لوگوں سے لیا ہوگا - بہرحال یہ تو قیاس ہی ہے لیکن اس سے کم از کم اتنا تو ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا مصنف کس قدر روشن خیال اور بلند نگاہ ہے اور وہ کس قدر

اپنے پڑوسیوں کے ساتھہ میل جول رکھتا ہے - اس نظم کو بارہ جام میں تقسیم کیا ہے اور ہر جام میں بنگ اور بنگاب کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں —

بنگ فارسی لفظ ہے اس کو سنسکرت میں بھنگ کہتے ہیں- بھنگ ایک منشی گھاس ہے ' شراب کی طرح اس کو پی کر انسان کو ایک عجیب قسم کا سرور حاصل ہوتا ہے- بنگاب اس گھاس کی پتیوں اوردوسری چیزوں کے ملانے سے بنتی ہے- مگر اصطلاحاً بھنگ کے معنی عرفان اور گیان کے ہیں - اصطلاح میں بھنگ حقیقت کلی کو بھی کہتے ہیں جو غیر حادث اور ہر شے کا اُصول اولیں ہے-لیکن اس علم حقیقی کو محض محبت کی مدد سے حاصل کر سکتے ہیں- محبت بنائے علم حقیقی ہے- پہلے عاشق صادق بنو اور راز عالم تم پر خود بخود منکشف ہوجائیگا - اس کی مرضی کو اپنی مرضی سمجھو اور اس میں محوومستغرق ہوجاؤ' مگر یہ محویت اوریہ استغراق صرف خودی مٹاکر نصیب ہوسکتی ہے-اس کے حاصل کرنے کے لئے اس میں ایک چیز کی اور ضرورت ہے اور وہ شراب محبت ہے ' کیوں کہ شراب معرفت دافع خودی ہے اور بے خودی محویت و استغراق کا پیش خیمہ ہے —

اگر یہ نکات ذہن نشین کرلئے جائیں تو اس نظم کا سمجھنا بالکل سہل ہوجائےگا اور پھر لطف دوبالا ہوجائیگا —

بنگاب نامہ بارہ قطعات پر مشتمل ہے - ہر قطعہ کا نام جام رکھا گیا ہے تاکہ بنگ کی تمثیل برابر نظر کے سامنے رہے -

جام اول

بنگ سے مراد علم قدیم ہے - بنگ سبب ہے اور محبت اس کا لازمی اثر - جس طرح سبب کا نتیجہ اثر ہوتا ہے اسی طرح بنگ کا نتیجہ محبت ہے - محبت اثر ہے اور اسی اثر میں کو ہر ہستی کا مسکن ہے یہ گویا جوہر الفت کی شمع ہے - اس بنگ سے آدم صفی کا وجود ہوا - صرف آدم صفی ہی میں بنگ نے اپنا پورا پورا اثر دکھایا ہے - بنگ امانت ہے مگر اظہار نہیں اور اُسے تم بنگاب میں

نمایاں دیکھ سکتے ہو —

جام دوم

بنگ بادشاہ عالم ہے - یہ شاہی جواد مطلق نے اپنے ہاتھوں اُسے عنایت فرمائی ہے - یہ فلسفہ اخلاق کا جو ہر ہے نہیں نہیں بلکہ یہ بنائے اخلاق ہے۔ بنگاب رہنمائے عالم اور معلم کُل ہے —

جام سوم

بنگاب لازوال ہے اور لاانتہا - مگر اس کا ملنا ہر شخص کی قسمت میں نہیں مگر کوشش کرنا تمہارا فرض ہے - اس سر چشمہ بنگاب پر سر نیاز خم کرو کیوں کہ اس کا ایک شمہ بھی تمہاری مصیبتوں کو دور کردیگا۔ یہ تحفہ ملکوتی ہے - یہ تمہارے لئے آب حیات سے کم نہیں وغیرہ وغیرہ —

جام چہارم

بنگ سات صفات پر مشتمل ہے - ان میں سے پانچ تو حواس خمسہ ہیں جنکی بدولت ہمیں عالم ظاہر کا علم ہوتا ہے - انہیں حواس خمسہ کی بدولت ہم میں کام کرنے کی اہلیت پیدا ہوتی ہے اور اس کی بدولت ہم دنیا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں - اس کے وجود کے متعلق شبہ کرنا عقلمندوں کی نشانی نہیں - نہ تم یہ گمان کرو کہ بنگ بلکل فضول ہے۔ یہ کل چیزوں سے اعلیٰ و ارفع ہے —

جام پنجم

بنگ سے مراد ذات باری ہے - ایک زمانہ وہ تھا بنگ بنگاب سے بے نیاز تھا جب سے اطمینان کلی نصیب تھا اور اپنی ذات پر نازاں تھا - یہ اس وقت کا تذکرہ ہے جب نہ آسمان تھا اور نہ لوح و قلم، جب موجودات عالم کا پتہ بھی نہ تھا اور جب چار دانگ عالم میں ہر طرف اس کا ظہور تھا لیکن آخر کار اُس ذات مخفی (بنگ) سے عالم ظاہر کا وجود ہوا اور پھر اُس سے دوسری چیزیں حیز وجود میں آئیں —

جام ششم

بنکاب کو بظاہر سر سبز مگر اندر سرخ دیکھکر شاعر اس کو حنا سے تشبیہ دیتا ہے جس کی ہری پتیاں دست معشوق کو سرخ بنا دیتی ہیں—

غرضیکہ اس کے نزدیک بہی انسان کو ظاہری صورتوں پر نہ جانا چاہئیے کیوں کہ وہ ہمیشہ دھوکا دیتی ہیں - جسے تم حقیقت اور اصلیت سمجھے ہو وہ در حقیقت اصلیت نہیں ہے اور جسے تم اصلیت و حقیقت نہیں سمجھتے وہی فی‌الواقع حقیقت ہے —

جام ہفتم

حقیقی بنکاب نور ہے اور جام عرفان اسی سے لبریز ہے - کل دنیا اسی کا مظہر ہے اس کے ایک ایک رنگ سے لاکھوں رنگ کا ظہور ہوتا ہے - وہی بنکاب ہر شے میں ساری و طاری ہے - شاہد و شہود دونوں اس کے عقیدت مند ہیں طالب وسطلوب اس کے علم بردار ہیں - بغیر اس کے روح انسانی بیچین ' پریشان حال اور خستہ نظر آتی ہے - اس کے بغیر گیان نہیں حاصل ہوسکتا —

جام ہشتم

تم اپنے خواہشات نفسانی بنکاب کے تابع رکہو - رنج ' خوشی ' بھوک ' پیاس ' تمنائیں اور آرزوئیں سب بنکاب کے زیر تحت رہیں تو انسب ہے - عالم ظاہر کی چیزیں اعلیٰ زندگی کے تابع ہیں - یہی راز زندگی ہے اور بغیر اس کے کسی چیز کا حاصل کرنا ممکن نہیں —

جام نہم

عشق مجازی سے عشق حقیقی کی تکمیل ہوتی ہے کیوں کہ کرۂ بنگ میں صرف دوہی چیزیں اس قابل ہیں کہ ان کے لئے کوشش کی جاے ' ایک معشوق دوسرا بنکاب - جنہیں کسی سے محبت نہیں ان کی زندگی بے کار ہے - بنکاب سے سروکار نہ رکھنے والے بے لطفی کی زندگی بسر کرتے ہیں - ان لوگوں سے کہدو کہ

عشق‌ورزی اور بنگاب نوشی سے اجتناب نہ کریں ورنہ یہ گُھٹ گُھٹ کے مریں گے اُس سے کبھو دام محبت میں گرفتار ہونا بقائے انسان کے لئے نہایت ضروری ہے —

جام دہم

بنگاب بغیر موسیقی فضول ہے - گانے ہی سے تو بنگاب پر رنگ چڑھتا ہے - بغیر سرود بنگاب نوشی میں کوئی لطف نہیں - بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گانا بری چیز ہے ، شرعاً حرام ہے - کاش اُنہیں معلوم ہوتا کہ یہ قربت حقیقی کا ذریعہ ہے - جن کو خدا نے چشم بصیرت نہیں عطا کی موسیقی کی قدر نہیں کرتے - کچھ فریب خوردۂ الفت ہی نغمہ کی قدر و منزلت کرسکتا ہے —

جام یاز دہم

ہماری موجودہ قابلیت ہماری موجودہ شکتی بنگاب ہی کی بدولت ہے - بنگاب کے متوالے اور کسی شے سے تعلق رکھنا حرام سمجھتے ہیں - یہ بنگاب علم کا باعث ہے - اس کی بدولت وہ سچ اور جھوٹ میں تمیز کرتے ہیں - اسی بنگاب سے انہوں نے کل علوم حاصل کئے ہیں —

جام دواز دہم

شاہ محمد باقر سالک راہ ہدیٰ ہیں - وہ بھی بحر بنگاب کے غواص ہیں - وہ محفل بنگاب کے محبوب ترین ساقی ہیں - باغ بنگ کے وہ باغباں اکمل ہیں - جس کسی کو وہ جام بنگاب دیدیتے ہیں وہ شقایق کی طرح سرخ ہوجاتا ہے - بنگاب کے سربستہ ہائے راز کو انہوں نے منکشف کردیا ہے - وغیرہ —

۱-	چھوڑ یو سب طرز توں تسلیم ہو	پگ تلے تسلیم کے جیوں میم ہو
۲-	جیو کو بنگاب پلا شاد رکھہ	دل سوں درویش ہو دل آزاد رکھہ
۳-	پھر سب اس کیف کے پینے میں کھو	ہاں نہ صحبت کو دری سینے میں کھو
۴-	اب توں تلک آپ سے کرتار سوں	سونپ آپس آپکے کرتار سوں
۵-	ہوش کے بنگاب سوں مدہوش اچھہ	ختم کر اس بات پہ خاموش اچھہ

کتابت نسخہ کی چند خصوصیات قابل غور ہیں —

'ک' کے نیچے تین نقطہ رکھنے سے وہ 'گ' ہوجاتا ہے (ایسا ہی ترکی زبان میں ہوتا ہے

'ر' کے نیچے تین نقطہ لگانے سے وہ 'ڑ' ہو جاتا ہے ڑ = ڑ

'ت' پر چار نقطے لگاکر 'ٹ' بناتے ہیں ٹ = ٹ

الف ممدودہ کی مد گرادینا اس زمانے میں معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ 'آج' کو 'اج' 'آگ' کو 'اگ' لکھتے تھے —

ک اور گ میں کوئی فرق نہیں نون غنہ اور نون بالاعلان میں کوئی فرق نہیں۔ اس زمانہ میں لوگ اس کا بھی خیال نہیں کرتے تھے —

بصری کی تصانیف میں صاف اور آلائش سے پاک دکھنی طرز کی عمدہ زبان پاؤگے - در حقیقت اس کی زبان قدیم دکھنی زبان کا بہترین نمونہ ہے لہذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس کی تصانیف میں ہمیں ایسے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں جو فی الواقعی سنسکرت زبان سے نکلے ہیں - اس قسم کے الفاظ اور محاورے اس کی تصانیف میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ بغیر سنسکرت جانے ہوے اس کی تصانیف کا سمجھنا ذرا مشکل ہے' جیسا کہ نیچے دیے ہوے الفاظ سے معلوم ہوجاے گا —

سکل	دَل	تربھون	تہن دنیا
ارت	مطلب	سیس	سر
ادک	کچھہ اور	سھس	ہزار
دَل	فوج	ستھول	کثیف۔جسمانی
سرگ	بہشت	سکشم	لطیف

وغیرہ وغیرہ

مقدمہ فاوست

باب اول

جرمن ادب گوئیٹے سے قبل

[ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پی ۔ ایچ ۔ ڈی نے انجمن ترقی اُردو کے لئے جرمنی کے نامور شاعر، ڈراما نویس اور ادیب کے مشہور ڈراما فاوست کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ دنیا کی ان چند کتابوں میں سے ہے جو عالی خیالات اور بلند مضامین اور ندرت بیان کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اس ترجمے پر ڈاکٹر صاحب موصوف نے ایک بسیط مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے جس سے جرمنی کے اس زمانے کے ادب، گوئٹے کی سیرت اور تصانیف اور خاص کر فاوست کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ یہ مقدمے کا پہلا حصہ ہے دوسرا حصہ آئندہ شایع کیا جائے گا۔ اڈیٹر]

'یورپ' کی تمام بڑی قوموں میں جدید تمدنی زندگی کے اعتبار سے 'جرمن' قوم سوائے 'روسیوں' کے (اگر ان کا شمار یورپ کی قوموں میں کیا جائے) سب سے کم سن ہے۔ جب یورپ اسلامی تمدن اور یونارومی تمدن سے متاثر ہوکر اس جمود سے چونکا جو اس پر قرون وسطیٰ کی آخری صدیوں میں طاری تھا تو فرانس اور انگلستان کو سیاست و معاشرت، علم و حکمت، ادب اور فنون لطیفہ غرض زندگی کے ہر شعبے میں روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ مگر جرمنی کی

ترقی کا دور بہت دن کے بعد شروع ہوا - سولھویں صدی میں جو نئی زندگی کی لہر ' اطالیا ' سے اٹھی تھی وہ یہاں بھی پہنچی مگر یہاں اسے عرصے تک ایسے گردابوں کا مقابلہ کرنا پڑا کہ اس کا سارا زور جاتا رہا - ' جرمنی ' میں عہد جدید مذھبی اصلاح سے شروع ھوا - ' مارٹن لوتھر ' نے ' پروٹسٹنٹ ' مذھب کی بنیاد ڈال کر اپنے ھم قوموں کو رومی کلیسا کی مذھبی اور سیاسی غلامی سے نجات دلائی - اس کے سبب سے ' جرمنوں ' میں حرکت اور جوش کا ھیجان اٹھا مگر ملک کے بعض حصوں میں کیتھولک مذھب اس قدر مضبوطی سے جڑ پکڑ چکا تھا کہ نئے مذھب کی شدید مخالفت ھوی اور مذھبی جنگوں کا سلسلہ شروع ھو گیا جس کے سبب سے تمدنی ترقی رک گئی - سترھویں صدی کے آغاز میں ان لڑائیوں میں ' سویڈن ' اور ' فرانس ' نے مداخلت کی - سی سالہ جنگ نے ' جرمنی ' کو برباد کر دیا اور ' جرمن ' قوم کی روح کو ایسا کچلا کہ اسے پنپنے میں کم و بیش سو سال کا عرصہ لگ گیا - ' جرمنی ' کی علمی ترقی سترھویں صدی کے آخر میں شروع ھوی اور اس کے سیاسی استحکام کی ابتدا اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں اور تکمیل انیسویں صدی کے نصف آخر میں ھوی - کہیں سنہ ۱۸۷۰ ع میں جا کر ' جرمن ' ایک متحد قوم بن پائے —

مستقل جرمن ادب اصل میں اٹھارھویں صدی سے شروع ھوتا ھے ' لیکن اس کی بنا سولھویں صدی میں پڑ چکی تھی - اس سے قبل قرون وسطی میں اور ملکوں کی طرح ' جرمنی ' میں بھی علمی زبان ' لاطینی ' تھی - بولنے کی زبان بھی ایک نہ تھی بلکہ مختلف حصوں میں مختلف زبانیں رائج تھیں - ان زبانوں میں تصنیف و تالیف نہ ھوتی تھی لیکن شاعری جو بہ قول ھرڈر کے قوموں کی مادری زبان ھے موجود تھی ' اس پر مذھبی رنگ چھایا ھوا تھا اور چونکہ کیتھولک عیسائیت ' جرمن ' قوم کی طبیعت کے موافق نہ تھی اس لئے اس زمانے کی ' جرمن ' مذھبی شاعری کچھ بے رنگ سی تھی - رزمیہ شاعری البتہ ان لوگوں کے مذاق کی

چیز تھی - پرانی قومی داستانیں جو زاگاز (Sagas) کہلاتی تھیں نظم کی جاتی تھیں اور بہت ہر دلعزیز تھیں - ان میں نیبلنگن (Nieblungen) کی داستان کو خاص امتیاز حاصل ہے - یہ ' زیگفریڈ ' کے کارناموں کا گیت ہے جو قدیم ' جرمنی ' کا ہیرو تھا جیسے ' رستم قدیم ' ایران ' کا - ' زیگفریڈ ' ایک سیدھا سچا بھولا بھالا سورما تھا - جنگجوی نے اس کے مزاج میں خشونت نہیں پیدا کی تھی - اس کا قلب رقت اور درد سے معمور تھا وہ موسیقی کا شیدا تھا اور گھر یلو زندگی کا عاشق - یہ جرمن قوم کا کیرکٹر ہے اور ' زیگفریڈ ' جرمن روح کی مثال - سولھویں صدی کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے اثر سے ' اطالیہ ' ' انگلستان ' ' فرانس میں لوگ تنگ مذہبی دائرے سے باہر نکلے اور قدیم ' روم ' و ' یونان ' کی تقلید میں علم و حکمت اور فنون لطیفہ کی طرف متوجہ ہوے ' مگر ' جرمنی ' میں یہ تحریک صرف اس حد تک پہنچی کہ بعض لوگ یونانی اور لاطینی ادب کا مطالعہ کر نے لگے - ' یونان و روم ' کی روح ' جرمنی ' کی تمدنی زندگی میں سرایت نہ کر سکی - یہاں نشاۃ ثانیہ سے پہلے تجدید مذہب کا دور گذرا جس کا آغاز ' مارٹن لوتھر ' (سنہ ۱۴۸۳ تا ۱۵۴۶ ء) سے ہوا ' لوتھر ' اصل میں جدید ' جرمن ' تہذیب و تمدن کا بانی ہے - اس نے نہ صرف اس مذہب کی بنا ڈالی جو ' جرمنوں ' کی گہری مذہبیت کا مظہر ہے بلکہ ' جرمن زبان اور ادب کی داغ بیل بھی اسی کے ہاتھ سے پڑی - اس نے ' انجیل کا اپنے وطن ' سیکسنی ' کی زبان میں ترجمہ کیا اور بہت سے مذہبی اور مناظرانہ رسائل لکھے - اس کی ' ترجمہ انجیل ' کی سادی اور ستھری زبان تمام جرمنی کی متحدہ زبان بن گئی - اس نے ایک طرف پادریوں اور دوسری طرف ' لاطینی ' کے پرستاروں کے مقابلے میں ' جرمن ' زبان کی حمایت کی اور اُسے ادبی زبان بنا نے کی کوشش کرتا رہا - اُس زمانے میں چھاپا نیا نیا ایجاد ہوا تھا - ' لوتھر ' نے مطبوعہ کتابوں کو رواج دیا اور اُن کے ذریعے سے اُس کے مذہبی خیالات کے ساتھ ساتھ زبان کی بھی اشاعت ہو تی رہی - اُس کی گہری نظر نے دیکھ لیا

تھا کہ جو چیز مقبول عام نہ ہوسکے وہ قومی ترقی کے لئے زیادہ مفید نہیں - جس اصول کو پیش نظر رکھہ کر اُس نے ' انجیل ' کا ترجمہ کیا تھا اُسے وہ ذیل کے الفاظ میں بیان کرتا ھے جن سے اُس کی صائب رائے اس کے محبت بھرے دل اور اُس کی اکھڑ طبیعت کا اندازہ ھوتا ھے " ان گدھوں کی طرح ' لاطینی ' حرفوں سے نہ پوچھنا چاھئے کہ ' جرمن ' زبان کیوں کر بولی جائے بلکہ گھر میں بیٹھنے والی ماؤں سے سڑک پر کھیلنے والے بچوں سے' بازار میں پھرنے والوں لوگوں سے ' ان کی بات چیت کان لگا کر سنو اور اسی زبان میں ترجمہ کرو - تب وہ سمجھیں گے کہ تم ' جرمن ' زبان بول رہے ھو " —

' لوتھر ' کے مددگاروں میں ' اُلرش فان ھیوتن ' Ulrich von Hutten (۱۴۸۸ تا ۱۵۲۳ ع) خاص امتیاز رکھتا ھے - یہ ابتدا میں ھیومانزم کی تحریک کا موید تھا اور لاطینی زبان کا شیدا - مگر ' لوتھر ' کے اثر سے اس کے خیالات بدلے اور یہ نہایت جوش و خروش سے مذھبی اصلاح اور ' جرمن ' قوم کے سیاسی اور ذھنی استقلال کا حامی بن گیا - اُس کی طبیعت میں ' لوتھر ' سے زیادہ شورش تھی چنانچہ اس نے اپنے زمانے کی انقلابی تحریک میں نمایاں حصہ لیا - اُس کی ادبی خدمات بڑی کم نہیں - آج تک اُس کے قومی گیت فدائے ملت ' جرمنوں ' کے دلوں کو اُبھارتے ھیں —

افسوس ھے کہ ملک کے سیاسی انتشار نے اس عہد میں ' جرمن ' ادب کی اُٹھتی جوانی کو برباد کردیا تجدید مذھب نے جو نئی روح پھونکی تھی وہ بجاے اس کے کہ عام تمدنی اور ادبی ترقی میں صرف ھوتی خانہ جنگیوں کی نذر ھوگئی - سولھویں صدی کی ادبی پیداوار سوائے مذھبی گیتوں یا ' پوپ ' کے خلاف طنزیہ نظموں اور ڈراموں کے اور کچھہ نہیں - ' ھانس زاکس ' نے ڈراما کو وسعت دینا چاھی اور ' وکرام ' نے ناول کی بنا ڈالی' لیکن عام ذھنی معیار اس قدر کم تھا کہ یہ دونوں چیزیں ترقی نہ کرسکیں - ' جرمن ' قوم کے گہرے دلی جذبات اس زمانے میں

ادب العوام (Folklore) میں ظاہر ہوے ' جن میں خصوصیت کے ساتھہ قابل ذکر 'اوئلن'اشپیگل'کے قصے اور 'فاؤسٹ' کی داستان ہے جو 'گوئٹے کے ڈراما کا ماخذ ہے—

' سترھویں ' صدی کی ابتدا میں ' جرمنی ' میں ادبی تحریک کچھہ دن کے لئے پھر اُبھری - اس زمانے میں ملک میں مقابلۃً امن تھا اور لوگوں کو کسی قدر فرصت تھی کہ ذھنی زندگی کے مسائل کی طرف متوجہ ھوں - ' جرمنوں ' کو یہ احساس پیدا ھوا کہ اُن کا ادب دوسری قوموں کے ادب سے بہت پیچھے ہے اور اُنھوں نے اپنے دامن سے اس دھبے کو دور کرنے کی کوشش شروع کی- ' مارٹن اوپٹز (۱۵۹۷ تا ۱۶۳۹ ع) نے ' جرمن ' زبان کی اصلاح و ترقی میں بہت سعی کی اور اُس کے ساتھیوں نے بھی زبان کو بہت سنوارا - لیکن مضامین کے لحاظ سے ان لوگوں کی تصانیف بالکل کھوکھلی ھیں - ان کے مضامین کا ماخذ ' یونانی ' اور ' لاطینی ' کے پرستاروں کی تصانیف ھیں اور یہ بھی ان لوگوں کی طرح ' یونان ' و ' روما ' کی نقالی کرتے تھے - اینڈرِ یاس گریفیس اس عہد کا ممتاز ڈراما نگار تھا مگر اس کے کھیل ڈراما کی روح سے خالی ھیں - اس عہد کی شاعری بالکل سطحی اور تصنع سے بھری ہے-

' جرمنی ' کو جو سکون کا دور نصیب ھوا وہ دیرپا نہ تھا - تھوڑے ھی دن میں سی سالہ جنگ (سنہ ۱۶۱۸ تا ۱۶۴۸ ع) شروع ھو گئی جس نے ملک کو مادی اور ذھنی حیثیت سے برباد کر دیا - اس جنگ میں ' فرانس ' ' جرمنی ' کی سیاست میں دخیل ھو گیا اور فرانسیسی تہذیب کا رنگ جرمن زندگی پر چھا گیا - فرانسیسی زبان جرمنی کے تعلیم یافتہ حلقوں میں پھیل گئی - ذھنی غلامی کے زمانے میں کوئی قوم پوری ادبی ترقی نہیں کر سکتی- جرمنی کی ادبی تحریک جو اس صدی کے شروع میں اٹھی تھی بالکل فنا ھوگئی اور صدی کے آخر تک سواے ' گریمیل ھاؤزن ' کے کوئی معقول ادیب نہیں پیدا ھوا - اس کا سب سے مشہور ناول ایک آوارہ گرد کی خود نوشتہ سوانح عمری کے طور پر شائع ھوا جس کا نام Simplicissimus ہے —

غرض سترھویں صدی کا جرمن ادب مجموعی حیثیت سے سولھویں صدی کے ادب سے بھی بہت پست تھا - اُس پر تنگ خیالی ، بد مذاقی اور کورانہ تقلید کا رنگ غالب تھا نہ اس میں تخیل کی بلند پروازی تھی اور نہ تناسب اور ترتیب -

اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں جرمنی کی ذھنی حالت کچھہ بہتر نظر آتی ھے اب جرمن فرانسیسیوں کی تقلید میں بہت کچھہ ترقی کر چکے تھے - اب وہ محض نقالی نہیں بلکہ سمجھہ بوجھہ کر تقلید کرتے تھے - فرانس اور انگلستان کا عقلی فلسفہ جرمنی میں پھیل چکا تھا - اس فلسفہ کا اصل اصول یہ تھا کہ ذھن انسانی کا اصلی جوھر عقل ھے اور کائنات پر اسی کی حکومت ھے - انسان کی مادی' ذھنی اور روحانی زندگی کا معیار عقل ھی کو قرار دینا چاھئے - جو چیزیں احساس و وجدان پر منحصر ھیں ، مثلاً مذھب یا آرٹ وہ بھی اسی حد تک قابل قبول ھیں جس حد تک وہ عقل کے مطابق ھوں - چوں کہ عقل سب انسانوں میں مشترک اور ھر زمانے میں موجود ھے اس لئے صحیح علم ، مذھب اور آرٹ کے اصول بھی ھر قوم کے لئے ھر عہد میں یکساں ھیں - آرٹ میں یہ اصول یونانیوں کو معلوم تھے اس لئے ادب اور فنون لطیفہ کے دوسرے شعبوں میں یونانیوں کی تقلید اوج کمال پر پہنچنے کے لئے ضروری ھے —

اس علمی تحریک کے ماتحت ایک تعلیمی تحریک بھی تھی - اس کی کوشش کی جاتی تھی کہ یہ خیالات عوام میں پھیلیں اور ان کے دل سے مذھبی تعصبات اور ھر طرح کی ضعیف الاعتقادی دور ھو - جرمنی کی ذھنی تاریخ میں یہ تحریک (Aufklarung) کہلاتی ھے اور ھم اِسے نئی روشنی کی تحریک کرسکتے ھیں- جرمنی میں اس کا ھر اول کرستیان تومس (۱۶۵۵ تا ۱۷۲۸ ع) —

عقلی فلسفہ کا اس زمانے کے ادب پر بہت گہرا اثر پڑا - اس زمانے کی تصانیف میں مذھبی شکوک عام طور پر نظر آتے ھیں - شاعری اور ڈراما وغیرہ میں فرانسیسیوں کے توسط سے یونانی نمونوں کی پابندی ھونے لگی - شاعری کے

موضوع کو بہت وسعت ہوئی - سچی شاعری کی جان انسانی جذبات کی ترجمان کے علاوہ مناظر قدرت کی نقاشی ہے - اب تک جرمن شاعری میں حسن فطرت کی تصویروں کی کمی تھی - براکس (۱۶۸۰ تا ۱۷۷۴ ع) نے اس کمی کو پورا کیا - اس کی شاعری کا پایہ بہت بلند نہیں مگر اس کا یہ احسان ہے کہ اُس نے تخیل کی جولانی کے لئے ایک نئی راہ کھول دی —

اُس عہد کا سب سے بڑا ادبی نقاد گوت شیڈ (۱۶۸۰ تا ۱۷۴۷ ع) ہے - یہ لائپزش کی یونیورسٹی میں پروفیسر تھا - گوت شیڈ عقلیت کا حامی تھا اور ادب میں یونانیوں کے مقرر کئے ہوئے قواعدو ضوابط کی پابندی پر زور دیتا تھا - سوئٹزرلینڈ کا بوڈ مر اس کا مخالف تھا اور لوگوں کو انگلستان کے ادب کی تقلید اور جذبات پرستانہ شاعری کی طرف توجہ دلاتا تھا - ان دونوں کے پیرووں میں سخت مناظرے رہتے تھے جن کی بدولت جرمنوں کے تنقیدی ذوق کو نشو و نما کا بہت اچھا موقع ملا- اسی زمانے میں لائپزش میں نوجوان ادیبوں کا ایک حلقہ تھا جو شاعری کا مقصد قوم کی اخلاقی اصلاح کو سمجھتا تھا - یہ لوگ بریمن کے ایک رسالے میں مضمون لکھا کرتے تھے - ان لوگوں میں جرمنی کا پہلا بڑا شاعر کلوپف اشتوک بھی تھا-

اٹھارھویں صدی کے نصف ثانی میں جرمن ادب نے یکایک حیرت انگیز ترقی کی - سنہ ۱۷۴۰ تک یوروپ میں جرمن ادب کی کوئی وقعت نہ تھی اور سنہ ۱۸۰۰ میں یہ حالت ہوگئی تھی کہ کسی ملک کا ادب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا - اس کا یا پلٹ کا راز جرمنی کی سیاسی ترقی میں مضمر ہے - اس زمانے میں ریاست پروشیا میں فریڈرک اعظم نے ایک مستحکم سلطنت قائم کی اور تمام یوروپ میں اُس کا فوجی اقتدار مسلم ہو گیا - دوسری بڑی بات یہ تھی کہ پروشیا کو چھوڑ کر اور ریاستوں کو تجدید مذھب کے بعد پہلی بار ایک طویل عرصے تک چین سے بیٹھنا نصیب ہوا - اب جرمنوں کے دل میں اپنی عزت پیدا ہوگئی ، وہ اپنے اوپر اعتماد کرنے لگے اور اپنی زندگی کو اس قابل سمجھنے

لگے کہ ادب اور شاعری کا موضوع بن سکے - یہ تحریک شروع ہوئی کہ فرانسیسیوں کی تقلید ترک کردی جائے - مگر یہ رنگ اتنا گہرا ہوچکا تھا کہ یکایک اس کو چھوڑنا آسان نہ تھا۔ پھر بھی ادب کے میدان میں اتنا ضرور ہوا کہ کلوپف اشٹوک' ویلانڈ اور لیسنگ کی بدولت جرمن شاعری 'ڈراما' ناول وغیرہ میں مضامین کے اعتبار سے جدت ' گہرائی ' اور بلند پروازی پیدا ہوئی اور اصول فن کے لحاظ سے فرانسیسیوں کا واسطہ چھوڑ کر براہ راست یونانیوں کی تقلید ہونے لگی اور یونانیوں کے مقرر کئے ہوے قواعد و ضوابط کی تفسیر جرمن ادیب اپنے طور پر کرنے لگے —

کلوپف اشٹوک (۱۷۲۴ تا ۱۸۰۳ ع) جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں لائپزش کے اُس حلقے میں سے تھا جو شاعری کا مقصد اخلاقی اصلاح کو سمجھتا تھا - اس نے جرمن شاعری کا پایہ بہت بلند کردیا - شاعری اب محض ادبی مشق یا عارضی تفریح کا ذریعہ نہیں رہی بلکہ گہرے مذہبی اور اخلاقی جذبات کا آئینہ بن گئی - کلوپف اشٹوک کی سب سے مشہور " مسیحا '' ہے جس میں اس نے حضرت عیسیٰ کی زندگی کا قصہ نظم میں بیان کیا ہے۔ اس میں اُس نے مسیح کے حالات بالکل کلیسائی روایات کے مطابق بیان کئے ہیں اس لئے زیادہ شاعری کا موقع نہیں ملا - اس کے کیرکٹر جیتے جاگتے انسان نہیں بلکہ کٹھ پتلیاں ہیں جن کی زبان سے شاعر بولتا ہے - یہی حال اُس کے ڈراموں کا ہے جن کے موضوع انجیل کے قصے ہیں - اس کی غنائی شاعری موسیقی سے خالی ہے ؛ البتہ قومیت کے جذبے کے سبب سے اس کی شاعری میں کہیں کہیں زندگی کی جھلک نظر آتی ہے - سب سے بڑی کمزوری اُس کی شاعری کی یہ ہے کہ اُس کا فطرت انسانی کا تصور بالکل یکطرفہ ہے - وہ انسان کو محض جذبات کا مجموعہ سمجھتا ہے - اُس کی ارادی اور عملی زندگی اور اُس کی شہوانی کمزوریوں کی طرف سے چشم پوشی کرتا ہے —

ویلانڈ (۱۷۳۳ تا ۱۸۱۳ ع) کے کلام کی خصوصیت اس کا سادہ اور موثر

اسلوب بیان ھے - موضوع کلام اور خیالات کے اعتبار سے اُس کی شاعری کے دو علحدہ دور ھیں - پہلا مذھبیت اور عین پسندی کا ھے - اس زمانے میں اس نے ایک طویل نظم " حقیقت اشیاء " کے نام سے لکھی - اس میں اس نے قدیم فلسفی شاعر لکریشیس کی مادیت کے خلاف افلاطون کی عینیت کی حمایت کی - اسی دور میں اُس نے " بہار " کے نام سے نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا جس میں افلاطونی عشق کی حقیقت بیان کی گئی تھی - " ابراھیم کا امتحان " میں چند منظوم خطوط ھیں جن میں کچھ مردے اپنے زندہ دوستوں سے وہ روحانی واردات بیان کرتے ھیں جو اُنھیں مرنے کے بعد پیش آئی - ویلانڈ کی اس دور کی شاعری میں اصلیت کم اور تصنع زیادہ ھے - جو مذھبی اور اخلاقی مطالب بیان کئے گئے ھیں وہ دل سے نکلے ھوے جذبات نہیں بلکہ دماغ سے پیدا کئے ھوے خیالات ھیں —

اُس کی شاعری کا دوسرا دور وہ ھے جب والٹیر اور شیکسپیر کی تصانیف کے مطالعے اور زندگی کے بلاواسطہ مشاھدے کے بعد اُس کے ذھن میں فطرت انسانی کا وسیع تصور قائم ھوا - اب اُس نے جتنی چیزیں لکھیں اُن سب کا موضوع اپنے زمانے کے مسائل زندگی کو قرار دیا - افسانے سب غیر ملکوں کے ھیں لیکن اُن کے پردے میں وہ اپنے ملک کی حالت دکھاتا ھے - مثلاً " ڈان سلویو " جو ڈان کوئکزوٹ کی طرح اسپین کے ایک بانکے کا قصہ ھے ؛ " اگاتھون " جس میں ایک یونانی سورما کے حالات ھیں ؛ " طلائی آئینہ " جو الف لیلہ کے قسم کی کتاب ھے اور مشرقی ممالک کے قصوں کا مجموعہ —

قومیت کا جو عنصر ' کلوپف اسٹوک ' کے یہاں تھا اس سے ' ولانڈ ' کا کلام خالی ھے - اسی لئے اُسے جتنی مقبولیت غیر ممالک میں حاصل ھوئی خود ' جرمنی ' میں نہیں ھوئی - یہاں ایک گروہ اُس کا مخالف تھا جو اس کی واقعیت پسندانہ کو مخرب اخلاق سمجھتا تھا —

اس دور کا سب سے بڑا ادیب' نقاد اور ڈرامانگار "لیسنگ" (۱۷۲۹ تا ۱۷۸۱ ع) ھے-

س نے اس طرز شاعری کو جو ' کلاسیکی ' کہلا تے ہے کہاں کو پہنچا دیا - اس طرز کی خصو صیات یہ ہیں کہ انداز بیان سادہ اور حقیقت میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے ' اصول فن کی پوری پابندی کی جاتی ہے اور جذبات کو عقل کے ماتحت رکھنے کی کوشش کی جا تی ہے - خیالات کے اعتبار سے ' لیسنگ ' " عقلیت " اور " نئی روشنی " کا علم بردار ہے - رسم و کیش ' مذہب و ملت کی قیود کو وہ عقل انسانی کے لئے زنجیریں سمجھتا ہے - وہ ان پردوں کے پیچھے ' انسانیت ' کے عین کو دیکھتا ہے اور اسے بے نقاب کرنا چاہتا ہے —

اس کے ابتدائی ڈراموں میں اصول فن کے لحاظ سے ' فرانسیسیوں ' کی تقلید ہے؛ لیکن چونکہ وہ نقادانہ طبیعت رکھتا تھا ' اس لئے اس نے خود یونانی ڈراموں کا ' جن کی تقلید کا فرانسیسیوں کو دعوے تھا ' نظر غور سے مطالعہ کیا اور اس کی بنا پر ڈراما نویسی اور دوسرے فنون لطیفہ کے اصول و ضوابط قائم کئے - فن تنقید میں اس کی دو کتا بیں ' ہامبرگ کا فن ڈراما ' اور ' لئو کو آن ' مشہور ہیں - اس کی تنقید عقلیت کے فلسفے پر مبنی ہے - اس کے نزدیک فنون لطیفہ کا عام معیار خوبی یہ ہے کہ وہ صاف اور واضح تصورات منطقی تناسب اور تر تیب سے پیش کریں - اس کا پہلا اوریجنل ڈراما ' سارہ سیمپسن ' ہے - اس میں اس نے یہ قدیم اصول توڑ دیا کہ المیہ کا موضوع ہمیشہ بادشاہوں یا امرا کی زندگی ہونا چاہئے ' اور ایک معمولی خاندان کی لڑکی کا قصہ بیان کیا - لیکن اس افسا نے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے - البتہ ' بارن ہیلم ' کی ' مینا ' اپنے موضوع کے لحاظ سے ' نیز ڈراما کی خصوصیات کے اعتبار سے نہایت کامیاب فرحیہ (کامیڈی) ہے - اس میں جذبۂ عشق کی کشمکش احساس فرض اور حب وطن سے دکھائی ہے اس ڈرامے میں ایک فرانسیسی کا مضحک کیرکٹر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ' جرمنوں ' کے دل میں ' فرانسیسیوں ' کا جو رعب چلا آ تا تھا وہ اب جاتا رہا—

لیسنگ کے دو ڈرامے ' ایمیلیا گیلوٹی ' اور ' دانشمند ناتان ' ادبی دنیا میں

شہرت رکھتے ہیں ۔ 'ایمیلیا' میں لیسنگ نے اپنے عہد کی اطالوی زندگی کا ایک المناک قصہ لکھا ہے جو تنقیدی ادبی طرز کی بہترین مثال ہے ۔ 'ناتان' ساطان صلاح الدین کے زمانے کی صلیبی جنگ کا افسانہ ہے جس میں ایک یہودی حکیم کی زبان سے مذہبی روا داری کا درس دیا گیا ہے اور عقلیت کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے —

غرض اٹھارھویں صدی میں جرمن زبان بہت منجھی اور صاف ہوئی، جرمن ادب فرانسیسیوں کی تنقید سے آزاد ہوا، اُس میں جدت اور وسعت پیدا ہوئی لیکن ابھی گہرائی نہ تھی ۔ بات یہ تھی کہ اس صدی میں جس راہ پر جرمن ذہن چل رہا تھا، یعنی عقلیت کا فلسفہ اور کلاسیکی ادب، وہ جرمن قوم کی طبیعت کے مناسب نہ تھا ۔ جرمن طبیعت میں باطنیت اور انفرادیت ہے، اس کے تخیل میں شورش ہے، وہ خارجی قیود سے گھبراتی ہے اور لاعقلی عناصر کو عقل کے ماتحت نہیں رکھنا چاہتی ۔ شاید اس کی تربیت اور انضباط کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ عقلیت کے دور سے گذرے ۔ لیکن وہ زیادہ دن تک اس کی پابند نہیں رہ سکتی تھی ۔ فلسفے میں کانت کے نقادانہ دماغ نے عقلیت کی حدود معین کردی تھیں ۔ اُس کے بعد عینیت پسند فلسفیوں کو تخیل کی بلند پروازی دکھانے اور لاعقلی عناصر پر زور دینے کا موقع ملا ۔ ادبی تنقید میں عقلیت کے خلاف علم پیکار بلند کرنے والا عالم دین ہرڈر، تھا ۔ عقلیت کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ ذہن انسانی کو ساکن اور یکرنگ سمجھتی تھی اور اس کی تاریخی نشو و نما اور مختلف النوعی کی طرف سے چشم پوشی کرتی تھی ۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی اور خیال کے اصول جو عقل کی روشنی میں صحیح ہوں ہر قوم اور ہر زمانے کے لئے یکساں تھے ۔ 'ہرڈر' نے اس پر سختی سے تنقید کی اور "تاریخی منہاج" کی بنا ڈالی ۔ اس کی کتاب "جمالیات" میں جو تنقیدی اصول بیان کئے گئے وہ بالکل نئے اور اچھوتے تھے ۔ اس کے نزدیک ہر قوم کا ادب اور اس کی شاعری قومی سیرت

کی خصوصیات کا آئینہ اور قومی زندگی کی ارتقا کا نتیجہ ہے ۔ اس کے نزدیک سچی شاعری کی پہچان یہ ہے کہ وہ انسانی خواہشات و جذبات کی تصویر ہو اور شدت احساس اور خلوص سے لبریز ہو - اگر یہ باتیں شاعری میں موجود ہوں تو وہ فطری شاعری ہے ورنہ ایک مصنوعی اور بیجان چیز ہے - اس معیار پر اس کے خیال میں وہ گیت پورے اترتے ہیں جو عوام کے بنائے ہوئے اور ان میں مقبول ہوں - اس لئے یہی سچی شاعری کا نمونہ ہیں- اس کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ" شاعری نوعِ انسانی کی مادری زبان ہے" - اس نے بڑی محنت سے ایک مجموعہ مختلف قوموں کے منتخب گیتوں کا تیار کیا اور اس کا نام " قوموں کی آواز گیت کے پردے میں " رکھا —

" جرمن ادب کے متعلق چند متفرق خیالات " ہرتر کا شاہکار ہے - اس میں اس نے اپنا فلسفۂ لسان بیان کیا ہے - ہرتر کہتا ہے کہ ہر قوم کی زبان میں ایک خاص روح ہوتی ہے اور یہی روح اس کے ادب کے لئے وجہ حیات ہے - زبان کی ارتقا کے عام اصول قائم کرنے کے بعد وہ جرمن زبان کی خصوصیات بتاتا ہے اور اس کی نشو و نما دکھاتا ہے - اس کے نزدیک " نئی روشنی " کے دور نے جرمن زبان و ادب کو ابھرنے نہ دیا - اس عہد میں ذہن انسانی کی ساری کائنات عقل سمجھی جاتی تھی حالانکہ عقل اس کا محض ایک پہلو ہے اور انسانی زندگی کی تکمیل کے لئے کافی نہیں - " تنقید کے جنگل " میں اس نے ان خیالات کو پھیلایا ہے اور ان سے ادبی تنقید میں کام لیا ہے - " اوسیان کے متعلق خطوط " میں اس نے ایک قدیم کیلٹ کے کلام پر تبصرہ کیا اور اسے یونان کے سایۂ نز شاعر ہومر کا ہم پلہ قرار دیا - " مقالہ بر کلام شیکسپیر " میں اس نے یہ بتایا کہ شیکسپیر کی تصانیف کو فرانسیسی تنقیدی اصول پر نہ جانچنا چاہئے بلکہ انگلستان کی مخصوص ادبی روح کے معیار پر —

اس کی ایک نہایت اہم کتاب " Auch eine Philosophie der Geschichte " ہے جس کا ترجمہ اردو میں یہ ہوگا - " تاریخ کا بھی فلسفہ " - اس نے تاریخ کے مطالعے میں

روحانی ارتقا کے نظریے سے کام لیا اور قرون وسطیٰ کے متعلق عام مورخین کا جو حقارت آمیز رویہ تھا اُس کی سختی سے تردید کی - لوگ اس عہد کو تاریکی کا زمانہ سمجھتے تھے - ھرڈر نے یہ ثابت کیا کہ اس زمانے میں یورپ میں ایک مکمل نظام زندگی موجود تھا جو فطرت سے قریب تر تھا ــ

ھرڈر کا طرز تحریر بھی خاص ھے - وہ لکھنے میں کسی اصول کی پابندی نہیں کرتا اور اپنے خیالات وضاحت، صفائی اور تسلسل سے ادا نہیں کرسکتا؛ اس لئے اُس کی کتابیں پڑھنے میں دلچسپ نہیں - لیکن اس کے خیالات اس قدر گہرے اور حقیقت پر مبنی تھے اور اُس نے جرمن انداز طبیعت کو اس خوبی سے سمجھا تھا کہ اُس کی وجہ سے جرمنی کی ادبی دنیا میں عظیم‌الشان انقلاب ھو گیا - اُس کی تحریک سے جرمن زبان بیرونی بندشوں کو توڑ کر آزاد ھوئی اور جرمن روح کی بیچینی، آرزو، اور جستجو نے ادب اور شاعری میں عجب سوز و گداز پیدا کردیا ــ

اس ادبی انقلاب کی " جو طوفان وھیجان " کا دور کہلاتا ھے، ابتدا اُس زمانے سے سمجھنا چاھئے جب استراسبرگ میں ھرڈر اور گوئٹے سے ملاقات ھوئی (سنہ ۱۷۷۱ م) - نو جوان گوئٹے جس قدر ھرڈر کی اثر آفریں شخصیت سے متاثر ھوا اپنے ھم عصروں میں کسی سے نہیں ھوا - سنہ ۱۷۷۲ م میں ایک مجموعۂ مضامین " جرمن طبیعت جرمن اور آرٹ " کے نام سے شائع ھوا جو گویا نئے دور کا پیش خیمہ تھا - اس میں ھرڈر، گوئٹے اور چند اور لوگوں کے مضامین تھے ــ

اس ادبی انقلاب نے دو راھیں اختیار کیں ایک تو غنائی شاعری اور دوسرے ڈراما - نئی غنائی شاعری کا مرکز گوٹنگن تھا جہاں یونیورسٹی کے چند طالب علموں نے مل کر ایک حلقۂ شعرا قائم کیا جن میں ' فوس' اور ' بیورگر' ممتاز تھے - یہ لوگ ایک سال نامہ " آرٹ کی دیویوں کے سال نامے " کے نام سے نکالتے تھے - ان کی شاعری نفس مضمون اور طرز ادا کے لحاظ سے کلاسیکی شاعری

کی ضد ہے-ان کے کلام میں اس قدر جوش وخروش ہے کہ وہ پوری طرح اپنے مضمون پر قابو نہیں پاسکتے - ان کا موضوع کلام انسان کی داخلی زندگی ' اُس کے جذبات کا هیجان ' اُس کی باطنی قلبی واردات ہے - اس ضمن میں ' گوئٹے ' کا " ویرتھر " بھی شمار کیا جاسکتا ہے جو شعر منثور کا نمونہ ہے —

لیکن طوفان وهیجان کی تحریک کا اصلی زور ڈراما میں ظاہر ہوا - ' جرمنی ' کے دو سب سے بڑے ڈراما نگار ' گوئٹے ' اور ' شلر ' اپنی جوانی کے زمانے میں اس تحریک کے علم بردار تھے - ' گوئٹے ' کا ' گوتس " اور ' شلر ' کا " قزاق "" هیجان و طوفان" کا آئینہ هیں - " گوتس " سولھویں صدی کے ایک بانکے سردار کا قصہ ہےاور " قزاق " جیسا کہ نام سے ظاہر ہے قزاقوں کا افسانہ ہے - دونوں میں مصنفوں کی همدردی ان لوگوں کے ساتھ ہے جو مروجہ اخلاق کو توڑ کر محض اپنے ضمیر کے احکام کی پابندی کرتے هیں - ' گوئٹے ' اور ' شلر ' نے اس دور میں اور بھی کئی ڈرامے لکھے اور یہ رنگ اس قدر پھیلا کہ بہت سے ڈراما نگاروں نے اسے اختیار کرلیا - ان لوگوں میں " کلنگر " کسی قدر اهمیت رکھتا ہے جس کے ڈراما " طوفان و هیجان " کے نام سے یہ دور موسوم ہے —

اس دور کی خصوصیات تین تھیں :— کلاسیکی اصول فن کی سختیوں سے آزادی' داخلیت کی جذبات پرستی اور انفرادیت ' مروجہ اخلاقی اور تمدنی قوانین کے خلاف احتجاج - اس زمانے میں جرمن روح کو اپنی پوری خصوصیات ' اپنی خوبیاں اور کمزوریاں پوری طرح ظاہر کرنے کا موقع ملا —

اس دور کی کمزوریاں بھی صاف نظر آتی هیں - ادب اور زندگی کے صحیح نشوونما کے لئے جہاں بیجا قیود سے آزادی لازمی ہے وہاں کسی نہ کسی ذهنی معیار کی پابندی بھی ضروری ہے - " طوفان و هیجان " نے جرمنی کی روحانی روح آزاد کردیا تھا - اس میں بیحد زور' بے تھاہ گہرائی' بے پایاں وسعت تھی؛ لیکن بہت جلد یہ معلوم ہوگیا کہ ان خوبیوں کے ساتھ ترتیب اور هم آهنگی کے نہ ہونے

سے بے راہ روی اور انتشار کا خوف ہے - کچھ دن میں اس دور کے ادیبوں کی بے اصولی ' داخلیت ' اور انفرادیت حد سے گذرنے لگی - اس کا احساس سب سے پہلے ' گوئٹے ' کی ہمہ گیر طبیعت کو ہوا - اُس نے اس مسئلے کو اپنی زندگی اور اپنی تصانیف دونوں میں حل کیا - ایک طرف تو اُس نے اپنی زندگی میں آزادی اور پابندی ' فطری جوش اور اخلاقی انضباط ' Genius (خدا داد تخلیقی قوت) اور Charachter (اکتسابی سیرت) میں امتزاج پیدا کرکے جرمن قوم کے لئے ایک نمونہ قائم کیا اور دوسری طرف اپنی شاعری میں رومانی روح کے ہیجان و طوفان کو کلاسیکی ہم آہنگی اور ترتیب کی مدد سے راہ پر لگادیا - گوئٹے کے بعد کئی بار جرمن روح کے دست وحشت نے زندگی کے گریبان تنگ کو چاک کیا : لیکن گوئٹے کی زندگی اور شاعری کی مثال سامنے تھی اس لئے فوراً ہی اُس کی بخیہ گری بھی ہوگئی - اب یہ دیکھنا ہے کہ گوئٹے نے یہ مثال کیوں کر قائم کی —

باب دوم

گوئٹے کی زندگی کے حالات اور اُس کی تصانیف

' یوحان وولف گانگ گوئٹے ' سنہ ۱۷۴۹ ع میں دریائے مائن کے کنارے شہر فرانکفورٹ میں پیدا ہوا - اُسے اپنے باپ سے ضبط و انضباط ' باریک بینی ' اور مشاہدے کی عادت ورثے میں ملی اور اپنی ماں سے وسعت تخیل اور ذوق جمال - وہ اپنے ایک قطعے میں کہتا ہے —

" اپنے باپ سے میں نے وجاہت اور سنجید گی پائی ہے اور اپنی پیاری ماں سے زندہ دلی اور کہانی کہنے کا شوق " - جوانی میں اُس کے مزاج میں بیحد تلون تھا - اُس کا دل جذبات و کیفیات کا ایک سمندر تھا جس میں ہمیشہ مدوجزر رہتا

تھا ـــــ کبھی ملال اور افسردگی، کبھی جوش اور مسرت، کبھی حوصلہ مندی اور امید، کبھی بیدلی اور یاس، کبھی لطف صحبت کا ذوق، کبھی تنہائی کی تلاش ـ یہ کیفیت کم و بیش ہر نوجوان کی ہوتی ہے ـ عہدشباب میں جس طرح خون گرم ہوتا ہے اور تیزی سے بہتا ہے اسی طرح جذبات مشتعل ہوتے ہیں اور جلد جلد رنگ بدلتے ہیں مگر 'گوئٹے' کی طبیعت کے تلون اور بیچینی کو محض عمر کا تقاضا نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ اس کی یہ سیماب مزاجی عنفوان شباب کے گذر نے کے بعد بھی عرصے تک اُسی زور شور سے باقی رہی، بلکہ آخر عمر میں بھی رہ رہ کے ظاہر ہوتی رہی ـ اُس کے اس باطنی اضطراب کا سبب یہ تھا کہ اُس کے سینے میں " دوروحیں " تھیں ایک تو شاعر کی حسن پرست، عشق پرور، شورش انگیز، ہنگامہ خیز روح اور دوسرے حکیم کی عرفان جو، حق پسند، سکون طلب، نظم آفریں روح ـ ان دونوں کی کشمکش اُسے چین نہ لینے دیتی تھی اور اس کشمکش کو دور کرنے پر اُس کی نجات منحصر تھی ـ اسی کے ساتھ اس کے ذہن میں بلاکی وسعت اور ہمہ گیری اور اس کی طبیعت میں غضب کی آمد اور روانی تھی ـ اس کے لئے یہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا کہ اپنی تخلیقی قوت کے لئے کیا حدود اور کیا ضوابط مقرر کرے تا کہ وہ سیلابی دریا کے مانند کناروں کو توڑ کر آس پاس کی بستیوں کو ویران نہ کردے بلکہ سبک روندی کی طرح ایک مقررہ دھارے میں بہ کر اپنی وادی کو سیراب کرے اور زرخیز بنائے ـ غرض 'گوئٹے' کو اپنی ذات کی ارتقا اور تکمیل کے لئے ایک بہت بڑا کام انجام دینا تھا یعنی اپنے مزاج کے متضاد عناصر میں توازن پیدا کرنا اور اپنے ذہن کی حدبندی، تہذیب اور انضباط کرنا ـــ

مگر 'گوئٹے' کا کام یہاں تک محدود نہ تھا ـ وہ شاعر تھا اور اُس کی فطرت کا تقاضا تھا کہ اپنی داخلی زندگی کے نشیب و فراز اور نشو و نما کو الفاظ و تصورات کے خوش نما نقوش، حسن وصورت کی خوش آئند ترکیبوں میں ظاہر کرے تاکہ دوسرے بھی اُس سے سرور کے پردے میں تسکین اور نجات حاصل کریں ـ جس

روحانی کشمکش میں گوئٹے مبتلا تھا اسی میں اس کی قوم بھی گرفتار تھی ۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس زمانے میں رومانی جرمن روح فرانسیسیوں اور یونانیوں کی تقلید سے آزاد ہوکر اپنی فطری جوش کی رو میں بہ رہی تھی ۔ جرمن ادب پر " طوفان و ہیجان " کا رنگ چھایا ہوا تھا ۔ اُس نے اصول فن کے بند توڑ دیے تھے اور مذہب و اخلاق رسم و رواج کے پشتوں کو کمزور کردیا تھا ۔ لیکن ایک طرف تو کلاسیکی تاریخی روایات، دوسری طرف جرمنوں کی گہری مذہبیت، تیسری طرف فریڈرک اعظم کا قائم کیا ہوا فوجی انضباط جو تمام قوم کے دل میں گھر کرچکا تھا، یہ سب قوتیں " طوفان و ہیجان " کی تخریبی اور انقلابی تحریک کی مطلق العنانی کو روک رہی تھیں ۔ بہتوں کے دل میں یہ احساس پیدا ہوچکا تھا کہ تخریب کے ساتھہ تعمیر کی بھی ضرورت ہے ۔ سب سے زیادہ اس کا احساس گوئٹے کو تھا اور اُسی میں اتنی قوت بھی تھی کہ طوفان کو قابو میں لاکر اُس سے آب رسانی کا کام لے —

غرض گوئٹے کی زندگی اُس اصلاح و تعمیر کا افسانہ ہے جو اُس نے اپنی سیرت میں اور اپنی قوم کے ادب اور تہذیب میں کی ۔ یہ کوئی سہل کام نہ تھا جو تھوڑے دن میں انجام پا جاتا، بلکہ اس میں گوئٹے کو سالہا سال داخلی اور خارجی مشکلوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھنا پڑے ۔ اُس کی زندگی کے چھہ دور قرار دئے جاسکتے ہیں جنھیں ہم علحدہ علحدہ بیان کریں گے ۔

پہلا دور بچپن اور غنوان شباب کا ہے ۔ فرانکفورٹ میں گوئٹے کی زندگی باپ کی سخت نگرانی میں، ماں کے دامن شفقت میں، بہن کے ساتھہ پیار اور کھیل میں گذری ۔ اُس کا باپ خوش حال آدمی تھا مگر سادگی اور کفایت شعاری سے زندگی بسر کرتا تھا ۔ وہ اپنے بیٹے اور بیٹی کو نہایت اہتمام سے گھر پر تعلیم دیتا تھا ۔ گوئٹے دس برس کا تھا (۱۷۵۹) کہ فرانسیسیوں نے فرانکفورٹ پر قبضہ کرلیا اور شہر والوں کے گھروں میں جبراً فرانسیسی سپاہی اور افسر رکھے

گئے - گوئٹے کے گھر میں بھی فرانسیسی افسر رہتے تھے - اُس کا باپ شرم اور نفرت کے جذبات سے اس قدر مغلوب تھا کہ اُس نے اپنے کمرے سے نکلنا چھوڑ دیا ۔ مگر خاندان کے اور سب افراد ان فرانسیسیوں کی خوش مزاجی' تہذیب اور نفاست سے بہت خوش تھے اور اُن کے ساتھ لطف سے وقت گذارتے تھے - اس طرح کے خیالات اور اُس کے مذاق پر بچپن سے فرانسیسی اثر پڑا - سنہ ۱۷۶۵ ع میں جب وہ لائپزش کی یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم پانے کے لئے بھیجا گیا اُس وقت وہ فرانسیسیوں کی تقلید میں سر سے پیر تک ڈوبا ہوا تھا - اس کی وضع قطع میں' بات چیت میں' نشست و برخاست میں' تکلف اور تصنع کی بھرمار تھی - لائپزش کے لوگ بھی اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے - یہاں گوئٹے کی زندگی سخت روحانی کوفت میں گذری - اُس کی شاعرانہ طبیعت اپنے اور دوسروں کے اس طرز زندگی سے سخت بیزار تھی - علاوہ اس کے وہ یونیورسٹی کے تنگ نظرانہ' اور سطحی طرز تعلیم سے بہت گھبراتا تھا - ایک تو وہ خاموش اور حساس طبیعت رکھتا تھا - اور ملنے جُلنے سے پرہیز کرتا تھا اور دوسرے درسی مشقوں کو کوہ کندن اور کاہ برآوردن سمجھ کر اُن سے جی چراتا تھا - اس لئے اُس کے استادوں کو اس کی طرف کوئی توجہ نہ تھی - طالب علموں میں بھی اُس کے دوست بہت کم تھے - س کس مپرسی سے محبت کا بھوکا گوئٹے ہمیشہ ملول اور افسردہ رہا کرتا تھا - کچھ اس کے اثر سے اور کچھ نوجوانی کی بے راہ روی سے وہ ایک معمولی درجے کی عورت انتے شوئنے کو پف پر عاشق ہوگیا - اس زمانے میں اُس نے بہت سی غنائی نظمیں لکھیں اور دو چھوٹے ڈرامے - لیکن اِس کلام میں بھی وہی تصنع پایا جاتا ہے جو اُس کی زندگی میں تھا اُس کو ابھی وہ راہ نہیں ملی تھی جسے اُس کی روح ڈھونڈھتی تھی - اُس کے حوصلے اُس کی آرزو' اُس کے نصب‌العین میں اور اُس کی واقعی زندگی میں جو تضاد تھا اُس نے گوئٹے کو عجب روحانی کشمکش میں مبتلا کردیا تھا - عشق کے معاملے میں بھی اسے تھوڑے دن کے

بعد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۔ انیٹّے سے اُس کے تعلقات نہ نبھہ سکے - ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ گوئٹے کی صحت روز بروز گرتی گئی یہاں تک آخر وہ سخت بیمار ہو کر سنہ ۱۷۶۸ ع میں اپنے گھر فرانکفورٹ واپس آیا —

یہاں وہ ڈیڑھ سال تک علالت کی حالت میں رہا - اس کی ماں کی دوست فروئلائن فان کلیٹنبرگ نے جو پئیٹسٹ* (Pietist) فرقے سے تعلق رکھتی تھی' بڑی دلسوزی سے اس کی تیمارداری کی - وہ چاہتی تھی کہ گوئٹے کو اپنے فرقے میں شامل کرے - اس کی صحبت کے اثر سے گوئٹے کے دل میں مذہبیت کا جوش پیدا ہوا جو کسی نہ کسی صورت میں عمر بھر باقی رہا - مگر پئیٹسٹ فرقے کے جذبات پرستانہ عقائد سے اس کی تسکین نہیں ہوئی - اس نے اس سلسلے میں سحر و نیز نجات کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا' لیکن اس کی نقادانہ محققانہ نظر نے بہت جلد دیکھ لیا کہ ان چیزوں کی کوئی اصلیت نہیں - پھر بھی فروئلائن فان کلیٹنبرگ کا وہ بہت ممنون احسان تھا اور اس نے اپنے ناول ولہیلم مائسٹر میں اس خاتون کی سیرت نہایت خوبی سے بیان کی ہے —

گوئٹے کی زندگی کا دوسرا دور سنہ ۱۸۷۰ع سے شروع ہوتا ہے جب وہ اپنی تعلیم کو مکمل کرنے اسٹراسبرگ گیا - یہ شہر فرانس کی سرحد پر واقع ہونے کے سبب سے لائپزش سے بھی زیادہ فرانسیسی رنگ میں رنگا ہوا تھا - لیکن گوئٹے کی نظر میں اب زیادہ گہرائی پیدا ہوچکی تھی - یہاں اس نے اپنے ہم وطنوں کو اس اندھے پن سے وضع قطع گفتگو اور خیالات میں فرانسیسیوں کی تقلید کرتے دیکھا کہ اسے سخت شرم آئی اور ان کی ضد پر اس کے دل میں جرمن قومی تمدن کی محبت کا جذبہ بیدار ہوا اور ہرڈر کی ملاقات گویا سونے پر سہاگا ہوگئی - ہرڈر نے گوئٹے نے

---

* جرمنی میں ایک مذہبی فرقہ تھا جو سترھویں صدی میں قائم ہوا تھا - یہ لوگ پروٹسٹنٹ مذہب کی انتہائی معقولیت اور خشکی کو تصوف اور جذبات پرستی کی چاشنی سے دور کرنا چاہتے تھے —

دل میں قومیت کے جوش کو اور اُبھارا، اُسے اپنا قومی ادب کا نظریہ سمجھایا اور جرمن قومی شاعری، اور جرمن طرز تعمیر کی خوبیوں کی طرف توجہ دلائی۔ گوئٹے پر ہرڈر کی شخصیت کا جتنا گہرا اثر پڑا اتنا کسی کا نہیں پڑا اور جتنی عقیدت اسے اس سے تھی کبھی کسی سے نہیں ہوئی۔ باوجود اس کے کہ ہرڈر گوئٹے کے ساتھ برابر سختی، بیمروتی، ہمت شکنی، تضحیک کا برتاؤ کرتا رہا، گوئٹے کے دل میں ہمیشہ اس کے خیالات کا احترام رہا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گوئٹے نے فاوسٹ میں ابلیس کی جو تصویر کھینچی ہے وہ ہرڈر اور اس کے ایک اور دوست میرک کے خط و خال سے مرکب ہے۔ اسٹراسبرگ میں اور بھی کئی نوجوان ہرڈر کے خیالات سے متاثر ہوے تھے اور ان سب نے مل کر ایک ادبی حلقہ قائم کیا تھا جس نے جرمنی کی رومانی روح کو بیدار کرنے کے لئے "طوفان و ہیجان" کی تحریک شروع کی۔ لیکن اس تحریک کا روح رواں گوئٹے ہی تھا۔ اسی کی بدولت رومانیت پروان چڑھی اور اسی نے اس کی کمزوریوں کو محسوس کرکے اس کی اصلاح کی —

اسٹراسبرگ میں بھی گوئٹے کا درد آشنا دل تیر محبت سے زخمی ہوا۔ شہر کے قریب ایک خاندان رہتا تھا جس سے گوئٹے کی ملاقات تھی۔ صاحب خانہ کی بیٹی فریڈریکے بریون کے حسن نے گوئٹے کے دل کو موہ لیا۔ یہ محبت بالکل پاک تھی۔ اسی لئے گوئٹے پر اس کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ اس نے اپنی معشوقہ کو "فاؤسٹ" میں گریٹشن بناکر اسے حیات جاودانی بخشی۔ کشمکش آرزو سے نجات پانے اور راز معشوق کی پردہ داری کے خیال سے گوئٹے نے اس گھر میں آنا جانا ترک کردیا۔ یہ رمیدگی اُس کے عشق کی خصوصیت تھی اور کئی بار مختلف موقعوں پر ظہور میں آئی —

جب گوئٹے سنہ ۱۸۷۱ء میں اپنی تعلیم ختم کرکے اور قانون کی سند لے کر اسٹراسبرگ سے رخصت ہوا تو وہ دو ڈراموں کا خیال اپنے دل میں لایا ایک تو

گوتس فان برلی شنگن کا اور دوسرے فاوست کا - یہ دونوں سولھویں صدی کے جرمن کیریکٹر ھیں - اس سے معلوم ھوتا ھے کہ ھرڈر کے اثر سے قومی ادب کا خیال گوئٹے کے دل میں کس قدر راسخ ھوچکا تھا —

اب ' گوئٹے ' نے ' فرانکفورٹ ' میں وکالت شروع کی لیکن اس کا اصلی مشغلہ تصنیف و تالیف تھا - سنہ ۱۷۷۱ ع میں اس کا ڈراما " گوتس " شائع ھوا - یہ ' جرمن ' ادب میں اپنی قسم کا پہلا ڈراما تھا - اس میں سولھویں صدی کے ایک اولوالعزم بانکے کا قصہ ھے جو رسمی اخلاق کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کرتا بلکہ اپنے ضمیر کے اخلاقی نصب العین کے ماتحت شجاعت اور مردانگی کے بڑے بڑے کار نمایاں انجام دیتا ھے - وہ شاھنشاہ اور دوسرے رئیسوں سے لڑ کر اپنے طبقے کی کھوئی عزت حاصل کرتا ھے - اور میدان جنگ میں تلوار کا زخم کھا کر ھنستے کھیلتے جان دیتا ھے - اس منثور ڈرامے میں ' گوئٹے ' نے ' شیکسپیر ' کی طرح تمام مسلمہ اصول فن توڑ دے - اس نے اِس میں صرف کیریکٹر نگاری کو مد نظر رکھا - داستان کے تسلسل اور اسٹیج کے قواعد کی کوئی پروا نہیں کی - ' جرمن ' پبلک نے بڑے زور شور سے اس کتاب کا خیر مقدم کیا اور اس کے مصنف کی شہرت تمام ملک میں پھیل گئی - لیکن ' ھرڈر ' کی مشکل پسند طبیعت نے اسے پسند نہیں کیا اور اس نے 'گوئٹے' کو بہت سرزنش کی اور لکھا کہ "شیکسپیر نے تمھیں خراب کردیا"۔

اس زمانے میں عشق نے پھر ' گوئٹے ' کے مشتاق جراحت دل کی پرسش کی - وہ اپنے ایک دوست کی بیوی ' لوٹے کیسٹنز ' پر دل و جان سے عاشق ھوگیا - ' لوٹے ' اس سے دوستانہ تلطف کا برتاؤ کرتی تھی لیکن اس کا ناز پاکدامنی ' گوئٹے ' کے نیاز عشق کو ھمیشہ رد کرتا تھا - شاعر نے اپنے قلب کی بیچینی کی تصویر شعر منثور میں کھینچی اور اس قصے کا نام " نوجوان ویرتھر کے مصائب" رکھا - سنہ (۱۷۷۴ ع) - ' ویرتھر ' ایک شادی شدہ حسینہ پر عاشق ھوتا ھے اپنے جذبات مضطرب کا اظہار عاشقانہ خطوط میں کرتا ھے - اور آخر درد فراق کی

تاب نہ لا کر خود کشی کر لیتا ھے - یہ قصہ ' گوئٹے ' نے بیخودی کے عالم میں ایک مہینے میں ختم کیا - ' گوئٹے ' کی عمر کا یہ دور سراپا " طوفان و ھیجان " ھے اور ' ویرتھر ' اس کا سچا مظہر ھے - ' گوئٹے ' نہایت عرقریزی سے کوشش کرتا تھا کہ وکالت کے پیشے میں جی لگائے لیکن اس کا سیماب وش دل چین نہ لینے دیتا تھا - اس نے چاھا کہ ایک تاجر کی لڑکی سے شادی کر لے - نسبت بھی ھو گئی ' لیکن اختلاف معاشرت اور اختلاف مذاق کے سبب سے شادی کی نوبت نہ آئی —

سنہ ۱۷۷۵ ع میں ' گوئٹے ' نے " فاوست " لکھا - اپنی پہلی صورت میں یہ " طوفان و ھیجان " کا ڈراما تھا' لیکن آگے چل کر کچھ اور ھی چیز بن گیا —

اسی سال ' گوئٹے ' کو ' وائمار ' کے نوجوان فرمانروا ڈیوک ' کارل آؤگست نے اپنا مشیر مقرر کر کے بلا بھیجا - ' گوئٹے ' بھی ' فرانکفورٹ ' کی پر آشوب زندگی ' اور مایوسی عشق کی تلخیوں سے عاجز آ گیا تھا - علاوہ اُس کے ' وائمار ' کے دربار میں جانے سے اسے امید تھی کہ وکالت کی محدود زندگی سے نجات پا کر جاہ و منصب ثروت اور عزت حاصل کرنے کا موقع ملے گا - اس لئے اس نے خوشی سے منظور کر لیا - نوجوان ڈیوک اور جوان شاعر میں کچھ دن قبل پہلی بار ملاقات ھوئی تھی انھیں ایک دوسرے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ھوئی تھی - اسی کی بدولت ' گوئٹے ' کو ' کارل آؤگست ' کا قرب حاصل ھوا اور اس قرب سے عمر بھر کی سچی دوستی کی بنیاد پڑی - ' وائمار ' میں ' گوئٹے ' کی زندگی کا تیسرا دور شروع ھوا ' جس نے بتدریج اس کے مزاج اور اس کی سیرت میں عظیم الشان تبدیلی پیدا کی - درباری زندگی کی دلچسپیوں اور مصروفیتوں کے سبب سے بہت دن تک اس کی شاعرانہ تخلیق کا سر چشمہ بند رھا لیکن گوناگوں تجربوں کی بدولت سطح کے نیچے آب حیات کا خزانہ جمع ھوتا رھا جو آگے چل کر اُبلا اور بحر ذخار بن کر اُبلا —

' فرانکفورٹ ' ھی میں ' گوئٹے ' نے اپنا ڈراما ' ایگمونت ' شروع کر دیا تھا - مگر یہ وائمار جانے کے بارہ برس بعد سنہ ۱۷۸۷ ع میں ختم ھوا - یہ ایک امیر کا

قصہ ہے جو ایک نیچے طبقے کی عورت پر عاشق تھا - اس کی راہ میں ہزاروں خطرے تھے مگر اسے کسی کا احساس نہیں ہوا یہاں تک کہ آخر وہ ورطۂ ہلاکت میں غرق ہو گیا - اس قصے میں ' گوئٹے ' کا ' ڈیمون ' (Demon) کا نظریہ ہے - یہ انسان کی سیرت کا لا شعوری عنصر ہے جو حرکت اور تخلیق کی قوت کا خزانہ ہے - اس کی بدولت انسان زندگی کی سنگلاخ راہوں میں بے جانے بوجھے بے دیکھے بھالے ' آگے بڑھا چلا جاتا ہے - چاہے جو انجام ہو - اس نئے روحانی دور میں ' گوئٹے ' اس کا قائل ہے کہ آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو اس مخفی قوت کے ہاتھ میں چھوڑ دینا انسان کی نجات کا باعث ہے - ان دنوں اس کی تصانیف پر بلکہ اس کی ساری زندگی پر یہی بیخودی اور بیخبری کا رنگ چھایا ہوا ہے —

جیسا ہم کہہ چکے ہیں ' وائمار ' آنے کے بعد چند سال تک ' گوئٹے ' دربار کی لا ابالی زندگی اور ہم سن اور ہم مشرب احباب کی پر لطف صحبتوں میں ایسا ڈوبا رہا کہ اسے سوائے چھوٹی چھوٹی ہنگامی چیزیں لکھنے کے تصنیف و تالیف کا بالکل موقع نہیں ملا - ' ڈیوک کارل آؤگسٹ ' ان دنوں عہد شباب کی رندی و سیہ مستی کی داد دے رہا تھا - ' گوئٹے ' اس کی بزم عشرت میں شمع فروزاں بن کر پہنچا - وہ سفر میں ' حضر میں ' دربار میں ' شکار میں ' ڈیوک ' کے ساتھ رہتا تھا اور اپنی طبیعت کی رنگینی ' شوخی ' اور اپج سے عیش و مسرت کی نئی نئی راہیں نکالتا تھا - مگر اس کی روح اس زندگی سے مطمئن نہ تھی - مبداء فیاض نے اسے جو جوہر قابل عطا کیا تھا وہ نشو و نما کے لئے بیچین تھا - جوش جوانی اور احساس فرض آرزوے عیش اور تمنائے تخلیق میں شدید کشمکش تھی —

اس روحانی تلاطم میں ' گوئٹے ' کی دستگیری اس چیز نے کی جو بہتوں کو گرداب بلا میں مبتلا کرتی ہے یعنی عشق و محبت نے - ' فراؤ فان اشٹائن ' نے جو ریاست ' وائمار ' کے ایک عہدہ دار کی بیوی تھی حسن صورت اور جمال سیرت

کی موھنی نے نوجوان شاعر کے دل کو موہ لیا - یہ خاتون ' گوئٹے ' سے عمر میں بڑی تھی اور وقار و متانت ' نفاست مذاق ' اصابت رائے اور حسن تدبیر میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی - کچھہ اُس کی واقعی صفات اور کچھہ شاعر کے تخیل کی کمال بینی (Idealization) غرض ' گوئٹے ' اُسے صنف نسوانی کا کامل نمونہ سمجھتا تھا - ان دونوں کی محبت برسوں تک افلاطونی عشق کی حد سے آگے نہیں بڑھی - ' گوئٹے ' اس سے کاروبار میں ' تصنیف و تالیف میں غرض ہر چیز میں مشورہ لیتا تھا اور اُس کے مشورے پر عمل کرتا تھا - جوش جوانی کے تقاضے سے وہ روحانی ارتباط کے علاوہ جسمانی وصل کا بھی طالب تھا مگر اس کی معشوقہ مدتوں اُن پیارے حیلوں سے جنھیں کچھہ پاکدامن اور شائستہ عورتیں ھی خوب جانتی ھیں ٹالتی رھی آخر گوئٹے کے دل کی مراد پوری ہوئی ؛ اگرچہ بعض دقتوں سے نکاح نہ ہوسکا مگر دونوں کے تعلقات اسی قدر استوار اور وفادارانہ تھے جیسے میاں بیوی کے ہوتے ہیں اور آخر عمر تک ایسے ھی رھے —

'فراؤ فان اشتائن' کے ڈر سے 'گوئٹے ' کی سیرت میں عظیم الشان انقلاب ہوگیا - اُس نے اپنی لااُبالی زندگی بالکل ترک کردی اور وہ ضبط نفس حاصل کیا جس پر زاھدوں کو بھی رشک آئے - وہ محنت ' فرض شناسی ' کفایت شعاری پابندی اوقات کا پتلا بن گیا - جو انتظامی فرائض اُس کے سپرد تھے اُن سے اُس کی طبیعت کو ذرا بھی مناسبت نہ تھی - لیکن طبیعت پر انتہائی جبر کرکے اس نے محنت اور ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دینا شروع کئے اُسے وائمار کی رعایا کی بہبود ہی کا سوتے جاگتے ہر وقت خیال رہتا تھا اور اس کے لئے وہ نت نئی تدبیریں سوچتا تھا اور اُن پر مستعدی اور تن دھی سے عمل کرتا تھا - یہ سچ ھے کہ اُس کی سعی سے ملک کے نظم و نسق میں کوئی دیر پا خارجی نتائج حاصل نہیں ہوے مگر اس میں اُس کا قصور نہ تھا - پھر بھی یہ فائدہ کیا کم ھے کہ خود ' گوئٹے ' کی سیرت میں اس عملی جدوجہد سے پختگی اور یکسوئی پیدا ہوگئی اور اُسے انسانی زندگی میں وہ بصیرت حاصل ہوگئی جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ھے - اس کے علاوہ اُس نے

نوجوان ڈیوک کی' تربیت اور اصلاح کی کوشش شروع کی جو ابتدا میں تو کامیاب نہیں ہوئی لیکن اُس کے انتہائی استقلال کی بدولت آخر میں اپنا اثر دکھا کر رہی۔ مدبر کی حیثیت سے گوئٹے نے وائمار کو کوئی نمایاں فائدہ نہیں پہنچایا' لیکن معلم کی حیثیت سے اُس نے وائمار کے فرمانروا کو رندلاابالی سے فرض شناس اور خوش تدبیر حکمراں بنادیا۔

اس عرصے میں اس کی تصنیف بہت محدود رہی - زیادہ تر توجہ غنائی شاعری کی طرف رہی - دو ڈرامے ' افی گینیا ' اور ' ٹیسو ' اُس نے شروع کئے مگر انھیں ختم نہ کر پایا - ان ڈراموں کے جو حصے اُس نے اس زمانے میں لکھے اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کا شاعرانہ عقیدہ بدل چلا ہے - وہ انسان کے فطری جوش طبیعت کا قائل ہے لیکن اخلاق و تمدن کے ضابطوں کی روحانی قوت بھی اُسے نظر آنے لگی ہے - اسے یہ احساس پیدا ہو چلا ہے کہ ان دونوں چیزوں میں امتزاج کی ضرورت ہے' لیکن ابھی اس امتزاج کی کوئی شکل اس کی سمجھ میں نہیں آتی - اس کے لئے اسے کسی خارجی اثر کی ضرورت ہے مگر یہ اثر 'جرمنی' میں نہیں ملتا ۔ خدا جانے کیا بات ہے کہ اس کا دل خود بخود اطالیہ کی طرف کھنچ رہا ہے —

سنہ ۱۷۸۶ع کے آغاز میں ' گوئٹے' کی طبیعت بہت بیچین ہے - اپنی شاعرانہ قوت تخلیق کے رک جانے کا اسے بیحد صدمہ ہے-وہ سمجھ گیا ہے کہ انتظامی کام اس کے بس کا نہیں - بیدلی سے کام کرنا اسے گوارا نہیں - وہ رسیاں تڑاکر بھاگنا چاہتا ہے - اگر کوئی کمزور طبیعت کا آدمی ہوتا تو خدا جانے کب تک اس حیص بیص میں رہتا مگر گوئٹے کی طبیعت کمزور نہیں - اُس میں بلا کی قوت ہے جو پچھلے چند سال کی باضابط زندگی کی بدولت اور پختہ ہوگئی ہے ' وہ جلد فیصلہ کرتا ہے کہ اُسے اطالیہ کا سفر کرنا چاہئے اور ڈیوک سے اجازت لے کر بغیر اپنے دوستوں سے مشورہ کئے چل دیتا ہے —

' اطالیہ ' میں اس کا قیام دو سال سے زیادہ رہا - اس ملک میں اُسے وہ چیز مل گئی جسے اُس کا دل مدت سے ڈھونڈتا تھا - یہاں کی خوشنما پرانی عمارتوں میں ' یہاں کے عجائب خانوں میں ' یہاں کی آرٹ گیلریوں میں اُسے قدیم ' یونانی

رومی ' تمدن کے نمونے اور کلاسیکی روم کے مجسمے ملے - یہاں آکر اُسے معلوم ہوا کہ انسان نے کس طرح اپنی فطرت کے اُبھار اپنی طبیعت کی اُپج کو ترتیب اور ہم آھنگی کے ضابطوں سے جکڑ کر خوشنما اور مفید بنایا تھا ' کس طرح ' طوفان و ھیجان ' کو اخلاقی اور مدنی اصولوں کے پشتوں سے قابو میں لاکر راہ پر لگایا تھا - اطالیہ میں آکر گوئٹے کی زندگی کا چوتھا دور شروع ہوا جو اصل میں اُس کی شاعرانہ تخلیق کا آغاز تھا - زندگی کے مطالعے کے لئے اُسے جس بصیرت کی حاجت تھی وہ مل گئی اُس کے دھندلے خیالات واضح ھوگئے ' اُسے اپنا نصب العین صاف نظر آنے لگا -

علاوہ اس کے فرحت بخش جنوبی آب و ھوا میں سکون و تنہائی کی زندگی بسر کرنے سے گوئٹے کو اپنی پچھلی زندگی پر تبصرہ اور آئندہ زندگی کی طیاری کرنے کا موقع ملا - یہاں اُس نے اپنی کل پرانی تصانیف پر نظرثانی کی - ' ایگمونت ' جو اُس کی بیخودی اور وارفتگی کے عہد کی یادگار تھا ' ختم کیا - ' اِفی گینیا ' جو اس کے ھوش اور خودداری کے دور کی تمہید تھی مکمل کی - ' تیسو ' کا اکثر حصہ لکھا اور ' فاؤست ' کے کچھ سین - فاؤست کا جو خاکہ اُس کے ذہن میں تھا وہ بالکل بدل گیا - اس کی تفصیل ھم آگے کے صفحات میں درج کریں گے -

' افی گینیا ' کا قصہ ایک قدیم یونانی روایت پر مبنی ھے - مشہور یونانی شاعر ' یوری پیڈیس ' نے بھی اس پر ڈراما لکھا ھے - یہ ایک بہادر اور عقلمند لڑکی کی کہانی ھے جو اپنے باپ کے قول کو پورا کرنے اور اپنے ملک کی مدد کے لئے ' آرٹیمس ' دیوی کے مندر میں قربان کئے جانے پر طیار ھوگئی مگر اپنی دانشمندی اور دیوی کی مدد سے اس نے اپنی جان بھی بچالی اور اپنے ملک کی لاج بھی رکھہ لی - اس ڈرامے میں ' گوئٹے ' نے کلاسیکی طرز ادا کو اس خوبی سے نباھا ھے کہ یہ قدیم ' یونانی ' طرز کے بہترین ڈراموں میں شمار کیا جاتا ھے - مضمون کے اعتبار سے بھی یہ قصہ شاھد ھے کہ اب ' گوئٹے ' مذھب و اخلاق کو جس کا وہ ابتدائی دور میں مخالف تھا اور ھی نظر سے دیکھتا ھے -

ٹیسو میں اگرچہ گوئٹے نے جدید عہد کے ایک شاعر کا قصہ لکھا ہے - لیکن ہر اعتبار سے یہ ڈراما بھی کلاسیکی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے - شاعر کی بیچپن اور حساس طبیعت ' اُس کی عاشق مزاجی ' اُس کے والہانہ جوش' اُس کی شہرت پسندی' اس کی رقابت کی تصویر دکھا نے میں گوئٹے نے کمال کردیا ہے - ٹیسو کے حریف مدبر کا کیرکٹر بھی بالکل حقیقت پر مبنی ہے —

اصل میں اس ڈراما میں گوئٹے یہ اعتراف کرتا ہے کہ شاعر اپنی نازک مزاجی' اپنی زود رنجی' اپنی لطافت طبع کے سبب سے عملی زندگی کی سختیوں اور ناہمواریوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور اس کی کشتیءِ حیات ان چٹانوں سے ٹکراکر پاش پاش ہوجاتی ہے —

سنہ ۱۷۸۸ ع میں اطالیہ سے واپسی کے بعد گوئٹے نے انتظامی اور عملی کاموں میں حصہ لینا کم کردیا اور آہستہ آہستہ تخیل اور تفکر کے کنج عزلت میں گوشہ نشینی اختیار کی - ریاست کی جو خدمتیں اُس نے اپنے ذمے لیں بھی وہ ایسی تھیں جن سے اُس کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی - کچھہ دن وہ وزیر تعلیم رہا اور مدتوں دربار کے تھیٹر کا منتظم - سنہ ۱۷۸۹ ع میں گوئٹے نے ٹیسو ختم کرلیا - دوسرے سال اس کی اس وقت تک کی تصانیف کا مجموعہ شائع ہوا جن میں فاؤست بھی Fragment (ایک نا تمام ٹکڑے) کے نام سے شامل تھا —

یہ انقلاب فرانس کا زمانہ تھا - گوئٹے کو ابتدا میں اس تحریک سے بڑی ہمدردی تھی - اپنی طرز معاشرت کے لحاظ سے وہ امارت پسند تھا لیکن اُس کو عوام کے طبقے سے بڑی محبت تھی - ابھی تک اُس کے دل سے "طوفان و ہیجان" کی یاد محو نہیں ہوئی تھی جس کا نعرۂ جنگ " آزادی " تھا - فرانس کے عوام کو امرا کے جبر و استبداد سے آزاد ہوتے دیکھہ کر اُسے بڑی خوشی ہوئی - جب نپولین نے ریاست پروشیا سے جنگ چھیڑی تب بھی گوئٹے کی ہمدردی اس اولوالعزم فاتح کے ساتھہ تھی - و ائمار نے حب وطن کے جوش میں پروشیا کا ساتھہ دیا تو

گوئٹے کو بڑا صدمہ ہوا۔ اُسے اپنے ملک سے جتنی محبت تھی وہ کم لوگوں کو ہوگی لیکن وہ سمجھتا تھا کہ نپولین نے تمام یوروپ کو آزاد کرانے اور ایک نئے اور اعلیٰ تمدن کی بنیاد رکھنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ وائمار میں کوئی اس معاملے میں اُس کا ہم خیال نہ تھا، اس لئے اُس کی دلچسپی انقلاب سے رفتہ رفتہ کم ہو گئی اور وہ حکیمانہ بے تعلقی سے اس کی نشو و نما کا مطالعہ کرنے لگا۔ لیکن نپولین سے اُسے ہمیشہ عقیدت رہی

ان دنوں وائمار میں ایک نوجوان شاعر آیا ہوا تھا جو جرمنی کے آسمان سخن پر گوئٹے کے پہلو بہ پہلو چمکنے والا تھا۔ شلر جس کا نام آج تک گوئٹے کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے، اُفتادِ طبیعت، شاعرانہ عقائد، طرزِ ادا غرض ہر چیز میں گوئٹے سے مختلف تھا۔ سن رسیدہ گوئٹے خود دار، بھاری بھر کم، صابر اور دور اندیش تھا اور نوجوان شلر بے تکلف، گرم جوش، جلد باز اور ناعاقبت اندیش۔ شلر صرف شاعر نہ تھا بلکہ اُس نے تاریخ اور فلسفہ کا بھی عالمانہ مطالعہ کیا تھا۔ فلسفے میں وہ کانت کا پیرو تھا اور جمالیات کے شعبے میں اُس نے کانت کے خیالات کو بنیاد قرار دے کر بڑے گہرے اور بصیرت افروز مقالے لکھے ہیں۔ اپنی شاعری میں بھی وہ ایک حد تک فلسفیانہ اصول کا پابند تھا اور منطقی تحلیل سے جس حد تک شاعر کام لے سکتا ہے لیتا تھا۔ گوئٹے رسمی فلسفہ سے زیادہ دلچسپی نہ رکھتا تھا لیکن اُس کی نظری ذہانت اُس کی وسیع نظر اُس کے گہرے مطالعے، اُس کے طویل تجربے نے اسے فلسفۂ زندگی میں وہ بصیرت بخشی تھی جو شلر تو کیا عہد جدید کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ پھر ہمہ گیری کے اعتبار سے بھی شلر کو اُس سے کوئی نسبت نہ تھی۔ مجرد فلسفہ نہ سہی لیکن سائنس کے ہر شعبے میں اور دوسرے علوم و فنون میں وہ اہل فن کا سا درک رکھتا تھا۔ تاہم اُس نے شلر کی طرح شاعری کی بنیاد فلسفے پر نہیں رکھی تھی بلکہ فلسفے کی شاعری پر۔ وہ فلسفہ کی عینک سے زندگی کا مطالعہ نہیں کرتا تھا بلکہ شاعر کی نظر سے اُس کا

مشاہدہ کر کے فلسفیانہ نتائج حاصل کرنا چاہتا تھا - جو لوگ شاعری کی حقیقت سے واقف ہیں انھیں یہ تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوگا کہ گوئٹے کا اصول صحیح ہے اور شلر کا غلط - ان دونوں کی شاعری خود اس کی روشن دلیل ہے - شلر کا کلام زور' صفائی' چستی کے لحاظ سے نہایت قابل قدر ہے' لیکن اُس میں وہ گہرائی نہیں جو گوئٹے کے یہاں پائی جاتی ہے - شلر کا کوئی ڈراما فلسفیانہ نہیں کہا جاسکتا' گوئٹے کا فاؤسٹ دنیا کی اعلیٰ ترین فلسفیانہ نظموں میں شمار ہوتا ہے —

شلر کو گوئٹے سے ملنے کی بڑی آرزو تھی لیکن گوئٹے کچھہ اختلاف طبیعت' کچھہ عزلت پسندی' کچھہ رشک کے سبب سے بہت دن تک کتراتا رہا - آخر دونوں میں ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا اور آہستہ آہستہ انھیں ایک دوسرے کی قدر و قیمت کا اندازہ ہونے لگا - سنہ ۱۷۹۴ ع تک اُس دوستی کی بنیاد مضبوط ہوچکی تھی اور باہمی تاثیر و تاثر کا وہ سلسلہ شروع ہوچکا تھا جس نے دونوں کے حوصلوں کو بڑھایا اور دونوں کے کلام میں چار چاند لگادئے —

شلر کی دوستی سے گوئٹے کی زندگی کا پانچواں دور شروع ہوتا ہے اور یہی دور اُس کی شاعری اور معانی آفرینی کا زرین عہد ہے - شلر کے جوش جوانی اور حوصلہ مندی نے گوئٹے کے دل میں شاعری کی دبی ہوئی آگ کو اُبھارا اور اُسی کے مشورے اور اصرار سے گوئٹے نے ان معرکہ آرا تصانیف کو پھر ہاتھہ میں لیا جنھیں وہ مدت سے چھوڑ چکا تھا - اب شلر گوئٹے کا ادبی مشیر بن گیا اور اُسی کے اثر سے گوئٹے کو اپنی تصنیف میں تنقید اور تنظیم کی طرف زیادہ توجہ ہوئی - اب تک اُس کی طبیعت ایک پہاڑی ندی کی طرح بے قید تھی اور جدھر من کی موج ہو اُدھر بہتی تھی - اب اُس نے اسے ایک نہر کی طرح سوچ سمجھہ کر معینہ راستوں پر لے جانے کی کوشش کی - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کیف و کم دونوں کے لحاظ سے اُس کی تصنیف نے بہت ترقی کی - اب وہ زندگی کے منفرد پہلوؤں کی مصوری سے آگے بڑھ کر مجموعی انسانی زندگی کا نقاش بن گیا -

اس سلسلے کی پہلی کتاب " ولہیلم ما ئسٹر کا زمانہ شاگردی ھے " ۔ کسی زمانے میں اس نے ایک نو جوان کا قصہ لکھا تھا جو تھیٹر کی تماشاگری کو اپنا پیشہ بنانا چاھتا ھے اور برسوں اس کوچے میں سر گرداں رہ کر عجیب تجربات حاصل کرتا ھے - اب ' گوئٹے ' نے اس قصے کو دوبارہ لکھا اور ایک شاہ کار بنا دیا جس کا جواب اگر جرمن ادب میں مل سکتا ھے تو ' فاوسٹ ' یہ ھے اب ' گوئٹے ' کے فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ تعلیم کا آئینہ بن گیا - اس میں ' گوئٹے ' نے یہ دکھایا کہ سچی تعلیم وہ ھے جو انسان زندگی کی سختیاں جھیل کر اور ٹھوکریں کھا کر حاصل کرتا ھے بہ شرطیکہ اس کی آنکھیں کھلی ھوں —

ھم کہہ چکے ھیں کہ تنقید کا شوق گوئٹے کو شلر نے دلایا تھا ۔ گوئٹے جو زندگی کے مدرسے سے حکمت و بصیرت کی سند لے چکا تھا اب اس طرف متوجہ ھوا کہ دوسروں کو راہ دکھائے اور تعلیم دے ۔ ' شلر ' نے ' یلینا ' سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا تھا ۔ ' گوئٹے ' نے اس میں تنقیدی اور طنزیہ مضامین لکھے ان میں فن تنقید کے وہ باریک نکتے بیان کئے گئے ھیں جن کی مثال جرمنی میں کیا دنیا کے ادب میں ملنا مشکل ھے —

یہ چیزیں تو نثر میں تھیں - نظم میں ' گوئٹے ' نے وہ پیاری کتاب ' ھرمان ' اور ڈرروتھیا ؟ " لکھی جو خیالات کی پختگی اور طرز ادا کی سادگی کے لحاظ سے ' ھومر ' اور ' فردوسی ' کے کلام کی طرح سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ھے - اس میں دیہات کی سیدھی سادی زندگی اور دو پاک اور بھولی روحوں کے باھمی عشق کی تصویر ھے جس کا ھر رنگ دلکش اور ھر خط اثر آفرین ھے ۔ اس کے اس عہد کے چھوٹے چھوٹے ڈراموں اور غنائی شاعری میں بھی ' کلاسیکی رنگ چھایا ھوا ھے —

ان چیزوں کے ساتھ گوئٹے ' فاوسٹ ' پر بھی نظرثانی کرتا رھا - اس کی ھمہ گیر طبیعت ایک وقت میں ایک چیز پر قناعت نہ کرتی تھی ۔ ایک ھی وقت میں وہ وہ صرف مختلف ادبی کام کرتا تھا بلکہ طبیعیات ' نباتیات ' معدنیات وغیرہ

میں نظری مطالعہ اور عملی تجربہ کرتا رہتا تھا - اسی کے ساتھ ' نقاشی اور دوسرے فنون لطیفہ کا شغل بھی رہتا تھا اس سرسری خاکے میں ہم ' گوئٹے ' کو صرف ادیب کی حیثیت دکھانا چاہتے ہیں ورنہ وہ تو ایسا جامع حیثیات شخص تھا کہ اس کی زندگی علم النفس کے ماہروں کے نزدیک ایک معمہ ہے - اس کی جتنی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں سے کسی کو اٹھا کر دیکھئے تو ذہن انسانی کی وسعت اور ہمہ گیری کا حیرت انگیز نمونہ نظر آئے —

' گوئٹے ' اور ' شلر ' کی دوستی کا یہ دور حکم قضا سے بہت جلد ختم ہو گیا - ' شلر ' سنہ ۱۸۰۵ ع میں سن کہولت کو پہنچنے سے پہلے دنیا سے رخصت ہو گیا - ' گوئٹے ' کو اس کے مرنے کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس کی فطری شگفتگی ہمیشہ کے لئے مرجھا کر اور اس کی خلاقی اُمنگ ہمیشہ کے لئے دب کر رہ گئی - اس کی عزلت پسندی اب اور بھی بڑھ گئی - سنہ ۱۸۰۶ م میں اس نے اپنی ایک وفادار خادمہ سے نکاح کر لیا اور خارجی دنیا سے قریب قریب قطع تعلق کر کے اپنی تخیل اور تفکر کی دنیا میں جو ظاہر میں محدود مگر باطن میں کل کائنات سے زیادہ وسیع ہے محو ہو گیا —

مگر یہ نہ سمجھہ لینا چاہئے کہ ' گوئٹے ' کی ادبی اور علمی جد و جہد ختم ہو گئی - اس نے اپنی نصف صدی کی زندگی میں تجربے اور مشاہدے کا اتنا بڑا خزانہ جمع کر لیا تھا اور تندہی اور محنت کی ایسی پختہ عادت ڈال لی تھی کہ اس کی عمر کے بقیہ پچیس برس میں تصنیف و تالیف کا مشغلہ بدستور جاری رہا —

' گوئٹے ' کی عمر کا یہ آخری دور غالباً انسانی زندگی کے مبصر اور ادبی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ ہے - اس میں ہمیں ایک پیر دانشمندی کی تصویر نظر آتی ہے جو زندگی کے متعدد نشیب و فراز دیکھہ چکا ہے ' جو اپنی فطری بیچینی ' اپنی بے قید قوت تخلیق ' اپنی بے روک جذبات پرستی

کو ضبط و انضباط ' اصول و قواعد ' عقیدے اور نصب العین کے قابو میں لا چکا ہے ' اپنے ملک کے ادب کے رومانی جوش و خروش کو کلاسیکی ترتیب وہم آہنگی کے سانچے میں ڈھال چکا ہے ' اپنی قوم کے مزاج کی وحشت اور شورش کو تنظیم اور تہذیب کی راہ دکھا چکا ہے اور اب سکون و اطمینان سے بیٹھ کر اپنے کام پر نظر ثانی کر رہا ہے - وہ اپنے گھر سے باہر بہت کم نکلتا ہے لیکن اس کا گھر اہل علم وارباب ادب کا مرجع ہے - لوگ آتے ہیں اور اس کے فیض سخن اس کی حکمت و بصیرت سے مالا مال ہو کر جاتے ہیں - سارے ' جرمنی ' بلکہ سارے یورپ کی ادبی نشو ونما اس کے پیش نظر رہتی ہے - وہ حکیمانہ تنقید اور بزرگانہ مشوروں سے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی کوششوں کو سیدھی راہ پر لگاتا رہتا ہے - وہ دیکھتا ہے کہ رومانی تحریک جسے وہ دبا چکا تھا اب پھر نئی نسل میں اُبھر رہی ہے مگر وہ اس سے خفا نہیں - وہ جانتا ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے شباب کا گرم خون " طوفان و ہیجان " بن کر اُبلتا رہے گا - مگر اسے یہ بھی یقین ہے کہ جیسے اُس نے زندگی کی تپ کو مدتوں سہہ کر آخر میں ضبط وانضباط کی تبرید کی قدر پہچانی اسی طرح دوسرے بیمار بھی کریں گے اور انھیں اس میں خود اس کے نسخوں سے بڑی مدد ملے گی - ' رومانیت ' کی دوا مل جانے سے وہ اتنا مطمئن ہے کہ اس عمر میں کبھی کبھی خود بھی یہ درد مول لیتا ہے اور اس کے سوز و ساز کا لطف اٹھاتا ہے —

' گوئٹے ' کی متعدد بہترین تصانیف اسی دور میں لکھی گئیں یا شائع ہوئیں - سنہ ۱۸۰۸ ع میں اس نے ' فاوسٹ ' کا پہلا حصہ شائع کیا - اس کے کچھ سال بعد اس نے " مشرقی مغربی " دیوان لکھا - یہ اس کی متعدد غنائی نظموں کا مجموعہ ہے جو اس نے ایرانی شعرا خصوصاً ' حافظ ' کے کلام سے متاثر ہو کر لکھا ہے - اسی کے جواب میں علامۂ اقبال نے " پیام مشرق " لکھا ہے - اس کتاب نے جرمنی کے شاعرانہ حلقوں میں ایک ہل چل ڈال دی - اس کی تقلید میں رومانی شاعروں نے

متعدد کتابیں لکھیں اور مشرقی ادب ایک مستقل شعبہ بن گیا ۔

اب ' گوئٹے ' نے پھر نثر کی طرف توجہ کی۔ " انتخابی رشتے " جو اصول کے فن کے لحاظ سے اُس کا سب سے مکمل ناول ہے اسی عہد کی تصنیف ہے - یہ عورت اور مرد کے عشق کا نفسیاتی مطالعہ ہے - ایک میاں بیوی کا جوڑا جن کی طبیعتوں میں باہم مناسبت نہیں ہے احساس فرض کے سبب سے کچھ دن ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرتا ہے مگر آخر میں میاں اپنی ایک عزیز لڑکی پر اور بیوی میاں کے ایک دوست پر عاشق ہوجاتی ہے - پاس آبرو اور اخلاقی قانون انھیں زنجیروں میں جکڑ کر رکھتا ہے اور اُن کی زندگی کو برباد کردیتا ہے - اس میں 'گوئٹے' نے سماج کو انفرادی روح کی فریاد سنائی ہے لیکن اخلاقی قانون کی زور شور سے حمایت کی ہے - اس کا مقابلہ " ویرتھر " سے کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب 'گوئٹے کا عقیدۂ زندگی کتنا بدل چکا تھا —

اس کے بعد ' گوئٹے نے ' ولہیلم مائسٹر ' کا دوسرا حصہ " ولہیلم مائسٹر کا زمانہ سیاحی " کے نام سے لکھا ہے- اس میں اُس نے دکھایا ہے کہ ایک شخص جو جوانی میں " طوفان حوادث " کے " مکتب " میں تعلیم حاصل کرچکا ہے کیوں کر زندگی کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے اور اپنی قوم کی تنظیم کرنے کی کوشش کرتا ہے - ' فاؤسٹ ' کے دوسرے حصے کی طرح یہ بھی 'گوئٹے' کے فلسفۂ حیات کا دستورالعمل ہے - تعلیم کے متعلق جو گہرے خیالات اس میں ظاہر کئے گئے ہیں وہ آج تک معلموں کے لئے سبق آموز ہیں —

جب ' گوئٹے ' کی کتاب زندگی ختم ہونے کو آئی تو اُسے اپنی سوانحعمری لکھنے کا خیال آیا - " شاعری اور حقیقت " کے نام سے اُس نے اپنے عہد شباب کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے - یہ صرف اس کی ابتدائی زندگی کی تصویر نہیں ہے بلکہ " طوفان و ہیجان " کی ادبی تحریک کا مرقع ہے - افسوس ہے کہ اسے اس کتاب کے ختم کرنے کا موقع نہیں ملا ' ورنہ ہمارے سامنے گوئٹے کی پوری زندگی کی

قدیم 'یونان کی مشہور 'حسینہ ہیلن' کی روح کو بلاتا ہے۔ وہ اس روح سے شادی کر لیتا ہے اور اس کے بطن سے اس کا ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ جب اس کے اور شیطان کے معاہدے کی میعاد ختم ہوتی ہے تو فاؤست اپنے کئے پر پچھتاتا ہے اور شیطان جسے اپنی جیت کا یقین ہے اس سے یوں کھیلتا ہے جیسے بلی چوہے سے۔ اپنی زندگی کا آخری دن وہ اپنے دوستوں کے ساتھ وِٹنبرگ میں بسر کرتا ہے۔ یہاں ابر و باد کے تند و تیز طوفان میں وہ ایڑیاں رگڑ کر جان دیتا ہے اور اپنی روح شیطان کے حوالے کرتا ہے۔

سنہ ۱۵۹۰ ع میں اس کتاب کا جرمن سے انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ تھوڑے ہی دن بعد مارلو نے اس قصے کو ڈراما کے طرز پر لکھ کر شائع کیا۔ انگلستان میں یہ ڈراما بہت مقبول ہوا اور وہاں سے تھیٹر کی کمپنیاں جو بر اعظم کا دورہ کیا کرتی تھیں اسے جرمنی لائیں۔ جرمنی کی اسٹیج پر ان دنوں فرانسیسی کھیلوں کا قبضہ تھا۔ یہ قصہ وہاں بہت دن تک کٹھ پتلی کے تماشے میں دکھایا جاتا تھا —

اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں لیسنگ نے جس کی بدولت جرمن ادب میں نئی روح پیدا ہوئی جرمن اسٹیج کو بھی فرانسیسی اثر سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے متعدد اور یجنل ڈرامے لکھے اور اسی سلسلے میں فاؤست کے قصے کو بھی ڈراما کی صورت میں لانا چاہا۔ لیکن ایک سین سے زیادہ نہ لکھ پایا —

غرض فاؤست کا قصہ جرمنوں کے قومی تخیل کا عکس تھا۔ اور صدیوں سے خاص و عام میں مقبول تھا۔ لوگ اسے "کتاب فاؤست" میں پڑھتے تھے کٹھ پتلی کے تماشے میں دیکھتے تھے اور کہانی کی طرح سنتے تھے —

باقر آگاہ

(ان کی حیات، تصنیفات اور دیوان)

از

(جناب محمد عبدالقادر سروری صاحب ایم، اے۔ ال، ال، بی)

اٹھارھویں صدی عیسوی کا آخری زمانہ بھی ھندوستان کے لئے عجیب پر آشوب تھا۔ ایک طرف تو مغربی اقوام سواحل پر اپنی قوت کا استحکام کرکے اندرون ملک کی طرف بڑھنے لگی تھیں اور ھندوستان کی طوائف الملوکی سے جرأت پاکر ان کی تجارتی جماعتوں کو حکومت میں دخل در معقول کرنے کا خیال پیدا ھو گیا تھا - اس غرض کے حصول کے لئے ان کی سربرآوردہ قوتوں کے درمیان کشمکش شروع ھوگئی - اگرچہ سیاسی فضا میں ایسی افرا تفری مچی ھوئی تھی ، لیکن اس کے ساتھ ھی ساتھ شمالی ھندوستان میں میر تقی میر ، خواجہ میر درد اور مرزا رفیع سودا کی شیوہ بیانیوں سے اھل زبان متاثر ھورھے تھے اور اردو شاعری کی بنیادیں مضبوط ھورھی تھیں۔ عین اسی زمانے میں دکن بھی، باوجود اس سیاسی ھاچل کے اپنی علمی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ چنانچہ صوبۂ مدراس کے قصبہ ایلور سے ایک بزرگ ظاھری اور باطنی علوم و فنون کا مرکز بن کر اپنی زندگی ھی میں اپنے کردار اور افعال سے معاصرین کو متاثر کرتے ھیں اور مرنے کے بعد اپنے اقوال اور

افادات کا کافی ذخیرہ عربی، فارسی اور اردو میں چھوڑ جاتے ہیں - یہ حضرت مولانا محمد باقر "آگاہ" شافعی قادری ایلوری ہیں اور مدراس کے بڑے محقق عالم اور کثیرالتعداد تصنیفات کے مصنف ہیں —

جیسا ہم نے ابھی اوپر بیان کیا ہے حضرت آگاہ مدراس کے ایک صوبہ ایلور میں تولد ہوے تھے - * آپ کی پیدائش کا سال سنہ ۱۱۵۸ ھ ہے - آگاہ کے والد کا نام محمد مرتضیٰ تھا اور محمد صاحب کے نام سے مشہور تھے - محمد مرتضیٰ کے اسلاف دراصل بیجاپور کے رہنے والے تھے - خود محمد مرتضیٰ آگاہ کی ولادت سے پہلے ایلور چلے آئے تھے جہاں آگاہ پیدا ہوے —

آگاہ بچپن ہی سے نہایت ذہین تھے اور حافظہ بھی قوی تھا - چنانچہ سات سال کی عمر میں انہوں نے قرآن مجید ختم کیا - ابتدائی تعلیم چچا سے گھر ہی میں

---

* حضرت محمد باقر آگاہ کے خیالات کا سب سے پہلا اور مستند ماخذ تذکرہ گلزار اعظم ہے - اس کے مصنف والا جاہی خاندان کے سب سے آخری صوبہ دار کرناٹک نواب محمد غوث خاں بہادر امیرالہند والا جاہ عمدۃ الامرا مختارالملک عظیم‌الدولہ، شہامت جنگ ہیں - جو نواب منور خاں بہادر اعظم جاہ کے بیٹے اور بانیء خاندان والا جاہی نواب محمد علی والا جاہ کی پانچویں پشت میں پوتے ہوتے ہیں - ان کی ولادت سنہ ۱۲۳۹ھ (۱۸۲۴ ع) کو ہوئی، نواب اعظم خاں کے انتقال کے وقت یہ تین سال کے تھے اور اسی وقت (۱۲۴۱ ھ ۱۸۲۵ ع) کو تخت پر بٹھائے گئے - ان کے چچا نواب عظیم جاہ بہادر ان کے نائب مقرر ہوے - محمد علی والا جاہ کی طرح یہ بھی علم دوست اور علما کے سرپرست تھے - سنہ ۱۲۵۷ ھ سے تذکرۂ کرناٹک کے کام کو شروع کیا تھا جو غالباً سنہ ۱۲۷۲ھ کے کچھ پہلے ختم ہوا - اور اسی سال صوبۂ کرناٹک کے سرکاری مطبع میں چھپ کر "گلزار اعظم" کے نام سے شایع ہوا - ان کی وفات بھی سنہ ۱۲۷۲ ھ میں ہوئی (ملاحظہ ہو "تذکرۂ گلزار اعظم" صفحہ ۷۲)

مولوی محمد مرتضیٰ صاحب سابق سکریٹری حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس نے بھی اسی تذکرے سے آگاہ کے حالات جمع کرکے ایک کتاب کی صورت میں شایع کئے ہیں *

ہوئی - لیکن بعد میں حضرت سید ابوالحسن قربی * کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے بھیج دیے گئے - یہیں آگاہ نے وہ فیض حاصل کیا جو آئندہ زندگی میں عمر بھر ان کی رہبری کرتا رہا - آگاہ کو اپنے استاد سے بہت محبت تھی اور ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور اس احترام میں آخر وقت تک کوئی فرق نہیں آیا - اس کا ثبوت 'آگاہ' کی تصنیفات میں جا بجا ملتا ہے چنانچہ دیوان ہی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں -

حضرت مرشد اس حقیر کے جناب سید ابوالحسن قادری قربی قدس اللہ سرہ اس کی جوڑ میں ایک برھنی اور ایک درسنی کہے† -

حضرت ابوالحسن قربی ایلورھی کے رہنے والے تھے اور فارسی و عربی کے متبحر عالم ہونے کے علاوہ ہندی (اردو) کے بھی اچھے شاعر تھے - ان کا اردو کلام دستیاب تو نہیں ہوسکا ، تاہم آگاہ نے ان کی ایک ' درسنی ' کی یہ بیت اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھی ہے -

میں پیو میں اپس کو فدا کروں میں مرنے کے آگیج مری

غزلوں میں ایک جگہ اس مصرع کی تضمین اس طرح کی ہے ‡ :-

بقول حضرت قربی اب آگاہ کسو کا عشق میں پروا نہ کرنا

(ورق ۱۶۷)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ اس قسم کی کٹھن اصناف شاعری میں طبع

---

* حضرت قربی سنہ ۱۱۱۷ھ میں بیجاپور میں پیدا ہوے - چار سال کی عمر میں والد کے ساتھ شہر چھوڑ کر ایلور میں آرہے - سنہ ۱۱۸۲ھ میں ان کا انتقال ہوا - فارسی کے بڑے متبحر عالم اور عربی ، فارسی اور ہندی کے اچھے شاعر تھے (گلزار اعظم صفحہ ۲۸۵ تا ۲۸۸) م

† دیباچہ دیوان اُردو (قلمی) ورق ۵ ب -

‡ ملاحظہ ہو تذکرہ گلزار اعظم مطبوعہ سنہ ۱۱۷۲ھ صفحہ ۸ (مطبع سرکاری کرناٹک)

آزمائی کرتے تھے تو یقین ھے کہ غزل اور مثنوی بھی ضرور لکھی ھوگی کیونکہ یہی اس زمانے کے سب سے زیادہ ھر دلعزیز اصناف تھے - فارسی میں بھی ان کے اشعار موجود ھیں —

استاد کے اس ذوق سخن نے شاگرد رشید کی موزوں طبعیت پر خاصا اثر ڈالا اور شاعرانہ مذاق کو سنوارنے میں بڑی مدد دی —

حضرت قربی کے پاس تحصیل علم کرنے کے بعد بھی آگاہ کی علمی پیاس پوری طرح نہیں بجھی - اس لئے وہ شہر کو چھوڑ کر طلب علم میں ترچناپلی پہنچتے ھیں - ترچناپلی کو اس زمانے میں ' نتھر نگر ' کہا کرتے تھے - یہاں مولوی ولی اللہ نامی ایک عالم تھے جن سے آگاہ نے کچھہ عرصہ کے لئے علوم کی تحصیل کی اور انھیں کے مشورے سے کتابوں کا مطالعہ جاری رکھا - تھوڑی مدت یہاں اس طرح گذارنے کے بعد غالباً سنہ ۱۱۰۵ ھ کے قریب اپنے وطن ایلور کو واپس ھوے - یہاں اپنے قدیم استاد حضرت قربی کی خدمت میں آ رھے اور ان کے انتقال تک جدا نہیں ھوے —

آگاہ نے پندرھویں سال سے شعر کہنا شروع کیا - چنانچہ اپنی ایک تصنیف " ریاض الجنان " کے دیباچے میں لکھتے ھیں —

" یہ عاصی پندرھویں سال سے شعر کے ساتھہ الفت و ارتباط رکھتا ھے * " —

ابتدا میں کوئی تخلص اختیار نہیں کیا تھا - " رسائل ھشت بہشت" میں جو سنہ ۱۱۸۴ اور سنہ ۱۱۸۵ ھ کے درمیان لکھے گئے اور جس وقت ان کی عمر ستائیس سال کی تھی ' پہلے پہل ' باقر ' تخلص اختیار کیا - اور اس کے دس سال بعد سنہ ۱۱۹۴ ھ میں جب عربی دیوان لکھنا شروع کیا تو آگاہ تخلص کیا - گو یا اس طرح

---

* مخطوطہ " ریاض الجنان " - ورق ۹ ب (کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ نمبر ۲ ی ۱۰) (فہرست مخطوطات زیر طبع) —

"باقر" تمام دکھنی مثنویوں میں اور "آگاہ" اردو غزلوں اور فارسی اور عربی نظموں کے لئے مخصوص کر لیا گیا تھا - اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے آگاہ نے فارسی شاعری بھی شروع کردی تھی - چنانچہ "گلزار اعظم" کے مصنف لکھتے ھیں کہ اٹھارہ سال کی عمر میں استاد کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر گذار نا تھا جس کا مطلع یہ ھے :—

افتاب برج وحدت مہتاب برج دیں   کا شف اسرار قربت صاحب عین الیقین

استاد نے شاگرد کے خلوص اور احترام کے جذبات سے زیادہ اس گوھر قابل کی جودت طبع کی تعریف فرمائی اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اس میں بعض چیزیں اصلاح کی محتاج ھیں جو بالمشافہ دکھائی جا سکتی تھیں ● —

غالباً انیسواں سال (سنہ ۱۱۷۶ یا ۷۷ھ) تھاجب آگاہ ترچنا پلی سے گھرواپس ھوے کیونکہ اٹھارھویں سال تک تو وہ حضرت قربی سے دور تھے اور وھیں سے قصیدہ + اُستادکی مدح میں لکھ کر روانہ کیا تھا - اور پھر واپسی کے ساتھ ھی فوراً حضرت قربی کی خدمت میں جا پہنچے - اس لحاظ سے وہ اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے ایلور واپس نہیں ھوسکتے - اور چونکہ واپسی کی صحیح تاریخ معلوم نہیں اس لئے یہ اٹھارہ سال سے بعد اور قریب ھی کوئی تاریخ ھوسکتی ھے —

اس مرتبہ حضرت قربی سے نہ صرف علمی تعلق رھا بلکہ روحانی رشتہ بھی قائم ھوگیا - کیونکہ آگاہ نے قربی کے ھاتھ پر بیعت بھی کرلی تھی —

نظم میں آگاہ قربی ھی سے اصلاح لیا کرتے تھے - اس کا ذکر جگہ جگہ نئی طرح پر کیا ھے - ایک فارسی شعر میں کہتے ھیں —

بود ھر بیت من آئینہ دار دیدہ آگاہ   کہ بر وجہ حسن کسب سخن از بوالحسن کردم

● مخطوط " ریاض الجنان" ورق ۷ الف (کتب خانۂ کلیہ جامعہ عثمانیہ ۲ی+۱)-

+ یہ قصیدہ تمام تر چنا پلی کے زمانے میں لکھ کر بھیجا گیا تھا - اسی وجہ سے حضرت قربی نے اصلاح کے لئے اگاہ کا موجود ھونا ضروری سمجھا - آگاہ اٹھارھویں سال سے پہلے ایلور واپس نہیں ھوے —

اُردو دیوان میں بھی اس طرح کئی اشعار میں اشارہ کیا ہے - ذیل کا شعر ملاحظہ ہو —

جام جہاں نما ہے نظم دقیق آگاہ　　　صاف اس کو کردیا ہے صیقل ابوالحسن کا ●

ویلور میں آگاہ کا قیام حضرت قربی کے انتقال تک رہا - اس کے بعد وہ پھر "نتھر نگر" (ترچنا پلی) چلے گئے - اس دفعہ ترچناپلی جا نے کا سنہ بھی معلوم نہیں - اگر ان کی تمام تصنیفات دستیاب ہو جائیں تو ان کے بالا ستیعاب مطالعے سے اس کا پتہ چلنا ممکن ہے - بہر حال آ گاہ نے تر چنا پلی ہی میں مستقل بود و باش اختیار کرلی - اس وقت تک اگاہ کے علم و فضل کی سارے ملک میں کافی شہرت ہوچکی تھی - چنانچہ اسی شہرت کی بنا پر نواب محمد علی والا جاہ بہادر نے مولانا کو اپنے در بار میں تشریف لانے کی دعوت دی —

محمد علی والا جاہ بہادر اس وقت کر نا ٹک کے حکمراں تھے اور جس طرح آغاز مضمون میں بیان کیا گیا ہے ان کی حکومت کے دوران میں ہندوستان ایک عجیب انقلابی حالت میں تھا - مغربی قومیں خصوصاً انگریز اور فرانسیسی تجارتی کمپنیاں ایک دوسرے پر بر تری حاصل کرتے اور اپنے سوا دوسروں کو ہندوستان سے باہر نکال پھینکنے کی فکر میں تھیں - ان کے قدم بھی یہاں جمنے لگے تھے جس کی بڑی وجہ ہندوستانی حکمرانوں کا آپس کا اختلات اور خانہ جنگی تھی —

کرناٹک کا صوبہ جو در حقیقت مدراس کے بڑے حصے پر مشتمل تھا، نواب نظام الملک بہادر کی سلطنت کا ایک جز اور نواب صاحب کی طرت سے ایک گورنر کے ماتحت تھا - سنہ ۱۷۴۳ ع میں کر نا ٹک کے پہلے گورنر حکمراں کا آخری سلسلہ صفدر علی والیءصوبہ کے مارےجانے پر ختم ہو گیا - اس کے بعد نواب نظام الملک

● مخطوط دیوان اُردو ورق ۶۶ (الف) —

بہادر کی جانب سے انورالدین خاں یہاں کے گورنر بنا کر بھیجے گئے (سنہ ۱۷۴۳ ع)* ۱۱۵۰ ھ - آمبور کی لڑائی میں انورالدین خاں بھی ہلاک ہو گئے-ان کے فرزند نواب محمد علی نے تر چنا پلی (نتھرنگر) میں پناہ لی اور انگریزوں کی مدد سے بڑی جان توڑ کوشش کے بعد تخت حاصل کیا - لیکن آخری وقت تک برابر فرانسیسیوں کے خلاف انگریزوں نے ان کو آلہ کار بنا بنا کر جنگوں میں مصروف رکھا † —

---

* ملاحظہ ہو برٹش انڈیا " مصنفہ آر - ڈبلیو فریزر (فشرانوین اڈیشن) صفحہ ۷۲ تا ۹۹ —

† انورالدین خاں بہادر سے لےکر (سنہ ۱۷۴۳ ع ۱۱۵۰ ھ) نواب محمد غوث خاں بہادر تک یعنی (سنہ ۱۲۷۲ ھ - ۱۸۶۴ ع) تک اس خاندان کے کل چھ حکمراں ہوے جن کا شجرۂ نسب یہ ہے —

انورالدین خاں (سنہ ۱۱۵۰ ھ - ۱۱۵۶ ھ)

|

محمد علی والا جاہ سنہ ۱۱۵۶ھ - سنہ ۱۲۱۰ ھ)

|

علی حسین خاں عمدۃ الامرا (سنہ ۱۲۱۰ - سنہ۱۲۱۶ ھ)

امیرالامرا (انتقال سنہ ۱۲۰۴ھ) باپ کے سامنے

|

عبدالعلی عظیم الدولہ

(سنہ ۱۲۱۶ - سنہ ۱۲۳۴ ھ)

|

منور علی اعظم جاہ (سنہ۱۲۳۴تا۱۲۴۱ھ)

عظیم جاہ سفیدالاولہ(ملہم)

|

محمد غوث خاں (سنہ ۱۲۴۱ تا سنہ ۱۲۷۲ ھ)

|

مصنف تذکرہ گلزار اعظم

اگرچہ محمد علی ان پریشانیوں میں مبتلا تھے مگر انھوں نے علم و فضل کی ہمیشہ اور ہر حال میں سرپرستی کی۔ عالموں اور فاضلوں کی صحبت سے نواب صاحب کو بڑی دلچسپی تھی ' فرصت کا بیشتر وقت وہ انھیں مشاغل میں گذارنا چاہتے تھے - جب آگاہ کی شہرت ان کے کانوں تک پہنچی تو انھوں نے نہایت اعتقاد اور احترام کے ساتھ ان کو اپنے پاس بلا لیا —

یہاں نواب کے دونوں فرزندوں نواب امیر الامرا اور نواب عمدۃ الامرا - (علی حسین خان بہادر) کی اتالیقی کی خدمت آگاہ کے تفویض ہوئی - اور دوسو روپیہ ماہوار - چند دنوں بعد نواب نے الندور کی جاگیر بھی عطا کی جس کی آمدنی ایک ہزار دوسو ہون سالانہ تھی - اس خدمت سے متعلق ہو جانے کے بعد آگاہ نے کرناٹک ہی کو اپنا مستقر بنایا اور مرتے دم تک یہیں رہے —

یہ زمانہ آگاہ کے لئے بے حد فرصت اور آرام کا تھا - چنانچہ ان کی تصنیفات کا بیشتر حصہ اسی وقت تکمیل کو پہنچا —

آخری دنوں میں آگاہ کی قابلیت نے نواب صاحب کی نظروں میں بڑی وقعت پیدا کر لی تھی - چنانچہ دبیری (معتمد) کا عہدہ بھی انہیں کو عنایت ہوا - نواب صاحب کی تمام مراسلت خصوصاً جو اہل حجاز کے ساتھ ہوتی انہیں کے ذریعے کی جاتی - پہلا نامہ جو آگاہ نے لکھا اس کی بڑی تعریف حجاز سے نواب صاحب کے پاس وصول ہوئی - جس کے صلے میں نواب نے ایک زرین گہوارہ تیار کروا کر اپنے دونو فرزند نواب عمدۃ الامرا اور نواب امیرالامرا کے ساتھ آگاہ کی خدمت میں روانہ کیا - اور حکم دیا کہ یہ دونو استاد کو اس میں بیٹھا کر جھلائیں - آگاہ نے بڑی رد و کد کے بعد اس صلے کو تو قبول کر لیا ' لیکن ان کی عقل سلیم نے اس کو گوارا نہیں کیا کہ اس میں بیٹھ کر جھولیں —

آگاہ کا انتقال چودھویں ذیحجہ سنہ ۱۲۲۰ ھ شب پنجشنبہ کو ہوا - میلاپور میں ان کی زر خرید اراضی تھی ' یہیں مدفون ہوے - شرف الملک کرناٹک کے

مدارالمہام * نے جن کو آگاہ سے خاص تعلق تھا، سنہ وفات " قدمات فردالعصر " سے نکالا ہے —

(۲) تصنیفات

آگاہ بڑے متبحر عالم اور عربی اور فارسی اور اُردو تینوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے - ان تینوں زبانوں میں ان کی تصنیفات موجود ہیں۔ ان زبانوں میں شعر بھی کہتے تھے۔ " احسن‌النبئین " (تصنیف آگاہ) میں لکھا ہے کہ ان کی مجموعی تعداد تین سو تین (۳۰۳) ہے + - اُردو میں تو ان کی نظم و نثر کی بیس کے قریب کتابیں موجود ہیں - عربی شاعری کے نمونے بھی اُردو دیوان سے کچھ مل جاتے ہیں - لیکن خود آگاہ نے عربی میں ایک دیوان کے مرتب کرنے کا حال بیان کیا ہے۔ چنانچہ مخطوطۂ " ریاض‌الجنان " کے نثری دیباچہ میں لکھتے ہیں —

" بیچ سنہ یک ہزار و یکسو نوہ اور چہار کی وقت نظم کرنے دیوان عربی

---

* یہ مولوی محمد غوث شرف‌الملک ہیں - جو نواب امیرالامرا بن نواب والاجاہ محمد علی کی رفاقت میں رہتے اور بعد میں ان کے فرزند عظیم‌الدولہ کے اتالیق مقرر ہوے - والد کی وفات کے بعد عدالت کے " داروغہ " (منفذاحکام شریعت) بنے - عمدۃالامرا کی متلون مزاجی سے ناراض ہوکر خدمت سے استعفا دےدیا اور سنہ ۱۲۱۳ ھ میں سوہوت ہوتے ہوے حیدرآباد پہونچے - یہاں سے سید عبدالقادر جاگیر دار (اود گیر) کے پاس جاکر رہے (سنہ ۱۲۱۵ ھ) - ایک سال بعد عظیم‌الدولہ نے انھیں مدراس طلب کر کے ایک سو تیس کے مشاہرے پر مداوالمہامی کا عہدہ ان کے تفویض کیا - سنہ ۱۲۱۹ ھ میں شرف‌الدولہ شرف‌الملک کا خطاب اور سنہ ۱۲۲۰ ھ میں مسند عنایت کی- سنہ ۱۲۳۳ھ کو پھر خدمت سے مستعفی ہوگئے اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے- سنہ ۱۲۳۸ ھ میں انتقال ہوا —

ان کی تصنیفات کل ۳۱ بتلائی گئی ہیں، جن میں سے عربی کی اٹھائیس، فارسی کی دو اور ہندی کی ایک (موسومہ رسالہ فقہ مذہب حنفی) (ان کے حالات مخطوطۂ ' تاریخ احمدی ' مولفہ احمد بن صبغۃاللہ ابن شرف‌الملک سے لئے گئے ہیں) -

+ ملاحظہ ہو دیباچہ خیر المبین ترجمہ احسن‌النبئین تصنیف باقر آگاہ - مطبوعہ مفید دکن حیدرآباد دکن سنہ ۱۲۱۱ ھ - صفحہ ۳ -

کے تخلص اپنا آگاہ مقرر کیا - اس تخلص کو اشعار عربی و فارسی میں لایا اور اکثر مراثی اور ریختوں میں بھی اس تخلص کو اختیار کیا * " —

صاحب " گلزار اعظم نے بھی " آگاہ کی عربی شاعری کا ذکر اپنے تذکرہ میں اس طرح کیا ہے - " خود را تالیف و تصنیف فنون جداگانہ نظما و نثرا در زبان عربی و فارسی و ہندی مصروف گردانید - جملہ تصانیف او درالسنۂ ثلاثہ از روے حساب ابیات زیادہ از پنجاہ ہزار است - وہریکی از انہا مشتہر و برگزیدہ روزگار " (صفحہ ۱۰)

عربی اشعار کے غالباً کئی دیوان تھے - مخطوطۂ " گلستان نسب " میں ان کے پہلے عربی دیوان کا نام " نفحۃالعنبریہ فی‌مدحۃالخیرالبریہ " بتلایا ہے - یہ دیوان آنحضرت صلی‌اللہ علیہ وسلم کی مدح پر مشتمل ہے† - دوسرا دیوان نعت ' منقبت ' مدح ' اور عربی غزلوں پر مشتمل ہے - اس میں معاصرین میں سے اکثر مشہور لوگوں کی مدح بھی لکھی ہے - جن میں ایک میر غلام علی آزاد بھی ہیں - فارسی میں بھی ایک مختصر دیوان مگر بلند پایہ کلام پر مشتمل ہے - جس کا مخطوطہ مکتبۂ ابراھیمیہ (حیدرآباد دکن) میں دیکھا گیا - آگاہ کے فارسی ' عربی اور اُردو کے جملہ اشعار کی تعداد (۱۵۰۰۰) بتائی گئی ہے ‡ - اور غالباً یہ اس باقی کلام کا حال ہے جو حضرت قربی کے انتقال کے بعد لکھا گیا تھا - اس سے پہلے کا جو کلام تھا وہ استاد اور مرشد کے انتقال کے بعد گوشہ نشینی کے خیال سے شاگرد نے انتہائی رنج و محن کی حالت میں " آشنائے آب § " کردیا تھا —

آگاہ کی اردو تصنیفات تیرہ تک معلوم ہوئی ہیں - جن کا ذکر آئندہ تفصیل

---

* مخطوطۂ " ریاض‌الجنان " کا دیباچہ ورق ۷ ! (کتب خانہ کلیہ جامعۂ‌عثمانیہ) ۲۵۱
† " گلستان نسب " مصنفۂ غلام عبدالقادر ناظر —
‡ " گلزار اعظم " صفحہ ۱۰ —
§ " گلزار اعظم " صفحہ ۹ —

کے ساتھ آے گا - اس میں اکثر دینیات کے موضوع پر ھیں - غالباً آگاہ ان اولین اُردو مصنفین میں ھیں جنھوں نے اپنی تحریروں کا مخاطب صنف نازک کو بھی بنایا - بعض کتابیں جیسی "تحفۃالنسا" خاص عورتوں کے لئے لکھی گئی - لیکن عموماً ھر تصنیف میں وہ عورتوں کا لحاظ ضرور رکھتے تھے - فرائد در فوائد کے دیباچہ میں وہ اس کی طرف خود اشارہ کرتے ھیں —

> "مضمون اس کا بہت عمدہ کتابوں سے لیا ھوں - اور داد ضبط و تحقیق کا دیا ھوں - اُمیّان اور عورات کے سمجھانے کے واسطے اسے صاف اور سیدا لکھا ھوں *" —

ان کی تصنیفات میں اکثر غیر مطبوعہ ھیں - ذیل میں ان تمام کتابوں کی ایک اجمالی تفصیل پیش کی جاتی ہے جو آگاہ کی ھیں - یا ان سے منسوب کی گئی ھیں —

۱ — ھشت بہشت † یہ آنحضرت صلعم کی سیرت ھے جس کے آٹھ حصے ھیں - ان حصوں کی تفصیل یہ ھے (۱) من دیبک - نور محمدی کے حالات میں (۲) من ھرن - ولادت با سعادت کے اشارات پر (۳) من موھن - حالات ولادت میں (۴) جگ سوھن - زندگیء مبارک کے حالات پر مشتمل ھے (۵) آرام دل - اخلاق نبوی (۶) راحت جان - آنحضرت کے خصائل سے (۷) من درپن - اور (۸) من جیوں میں معجزات بیان کئے گئے ھیں - اس کی ابتدا سنہ ۱۲۰۶ ھ‡

---

* مخطوطۂ "فرائد در فوائد" ورق الف ب کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ نمبر ۱۸ (فہرست زیر طبع) —

† اس کا ایک نا مکمل مخطوطہ کتب خانۂ کلیہ جامعہ عثمانیہ میں موجود ھے نمبر ۲ و ۴ - دوسرا مکمل مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی (حیدرآباد دکن) میں ھے (ملاحظہ ھو جلد دوم (سنہ ۱۳۳۳ ھ) صفحہ ۸۸۸ نمبر ۵۳ —

‡ ملاحظہ ھو مخطوطہ "ریاض الجنان" ورق ۷ - الف ' (کتب خانہ کلیہ) —

میں ہوئی اور اختتام سنہ * میں ہوا —

۲ - فرائد در فوائد - میں قران مجید کے نزول ' فضائل کا حال اور سورتوں کی تعداد ' ان کے خصائل ' ان کا جمع ہونا اور ان کے معنوں کی وسعت پر بحث کی گئی ہے - پوری کتاب ایک نثری دیباچہ کے علاوہ ستائیس فصلوں اور ایک فائدہ پر مشتمل ہے - یہ سنہ ۱۲۱۰ ھ میں تمام ہوئی تھی † —

۳ - ریاض الجناں - ‡ یہ مثنوی اہلبیت کے مناقب میں ہے - ولی و یلوری اور شیدائے حیدر آبادی کے بعد مگر ان سے زیادہ مستند ذرائع سے مدد لے کر یہ کتاب لکھی گئی - اس کی تصنیف کا سال سنہ ۱۲۰۷ ھ ہے $ —

۴ - محبوب القلوب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے مناقب میں منظوم رسالہ ہے- ایک دیباچہ کے علاوہ گیارہ فصلوں پر منقسم ہے - دیباچے سے مصنف کی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے - اس کی تصنیف کا سال خود مخطوطہ سے سنہ ۱۱۳۷ ھ معلوم ہوتا ہے - لیکن - " ریاض الجناں " کے دیباچہ میں سنہ ۱۲۷ ھ لکھا ہوا ہے جو در حقیقت ایک ہزار ایک سو ستائیس ہے -

---

* ملاحظہ ہو مخطوطہ " ریاض الجناں " ورق ۷ - الف کتب خانہ کلیہ -

† اس کا مخطوطہ بھی کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ میں موجود ہے نمبر الف ۱ - مکتبہ ابراہیمیہ (حیدرآباد دکن) میں ایک مطبوعہ نسخہ موجود ہے - جو " ہشت بہشت کا دوسرا ایڈیشن ہے اور مطبع عزیزیہ میں سنہ ۱۲۷۰ ھ کو چھپا - یہ کتاب پہلی دفعہ سنہ ۱۲۶۲ ھ میں مطبع راج کشن میں چھپی تھی (سرورق نسخۂ مکتبہ) —

‡ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ میں موجود ہے نمبر ۲ی ۱-

$ یہ سن اختتام ' ریاض ' میں خود مصنف نے لکھا ہے (جب تھے بارہ سو اور سات برس - تب بنا ہے یہ نسخۂ اقدس)

اگر یہ آخری تاریخ صحیح ہو، اور کاتب کی غلطی سے بجائے ۳ کے ۲ نہ لکھہ دیا گیا ہو تو غالباً یہ سنہ ۱۱۲۷ ھ میں شروع ہوا ہو گا اور دس سال بعد ختم ہوا * —

۵ — ریاض السیر † —

۶ — تحفۃ النساء —

۷ — تحفۃ الاحباب فی مناقب الاصحاب —

۸ — روضۃ اسلام —

۹ — گلزار عشق ‡ —

۱۰ — قصہ رضوان شاہ —

۱۱ — روح افزا —

۱۲ — خمسہ متحیرہ —

۱۳ — مثنوی ادب سنگار —

۱۴ — دیوان ہندی $ —

۱۵ — کرامات قادریہ —

۱۶ — استیناس ردالناس علی حدیث القرطاس —

۱۷ — دفع الشک فی الفدک —

۱۸ — سور القران —

---

* کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ اور کتب خانہ آصفیہ میں بھی اس کا ایک ایک مخطوطہ موجود ہے - پہلے کے لئے ملاحظہ ہو فہرست ۲ ی ۳ - دوسرے کے لئے فہرست کتب خانہ آصفیہ جلد دوم صفحہ ۱۵۶۲ تا ۵۳ —

† ملاحظہ ہو فہرست کتب خانہ آصفیہ جلد دوم صفحہ ۶۸۶ - نمبر ۲۵ مکتوبہ ۱۲۵۹ھ —

‡ دیباچہ مخطوطہ دیوان ہندی ورق ۳ ب —

$ ان کتابوں کے متعلق یہ معلوم ہے کہ اردو ہیں —

(۱۹) کحل الجواهر شرح جلاء البصائر فی نقص الاٴئل الناصر (یہ محمد محی الدین کے رسالہ " جلاء البصائر کی شرح ہے) ●

(۲۰) احسن التبیئین †

(۲۱) نفحة الغیریہ فی مدحة الخیرالبریہ (عربی دیوان جو نعت نبوی پر مشتمل ہے) ‡

(۲۲) مجموعہ قصائد و غزلیات (عربی قصائد اور غزلوں کا مجموعہ ہے) $

(۲۳) دیوان فارسی §

(۲۴) تحفة الاحسن فی المناقب السیدابی الحسن ¶

(۲۵) سحرالحلال فی ذکر الهلال (فارسی)

(۲۶) مکتوبات آگاہ یعنی وہ عربی خطوط جو کرناٹک کے صوبیدار نواب محمد علی والاجاہ کی خدمت دبیری کے زمانے میں آگاہ نے حجاز اور عرب کے اکثر سربرآوردہ لوگوں کے نام نواب صاحب کی طرف سے لکھے تھے —

(۲۷) شجرہ طیبہ جنیدیہ قادریہ ‡

(۲۸) فتویٰ دربارہ تقلید - فارسی میں فقہ کا ایک رسالہ ہے ‡

● † اور $ کے مخطوطے - اور † کی مطبوعہ کتاب محمد حمیداللہ صاحب بی - اے (عثمانیہ) کے پاس دیکھی گئی —

† اس کا ترجمہ " خیرالمبین " کے نام سے مولوی دستگیر صاحب نے کیا - (مطبوعہ مفید عام پریس حیدرآباد دکن) اس کتاب کے ساتھ مترجم کا دیباچہ ہے جس سے باقر آگاہ کی چند کتابوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے —

§ اس کا مخطوطہ مکتبہ ابراهیمیہ (حیدرآباد دکن) میں موجود ہے —

¶ ملاحظہ ہو - تذکرہ " گلزار اعظم " صفحہ ۲۸۶

‡ ملاحظ ہو فہرست کتب خانہ آصفیہ جلد اول صفحہ ۵۱۴ - ۸۶۱

‡ " " " " صفحہ ۱۷۴۰ نمبر ۲۴/۲ (فن مجامیع)

(۲۹) دفع و سواس الخناس العارض فی حدیث المیراب و الفدک و القرطاس *

(۳۰) کشف الغطا - (فارسی زبان میں ' کلام پر هے) †

(۳) دیوان هندی

یہاں هم ' آگاہ ' کے دیوان کے متعلق تفصیلی معلومات پیش کرنا چاهتے هیں۔ دیوان کے سرورق پر اور خود اشعار میں بھی کہیں کہیں " هندی " هی کا لفظ استعمال کیا گیا هے۔ تا هم یہ معلوم رهے کہ اس سے مراد ان شاعروں کی " اُردو " هوتی تھی۔کیوں کہ وہ اُردو کو هندي سے کوئی جدا چیز نہیں سمجھتے تھے۔اس بحث کی تفصیل آگے آئے گی —

یہ دیوان (۱۷۱) اوراق پر ختم هوا هے اور هر صفحہ میں ۱۴ سطور هیں۔ خط نستعلیق شکستہ هے - عنوانات ' مقطع میں تخلص اور کہیں کہیں کچھ شعر سرخی سے لکھے هوئے هیں - کاتب کا نام اور سنہ کتابت کہیں درج نہیں هے - لیکن ورق الف -ب پر یہ عبارت درج هے —

سفر قبلگاہ بھکہ مکرمہ کو تقریباً ۱۰۲ سال هوے هیں۔ ان کی پھپی صاحبہ دختر آگاہ مرحوم ان کو عنایت فرمائیے " —

مرقوم ۲ - رجب سنہ ۱۳۴۶ هجری - محمد حبیب اللہ (دستخط)

سنہ اور اوپر کے سال کے هندسوں میں بعد میں کچھ تغیر کیا گیا هے خارجی ذرائع سے معلوم هوا هے کہ محمد حبیب اللہ صاحب کے والد مرتضیٰ صاحب نے سفر حج سے سنہ ۱۲۴۰ هجری کے قریب فراغت حاصل کی تھی - اور یہ دیوان ان کو اسی وقت دیا گیا - اس طرح اس کی کتابت یقیناً سنہ ۱۲۴۰ هجری سے پہلے هوچکی تھی۔ورق ۲- الف کے ناصیہ پر "علاقہ متروک'' ذرا نیچے هٹ کر یہ دو تحریریں ترچھی درج هیں —

---

* ملاحظہ هو فہرست کتب خانہ آصفیہ جلداول صفحہ ۱۳۴۰ نمبر ۷۵۰

† ,, ,, ,, ,, صفحہ ۱۳۵۴ نمبر ۳۸۳

۱- دیوان ہندی مولوی باقر آگاہ —

۲- عنایت حضرت پھوپی صاحبہ قبلہ بنت حضرت آگاہ مغفور مالک مرتضیٰ بن صفی الدین کان اللہ الہما —

ذرا اور نیچے دست کر لکھا ہے " مالک غلام محمد بن مرتضیٰ " —

ان تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد حبیب اللہ کے والد مرتضیٰ بن صفی الدین کو یہ دیوان ان کی پھوپی نے جو باقر ' آگاہ ' کی دختر تھیں ' عنایت کیا ہے - گویا محمد حبیب اللہ باقر آگاہ کے پر پوتے ہوتے ہیں - جن کو یہ دیوان اپنی دادی (باپ کی پھوپی) کے پاس سے ملاتھا —

اس سے بھی اس دیوان کی قدامت پر روشنی پڑتی ہے - محمد حبیب اللہ کے پاس دو پشتوں سے گذر کر یہ دیوان پھر پہنچا ہے جس کی مدت ایک سو سال سے کسی طرح کم نہیں ہوسکتی —

دیوان کے غالباً صرف دو نسخے ہیں - جن میں سے ایک جو ہمارے پیش نظر ہے ہم کو آگاہ کے ایک موجودہ رشتہ دار مولوی محمد حمیداللہ صاحب بی - اے (عثمانیہ) سے مطالعہ کے لئے ملا ہے - دوسرا مخطوطہ مکتبہ ابراہیمیہ (حیدر آباد دکن) میں موجود ہے - جس میں تاریخ کتابت نہیں ہے- آگاہ کا دیوان اس زمانے کی تمام مروجہ اصناف نظم پر مشتمل ہے - زبان کے اعتبار سے بھی اس وقت کے روز مرہ کے مطابق ہے جس کی طرف خود آگاہ نے اس طرح اشارہ کیا ہے —

" یہ مجموعہ اگرچہ مختصر ہے ' سب اقسام سخن پر مشتمل ہے اور اسے محاورہ اردو سے مخصوص کردیا - جسے تفنن سخن میں پوری رسائی اور تصرف و چاشنی میں جوں چاہے آشنائی ہے ... وغیرہ (دیباچہ دیوان ورق ۱۱ ب) - شمالی ہند میں اُردو نثر کی ابتدا بارھویں صدی ہجری کے آغاز سے کچھ پہلے ہوی - تیرھویں صدی میں میر کے معاصر اور مد مقابل مرزا رفیع سودا کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اُنھوں نے میر کی مثنوی " شعلۂ عشق " کو نثر میں لکھا تھا-اور یہ اُردو نثر کا

سب سے پہلا نمونہ تھا - یہ ترجمہ اب تک علمی دنیا کو دستیاب نہیں ہوا - اگر یہ مل جائے تو یقیناً بڑی کام کی چیز ہوگی کیونکہ اس سے شمال میں اُردو نثر کی ابتدائی حالت معلوم ہونے کے علاوہ میر و سودا کے دکنی معاصرین خصوصاً باقر آگاہ کے نثری نمونوں کو ان کے سامنے رکھہ کر ایک تقابلی مطالعہ کیا جاسکتا ہے - فی الحال سودا کے اس نثری نمونے کے ملنے تک ان کے دکنی معاصرین کی نثر کا مطالعہ بخوبی کیا جاسکتا ہے - اس لئے نہیں کہ یہ اُردو نثر کے ابتدائی نمونے ہیں بلکہ اس لئے کہ ان سے اس زمانے میں زبان کی ارتقائی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے —

مربوط اُردو نثر نگاری کی ابتدا دکن میں آٹھویں صدی ہجری سے پہلے ہوچکی تھی - قدیم ترین اُردو نثر کے کچھہ نمونے بعض در مندان اُردو خصوصاً مولوی عبدالحق صاحب بی-اے- انجمن ترقی اُردو اورنگ‌آباد (دکن) کے سکریٹری کی مساعی سے منظر عام پر آچکے ہیں *- اور امید ہے کہ آئندہ بہت سی اس قسم کی کتابیں علمی دنیا سے روشناس ہوتی رہیں گی —

آگاہ کے اس دیوان کی ابتدا میں ایک نثر کا دیباچہ ہے جو بارہ صفحوں پر مشتمل ہے - اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر اور سودا کے معاصرین نے نظم کے ساتھہ ساتھہ نثر کو بھی کس رتبے تک پہونچا دیا تھا - اور کن مفید اور علمی مطالب کا اسکو حامل بنایا تھا - پہلی مذہبی اور تبلیغی تحریروں سے گذر کر اس وقت زبان کے اہم پہلوؤں پر بھی ناقدانہ طرز سے تحریریں پیش کی جانے لگی تھیں - یہ دیباچہ اس وقت کی تمام نثری تحریروں میں ایک خاص امتیاز رکھتا ہے - جس اجمال اور مفید اختصار کے ساتھہ اصناف نظم پر اس میں بحث کی گئی ہے اس کی مثال اس وقت تک کی تمام دکنی تحریروں میں نہیں ملتی - بلکہ

---

* ملاحظہ ہو رسالہ "تاج" (حیدرآباد دکن) جلد ۲ شمارہ ۴، ۵ و ۶ —

ان کے بعد بھی سید انشاالله خاں ' انشا ' سے پہلے کسی نے اس موضوع پر قلم اٹھانے کی کوشش نہیں کی - اور اگر زبان کی قدیم خصوصیات سے قطع نظر کر کے دیکھا جاے تو موجودہ متین علمی نثر میں بھی اس کا رتبہ دوسری تحریروں سے کسی طرح کم نہیں —

اس دیباچہ کی اهمیت کے مدنظر اور قدیم ترین علمی نثر کا نمونہ ہونے کی وجہ سے هم مناسب سمجھتے هیں کہ اس کو یہاں بلا کم و کاست پیش کردیں - اس سے کئی ایک اهم امور پر بخوبی روشنی پڑتی هے —

بسم الله الرحمن الرحیم

حمد و ثنا اُس ذات اقدس کا کون کر سکے کہ الفاظ اجناس جزئی و کلی و کلمات انواع علوی و سفلی یک کن فرما تے هی اُس کی مادۂ امکان سے اشتقاق پاے هیں اور وصف و نعت اُس کی حبیب مقدس کا کوئی کیونکر لکھے کہ جوامع الکلام سے اُس کی زبان اور ان انفس و افاق کی هیبت کھائی صلےالله علیه و آلهواصحابه اهل المجدوالکرم - بعد اس کے آگاہ جوہران سے یاران نکتہ داں کو کہ دل اُن کا جواهر خانہ عرش کا گنجینہ دار اور سینہ اُن کا آئینہ خانہ معنی کا تجلی زار هی معلوم هوئی کہ آدمی چشم عالم کا انسان اور سخن اس جان جہاں کا جاناں هی بعضی مناقب و مراتب اُس کی دیباچہ گلزار عشق میں لکھا هوں اب اس دیباچہ میں سوائے اُن کی قواعد دے کر مذکور کرتا هوں اور جیب و دامن طالبوں کو (کے ؟) نفایس فواید سے بھرتا هوں- فائدہ اول مخفی نہ رهے کہ ریختہ بجز محاورہ هندی کے سب امور میں فارسی کا تابع هے مانند قوانین عروض و قافیہ و صنایع بدیعیہ هر حال میں قدم پر اُس کی قدم دھری اور هرگز پیروی سے اُس کی عدول نہ کرے یہ صرف محض صواب و عین انصاف اور دور از شائبہ خلاف و اختلاف هے - فائدہ دوم محققان ادبای فارسی کہ فکر روشن اُن کی محاسن نظم و نثر کی آرسی هی

شعر کو کئی پر تقسیم کئے ھیں- قسم اول قصیدہ، تعریف اُس کی یوں کر کئے کہ قصیدہ کیتک ابیات ھیں کہ مطلع رکھیں اور وزن و قافیہ میں متحد ھویں اور بار ماهیت (غالباً بارہ بیت ؟) سے تجاوز کریں، اکثر کو اُس کی حد نہیں لیکن نزدیک متاخرین کی مستحسن یہ ہے کہ ابیات اُس کی ایک سو بیس سی زیادہ نہوں، وہ اغلب مدح میں ھوتا ہے اور کبھو مذمت یا فخر و نصیحت میں۔ معنی قصیدہ کے مغز غلیظ یعنی قوی ھے، جب قصائد میں معانی و مضامین جلیل و متین مندرج ھوتے اور ذایقہ طبع سلیم کو لذت دیتے ھیں اس نام سی مسمی ھو اور آخر قصیدہ مدحیہ قطعہ دعائیہ لانا لازم واولی ھی اور بوجھ تو کہ قصیدہ کبھو تشبیب سی مقرون ھوتا ھی اور کبھو بے تشبیب استعمال پاتا ھی پس اگر تشبیب ھوئی تو واجب ھے کہ آخر تشبیب میں حسن التخلص کہ اوسی فارسی میں گریز و گریز کاہ کہتے ھیں لاوے ایسی طرز لطیف سے کہ قصیدہ و تشبیب میں پیوندانقطاع نہ پاوے۔ قسم دوم تشبیب ھی، تعریف اُس کی یہ ھے کہ وہ کیتک ابیات مطلع دار ھیں، اول سے آخر تک مشتمل ھیں وہ ابیات اوپر ذکر اس چیز کی کہ شاعر کے دل کو نشاط میں لاوے خواہ وصف جمال محبوب یا صفت حال عاشق مکروب یا تعریف بہار و گلزار یا شکایت او ضاع روز گار وغیرہ۔ اس تشبیب کو نسیب بھی کہتے ھیں معنے دونوں کی واحد ھی یعنی ذکر ایام جوانی اور غزل خوانی محبوبان جانی سی کرنا اور ھر ذکر مسرت آور پر من دھرنا۔ قسم سوم مسمط ھی، تعریف اُس کی یہ کہ وہ کیتک مصاریع ھیں کہ وزن و قافیہ میں متفق ھویں سوائے مصرع آخیر کے کہ وزن میں متفق اور قافیہ میں مفترق ھے اکر احیانا ابتدا یا وسط میں متفق ھویں تو مضائقہ نہیں لیکن متاخرین فارسی اور ریختہ کی ابتدا میں مصاریع اول مسمط کو قافیہ میں متفق استعمال کرتی ھیں۔ اور بوجھ تو کہ مسمط تین مصرع سے دس مصرع تلک ھوتا ھے اول کو مثلث دوسری کو مربع تیسری کو مخمس چوتھی کو مسدس پانچویں کو مسبع چھٹی کو مثمن ساتویں کو متسع

آٹھویں کو معشر کہتے ھیں - شعرای فارسی‌ان آٹوں قسم میں اشعار کہے ھیں لیکن شعراء ریختہ کو اکثر مربع اور مخمس اور کبھو مسدس و مثمن نظم کرتے - لغت میں تسمیط موتی پرونی کو کہتے ھیں اور مسمط اسم مفعول‌ھی بعد ازاں واسطے ایسی کلام کے نقل کئی ھیں —

قسم چہارم‌ترجیع ھے‘بعض اوسے ترکیب بند بھی کہے ھیں’ تعریف‌اس‌کی یہ ھےکہ وہ نظم ایک ھے کہ حصہ کیا گیا ھے ایک بیت دو قافیہ دار سے ھر حصہ اس کا چند ابیات ھیں کہ وزن و قافیہ میں اتحاد رکھتے ھیں اور وہ بیت ذو القافیتین اکثر مکرر ھوتی ھے اور کبھو غیر مکرر آتی اس بیت کو بند ترجیع (کہتے) ھیں اور شرط ھے کہ بند ترجیع مکرر ھو یا غیر مکرر ھو بیت سابق سے مناسبت و ربط رکھے اور مستحسن یہ ھے کہ ھر حصے کی ابیات غیر حصے سے زیادہ نہ ھو یں - ترجیع لغت میں پھر آنا آواز کا ھے اس معنی لغوی کو واسطے اس قسم کلام کے نقل کئے ھیں مناسب (مناسبت) دونو میں ظاھر ھے—

قسم پنجم ‘ مثنوی ’ تعریف اس کی یہ کہ وہ ایسی ابیات ھیں کہ وزن میں موافق اور قوافی میں مختلف ھویں یعنے ھر بیت اونسی دو قافیہ رکھتی ھوی - مثنوی منسوب بہ مثنا ھی یعنی دو‘ جب ھر بیت اس کی دو قافیہ رکھتی‌ھی اوسے مثنوی ھے - اغلب اوزان مثنوی کے خفیف یعنی سبک ھوتے ھیں ‘ شعراء عجم اس کو سات وزن میں کہے ھیں’ تفصیل ان اوزان کی بقاعدہ عروض تطویل چہتی ھی اگر کسی کو شوق ھے تو کتب‌عروض دیکھے- مثنویات نامداران ساتوں وزن میں بے شمار ھیں مثل ھفتو رنگ حضرت مولانا جامی قدس سرہ السامی اور سبعہ سیارہ ملا زلالی وغیر ھما - جان ای بھائی جان کہ ایک وزن خوش اسلوب کہ مثنوی اوس میں نہایت مرغوب واقع ھوتی ھی شیخ بہاوالدین عالمی استخراج کیا ھے اور اس میں یک منظوم شیر و شکر موسوم بنا یا یہ ھے وزن عرب میں‌مطبوع و مانوس

اور نام اس کا رکض الخیل وصوت الناقوس ہے قصائد عربی اس میں بہت منظوم ہیں کئی بیتیں مثنوی شیر و شکر سے یہ ہیں :—

اے ساقی بادۂ روحانی زارم زعلایق جسمانی
یک لمعہ زعالم نورم بخش یک جرعہ ز جام طہورم بخش
عشاق جمالک اخرقوا فی بحر صفاتک قد غرقوا

اور شعراء دکن بھی اس وزن میں شعر کہے اور نام اس کا برہنی یا درسنی رکھے پانچ مصرع اس کے اوپر یک قافیہ کے بنے اور دو مصرع اوپر قافیہ دیگر کے بنتے ہیں اور اغلب یہ دونو مصرع مکرر ہوتے ہیں مثال اس کا اس نظم سے شاہ اعظم قدس سرہ کی معلوم ہوگا —

رنگ رانی جگ گلفام ہوئی مدماتی سی آشام ہوئی
گُل نرگس رنگین جام ہوئی من جیون کو آرام ہوئی
یک درسن میں کئی کام ہوئی
اس مورت کی بلہارے ہوں جس دیکھت بہ بل ہاری ہوں

یہ درسنی عجب لطافت و رنگینیے اور معرفت اور محبت کی چاشنی رکھتی ہے - حضرت مرشد اس حقیر کے جناب سید ابوالحسن قادری قربی قدس سرہ الوہبی اس کی جواب میں یک برہنی اور ایک درسنی کہیے' بایں اکثر فرماتے تھے کہ جواب اس کا زاید تھا اور اغلب اوقات میں ابیات اس کی خصوصاً مقطع اس کا پڑتے تھے اور گریان ہوتے' یک بیت مکرر حضرت قربی کی درسنے کی یہ ہے:—

میں پیوں میں اپس کو فنا کری میں سرنی کے اکیج سری

راقم حروف اسی وزن اور ساتوں وزن مشہور میں آٹ مثنوی سیر شریف پر نور میں نظم کر کر ہشت بہشت معنوی سے موسم کیا ہے اب اصل مطلب کی طرف رجوع کرنا اولی ہے۔ قسم ششم غزل ہے۔ تعریف اس کی یہ کہ وہ ابیات با مطلع ہیں اور وزن و قافیہ میں متحد ہویں اور بارہا بیت سے تجاوز نکریں۔

فایدہ اس قید کا یہ ہے کہ جو بارہا بیت سے گذر جاوے تو غزل سے مسمی نہ ہوے
بلکہ قصیدہ کہلاوے بیشتر غزلیں متقدمیں کی اور متاخرین کی میں صایب حد
قصاید کو پہنچے ھیں- اکثر غزل وصف معشوق پر مشتمل اور کبھو حال عاشق بیدل
پر شامل ھوتی ھے اور کبھو نصایح و معارت و اسرار و دیگر امور بسیار سے خبر
دیتی - مخفی نہ رھے کہ توصیف معشوق سراپا ناز سے ذکر سوز و گذار عاشق بانیاز
بہتر ھے کیا واسطے کہ تعریف محبوب فقط دعوی سے ھمراہ ھے اور ذکر سوز و
گداز عاشق کا ادعاء با گواہ - طریق مستحسن نزدیک ماھران فن کے یہ ھے کہ سات
بیت سے زیادہ اور پانچ بیت سے کم نہ ھو مگر و قتیکہ فکررسا بر سراعانت آوی
و مضمون دل کش و دلکشا بطریق آمد ھات اجاوے نو یا گیارھا بیت کہنا مضا یقہ
نہیں رکھتا - وجہ تسمیہ کہ لغت میں غزل زنان کی سات سخن کہنا ھی جب
اس نوع کے کلام میں اوصات محبوبان مذکور ھوتے ھیں نام اس کا غزل رکھے و
فی الحقیقت جب فارسیان نظم و نثر فارسی میں خوشہ چین عرب کے ھیں اور
تغزل ان کا غزل و تشبیب میں عورات کی سات تھا انھو نے بھی اس نظم کو غزل سے
مسمی کر دئے - گو تغزل امردوں کی سات کئے نفس الامر میں کئی وجہ سے امرد
بھی تشبیہ زن ھے لہذا نظر کرنا ضرت (طرت؟) اس کی حرام ھے - قسم ھفتم
فرد ھے، تعریف اس کی یہ ھے کہ فرد یک بیت ھے خواہ صاحب یک قافیہ ھو
یا دو مانند مطلع، وجہ تسمیہ ظاھر ھے —

قسم ھشتم رباعی ھے تعر یف اس کی یہ کہ رباعی دو بیت ھیں کہ وزن قافیہ
میں متحد رھتی ھیں اور بیت اول ذو قافیتیں ھو تی ھے اور بوزن خاص مخصوص
ھو گئی اگر کسی کو عروض میں راہ نہیں تو اس وزن کو یاد رکھے لاحول ولاقوت
الا با للہ - اور کبھو ھر چار مصرع قافیہ میں متفق ھوتے وجہ تسمیہ یہ کہ اس
شعرمیں چار مصراع ھیں اس واسطے اوسے رباعی کہے اور عجب تمام یہ کہ فارسی میں اس نظم کا
رباعی نام ھے اور عربی میں دوبیت کہتے ھیں -قسم نہم قطعہ ھے تعریف اس کی یہ ھے کہ قطعہ کیتک

ابیات هیں کہ وزن و قافیہ میں متحد هوتے هیں اور مطلع نہیں رکھتی اگر مطلع رکھہ کر بارہا بیت سے زیادہ هوں تو قصیدہ هے و اگر کم هیں تو خلاف قیاس هے اولی یہ هے کہ ابیات قطعہ کی ابیات قصیدہ سے کم هو ویں۔ قطعہ قَطَعَ یَقطع قطعاً و قطعہ کا مصدر هی اور قطعہ لغت میں اُسے کہتے هیں کہ یک شی سے پارہ یک هو اس معنے سے واسطے اس نوع کلام کی نقل کئے ' مناسبت درمیانی دو معنے کی یہ هے کہ اس قسم کا کلام گویا پارہ ایک قصیدہ سے هے - بعض اهل فن مستزاد معمہ و نغز کو بھی اقسام اولیہ نظم میں داخل کئے هیں لیکن ارباب تحقیق کہ کہے کہ یہ تینوں اقسام اولیہ سے شعر کی نہیں هیں کیا واسطے کہ اگر اقسام مستقل هوتے تو اقسام دیگر میں داخل نہیں هوتے , حال آنکہ یہ تینوں قصیدہ و غزل و رباعی وغیرہ میں منظوم هوتے هیں - بہر حال تعریف ان تینو کی بھی کرنا مناسب هے - مستزاد وہ کلام هی کہ بعد مصرع یا بیت اُس کی فقرہ مختصر ایک نثر سے لاویں- بعضے شعراء تحقیق اثر کہ متاخر تر هیں یہاں قیل و قال رکھتے هیں کہ جمع هونا نظم و نثر کا از قبیل اجتماع دو ضد هی پس صحیح یہ هی کہ وہ ایک دو لفظ زاید هے نظم سے هیں اور قواعد عروضی سے اُسے وزن و تقطیع بھی بہم پہنچا یں هیں تفصیل اس بحث دقیق کے اس محل میں زاید هے اور تعریف معمی کے یہ هے کہ معمی ایسا کلام منظوم هے کہ بطریق رمز و ایما کوئی نام پر ناموفسی دلالت کرتا هے اور نغز کلام موزوں هے کہ دلالت کرتا هے اوپر یک چیز کے چیز ها سے اس طور سے کہ اُس چیز کو غیر سے اُس کی علحدہ کردیتا هے یعنی بذکر صفات و علامات کہ اهل فن اوفسی طرف اُس چیز کی پی بر هوتے هیں - یہ نغز دو قسم پر هے قسم اول یہ کہ اغلب ابتدا میں اُس کی لفظ چست و شبیہ اُس کی لاتے هیں اسواسطے اسے فارسی میں چیستان سے بھی موسوم کئے اور قسم ثانی یہ هے کہ لفظ چیست وغیرہ نہیں لاتی ریختہ گویونسی ان دونوں قسم میں اشعار کم هیں بلکہ نہیں مگر اشعار هندی میں کہ اشلوک و کبت دوهرہ وغیرہ هیں بہت دیکھنے میں آئے

زبان هندی میں اُسے پہیلی کہتے ہیں - بحثیں اور تمثیلیں ان سب کی طویل الذیل
ہیں اس مختصر میں ذکر اُس کا کیونکر سماوے - فائدہ سیوم ادبا عرب و عجم
کے متفق ہو کر کہے ہیں کہ شاعر قصیدہ میں چار جگی اہتمام زیادہ صرف کری -
اول مطلع میں کیا واسطے کہ جو پہلے مستمعان کی سمع میں پہنچتا ہو مطلع
ہے اگر وہ جودت و خوبی میں طاق ہو سامع دوسرے ابیات کی سننے کا مشتاق ہو -
دوسرا گریز میں جوں چاہے بذل مجہود کری کیا واسطے کہ اول تشبیب ہے آخر
تک کلام یک اسلوب پر تھا اب وضع دیگر کو پہنچا پس اگر گریز بطرز دلاویز کرے
سامع کا طرب انگیز ہوے - تیسرا اگر شاعر قصیدہ میں تعرض بذکر مدعا یا عرض
دعا کرے بآئیں دلپذیر و اندازبی نظیر - ان کی ادبا اسے حسن الطلب و براعۃ المطلب
کہتے ہیں - چوتھا درستی خاتمہ میں سعی بلیغ کرے کیا واسطے کہ مقطع جید
دلنشیں قصورو فتور ابیات پیشیں کا ساتر ہوتا اور پے سخن اُن سب خللوں کو
کہوتا ہے شعراء اسے براعۃ الختام و حسن المقطع کہتی ہیں - اور غزل کے اندر فقط
مطلع و مقطع میں جدو کد عمل میں لاوے اور بیت ثانی میں کہ بعضے اوسے حسن
مطلع بولتے ہیں کوشش واقعی کرے - فایدہ چہارم ریختہ کہنے والے پر واجب ہے کہ
قصیدہ و غزل و مثنوی میں الفاظ عرب و لغات غیر مشہور عربی و فارسی کہ ہندیاں
اس سے چنداں مانوس نہیں ہیں نہ لاوے اور ترکیب میں وضع ہندی کو ترتیب
نہج فارسی پر غالب کر دیوے اور تا مقدور ترکیب شوخ و چست باندازِ درست
اختیار کرے اہل صنایع بدیعہ اسی انسجام کہتے ہیں معنی انسجام کے لغت میں
برسنا مینہ کا ہے اس طورسے کہ ہر قطرۂ کلاں اُس کا علحدہ پڑے اور قطرۂ دیگر
سے اختلاط نہ کرے اور اصطلاح میں اُن کی ہونا کلام کا اس بندوبست سے کہ ہر
کلمہ با وجود فصاحت کے برمحل واقع ہوئے اور اصلا اُس میں تکلف نہ پایا جاوے -
اور ناظم ریختہ پر لازم ہی کہ واو عطف کو درمیان دو حرف صحیح کے ایسی نہج
سے لاوے کہ حرکت کو اُس کی ظاہر کرنا نہ پڑے اور دو حرف صحیح میں

پیوند اس طرح ندیوے کہ اظہار حرکت سے ان کی وزن الوداع بولے اگر دو حرف علت ہوں تو مضائقہ نہیں اور لفظ فارسی یا ہندی کو طرف دوسري کلمۂ ہندی کی مانند فارسی مضاف نہ کری کہ بہتر ہے مگر در صورت شدت ضرورت، وہ بھی بطریق ندرت ، یہ امر شاید اشعار پیشیں میں کہیں واقع ہو گا نہ اشعار حال میں۔ اور لفظ ہر ایک کا ایسی طور سے نہ لاوے کہ حرف یا تقطیع میں ساقط ہوئے۔ ہر ایک لاٹا مضائقہ نہیں کیا واسطی کہ اجتماع دو ساکن کاروا ہے اور الف وصل کا ساقط ہوتا اور واجب ہی کہ اجتماع دو ساکن کا روا ہی اور الف وصل کا ساقط ہوتا ہے - اور واجب ہی کہ شاعر خلاف شرع سے کہ بزرگان اُسی ہفوات شعراء کہتے ہیں پرہیز کرے جیسا مدح میں سلاطین کو انبیا کی برابر کرے یا ائمہ اولیا کو اُن پر ترجیح دیوي اسواسطے حضرت نظامی قدس سرہ السامی فرماتی ہیں - تا نکند شرع ترا نامدار - نامزد شعر مشوزینہار - اور تا مقدور تلاش مضامین تازہ ونکات بلند آوازہ کری کہ مضمون تازہ دل کشا جان قالب سخن رساہی- فایدہ پنجم، ای بھائی تو سابق سن چکا کہ ریختہ فارسي کا تابع ہو پس اُس کے ناظموں پر واجب ہی کہ انواع سخن میں قوانین قوافی فارسی سی عدول نہ کریں بلکہ تتبع پر اُس کي بواقعی من دھریں، عجب وسو عجب ہی کہ اکثر بلکہ سب ریختہ کہنے والے اس سرشتہ کو چھوڑے اور ایک لغت اُس سی منہ موڑے جیسا کہ کاف فارسی کو سات کاف عربی کی اور رائے ہندی کو سات راے عربے کی اور اسہی قبیل کے اور حرفوں کو سات حروف دے کر کے قافیہ کرتے ہیں تذکرہ نویسان فارسی لکھے ہیں کہ یک شخص حضرت نظامی پر قدس سرہٗ السامی اس بیت میں اعتراض کیا —

بدریا گرزدی قہرش پلارک بماہی کا ؤکفتي کیف حالک

کاف پلارک فارسی اور کاف حالک عربی ہی اور حرکت ماقبل روی کے مختلف ہے کیا واسطےکہ لام حالک مضموم اور راء پلارک مفتوح ہی حضرت نظامی دیکھے کہ دعواعتراض درست ہیں، ناچار اُس معترض کو جواب ظریفانہ دئے کہ یہ مصرع مقولہ گاؤ ہی وہ نحو وقواعد شعر نہیں

جانتا ہے - اس حکایت میں غور نظر سے تامل کر کہ حضرت نظامی یادگار و افتخار سخن و سرآمد مثنوی گویاں لو وکھن ہیں بایں اعتراض بجا ویسے جناب والا پڑھی گئے اور انھوں نے اوسی مان گئے - یہ مثل آئنیہ صاف ہی کہ انصاف علامت شرافت ہی اور یونہی تکرار قافیہ اور لانا اوس قافیہ کاکہ اوسے ایطاء جلی اور قافیہ شائیگان کہتے ہیں جائز نہیں ہی - اس قافیہ کو بھی ریختہ گویاں بہت لاتے ہیں وہ قافیہ یہ ہے کہ قصیدہ الفیہ یا نونیہ میں الفاظ جمع فارسی پے در پے یا فاصلہ یک بیت سے لاویں - اولا یہ ہی کہ قصیدہ مذکور میں ایسے الفاظ کو قافیہ نہ کریں اور اگر بہ ضرورت لاویں تو تکرار اس کا بعد پانچھ چھی بیت کے کریں اور الفاظ ہندی میں جیسا ادھر اور اودھر اور جدھر اور یہاں وہاں جہاں و مانند اس کے ایسے دو لفظ کو قافیہ کرنا ہرگز جایز نہیں - فایدہ ششم ' اکثر ریختہ گویاں الفاظ مشہورعربی و فارسی کو زیر وزبر کرتے ہیں اصلاانضباط و احتیاط پر خیال نہیں دھرتے فنظائر اس کے لانا دور و دراز ہی تو آپ انصاف و تامل سے مطالعہ دواویں کرنا یہ بات تجھے معلوم ہوے اگر شعراء دکھن الفاظ مذکور کو زیر زبر کریں تو چنداں مضایقہ نہیں رکھتا ہی کیا واسطی کہ انھو تصفیہ محاورہ میں اس قدر جد و کد نہیں کئے بخلاف صاحبان محاورہ اردو کہ اس باب میں سعی بلیغ کر کر اس روز مرہ کو محاورہ فارسی کا ہم پہلو کردے - پس یہ افراط و تفریط ان سے نہایت نازیبا بلکہ ناروا ہے' خصوصاً الفاظ مشہور تر کو زیر و زبر کرنا پر دشوارہی جیسا لفظ نشاہ کو کہ سکون شین و ہمزہ وہاے خفی سی ہے بفتح شین پڑ نا اور ہمزہ وہاکو دور کر نا اور لفظ منہیات کو کہ سکون سے ہے بفتح نون لانا اور لفظ کنہ کو کہ بسکون نون ہے زبر دینا اور لفظ شکل کو کہ بسکون کاف ہی حرکت فتحہ دیکر اوسی قافیہ قصیدہ لامیہ کا کہ ماقبل اوس کے روی کا مفتوح ہے کر نا اور لفظ بعل کو کہ کسرہا سی ہی فتحہ دیکر الفاظ مفتوحہ کا قافیہ لانا ناروا تر ہی - اور لفظ زیادہ میں طرفہ تصرف صر فیانہ کئے کہ یا ی متحرک کو ساکن کر کر فتحہ

اس کا ماقبل کو اس کی کہ زائے مکسور ہے دئے بعد اس کے کہ کسرے کو اس کے
چہین لئے یہ تصرف نہایت ثقیل و پر تکلف ہی - مقصود اس تحریر سے ان پر
طعن نہیں ہے - بلکہ غرض اصل یہ کہ مستعدان حال کے تازہ عرصہ میں آے ہیں اور
طبع رسا کو بمضار فکر شعر جو لانی میں لائے اس امر میں ان کا اقتدا نہ کریں- " قاعدہ
ہفتم ضبط و بیان میں بعض الفاظ ضروری کے" مصاریع جمع مصراع اور اسی صراع بھی کہتے
ہیں - قوافی جمع قافیہ روی آخر حرف قافیہ کہ بناء قصیدہ یا غزل وغیرہ کا اس پر
ہے جیسا حرف راے مہملہ قصیدہ اول میں اس مجموعہ کے ' اور حرف زائے منقوطہ
قصیدہ ثانی میں اوس کی- پس جو قصیدہ کہ روئی اوسکی یک حرف حروف ہجا سے ہے
او سے - اوس صرف طرف منسوب کرتے ہیں مثل قصیدہ' رائیہ یا زائیہ یا کافیہ یا لامیہ
وغیرہ۔ادباء کو کہتی ہیں کہ بارھا (۱۲) علم میں مہارت رکھے ہیں- اول علم صرف دوم
علم اشتقاق و لغت سیوم علم نحو چہارم علم معانی پنجم علم بیان ششم علم بدیع
ہفتم علم عروض - ہشم علم قافیہ نہم علم رسم الخط دھم علم محاضرات۔فن تاریخ بھی
اسہی علم میں داخل ہے- یازدہم علم تقریض کہ اوسے علم قریض و قرض الشعر بھی بولتے
ہیں دو ازدہم علم انشاء و خطب و رسایل - اے بھائی جس توان فواید کو مجلا سنا
اب اس حرف کو بھی سن یہ حقیر نارس آ کے تیس بتیس برس کے کیا فارسی اور
کیا ہندی میں سب اقسام شعر میں نظم کیا تھا اور ان سب کر بعد انتقال حضرت
مرشد کے قدس سرہ وھو و الا مکر (کذا) عقاید مسمی ھشت بہشت کیا- پیچھے اوس کے
ریاض الجنان در مناقب اہل بیت عالیشان اور تحفۃ الاحباب در مناقب اصحاب
اور محبوب القلوب در مناقب حضرت محبوب اور فرایض در بیان فواید لکھا - بعد
اس کے گلزار عشق کا قصہ رضوانشاہ و روح افزا کا ھی بنایا - یہ مثنوی شاعرانہ اور
تلاش مضامین رنگین و معانی تازہ دلنشین میں یگانہ ہے - محاورہ اس کا بعینہ
محاورہ اُردو ہے مگر کہیں کہیں تاعلامت وطنیت دکن باقی رہی جیسا کہ یہ مضمون
شرح و بسط سی دیباچہ میں اوس کے مرقوم ہے - بعدازاں بعض دوستاں بمبالغہ

پیکران نظم و غزلیات کی خواہاں ہوے- پاس خاطر سے اون کے کیتک غزل که شورش دل اور جو شش خاطر سے نکل آئے منظوم ہوے پیچھے دس قصیدہ که وار ہی اور وارسی اُن کے لطایف کی سخن فہموں پر موقوت ہے خصوصاً قصیدہ کافیه که حضرت خیرالبریه علیه الصلواۃ و التحیه کے شمایل قدسیه یا سلوب کنایت و مجاز کہا گیا ہے اور تصور میں ناظم کی منتہائے لطافت و دقت کو پہنچا و قصیدہ لامیه هلالیه که تشبیہات تازہ سے لبریز اور مضا میں تلاشی بلند آوازہ سے شور انگیز ہے صاحبان استعدادان دونو قصیدہ کو غور سے دیکھیں اور داد دیویں - مرقوم ہوے قصیدہ اول که حمدہ سپاس حضرت قیوم اجل میں ہے عز وجل مشبب ہی اب تک عربی فارسی ہندی میں قصیدہ مشبب حمد میں اس عاصی کو نظر نہیں آ یا اور دو قصیدہ دیگر پیشتر انتظام پاے تھے اور محبوب القلوب کے خاتمه میں داخل ہوے اور مسمط و ترجیع بند پندرا برس کے آگے مرثیه جناب سید الشهدا میں علی جدہ وعلیه الصلوات و السلام شکل انسجام پاے تھے اور ایک مثنوی مختصر شرح ابیات شش گانه حضرت علویه یگانه میں کرم الله وجهه الانوار ان دونو میں بنے یا چند رباعیات مقطعات دلپسند اس مجموعه میں درج کیا تا یه مجموعه اگرچه مختصر ہے سب اقسام سخن پر مشتمل رہے اور اسے محاورہ اردو سے مخصوص کردیا - جسے تفنن سخن میں پوری رسای اور تصوت و چاشنی محبت سی جون چاہے ہے آ شنای ہی انداز اس کا بواقع جا نے گا اور رتبه اس کا کما ینبغی پہچا ئنیگا اور درصورت عدم انصاف اور بغض و حسد دل فا صاف اس حرف کو لاف گذاف پر عمل کر ینگا بلکه صاحب کمال جس مذهب سے ہوے مضطر ہو کے داد سخن دیوے - مخفی نه رہے که مدت سے مزاج اس درد مند کی اقسام اسقام سی پر گز ندر ہتی ہے عجز و ضعف سے انواع کاهش سہتی اور مطالعه دواوین ہندی کا کر کر تیس برس گذر گئے اس صورت میں احتمال ہے که شاید کسی محل مین عدول اس محاورہ سے ہوا ہوا کر

کہیں صاحبان انصاف یوں پاویں خوردہ گیری نہ گیری بلکہ ترکیب دل نشیں و مضامین رنگین پر من دھریں —

الحمدللہ اولا و آخرا و الصلوۃ
و السلام علی نبیہ و آلہ
و اصحابہ باطنا
و ظاہرا

اس دیباچے کے مطالعہ کے بعد زبان اُردو کے کئی مسائل ہمارے پیش نظر ہوجاتے ہیں جن میں سب سے اہم اور ضروری یہ کہ میر اور سودا کے زمانے تک اس زبان کو لوگ کیا سمجھتے تھے آیا وہ اس کو " بازار کی زبان " سمجھتے تھے یا " برج بھاشا کی بیٹی " —

دیباچہ اس پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے - ہندی یا ہندوی اس کا قدیم ترین نام تھا - اُردو اور دکھنی کے لئے بھی یہ لفظ بلا تکلف استعمال ہوتا تھا گویا ' اُردو، ہندی ' اور دکھنی ایک ہی زبان کے مختلف نام تھے - ہندی وہ زبان تھی جو مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے اور یہاں کی قوموں سے میل جول پیدا ہونے کے بعد لسانی اصول کے تحت اہل ہند کی بین القومی زبان کے طور پر پیدا ہوئی اور ہند و مسلمانوں کی کوششوں سے اس کا نشو و نما ہوا' اس زبان کی شاعری ریختہ کہلاتی تھی - لیکن سر زمین ہند کی وسعت ایک بر اعظم کی وسعت کے برابر ہونے کی وجہہ سے اس زبان میں مقامی خصوصیات کے اعتبار سے فروعی تبدیلیاں پیدا ہوگئیں اسی لئے جب مختلف صوبوں کی ہندی میں امتیاز مقصود ہوتا تو اس کے ساتھہ " اُردو " اور " دکھنی " کے الفاظ بھی استعمال کئے جاتے تھے - آگاہ ان میں صرف اس طرح امتیاز کرتے ہیں کہ وہی ہندی جو شمالی ہند کے مرکزوں میں چند ضروری مقامی خصوصیات کے بعد " اُردو " کہلائی ' دکن میں اسی بنا پر اس کو

یہاں کے باشندے دکھنی کہنے لگے - اس امتیاز کی ضرورت اس وجہہ سے بھی ہوئی کہ دکن میں ہندی نظم کے سوا نثر بھی اس وقت تک ارتقا کے کئی مدارج طے کرچکی تھی - اس کے بر خلاف اس کے عرصہ دراز بعد تک شمالی ہندی صرف "ریختہ" پر محدود رہی - اس طرح دکھنی ہندی سے ایک اور شاخ گجراتی کی شکل میں ٹھیک اس طرح علحدہ ہوگئی تھی جس طرح شمالی ہندی سے پنجابی ہندی —

دوسری چیز جس سے اس دیباچے کے ذریعہ ہم روشناس ہوتے ہیں ' یہ ہے کہ یہ زبان خصوصاً نظم میں غیر شعوری طور پر انہیں اصول اور قوانین کی پابندہوگئی تھی جو فارسی شاعری سے مخصوص ہیں - چنانچہ بحور ' ردیف و قافیہ اور دیگر عروضی قوانین سے اس کا پتہ چلتا ہے - لیکن اس خیال میں جامعیت ہے مانعیت نہیں - کیونکہ یہ کہنا کہ یہ نو مولود زبان فارسی کی تقلید پر منحصر تھی ' اس کو خلاف واقعہ محدود کردینا ہے - اس نے خاص ہندی کے اصناف کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی چنانچہ غزل ' قصیدہ ' مثنوی اور رباعی اور دیگر فارسی اصناف نظم کے ساتھہ ساتھہ دوہا ' درسنی ' کبت بھی اس وقت ایسے ہی عام تھے —

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اردو کو فارسی عربی اور سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ سے بچانے کا موجودہ رجحان بھی انہیں قدمائے زبان کا مدونہ اصول ہے - اسی طرح ان کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ سوائے شدید ضرورت کے فارسی یا ہندی کلمے کو ہندی یا فارسی کلمے کی طرف مضاف نہ کرنا مناسب ہے —

یہی وہ امور ہیں جن کی وجہہ سے آگاہ کے دیوان کا دیباچہ نہایت وقعت کی نظروں سے دیکھا جانے کا مستحق ہے - دیباچے کے ان چند ضروری امور کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ہم اصل دیوان کی طرف رجوع ہوتے ہیں —

دیوان کی ابتدا قصائد سے ہوتی ہے - سب سے پہلا قصیدہ حمد میں ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے —

رات کو جو خواب غفلت سے ہوا میں ہوشیار   صفحہ آفاق میں عبرت سے دیکھا بار بار

جملہ قصیدوں کی تعداد دس ہے جن کی تفصیل یہ ہے - حمد (۱) نعت (۵) منقبت حضرت فاطمہ زہرا (۱) منقبت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ (۲)

اردو شاعری کی رسمی حالت پر نظر کرتے شاید یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ حالی سے پہلے تک مختلف شعرا کے دیوانوں اور کلیات میں بہت کم اصولی اور مابہ الامتیاز خصوصیات پائی جاتی ہیں - اس لئے آگاہ کی شاعری کو بھی مضامین اور خیالات کی ممتاز خصوصیات کے لحاظ سے جانچنا یا ان کے خاص نقطہ نظر اور پیغام کا پتہ چلانے کی کوشش ' اُردو زبان کے ذخیرہ میں کچھ اضافہ نہیں کرسکتی تا ہم چند خصوصیات کا ذکر آگاہ کی انفرادیت کو قایم رکھنے اور طرز شاعری پر روشنی ڈالنے کے لئے ضروری ہے —

قصیدوں میں آگاہ فارسی قصیدوں کے متبع ہیں اور اس خصوص میں سودا کا رنگ ان سے کچھ زیادہ جدا نہیں ہے - لیکن ایک خاص چیز یہ ہے کہ سودا کی طرح آگاہ نے قصائد کو کسی مقصد کا ذریعہ نہیں بنایا - بلکہ وہ صرف اسی کو مقصد سمجھتے تھے - یہی وجہ ہے کہ باوجود نواب محمد علی والاجاہ کی عنایتوں کے ایک قصیدہ بھی ان کی مدح میں نہیں لکھا - یہ یقیناً آگاہ کی عالی حوصلگی کی دلیل ہے - مثال کے لئے ذیل کے نمونے ملاحظ ہوں —

اے ترے قامت دلکش پہ قیامت انداز　　بادہ مستانہ خرامی کا تری پاانداز

ہے عیاں عارض تاباں سے ترے جاوہ طور　　کیوں نہوسرمد ساہستی میری سوز اور گداز

دیدہ دل کو لگا فکر و نظر کی عینک　　دیکھتا تھا میں یہ شب غور سے در ملک وملک

اس کے رہوار سبک رو کی لکھوں جب توصیف

تیز ہو نال قلم جوں شرہ جاوے ہے اچھل

سودا اور آگاہ کے کلام کی یکرنگی کے ذکر کے ضمن میں اس امر کا جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس وقت بھی شمالی ہند اور دکن ایک دوسرے سے بہت بعید اور بے تعلق نہیں تھے - چنانچہ آگاہ اور سودا ایک دوسرے سے واقف تھے - آگاہ کے کلام میں جا بجا سودا سے معاصرانہ چشمک کا پتہ چلتا ہے - لیکن عجیب بات ہے کہ اسی دور کے ایک اہم شاعر میر تقی 'میر' کے متعلق آگاہ کا دیوان بالکل ساکت ہے - حالانکہ یہ نا ممکن ہے کہ میر کی شاعری سے دکن نا واقف ہو - خود میر نے اپنی غزلوں میں اس طرف اشارہ کیا ہے - چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں

کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک

ہے میرے ریختوں کا دیوانہ دکن تمام

اس کا سبب شاید سودا کی شاعری کی اُن خصوصیات میں ملتا ہے جن کی وجہ سے میر سے زیادہ سودا کا کلام ہر دلعزیز ہو رہا تھا —

آگاہ اپنی علمیت کے سامنے سودا کو خاطر میں نہیں لاتے اور ان کی غلطیاں نکال کر دکھاتے ہیں - قصائد ہی کے ضمن میں ایک منقبت میں فرماتے ہیں :—

اس ہند میں سودا کی ظاہر ہے پریشانی اپنے کو یزیدی کہ بیٹھا ہے بہ نادانی
اور لے چکا اپنے پر الزام یہ نصرانی کہتا ہے غرض یارو' اس طرح بہ نادانی
میں ایک نصاری سے یوں از رہ نادانی پوچھا کہ مسلماں ہو' بولا وہ ہے نصرانی

(مخطوطۂ دیوان ورق ۵۵ و)

اس طرح غزلیات میں بھی بعض جگہ اس معاصرانہ چشمک کا ثبوت ملتا ہے -

سر سودا پہ ترے شعر رسا سے آگاہ سلسلہ حشر کا بر پا نہ ہوا تھا سو ہوا

(ورق ۹۴ الف)

آگاہ گر سنے نمکین نظم یہ تری سودا کہے کہ شعر سے میرے نمک گیا

(ورق ۷۰ ب) وغیرہ

قطعات میں بھی ایک قطعہ سودا سے متعلق ہے - جس کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے -

هیں ایک قطعہ میں سودا کے یہ دو بیت غریب
کہ معنی ان کے ز انصاف رو براہ نہیں
دیار ہند میں دو چار ایسے ہو گذرے
جنھوں نے باز رکھا مضحکہ سے اپنے تئیں
چنانچہ خسرو و فیضی و آرزو و فقیر
سخن انھوں کا مغل کے ہے قابل تحسین
کہا میں سن کے عجیب ہیگا یہ دو چار کا قید
کوئی ایسا حرف تعجب فزا سنا ہی نہیں
بہت سے گل کہ ہے ایران جن سے داغستاں
یہ گلز میں ہیں گلچوش خندہ شیریں
یہ سر خوشان معانی کا اوج موج خیال
سنئے اگر مٹی شیراز ہوئے سر کہ جبیں
چنانچہ طوطی شکر شکن امیر حسن
جو ہم صفیر ہے خسرو کا اور قرب آئیں

اس کے بعد مسعود، شہر یار علی، قدیم بیجا پور، مرزا بیدل، شیدا، غنی، وغیرہ کے نام ان کی شاعری کی خوبیوں کے ساتھ گنوا کر، اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں - ورق ۵۶ ب سے غزلیں شروع ہوتی ہیں - غزلوں میں بھی آگاہ کا رنگ سودا سے ملتا جلتا ہے - فرق صرف اس قدر ہے کہ سودا کا سا بلند تخیل آگاہ کے پاس نہیں —

پہلی غزل کا مطلع یہ ہے :—

اے حسن و عشق کو ترے جلوے سے ابتدا
ہر عین کو ہے تیری تجلی سے ابتدا

غزلیں ردیف وار ترتیب دی گئی ہیں - بعض غزلیں مسلسل بھی ہیں -

غزلوں سے بھی چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ھیں —

هر اشک مرا تھا رشک یاقوت — ایسے کو تو خاک میں ملایا

کیاھاتھ میں آیا ترے اے عشق ستمگر — جو ایسے جلے دلکو تو اس طرح جلایا

ناکارہ و بیچارہ و آوارہ دل آگاہ — المنۃللہ میرے دلدار کو بھایا

نادر ھے ترا تماشہ اے دل — اپنے کو تو کیا ترا شا اے دل

خبر ھے کس کے آنے کی یہ گلشن — بڑی ھے چو طرف غل خیر مقدم

تکلیف سیر مجھکو ندے ھرگز اے صبا — مانندبو مجھے ھے سفر نت وطن کے بیچ

نشہ میں تیرے جو سو گئے هم — بے ھوش دو جگ سے ھو گئے هم

میں ایک جینے سے اپنے بہ تنگ ھوں 'آگاہ' — جہاں میں دیکھئے جس کو تو ھے حیات لذیذ

میں تیری زلف کی پیچوں میں دل کا جویا ھوں
کہ اس اندھیرے میں وہ شب چراغ کھویا ھوں

خواب شیریں سے نہ شیریں کو جگا یا افسوس
هر ذرہ جولاں ھے عبث نالۂ فرھاد ھنوز

ھے اندنوں لب جاں بخش یار بر سر لطف
بشارت اے دل بیمار اب جیا تو نے

قیامت نے خرام ناز تیرا دیکھ کر پیارے
کھڑی قد کی بلا لیتی ھے تیرے بار بار آرے

بھری میں کٹ گئی سب افسوس زندگانی
دیکھی کبھی نہ هم نے ھوتی ھے کیا جوانی

طوالت کے خوف سے انھیں اشعار پر اکتفا کیا جاتا ھے۔ جیسے هم اوپر بیان کر چکے ھیں ھماری شاعری میں کسی خاص شاعر کے کلام سے اس کی زندگی اور خیالات کے متعلق' بہت کم مواد دستیاب ھوتا ھے۔ کیونکہ یہ شاعری رسمی اور تقلیدی

ہے ۔ اور اس منزل سے عموماً ہر زبان کی شاعری کو گذرنا پڑتا ہے —

ہم کو معلوم ہے کہ آگاہ بڑے جید عالم اور ارشاد و ہدایت کے بھی مرکز تھے ان خصوصیات کی جھلک ان کے کلام میں کہیں کہیں نظر آ جاتی ہے چنانچہ دیوان میں ہم کو بہت سے اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں آگاہ نے معرفت اور تصوف کا اظہار کیا ہے ۔ ذیل کی چند مثالیں خاص نقطہ نظر سے ملاحظے کے قابل ہیں :—

ہرگز وجود میں تو شریک آپ کو نجان
تقصیر یہ تری نہ کبھی ہوے گی معاف
دنیا ہے گندہ پیر کہ صحبت ہی اس کی زہر
نا بالغوں کے تئیں نظر آتی ہے نو عروس
ہے یار کا میرے سینہ میں بود و باش ہنوز
عجب ہے پھر مجھے اس کی ہے کیوں تلاش ہنوز
جلوہ اس کا نہ رکھا کوئی تعین باقی
وہم باطل کا عبث ہم کو ہے پندار ہنوز

غزلوں میں ارشاد و ہدایات کا فطری رنگ بھی کہیں کہیں نمایاں ہو گیا ہے ۔ کہیں کہیں اپنی قوت شاعری سے متاثر ہو کر شعرائے پیشین سے بھی اپنا مقابلہ کیا ہے —

اگرچہ یہ سخن ہندی ہے آگاہ
نہ کر سکتا ہے ہر فہم اس کو ادراک
ہر مصرعہ رسا میرا طوبی سے ہے قریں
کا ندھے پہ ہی دبیر فلک کے علم مرا

قطعات کے بعد اصناف سخن سے دیوان کو مکمل کرنے کے لئے مختلف

صنایع و بدائع کے نمونے پیش کئے گئے ہیں - پہلی نظم کا عنوان یہ ہے - "دوارتھی برطریق صنعت ابو قلموں دور عربی آنرا استخدام مظہر گویند" اس کا نمونہ یہ ہے: —

تن سر د ی سے کیوں معتدل ہے یعنے ہمارا

من وحشت سے کیوں بیکل ہے جواب - نار نہیں

دوارتھیوں کے ختم پر میر شمش الدین ' فقیر کے تتبع میں فارسی کبت ' بحر سویہ میں لکھے ہیں ' ریختے میں بھی کئی کبت لکھے ہیں - نمونۃ یہاں ایک درج کیا جاتا ہے :—

کیوں دیکھ سکے کوئی اس کو جو شوم کرے پیرا ھن سے

کب بر میں اُسے لا سکتا ہو جو تک نہ ملے مرے تن سے

نامہ کو خبر اس کے منہ سے نہ گل کو اس کے تن سے

کچھ بھی تو نہیں آگہ اوس سے جو کہا ہوں میں ہے سب ظن سے

کبت بھی کئی طرح کے ہیں ' جن میں سے قابل ذکر یہ ہیں —

(۱) " کبت در زبان ریختہ بر چھاپہ کبت ریسی کبیر کہ در صنعت طاق و حسن بقجیہ گفتہ واین صنعت در عربی و ھندی مشترک است" —

(۲) " کبت در تعریف سکیا نائکہ کہ ترجمہ اس چنانچہ شرمگیں باشد"—

(۳) "کبت از زبان با سکھیا نا ئکہ یعنی قدوم محبوب"—

(۴) کبت از زبان دھیرا نا ئکہ —

حسب ذیل سر خیاں بھی قابل توجہ ہیں

(۱) ست آبسار کانایکہ یعنے کسیکہ درشب ماہ سوے محبوب رود

(۲) سیام آبسار کانایکہ یعنے کسیکہ در شب تار سوے محبوب رود

فردو سی ہو گیا ہے دم دل کشا ترا

آ گاہ تری طبع کو ہے فیض روض طوس

شعر کی گر چہ قلمرو کو میں چھوڑا آگاہ
عرب و ہند و عجم میں ہے مرا داب ہنوز*

گر چہ نہیں کچھہ سخن ہمارا
کیا تجھہ سے بوی اے ولی گئے ہم

لام کی ردیف میں ایک شعر حیدرآباد دکن کے متعلق بھی موجود ہے - یہ عجیب با معنی شعر ہے ' ہمارے لئے اس کی حیثیت ایک تاریخی ہے —

الفت اہل بہت سے آگاہ حیدرآباد ہو گیا ہے دل

غزلیں ورق ۱۴۷ ب پر ختم ہو تی ہیں - آخری غزل کا مطلع اور مقطع یہ ہے —

زلف سیاہ کی ترے ہے کیا بکٹ کہانی
دشوار جس سے ہوئی ہے دن رات نیند آنی

جب قدر داں سخن کا تیرے ہے عشق آگاہ
کیا غم ہے گر نہیں ہے کوئی اس کی قدر دانی

غزلوں کے بعد " افراد '' شروع ہوتے ہیں - پہلا فرد یہ ہے —

دل اپنا ہو گیا پرایا شکوہ کروں کس کا اب خدایا

آخری فرد کے ختم ہو نے پر رباعیاں شروع ہو تی ہیں رباعیوں کی تعداد (۱۵۴) ہے جن میں متفرق (۲۴) نعت میں (۲۱) اور منقبت میں (۱۰۹) ہیں . رباعیات ہی میں ایک دوسري قسم رباعیات مستزاد کی ہے ' جس کا نمونہ یہ ہے —

کس مہر کے جلوے سے مری چشم اوپر حیرت کی ہے دھوم
آنسو کے عوض آنکھہ سے تاصد نظر جھڑتی ہے نجوم

---

* غالباً یہ اس زمانے کا شعر ہے جبکہ آگاہ نے اپنے استاد ابوالحسن قربی کے انتقال سے بددل ہو کر شاعری ترک کر کے اپنے کلام کو سپرد آب کردیا تھا —

دل آتشی شیشہ ہوا کس رخ سے کہ یوں جلتا ہے سدا

انداز سے اس قد کے میری پر محشر کرتی ہے ہجوم

ایسی کل رباعیات صرف پانچ ہیں جن میں سے ایک " طرز بیدل " میں لکھی گئی ہے - رباعیات کے اختتام پر قطعات شروع ہوتے ہیں ' ان کی مجموعی تعداد گیارہ ہے' پہلے قطعے کا پہلا اور آخری قطعے کا آخری شعر یہ ہے —

کہی میں چاند سے یک رات یہ بات　　　کہ اے مرات شب تجھسے مصقل

(۳) دو ابسار کا نا یکہ یعنے کسیکہ بروز جانب محبوب " —

کبت ہی میں ایک ایسی رباعی ہے جو تلنگی زبان میں لکھی گئی ہے اور شاید یہ چیزیں آگاہ ہی کی جدت طبع کے نتائج ہیں - اس سے پہلے اس قسم کی نظموں کا حال نہیں سنا - یہ رباعی بذات خود دلچسپ ہے اس لئے یہاں نقل کی جاتی ہے —

یاداو سوتا نیلتکو پویلدي　　　نادھیا تم نا پرانم اکڑا اوندی

ی واکتہ کہنتہ پوي کوسی کوسی　　　میرارک اروایم پور کوسندی

ایک فرد بھی نئی طرح کا ہے جو زبان اروی میں لکھا گیا ہے —

رن آشی پدوپولی ملی ارکد واپڑی　　　نیاتکو و چان تم میلی ردویارم

دیوان دھروں پرختم ہوتا ہے جو کئی مضامین پر مشتمل ہے - آخری دھرہ یہ ہے -

چشم لال کی جگنے سے نہیں ہوتے ہیں لال　　　عکس آنسو کا میرے وہاں کی ہے اپنی چال

معصومیت

از

(جناب اختر شیرانی صاحب اڈیٹر " بہارستان " لاہور)

لیلی شب کے پریشان ہیں گیسوے سیاہ

شورش آباد جہاں ' تیرہ و تار

نشہ برساتی ہے مدھوش ستاروں کی نگاہ

نیند میں غرق ہے سارا سنسار

چارسو ' چھاگئی خاموشی و ظلمت کی سپاہ

نور و آھنگ نے لی راہ فرار

نیند کی سیج سے جاگ اٹھا ہے خوابیدہ گناہ

شیر خونخوار ہو جیسے بیدار

رات کے پردوں میں آباد ' سیہ خانے ہیں

تیرہ و تار ' مہیب اور خونریز

ذوق عصیاں کے بھبھکتے ہوے میخانے ہیں

تہ ظلمات میں شورش انگیز

معصیت کاری کے بھپرے ہوے مستانے ہیں

روح دوشیزگی سے گرم ستیز

ان کے فولاد گوں پنجوں میں جو پیمانے ہیں
خون عصمت سے ہیں یکسر لبریز

چار سو موجزن، اک حشر سیہ کاری ہے
تند و ہنگامہ فگن، طوفانی
بزم انسانی پہ اک ابر گنہ طاری ہے
قیر گوں، شعلہ فشاں، ہیجانی
ہر طرف فسق کا اک سیل بلا جاری ہے
شورش انگیز و پر از طغیانی
محشرستان سیہ مستی و سر شاری ہے
مست ہے جلوہ گہ انسانی

یہ سماں دیکھ کے اک حور وہاں آتی ہے
مشکبو زلفوں کو بکھرائے ہوے
اور نظر، اس ستم آباد پہ دوڑاتی ہے
فرط تقدیس سے گھبرائے ہوے
عالم سوگ میں مبہوت سی رہ جاتی ہے
اشک غم آنکھوں میں چھلکائے ہوے
چاندنی کی کرن اک نور سا برساتی ہے
سینۂ صاف پہ لہرائے ہوے

فلک حسن کا گم گشتہ ستارہ کہیئے
جس سے روشن ہے فضائے صحرا

جنت قدس کا آوارہ نظارہ کہیئے

جس سے رنگیں ہے ہوائے صحرا

بحر رعنائی فطرت کا کنارہ کہیئے

جس سے ہے مست ادائے صحرا

جذب موسیقی کا اک نقش دلارا کہیئے

نغمۂ روح فزائے صحرا

اک فرشتوں کے سے لہجے میں وہ کرتی ہے خطاب

آہ وہ لہجہ حزیں و غمناک

کہ تم اے راہزن عفت و آوارہ شباب

سرخوش و بیخود و مست و ناپاک

تم جو عصمت کا لٹاتے ہو یہ در نایاب

کر کے دامان تقدس کو چاک

یہ وہ جوہر ہے جسے مہر و نجوم و مہتاب

رشک سے دیکھتے ہیں اور افلاک

ہاں یہ اک جاذبۂ فطرت ربانی ہے

اور دنیا کی مثالوں سے بری

عالم قدس کا اک جوہر نورانی ہے

روشن از جلوۂ نجم سحری

اس گند زار میں بہر دل انسانی ہے

بر تراز مریمئی حور و پری

روح قدرت کا یہ اک جلوۂ عرفانی ہے

یا الہیت ذوق بشری

یہ وہ نشہ ہے کہ ایسا کسی صہبا میں نہیں

روح کیفیت صہبا کی قسم

یہ وہ موتی ہے کہ ایسا کسی دریا میں نہیں

قعر تاریکیٔ دریا کی قسم

یہ وہ تابش ہے کہ جو حسن ثریا میں نہیں

نور رخسار ثریا کی قسم

یہ وہ لذت ہے کہ جو الفت سلمیٰ میں نہیں

جذبۂ الفت سلمیٰ کی قسم

ذرے ذرے میں ہے اک روح حقیقت مستور

اور ہر ذرے کی قسمت ہے وہی

سینۂ شمع میں ہے سوز محبت مستور

شمع پر سوز کی فطرت ہے وہی

غنچے کے دل میں ہے اک جذبۂ نکہت مستور

غنچے کی سرمدی صورت ہے وہی

ہے جوانی میں یونہی جلوۂ عصمت مستور

اور جوانی کی حقیقت ہے وہی

مہ تابندہ جو محروم لطافت ہو جائے

نام اس کا مہ تاباں نہ رہے

روشنی صبح درخشاں کی جو غارت ہو جائے

صبح پھر صبح درخشاں نہ رہے

شام سے دور اگر شام کی رنگت ہو جائے
شام، شام شفق افشاں نہ رہے
گر جوانی یونہی بیگانۂ عفت ہو جائے
لایق پیکر انساں نہ رہے

ساز کے پردے میں بیتاب، گر آواز نہ ہو
ساز، پھر ساز نہ کہلائے کبھی
دل نکہت میں اگر جذبۂ پرواز نہ ہو
صحن گلشن کو نہ مہکائے کبھی
گل میں گر ذوق فمو پردہ براندا‌ز نہ ہو
گل، نگاہوں کو نہ للچائے کبھی
گر جوانی میں بھی تقدیس کا انداز نہ ہو
وہ جوانی نہ نظر آئے کبھی

مئے رنگیں سے اگر نشۂ و لذت چھن جائے
سادہ پانی ہے وہ یا موج شراب؟
ماہ تاباں سے اگر نور و لطافت چھن جائے
تودۂ خاک ہے وہ یا مہتاب؟
گل رعنا سے جو رنگینی و نکہت چھن جائے
سوکھی پتی ہے وہ یا ہر برگ گلاب؟
جس جوانی سے کہ رنگینی عفت چھن جائے
اشک پیری ہے وہ یا حسن شباب

الغرض، فلسفۂ ذوقِ جوانی یہ ہے
کہ جوانی نہ لٹائی جائے
مئے پارینہ کی خوبی کی نشانی یہ ہے
مدتوں تک وہ چھپائی جائے
عصمت اور اس کے مظاہر کی کہانی یہ ہے
شاعروں کو نہ سنائی جائے
مذہب شعر کی الہام فشانی یہ ہے
معصیت خوب بڑھائی جائے

کب تک؟ اے گھر ہو! یہ عالم غفلت کب تک؟
اور یہ نفس پرستی تا چند؟
موجۂ خون میں یہ دورۂ وحشت کب تک؟
دل میں یہ جذبۂ پستی تا چند؟
روح آلودۂ تاریکئ ذات کب تک؟
اور یہ جذبات کی مستی تا چند؟
یہ شباب اور یہ بربادئ عفت کب تک؟
ہاں گناہوں کی یہ بستی تا چند؟

روح کے گُل کدے ویران ہوے جاتے ہیں!
شیطنت کاری کے سینے مسکن!
دل کے شورش کدے سنسان ہوے جاتے ہیں!
اور جذبات صفا کے مدفن!

ذوق بیگانۂ عرفان ہوے جاتے ہیں!
اور منزل گہ صد آہر یمن!
جو تھے انسان وہ حیوان ہوے جاتے ہیں!
آہ! او سفلگئی چرخ کہن!

آے گا ایک دن آے گا کہ شرماؤ گے تم
اور میں ہاتھوں سے نکل جاؤں گی
عالم پیری میں میرے لئے گھبراؤ گے تم
اور میں بھی صورت نہ دکھلاؤں گی
پچھلی بد ذوقیوں کو ذہن میں جب لاؤ گے تم
شرم بن کر تمھیں شرماؤں گی
یاد کر کے مجھے، پھر روؤ گے پچھتاؤ گے تم
میں مگر ہاتھ نہیں آؤں گی!

ترچھی نگاہیں

از

(جناب محمد یسین صاحب تسکین سورونوی)

(۱)

رگوں میں خون گردش کر رہا ہے بجلیاں بن کر
عجب اک بے خودیء شوق مجھ پر چھائی جاتی ہے
کھنچی آتی ہے گویا روح بھی اب جسم سے باہر
تری ہستی ، مری ہستی پہ غالب آئی جاتی ہے

ارے ترچھی نگاہوں سے نہ دیکھو او دیکھنے والے!

(۲)

یہ انکھیں ایسی آنکھیں اور پھر اتنی حسین آنکھیں !
کہ جن پر جلوہ ہائے صبح بھی صدقے اترتے ہیں،
زہے جذب و کشش ! ہیں کس قدر نور آفرین آنکھیں
ستارے جن کے آگے آسماں پر سجدہ کرتے ہیں !

ارے ترچھی نگاہوں سے نہ دیکھو او دیکھنے والے

(۳)

بشان کم نگاہی ، ہائے یہ طرز خلش ریزی !
نہ ہوتی ہوں تمنائیں تو اب دشوار ہو جائیں

قدر ا نداز ہو کر، یہ غلط ا ندازیاں کیسی !
یہ وہ ناوک نہیں ظالم جو دل کے پار ہو جائیں
ارے ترچھی نگاہوں سے نہ دیکھ او دیکھنے والے!

(۴)

یہ آنکھیں جس نے دیکھیں یا ان آنکھوں نے جسے دیکھا
وہ ان کو دیکھتا رہتا ہے اور دیکھا نہیں جاتا
غضب ہے او نشیلی آنکھ والے دیکھنا تیرا !
مجھے لینا، چلا میں، ہائے اب سنبھلا نہیں جاتا
ارے ترچھی نگاہوں سے نہ دیکھ او دیکھنے والے

(۵)

رگوں میں خون گردش کر رہا ہے بجلیاں بن کو
عجب اک بے خودی و شوق مجھ پر چھائی جاتی ہے
کھنچی آتی ہے گویا روح بھی اب جسم سے باہر
تری ہستی مری ہستی پہ غالب آئی جاتی ہے
ارے ترچھی نگاہوں سے نہ دیکھ او دیکھنے والے!

اساتذہ کی اصلاحیں

از

(جناب صفدر صاحب مرزا پوری)

(خواجہ غلام نظام الدین 'نظام' قادری بدایونی)

محمد غلام مصطفیٰ خاں 'مداح' پھپوندوی ضلع اٹاوہ :

کوئی خوش بھی ہوا ہوگا کبھی ان خوش جمالوں سے
یہاں تو رات دن مطلب ہے اپنا صرف نالوں سے

اصلاح : کوئی خوش بھی ہوا ہو گا کبھی ان خوش جمالوں سے
یہاں تو کام ہے فریاد سے مطلب ہے نالوں سے

اصلاح سے مطلع میں چستی و بیان میں سلاست پیدا ہوگئی -

مداح : ہمیں تو پوچھنا ہے یہ جگر کے رونے والوں سے
بتائیں تو سہی یہ کیوں ملے تھے خوش جمالوں سے

اصلاح : ہمیں یہ پوچھنا ہے دل جگر کے رونے والوں سے
یہ کیا سمجھے تھے آخر کیوں ملے تھے خوش جمالوں سے

پہلے مصرع میں 'دل' کا لفظ بڑھایا اور دوسرے مصرع میں 'یہ کیا سمجھے تھے آخر' بنایا جس سے مطلع دل آویز ہو گیا —

مدام : اُدھر وعدہ قیامت کا لبوں پر رہ گیا آ کر
اِدھر اٹھ کر قیامت رہ گئی عاشق کے نالوں سے

اصلاح : زباں تک آتے آتے رہ گیا وعدہ قیامت کا
قیامت اُٹھتے اُٹھتے رہ گئی عاشق کے نالوں سے

پہلے مصرع کی ترمیم سے 'رہ گیا' کا ثبوت قوی ہو گیا دوسرا مصرع پہلے مصرع کی مناسبت سے بنایا گیا —

مدام : تم نے نگاہ ڈالتے ہی دل اڑا لیا
اب اور ہو گا اس سے زیادہ کہاں کیا

اصلاح : تم نے نگاہ ڈالتے ہی دل اُڑا لیا
ہو گا اب اور اس سے زیادہ کہاں کیا

لفظوں کے الٹ پھیر سے شعر صاف ہو گیا اور تعقید کا عیب جاتا رہا —

مدام : اب وعدہ وصال پہ یہ قیل و قال کیا
یہ تیرے اختیار میں ہے یہ محال کیا

اصلاح : اب وعدہ وصال پہ یہ قیل و قال کیا
جو تیرے اختیار میں ہے وہ محال کیا

دونوں مصروں میں 'یہ' سہ کر رتھا۔اس لئے بجائے 'یہ' کے 'جو' اور دوسرے جگہ 'وہ' بنایا جس سے شعر خوب ہو گیا —

مدام : دیکھنے والوں کا ہنگامہ نکل کر دیکھئے
آپ نے دیکھا نہیں محشر تو محشر دیکھئے

اصلاح : دیکھنے والوں کا ہنگامہ نکل کر دیکھئے
آپ نے محشر نہ دیکھا ہو تو محشر دیکھئے

اصلاح سے تعقید کا عیب دور ہو گیا اور مطلع زبان کی حد میں آ گیا—

مدام : چھیڑ تو دیکھو اگر ہوتا ہوں میں سایل کبھی
وہ یہ کہتے ہیں کہ کوئی دوسرا گھر دیکھئے

اصلاح : چھیڑ تو دیکھو اگر ہوتا ہوں میں سایل کبھی
ہنس کے فرماتے ہیں کوئی دوسرا گھر دیکھئے

" ہنس کے فرماتے ہیں " اس ٹکڑے نے شعر میں شوخی پیدا کردی —

مدام : دل مجھے مجبور کرتا ہے کہ اس کو چھیڑئے
دیکھئے پھر اس کی چتون اسکے تیور دیکھئے

اصلاح : دل مجھے مجبور کرتا ہے کہ اس کو چھیڑئے
اس کی آنکھیں' اسکی چتون' اس کے تیور دیکھئے

استاد نے ' آنکھیں ' بڑھا کر شعر کو قابل دید کر دیا —

مدام : جو سمجھا انتہائے عشق ہی فرقت میں مرجانا
نہ اسنے عاشقی سمجھی نہ اسنے عشق کرجانا

اصلاح : کہاں عشق سمجھا جو غم فرقت میں مرجانا
نہ اسنے عاشقی سمجھی نہ اسنے عشق کرجانا

اصلاح سے مطلع میں جان آ گئی - عمدہ اصلاح ہے —

مدام : یہ دعویٰ کیوں ہے اپنی سادگی پر ماہ کامل کو
زرا اک دن گھڑی بھر کے لئے تم بھی سنور جانا

اصلاح : بڑا دعویٰ ہے اپنی سادگی پر ماہ کامل کو
زرا اک دن گھڑی بھر کے لئے تم بھی سنور جانا

پہلے مصرع میں تو اصلاح سے لطف زبان پیدا ہو گیا مگر دوسرے مصرع میں بجائے ' سنور جانا ' کے سنور لینا کا پہلو غالب ہے —

مدام : میرے گھر میں میرے گھر سے شام وعدہ شام غم
عمر بھر آئی نہیں ہے عمر بھر نکلی نہیں

اصلاح : میرے گھر میں شام وعدہ مرے گھر سے شام غم
عمر بھر آئی نہیں ہے عمر بھر نکلی نہیں

الفاظ وہی ہیں مگر لفظوں کے الٹ پھیر نے شعر میں کس قدر سادگی و صفائی پیدا کردی - عمدہ اصلاح ہے —

مولوی عبدالمقتدر ' مطلب ' پھپھوندوی :-

کچھہ زمین و آسماں کی اصل بھی بنیاد بھی
تم نے دیکھی ھی نہیں آہ دل نا شاد بھی

اصلاح : کچھہ زمیں کی اصل بھی کچھہ چرخ کی بنیاد بھی
تم نے دیکھی ھی ابھی آہ دل ناشاد بھی

اصلاح سے الجھا ہوا مطلع سلجھہ گیا - مصرعہ ثانی میں بجاے ' نہیں ' کے ' ابھی ' کا لفظ بنا دیا جس سے ردیف مستحکم ہو گئی —

مطلب : حضرت زاھد صلاح ترک میخانہ ھمیں
سب تمھیں مجنوں کہیں گے یاکہ دیوانہ ھمیں

اصلاح : حضرت زاھد صلاح ترک میخانہ ھمیں
تمکو دیوانہ کہیں گے سب کہ دیوانہ ھمیں

' دیوانوں کی ' تکرار نے لطف زبان پیدا کر دیا - بندش میں چستی آگئی استادانہ اصلاح ہے —

مطلب: جاؤ غیروں کو سناو کیوں سنانے آے ھو
داستان کوھکن مجنوں کا افسانہ ھمیں

اصلاح : جاؤ دشمن کو سناو کیوں سنانے آے ھو
کوھکن کی داستاں مجنوں کا افسانہ ھمیں

دونوں مصرعوں کی ترمیم سے شعر میں صفائی و لطف زبان پیدا ھو گیا —

مطلب: تشنہ کاموں پر بھی ہو کچھ لطف او مست شباب
اپنی آنکھوں کا تصدق ایک پیمانہ ہمیں

اصلاح: تشنہ کاموں پر نگاہ لطف او مست شباب
اپنی آنکھوں کا تصدق ایک پیمانہ ہمیں

'پیمانہ' کی مناسبت سے 'نگاہ لطف' کا ٹکڑا خوب بنایا۔ سبحان اللہ چشم بددور—

مطلب: آغاز عشق ہوتے ہی انجام ہو گیا
پڑتے ہی ان کی آنکھ میرا کام ہو گیا

اصلاح: آغاز عشق ہوتے ہی انجام ہو گیا
پہلی نظر میں ان کی میرا کام ہو گیا

سبحان اللہ 'پہلی نظر میں' اس ٹکڑے نے مطلع کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس کی ترقی کو ارباب نظر ہی سمجھ سکتے ہیں—

مولوی عبدالصمد 'صمد' بدایونی:-

آپ کیا واقف ہیں میری گردش تقدیر سے
آپ اس گردش کو پوچھیں آسمان پیر سے

اصلاح: آپ کیا واقف ہیں میری گردش تقدیر سے
آپ اس چکر کو پوچھیں آسمان پیر سے

دونوں مصرعوں میں 'گردش' کی تکرار بدنما تھی اس لئے مصرعۂ ثانی میں 'گردش' کے بجائے چکر بنا دیا —

صمد: میرے دل کی دلگی میرے جگر کی چھیڑ ہے
کچھ تمھاری تیغ سے اور کچھ تمھارے تیر سے

اصلاح: میرے دل کی دلگی میرے جگر کی چھیڑ چھاڑ
کچھ تمھاری تیغ سے ہے کچھ تمھارے تیر سے

دونوں مصروں کی ترمیم سے شعر ایک نشتر بن گیا ۔

صمد : الله الله یہ نزاکت اور پھر یہ قتل عام
پہلے تم آنکھیں ملا دیکھو زرا شمشیر سے

اصلاح : الله الله یہ نزاکت اور یہ عزم قتل عام
پہلے آنکھیں تو ملا دیکھو زرا شمشیر سے

صمد کے پہلے مصرع کا مفہوم یہ تھا کہ معشوق قتل عام کر چکا۔ ' عزم قتل عام ' سے مطلب صاف ہو گیا ۔ دوسرے مصرے میں ' تم ' کی چنداں ضرورت نہ تھی ' تو ' سے مفہوم ادا ہو گیا ۔

صمد : ترس کے رہ گئے ہم ان سے گفتگو کے لئے
نہ کوئی لفظ ملا شرح آرزو کے لئے

اصلاح : ترس کے رہ گئے ہم ان سے گفتگو کے لئے
ملا نہ لفظ کوئی شرح آرزو کے لئے

سلاست بیان کے علاوہ تعقید کا عیب بھی رفع ہو گیا ۔

صمد : غیر کا نام جب لیا ہم نے
ان کو دشمن بنا لیا ہم نے

اصلاح : غیر کا نام کیا لیا ہم نے
ان کو دشمن بنا لیا ہم نے

' جب ' سے ' کیا ' میں زیادہ لطافت و معنویت ہے ۔

صمد : سن کے روز ازل نتیجۂ عشق
دل بے مدعا لیا ہم نے

اصلاح : سن کے انجام عشق روز ازل
دل بے مدعا لیا ہم نے

اس اصلاح سے اسلوب بیان دلکش ہو گیا ۔

مولوی فخرالحسن 'فخر' دہلوی :-

مجکو نہ ملے داد وفا روز جزا بھی
کہدو کہ مکر جائیں گے ہم پیش خدا بھی

اصلاح : ہاں ہاں نہ ملے داد وفا روز جزا بھی
کہدو کہ مکر جائیں گے ہم پیش خدا بھی

'ہاں ہاں' کے ٹکڑے نے ایک خاص لطف پیدا کردیا - مطلع میں زور پیدا ہوگیا —

فخر : کیا اپنی کوئی حسرت پابوس نکالے
ملتا نہیں اس' فخر' کو نقش کف پا بھی

اصلاح : کیا اپنی کوئی حسرت پابوس نکالے
ملتا نہیں اس شوخ کا نقش کف پا بھی

'اس فخر کو' یہ ٹکڑا مہمل تھا - بجاے اس کے 'اس شوخ کا' بنا کر شعر میں فصاحت پیدا کردی • —

(مولوی سید حسین 'حیرت' بدایونی)

محمد جمیل احمد 'جمیل' بدایونی :-

کیا خوب مسیحا نفسی ہے کوئی دیکھے
کہتے ہیں وہ بیمار سے مرتا ہے تو مر بھی

اصلاح : کیا خوب مسیحا نفسی ہے دم آخر
بیمار سے کہتے ہیں کہ مرتا ہے تو مر بھی

پہلے مصرع میں 'کوئی دیکھے' یہ ٹکڑا حشو تھا - بجاے اس کے 'دم آخر'

• یہ اصلاحیں محبی محمد غلام مصطفیٰ خاں 'مداح' پھپوندوی ضلع اٹاوہ نے ذریعہ ڈاک بصیغہ رجسٹری ارسال فرمائیں - مؤلف شکر گذار ہے —

نے دوسرے مصرے کا ثبوت قوی کر دیا - مصرعہ ثانی کی ترمیم سے تعقید کا عیب رفع ہو گیا - مگر مولف کے خیال ناقص میں پہلے مصرع میں ' کیا خوب ' کے بجائے اگر ' اچھی یہ ' کا ٹکڑا بنا دیا جاتا تو لطف زبان اور بڑھ جاتا یعنی -
اچھی یہ مسیحا نفسی ہے دم آخر —

جمیل : خوف کیا ہو کثرت عصیاں سے مجکو اے 'جمیل'
ہیں مرے سرکار مرے بخشوانے کے لئے

اصلاح : خوف کیا ہو کثرت عصیاں سے مجکو اے 'جمیل'
ہیں رسول پاک مرے بخشوانے کے لئے

' میرے سرکار ' اس ٹکڑے میں بھی کوئی نقص نہ تھا مگر ' رسول پاک' سے اور واضح ہو گیا —

مولوی اختصاص حسین 'اختصاص' :-

کبھی نہ کر ستم ہو گا کبھی نہ کر جفا ہو گا
بروز حشر میرا اور تمھارا فیصلہ ہو گا

اصلاح : وہیں نہ کر ستم ہو گا وہیں نہ کر جفا ہو گا
خدا کے سامنے میرا تمھارا فیصلہ ہو گا

پہلے مصرع میں بجائے ' کبھی ' کے دونو جگہ ' وہیں ' بنایا اور دوسرے مصرع میں بجائے ' بروز حشر میرا اور ' کے ' خدا کے سامنے میرا ' بنا کر مطلع کو دل آویز کر دیا - اس اصلاح سے بندش میں چستی اور بیان میں صفائی پیدا ہو گئی —

مولوی عبدالواحد ' واحد' بدایونی :-

نگاہ یار میں کیسا اثر ہے مرے سینے میں دل ہے نے جگر ہے

اصلاح : نگاہ یار میں ایسا اثر ہے نہ بس میں دل نہ قابو میں جگر ہے

پہلے مصرع میں بجائے 'کیسا' کے 'ایسا' خوب بنا دیا - دوسرے مصرع کی ترمیم سے ضعف نظم کا عیب رفع ہو گیا اور مطلع میں روانی و سلاست پیدا ہو گئی * —

(سید مجاور حسین عرف مجن صاحب 'تمنا' تلمیذ وجانشین حضرت 'جاوید' مرحوم)

سید زوار حسین 'صبر' لکھنوی:-

بے مروت کوئی ایسا ہم نے دیکھا ہی نہیں
موت آئی اور سب آئے وہ آیا ہی نہیں

اصلاح : بے مروت کوئی ایسا ہم نے دیکھا ہی نہیں
ہچکیاں آئیں ' اجل آئی ' وہ آیا ہی نہیں

دوسرا مصرع 'اور سب آئے' سے پست ہو گیا تھا - اس لئے 'ہچکیاں آئیں اجل آئی' کی اصلاح دی گئی جس سے معنوی ترقی کے علاوہ نشست الفاظ بھی درست ہو گئی —

صبر : تمہارے دل جلے کی قبر پر گل جو اُگ آیا تھا
وہ سبزہ آج پژمردہ ہے کاہی ہے نہ دھانی ہے

اصلاح : تمہارے دل جلے کی قبر پر گل جو اُگ آیا تھا
وہ سبزہ آج خاکستر ہے کاہی ہے نہ دھانی ہے

'پژمردہ' ہونے سے رنگت تبدیل نہیں ہوتی 'خاکستر' ہونے سے کوئی رنگ باقی نہیں رہتا —

صبر : ہے وحشت دل کی زاید اور کم ہے وسعت صحرا
ارادہ اس لئے کرتے نہیں وحشی بیاباں کا

---

* یہ اصلاحیں جناب جمیل احمد 'جمیل' بدایونی نے ذریعہ ڈاک ارسال فرمائیں تھیں - اصلاحیں زیادہ تھیں مگر انتخاب میں نہ آسکیں جس کی معافی چاہتا ہوں اور یہ چند اصلاحیں شکریہ کے ساتھ درج کرتا ہوں —

اصلاح : سوا ہے وحشت دل اور کم ہے وسعت صحرا
ارادہ کیا کریں وحشی ترے سیر بیاباں کا

مصرعہ اولیٰ کی ترمیم سے نشت الفاظ درست ہو گئی مصرعہ ثانی کی تبدیلی سے شعر میں ایک خاص حسن پیدا ہوگیا -

صبر : ترے وحشی کو بڑی آنکھ کے پردوں سے بھی کہ
اک گریباں جو پھٹا سات گریباں نکلے

اصلاح : سوے افلاک بڑھا ہاتھ ترے وحشی کا
اک گریباں جو پھٹا سات گریباں نکلے

آنکھ کے سات پردوں کو جو سات گریبانوں سے مشابہت دی گئی تھی وہ ناقص تھی کیونکہ انکھ ایک چھوٹی شے ہے اور گریبان اس سے بڑا ہوتا ہے اور تشبیہہ ہمیشہ بڑی شے سے دی جاتی ہے اس لئے یہ اصلاح دی گئی ' جو مبالغہ شاعری میں بےمثل ہے —

صبر : یا الٰہی جس پہ میں دیتا ہوں جاں
وہ چھری اب مجھ سے کتنی دور ہے

اصلاح : بند آنکھیں ہیں تو بتلا دے کوئی
وہ چھری گردن سے کتنی دور ہے

مصرعہ اولیٰ میں بند آنکھوں کا ذکر ضروری تھا کیونکہ مصرعہ ثانی میں جو استفہام ہے وہ بغیر اس کے ادا نہ ہوتا تھا ' گردن سے ' یہ ٹکڑا بھی خوب بنایا ' کیونکہ چھری کا تعلق گردن ہی سے تھا —

صبر : میرے داغ دل کو کب ہے وہ نصیب
صبح کے تارے میں جتنا نور ہے

اصلاح : کھینچ لے اس کو بھی جذب داغ دل
صبح کے تارے میں جتنا نور ہے

'صبر' کا مصرعہ اولیٰ مذاق شاعری کے برعکس تھا اسی نقص کی وجہ سے مصرع بدلا گیا - اس اصلاح سے عاشق کے دل کی کشش اور شوق کا بھی ثبوت ہوگیا —

صبر : یقیں ہے ہجر میں اس کے تعلق چھوٹے دنیا سے
پتا مجکو عدم کا دے رہی ہیں ہچکیاں میری

اصلاح : مسافر کو جو کار خیر ہے رستا بتا دینا
پتا مجکو عدم کا دے رہی ہیں ہچکیاں میری

ترقی کی اصلاح ہے —

صبر : تصور میں گلوں کے جان دے کر یہ ہوا حاصل
کہ ہر دیوار گلشن پر لکھی ہے داستاں میری

اصلاح : پڑی ہیں ذبح کے ہنگام اڑ کر خون کی چھنٹیں
کہ ہر دیوار گلشن پر لکھی ہے داستاں میری

شعر میں داستان کے لکھے ہونے کا ثبوت نہ تھا ' اس لئے پہلا مصرع بدلا گیا - اب خون کی چھینٹوں سے حرف وغیرہ بھی بن گئے اور مصرعہ ثانی کا ثبوت قوی ہو گیا -

صبر : میری کشتی غرق ہوتے جب نظر آئی اسے
دیر تک ہاتھوں سے دل تھامے رہا ساحل کے پاس

اصلاح : ٹوٹ کر مجھ سے حبابوں نے نجانے کیا کہا
دیر تک ہاتھوں سے دل تھامے رہا ساحل کے پاس

'صبر' کا پہلا مصرع مہمل سا تھا نہ کشتی آب نہ کشتی دل نہ کشتی عمر کسیکا پتا نہ چلتا تھا اس لئے دوسرا مصرع لگا دیا گیا ' جس سے مصرعہ ثانی کا صحیح مفہوم ادا ہو گیا -

صبر : کسی کی دید نے ایسا کیا ہے مضطرب اس کو
کہ لہریں آ رہی ہیں آج آئینے کے پانی میں

اصلاح : نہ جانے پڑ رہا ہے عکس کس کی زلف پر خم کا
کہ لہریں آ رہی ہیں آج آئینے کے پانی میں

زلف پر خم کے عکس سے لہروں کی پوری تشبیہ بھی ہو گئی اور الجھا ہوا شعر بھی سلجھ گیا۔

صبر : قفس سے دیکھتا ہوں سیر اپنے آشیانے کی
اڑے جگنو تو سمجھوں چاند نکلا اک نشیمن سے

اصلاح : مجھے مرغوب ہے ہر چیز اپنے آشیانے کی
اڑے جگنو تو سمجھوں چاند نکلا اک نشیمن سے

ایک لفظ 'مرغوب' سے جگنو چاند بنایا گیا۔

سید ضامن حسین شاغل لکھنوی :-

یہ کہہ کر میں نے دونوں ہاتھ رکھے اپنی آنکھوں پر
کہ اب مشکل ہے اس شب کی قیامت تک سحر ہونا

اصلاح : یہ کہہ کر میں نے آخر بند کر لیں شام غم آنکھیں
کہ اب مشکل ہے اس شب کی قیامت تک سحر ہونا

'بند کر لیں شام غم آنکھیں' اس ٹکڑے نے موت اور نیند دونوں معنی دئیے اور 'آخر' کا لفظ بھی خوب ہے۔

نواب محمد رضا عرف نوابو صاحب 'دانش' لکھنوی :-

شاید اس آئینہ رو کو دیکھ لوں میں خواب میں
آج رکھ کر سوؤں گا میں زیر بستر آئینہ

اصلاح : شاید اس آئینہ رو کو دیکھ لوں میں خواب میں
آج رکھ کر سوؤں گا بالین بستر آئینہ

چونکہ دونوں مصرعوں میں 'میں' کی تکرار خلاف فصاحت تھی' اس لئے 'بالین بستر' بنا دیا۔

میر ہادی اصغر حسین 'زخمی' لکھنوی :-

ہوا اثر اس پر جو زخمی عشق میں کامل بنو
یعنی پیوندِ زمیں کوچۂ قاتل بنو

اصلاح : عشق ابھی ناقص ہے زخمی مر کے تم کامل بنو
یعنی پیوندِ زمیں کوچۂ قاتل بنو

'زخمی' کا پہلا مصرع کچھ نہ تھا، کامل کے لئے عشق ابھی ناقص ہے خوب بنایا اور پھر 'مر کے'، اس ٹکڑے کی بھی پیوند زمیں کے لئے ضرورت تھی -

زخمی : صنعت بتوں کی دیکھ کے آئی خدا کی یاد
ثابت رہا اگر تو خدا نے بچا لیا

اصلاح : صنعت بتوں کی دیکھ کے آئی خدا کی یاد
گرنے سے مجکو لغزشِ پا نے بچا لیا

اول تو باہم دونوں مصرعوں میں ربط نہ تھا دوسرے دونوں مصرعوں میں 'خدا' کی تکرار خلاف فصاحت تھی اس لئے یہ مصرع بدلا گیا -

زخمی : اور بھی حد سے زیادہ ہو مری بیماری
کروٹیں آکے بدلواؤ اگر تم مجکو

اصلاح : پاوں پھر اور بھی پھیلائے مری بیماری
کروٹیں آکے بدلواؤ اگر تم مجکو

بیماری کا پاوں پھیلانا وہ صورت بامحل ہے کہ جس کی کیا تعریف ہوسکتی ہے - اس اصلاح نے شعر میں ایک نئی روح پھونک دی - خوب اصلاح ہے -

نواب دلارے صاحب 'ناوک' لکھنوی:-

ناوک ہے یہی دل کے بہلنے کا سہارا
گھبراتے ہو ٹیسوں سے عبث قلب و جگر کی

اصلاح : ناوک ہے یہی کروٹیں لینے کا سہارا
گبھراتے ہوتیسوں سے عبث قلب و جگر کی

'کروٹیں لینے کا سہارا' قلب و جگر کی ٹیسوں کے ساتھ حرت بامحل ہے۔

ناوک : میں اپنے ہاتھ سے فرقت میں اپنا کیوں گلا کاٹوں
سنا ہے آج کل خود میرے قاتل کی جوانی ہے

اصلاح : میں اپنے ہاتھ سے فرقت میں اپنا کیوں گلا کاٹوں
سنا ہے باڑہ پر اب میرے قاتل کی جوانی ہے

'باڑہ پر' اس ٹکڑے نے کس قدر رعایتیں اور خوبیاں شعر میں پیدا کردیں - عمدہ اصلاح ہے -

محمد علی عزت پنجو صاحب خوشخو لکھنوی :-

پوچھتا ہوں اس سے میں کھوئے ہوے دل کا پتا
اس طرح بیٹھا ہے وہ جیسے کہ سنتا ہی نہیں

اصلاح : پوچھتا ہوں اس سے میں کھوئے ہوے دل کا پتا
بت بنا بیٹھا ہے یوں جیسے کہ سنتا ہی نہیں

بت بن کر بیٹھنا بمعنی خاموش محاورہ ہوی ہے اور شعرا نے معشوق کو بھی بت سے مراد لیا ہے اسی مناسبت سے 'بت بنا بیٹھا ہے یوں' کی اصلاح دی گئی جس سے شعر میں رعایت لفظی کے علاوہ معنوی خوبیاں بھی بڑھ گئیں -

محمد رضا منصور لکھنوی: اس کی باتوں پر ہنسی آے نہ پھر کیونکر مجھے
ہاتھ سے شب کو بھی جو رکھے نہ دم بھر آینہ

اصلاح : کچھ اسی سے جذب شوق دید پوچھا چاہئے
ہاتھ سے شب کو بھی جو رکھے نہ دم بھر آینہ

شاگرد کا مصرع کچھ نہ تھا - استاد نے پورا مصرع بدل کر شعر کو لطیف کر دیا -

---

*یہ اصلاحیں خود جناب تمنا نے اپنے شاگردوں سے لے کر مرحمت فرمائیں اس زحمت کا مولف شکر گزار ہے —

محمد عبدالحکیم خاں ' نشتر ' جالندھری

جناب آغا شاعر دھلوی تلمیذ حضرت داغ مرحوم کے کلام پر تنقید کرتے ہوے چند اصلاحیں بھی جناب نشتر نے دیں ھیں - نشتر صاحب حضرت شوق قدوائی مرحوم کے خوشہ چیں ھیں - ان اصلاحوں میں شاگرد نے کہاں یہ دکھا یا ھے کہ استاد کا رنگ جھلکتا ھے ' جسے ادا شناس ھی خوب سمجھہ سکتے ھیں —

یہ اصلاحیں خود جناب نشتر نے بذریعہ ڈاک ارسال فرمائیں جو فایدے سے خالی نہیں-اصلا حیں جس پایہ کی ھیں اسکا فیصلہ ارباب نظر خود کرلینگے . آغاشاعر کے نام نامی سے غالباً ھمارے ناظرین نا واقف نہ ھوں گے . آپ ایک خوش فکر شاعر ھو نے کے علاوہ جانشینی حضرت داغ مرحوم کے بھی مدعی ھیں - میں ان اصلاحوں کو ھرگز درج نہ کر تا مگر چو نکہ یہ بھی ادبی نکات ھیں جن کے مطالعہ سے معلومات میں ایک معتد بہ اضافہ ھوتا ھے ' اس لئے مناسب معلوم ھوتا ھے کہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے انھیں بھی مشاطہ سخن کے زریں اوراق میں جگہ دوں – مولف

آغا شاعر

تسلی رھتی تھی عاشق کو اسکے پاس رھنے سے
اسی باعث سے سا یہ اڑ گیا جسم پیمبر کا

اصلاح :

تسلی رھتی تھی عاشق کو اسکے پاس رھنے سے
اسی با عث سے سایہ رکھہ لیا جسم پیمبر کا

' سایہ اڑ گیا ' برا تھا ' سایہ رکھہ لیا ' خوب بنایا -

آغا شاعر :

تم ماہ نیم ماہ اگر ھو تو کیا ھوا
میں بھی تو آفتاب لب با م ھو گیا

اصلاح :

تم بزم کے حسن میں جو ھوے مہر نیمروز
میں گوشے کے آفتاب لب با م ھو گیا

آغا صاحب کے شعر میں نہ ماہ نیم ماہ کا ثبوت تھا ' نہ آفتاب لب با م کا - گو ماہ نیم ماہ سے چودھویں کا چاند مراد لیا ھے ' مگر اردو میں میری نظر سے اس

معنی میں کسی کا شعر نہیں گزرا - اصلاح سے بڑھنے اور گھٹنے کا ثبوت قوی ہوگیا اور شعر چمک گیا - استادانہ تصرف ہے -

آغا : جوانی بھی عجب شے ہے کہ جب تک ہے نشا اس کا
مزا ہے سادے پانی میں شراب ارغوانی کا

اصلاح : جوانی بھی عجب شے ہے کہ جب تک نشہ ہے اس کا
مزا ہے سادے پانی میں شراب ارغوانی کا

'فشا' بروزن 'وفا' اساتذہ کے کلام میں میری نظر سے نہیں گزرا لغت میں تو 'نشہ' بروزن پشہ (بہ تشدید شین) ہے مگر عموماً شعرا بروزن شمع باندھتے ہیں - اصلاح مری رائے ناقص میں صحیح دی گئی -

آغا شاعر : کیا کہیں عالم امکاں میں کیا کیا دیکھا
ہم نے متی کے کھلونے کو بھی گویا دیکھا

اصلاح : کیا کہیں عالم ایجاد میں کیا کیا دیکھا
ہم نے متی کے کھلونے کو بھی گویا دیکھا

امکان میں عطف و اضافت کی حالت میں اعلان نون غلط ہے مضاف الیہ 'امکان' میں نون غنہ چاہئیے تھا - اس لئے 'عالم امکاں' کے بجائے 'عالم ایجاد' بناکر شعر کو صحیح کردیا -

غا شاعر: خوف کیا آتش دوزخ سے کہ او زاہد خشک
میرے سر پر ہے میرے دامن تر کا ٹکڑا

اصلاح : خوف کیا آتش دوزخ سے ہمیں زاہد خشک
سر پہ ہے روز جزا دامن تر کا ٹکڑا

پہلے مصرع میں 'کہ او' کے بجائے ہمیں بنایا' دوسرے مصرع میں 'روز و جزا' کی ضرورت تھی اس اصلاح سے شعر میں سلاست و روانی پیدا ہو گئی اور حشو و زواید بھی رفع ہو گئے -

آغا شاعر : اس رنگ سے ہو کفر پرستی تو خوب ہے
زنار ڈالئے تو پھولوں کے ہار کا

اصلاح : اس رنگ سے ہو کفر پرستی تو گل کھلیں
زنار ہاتھ آئے کسی گل کے ہار کا

مضمون تو فی نفسہ خوب تھا مگر افسوس کہ خوبی سے بندھ نہ سکا۔ اصلاح سے مناسبت الفاظ کے علاوہ دلکشی و فصاحت بلائیں لینے لگی۔

(نا خدائے سخن 'نوح' ناروی)

مرزا عثمان غنی ' غنی ' آلہ آبادی :-

دل میں اگر نہ کیں ہو آنکھوں سے کیوں نہاں ہو
اللہ رے بد گمانی اس درجہ بدگمان ہو

اصلاح : دل میں اگر نہ کیں ہو آنکھوں سے کیوں نہاں ہو
اللہ رے بد گمانی تم اتنے درجہ بدگماں ہو

' تم اتنے ' اس ٹکڑے سے لطف زبان بڑھ گیا۔

غنی : مثل کلیم طور پر ہرگز نہ جائیں گے
دیکھیں گے حسن یار کا جلوہ یہیں سے ہم

اصلاح : مثل کلیم طور پر جانے سے فائدہ
دیکھیں گے حسن یار کا جلوہ یہیں سے ہم

' ہرگز نہ جائینگے ' اس ٹکڑے میں زرا ثقالت تھی بجائے اس کے ' جانے سے فایدہ ' بنادیا جس سے فصاحت پیدا ہو گئی۔

غنی : فصل گل آنے تو دو فصل بہار آنے تو دو
خود بخود کھل جائینگی کڑیاں مری زنجیری

اصلاح : فصل گل آنے تو دو فصل خزاں جانے تو دو
خودبخود کھل جائینگی کڑیاں مری زنجیر کی

فصل گل و فصل بہار دونوں ٹکڑے ہم معنی تھے اس لئے "فصل خزاں جانے دو" خوب بنایا - آنے کے لئے "جانے" کی بھی ضرورت تھی بےنظیر اصلاح ہے۔

غنی: رہی ہے اُن کی الفت میں یہ صورت کوچہ گردی کی
اِدھر جانا اُدھر ہوکر اُدھر جانا اِدھر ہوکر

اصلاح: رہی ہے جوش وحشت میں یہ صورت کوچہ گردی کی
اِدھر جانا اِدھر ہوکر اُدھر جانا اِدھر ہوکر

"جوش وحشت" کے ٹکڑے نے مضمون مصرعہ ثانی کا ثبوت قوی کردیا —

غنی: سیکڑوں ظلم و ستم ڈھاتے ہو مجھ پر صبح و شام
اور پھر کہتے ہو تجھکو چاہتے ہیں دل سے ہم

اصلاح: سیکڑوں ظلم و ستم ڈھاتے ہو میری جان پر
اور پھر کہتے ہو تجھکو چاہتے ہیں دل سے ہم

"میری جان پر" اس ٹکڑے نے شعر میں جان ڈال دی —

غنی: ہمیشہ بے سبب تم کیوں اِسے پامال کرتے ہو
تمہیں اتنی کدورت کس لئے ہے میرے مدفن سے

اصلاح: ہمیشہ آتے جاتے کیوں اِسے پامال کرتے ہو
تمہیں اتنی کدورت کس لئے ہے میرے مدفن سے

پامال کرنے کے لئے "آتے جاتے" کی سخت ضرورت تھی- اس لئے بجائے "بے سبب تم" کے "آتے جاتے" بنایا —

غنی: آج تک جس نے نہ دیکھی ہو پریشاں نظری
دیکھ لے وہ تری زلفوں کا پریشاں ہونا

اصلاح: آج تک جس نے نہ دیکھی ہو پریشانیٔ دل
دیکھ لے وہ تری زلفوں کا پریشاں ہونا

"پریشاں نظری" کو زلفوں کی پریشانی سے کیا تعلق "پریشانیٔ دل" خوب ہے۔

غنی: باد صر صر نے کہیں کا بھی نہ رکھا مجکو
دیکھتا ہوں تو نشیمن بھی گلستاں میں نہیں

اصلاح: باد صر صر نے کیا اور مجھے خانہ بدوش
دیکھتا ہوں تو نشیمن بھی گلستاں میں نہیں

" کہیں کا بھی نہ رکھا مجکو " اس کے بجاے " کیا اور مجھے خانہ بدوش" میں زیادہ لطف ہے؛ مصرعہ ثانی اسی کا محتاج تھا —

غنی: میرے پہلو میں رہو میری نگاہوں میں رہو
میں اسی بات کی رکھتا ہوں تمنا دل میں

اصلاح: میرے پہلو میں رہو میری نگاہوں میں پھرو
میں اسی بات کی رکھتا ہوں تمنا دل میں

" نگاہوں میں رہو " کے بجاے " نگاہوں میں پھرو " بنایا - جس سے " رہو " کی تکرار جاتی رہی اور شعر عمدہ ہو گیا —

بابو سکھہ ریو پرشاد ' بسمل ' آلہ آبادی :—

جلوۂ نور جہاں ایزدی ہے دیر بھی
آو اے اہل حرم کر لو یہاں کی سیر بھی

اصلاح: مظہر نور جہاں ایزدی ہے دیر بھی
آو اے اہل حرم کر لو یہاں کی سیر بھی

" مظہر " بجاے " جلوۂ " کے بنا کر مطلع کو مطلع انوار بنا دیا سبحان اللہ!

بسمل: تیر نگاہ یار خدا کی تجھے قسم
دل میں لہو رہے نہ جگر میں لہو رہے

اصلاح: تیر نگاہ یار ادا کی تجھے قسم
دل میں لہو رہے نہ جگر میں لہو رہے

ایک لفظ " ادا " نے شعر میں کیا کیا ادائیں پیدا کردیں - اصلاح اسی کا نام ہے-

بسمل : جب بگولا دشت میں اُٹھ کر کہیں اونچا ہوا
قیس یہ سمجھا کہ بس لیلیٰ اسی محمل میں ہے

اصلاح : جب بگولا دشت میں اُٹھ کر ذرا اونچا ہوا
قیس یہ سمجھا کہ بس لیلیٰ اسی محمل میں ہے

" کہیں" شعر میں زاید تھا اس لئے " زرا " بنا دیا اب " زرا" کو زرا دیکھئے۔

بسمل : وہ شمع نہ تھی وہ بزم نہ تھی وہ رونق اہل بزم نہ تھی
اک یاد دلانے کی خاطر انبار پر پروانہ تھا

اصلاح : وہ شمع نہ تھی وہ بزم نہ تھی صبح کو اہل بزم نہ تھے
بس یاد دلانے کی خاطر انبار پر پروانہ تھا

دونوں مصرعوں کی ترمیم سے شعر حسرت ویاس کا مرقع بن گیا —

بسمل : سمجھ لیا کہ یہ دل ہے شکستۂ حسرت
کہیں کسی کا جو ٹوٹا مزار دیکھ لیا

اصلاح : سمجھ لیا کہ یہ دل ہے شکستۂ اُلفت
کہیں کسی کا جو ٹوٹا مزار دیکھ لیا

" شکستہ حسرت " کچھ نہ تھا " شکستہ الفت " نے شعر کو با معنی کردیا —

بسمل : سمجھ کا پھیر ہے اس کو قضا کہنے لگی دنیا
گرہ جب کھل گئی ترکیب اجزائے پریشاں کی

اصلاح : سمجھ کا پھیر تھا اس کو قضا کہنے لگی دنیا
گرہ جب کھل گئی ترکیب اجزائے پریشاں کی

" کہنے لگی " یہ ٹکڑا زمانہ ماضی کی خبر دیتا ہے اس لئے بجائے " ہے "
کے " تھا " بنایا —

بسمل : کون رویا لاش پر کسنے جلائی آ کے شمع
ہم کو اس کی کیا خبر ہم مر گئے تو کیا ہوا

اصلاح : کون رویا لاش پر کس نے جلائی آ کے شمع
ہم کو اس کی کیا خبر جب مر گئے تو کیا ہوا

ہم کی تکرار بد نما تھی اس لئے بجائے " ہم " کے " جب " بنا کر شعر کو صاف کردیا —

بسمل : صیاد سے یہ کہتی ہے اکتا کے عندلیب
کردے قفس میں بند ہوائے بہار کو

اصلاح : صیاد سے یہ کہتی ہے گھبرا کے عندلیب
کردے قفس میں بند ہوائے بہار کو

اس محل پر " اُکتا کے " بے محل تھا اس لئے " گھبرا کے " بنایا -

بسمل : عزیز و اقربا کیا کر رہے ہیں دیکھو مرنے پر
کہ اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں پیوند زمیں ہم کو

اصلاح : عزیز و اقربا کو بعد مرنے کے یہ کیا سوجھی
کہ اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں پیوند زمیں ہم کو

" دیکھو مرنے پر " یہ ٹکڑا فصاحت سے گرا ہوا تھا اس لئے " بعد مرنے کے یہ کیا سوجھی " خوب بنایا —

بسمل : نزع میں یہ کون آہ سرد بھر کر رہ گیا
دل جگر تھامے ہوے جو وہ ستمگر رہ گیا

اصلاح : نزع میں یہ کون آہ سرد بھر کر رہ گیا
تھام کر اپنا کلیجا وہ ستمگر رہ گیا

بسمل کا مصرع بسمل تھا " تھام کر اپنا کلیجا وہ ستمگر رہ گیا " - اس مصرع سے مطلع کی شان ہی کچھ اور ہوگئی- ایسی ہی اصلاحیں سبق اموز ہوا کرتی ہیں-

بسمل : مجھے مشہور کرتی ہے تجھے بد نام کرتی ہے
جفا کس کی جفا تیری وفا کس کی وفا میری

اصلاح : مجھے نا کام رکھتی ھے تجھے بد نام کرتی ھے
جفا کس کی جفا تری وفا کس کی وفا میری

ایک مصرع میں دو جگہ ' کرتی ھے' کی تکرار اچھی نہ تھی اور مشہور 'کرتی ھے' یہ ٹکڑا بھی بد نما تھا اس لئے ' نا کام رکھتی ھے ' بنایا جس سے شعر میں معنوی خوبیوں کے علاوہ فصاحت آ گئی -

بسمل : ادھر میں ڈوبنے جاتا ھوں دریائے محبت میں
ادھر دنیا بلاتی ھے مجھے گھبرا کے ساحل سے

اصلاح : ادھر میں ڈوبنے آیا ھوں دریائے محبت میں
ادھر دنیا بلاتی ھے مجھے گھبرا کے ساحل سے

ایک لفظ آیا ' سے زمانے کا جو فرق تھا جاتا رہا - لطف اصلاح یہی ھے کہ کہیں استاد کی نظر نہ چوکے -

بسمل : حسن نے بڑھ کے دل سے لیں اسکی بلائیں لاکھ بار
جان سے جب گزر گیا سرمد پاکباز عشق

اصلاح : جلوہ سرمدی نے لیں اسکی بلائیں لاکھ بار
جان سے جب گزر گیا سرمد پاکباز عشق

' جلوہ سرمدی نے ' اس جواھر نگار ٹکڑے کی کیا تعریف ھو ' کتنی نازک اصلاح ھے -

بسمل : اللہ اللہ دور کب دل سے ھوا ان کے غبار
خاک میں جب مل گئے خاکے مری تصویر کے

اصلاح : ھوتے ھوتے دور کب دل سے تیرے غبار
خاک میں جب مل گئے خاکے مری تصویر کے

' اللہ اللہ ' کی یہاں ضرورت نہ تھی ۔ ' ہوا ' کی مناسب سے ' ہوتے ہوتے '
کا کیا کہنا ' ان کے ' کی جگہ ' ترے ' بنایا ۔ معشوق سے خطاب اور لطف دے گیا ۔
منشی سندر لعل ناز الہ آبادی :۔

یہ آ یا ہے دم اخر جواب اس دشمن جاں کا
کوئی مہماں ہو آکر کہاکسی دم بھر کے مہماں کا

اصلاح : یہ آیا وقت آخر اب جو اس دشمن جاں کا
کوئی مہماں ہو کس امید پر دم بھر کے مہماں کا

دونوں مصرعوں کی ترمیم سے مطلع میں جان آ گئی اس بالغ نظری کی کیا
داد دی جاے * ۔

شاہ سید شاہد علی فانی سبز پوش
سجادہ نشین درگاہ رشید یہ جونپور

بابو پیارے موہن عاجز :—

اُڑ کر جو آج پہنچا اب بام یار پر
کیا کیا ہے رشک غیر کو میرے غبار پر

اصلاح : پہنچا جو اُڑ کے گوشۂ داماں یار پر
کیا کیا ہے رشک غیر کو میرے غبار پر

عاشق جانباز کا غبار گوشہ داماں یار پر جب اُڑ کر پہنچا تو غیر کو رشک

---

* میری التجا پر مکرمی حضرت نوح نے چند اصلاحیں اپنے شاگردوں سے طلب
فرما کے میرے پاس بھیجدی ہیں اور مطالعہ سخن حصہ دوم کی پیشگی قیمت بھی
بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائی اپنے محترم دوست کی ان عنایتوں کا شکریہ
ادا کرتا ہوں — مولف

آ یا - غبار عاشق کی بھی جگہ تھی اس اصلاح سے مطلع کا حسن اور بڑھ گیا -

عاجز : کیوں جی یہی ہے رسم محبت کہ بعد مرگ
دو پھول بھی نہ تم نے چڑھا یا مزار پر

اصلاح : کیوں جی یہی ہے رسم محبت کہ بعد مرگ
دو پھول بھی نہ تم نے چڑھائے مزار پر

' چڑھا یا ' غلط تھا کیونکہ ' دو پھول تھے ' اس لئے چڑھائے بنا کر شعر کو صحیح کر دیا—

عاجز : کیوں کریں غم عبث کسی کے لئے
موت ہے ایک دن سبھی کے لئے

اصلاح : کہتے ہیں روئیں کیوں کس کے لئے
موت ہے ایک دن سبھی کے لئے

اس اصلاح سے مطلع میں سلاست وروانی پیدا ہو گئی اور یہ پتا چل گیا کہ معشوق اپنی زبان سے کہہ رہا ہے -

عاجز : لے کے دل میرا غیر سے ملنا
کیوں جی دل لے لیا اسی کے لئے

اصلاح : مل کے دشمن سے تم ہوئے بد نام
منع کرتے تھے ہم اسی کے لئے

اصلاح سے شعر کا مفہوم ہی کچھ اور ہو گیا - مصرعہ ثانی تعریف سے مستغنی ہے —

عاجز : صلح دشمن سے واہ کیا کہنا
کیوں کریں ہم تیری خوشی کے لئے

اصلاح : صلح دشمن سے اور ہم عاجز

یہ بھی کرنی پڑی کسی کے لئے

اس اصلاح سے شعر میں معنوی ترقیاں اور بڑھ گیئں - مقطع میں عاجز کا لفظ کس قدر معنی خیز ہے جس حسن ردیف کا کیا کہنا -

---

* یہ اصلاحیں عزیزی حکیم امیر احمد ہاشم خلف حضرت وسیم سے ملیں - اصلاحیں بہت تھیں مگر پنسل کی لکھی ہوئیں تھیں پڑھنے میں دقت تھی اس لئے یہ چند اصلاحیں انتخاب کرلی گئیں —

تبصرے

ادب

تاریخ

متفرق

اُردو کے جدید رسالے

ادب

پیام روح

(مجموعۂ کلام جناب حامد اللہ صاحب 'افسر' - مطبوعۂ انڈین پریس الہ آباد - قیمت تین روپیے -)

یہ حامد اللہ صاحب افسر کے کلام کا مجموعہ ہے جس کا نام "پیام روح" رکھا ہے - اس میں ان کا پورا کلام ہے - کچھ تو لڑکپن کے زمانے کی نظمیں ہیں اور باقی بعد کی - نظمیں مختلف مضامین پر ہیں اور ان سے شاعر کے تخیل اور درد دل کی کیفیت معلوم ہوتی ہے - بعض نظمیں جو حب وطن کے جوش میں لکھی ہیں خوب ہیں ' ایسی نظموں میں وہ ہندی الفاظ بڑے سلیقے سے لکھے جاتے ہیں- تھوڑی سی غزلیں بھی ہیں لیکن ان کا رنگ بھی جدا ہے - غزل میں مولانا حالی نے قدیم رنگ سے کسی قدر الگ ہو کر خاص بات پیدا کی تھی ' اس کا تتبع جناب افسر نے بھی کیا ہے —

یہ مجموعہ ہماری جدید شاعری کا بہت اچھا نمونہ ہے- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تعلیم کا اثر رائگاں نہیں گیا - افسر صاحب ہمارے نوجوان شاعروں میں بہت قابل قدر ہیں اور امید ہے کہ ان کا کلام شوق سے پڑھا جائے گا - کتاب کے چھاپنے میں خاص اہتمام کیا گیا ہے ' کاغذ بھی اعلیٰ درجے کا لگایا گیا ہے ' کاش خط بھی ایسا ہی اچھا ہوتا ...

آنند مٹھ

(مصنفۂ بنکم چندر چٹرجی ' مترجمۂ ڈاکٹر گوکل چند ' نارنگ ایم - اے - پی ایچ ڈی بیرسٹر - گیان پرکاش مندر - پوسٹ ماچھرہ - ضلع میرٹھ - صفحات ۲۱۵ ' قیمت ایک روپیہ —)

یہ کتاب بنگال کے نامور ناول نویس اور ادیب بابو بنکم چندر چٹرجی کی تصنیف ہے - اٹھارھویں صدی میں کچھ دنوں کے لئے بنگال میں سنیاسیوں کے گروہ نے بڑی شورش اور غارتگری برپا کردی تھی - اسے مصنف نے حب وطن کا رنگ دے کر یہ ناول لکھا ہے - یہ وہی مشہور ناول ہے جس میں بندے ماترم کا گیت ہے جو آج ہندوستان کا قومی ترانہ بن گیا ہے - اس میں مسلمانوں اور مسلمانی راج کی خوب نندا (برائی) کی ہے اور انگریزوں کی حکومت کو سراہا ہے - سنیاسیوں کی شورش کا اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومت مٹا کر انگریزی راج قائم کریں - ذیل کے جملوں سے کتاب کی اصل غایت پر روشنی پڑتی ہے —

"بیشک ہمارا مقصد راج حاصل کرنے کا نہیں' ہم صرف مسلمانوں کی بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں ' کیونکہ مسلمان بھگوان کے دشمن ہیں " —

" انگریز ہندوستان کی نجات کے لئے آئے ہیں "—

" شکر ہے ' بھگوان نے پھر وہ دن دکھائے کہ مسجدیں گراکر رادھا مادھو کے مندر بن جائیں گے " —

' جب تک ہندو لوگ گیان وان ' گن وان اور بلوان نہیں ہونگے ' انگریز یہ کھٹکے یہاں راج کریں گے ' ان کے راج میں لوگ خوش رہیں گے اور ہر ایک آزادی سے اپنے اپنے دھرم کو پورا کرے گا " —

" دشمن کون ہیں ' دشمن کہاں باقی ہیں ' انگریز دوست ہیں " —

غرض غلامی کا عار کہیں نہیں گیا - غلام قومیں ہر نئے فاتح کو ملک کی نجات کا باعث سمجھ کر اپنی تسلی کرلیتی ہیں —

ناول پر جوش ہے ' ہندو حب وطن سے لبریز ہے - لیکن جس گروہ کے ذریعے حب وطن کا اظہار کیا گیا ہے وہ کچھ ان پر پھبتا نہیں - ناول سے مصنف کا کمال بلا شبہ ظاہر ہوتا ہے - بعض اشخاص کی صورت بھی خواب دکھائی ہے - ترجمہ اچھا اور صاف ہے لیکن زبان کے محاورے پر پنجابی رنگ غالب ہے - ناول دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے —

ماہ نو

(مجموعۂ نظم، تصنیف پروفیسر محمد اکبر صاحب منیر ایم - اے۔
کتب خانۂ مقبول عام، ریلوے روڈ، لاہور)

پروفیسر منیر صاحب کو ابتدا سے فارسی زبان سے طبعی ذوق تھا، ایران کے سفر نے اس میں چار چاند لگادئے - یہ مجموعہ فارسی نظموں کا اُن کی فکر لطیف کا نتیجہ ہے - فارسی زبان پر اُنھیں پوری قدرت ہے اور اُن کے اشعار کی فصاحت اور خوبی اس کی شاہد ہے - جو صاحب فارسی کا ذوق رکھتے ہیں اُن کے لئے منیر کا کلام بہت لطف انگیز ہوگا - آخر میں ایک اُردو نظم بھی ہے جو قاآنی کی طرز میں کہی ہے —

محاورات اُردو

(مرتبۂ اندرجیت شرما صاحب مینجر اسکول بک ڈپو، ماچھرہ
صفحات ۱۰۰، قیمت آٹھہ آنے)

یہ چھوٹی سی کتاب مؤلف نے طالب علموں کے لئے لکھی ہے - اس میں ضروری اور عام محاورے موجود ہیں اور ہر محاورے کے لئے کسی نہ کسی استاد کے کلام سے سند بھی دی ہے —

محاورے کے معاملے میں اکثر یہ غلطی ہوتی ہے کہ معمولی الفاظ یا جملوں کو اور بعض اوقات ایسے جملوں کو جو استعارۃً استعمال ہوے ہیں، محاورہ قرار دیکر لکھہ دیا جاتا ہے - چنانچہ اس کتاب میں بھی بعض بعض مقامات پر یہ غلطی پائی جاتی ہے - مثلاً آرزو ہونا، پارہ پارہ ہونا، تلک ظرف، دن گئے (وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں) عرش سے فرش تلک، فرض ادا کرنا۔

یہ تمام مرکبات لغوی اور معمولی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، انھیں محاورہ قرار دینا صحیح نہیں - "دن گئے" کوی محاورہ نہیں، غالب کے مصرعے سے یہ دو لفظ اٹھا کے جوں کے جوں رکھہ دئے ہیں -

اسی طرح بعض محاوروں کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے - مثلاً "آنکھوں میں

پی جانا " - اس کے معنی لکھے ہیں ضبط کرنا ' خاموش ہو رہنا ، کسی مرغوب شے کو آنکھوں سے چپ چاپ دیکھتے رہنا - اصلی محاورہ ' پی جانا ' ہے - اور اس کے معنے ضبط کرنا' ہے-تیسرے معنے جواس میں لکھےھیں وہ مولف نے آتش کے اس شعرسے پیدا کئے ہیں'

شیشہ کو دیکھتا ہوں تو کہتے ہیں یہ مغاں
آنکھوں میں دخت رز کو پیے جاتے ہو عبث

آتش نے یہاں محض یہ جملہ استعارۃً استعمال کیا ہے' یہ کوئی محاورہ نہیں ہے - "اپنے دن برے ہونا " محاورہ نہیں بلکہ " کسی کے دن برے ہونا " محاورہ ہے - یہ غلطی انہیں نسیم کے شعر سے ہوئی ہے - اگر کوئی کہے زید کے دن برے تھے تو زید کے دن برے ہونا محاورہ نہیں ہوگا -

" پھونک پھونک پانو دھرنا یا قدم دھرنا " - پھونک پھونک کر ہونا چاھئے —

" پی کے رہ جانا " محاورہ نہیں " پی جانا " ہونا چاھئے- " خشک دماغ " کوئی محاورہ نہیں اور نہ اس کے معنے بے مروت کے ہیں اور نہ اُس شعر سے یہ معنے نکلتے ہیں جو سند میں لکھا گیا ہے —

" دانت ہونا " محاورہ نہیں ہے بلکہ " کسی چیز پر دانت ہونا - " امید ہے کہ آیندہ طبع کے وقت اس قسم کی غلطیوں کی اصلاح کرلی جاے گی —

کلیات وفا

(کلام حکیم عبدالہادی خاں صاحب 'وفا' رامپوری- قیمت دو روپئے' مکتبۂ جامعۂ ملیہ دھلی)

وفا مرحوم قادرالکلام شاعر تھے اور غالب و مومن کی طرز پر خوب لکھتے تھے - اس مجموعے میں ان کا اُردو اور فارسی کلام جمع کیا گیا ہے - شروع میں چند قصائد بھی ہیں جن سے اُن کی زور طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے - قدیم طرز کے لکھنے والوں میں وفا کا کلام بہت غنیمت اور قدر کے قابل ہے —

قزاقی کا جوگ

(جناب حامد اللہ صاحب 'افسر' بی - اے - انڈین پریس - آلہ آباد)

یہ گیارہ مختصر فسانوں کا مجموعہ ہے جو اس سے قبل مختلف رسالوں میں شائع ہوچکے ہیں - بعض فسانے بہت دلچسپ ہیں —

واقعات عالم

(از تصنیف الحاج خطیب قادر بادشاہ صاحب
متخلص بہ 'بادشاہ' مرحوم - قیمت چار آنے) -

کتاب کے نام سے دھوکا ہوتا ہے - یہ دراصل خطیب صاحب مرحوم کے قطعات تاریخی کا مجموعہ ہے - تاریخی مادے اچھے اچھے ہیں - خطیب صاحب مدراس کے مشہور شاعروں میں تھے اور ہر قسم کی نظمیں اُن سے یادگار ہیں —

تاریخ

سفیر اودھ

(خود نوشتہ حالات مولوی محمد مسیح الدین علوی خاں بہادر مرحوم مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ - قیمت ایک روپیہ - انجمن ترقی اُردو سے بھی مل سکتی ہے)

مولوی مسیح الدین علوی کا کوری کے رہنے والے تھے - صاحب علم و فضل تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں معزز عہدوں پر رہے اور اس زمانے میں خطاب خانی و بہادری سے سرفراز ہوئے - اس زمانے میں یہ خطاب بہت ہی کم لوگوں کو ملتا تھا - انتزاع سلطنت اودھ پر بادشاہ کی طرف سے سفیر ہو کر انگلستان گئے اور وہاں اُن

کی بہت آؤ بھگت ہوی - انگلستان پہنچ کر انھوں نے بادشاہ کے لئے بہت کچھ کوشش کی لیکن عین وقت پر ھندوستان میں شورش برپا ہوگئی جو عام طور سے غدر سنہ ۵۷ ع کے نام سے مشہور ھے- اس سے سارا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا اور وہاں انھیں بڑی بڑی تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھانی پڑیں - بہزار دقت انگلستان سے حج کو گئے اور حج سے فارغ ھو کر ھندوستان پہنچے - مولوی صاحب مرحوم بہت باوضع صاحب استقلال اور صاحب علم شخص تھے اور اپنی لیاقت اور دیانت کے باعث ہمیشہ مورد عزت و حرمت رہے اگرچہ اس میں زیادہ تر اپنی تعلیم اور ملازمتوں اور انگلستان میں سفارت کا ذکر ھے تاھم کتاب دلچسپ ھے - عبارت میں کسی قدر قدیم رنگ پایا جاتا ھے —

جمال الدین افغانی

(مکتبۂ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ - دھلی - قیمت ۸ آنے) —

سید جمال الدین افغانی کے نام سے بچہ بچہ واقف ھے مگر ان کے حالات سے بہت کم لوگ واقف ھیں - جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دھلی نے یہ رسالہ شائع کر کے بڑا کام کیا ھے - سید صاحب اپنے زمانے کے بہت بڑے مجدد اور مصلح ہوے ھیں - سب سے پہلے انھوں نے اسلامی ممالک کی ابتری اور انحطاط اور یورپی اقوام کی عیاریوں کو سمجھا اور اپنی ساری عمر ممالک اسلام کے اتحاد اور مخالفوں کے خطرے سے بچانے میں صرف کی - وہ نہ صرف جید عالم تھے بلکہ بہت اولوالعزم عالی حوصلہ صاف گو اور بیباک شخص تھے - استبداد کے سخت دشمن اور آزادی و جمہوریت کے عاشق تھے - ان کی تقریر میں جادو کا سا اثر تھا اور اسی طرح ان کی تحریر نہایت پر زور اور پر اثر ہوتی تھی - ایران ' مصر اور ترکی کے بیدار کرنے میں انھوں نے بڑی جد و جہد کی - اگرچہ وہ کہیں کامیاب نہ ہوے مگر جو بیج انھوں نے بویا وہ رائگاں نہ گیا - پروفیسر براؤن نے ان کی سیرت کے متعلق کس قدر سچ لکھا ھے کہ " یہ بزرگ شخص ایک زبردست سیاح اور عالم تھا اور باوجود اس کے کہ دولت دنیا میں سے فصیح زبان و قلم ' وسیع علم ' سیاسی فہم و فراست ' معلومات مختلفہ اور اسلام کے لئے (جس کے انحطاط کو وہ اپنے دل میں محسوس کرتے تھے) سچے عشق کے سوا اُن کے پاس اور کچھ نہ تھا ' تاھم یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ھے اور حرف بحرف صحیح ھے کہ انھوں نے بادشاھوں کے تخت و تاج ہلا دیے تھے ' اور مدبرین

یورپ کی بعض متفقہ تجاویز کو درہم برہم کردیا تھا ' انھوں نے اُن غیر معمولی قوتوں کو استعمال کیا جن کی جانب مشرق و مغرب کے سیاست دانوں میں سے کوئی شخص بھی ملتفت نہ ہوا تھا اور نہ کبھی ان سے فائدہ اٹھانے کا خیال کسی کے ذہن میں آیا "۔

اگرچہ اس سے قبل اُردو میں بعض مضامین مختلف رسالوں میں سید جمال الدین مرحوم کے متعلق شائع ہوئے لیکن ان کے حالات میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی - ہر مذہب وطن کو نیز ہر شخص کو جو اس زمانے کے حالات سے با خبر رہنا چاہتا ہے یہ کتاب پڑھنی چاہئے —

عربوں کا تمدن

(مصنفۂ ڈاکٹر جوزیف ہیل مترجمہ سید نزیر نیازی صاحب بی - اے (جامعۂ ملیہ) صفحات ۱۹۴ ' قیمت دو روپے مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی) —

یہ کتاب بہت دلچسپ اور مفید ہے - سید نزیر نیازی صاحب نے ڈاکٹر صلاح الدین خدا بخش کے انگریزی ترجمے سے اس کا اُردو ترجمہ کیا اور دوران ترجمہ میں اصلی کتاب بھی پیش نظر رہی ہے - اس مبحث پر اُردو میں بہت کم کتابیں ہیں - جرمن فاضل نے جس نظر سے اس مضمون پر بحث کی ہے وہ قابل داد ہے - گو یہ کتاب مکمل اور مفصل نہ ہو لیکن پڑھنے والا اس سے بہت کچھ مستفید ہوسکتا ہے اور اس کی نظر میں عربی تمدن کا پورا خاکہ آجاتا ہے - اس قسم کی کتابیں اس لئے بھی مفید ہیں کہ وہ اس قسم کے مضامین پر لکھنے کے لئے رہنمائی کا کام دیتی ہیں اور ان سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں - قابل مترجم نے آخر میں ایک ضمیمہ بھی شامل کردیا ہے جس میں کتاب کے بعض مضامین پر حواشی درج ہیں - ترجمہ بہت اچھا ہے —

ذکریٰ

(از خواجہ محمد عبدالحی فاروقی صاحب استاد تفسیر و ناظم دینیات جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی صفحات ۲۷۲ قیمت تین روپے) —

خواجہ معصود عبدالحی صاحب کی تفسیر قرآن کے لئے حصے شائع ہوچکے ہیں - یہ پارۂ عم کی تفسیر ہے - مولانا نے جو اصول اپنی تفسیر کا رکھا ہے اس سے عالم و عامی سب مستفید ہوسکتے ہیں اور اس ضمن میں بہت سے حقائق پر بھی بحث آ گئی ہے - اس زمانے کے لئے یہ تفسیر بہت قابل قدر ہے —

یورپ کا دستور حکومت حصۂ اول

(تالیف مولوی سید محمود شیر بی - اے ' بی - ایل
قیمت ۸ آنے - دارالاشاعت امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ) —

اس کتاب میں قابل مولف نے بیسویں صدی کی دستوری ترقیوں اور جرمنی ' فرانسی ' اٹلی اور روسی وغیرہ کے دستور حکومت کا حال بیان کیا ہے - اگرچہ کتاب مختصر ہے لیکن مفید ہے —

سلاطین معبر

مولفہ جناب حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب صفحات
۳۷ دفتر آل انڈیا مسلم ایجو کیشنل کانفرنس علی گڑھ) —

یہ کتاب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی فرمائش سے حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب نے عربی ' فارسی انگریزی کی مستند اور معتبر ماخذوں سے تالیف کی ہے - اس میں ساحل کارومنڈل کی فراموش شدہ اسلامی سلطنت کا تاریخی حال ہے - اگر چہ کتاب مختصر ہے مگر معلومات سے پر ہے اور بہت سی تاریخی کتابوں کا عطر ہے —

قوم پرست طالب علم

(مولفہ محمد عبدالغفار صاحب مدھولوی مدرس
مدرسہ جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی قیمت ۴ آنے) —

یہ چھوٹا سا ڈراما طالب علموں کے لئے اچھا ہے - محمد عبدالغفار صاحب میں ڈراما لکھنے کی صلاحیت معلوم ہوتی ہے اور امید ہے کہ آئندہ ایسے ڈرامے لکھیں گے جو مقبول بھی ہوں اور موجب اصلاح بھی ہوں - اس ڈرامے میں انھوں نے آج کل کی سیاسی اصلاح اور کش مکش کا ایک پہلو دکھایا ہے جو فرصت کے وقت پڑھنے کے لئے اچھا خاصا ہے —

القابلہ

(مولفہ جناب حکیم محمد یوسف صاحب نیر - صفحات ۴۲۴
قیمت دو روپئے - دفتر المسیح ' قرول باغ - دہلی)

حکیم محمد یوسف صاحب عالم و شاعر ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کے طبیب بھی ہیں - اس سے قبل فن طب پر اُن کی کئی کتابیں شایع ہوچکی ہیں - یہ کتاب " القابلہ " حال ہی میں دفترالمسیح سے چھپ کر شایع ہوئی ہے - اس مضمون پر اُردو زبان میں اس سے جامع اور بہتر کتاب اب تک نہیں لکھی گئی ' علاوہ فن کے بڑی خوبی حسن بیان کی ہے - تمام مضامین عاقلہ اور قابلہ کے باہم گفتگو میں ایسے موثر اور دلچسپ پیرائے میں بیان کردئے ہیں کہ فن سے ناواقف شخص بھی اسے شوق سے پڑھ سکتا ہے - حکیم صاحب نے طبقۂ نسواں پر بڑا احسان کیا ہے - معمولی پڑھی لکھی عورتیں بھی اسے پڑھ کر فائدہ حاصل کرسکتی ہیں اور بہت سی آفتوں سے بچ سکتی اور دوسروں کو بچاسکتی ہیں - غالباً اس خیال سے اس ضخیم کتاب کی قیمت بھی کم رکھی گئی ہے —

جدید انگلش ٹیچر

(از جناب صدیق الحسن خاں صاحب - صفحات ۲۷۶
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے - قمر برادرز شملہ)

عموماً بچوں کو انگریزی صرف نحو کا نصاب رٹایا جاتا ہے جس کی وجہ سے طالب علم کا نہ صرف وقت ضائع ہوتا ہے بلکہ اُس کی ترقی کرتی ہوی قوت دماغی کو بھی نقصان پہنچتا ہے - اس کے علاوہ وہ زبان کے قواعد سے کسی قسم کا عملی فائدہ بھی نہیں اُٹھا سکتا - اس قسم کی تعلیم نے انگریزی زبان میں اظہار خیالات کی قوت نہیں بڑہ سکتی ، صرف طالب علم کے حافظ پر بار ڈالا جاتا ہے —

ان حالات کو مدنظر رکھہ کر مولوی صدیق الحسن خاں صاحب نے جو طلبہ کی مشکلات اور کمزوریوں سے بخوبی واقف ہیں اُن کی اعانت و رھبری کی خاطر یہ کتاب تیار کی ہے جس کی حقیقت میں بڑی ضرورت تھی- اس میں آسان و دل آویز پیرایہ میں طلبہ کو انگریزی قواعد سے واقف کرانے کی کوشش کی گئی ہے - ترتیب کتاب سے واضح ہوتا ہے کہ قابل مصنف انگریزی قواعد کو اُصول فطرت کے مطابق سکھانا چاہتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس مقصد میں اُنہیں بڑی حدتک کامیابی ہوئی ہے —

ایک امر جو مصنف صاحب کی توجہ کا محتاج ہے یہ ہے کہ اگر بیان کے ختم پر تعریف بھی آسان الفاظ میں لکھدی جاے تو طلبہ سبق کے خلاصے سے پوری طرح واقف ہوجاتے، اسی طرح سے طالب علم نہ صرف مثالوں اور مشقوں سے واقف ہوتا بلکہ تعریف بھی اُس کے ذہن نشین ہوجاتی - اُمید ہے کہ قابل مصنف کی یہ پہلی کوشش باراور ہوگی اور اُس کی قدردانی اُن کی حوصلۂ افزائی کا باعث ہوگی —

لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے اور کتاب املا اور عام غلطیوں سے معرا ہے —

متفرق

کوهستان کانگڑہ کی دلفریب وادی —

یہ خوبصورت رسالہ نارتھ ویسٹرن ریلوے کی طرف سےشائع ہوا ہے - خوشی کی بات

ہے کہ ریلوے کی طرف سے اُردو میں ایسی خوشنما اور پاکیزہ کتاب شایع کی گئی ہے -
اس میں وادی کانگڑہ کے جغرافی ' معاشیاتی اور دیگر حالات ایسی اچھی اور ستھری
زبان میں لکھے ہیں کہ دل خواہ مخواہ وہاں کی سیروپر راغب ہونے لگتا ہے - کانگڑہ ویلی
ریلوے حال ہی میں کھلی ہے اور امید ہے کہ مقامات کی دلفریبی کی وجہ سے یہ لائن
آیندہ چل کر بہت مقبول ہوگی - کاغذ ' چھپای اور خط نہایت عمدہ ہے اور کتاب کئی
خوبصورت تصویروں سے آراستہ ہے - نارتھ ویسٹرن ریلوے کے ایجنٹ صاحب اور منتظمین
قابل مبارک باد ہیں —

اُردو کے جدید رسالہ

اردو کے رسالوں میں برابر ترقی ہو رہی ہے ' اگر ایک بند ہو تا ہے تو اس کی
جگہ دو نئے آ جا تے ہیں - اس سے معلوم ہو تا ہے کہ پڑھنے والوں کی تعداد اور ان کا
شوق بھی ترقی پر ہے - اس سہ ماہی میں ہمارے پاس یہ جدید رسالے پہنچے ہیں —

تاریخ

تاریخ اور آثار قدیمہ کا سہ ماہی رسالہ ہے - اس کے اڈیٹر جناب حکیم سید
شمس اللہ صاحب قادری ہیں جو تاریخ اور آثار قدیمہ کے بڑے ماہر ہیں اور ان

مباحث پر ان کی کئی کتابیں اور متعدد مضامین شایع ہو چکے ہیں - ہمارے ناظرین ان سے خوب واقف ہیں اور اس سے وہ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ رسالہ کس پایہ کا ہو گا - پہلا نمبر جو ہمارے سامنے ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قابل اڈیٹر اور ان کے معاونین نے رسالہ بڑی محنت سے مرتب کیا ہے اور بہت دلچسپ اور محققانہ مضامین اس کے لئے مہیا کئے گئے ہیں تاریخ کے شائقین کے لئے بہت اچھا تحفہ ہے - سالانہ چندہ پانچ روپئے ہے —

نوشیروان

یوں تو ملک کے ہر گوشے سے اُردو اخبارات اور رسالے جاری ہورہے ہیں لیکن اس رسالے پر کوئٹہ (بلوچستان) کا نام دیکھ کر تعجب ہوا اور خوشی بھی ہوئی - منشی بلدیو سہائے صحرائی سروری اُردو کے بہت دلدادہ اور بڑے سخن فہم اور سخن سنج ہیں یہ اُن کی سعی اور محنت کا نتیجہ ہے اور مسٹر این - بی منچر جی کی اعانت ان کے شامل حال ہے - مسٹر منچرجی کے والد کا نام نوشیروانجی تھا ، اس رعایت سے رسالہ کا یہ نام رکھا گیا ہے - پہلا پرچہ دیکھ کر جی خوش نہیں ہوا تھا مگر دوسرے نمبر نے اس کی تلافی کردی - امید کہ منشی صاحب کی تلاش اور جستجو اور محنت اسے اُردو کا ایک اچھا رسالہ بنا دیگی اور اُس علاقے میں تو اب بھی اس سے بہتر کوئی رسالہ نہیں قابل اڈیٹر کے شوق اور محنت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ دوسرے ہر نمبر میں انہوں نے ہندوستان کے قابل قدر ادیبوں اور شاعروں کا کلام مہیا کرلیا ہے - تقطیع بھی بڑی ہے - تصویریں بھی ہیں ، مضمون بھی اچھے ہیں ، امید ہے کہ چھپائی بھی آیندہ اس سے بہتر ہوجائے گی - سالانہ چندہ چار روپیہ —

میسر

یہ بھی نیا رسالہ ہے - لکھنؤ سے نکلا ہے - لکھنؤ کی سرزمین عامی رسالوں کے لئے

کچھ راس نہیں ہے - یا تو ایسے رسالے بند ہوجاتے ہیں یا اگر چلتے ہیں تو روتے جھینکتے اور سسکتے ہوے - یہ رسالہ حضرت ابوالعلاءالناطق مدیر اور حکیم اشفتہ معاون کے زیر ادارت انجمن معراج الادب کی جانب سے شایع ہونا شروع ہوا ہے - اس رسالے کا تعلق زیادہ تر اُردو شعر و سخن سے ہوگا اور اس میں صرف وہی کلام شایع ہوگا جو اصلی شاعری کا نمونہ ہوگا - رسالے کے مدیر صاحب کو اس زمانے کی شاعری اور مذاق سخن پر سخت اعتراض ہے اور اس لئے اس رسالے کا ایک مقصد اصلاح ذوق بھی ہوگا - خدا کرے وہ اس نیک مقصد میں کامیاب ہوں - سالانہ چندہ چار روپئے ---

---

جام جہاں نما

یہ ماہانہ رسالہ بھی لکھنؤ سے نکلتا ہے اور غالباً اسے یہ تیسرا سال ہے - خاصا ہے ' عام اہل لکھنؤ کے مذاق کے موافق ہے ' کوئی خاص یا امتیازی بات نہیں - شعر و سخن کی چاٹ اس میں بھی ہے - سید افقر موہانی وارثی صاحب اس کے اڈیٹر ہیں - سالانہ چندہ تین روپے ۸ آنے ہیں ---

---

مقنن

یہ ہفتہ وار قانونی رسالہ ہے جس کے اڈیٹر سید احمد احسن صاحب بی - اے ' ال ال - بی ' میر حسن الدین صاحب بی - اے ' ال ال - بی اور محمد عبدالرحمن صاحب رئیس ہیں اور حیدرآباد دکن سے شائع ہوتا ہے - اس کے پہلے حصے میں ایسے مضامین ہوتے ہیں جن کا تعلق علم قانون سے ہے ' دوسرے حصے میں حیدر آباد دکن کی عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) اور جوڈیشل کمیٹی کے

نظائر اور تیسرے حصے میں عدالت ہاے عالیہ ہند کے نظائر دیوانی و نظائر فوجداری درج ہیں —

رسالہ سلیقہ اور محنت سے مرتب کیا جاتا ہے اور قانون پیشہ اور قانون داں حضرات کے لئے بہت کار آمد ہے - سالانہ چندہ پندرہ روپئے علاوہ محصول ڈاک ہے —

مشاعرہ

یہ ماہانہ رسالہ بھی حیدر آباد دکن سے نکلا ہے - اس کا مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے ' تصریح کی حاجت نہیں - طرحی غزلیات اور دوسرے نظموں کے علاوہ نثر کے مضامین بھی ہوتے ہیں مگر ان کا تعلق بھی زیادہ تر شعر و شاعری ہی سے ہوتا ہے - حیدر آباد میں اب بھی بعض اوقات دھوم دھام سے مشاعرے ہوتے ہیں اور اہل سخن اور اہل ذوق ان میں شوق سے شریک ہوتے ہیں - اس رسالے کے لئے وہاں کافی مسالا مل سکتا ہے - سالانہ چندہ چار روپے ہے ' لیکن مقررہ طرح عنوان پر غزلیں اور نظمیں بھیجنے والوں سے سالانہ تین روپے —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

انجمن کے مطبوعات

(مخزن نکات)

یہ اُردو شعرا کا نایاب تذکرہ ہے ۔ مصنفہ شیخ محمد قیام الدین ' قائم ' چاندپوری۔ شروع میں مولوی عبدالحق صاحب بی - اے آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو کا ایک مقدمہ ہے جس میں اس تذکرے پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور آخر میں قائم کے کلام کا انتخاب بھی دیدیا ہے - قیمت فی جلد مجلد ڈیڑھ روپیہ —

(ذکر میر)

ہندوستان میں کون ایسا صاحب ذوق ہوگا جو اُردو کے خدائے سخن حضرت ' میر ' کے نام اور کلام سے نا آشنا ہو ان کے کلام کا پاکیزہ انتخاب عرصہ ہوا کہ انجمن نے شائع کیا تھا جو ملک میں بہت مقبول ہوا - اور کئی بار چھپ چکا ہے - اب خاص اہتمام سے میرصاحب کی یہ نادرۂ روزگار سوانح‌عمری طبع کی گئی ہے - جو خود انہیں کے پر سوز و گداز قلم کی تراوش ہے - جس میں انہوں نے اپنے حالات زندگی اور اس وقت کی فضا نیز آخری دور مغلیہ کی تصویر نہایت دل کش انداز سے کھینچی ہے - اور انجمن نے اپنے مخصوص و خوش نما ٹائپ میں چھاپی ہے - شروع میں جناب مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ معتمد انجمن کا مقدمہ بجائے خود قابل دید اور کتاب کی جان ہے - جلد خوب صورت حجم ۱۸۰ صفحے قیمت دو روپے —

(بزم مشاعرہ)

گذشتہ سال ماہ تیر (مئی وجون) میں عالی جناب مہاراجہ کشن پرشاد ' شاد ' مدظلہ العالی صدر اعظم دولت آصفیہ دکن نے اورنگ‌آباد میں شرف ورود فرمایا تھا - جناب معظم کی تشریف آوری پر اور دل چسپ ہنگاموں کے علاوہ ایک نہایت

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

پر تکلف ، دل فریب مشاعرہ بھی حضرت موصوف کی صدارت میں بمقام مقبرہ ہوا ۔ اس مشاعرے کا گلدستہ نہایت خوش نما ، نظر فریب دو رنگوں میں طبع کیا گیا ہے ۔ شروع میں جناب صدر مدظلہ کی پاکیزہ تصویر اور جناب مہدوی صدیقی کے قلم کا دل پذیر دیباچہ بھی ہے ۔ سر ورق بھی خوب صورت اور شاندار ہے ۔ آخر میں وہ قصائد بھی شامل کردیے گئے ہیں جو اورنگ آباد کالج میں پڑھے گئے تھے ۔ نفاست پسند ارباب ذوق کے لئے بہت تھوڑی تعداد میں یہ گلدستہ طبع ہوا ہے ۔ جلد منگوائیے قیمت آٹھ آنے —

—— (تاریخ اخلاق یورپ) ——

اس کتاب کے اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم و تبحر ۔ تحقیق وصداقت کا مرادف ہے ۔ یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن ۔ اصول اخلاق ۔ مذاہب و خیالات کا مرقع ہے ۔ مترجمۂ مولوی عبدالماجد صاحب بی ۔ اے ، جلد اول مجلد ۳ روپے جلد دوم مجلد دو روپے ، ۸ آنے —

—— (ہماری شاعری) ——

مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ، ایم ۔ اے پروفیسر لکھنؤیونیورسٹی نے رسالہ اردومیں شاعری پر ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جو عام طورپربہت پسند کیاگیا تھا اب رضوی صاحب نے اس میں بہت کچھ اضافہ کرکے کتابی صورت میں کردیا ہے ۔ اور انجمن ترقی اردونے اسے نہایت عمدہ طور پر پوری کتاب دو رنگوں میں (لیتھو میں) طبع کرائی ہے ۔ پورے کپڑے کی خوشنما جلد ہے ۔ حجم دو سو صفحے ، قیمت دو روپے—

—— (کلیات ولی) ——

ولی دکنی کے نام سے کون اُردو داں واقف نہ ہوگا ۔ اسے اردو شاعری کا باوا آدم کہتے ہیں اور یہی گویا ہماری شاعری کا قدیم اور ممتاز ترین علم بردار ہے ۔ اس کا کلام اس زمانے کی زبان اور شاعری کا بہترین اور کامل مرقع ہے —

یہ کلیات جناب ' احسن ' مارہروی نے نہایت محنت اور قابلیت سے مرتب کیا ہے ۔ اور انجمن ترقی اردو کے جدید ترین مطبوعات میں ہے ۔ اب تک ولی کے جو دیوان کہیں کہیں چھپے اور ملتے ہیں ۔ اکثر غلط اور نامکمل ہیں۔ یہ کلیات ۱۷-۱۸

ا لمشتہر ——————————

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکہ انگریزی میں ہیں)

قدیم ' قلمی ' نایاب نسخوں سے مقابلہ اور صحیح کرکے کئی سال کی لگا تار محنت وکاوش سے مرتب کیا گیا ہے —

اس قادرالکلام اُستاد کا کلیات تقریباً تمام اصناف سخن پر حاوی اور چار سو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے - شروع میں مرتب صاحب کا ایک بسیط اور قابل قدر مقدمہ ہے جس میں موصوف نے صاحب دیوان کے حالات و سوانح نہایت تحقیق اور کمال محنت سے فراہم کر کے جمع کئے ہیں اور کلام پر تبصرہ بھی فرمایا ہے —

کلیات کے آخر میں ایک بسیط فرہنگ ہے جس میں ان تمام قدیم ' متروک ' اجنبی ' ہندی ' دکنی الفاظ کا حل ہے جو کلام ولی میں جا بجا آئے ہیں - آخر میں پونے دو سو صفحے کا ایک ضمیمہ اختلاف نسخ ہے جو نہایت محنت و عرق ریزی سے مرتب کیا گیا ہے اس میں تمام نسخوں سے مقابلہ کرنے پر جو جو اختلاف نظر آیا ہے ' دیوان کی ہر غزل کے نمبر کا حوالہ دے کر بتا دیا ہے - یہ ضمیمہ ارباب فن و تحقیق کے لئے خاص طور سے قدر کی چیز ہے - اور کئی ماہ کی مسلسل محنت سے تیار ہوا ہے - ان تمام خوبیوں کے علاوہ انجمن نے اپنے مشہور عمدہ ٹائپ میں مضبوط سفید چکنے کاغذ پر طبع کیا ہے ' قابل دید اور اس لائق ہے کہ ہر لائبریری اور قدر دانان اُردو کے ہر کتب خانے میں اس کا ایک ایک نسخہ موجود رہے - حجم تقریباً آٹھ سو صفحات ' قیمت مجلد ۵ روپے غیر مجلد ۴ روپے —

—— (مثنوی خواب و خیال) ——

حضرت میر درد دہلوی (رح) کے چھوٹے بھائی میر اثر کی یہ لا جواب مثنوی نایاب تھی ' بہت کوششوں کے بعد بھی پتہ نہ چلتا تھا ' اُردو کی خوش نصیبی سے انجمن ترقی اُردو کو دستیاب ہو گئی ' اور اب خاص اہتمام کے ساتھ عمدہ ٹائپ میں اعلیٰ درجے کے کاغذ پر ' طبع کی گئی ہے ' جس پر انجمن کے فاضل معتمد جناب مولوی عبدالحق صاحب نے ایک زبردست ناقدانہ مقدمہ تحریر فرما کر اس مثنوی کے خصوصیات اور محاسن کو نمایاں کیا ہے - یہ نادر مثنوی آج تک نایید تھی ' تذکروں میں کہیں کہیں اس کا ذکر آ جاتا ہے ' حضرت میر درد کے اشعار اور کلام کے علاوہ اس میں مصنف کی غزلیں بھی جا بجا آئی ہیں ' جو قابل دید اور نہایت لطیف و پاکیزہ ہیں - یہ مثنوی اُردو میں ایک قابل قدر اضافہ اور انجمن کی طرف سے

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

قدردانان اُردو کی خدمت میں اس سال کا جدید علمی ہدیہ ہے' جلد بھی مضبوط عمدہ اور جدید طرز کی بنوائی گئی ہے - حجم دو سو صفحے سے زائد' قیمت مجلد ڈیڑھ روپیہ—

—— (انتخاب کلام میر) ——

ملک الشعرا میر تقی میر کے نام اور کلام سے کون قدر دان اُردو واقف نہیں ' یہ انھیں کے کلام کا بہترین انتخاب ہے - جو جناب مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو نے کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سارے کلیات کا عطر کھینچ لیا ہے ' یہ انتخاب ملک میں بہت مقبول ہو چکا ہے اور کئی یونیورسٹیوں نے اپنے نصاب تعلیم میں شامل کر لیا ہے —

مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اب دوسری بار انجمن ترقی اُردو پریس نے اپنے مشہور ' نفیس ٹائپ میں چھاپ کر شائع کیا ہے - کاغذ چکنا ' نہایت عمدہ' حجم دو سو صفحات سے زیادہ ' جلد نفیس اور مضبوط - شروع میں فاضل مرتب کا زبردست و دلچسپ مقدمہ ہے' قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے —

—— (قواعد اُردو) ——

یہ کتاب جناب معتمد صاحب انجمن ترقی اُردو کی بیش بہا تالیف ہے ' اور بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ زبان اُردو کے قواعد پر اب تک اس سے بہتر ' سہل ' جامع کتاب تصنیف نہیں ہوی - ملک میں بےحد پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی اور نہایت مقبول ہوی - جامعۂ عثمانیہ کے نصاب ایف اے میں داخل ہے - اب جناب مؤلف و مرتب کی بےحد کاوش اور غور سے نظر ثانی ' ترمیم و اضافہ کے بعد دوبارہ چھاپی گئی ہے- شروع میں اُردو زبان اور اس کے ادب پر لا جواب بسیط مقدمہ بجائے خود قابل دید ہے- انجمن نے اپنے پریس میں ' عمدہ ٹائپ میں چھپوائی ہے' کاغذ بہت عمدہ جلد نہایت نفیس اور مضبوط ' قیمت مجلد دو روپے ۸ آنے —

—— (جاپان اور اُس کا تعلیمی نظم و نسق) ——

سرکار نظام نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات ممالک محروسۂ سرکار عالی کو جاپان کے تعلیمی نظام کے مطالعے اور تحقیق کے لئے بھیجا تھا - نواب صاحب موصوف نے وہاں رہ کر اس عجیب و غریب ملک کے حالات اور خاص کر تعلیمی نظم و نسق کو

المشـــــــــــــــــــــــــــــتہر

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

نہایت غور اور تحقیق سے مطالعہ فرمایا - کتاب کے ابتدائی حصے میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دلچسپ اور فاضلانہ بحث کی ہے جو ہمارے اہل وطن کے لئے سبق آموز ہے - اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو جاپان پر اس طرز میں لکھی گئی ہے — ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھے جو علاوہ دلچسپ ہونے کے پر از معلومات بھی ہے - خاص کر ان لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے جو ملک کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں - حجم ۴۸۲ صفحے - قیمت فی جلد مجلد تین روپے —

—— (سرگذشت حیات (یا) آپ بیتی) ——

اس کتاب میں حیات کے آغاز اور اس کے نشو و نما کی داستان نہایت دلچسپ طرز پر بہت ہی سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے — حیات کی ابتدائی حالت سے لیکر اس کا ارتقا انسان تک پہنچایا گیا ہے اور تمام تاریخی مدارج کو اس سہل طریقے سے بتایا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سمجھ سکے اگرچہ جدید سے جدید علمی تحقیقات بھی اس میں آگئی ہے مگر بیان کی سلاست میں فرق نہیں آیا — یہ کتاب جدید معلومات سے لبریز ہے اور ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا لازم ہے (حجم ۳۰۰ صفحے) قیمت فی جلد مجلد ۲ روپے ۸ آنے —

—— (تذکرۂ شعرائے اُردو)

مولفۂ میر حسن دہلوی - میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں - اُن کی مثنوی ' بدر منیر ' کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ہی اُردو کی کسی کتاب کو نصیب ہوا ہو- یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف ہے - یہ کتاب بالکل نایاب تھی ' بڑی کوشش سے بہم پہنچا کر طبع کی گئی ہے - میر صاحب کا نام اس تذکرے کی کافی شہادت ہے - اس پر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے جو قابل پڑھنے کے ہے - قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ ۱۴ آنے غیر مجلد ایک روپیہ ۹ آنے —

المشـــــــــتہر

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

——(تاریخ تمدن)——

سر ٹامسن بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے - الف سے (ی) تک تمدن کے ہر مسئلے پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ہے - اس کے مطالعے سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے - حصۂ اول غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنے - مجلد دو روپے - حصہ دوم مجلد دو روپے —

——(مقدمات الطبیعات)——

یہ ترجمہ ہے مکر انگلستان کے مشہور سائنس داں حکیم هکسلے کی کتاب کا جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے - اس میں بظاہر فطرت کی بحث درج ہے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے - قیمت غیر مجلد ۲ روپے - مجلد ۲ روپے ۸ آنے —

——(القول الاظہر)——

امام ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف (فوزالاصغر) کا اُردو ترجمہ ہے - یہ کتاب فلسفۂ الہیین کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انہیں اصول کو منطبق کیا گیا ہے - قیمت غیر مجلد ۸ آنے - مجلد ایک روپیہ —

——(القمر)——

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ہوے ہیں ' ان سب کو جمع کردیا ہے - طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے - قیمت غیر مجلد ۱۰ آنے مجلد ایک روپیہ —

——(فلسفۂ تعلیم)——

ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلۂ تعلیم کی آخری کتاب ہے - غور و فکر کا بہترین کارنامہ - والدین و معلم کے لئے چراغ ہدایت - تربیت کے قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھہ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے - اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے - قیمت مجلد ۲ روپے غیر مجلد ایک روپیہ ۱۲ آنے —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں) —

—— (دریائے لطافت) ——

ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاءاللہ خاں کی تصنیف ہے - اُردو صرف ونحو اور محاورات اور الفاظ کی پہلی کتاب ہے ' اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں - قیمت مجلد ۲ روپے غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنے —

—— (طبقات الارض) ——

اس فن کی پہلی کتاب ہے - (۳۰۰) صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلم بند کئے ہیں - کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے - قیمت غیر مجلد ۲ روپے - مجلد دو روپے ۸ آنے —

—— (مشاہیر یونان و روما) ——

ترجمہ ہے - سیرت نگاری اور انشا پردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے - ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمے سے فیض حاصل کیا ہے - وطن پرستی اور بے نفسی عزم و جواں مردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے - قیمت جلد اول غیر مجلد ۳ روپے - مجلد ۴ روپے جلد دوم مجلد ۲ روپے ۸ آنے —

—— (اسباق النحو) ——

ملک کے ادیب کامل مولانا حمیدالدین صاحب بی - اے کی تالیف ہے - اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے - قیمت حصۂ اول غیر مجلد ۶ آنے - حصۂ دوم ۴ آنے —

—— (علم المعیشت) ——

اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم - اے نے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے - معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے - مبہم و مشکل مسائل کو پانی کردیا ہے ' اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں - اشتراکیت کا باب قابل دید ہے ' حجم ۸۸۵ صفحے ' قیمت مجلد ۵ روپے آٹھ آنے —

المشتہر ——————————————

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں) —

—— (تاریخ یونان) ——

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست شگفتگی کا نمونہ - اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے - ایف اے کلاس کے طلبا جو یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں ' اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے قیمت مجلد ۲ روپے —

—— (رسالۂ نباتات) ——

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے - علمی اصلاحات سے معرا - طلباے نباتات جس مسئلے کو انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اس رسالے میں مطالعہ کریں - قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے —

—— (دیباچۂ صحت) ——

اس کتاب میں مطالبات صحت پر مثلاً (ہوا ' پانی ' غذا لباس ' مکان وغیرہ) مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے - زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دلپذیر ہے ' ملک کی بہترین تصنیف ہے - اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا - حجم ایک ہزار صفحے - قیمت مجلد چار روپے —

—— (نکات الشعراء) ——

یہ اردو کا تذکرہ استادالشعر میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ہے - اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں - نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں - مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدرالصدور امور مذہبی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے - قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے —

—— (فلسفۂ جذبات) ——

کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے - جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہے - متعلمان نفسیات

المشتہر ———————————— مہتمم

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں) —

اسے مفید پائیں گے - قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے - غیر مجلد دو روپے —

—— (وضع اصطلاحات) ——

یہ کتاب ملک کے نامور انشا پرداز اور عالم مولوی وحیدالدین ' سلیم ' مرحوم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور فکر اور مطالعے کے بعد تالیف کی ہے بقول فاضل مؤلف " یہ بالکل نیا موضوع ہے - میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی زبان میں " - اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں - مخالف و موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی' مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے سابقوں اور لاحقوں - اُردو مصادر اور ان کے مشتقات - غرض سیکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آ گئی ہیں - اُردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان میں ان کی نظیر نہیں- لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کردی ہیں- اور ہمارے حوصلے بلند کردیے ہیں - اس سے پہلے ہم اُردو کو علمی زبان کہتے ہوے جھجکتے اور اس کی آئندہ ترقی کے متعلق دعویٰ کرتے ہوے ہچکچاتے تھے - مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا - اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے - تعداد صفحات (۳۰۵) قیمت مجلد تین روپے ۱۲ آنے —

—— (محاسن کلام غالب) ——

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا معرکۃ الآرا مضمون ہے - اُردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے- جو اس شان کی لکھی گئی ہے - یہ مضمون اُردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا - صاحب‌نظر قدر دانوں کے اصرار سے الگ بھی طبع کیا گیا ہے- قیمت‌مجلد ایک روپیہ

—— (ملل قدیمہ) ——

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے - اس میں بعض قدیم اقوام ' سلطنت کلدانی' آشوری ' بابل - بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت - عقائد - او صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کےساتھ دیے ہیں- اُردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس

المشتہر ——————————————

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں) —

سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہوسکیں اس لئے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے - حالات کی وضاحت کے لئے جا بجا تصویریں دی گئی ہیں - صفحہ ۲۸۴ قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے —

—— (بجلی کے کرشمے) ——

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی ' اے - نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعے کے بعد لکھی ہے - برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی گئی ہے - ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے ' کہاں سے آتی ہے ' کیا کام آسکتی ہے - یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے - اور لڑکوں لڑکیوں کے لئے بڑی مفید ہے - قیمت ایک روپیہ بارہ آنے —

—— (البیرونی) ——

مصنفۂ مولوی سید حسن برنی صاحب بی اے - اس کتاب میں علامۂ ابوریحان بیرونی کے سوانحی حالات ہیں اور ان کی مشہور و معروف تصنیف کتاب الہند اور دیگر تصانیف پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے - یہ کتاب انجمن ترقی اُردو میں باقی نہیں رہی تھی اب دوسرا ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی اور اضافۂ مضامین کے ساتھ نہایت عمدہ کاغذ پر چھپ کے تیار ہوا ہے - قیمت فی جلد مجلد دو روپے - غیر مجلد تین روپیہ —

—— (تاریخ ہند) ——

ہندوستان کی یہ تاریخ مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے محکمۂ تعلیمات سرکار نظام کی فرمایش پر لکھی ہے اور مڈل اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے - اس وقت تک کوئی اور مختصر تاریخ ہند اس نقطۂ نظر اور ایسی خوبی سے نہیں لکھی گئی ہے - تعلیمی حلقوں کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اسے بہت پسند کیا ہے - چھوٹے سائز کے ۲۸۴ صفحے - قیمت ایک روپیہ ایک آنہ —

المشتہر

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

—— (لغت اصطلاحات علمیہ) ——

جملہ اہم علوم کی اصطلاحوں کا ترجمہ ' جس میں حسب ذیل علوم داخل ہیں:

Astronomy, Botany, Economics, History, (Constitutional, Greece England, etc,) Logic, Algebra, Conics, Solid Geometry, Trigonometry, Differential Equations, Statics, Metaphysics, Psychology, Physics, Politi cal Science, Archaelogy, Biology -

کئی سال کی مسلسل محنت اور مختلف ماہرین لسان کی کاوش و کوشش کا نتیجہ ہے - مصنفین و مترجمین کے لئے نا گزیر ہے —

حجم ۵۳۸ صفحے - قیمت مجلد چھہ روپے

یہ بیش بہا کتابیں بھی انجمن ترقی اُردو اورنگ‌آباد دکن سے مل سکتی ہیں

—— (دیوان غالب جدید و قدیم) ——

یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بے حد انتظار تھا - اس میں مرزا غالب کا قدیم و جدید تمام کلام موجود ہے - مرزا صاحب کا قدیم کلام ملنے کی کسے توقع تھی - یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہاتھہ آ گیا اور ریاست بھوپال کی سرپرستی میں چھپ کر شائع ہوا ہے - مع مقدمۂ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم مجلد ۵ روپے غیر مجلد ۴ روپے (بلا مقدمہ مجلد ۳ روپے غیر مجلد دو روپے ۸ آنے) —

—— (حقیقت اسلام) ——

یہ کتاب جناب نواب سر امین جنگ بہادر کے' سی' آئی' ای' سی' ایس'

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

آئی' ایم' اے' بی' ایل' ایف' آر' ایس' چیف سکریٹری گورمنٹ نظام و صدرالسہام پیشی کی یہ نظیر تصنیف نوٹس آن اسلام کا با محاورہ اور سلیس ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھہ موجودہ خیالات سائنس سے اسلام کی تطبیق اور اس کی صداقت کا بیان کیا ہے۔ فاضل مصنف نے ان تمام مشکل مسائل کی حقیقت کو جن میں اکثر تعلیم یافتہ جوانوں یا غیر مسلموں کو شبہات واقع ہوتے ہیں' زمانہ حال کے ترقی یافتہ خیالات کی روشنی میں نہایت دلاویز طریقے اور حکیمانہ استدلال سے بیان کیا ہے جس سے مصنف ممدوح کے وسیع مطالعہ' فلسفیانہ طبیعت اور غور و خوض کا پتہ ملتا ہے —

کتاب بہت عمدہ کاغذ پر چھپی ہے۔ مجلد بارہ آنے میں مل سکتی ہے —

—(تاریخ زوال روما)—

یہ گبن کی مشہور تاریخ کے ابتدائی (۷) ابواب کا ترجمہ ہے۔ اصل کتاب اپنی خوبیوں کے اعتبار سے محتاج تعریف نہیں۔ قیمت فی جلد غیر مجلد سوا روپیہ —

—(تاریخ عرب)—

مصنفۂ موسیو سدیو فرانسیسی۔ عربوں کے متعلق یہ کتاب ان تمام تاریخوں کا نچوڑ ہے جو یورپ و ایشیا کے کتب خانوں کی زینت ہیں مسلمانوں کی ترقیوں او عربوں کے کمالات کا آئینہ ہے۔ ساتھہ ہی یورپ کے کذب وافترا کا بہترین جواب۔ قیمت مجلد چرمی ۷ روپے ۸ آنے —

—(یادگار غالب)—

یعنی مرزا اسد اللہ غالب دہلوی کے مفصل حالات زندگی اور ان کے اقسام نظم و نثر' اُردو فارسی پر تفصیلی ریویو اور انتخاب۔ مولفۂ شمس العلما مولانا الطاف حسین صاحب 'حالی' مرحوم۔ قیمت مجلد ۳ روپے —

—(شعر و شاعری)—

شمس العلما خواجہ الطاف حسین 'حالی' مرحوم کے اُردو دیوان کا لاجواب مقدمہ جس میں شعر و شاعری پر نقادانہ بحث کی گئی ہے۔ تنقیدی حیثیت سے اُردو زبان میں اب تک ایسا مضمون نہیں لکھا گیا ہے۔ قیمت مجلد ۲ روپے' غیر مجلد سوا روپیہ —

المشـــــــــتهر

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

——(موازنۂ انیس و دبیر)——

میر انیس کی شاعری پر تفصیلی ریویو اور میر انیس و مرزا دبیر کا موازنہ ۔ مولفۂ مولانا شبلی نعمانی' قیمت فی جلد مجلد چار روپے ۔ غیر مجلد تین روپے —

——(وکرم اُروسی)——

کالیداس کے مشہور ناٹک کا اُردو ترجمہ مع ایک بسیط مقدمے کے جس میں ہند و ڈرامے کی تاریخ اور نوعیت پر مفصل بحث کی گئی ہے مرتبۂ مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی - اے مرحوم - قیمت مجلد دو روپے - غیر مجلد تیرہ —

——(خطوط شبلی)——

علامۂ شبلی مرحوم کے یہ وہ لاجواب اور نادر خطوط ہیں جو موصوف نے بمبئی کی مشہور تعلیم یافتہ خواتین عطیہ بیگم صاحبہ فیضی اور زہرا بیگم صاحبہ فیضی کے نام وقتاً فوقتاً کمال اخلاص و محبت اور انداز خاص کے ساتھ لکھے تھے ۔ یہ جوہر پارے اردو میں مولانا کے کمال انشا پردازی کی نایاب یادگار ہیں ۔ طرز نگارش اس قدر لطیف اور پاکیزہ ہے کہ شروع کرکے ختم کئے بغیر کتاب کو چھوڑنا دشوار ہے ۔ شروع میں جناب مولوی عبدالحق صاحب' بی - اے معتمد انجمن ترقی اردو کا ایک نہایت لطیف و سخن گسترانہ مقدمہ بھی شامل ہے ' جس نے ان خطوط کے جذبات اخلاص و محبت اور نکات ادبی کو بے نقاب کردیا ہے - مرتبۂ مولوی محمد امین صاحب مارہروی و جناب قیصر بھوپالی ۔ قیمت ایک روپیہ —

——(دیوان غالب مطبوعۂ جرمنی)——

غالب کے کلام کی قدر اور جو مانگ ہے ہر صاحب ذوق جانتا ہے' ان کے دیوان کا ایک اڈیشن نفاست پسند طبائع کے لئے جرمنی کے مشہور کاویانی پریس میں جامعہ ملیہ نے چھپوایا تھا جو ہاتھوں ہاتھ نکل گیا - دوسری بار پھر اسی اہتمام و نفاست سے طبع ہوا ہے - ٹائپ' کاغذ' چھپائی' جلد' سائز ہر چیز دیدہ زیب و دلفریب ہے - قیمت چار روپیہ —

——(محشر خیال)——

یہ سید سجاد انصاری مرحوم وکیل بارہ بنکی کے چند دلکش ادبی و اصلاحی

(نوٹ) کل قیمتیں سکہ انگریزی میں ہیں --

مضامین اور نظموں کا مجموعہ ہے جو شرکت ادبیہ دہلی نے خاص اہتمام سے چھپوایا ہے - سجاد انصاری صاحب خوش فکر و خوش گفتار ادیب تھے ' ان کے مضامین میں خاص قدرت و ادبیت اور کلام میں خاص کیف اور بلند خیالی و جذبات نگاری ہوتی ہے - یہ مجموعہ مرحوم کی جوانمرگی کی یادگار ہے ' جس کو سید منظور حسین صاحب نے مرتب کیا ہے - لکھائی چھپائی بہت پاکیزہ ' سائز مختصر ' جلد نہایت نفیس' اوپر سنہری حروف میں کتاب کا نام بھی لکھا ہے - قیمت دوروپیہ آٹھہ آ نہ —

—— (چمن) ——

یہ نہایت چھوٹا سا حسین و جمیل مجموعہ اساتذہ اردو کے پاکیزہ کلام کا انتخاب ہے کارڈ سائز پر نہایت اعلیٰ طباعت و کتابت کے ساتھہ عید کے موقعہ پر دوست احباب کو پیش کرنے کے لئے بہترین ادبی تحفہ ہے - قیمت ۵ آ نے —

—— (دیوان حالی) ——

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی مرحوم کے قطعات غزلیات ' قصیدے ' مرثیے ' ترکیب بند ' رباعیاں ' تاریخیں اور متفرق اشعار قیمت تیرہ روپیہ —

—— (مٹر یکولیشن کا نصاب اردو) ——

مجلس نصاب اردو جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد دکن کی ہدایت کے مطابق مولانا مولوی عبدالحق صاحب بی - اے (علیگ) آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو نے مرتب کیا - قیمت دو روپے —

—— (معراج العا شقین) ——

حضرت مخدوم ابوالفتاح صدرالدین سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نواز (رح) کی تصنیف ہے - اس میں حضرت کے بعض مواعظ و ارشادات قدیم اردو یعنی دکنی اردو میں لکھے ہیں - مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کی تصحیح و ترتیب اور مقدمے کے ساتھہ چھپی ہے - قیمت ۲ آ نے —

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

———(وقائع عالمگیر)———

حضرت اورنگ زیب سلطان ہند عالمگیر کے وقائع زندگی جو خود ان کے مکاتیب اور مستند مورخین کی روایات پر مبنی ہیں - اور جن سے ان کے حقیقی کیریکٹر رواداری' عدل جوئی اور تشریع مذہبی کا کافی ثبوت ملتا ہے - مرتبہ چودھری نبی احمد صاحب سندیلوی مجلد ۲ روپے —

———(افغان بادشاہ)———

اعلیٰ حضرت غازی امان اللہ خاں کی عظیم الشان چشم دید داستان حیات اس کتاب لاجواب کو محمد حسین خاں بی - اے (علیگ) ڈائرکٹر جنرل پبلک انسٹرکشن افغانستان نے بڑی عرق ریزی سے مرتب کیا ہے' شائقین سیر و تاریخ کے لئے خصوصاً اور کافۂ مسلمین کو عموماً لازم ہے کہ اس کتاب کو غور سے مطالعہ فرماکر استفادہ کریں - قیمت فی جلد دو روپے آٹھ آنے —

———(پریم پچیسی)———

ملک کے مشہور انشا پرداز منشی پریم چند صاحب کے نہایت دلچسپ افسانوں کا مجموعہ - حصۂ اول ڈیڑہ روپیہ حصۂ دوم ڈیڑہ روپیہ —

———(عروس ادب)———

مولوی سید ناظرالحسن صاحب ہوش بلگرامی کے اخلاقی ادبی تاریخی اورسیاسی مضامین کا مجموعہ - حجم ۲۲۴ صفحہ - سایز ۲۹ × ۲۰ کاغذ عمدہ سفید ' لکھائی چھپائی بہت خوشنما - قیمت فی جلد دو روپے —

———(خیالات ارونگ)———

مشہور امریکن مصنف واشنگٹن ارونگ کے بعض دلچسپ مضامین کا با محاورہ اردو ترجمہ از مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا وکیل غازی آباد ضلع میرٹھ قیمت ۸ آنے —

المشـــــــــــــــــتہر

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

———(سیر المصنفین)———

جس میں نثاران اردو کے حالات زندگی اور اردو زبان کی عہد بعہد کی ترقی و تبدیلی کا ذکر کیا گیا ہے مصنفہ مولوی محمد یحیی صاحب تنہا بی - اے (علیگ) قیمت دو روپے —

———(مصنوعی بیوی)———

مشہور ہر دلعزیز مغربی ناولسٹ آر، ایچ، بول کے ایک نہایت دلچسپ انگریزی ناول "ہز میک بی لیو وائف" کا اردو ترجمہ از مولوی عباس حسین صاحب "لطفی" قیمت ۱۲ آنے —

———(خواتین انگورہ)———

مولفۂ ملا توحیدی صاحب - ترکی کی مشہور و معروف خواتین کے کارنامے - اس کتاب سے آپ کو معلوم ہوگا کہ موجودہ جد و جہد میں ترکی خواتین نے کس جوش اور قابلیت سے حصہ لیا ہے - قیمت ۱ روپیہ —

———(جہاں آرا بیگم)———

جہاں آرا بیگم بنت شاہجہان کی سوانح عمری جو نہایت مستند تاریخوں لکھی گئی ہے - مولفۂ مولوی ضیاالدین احمد برنی صاحب بی اے قیمت ۸ آنے —

(دار المصنفین اعظم گڑھ)

تاریخ فقہ	۴ روپیہ	شعر العجم مکمل ۵ حصے	۱۳ روپیہ
خلفاے راشدین	۳ روپیہ ۸ آنہ	الکلام	۲ روپیہ
مہاجرین	۴ روپیہ	اسوۂ صحابہ مکمل دو حصے	۸ روپیہ
سیرۃ النبی حصہ اول	۴ روپیہ	انقلاب الامم	۲ روپیہ
سیرۃ النبی حصہ دوم	۳ روپیہ ۸ آنہ	مکالمات برکلے	ڈیڑھ روپیہ
		سیرۃ النبی حصہ سوم	۶ روپیہ

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکہ انگریزی میں ہیں —

سیرالصحابیات	۲ روپیہ ۴ آنہ	تاریخ ہند قدیم	۱ روپیہ
روح الاجتماع	۲ روپیہ	(الناظر پریس ۔ لکھنؤ)	
ابن رشد	۲ روپیہ	فسانہ جرش	۱ روپیہ
گل رعنا	۵ روپیہ	مجموعہ قصائد مومن	۱۲ آنہ
سیرالانصار حصہ اول	۳ روپیہ ۸ آنہ	گوتم بدھ	۴ آنہ
سیرالانصار حصہ دوم	۳ روپیہ ۸ آنہ	مسالک النظر فی نبوت	
شعرالہند حصہ اول	۴ روپیہ	سود البشر	۴ آنہ
شعرالہند حصہ دوم	۴ روپیہ	حکایۃ لیلیٰ مجنوں	۴ آنہ
(جامعۂ ملیہ دہلی)		مقتل فریب مغربی محمل خالی	۴ آنہ
تاریخ نجد	۱ روپیہ	وکرم اروسی	۱ روپیہ ۸ ۔ آنہ
عربوں کا تمدن	۲ روپیہ ۸ آنہ	فلسفیانہ مضامین عبدالماجد صاحب	
تاریخ فلسفۂ اسلام	۲ روپیہ		۱ روپیہ ۸ ۔ آنہ
تاریخ الدولتین	۲ روپیہ	تاریخ عرب مجلد	۷ روپیہ ۸ آنہ
سیرۃ الرسول	ڈیڑھ روپیہ	موازنہ انیس و دبیر	۳ روپیہ
خلافت راشدہ	۲ روپیہ	مقدمہ شعر و شاعری	۱ روپیہ ۴ آنہ
خلافت بنی امیہ	ڈیڑھ روپیہ	اصول النسخ	۹ آنہ
خلافت عباسیہ	۲ روپیہ	مسلمانان اندلس	۱ روپیہ
خلافت عباسیۂ بغداد	۲ روپیہ	اسرار رنگون	۱ روپیہ
خلافت عباسیہ مصر	۲ روپیہ	خوان دعوت	۱ روپیہ
مبادی معاشیات	۱ روپیہ	مصنوعی شوہر	۲ آنہ
دنیا کے بسنے والے	۴ آنہ	الاحسان	۸ آنہ
قواعد عربی	۲ روپیہ	ارض نہرین	۴ آنہ
اسلامی تہذیب و قومی تعلیم	۴ آنہ	حیات نظامی	۴ آنہ
ترکوں کی کہانیاں	۴ آنہ	خطاب	۴ آنہ

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

میلاد نبوی	۴ آنہ	انتخاب زرین مجلد	۲ روپیہ
فریاد امت	۳ آنہ	قصائد ذوق	۲ روپیہ
(نظامی پریس بدایوں)		مراثی انیس جلد اول مجلد	۱۰ روپیہ
قاموس المشاہیر جلد اول	۲ روپیہ	مراثی انیس جلد دوم قسم دوم	۸ روپیہ
قاموس المشاہیر جلد دوم	۲ روپیہ	(تصانیف نورالہی و محمد عمر صاحبان)	
نکات غالب مجلد	۱ روپیہ	موجودہ لندن کے اسرار	۱ روپیہ ۴ آنہ
دیوان غالب مشرح مجلد	۲ روپیہ ۸ آنہ	ناٹک ساگر (یعنی دنیاے ڈراماکی تاریخ)	
دیوان جان صاحب مجلد	ڈیڑہ روپیہ	مجلد ۳ روپیہ غیر مجلد	۲ روپیہ ۸ آنے
دیوان درد	۱ روپیہ ۴ آنہ	نون ٹوپیاں	۸ آنہ
دیوان غالب (لائبریری ایڈیشن)	ڈیڑہ روپیہ	ظفر کی موت	۴ آنہ
خطوط سر سید قسم اول	۳ روپیہ	قزاق	۸ آنہ
خطوط سر سید قسم دوم	۲ روپیہ	بگڑے دل	۸ آنہ
لکھنو گرافی مجلد	۱ روپیہ ۸ آنہ		

المـــــــــــــــــــــــشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن
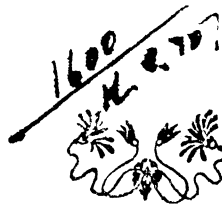
تاریخ

تاریخ و تراجم اور آثار و عقائق کا سہ ماہی رسالہ

(ایڈیٹر)

[حکیم سید شمس اللہ قادری]

(۱) رسالے کے حسب ذیل مقاصد ہوں گے - (۱) تاریخ و تراجم اور آثار و عقائق پر تحقیقی مضامین شائع کرنا (۲) تاریخ کے تاریک پہلو پر روشنی ڈالنا -
(۳) اسلاف کے آثار و عقائق سے اہل ملک کو واقف کرانا (۴) تبصروں کے ذریعے بلند پایہ تصنیفات سے اردو خواں طبقے کو روشناس کرانا —

(۲) اُن مباحث کی جانب زیادہ توجہ کی جائیگی جن کا تعلق اسلام اور ہندوستان و دکن سے ہو گا —

(۳) غیر زبانوں سے بہترین مضامین کے ترجمے یا ان کے اقتباس بھی شائع کئے جائیں گے —

(۴) رسالہ سال میں چار بار ' جنوری - اپریل - جولائی - اور اکتوبر میں شائع ہو گا -

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے علاوہ محصول ڈاک —

مضامین اور خریداری کی درخواستیں ایڈیٹر کے نام ذیل کے پتے پر آنا چاہئے -

---

حکیم سید شمس اللہ قادری ایڈیٹر رسالہ تاریخ - کوٹلہ اکبر جاہ - حیدرآباد دکن

رسالہ اُردو کے خریداروں کے ساتھہ خاص رعایت

رسالۂ اُردو کے خریداروں کو انجمن ترقی اردو کی شائع کی ہوی کتابیں فی روپیہ چار آنے کمی قیمت کے ساتھہ دی جائیں گی - امید ھے کہ ناظرین اس رعایت سے فائدہ اٹھائیں گے -

دیگر مقامات کی کتابیں جو بطور ایجنسی انجمن میں فروخت ھوتی ھیں اُن کی قیمتوں میں کوئی کمی نہیں کی جا سکتی -

---

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

اپنے ان مہربان معاونین کی فہرست مرتب کر رھی ھے جو اس بات کی عام اجازت دیدیں کہ آئندہ جو کتاب انجمن سے شائع ھو ' وہ بغیر ان سے دوبارہ دریافت کئے ' تیار ھوتے ھی ان کی خدمت میں بذریعہ وی پی روانہ کردی جایا کرے - امید ھے کہ قدر دانان زبان اردو ھمیں عام طور پر اس قسم کی اجازت دیدیں گے کہ ان کے اسماے گرامی اس فہرست میں درج کر لئے جائیں اور انجمن سے جو نئی کتاب شائع ھو ' فوراً بغیر دریافت کئے روانہ کر دی جایا کرے - یہ انجمن کی بہت بڑی مدد ھوگی اور آئندہ اسے نئی نئی کتابوں کے طبع کرنے میں بڑی سہولت ھوجاے گی - امید ھے کہ ھمارے وہ معاونین جو اردو کی ترقی کے دل سے بہی خواہ ھیں ' اس اعانت کے دینے میں دریغ نہ فرمائیں گے -

ان معاونین کی خدمت میں کل کتابیں جو آئندہ شائع ھوں گی وقتاً فوقتاً چوتھائی قیمت کم کر کے روانہ ھوں گی -

المشتہر
منیجر انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد (دکن)

اردو

جلد ۹ — جولائی سنہ ۱۹۲۹ع — حصہ ۳۵

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

سائنس

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماھی رسالہ

جس کا مقصد یہ ھے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جاے ۔ دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ھیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ھونگے ۔ ان کو کسی قدر تفصل سے بیان کیا جائے - ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کر نے کی کوشش کی جائے گی - اس سے اردو زبان کی ترقی اور اھل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ھے —

یہ بڑی خوشی کی بات ھے کہ ھندوستان کے سائنس دانوں کے علاوہ یورپ کے فضلا نے بھی اس رسالے میں مضمون لکھنا منظور فرمایا ھے - اس رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ھوا کریں گے —

سالانہ چندہ آٹھہ روپے سکۂ انگریزی (نو روپیہ چار آنے سکۂ عثمانیہ) —

امید ھے کہ اردو زبان کے بھی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے —

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

فہرست مضامین

خطبات گارساں دتاسی

ساتواں خطبہ ۴ دسمبر سنہ ۱۸۵۶ ع

(مترجمۂ جناب محمد عبدالباسط صاحب بی-اے)

(انگریزی سے اُردو میں مولوی سید وہاج الدین صاحب نے ترجمہ کیا)

حضرات! ہمارے گزشتہ جلسے کے انعقاد کے بعد، ہندوستان کی ایک ایسی سلطنت میں جہاں تمام تر ہندوستانی زبان ہی بولی جاتی ہے، ایک نہایت اہم واقعہ پیش آیا ہے - اور وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کی انگریزی حکومت نے سری رامچندرجی کی گدی کے مالک اودہ (قدیم اجودھیا) کے فرمانروا اعلیٰ حضرت واجد علی شاہ کو تخت سے اُتاردیا ہے- مجھے اس موقع پر اس خالص سیاسی انقلاب پر تبصرہ یا بحیثیت بادشاہ کے واجد علی کی اچھائیوں یا برائیوں سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ مجھے واجد علی شاہ کے ساتھہ اس وجہہ سے کسی قدر دلچسپی ہے کہ وہ ایک ممتاز ادیب اور بلند پایہ شاعر ہیں، ' اختر ' ان کا تخلص ہے، اور وہ آج کل ہندوستان کے آسمان شاعری کے چند درخشاں ستاروں میں سے ہیں، میں اس سے پہلے دوسرے موقعوں پر آپ سب کے سامنے ان کی تصنیفات اور نتائج افکار کا ذکر کرچکا ہوں - وہ اپنے خاندان کے شاہان سلف کی روایتوں کے حامل اور تخت و تاج کے ایک لائق وارث ہیں - ان کا سارا خاندان ہندوستانی ادبیات کا محسن تھا، اور اس کے اکثر افراد خود بھی ادبی ذوق رکھتے تھے - صفدر جنگ، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، جو ہندوستانی زبان کے شاعر تھے اور ' آصف ' تخلص کرتے تھے - ' سعادت علی خاں ' غازی الدین حیدر ' جو مشہور فارسی

لغت هفت قلزم کے مؤلف تھے ' اور جن کی کتاب کا یہ نام اس وجہہ سے ہوا کہ اس میں سات ابواب ہیں - نصیرالدین حیدر ' ناصرالدولہ ' اور خود واجد علی شاہ معزول کے والد امجد علی شاہ ' ان سب کے احسانات ہندوستانی ادبیات پر ہیں - واجد علی کو ایسی شریف اور با ہمت ملکہ کے بیٹے ہونے کا شرف حاصل ہے ' جس نے اگر چہ اپنی عمر میں کبھی سمندر نہ دیکھا تھا ' اور جہاز کا نام تک نہ سنا تھا لیکن محض اپنی نسل کے حقوق کی حفاظت کے لئے سات سمندر پار کا سفر کیا ' اور انگلستان پہنچ کر حکومت کے اس طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا - جس کا شکار ان کا بیٹا واجد علی بنایا گیا تھا —

اس تمہید کے بعد اب میں اپنے سالانہ خطبے کے موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہوں' یعنی ہندوستان کی اس ادبی تحریک کا بیان جو ہندوستانی زبان کے توسط سے ہوی ہے - میں نے کسی موقع پر ہندوستانی زبان کو فرانسیسی کی بہن * کہا ہے لیکن دراصل وہ اس کی خالہ زاد بہن ہے ' جس طرح اطالوی † زبان فرانسیسی کی خالہ زاد بہن ہے ' اور سنسکرت لاطینی کی بہن اور " ہندوستانی " یا " ہندی " یا " جدید ہندوستانی " کی ماں ہے —

حضرات ! لفظ " ہندوستانی " جیسا کہ میں متعدد بار آپ سے عرض کرچکا ہوں ' اسم جنس ہے اور اس سے ہندوستان کی اور خصوصاً ممالک مغربی و شمالی اور پنجاب کی زبان مرادلی جاتی ہے - اُردو جسے کسی قدر فارسی آمیز اور عربی آمیز ہندوستانی کہنا چاہئے' تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان ہے' اوران کی راجدھانیوں مثلاً دهلی ' آگرہ ' لکھنؤ اور حیدرآباد میں نہایت کھری اور خالص شکل میں بولی جاتی ہے - ہندی کو ہندوؤں کی ہندوستانی کہنا چاہئے اور یہ زیادہ تر سنسکرت

---

* ملاحظہ ہو میرے خطبۂ افتتاحیہ بابت سنہ ۱۸۵۴ع کا آخری پیراگراف' (مصنف)

† ملاحظہ ہو میکس مولر (Max Muller) کی کتاب (ہدایات دربارۂ تحصیل السنہ) Suggestions in learning the language کا صفحہ ۶ - (مصنف)

لفظوں سے ' خواہ خالص ہوں یا مخلوط ' بھری ہوی ہے - ہندی کے لئے عام طور پر دیوناگری رسم الخط استعمال کیا جاتا ہے - جس کے معنے ہیں دیوتاؤں کی تحریر اور جسے عرف عام میں محض ناگری کہتے ہیں - لیکن اس کے علاوہ ہندو دوسرے رسم الخط بھی استعمال کرتے ہیں مثلاً کایتھی اور صرافی ' جو دونوں کی دونوں ناگری کی بگڑی ہوی شکلیں ہیں - صرافی رسم الخط متھرا ' علیگڈہ اور مین پوری کے اضلاع کی ہندی تحریر میں استعمال کیا جاتا ہے - آگرے میں ناگری مدرسوں کی تعداد کایستھی سے کسی قدر زیادہ ہے ' لیکن دوسرے اضلاع میں زیادہ تر کایستھی ہی کا استعمال ہوتا ہے - کایستھی تحریر کو کایتھی ناگری بھی کہتے ہیں ' یعنی کایتھوں کی تحریر - کایتھ ' مقامی بولی میں کایستھ کو کہتے ہیں ' یعنی وہ ذیلی ذات جس میں محرر داخل ہیں ' مثلاً پٹواری وغیرہ - صرافی رسم الخط کا دوسرا نام مہاجنی ہے ' اور اس کا استعمال زیادہ تر مہاجنوں اور صرافوں میں ہوتا ہے - یہ رسم الخط صرف تجارتی بیوہار کے لئے مخصوص ہے اور ایک قسم کے آنکڑوں میں لکھا جاتا ہے جسے صرف جاننے والے ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن اگر کوی شخص ناگری حروف تہجی سے تھوڑا بہت واقف ہو تو اس کو صرافی کا حرف شناس بننے میں کچھ زیادہ دقت نہ ہوگی - ہاں ایک ایسے ہندیات * کے ماہر کو جس نے بجز خوش‌نما ' اور نوک پلک سے درست سنسکرت تحریر کے اور کچھ نہ پڑھا ہو ' دیہات کے بنئے † کی بد خط گھسیٹ پڑھنے میں البتہ بہت دقت ہوگی - اُردو کی خوش‌خط تحریروں میں عام طور پر " نستعلیق " کا استعمال ہوتا ہے جو دو لفظوں نسخ اور تعلیق سے مرکب ہے - معمولی اُردو تحریروں میں زیادہ تر " شکستہ " کا استعمال ہوتا ہے - خود اس لفظ " شکستہ " ہی سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ تحریر کتنی بے احتیاطی کے ساتھ ہوتی ہوگی -

---

* معلومات متعلق ہندوستان' جیسے مصریے مصریات (مترجم —)

† ملاحظہ ہو H. S. Reid. Report. Agra, pp 69 and 70 (مصنف)

سنہ ۱۸۳۴ ع میں ممالک مغربی و شمالی اور پنجاب میں ہندیوں کے ۳۷ مطبع اور ۳۳ رسالے وغیرہ تھے - رسالوں کی اشاعت ۲۲۱۶ * تک پہنچ گئی تھی- اخباروں اور رسالوں میں سب سے زیادہ مقبول اور کثیرالاشاعت لاہور کا اردو اخبار 'کوہ نور' تھا، لیکن اس کے خریداروں کی تعداد بھی ۳۴۹ سے زیادہ نہ تھی! اس کے اڈیٹر ہر سکھہ رائے تھے جو مطبع کوہ نور کے مالک بھی تھے - میں اس موقع پر اُن اخبارات کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو سال زیر بحث میں انگریزی زبان میں نکلتے تھے - اگر ان کی تعداد بھی دیسی زبانوں کے رسالے اور اخبارات میں شریک کردی جاے، تو اس سال سب کی اشاعت مل کر ایک لاکھہ باسٹھہ ہزار چار سو آٹھہ ہوجاتی ہے - یعنی پچھلے سال کی اشاعت سے اٹھاون ہزار سات سو ترانوے زیادہ ' اس لئے کہ پچھلے سال کی تعداد صرف ایک لاکھہ تین ہزار چھہ سو پندرہ تھی† — ۱

جن مطبعوں کا میں نے ذکر کیا ہے، ان میں سال زیر بحث کے اندر اخباروں اور رسالوں کے علاوہ دو سو سات کتابیں مشرقی زبانوں میں چھپ چکی ہیں - سنہ ۱۸۵۵ ع کے متعلق میرے پاس صحیح اعداد موجود نہیں ہیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ پچھلے سالوں کی طرح اس سال بھی کتابوں کی اچھی خاصی تعداد شائع ہوی ہے - غالباً ان کتابوں میں انگریزی زبان کی خالص ادبی تصانیف کے ترجمے بھی شامل ہیں - انگریزی زبان کی ادبی تصانیف کے جو ترجمے آئندہ کئے جائیں گے، وہ مستحق تعریف ضرور ہوں گے، لیکن اس شرط پر کہ وہ کوئی ایسی ترمیم یا اصلاح نہ کریں جس سے اردو ادبیات کی خصوصیت میں کوئی تبدیلی

---

* (مصنف) Allen's Indian mail' No of August 16th 1836. ملاحظہ ہو

† Alliens Indian Mail' 31st July 1856. (مصنف)

یا کبھی واقع ہوجاے، بقول ملٹن ''اتنے زیادہ نفس مذاق نہ بنو کہ غیر یقینی برائیوں کا فیشن ہوجاے'' —

چند ہفتے ہوے، مسٹر فرانسیس تے لر (Francis Taylor) نے جو دہلی کے ایک دیسی کالج کے پرنسپل ہیں مجھے ان ہندوستانی تصانیف کی ایک فہرست بھیجی ہے جو حال میں سلطنت مغلیہ کی راجدھانی (دلی) میں شائع کوئی ہیں - اس فہرست میں چند ایسی کتابوں کا بھی ذکر ہے جو میں نے اب تک آپ حضرات‌کو نہیں بتائی ہیں - یہ کتابیں اردو ادب کے لئے ایک قابل قدر اضافے کا حکم رکھتی ہیں - آگرہ گورنمنٹ نے بھی ادارۂ فرانسہ (Institute of France) کو ایک سو پچھتر کتابوں کا ایک ذخیرہ تحفتاً بھیجا ہے، اور اس میں بھی مجھے چند نئی کتابیں نظر آئی ہیں - یہ ذخیرہ میرے قابل فخر احباب مسٹر ولیم میور (William Muir) معتمد حکومت ممالک مغربی و شمالی ہند، اور مسٹر ایچ - ایس - ریڈ (H. S. Reid) ناظم تعلیمات ممالک مغربی و شمالی کے توسط سے وصول ہوا ہے - یہ دونوں حضرات ہندوستانی ادبیات کے جو ایک نہ ایک دن ہندوستان میں سنسکرت اور فارسی ادبیات کی جگہ لے کر رہے گا، بڑے سرگرم معاون اور سرپرست ہیں - اگرچہ ان کتابوں کو انگریزی حکومت نے دیسی کالجوں اور مدرسوں کے نصاب میں شریک کرنے کی غرض سے شائع کیا ہے، لیکن یہ یورپی حضرات اور خصوصیت کے ساتھ سیول اور فوجی محکموں کے اعلیٰ افسروں کے لئے بھی بہت مفید ہیں، جن کے لئے بنگال جیسے صوبے میں رہ کر بھی جہاں کے اکثر اضلاع میں بنگالی بولی جاتی ہے، ہندوستانی زبان سے واقف ہونا ضروری ہے - اس لئے کہ یہ زبان (ہندوستانی) نہ صرف بنگال کے اکثر مقامات میں بولی جاتی ہے بلکہ کلکتہ، نیز صوبۂ بنگال کے دوسرے شہروں* کی عدالتوں میں صرف یہی زبان

---

* H. H. Wilson. Glossary of Indian Terms, Preface P. 20.

استعمال ہوتی ہے —

حضرات! جن دو فہرستوں کا میں نے ابھی آپ کے سامنے ذکر کیا ہے، اب ان میں سے میں ایک نئے تذکرے کا حال آپ کو سناتا ہوں۔ اس تذکرے کا نام "گلستان سخن" ہے، اور اس کے مصنف مرزا قادر بخش المتخلص بہ 'صابر' ہیں۔ جو خاندان شاہی کے ایک شہزادے مرزا مکرم بخت کے لڑکے ہیں - اس خاندان کا ایک سربرآوردہ شخص سراج الدین* اب تک شاہ بلکہ بادشاہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ صابر مولوی امام بخش 'صہبائی' کے شاگرد ہیں، جو آج کل کے اعلیٰ درجے کے ہندوستانی مصنفین میں سے ہیں —

شعر کا شوق آج تک ہندوستانیوں میں بدستور باقی چلا آتا ہے، لیکن اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا ہے - ارسطو اپنی کتاب شعریات، باب نہم میں لکھتا ہے کہ "شاعری، بمقابلہ تاریخ کے کہیں زیادہ فلسفیانہ اور سبق آموز ہوتی ہے" لیکن جو فہرستیں اس وقت میرے پیش نظر ہیں ان میں، نظم کی بہت کم نئی کتابیں نظر آتی ہیں - یعنی ایک تو " گیان چالیا " (چالیس اقوال) جو ہندی دوہوں کی شکل میں ہے اور پنڈت شری لال کی لکھی ہوئی ہے جو کئی مفید کتابوں کے مصنف ہیں، اور دوسری "پشپ باٹک" (گلستان) جو گلستان کے باب ہشتم دربارۂ سیرت بادشاہاں کا ترجمہ ہے اور بنسی دھر کا کیا ہوا ہے - یہ کتاب آگرے میں طبع ہوئی ہے، اور اشاعت اول میں تین ہزار نسخے چھاپے گئے ہیں - ایک اور مصنف قمرالدین نامی نے "گلستان اردو" کے نام سے گلستان کی تلخیص کی ہے اور ساتھ ساتھ فارسی عبارت بھی دے دی ہے - انھوں نے بوستان کے اقتباسات کا بھی اسی طرح ترجمہ کیا ہے - ان کا ترجمہ نہایت فصیح اور صحیح ہے —

---

* یعنی ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ۱۲ مترجم

ان فلسفیانہ اور اخلاقی کتابوں میں جو حال میں ممالک مغربی و شمالی میں چھپی ہیں، سب سے زیادہ قابل ذکر " صفات رب العالمین " مصنفۂ بابو شری داس ہے - ان مصنف کا نام اگرچہ ہندوؤں کا سا ہے اور اس کے معنی " لکشمی کے غلام " کے ہیں، لیکن وہ در اصل عیسائی ہیں اور جن چند ہندوستانی عیسائی مصنفین کا ذکر میں نے ابھی کچھ زمانے * اُدھر آپ سے کیا تھا، ان میں ان کے نام کا بھی اضافہ کر لیا چاہئے --

ایک اور قابل ذکر کتاب ' بھوج پربند سا ' ہے یعنی بھوج کی کہاوتوں کا انتخاب - اس پر بنسی دھر نے حاشیہ بھی لکھا ہے - آپ سب واقف ہیں کہ بھوج، جسے ہندوستان کا سلیمان کہنا چاہئے، مالوے کا ایک مشہور راجہ تھا - اس نے پانچویں صدی میں اجین میں حکومت کی، اور ہندوستانی تصنیفات میں اس کا ذکر اکثر آتا ہے —

' بدھی و دیودیت ' (کتاب دربارۂ علم عقل) ایک ہندی کتاب ہے، اور اس میں تعلیم و تربیت کے فوائد کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے -

' شکھا منجری ' (گلدستۂ معلومات) یہ چند ' اقتباسات کا ہندی ترجمہ ہے جو ایچ - سی ' ٹرنر (H. C. Turner) نے ٹاڈ (Tod) کی کتاب "Hints on Self improvement" سے لئے ہیں - ہندی ترجمہ بنسی دھر کا کیا ہوا ہے —

میں اس موقع پر ان اخلاقی قصوں کا بیان بھی مناسب سمجھتا ہوں جو حال میں لکھے گئے ہیں - مثلاً ' فرخ آباد کی کہانی ' ' سراج پور کی کہانی ' اور ' بدھ پھل و دیا ' (درخت عقل' کے ' پھل) - یہ آخری کتاب جو پنڈت کشن دت ' اسسٹنٹ پروفیسر سنٹرل اسکول ' آگرہ کی تصنیف ہے ' ایک اردو کتاب ' کبودھی

---

* Hindustani Authors and their Works P. 20. and P. 58 of this Volume.

سبودھی ' کا ھندی ترجمہ ھے ' اس کتاب کا ذکر میں پچھلے سال کر چکا ھوں —

تاریخی کتابوں میں ' جن کی تعداد میری پیش نظر فہرستوں میں سب سے زیادہ ھے ' مجھے ' میر خواند ' کی مشہور کتاب ' روضۃ الصفا '' کا اردو ترجمہ نظر آتا ھے - اس کتاب میں نہایت قدیم زمانے سے ایکر مصنف کے زمانے یعنی سولھویں صدی عیسوی تک کی ایرانی تاریخ بیان کی گئی ھے —

ایک اور کتاب جو ایک مسلمان عالم مولوی عبیداللہ ابومسلم کی تصنیف ھے ' ' تحفۃ الہند ' ھے - اس میں ھندوؤں کے مذھب کی تشریح کی گئی ھے - یہ جاننا خالی از دلچسپی نہ ھو گا کہ مسلمان ھندو عقائد کی تشریح کس طرح کرتے ھیں - وہ اگرچہ ان کے عقائد کی شکل کو بالکل نہیں بدلتے ' لیکن ان کو بہت کامیابی کے ساتھہ اپنے ذاتی عقائد میں ضم کر دیتے ھیں - میں تاریخی سلسلے کی دو اور کتابوں کا بھی ذکر کرنا چاھتا ھوں - ان میں سے ایک تو ' تذکرۃ المشایخ ' ھے ' جس کے مصنف سداسکھہ لال ھیں - یہ کتاب سوانح سے تعلق رکھتی ھے ' اور انگریزی سے ترجمہ کی گئی ھے - دوسری کتاب ولسن کی Manual of Ancient History کا اردو ترجمہ ھے جو تاریخ عالم کے نام سے کیا گیا ھے - اس کتاب کا ایک ھندی ترجمہ بھی ' جگت درتانت ' (تاریخ عالم) کے نام سے شائع ھوا ھے —

جدید مطبوعات میں ' اخلاقی تصانیف کا حصہ بھی اھم ھے - میں سب سے پہلے ' چھندو دی پکا ' (عروض کا چراغ) کا ذکر کروں گا - یہ رسالہ ھندی عروض پر ھے ' اور سنہ ۱۸۵۴ ع میں آگرے میں چھپا ھے - اب تک ھندی زبان کے عروض سے کوئی واقف بھی نہ تھا ' اور جس طرح اردو عروض فارسی عروض کی کسی قدر بدلی ھوئی شکل ھے - اسی طرح ھندی عروض ' تھوڑے سے اختلاف کے ساتھہ ' بالکل سنسکرت عروض کی طرح ھے - لیکن اس موضوع (ھندی عروض) پر ایک رسالے کی پھر بھی ضرورت تھی ' اور بنسی دھر نے اس کمی کو پورا کر دیا ھے —

صرف و نحو کی ان کتابوں کا ذکر جو حال ھی میں ھندی اور اردو دونوں زبانوں

میں شائع ہوئی ہیں ' طوالت سے خالی نہ ہوگا - یہ قواعد جتنے اردو اور ہندی سے متعلق ہیں ' اتنے ہی فارسی اور سنسکرت سے ' پھر بھی مجھے امید ہے کہ اگر یورپی حضرات انہیں پڑھیں گے تو انہیں ان سے کئی نئی باتیں حاصل ہوں گی :—

مذکورۂ بالا کتب کے بعد انشا کی کتابوں کا نمبر ہے - ان میں حسب ذیل کتابیں نظر آتی ہیں:—

پتر مالی کا (پتیوں کا ہار) مصنفۂ شری لال ' ہندی زبان میں ؛

' انشاے خردا فروز ' مصنفۂ قمرالدین ' اردو میں - اس کتاب کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں ' اور ہزاروں نسخے فروخت ہو چکے ہیں—

انشاے خلیفہ' یہ فارسی کتاب 'انشاے شاہ محمد' کا اردو خلاصہ ہے' فارسی عبارت بھی ساتھ ساتھ دی گئی ہے - انشاے شاہ محمد' ہندوستان میں بہت مستند مانی جاتی ہے - اِس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ممالک مغربی و شمالی کے فاضل ناظم تعلیمات مسٹر رید نے جب سنہ ۱۸۵۳ - ۱۸۵۴ ء میں دیہی مدارس کا دورہ کیا تو انہیں تین سو تینتالیس مدرسوں کے طلبا کے ہاتھوں میں یہی کتاب نظر آئی —

ایک اور کتاب ' سدھ درپن ' (پاکی کا آئینہ) ہے - یہ ہندوستانی زبان میں ہے اور اس میں آداب و اخلاق کے متعلق ہندوؤں کے نقطۂ خیال کا بیان کیا گیا ہے - اس کے مصنف سیٹھہ بدھی چند نارائن انسپکٹر مدارس متھرا ' ہیں - یہ صاحب کئی کتابوں کے مصنف ہیں —

' بدیاانکر ' ہندی زبان میں شری لال کی تصنیف ہے - اسی کو بنسی دھر نے ' حقائق الموجودات ' کے نام سے اردو کا جامہ پہنایا ہے - اس میں موجودات عالم' ستارے' نظام شمسی' حرارت' روشنی' کرۂ ہوا ' کہر' بادل' دنیاے حیوانات' بناتات معدنیات وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے —

اب میرا فرض ہے کہ فن زراعت پر جو چند کتابیں تصنیف ہوی ہیں ' ان کا

بھی ذکر کروں- ان کا مطالعہ ہماری زراعتی انجمنوں کے لئے یقیناً پر از معلومات ہوگا - یہ کتابیں حسب ذیل ہیں :—

" کھیت کرن " اس کے مصنف کالی رائے ڈپٹی کلکٹر فتح گڈھ ہیں - یہ آج کل کے ایک مشہور مصنف ہیں - کتاب ہندی میں ہے اور اس میں ممالک مغربی و شمالی کے ہندوستانی کاشتکاروں کے دستور اور طریقوں کا حال درج ہے - یہ رسالہ آگرہ اور دہلی دونوں جگہ کئی کئی بار اُردو اور ہندی میں چھپ چکا ہے - اس میں مختلف قسموں کی مٹی، طرح طرح کے اوزاروں اور آب پاشی کے مختلف طریقوں کا بیان کیا گیا ہے - نیز تحصیل مالگذاری کے طریقوں کا حال اور زائد تحصیل کے متعلق چارہ جوئی کرنے کی ہدایتیں بھی کی گئی ہیں - اس رسالے میں نقشے بھی ہیں اور اصطلاحیں فارسی اور دیوناگری دونوں تحریروں میں دی گئی ہیں —

" کسان اپدیش " - اس کے مصنف بنسی دھر ہیں - کتاب ہندی میں ہے ' اور اس میں یہی آبادی، ملکیت کے کھاتوں ' نیز پٹواریوں کے سالانہ حساب وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے - میں سمجھتا ہوں کہ یہ وہی کتاب ہے جو موہن لال اور روشن علی کی متفقہ کوشش سے اردو میں ' " پند نامہ کاشتکاراں " کے نام سے چھپ چکی ہے- یہ دونوں حضرات تعلیم یافتہ ' اور آج کل کے ممتاز اہل قلم ہیں ' اس کتاب کا ایک فارسی ' اردو اڈیشن بھی ہے —

اگرچہ مجھے اس کا احساس ہے کہ اختصار کی بہت کچھ کوشش کے باوجود بھی اسمائے کتب کی فہرست بہت طویل ہو گئی ہے ' لیکن میں اس میں ایک کتاب کے اضافے کی جسارت اور کروں گا - اور وہ میری کتاب " ہندوستانی زبان کے مصنفین کا تذکرہ " * کا اردو ترجمہ ہے ' یہ ابھی حال ہی میں دلی

---

* مطبوعہ Journal I Institute بابتہ اکتوبر سنہ ۱۸۵۵ ع - ۱۲ مصنف

سے شائع ہوا ہے اور اس کے مترجم محمد ذکاء اللہ ہیں - ابھی تین دن ہوے اس ترجمے کی چند جلدیں مجھے وصول ہوئی ہیں - مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے اور مجھے یہ دیکھہ کر بہت خوشی ہوئی کہ دلکش ہندوستانی زبان پر میری یہ ادنیٰ درجہ کی تصنیف خود ہندوستانیوں میں مقبول ہوئی - میری تصنیف کے ہندوستانی زبان میں ترجمہ کئے جانے کا یہ پہلا موقع نہیں ہے، چند سال پہلے میری ایک اور کتاب "تاریخ ادبیات ہندوستان" (History of Hindustani Literature) کا " طبقات شعراے ہند" کے نام سے اردو ترجمہ ہو چکا ہے —

دیسی مدارس کے لئے جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ بہ یک وقت ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شایع ہوئی ہیں تاکہ ہندو اور مسلمان دونوں ایکساں طور پر ان سے مستفید ہوسکیں - اکثر یہ فارسی زبان میں بھی شایع ہوئی ہیں، جسے ہندوستانی مسلمانوں کی لاطینی سمجھنا چاہئیے، اور جسے مدارس میں (اور ہندووں کے مدارس میں بھی) اردو کے ساتھہ ساتھہ سکھایا جاتا ہے، اصلیت یہ ہے کہ اردو سیکھنے کے لئے فارسی زبان سے واقف ہونا ناگزیر ہے —

حضرات، میں نے آپ کو ان مذہبی کتابوں کا حال نہیں سنایا ہے جو سرگرم مبلغین دیسیوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے شایع کرتے رہتے ہیں - ایسی کتابوں میں عہدنامہ قدیم اور خصوصیت کے ساتھہ عہد نامہ جدید کے ترجمے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں - چاہے ان مقدس کتابوں کو پڑھ کر بہت کم ہندوستانیوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا ہو تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن لوگوں نے انھیں پڑھا ہے ان کی زندگی پہلے سے بہتر اور زیادہ خوشی کی ضرور ہوگئی ہے، کیوں کہ بقول ینگ (Young) —

" کش مکش حیات سے گوشہ نشین ہونے کے بعد انجیل

پڑھو اور خوش رہو اس میں ایسے حقائق کی کثرت ہے جن سے؛ زندگی کا سکون بدرجہ اُتم حاصل ہوتا ہے۔ اس کے مقدس صفحے کو پڑھو، اور اس کا احترام کرو، وہ ایک ایسا صفحہ ہے جہاں " ابدیت " کی فتح نظر آتی ہے، ویسا ایک صفحہ ساری مخلوقات مل کر بھی کوشش کرے تب بھی پیدا نہیں کرسکتی۔ اور زبردست سی زبردست آگ بھی اسے برباد نہیں کر سکتی " —

دکھنی مرثیے ایڈنبرا میں

(پہلی قسط)

از

(جناب مولوی سید محی الدین قادری صاحب)

[اردو ادب پر غور کرنے والوں کو یہ خبر خوش کئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ سر زمین اسکاٹ لینڈ کے قدیم اور خوبصورت دارالحکومت ایڈنبرا میں اس زبان کے چند مخطوطے بھی محفوظ ہیں، جن میں سے دو تین ضرور قابل قدر ہیں کیونکہ اُن کی وجہ سے اردو زبان کا ایک اہم دور ایک حد تک روشنی میں آجاتا ہے -

ان قابل ذکر مخطوطوں میں سے فی الحال دکھنی مرثیوں کے متعلق سرسری معلومات کی پہلی قسط پیش کی جاتی ہے تاکہ اُردو کی تحقیقات کرنے والے اُن سے نا واقف نہ رہیں -

کتب خانۂ ایڈنبرا یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقی کے کتلاگ میں "مراثی هاشم علی" کے عنوان کے تحت ان کی دو جلدوں کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن در اصل ان میں سے ایک تو ہاشم علی کے تقریباً ڈھائی سو مرثیوں کا مجموعہ ہے، جس کو مصنف نے "دیوان حسینی" کے نام سے موسوم کیا ہے، اور جس کے متعلق چند معلومات اس مضمون میں پیش کی جائیں گی - اور دوسری جلد ایک "بیاض" ہے جس میں قریب اسی (۸۰) شاعروں کے تین سو مرثیے ہیں - افسوس ہے کہ یہ بیاض ابتدائی اور آخری صفحوں کے لحاظ سے نامکمل ہے - یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ

حقیقت میں اس کا کیا حجم تھا - اور اس وقت اس میں اول اور آخر سے کتنے کتنے صفحے غائب ھیں -

اس بیاض پر تفصیل سے کچھہ لکھنے کے لئے خاص فرصت درکار ھے۔ تاھم اس میں جن جن شاعروں کے مرثیے موجود ھیں ان کی میں نے حروف تہجی کے لحاظ سے ایک فہرست ترتیب دے لی ھے جو اس مضمون کے ضمیمہ کے طور پر پیش کی جاتی ھے تاکہ اھل تحقیق و تفتیش کو فی الحال کچھہ معلومات حاصل ھوجائیں - اس کے علاوہ خود اس بیاض کی جو تفصیلی فہرست تیار کی گئی ھے وہ کسی دوسری قسط کے ساتھہ پیش کی جاے گی - اُس کی مدد سے آئندہ تحقیق کرنے والے' بیاض میں خاص خاص شاعروں اور مرثیوں کا صحیح سلسلۂ تاخر و تقدم معلوم کرکے' اُن کے زمانے وغیرہ کے متعلق کوئی پتے چلاسکیں گے -

چونکہ ان چھٹیوں سے پہلے اس مضمون کا ختم کردینا ضروری تھا اس لئے جو کچھہ لکھا گیا ھے بالکل رواروی اور جلدی کا نتیجہ ھے اور اس کے علاوہ چونکہ اس مضمون کا سارا مواد صرف مرثیوں کے زیر نظر دو جلدوں اور میری موجودہ یاد پر مبنی ھے اس لئے میرا خیال ھے کہ اکثر جگہ مجھے بہت ھی اختصار سے کام لینا پڑا ھے -

سید محی الدین قادری

کتب خانہ ایڈنبرا یونیورسٹی
۶ جنوری سنہ ۱۹۲۹ ء

دکنی مرثیوں کی ابتدا کے متعلق فی الحال کوئی تحقیقی بات نہیں کہی جاسکتی - لیکن اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ وھاں بہت قدیم زمانے ھی سے مرثیہ گوئی کے آغاز ھوچکا ھوگا ' کیونکہ بیجاپور اور گولکنڈا دونوں حکومتیں تقریباً شروع ھی سے شیعہ مذھب کی پیرو تھیں -

ہمارے زیر نظر مخطوطوں کو اردو مرثیہ‌گوی کے آغاز سے کوئی تعلق نہیں یہ اس زمانے کے مرثیے ہیں جب دکھنی مرثیہ گوئی کمال کو پہنچ چکی تھی - وہ ثابت کرتے ہیں کہ دکھن کی شیعہ سلطنتوں کے زوال کے ساتھہ ہی اس کو بھی زوال نہیں شروع ہوا بلکہ اس کا سلسلہ باقی تھا - یہاں تک کہ بعد میں شمالی شاعروں نے اس کو اپنے ہاتھہ میں لیکر اس میں اور بھی ترقی دی ' اور آخر کار ' انیس ' اور ' دبیر ' جیسے استادوں نے تو اُس کو اوج کمال پر پہنچا دیا —

یہ کچھہ کم تعجب کی بات نہیں کہ دکھن میں ' اس گئے گذرے زمانے میں بھی ' مرثیہ گوئی برابر جاری رہی - اور اس طرح ' ہاشمی ' اور ' مرزا ' اور ' انیس ' اور ' دبیر ' کے درمیانی زمانے میں مرثیوں کی زمین بالکل بنجر نہیں پڑی رہی - زیر نظر مرثیوں کے مطالعہ کے بعد یہ خیال دور ہوجاتا ہے کہ اردو مرثیہ گوئی دکھن میں شروع ہو کر بالکل ختم بھی ہو گئی - اور یہ کہ شمالی شاعروں کو از سر نو مرثیہ گوئی کا آغاز کرنا پڑا —

دکھنی مرثیوں کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کا مرثیہ پن ہے - اور اس حیثیت سے وہ شمال کے مرثیوں سے متفرق ہیں - وہ مرثیہ گوئی کے اصلی مقصد کو مدنظررکھہ‌کر لکھے گئے ہیں - ان کا مقصد رونے رلانےکے سوا کچھہ نہیں - شمال میں بھی ابتدا میں یہی رجحان تھا - لیکن ' انیس ' اور ' دبیر ' نے اس کے رخ کو بالکل بدل دیا اور ان کے یہاں مرثیے اردو شاعری کے اہم ترجزو بن گئے - اس میں بہت کم شبہ کی گنجائش ہے کہ دکن میں بھی اس طرح کا رجحان شروع ہو چکا تھا کہ مرثیہ نگاری‌میں رونےرلانےکے علاوہ شعریت کا بھی‌لحاظ رکھا جاےجیسا کہ ' روحی ' ' رضی ' ' قادر ' ' ندیم ' اور ' نظر ' وغیرہ کے مرثیوں سے ظاہر ہوتا ہے لیکن یہ بات عام طور پر مقبول نہیں ہوئی تھی - ایک دفعہ ' عزلت ' نے اپنے مرثیے کے آخر میں اشارہ کیا تھا کہ :-

خام مضمون مرثیہ کہنے سوں چپ رہنا بھلا
پختہ درد آمیز عزلت نت‌توں احوالات بول

مگر اس کے ایک بڑے ہم عصر ' رضا ' نے مرثیے کے اصطلاحی مضمون اور مقصد کو دلیل بنا کر اس طرح اس کا جواب پڑھا کہ :-

اے عزیزاں گرچہ ' عزلت ' مرثیہ میں یوں کہیا
خام مضموں مرثیہ کہنے سوں چوپہ (کذا) رہنا بھلا
لیکن اس مظلوم بے سر کا بیاں کرنا روا
تا کہ سن کر یوں بیاں ہوویں محبا اشک بار

اگرچہ شمالی مرثیوں کی طرح دکھنی مرثیے موضوع کے لحاظ سے زیادہ مضمون خیز نہیں ہیں تاہم ان میں بھی امام زادہ علی اصغر کی شہادت ' اور امام قاسم اور بی بی سکینہ کی شادی اور پھر ہمیشہ کی جدائی پر بہت کچھ توجہ صرف کی گئی ہے - خصوصاً علی اصغر کی شہادت پر دکھن کے قریب قریب ہر مرثیہ گو نے نئے نئے طریقے سے ماتم کیا ہے —

اس امر کا اظہار بھی شمال اور جنوب کے اردو مرثیوں کا مقابلی مطالعہ کرنے والوں کے لئے شاید غیر ضروری نہ ہوگا کہ دکھنی مرثیہ بالعموم مربع‌بندوں کی شکل میں لکھے گئے ہیں . ہر مرثیے کے پہلے بند کے چار مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف ہوتے ہیں - لیکن ہر بند کا چوتھا مصرعہ اسی ردیف اور قافیہ میں لکھا جاتا ہے جو ابتدائی بند کا ہوتا ہے - چند مرثیے مخمس کی شکل میں بھی ہیں- اور سلام ' درود ' اور فاتحہ وغیرہ کے موضوع کے لئے عموماً غزل کی شکل استعمال کی گئی ہے —

دکھنی مرثیوں کی ایک دور خصوصیت ان کی تاریخی معلومات ہیں - اس بارے میں وہ شمالی مرثیوں سے زیادہ اہم ہیں - ان سے شاعروں کے نام ' ان کی زندگی ' ان کے وطن ' اور زمانے وغیرہ کے متعلق بھی معلومات ہوتے

ھیں - اور یہ باتیں اس لئے زیادہ اہم ھیں کہ ان مرثیہ نگاروں پر اس وقت کسی اور ذریعے سے کوئی روشنی نہیں پڑتی —

دکھنی مرثیہ نگاری کی نسبت اس وقت ان چند اشاروں کے قلمبند کرنے کے بعد اور ھاشم علی کے متعلق بعض نوٹ پیش کرنے سے پہلے اس امر کا اظہار بھی ضروری معلوم ھوتا ھے کہ اس وقت ھاشم علی پر اس لئے نہیں قلم اٹھایا جارھا ھے کہ وہ بہترین دکھنی مرثیہ گو ھیں بلکہ اس لئے کہ اس وقت سب سے زیادہ انھیں کے مرثیے موجود ھیں —

(۲)

اس وقت جس مرثیہ گو پر ھم چند نوٹ لکھیں گے اس کا نام ھاشم علی ھے - ان ھاشم علی کو نصرتی کے ھم عصر ھاشمی سے کوئی تعلق نہیں - یہ بات یہاں ضرور ملحوظ رھے کہ ھاشم علی کبھی مرثیے میں خود کو ھاشم یا ھاشمی نہیں لکھتے - ان کے دیوان (یعنی مجموعۂ مراثی) کے مطالعہ کے وقت میں نے حتی‌الامکان کوشش کی کہ کہیں صرف لفظ ھاشمی کا استعمال دیکھوں مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ھے میں نے کسی مرثیے کے آخر میں ھاشم علی کے سوا کوئی اور تخلص نہیں پایا - یہی وجہ ھے کہ جب بیاض مراثی میں مجھے ایک ایسا مرثیہ ملا جس کے آخری شعر یہ ھیں —

تھا اے ھاشم مجھ کوں عظمت ترک اشعار جدید

(عزم ؟)

بس کے ھے دل میں ھجوم درد حسنین شہید

اشک کے طفلاں ھو دامن گیر ماتم کر مزید

لوح دل سیں یو سطر غم کی مٹانے نین دئیے

تو میں نے اس کو ھاشم علی کے مرثیوں کی فہرست میں نہیں داخل کیا ، بلکہ جیسا کہ اس مضمون کے آخر میں فہرست ملاحظہ کرنے سے واضح ھوگا ،

ہاشم اور ہاشم علی دو علحدہ علحدہ نام لکھے ہیں - تاہم ہاشم پر استفہامیہ لگادیا ہے - ممکن ہے کہ خرق عادت کے طور پر ہاشم‌علی نے ایک دفعہ ہاشم تخلص بھی استعمال کردیا ہو !

ہاشم علی ، عادل شاہی ہاشمی سے تقریباً ایک صدی بعد کے شاعر ہیں - وہ ولی اورنگ‌آبادی کے ہم عصر تھے۔ اُن کے موجودہ دیوان میں ایک دو تاریخیں ایسی ملتی ہیں جن سے اُن کے زمانے کا صحیح تعین ہوسکتا ہے --

۱- مرثیہ نمبر ۲۰ کے عنوان کے طور پر انھوں نے حسب ذیل عبارت لکھی ہے

"...... از جملہ تفضلات امام شہید کہ بریں عاصی‌شدہ آنست‌کہ برادر ایمانی حافظ فضل‌الدین درعالم رویا بتاریخ بیستم ماہ مبارک رمضان سنہ ۱۱۴۸ ھجری یک ھزار (؟) و چہل ھشت‌مشاہدہ نمود کہ گویا پائےعلاوہ (الاوہ- موجودہ) آنحضرت نشستہ و محبان جمع شدہ‌اند کہ یکایک از شکل ضریح سوز (؟) صدائے برآمد حاضران مجلس ھمگی بہ تعظیم آں برخاستہ ، دست ھائے ادب بر سینہ نہادہ ، بجہۃ استماع ندائے روح افزا عینے سراپا گوش گشتند ، کہ بار دیگر آواز برآمد ، و نام قایل بیان غم بر زبان راندند کہ‌کجاست، چوں ایں کمینہ‌را نیز دراں محفل حاضردید کہ با نیز تمام سر را قدم‌ساختہ نزدیک ضریح مقدس آمدہ‌ایستاد بار سیوم حکم عالی صادر شد کہ آں مرثیۂ واویلا رابخواں -حسب فرمان وحی ترجمان شروع بخواندن‌نمود کہ ازاں خواب بہ‌زبیدار شدہ ایں پائے ملتفی آنست کہ در بارگاہ سلیمانی وصول شدہ "—

اس سے جہاں مصنف کے مذہبی معتقدات پر روشنی پڑتی ہے ، جس پر آیندہ نظر ڈالی جاے گی ، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہاشم علی سنہ ۱۱۴۸ ھجری میں خاصے مشہور مرثیہ گو ہوچکے تھے - اور اُن کے مرثیے اس قدر پر اثر سمجھے جاچکے تھے کہ

اُن کی داد دینے اور سننے کے لئے ان کے اعتقاد کے مطابق حضرت امام حسین بھی اُن کے ایک دوست کے خواب میں تشریف لاے تھے—

۲- ایک جگہ (یعنے مرثیہ نمبر ۱۷۵ کے آخرمیں) مرثیے کی تاریخ تصنیف یوں بیان کی ہے :—

جب منجم نے کیا اس درد نامہ کا حساب غین و قاف وسین وطاآیارقم اندر کتاب

سن کے یو تاریخ کوں سینے میں دل ہوتا کباب ختم کر ہاشم علی قاسم کی شادی کے بین

گویا یہ مرثیہ سنہ ۱۱۶۹ ھ میں لکھا گیا ہے —

ان دونوشہادتوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہاشم علی گیارھویں صدی ہجری کے آخر یا بارھویں کے اوائل ؐ میں پیدا ہوے ہوں گے اور یہ کہ بارھویں کے آخر میں انتقال کیا -

ایک اور طرح سے بھی ہاشم علی کے زمانہ پر روشنی پڑتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہاشم علی نے اپنے مرثیوں میں دکن کے مشہور شاعر ' قادر ' کا دو دفعہ ذکر کیا ہے - اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ تو قادر کی زندگی میں ان کی طرف اشارہ کیا اور دوسری دفعہ اُن کی وفات کے بعد —

' قادر ' دکن کے بہترین مرثیہ گویوں میں سے ہیں - گجرات اُن کا وطن نہیں تھا بلکہ دکن کا کوئی حصہ - یہاں اُن کے ۱۷ اعلیٰ درجہ کے مرثیے موجود ہیں — ان میں کل ۳۰۵ شعر ہیں اور بلحاظ مقدار خود ہاشم علی اور غلامی کے سوا یہاں سب سے زیادہ انہی کے مرثیے ہیں -اگرچہ خوبیٔ کلام کے مدنظر فی الحال اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا غلامی بہتر ہیں یا قادر ؟

' قادر ' ہاشم علی کے ہم عصر تھے — ان کے مرثیوں میں سے ایک میں عجیب طرح سے تاریخ تصنیف کا ذکر ایا ہے — وہ لکھتے ہیں —

سن اگیارہ سو اوپر اونچاس سال سبز بانا قادرا کا لہو میں لال

ختم کریو مرثیہ پایا وصال (؟) ہاے کیا غم ' غم پہ غم ہے مستقیم

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قادر سنہ ۱۱۴۹ ہجری میں زندہ تھے - اور چنانچہ جب ہاشم علی نے یہ شعر لکھا —

ہاشم علی عجب نیں یو مرثیے کوں سن کر تجہ پر خلیفہ قادر تحسین کرے دکھن میں

وہ بقید حیات تھے لیکن اس کے بعد ہی (اور بہت ممکن ہے کہ سنہ ۱۱۶۹ ھ سے پہلے) ان کا انتقال ہوگیا - کیوں کہ ایک دوسرے مرثیے میں ہاشم علی کہتے ہیں -

ہزار حیف نیں شاعران دکھن سو 'روحی' و 'مرزا' او 'قادر' نہیں

ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تینوں ان کے سامنے مرگئے تھے اور ان کی وفات پر ہاشم علی کو افسوس بھی ہوا تھا —

اس تمام تفصیل سے یہ ثابت کرنا بھی مقصود تھا کہ سنہ ۱۱۴۸ ھ اورسنہ ۱۱۶۹ ھ سے متعلق ان کی ذاتی شہادتوں کے علاوہ سنہ ۱۱۴۹ ھ کی بھی ان کے زمانہ کے متعلق ایک بالوساطہ شہادت موجود ہے —

اسی سلسلے میں ان شاعروں کی نسبت بھی کچھ لکھنا دلچسپی سے خالی نہیں جن کا ہاشم علی نے ذکر کیا ہے اور جس سے ان کا ماحول بھی معلوم ہوتا ہے —

'قادر' کے ساتھ ایک ہی مصرعہ میں 'روحی' اور 'مرزا' کا تذکرہ کرنا ضرور قابل توجہ ہے - بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مرزا سے دکن کے ان دو شاعروں سے کوئی ایک مراد ہے جن میں سے ایک کا تعلق بیجاپور سے تھا اور دوسرے کا گولکنڈے سے - بیجاپور کے مرزا کو انتقال کئے ہوے اس وقت تک غالباً بہت زمانہ گذر گیا ہوگا کیونکہ موجودہ معلومات کی بنا پر اُن کا انتقال علی عادل شاہ ثانی ہی کے زمانہ میں یعنے سنہ ۱۰۸۳ ہجری سے پہلے ہوچکا تھا - اور یہ ظاہر ہے کہ ہاشم علی جن مرزا کا ذکر کر رہے ہیں و یقیناً وہ مرزا ہیں جو یا تو ان کے ہم عصر تھے یا جنھوں نے ان کے قریبی زمانے میں انتقال کیا تھا -

گولکنڈے کے مرزا ممکن ہے ہاشم علی کے زمانے تک زندہ ہوں - کیونکہ سنہ ۱۰۶۸ ھ

کے بعد ان کا بقید حیات ہونا مسلم ہے - بہت ممکن ہے کہ وہ پچیس تیس سال اور بھی زندہ رہے ہوں - لیکن یہاں جو بات غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ گولکنڈے کے مرزا سے عام طور پر مرثیے نہیں منسوب کئے جاتے - سمجھا یہ جاتا ہے کہ صرف بیجا پور کے مرزا مرثیہ گو تھے -

یہ بحث اس لئے بھی زیادہ قابل توجہ ہے کہ اسی پران پندرہ مرثیوں کی قسمت کا فیصلہ منحصر ہے جو یہاں "بیاض" میں مرزا کے نام سے موجود ہیں اور جن میں تقریباً ۲۱۵ شعر ہیں - اگر یہ مان لیا جائے کہ ان مرثیوں کے مصنف گولکنڈے ہی کے مرزا ہیں تو یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ وہ سنہ ۱۱۵۰ تک زندہ بھی تھے - کیونکہ مرزا کے جو مرثیے یہاں موجود ہیں ان میں ایک جگہ قادر کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ گویا وہ اس وقت مرچکے تھے - مرزا لکھتے ہیں :-

یہ مرثیہ ہو تراب سیتی قبول پاوے تو کچھ عجب نیں

کہ روح قادر کی زار رووے پڑے جو مرزا دکھن میں غم تھیں

یاد رہے کہ مرزا جیسا کہ ان کے ایک متذکرہ شعر سے ظاہر ہوتا ہے سنہ ۱۱۴۹ھ تک زندہ تھے --

اس میں بہت کم شک کی گنجائش ہے کہ 'مرزا' 'قادر' کی طرح دکن ہی کے شاعر تھے - وہ ایک جگہ کہتے ہیں --

در ملک ہند' پورب و پچھم ہے سوگ میں
سب سے ادھک عزا ہے بہ دکھن حسین کا

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مرزا کے مرثیے اس مجموعے کے بہترین مرثیوں میں سے ہیں - اُن کا مصنف یقیناً ایک اعلیٰ درجے کا اور پختہ شاعر ہوگا --

پس یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ ہاشم علی نے جس مرزا کا ذکر کیا ہے وہ گولکنڈے کے مرزا ہیں جنھوں نے مرثیے بھی لکھے اور جو سنہ ۱۱۵۰ھ تک زندہ بھی تھے - یا یہ کہ وہ دکن کا کوئی اور بڑا مرثیہ گو شاعر تھا، جو ولی، ہاشم علی، اور قادر کا ہم عصر تھا اور جس نے قادر کے بعد اور ہاشم علی سے پہلے انتقال کیا --

اس بحث کو بند کرتے وقت میں اپنا یہ اندیشہ بھی ظاہر کردینا چاہتا ہوں کہ کیا یہ ضروری ہے کہ یہ سب مرثیے ایک ہی مرزا کے ہوں ؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ بیاض جمع کرنے والے نے (جس طرح بعض قدیم شاعروں مثلاً ہاشمی اور اور شاہی کے مرثیوں کے نمو نے دئے ہیں ، یا بعضوں مثلاً بسمل اور ہادی کے فارسی مرثیے بھی شامل کر لئے) قطب شاہی مرزا اور عادل شاہی مرزا دونو کے مرثیے نقل کر لئے ہوں ، اور پھر ہماری بدقسمتی سے اس کا خیال نہ رکھا ہو کہ ہر مرثیے پر اس کے خاص مصنف کی طرف اشارہ کیا جاے —

اگر واقعی یہ مرثیے دو مختلف شاعروں کی پیداوار ہیں تو نہ معلوم آئندہ ایسا موقع بھی آسکے گا کہ کوئی خدا کا بندہ دو شاعروں کے مرثیے علحدہ علحدہ کر کے ہر حقدار کو اس کا صحیح حق پہنچاے —

ہاشم علی کے متذکرہ شاعروں میں تیسرا نمبر روحی کا ہے - بیاض میں ان کے زیادہ مرثیے موجود نہیں ہیں - تاہم جس قدر بھی ہیں اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے ممتاز ہیں - روحی کے مرثیوں میں شعریت اور تغزل کا جتنا رنگ غالب ہے کسی اور دکھنی مرثیہ گو کے یہاں نہیں - یہاں ان کے کل پانچ مرثیے ہیں جن میں پچاس سے بھی کم شعر ہیں —

روحی ایک اچھے شاعر ہوں گے - ان کے مرثیے ان کی خوبیٔ کلام کا پتہ دیتے ہیں - ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف مرثیہ گو نہیں تھے ، غزل گوئی میں خاصی مشق کی ہوگی - ایک مرثیے سے چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں

تا کہ اس کا اندازہ ہو کہ روحی جیسے کامیاب شاعر بھی عزلت کے ہم خیال تھے —

آج غم ناک ہیں چمن کے گل
بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل
غم زدہ سینہ داغ حیران ہیں
نرگس، لالہ، یا سمن کے گل
یوں نہ لالے شفق کے دستے ہیں
لہو میں ڈوبے ہیں سب گگن کے گل
جب سنے شہ کی بات مجلس میں
جل بجھے شمع انجمن کے گل
نقش پا دیکھ دل ہوس رکھتا
سر پہ رکھنے کون تجھ چرن کے گل
خوش لگے تجھ طبع سیں اے روحی
دل کے باغاں منے سخن کے گل

نہ معلوم اس طرح کے مرثیوں کو دیکھنے کے بعد 'رضا' کا کیا حال ہوا ہو —

روحی کی زندگی کی نسبت فی الحال کوئی معلومات نہیں۔ 'قائم' نے اپنے تذکرے میں البتہ ایک روحی کا ذکر کیا ہے جو حیدرآباد کے پیر زادے تھے۔ مگر نہ معلوم وہ بزرگ یہی روحی ہیں یا کوئی اور ؟ یہ ظاہر ہے کہ ان روحی کا ہاشم علی کی زندگی ہی میں انتقال ہو چکا تھا —

ہاشم علی کے دیوان میں ایک اور شاعر کا بھی ذکر آتا ہے۔ وہ اپنے مرثیے نمبر ۱۰ کے عنوان میں لکھتے ہیں :-

" تضمین غزل خواجہ حافظ شیرازی کہ حافظ رضی نامی شاعر نیز کردہ بود "

اس سے یہ پتہ چلتا ھے کہ حافظ رضی جن کے نو مرثیے بیاض میں موجود ھیں اور جو اچھے مرثیہ گویوں میں سے ھیں ' ھاشم علی کے زمانے سے پہلے گذرے تھے یا انھی کے زمانے میں تھے - رضی غالباً گجرات کے شاعر تھے - خود انھوں نے حافظ کی مشہور غزل " دل می رود زدستم صاحبدلاں خدا را " کی تضمین ایک اور شاعر 'بے خبر ' کی تقلید میں کی ھو گی - " بیاض " میں ' بے خبر ' کی تضمین کے بعد ھی حافظ ' رضی ' کی تضمین نقل کی گئی ھے - لیکن حافظ ' رضی ' کا یہ مرثیہ ' بےخبر ' اور ھاشم علی دونو کے مرثیوں سے بہتر ھے —

ھاشم علی کے زمانے اور ان کے قریبی شاعروں پر چند نوٹ لکھنے کے بعد مناسب معلوم ھوتا ھے کہ ان کے وطن کی نسبت ان کے کلام سے جو روشنی پڑتی ھے اس کو بھی ظاھر کر دیا جاے —

کٹلاگ کے مرتب نے انھیں برھان پوری لکھا ھے ' اگرچہ ان کے مرثیوں سے اس کا کوئی پتہ نھیں چلتا - ان سے صرف اس قدر علم ھو تا ھے کہ وہ گجرات کے شاعر تھے ' اور غالباً اس شھر میں رھتے تھے جس کو وھاں کے باشندے شاید ' نگر ' کہتے ھوں - کیونکہ اپنے مرثیوں میں انھوں نے دو دفعہ نگر کا اس طرح ذکر کیا ھے :

۱ - شہ کے غم میں آج اے ھاشم علی　　زینہار ھر گز نہ کر توں بے دلی
سن نگر میں شور محشر ھر گلی　　ھے شب قتل شہیداں آج رات '

(مرثیہ نمبر ۴۳ کے آخری شعر)

۲ - یو نگر میں شور شہ کے باج ھے　　اس الم کا نالہ گھر گھر آج ھے

(مرثیہ نمبر ۴۸ کا آخری شعر)

یہاں لفظ ' نگر ' برھان پور کے لئے ممکن ھے بالکل اسی طرح استعمال کیا گیا ھو جس طرح شہر حیدرآباد دکن کو وھاں کے لوگ اختصار کے لئے با العموم بلدہ یا شہر کے لفظوں سے یاد کرتے ھیں—

رہا اس کا ثبوت کہ یہ نگر گجرات کا کوئی شہر ہوگا، یوں ملتا ہے کہ ہاشم علی نے چند مرثیوں میں دکن کو اس طرح یاد کیا ہے کہ گویا وہ وہاں نہیں رہتے۔ اس کے برخلاف گجرات میں رہنا حسب ذیل شعروں سے ثابت ہوتا ہے —

ہاشم علی لکھا توں بیکس دولھن کی باتاں
اس غم سے ہے جگر خوں، اور چشم اشک ریزاں
گجرات میں پڑے جب یہ مرثیے کو یاراں
سن کر چلے ہیں روتے دکھنی دکھن کوں اپنے (مرثیہ نمبر ۲۲۷)

معلوم یہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں دکھنی گجرات کو اکثر جایا کرتے اور وہاں کے شاعروں سے مستفید ہوتے تھے، یہ بات صرف ولی اورنگ آبادی ہی تک محدود نہیں تھی۔ ہاشم علی کے علاوہ ایک اور مشہور شاعر 'رضا' نے بھی دکھنیوں کا اس بارے میں ذکر کیا ہے وہ اپنے ایک مشہور مرثیے کے آخر میں لکھتے ہیں:—

نیں ہے طاقت تا کروں غم کا سومیں سارا بیاں
تم کرو زاری شہاں کی آج اے پیر و جواں
آفریں مجھ کوں کہو اے شاعراں و ذاکراں
کرتا ہوں اب بس سخن کوں، آج ہے قاسم کا بیاہ (بیاض)
اے 'رضا'، قاسم کے جلوہ کا بیاں کر توں تمام
تجھ کوں محشر میں شفیع ہوکر چھڑاویں گے امام
مرثیہ تجھ کن لکھا کر لے گئے ہیں ہر کدام
لے گئے دکھنی دکھن کوں، آج ہے قاسم کا بیاہ

کیا تعجب ہے کہ 'ولی' نے اپنے انہیں گجراتی دوست شاعروں کی یاد میں وہ نظم لکھی ہو جو ان کے جدید مطبوعہ کلیات میں موجود ہے اور جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ واقعی 'ولی' کے دل پر گجراتیوں نے اچھے نقوش تاثر چھوڑے تھے۔

ہاشم علی کے حسب ذیل شعر سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کے

شعر دکھن پہنچتے تھے —

ہاشم علی لے آئے مصباں نے یو خبر　　دکھن سے ہوکے تیرے سخن کربلا چلے

اور نہ صرف یہی ' دکن کے شاعروں سے ہاشم علی کو داد تحسین حاصل کرنے کی بھی توقع رہتی تھی - وہ کہتے ہیں —

ہاشم علی عجب نیں یہ مرثیے کوں سن کر　　تجھ پر خلیفہ قادر تحسیں کرے دکھن میں

اس کے ساتھہ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گجرات اور دکھن کے شاعروں میں تعلقات بھی قایم تھے اور ایک جگہ کی خبریں دوسری جگہ پہنچ جایا کرتی تھیں - چنانچہ ہاشم علی نے اپنے مرحوم دکھنی دوستوں کو جس طرح یاد کیا ہے اس کا ذکر پہلے آچکا ہے' وہ کہتے ہیں —

عجب نیں ہے ہاشم علی بے سخن　　یہ غم کا بیاں سن کے لرزے گگن

ہزار حیف نیں شاعران دکھن　　سوروحی' و مرزا' اوقادر نہیں (مرثیہ ۱۶۵)

---

(۳)

ہاشم علی صرف مرثیہ گو شاعر تھے ' اور غالباً پیشہ ور - انھوں نے سوائے مرثیوں کے کسی اور صنف شاعری میں قلم نہیں اٹھایا - اور جس طرح دوسرے شاعر اپنی مختلف نظموں کو ایک جا کر کے انھیں ایک دیوان کی شکل میں حروف تہجی کے لحاظ سے ردیف وار مرتب کرتے ہیں ہاشم علی کو بھی اس کا شوق ہوتا ہے - چنانچہ وہ اپنے قسم قسم کے مرثیوں کو ردیف وار جمع کرکے ایک جلد میں نقل کرتے ہیں ' اور اس مجموعے کا نام " دیوان حسینی " رکھتے ہیں - کیوں کہ وہ امام حسین اور اُن کے ساتھیوں کے غم و الم پر مبنی ہے —

" و مسمی شدن ایں اوراق بہ دیوان حسینی "

کے تحت انھوں نے جو ۹ شعر لکھے ہیں ان کے آخری شعر یہ ہیں —

شاعراں نے شعر بولے گرچہ رنگیں دل کشا
اے عزیزاں یو سخن ہے اس دل بریان کا
توں لکھا ہے کربلا کا یو بیاں ہاشم علی
ہے یو دیوان حسینی نام اِس دیوان کا (مرثیہ نمبر ۲)

اس کے علاوہ اپنے صرف مرثیہ گو ہونے کی نسبت انھوں نے صاف صاف کئی جگہ اعلان کردیا ہے ۔ چنانچہ بعض شعر ملاحظہ ہوں —

۱- ہاشم علی ہمیشہ ثناخوان شاہ کا
جز مدح و منقبت سخن اُس نے لکھا نہیں (مرثیہ نمبر ۱۳۹)

۲- بجز مدح نیں شعر ہاشم علی
کہو راستی کے سخن پر سلام (مرثیہ نمبر ۱۱۴)

۳- شاعری میں یو مقرر ہے تجھے ہاشم علی
جز ثنا و مرثیہ شعر دگر کہنا غلط (مرثیہ نمبر ۷۴)

اور نہ صرف یہی ' انھیں اپنے خالی مرثیہ گو ہونے پر فخر بھی تھا - ان کا خیال تھا چونکہ وہ مرثیوں کے سوا کسی اور صنف شاعری سے اپنے قلم کو گندہ نہیں کرتے اس لئے شعر بھی اچھے لکلتے ہیں - وہ کہتے ہیں —

۱- ہے سخن کوں مدح آل مصطفیٰ میں برتری
یو سبب در ریز ہے ہاشم علی کی شاعری
قدر جوہر کوئی نجانے گا سوائے جوہری
اے صبا یہ بے بہا گوہر اوپر صلوات بول (مرثیہ نمبر ۹۹)

۲- بول توں بلبل صفت ہاشم علی
صبحدم میں مدح اولاد علی
جب تلک دیکھے گلستان جہاں (مرثیہ نمبر ۱۷۲)

۳- ہاشم علی کے شعر جو مدح امام ہے

برایں ثنا و اوس کی فصاحت کوں ہے درود (مرثیہ نمبر۷)

لیکن اگر کبھی انھیں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں میرے شعروں میں کوئی نقص تو نہیں تو وہ یہ کہکر اس کی مدافعت کرنا چاہتے ہیں کہ میرا مقصد شعر و شاعری تو ہے نہیں ' میں صرف مرثیہ گو ہوں ' بھلا مجھے نکتہ چینیوں کی کیا پروا ؟ چنانچہ لکھتے ہیں -

۱- ہوس نیں شاعری یاراں مجھے ہے مدعا زاری

سخن میں گر خطا دیکھو کرم سیتیں گناؤ ست (مرثیہ نمبر۱۸۶)

۲- شعر ہاشم علی کے تئیں یاراں

مدح مولا منے دیکھو خالص (مرثیہ نمبر ۷۱)

یہاں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہاشم علی نے اپنے مرثیہ گو ہونے پر فخر اور نکتہ چینیوں سے بے پروائی کا ذکر صرف اس لئے کیا کہ وہ اس ذریعے سے اپنے عیب چھپانا چاہتے تھے - واقعہ یہ ہے کہ ان کا اعتقاد ہی اس طرح کا تھا - وہ ایک ادنیٰ درجے کے پیشہ ور مرثیہ گو نہیں تھے - وہ جو کچھ لکھتے تھے اس کی اہمیت اور حقیقت پر انھیں اعتماد تھا - وہ اُس کو اپنے مذہبی فرائض کا ایک جز سمجھتے تھے اور اس سے انھیں صرف دنیاوی منافع ہی کی امید نہیں تھی - انھیں یقین تھا کہ ان کے مرثیے انھیں آل نبی کی نظروں میں عزیز کردیں گے اور ان کے ذریعے سے وہ اپنی دینی زندگی میں سرخرو رہیں گے —

یہ صرف نری توقعات ہی نہ تھیں - انھیں ان کوششوں کے پھل بھی ملنے لگے تھے - انھیں یقین ہوتا جارہا تھا کہ شہدائے کربلا علیہم السلام ان کے مرثیوں سے خوش ہیں اور یہ کہ ان بزرگوں نے اپنی خوشنودی کا اظہار بھی کردیا ہے - ان کے برادر ایمانی حافظ فضل الدین نے سنہ ۱۱۴۸ ھ میں جو خواب دیکھا تھا اس کو خود ہاشم علی ہی کے لفظوں میں ہم نے اوپر نقل کردیا ہے- لیکن اس طرح کے خوابوں کا ذکر ہاشم علی نے ایک سے زیادہ موقعوں پر کیا ہے - چنانچہ دیوان میں ردیف "کاف" کو انھوں

نے ایک سلام سے شروع کیا ہے جس کی سرخی یہ لکھی ہے :-

" سلام الا (کذا) جناب سیدالمرسلین و اشارہ بایں کہ چون سابق در عالم رویا جمال باکمال آنحضرت را دیدہ و آن خوابے است بسیار طولانی - درین سلام تمنائے بار دیگر نمودہ، و قسم حضرت شاہ کربلا دادہ، چنانچہ از فضل و کرم این آرزو برآمدہ، و بار دیگر با حسن وجہے مشاہدہ جناب اقدس نبوی نمودہ" -

ایک اور مرثیے کی سرخی یہ ہے - اس میں ایک سے زیادہ خواب بیان کئے ہیں :-

" سلام الی جناب سیدالشہداء، و دراں اشارہ است بسہ خواب -

اول خواب است کہ جناب اقدس نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ را چنانچہ در سلام ردیف الف اشارہ بآں باشد —

دوم خوابے ست کہ جناب ولایت مآب علی مرتضیٰ و حضرت علی بن موسی الرضا علیہ التحیہ و اشارہ مشاہدہ نمودہ قدمبوس و مصافحہ بجا آوردہ حضرت امیر بدست مبارک فکر باشارہ و بزبان می فرمودن کہ علی بن موسیٰ -

وسوم خوابے است کہ محب یکرنگ آل نبی امجد حاجی احمد درویش حضرت سیدالشہدا را دیدہ، و گویا این کمینہ نیز نزد حاضر بودہ و ارشاد و عملے شدہ کہ بجا آوردہ شد "-

(مرثیہ نمبر ۸۹)

(اس میں بعض جگہ عبارت غلط ہے - میں نے حتی الامکان بعینہ نقل کردینے کی کشش کی ہے) —

ان خوابوں کے علاوہ خود مرثیوں میں کئی شعر ایسے ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ ہاشم علی کس قدر خلوص اور اعتقاد کے ساتھہ مرثیے لکھتے تھے - حسب ذیل شعر ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خود متاثر رہتے تھے —

کہاں تک میں لکھوں اس غم کی باتاں
کہ دل کے جوش سوں پر خوں ہیں انکھیاں (مرثیہ نمبر ۲۲۷)

آج ہاشم علی لکھا غم سوں
بھر کے انجھو لوھو سیں سارے فین (مرثیہ نمبر ۱۵۲)

ہاشم علی کے سچے اعتقاد کا ثبوت اُن آرزوؤں سے بھی ملتا ہے جو انھوں نے اپنے متعدد شعروں میں بیان کی ہیں مثلاً ایک جگہ وہ چاہتے ہیں کہ کربلا جاکر خود مرقد امام علیہ السلام پر اپنے مرثیے سنائیں اور اس کی ان کو اس قدر تمنا تھی کہ وہ اپنے کلام کا کربلا جانا انتہائے عروج و قبولیت سمجھتے تھے - کہتے ہیں :-

بولاؤ ہاشم علی کوں سرور نجاوے دل میں یہ آرزو لے
کہ سارے جیتے یو مرثیے ہیں پڑے تمھارے وطن میں غم تھیں (مرثیہ ۱۵۴)
(جتنے) (سے)

ہاشم علی لے آئے سجاں نے یو خبر
دکھن سے ہوکے تیرے سخن کربلا چلے (مرثیہ ۲۲۵)

ان کی بعض دعاؤں اور خواہشوں کی نوعیت اور سنجیدگی ملاحظہ ہو :-

اے سجاں التماس آمِن کی | تم سوں رکھتا یہ گنہ گار روسیا
یا حسین اے خامس آل عبا | عرض ہیں گے پانچ مطلب اے شہا
اول ہے یو آرزو دل میں مدام | لطف سوں اپنے زیارت کوں بلا
دوسرا جب تئیں حیات مستعار | رکھہ مجھے بے منت خلق خدا
تیسرا ہونا قبول درگہت | یو سخن لکھنا مرا تیری ثنا
چار میں یہ حاضراں و ذاکراں | تم سوں پاویں اپنے دل کی مدعا
ہے تجے منصب شفاعت کا نصیب | پانچواں سب کوں قیامت میں چھوڑا
وغیرہ (مرثیہ نمبر ۱۹)

ان کو امید تھی کہ قیامت کے دن امام حسین ان کی شفاعت کرکے انھیں

جنت دلائیں گے :۔

حشر کے دیوان سیں جب نور چشم مصطفیٰ
روضۂ رضواں کوں بھیجیں گے محباں کوں چھوڑا
یاد کر ہاشم علی تجھہ کوں کہیں روز جزا
وہ ہمارا کہترین مداح شاعر کاں گیا (مرثیہ ۳۱)

ایک اور شعر ملاحظہ ہو :

ہاشم علی کوں سرور گر لطف سے نوازیں
نیں ہے عجب عزیزاں ' ہے خاندان کرم کا (مرثیہ ۷)

ہاشم علی کے پیشہ ور مرثیہ گو ہونے کی بحث کے متعلق چند اور معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں ۔ ایک تو یہ کہ ان کے چند شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر سال باضابطہ طور پر مرثیے لکھتے تھے ۔ چنانچہ کہتے ہیں —

تجھ کوں ہاشم علی حسیں سرور
ہر برس مرثیہ لکھاتے ہیں (مرثیہ ۱۴۹)

لکھوں کہاں تلک میں بیان ستم
مجھے ہر برس لے کے تیر قلم
لگاتا رہا ہے کہاں دار غم
جگر پر مرے تیر آخر نہیں (مرثیہ ۱۹۵)

آخری مصرعہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ مدت سے مرثیے لکھتے آئے ہیں اور یہ کہ جب تک زندہ رہیں گے انہیں ہر سال غم کرتے رہنا پڑے گا ۔ ایک اور جگہ بھی انہوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے —

شاعراں نے ہر کدامیں نوبت اس غم کی بھرے
ہے تجھے ہاشم علی اس درد کی باری ہنوز

اس سے یہ مطلب بھی نکالا جاسکتا ہے کہ ہم عصر مرثیہ گو مرثیے لکھتے لکھتے مرگئے لیکن ہاشم علی کی باری ابھی ختم نہیں ہوئی -

پیشہ ور مرثیہ گوئی سے متعلقہ دوسری قسم کی معلومات بعض مرثیوں کے درمیانی اشاروں سے ہوتی ہیں - ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہاشم علی نے صرف منبر پر بیٹھ کر پڑھنے ہی کے لئے مرثیے نہیں لکھے بلکہ انھیں ماہ محرم کے عام رسم و رواج کا بھی لحاظ رکھنا پڑا - زیارت اور چالیسویں کے نیز الوداعی مرثیوں کے علاوہ (جو علموں اور تعزیوں کو ٹھنڈا کر کے واپس ہوتے وقت پڑھے جاتے ہیں) تابوت لے جاتے وقت راستہ سے پڑھتے ہوئے جانے کے لئے بھی انھوں نے علاحدہ مرثیے لکھے - چنانچہ مرثیہ نمبر ۱۵۵ اور ۱۶۹ ' دونوں میں پچاس پچاس شعر لکھنے کے بعد یہ اشارہ کرتے ہیں کہ :—

" ازیں جا روبروے تابوت ایستادہ شدہ بخوانند و آہستہ روانہ شوند "

زیارت اور چالیسویں کے مرثیوں کی ابتدا میں حسب ذیل نوٹ لکھے ہیں:—

۱ — " درمیان روز سیوم کہ در اصطلاح روز پھولوں روز زیارت گویند ' و ایں مرثیہ مخصوص آں روز است " —

۲ — مرثیہ چہلم کہ با صطلاح اہل ہند چالیسواں گویند - و مناسب است کہ در اں روز یا شب خواندہ شود " —

---

(۴)

ہاشم علی کے مجموعہ مراثی ' یعنی دیوان حسینی میں کل ۲۳۸ مرثیے ہیں یہ ان کا مکمل دیوان نہیں ہے - کیونکہ کتاب میں اکثر جگہ (خصوصاً ہر ردیف کے آخر میں) بہت سے صفحے خالی چھوڑ دیے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اور مرثیے نقل کرنا چاہتا تھا - بد قسمتی سے کتابت کی کوئی تاریخ نہیں ملتی - بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں یہ بیاض

لکھی گئی ہو گی —

ہاشم علی ایک اچھے مرثیہ گو تھے - اگرچہ مرزا ' غلامی ' اور قادر کے بعض مرثیوں کے مقابلے کے ' دیوان حسینی ' میں کوئی مرثیہ موجود نہیں ہے ' تاہم ہاشم علی کی استادی اور اعلیٰ درجے کے شاعر ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا - اور بقول ان کے —

شعر ہاشم علی ہوے مشہور
نیں ہے دیوان کی کتاب ہنوز (مرثیہ ۶۲)

کوئی تعجب نہیں اگر وہ ' دیوان حسینی ' کے جمع ہونے سے پہلے ہی خاصے مشہور ہو چکے ہوں —

ان کی زندگی کی نوعیت پر ' افسوس ہے ' کہ ان مرثیوں سے کوئی روشنی نہیں پڑتی - ایک دو جگہ ایسے شعر ضرور مل جاتے ہیں جن میں مصنف کے خیالات کی کچھ جھلک ضرور نظر آتی ہے لیکن وہ کوئی زیادہ اہم نہیں - ذیل کے چند شعر ثابت کرتے ہیں کہ ہاشم علی کی زندگی عام انسانوں کی زندگی کی طرح صدموں سے آزاد نہیں تھی - یہ ایک غیر معمولی بات ہوتی اگر انھیں ٹھوکریں نہ لگتیں اور دنیا کی سرد مہریوں اور نیر نگیوں کی شکایت کرنے کا موقعہ نہ ملتا —

۱ — ہاشم علی زمانہ میں مہر و وفا نہیں
دلہاے پر نفاق میں صدق و صفا نہیں
ہرگز نہیں مروت و شرم و حیا نہیں
اس درد کے دوا کوں بغیر از خدا نہیں
فریاد یا محمد و یا مرتضیٰ علی (مرثیہ ۲۳۳)

۲ — زندگی دنیاں کی ہے ہاشم علی خواب و خیال
جو رہا سو یا و چوکا ' جاگتا ہے کا کہاں

ہے لحد کی نیند بھاری آج توں اس کوں سنبھال
تا جگا ویں صبح محشر تج کو آساں نید سوں

(مرثیہ ۹۵ بیاض)

اس مضمون کے ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہاشم علی کی شاعری کے چند نمونے بھی پیش کئے جائیں تاکہ ناظرین کو اس کے متعلق خود کوئی اندازہ قائم کرنے کا موقع ملے - ہاشم علی نے کربلا سے متعلق تقریباً ہر واقعے پر مرثیہ لکھا ہے- لیکن یہاں صرف چار قسم کے مرثیوں کے انتخاب نقل کئے جاتے ہیں -
۱ - عام مرثیے (یعنے وہ مرثیے جن میں کربلا کے واقعے پر عام طور پر غم کیا گیا ہو یا محرم کا آغاز بیان کیا ہو) ۲ - امام حسین کے مرثیے - ۳ - امام قاسم کے مرثیے ۴- امام زادہ علی اصغر کے مرثیے —

۱ - عام مرثیے کے چند شعر :—

افسوس چوکدھن سیں ٹپکتا لوھو لوھو
ھو کر شفق گگن سیں ٹپکتا لوھو لوھو
عالم کے سب نین سیں ٹپکتا لوھو لوھو
سرور گیا ، کفن سیں ٹپکتا لوھو لوھو

جس وقت اوپر شہید ھوا طفل خورد سال
سرور لے آے گھر کوں تب اندوہ سیں کمال
بانو کے سر سیں ھوش گیا دیکھ کے یو حال
اصغر کے پیرھن سیں ٹپکتا لوھو لوھو

---

۲ - عام مرثیے کا انتخاب :—

یہ موسم خزاں ہے گلہا نہی کے سوکھے
اس دوکھ سوں آج بلبل نالاں رہا چمن میں

پیاسا جگر ہے شہ کا دلہا میں آگ لاگی
سب ہو لوھو پگھل کر بہتے چلے نین میں
ماہ نبی لوھو میں جب کربلا میں ڈوبا
تارے فلک کے اوپر روتے ہیں سب رین میں
یہ بوند ہے لوھو کی یا لعل بے بہا کا
تکما ترے گلے پر ٹانکا ہے پیرھن میں
فانوس میں گھونگٹھ کے مانند شمع کریاں
ہے ہے رہی وہ دلہن جلتے اپس کے من میں

---

۳ - آغاز محرم :—

پھر گھٹا ہوی غم کے بادل کی گگن پر آشکار
کربلامیں میگھ برسے لہو کی دھاراں بےشمار
تیغ چمکے سراوپر بجلی کےمانن(مانند) بار بار
کیا سہا ہے، ہے پڑا سارا جہاں میانے اندھار

یہ جھڑی دس دن لگے گی ماہ غم ھا شور ہے
کربلا کی موج غم سوں دل کی ندیاں پور ہے
نعرہ ھا کڑکیں گرج کر آہ نفخ صور ہے
چوطرف گھن گھور ہے، لہو کی برستی ہے پھوھار

نہیں نکلتاہے سورج سوکے تہیں سکھ کے بھوَن
خون دل سوں جہاں تلک دیکھو ٹپکتی ہیں نین
تر ہوے ہیں اشکباری سوں، لرزتے ہیں بدن
آہ کا ہر دم ہوا ہے کا دلوں سیتیں پوکار

---

۴ - آغاز محرم -

دیکھو محرماں ہلال ماتم ہوا نمایاں فلک میں غم تھیں (سے)
دلوں سیں ندیاں لوھو کی بہتیں چلیں اوبل کر نین میں غم تھیں
جھلکتے تارے نہیں فلک پر، ملک ہیں گریاں فراق سیتیں
پڑیں ہیں بوندا انجھو کے سارے انکھیاں سے ڈھل ڈھل رین میں غم تھیں
رہا ہے بلبل یو دوکھہ سوں نالاں، گلاں کھل کر پڑے زمیں پر
وہ شہ کے سہرے کوں پھول مالی چونا ہے جب آ چمن میں غم تھیں
ہوا ہے چہرہ لوھو میں گل گوں، سوندید میانے مگن ہیں انکھیاں
پڑے ہیں گالوں اوپر اولجھ کر وہ زلف مشکیں شکن میں غم تھیں

---

۵ - شہادت حسین علیہ السلام پر حضرت فاطمہ کا ماتم -

آیا محرم اوڑتا ڈھولارا   روتا ہے عالم اس غم میں سارا
خیرالنسا نے تب یوں پکارا   میرا حسینا نا حق مارا

ہے ہے حسینا تیری جوانی!   تھا قطب تارا تیری پیشانی
دوجا نہیں تھا کوئی جگ میں ثانی   میرا حسینا نا حق مارا

جب تشنگی سوں توں تلملایا   ساتوں سمندر تب کھل بلایا
نہیں ظالماں نے پانی پلایا   میرا حسینا نا حق مارا

توں عرش کا تھا روشن ستارا   تیرا شرف تھا سب آشکارا
ہے آج تیرا سرتن سوں نیارا   میرا حسینا نا حق مارا

---

۶ - ۱۔امام قاسم اور بی بی سکینہ کی شادی ہوتی ہے۔ ابھی دولہا دُلہن سے برابر بات چیت بھی نہیں کرنے پاتا ہے کہ جنگ میں جانا پڑتا ہے - ایسے نازک وقت میں دولہا دلہن میں جو گفتگو ہوتی ہے، اس کا ہاشم علی نے ایک مرثیے میں

بیان کیا ھے جس کے چند شعر یہ ھیں :—

جلوہ سیں اوتھہ کے رن کوں چلا تب کہی دلھن
دامن پکڑ کے لاج سوں انجھواں بھرے نین
مت چھوڑ کر سدھارو تم اس حال میں ھمن
تم بن رھے گا ھاے یہ سونا بھون مرا

کیسی یو کدخدائی و کیسی ھے یو برات
آتا فراق تم سوں یو جلوہ کے آج رات
گھر کوں نہ لے گئے ھو نہ بولے ھو ھم سوں بات
دیکھا نہیں جہاں کوں بھر کے نین مرا

اس کربلا کے بن منے اکیلی میں کیوں رھوں
تجھہ باج میں جہاں میں پور امید کیا دھروں
جد کے مدینہ کیوں کہ میں اس تھار سے پھروں
تم اپنے ساتھہ لیکے دکھاؤ وطن مرا

جاتے ھو چھوڑ رن کی طرف مجکوں تم رولا
نہیں شرم کا ھنوز یہ سرسوں گھونگتھہ کھولا
کرتے نہیں محبت و جاتے میا بھولا
اس زندگی سوں آج بھلا ھے مرن مرا

شعلہ لگا ھے دل منے اس غم کا کیا کروں
مجھہ کوں روا ھوا ھے اگر زھر کھا مروں
دوری میں ھاے تیرے میں دن رین کیوں بھروں
فرقت کی آگ سیتیں جلے گا بدن مرا

———

قاسم کھڑا تھا روتے نین سن دولھن کی بات
غم‌ناک اپنا دیکھ کے دامن دولھن کے ہات
تب آہ دردناک سوں بولا دولھن کے سات
اے بوستان راحت و سرو چمن مرا

مجھ کوں نہیں ہے تیری جدائی کا اختیار
تیرے فراق سات میں جاتا ہوں اشکبار
میں کیا کروں علاج، نہیں حکم کردگار
حق نے کیا ہے رن میں مقرر رہن مرا

ہے داغ دل میں تیری جدائی کا، کیا کروں
نین ہے امید رن سے پھر آکر تجھے ملوں
جو کچھ ہوا مقدروں میں راستی کہوں
وعدہ ہوا ہے حشر میں تم سوں ملن مرا

۷- حضرت شہر بانو امام زادہ اصغر کا ماتم کرتی ہیں —

آج پر خون کفن ترا اصغر آج سوکھا دھن ترا اصغر
لال ہے گلبدن ترا اصغر حیف یو بالپن ترا اصغر

کیوں ہیں زلفاں کے بال تاروں تار کیوں گلے سیں لوھو کے جاری دھار
تجھ کوں سوتے کبھو نہ لگتی بار حیف یو بالپن ترا اصغر

اوتھ گلے کا لوھو دھلاؤں میں نیدآتی، تجھے سولاؤں میں
چل ترا پالنا جھولاؤں میں حیف یو بالپن ترا اصغر

کیوں جدا مجھ ستیں کئے تجھ کوں پھر میں گودی لئے پھروں کس کوں
کیوں نہ لاگے بلا تری مجھ کوں حیف یو بالپن ترا اصغر

اللہ اللہ کیا تجھے پالا من میں یوں تھا کروں گی بسم اللہ

ھاے ترا گیا جیا بالا حیف یو بالپن ترا اصغر

کس کا اب پالنا جھولاؤں گی لولی دے کے کسے سولاؤں گی
کس کوں چھاتی ستیں لگاؤں گی حیف یو بالپن ترا اصغر

۸- ماتم امام زادہ اصغر - حضرت شہربانو کہتی ھیں :-

کہتی ھیں بانو آج میں کس کا جھولاؤں پالنا
بالے اصغر باج میں کس کا جھولاؤں پالنا
سویا ھے گردن ڈال کیوں اولجھے زلف کے بال کیوں
رنگیں لوھو سیں گال کیوں کس کا جھولاؤں پالنا
توں کھول انکھیاں سیں دیکھوں، توں بول بتیاں میں سنوں
روتا نہیں توں کیا کروں کس کا جھولاؤں پالنا
تھے کھیلنے کے دن ترے، کیا عمر، کیا تھے سن ترے
نہیں چین مج کوں بن ترے کس کا جھولاؤں پالنا
یہ بہن تیری غمگسار بیٹھی ھے روتی زار زار
توں اوٹھ سکینا کر پکار کس کا جھولاؤں پالنا
کہاں (کہاں) سیں اجل تھی گھات سیں گئی لے کے تجھ کوں ھات میں
بالا گیا جی بات میں کس کا جھولاؤں پالنا
اے میرے پیارے لاڈلے! پھر آکے لگ توں مجھ گلے
انجھو نین سیں بہہ چلے کس کا جھولاؤں پالنا

۹- حضرت شہربانو کا ماتم علی اصغر کی شہادت پر :-

بالے اصغر کے تئیں بلاتی رھی سونا یہ پالنا جھولاتی رھی
جھولا تیرا پڑا رھا خالی توری مجھ ھات میں ھلاتی رھی

ھاے کیوں روٹھ کر گیا مجھ سوں میرے پیارے کے تئیں مناتی رھی

بھول کیوں توں چلا میا میری آرے اصغر تجھے بولاتی رھی

میں سولاتی تھی جب لگا چھاتی آنچل اپنا تجھے اوڑاتی رھی

رات دن میں کبھو نہ دی رونے کر کے باتاں تجھے ھنساتی رھی

تھا برس کا نتھہ کا تجھے ارماں لال جاماں ترا سلاتی رھی

قاسم آیا ھے جب بھیانے کوں میں تماشا تجھے دکھاتی رھی

لھو بھرا کیوں ترا چندر مکھہ ھے جس کوں ھاتھوں سے میں دھلاتی رھی

دودھ پیتا مرا گیا بالے غم سوں چھاتی مری بھر آتی رھی

تج کوں بھاتی نہ تھی اندھاری رات تیری خاطر دیوا جلاتی رھی

کر کے تعویذ دل اوپر رکھتی بد نظر سیں تجھے چھپاتی رھی

کیوں نہ آخر ھوئي عمر میری تجھ بنا حیف مجھ حیاتی رھی

(۵)

جن جن شاعروں کے مرثیے اس کتب خانے کی "بیاض مراثی" میں موجود ھیں اُن کی فہرست، حروف تہجی کے لحاظ سے، اُن کے مرثیوں اور اشعار کی تعداد کے ساتھ یہاں درج کی جاتی ھے: —

شمار	تخلص	تعداد مراثی	تعداد جملہ اشعار
۱	احمد	۷	۱۵۷
۲	اشرف	۱۳	۱۳۵
۳	اصغر	۱	۲۴
۴	افصح	۲	۲۹
۵	افضل	۱	۳۵ مصرعے (۷بند مخمس)
۶	اکبري	۱	۱۸
۷	الفی	۱	۱۱

شمار	تخلص	تعداد مراثی	تعداد جملہ اشعار
۸	امامی	۸	۶۹ شعر ۳۳ مصرعے (۱۱ بند مثلث)
۹	باقر	۱	۲۲
۱۰	برهی	۱	۹
۱۱	بے خبر	۲	۱۸
۱۲	تراب	۵	۴۹
۱۳	تقی	۲	۶۸
۱۴	حمیدی	۱	۱۲
۱۵	داس	۸	۱۹۶
۱۶	ذوقی	۱۱	۱۴۲
۱۷	رضا	۱۵	۳۵۴
۱۸	رضی	۹	۱۷
۱۹	رمضانی	۴	۵۵
۲۰	روحی	۵	۴۶
۲۱	سرور	۱	۱۷
۲۲	سری	۲	۱۹
۲۳	سیوہن	۲	۱۹
۲۴	سید	۹	۱۱۲
۲۵	سید محمود (؟)	۱	۱۴
۲۶	سیدی	۲	۱۸
۲۷	شرت	۴	۸۷
۲۸	شہابی	۱	۱۴
۲۹	شہی (شاهی)	۲	۱۹

شمار	تخلص	تعداد مراثی	تعداد جملہ اشعار
۳۰	شیدا	۱	۱۸
۳۱	صابر	۱	۵۰ مصرعے (۱۰ بند مخمس)
۳۲	صالح	۲	۲۴
۳۳	صلاح	۸	۱۲۱
۳۴	صوفی	۱	۱۲
۳۵	طاہر	۹	۱٦۸
۳٦	طفیل	۱	۱۱
۳۷	عابد	۱	۱۱
۳۸	عارف	۲	۲۹
۳۹	عترت (؟)	۱	۷
۴۰	عزت	۱	۴۴
۴۱	عزلت	۸	۲۰۵
۴۲	عطا	۱	۱۷
۴۳	عطائی	۱	۱۰
۴۴	عظیم	۱	۴۵
۴۵	علی	۱	(؟)
۴٦	عین الدین توحید(؟)	۱	۲۴
۴۷	غالب	۱	۱۲
۴۸	غلام	۱	۲۷
۴۹	غلامی	۱۷	۳۷۳
۵۰	فائز	۱	۵۱
۵۱	فتح	۱	۲۸

شمار	تخلص	تعداد مراثی	تعداد جملہ اشعار
۵۲	فضل	۲	۴۸
۵۳	قادر	۱۷	۳۰۵
۵۴	قائم	۳	۷۹
۵۵	قربان علی	۳	۴۰
۵۶	قطب ابن حسن	۴	۵۴
۵۷	کاظم	۱۰	۲۰۴
۵۸	گل	۲	۲۱
۵۹	مبتلا	۱	۱۱
۶۰	مرزا	۱۵	۲۰۵ شعر ۲۰ مصرعے
۶۱	مسکین	۱	۱۱
۶۲	مسیحا	۱	۲۶
۶۳	مسیح الدین	۲	۱۸
۶۴	موالی	۱	۹۴
۶۵	موسی	۱	۶۴
۶۶	معتبر خان عمر	۱	۲۵ مصرعے (۵ بند مخمس)
۶۷	مکھن	۱	۱۳
۶۸	ندا	۴	۳۹
۶۹	ندیم	۱۱	۱۵۴
۷۰	نظر	۴	۱۲۴
۷۱	نعیم	۱	۷
۷۲	ولی	۳	۲۸
۷۳	ہادی	۱	۴۳

شمار	تخلص	تعداد مراثی	تعداد جملہ اشعار
۷۴	ہاشم (؟)	۱	۲۰
۷۵	ہاشم علی	۲	۴۴
۷۶	ہاشمی	۱	۱۰
۷۷	ہوشدار	۴	۸۸
۷۸	یاری	۲	۲۳
۷۹	یوسف	۲	۵۶
۸۰	نامعلوم شعرا	۷	۸۳ شعر ۶۵ مصرعے

کبیر

از

(جناب محمد حفیظ سید صاحب بی - اے - بی ٹی لکچرار اُردو الہ آباد یونیورسٹی)

روایت ہے کہ کبیر نے پچاس سے زیادہ تصانیف چھوڑی ہیں - لیکن ان میں اکثر اصلی نہیں ہیں اور باقیوں میں سے بھی بہت سی ایسی ہیں جو ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئی ہیں - " خاص گرنتھ " جس کی نسبت دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ کبیر کے اشعار کا مکمل مجموعہ ہے ، فی الحقیقت اکیس دیوانوں پر مشتمل ہے - مگر ان میں سے چند ہی ایسے دیوان نکلیں گے جو تحقیق اور چھان بین کے معیار پر صحیح اُتر سکیں - " کبیر ساگر " یا " بدھ ساگر " کی ضخیم جلدوں کے مطالعے نے جسے زمانۂ حال کے مشہور کبیر پنتھی مصنف ، سوامی یوگالانند ، نے ترتیب دیا ہے اور ونکٹیشور پریس (بمبئی) نے شائع کیا ہے ، اس غیر محققانہ سادگی پر استعجاب ہوتا ہے جو علم ادب کے ایسے مختلف مجموعے کو ایک ہی زبردست دماغ کی کاوشوں کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے - لیکن جہاں اندرونی شہادت کی بنا پر بسا اوقات بہت سی نظموں کو بے اصل سمجھ کر مسترد کر دیا جاتا ہے ، وہاں یہ امر بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ باقی دواوین کے ہر بند کی صحت پر آنکھ بند کر کے اعتماد کر لیا جائے - بیلوے ڈیر پریس (الہ آباد)

کے شائع کردہ " ساکھیوں " اور " شبدوں " کے ایڈیٹروں نے قطع و برید ' ترمیم و تنسیخ میں جس احتیاط اور محنت سے کام کیا ہے اسے دیکھ کر خواہ مخواہ دل سے داد نکلتی ہے - لیکن انھوں نے تمباکو کی مذمت کے بند کو بھی شامل کر لیا ہے' حالانکہ اس کا رواج ہندوستان میں کبیر کی وفات کے کئی برس بعد ہوا - بہر حال جہاں تک باقی نظموں کا تعلق ہے ان سب سے کبیر کی شاعرانہ زبان' طرز بیان ' جذبات اور جوش کا اظہار ہوتا ہے - حقیقت حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ چند شاگردوں نے جو اپنے آقا اور استاد کے رنگ میں رنگے ہوے تھے اور شاعرانہ نغمہ سنجیوں سے پورے طور پر بہرہ اندوز تھے ' جوش عقیدت کے سبب اپنے نتائج فکر کو ان سے منسوب کر دیا - ثانیاً ہر چھوٹے سے چھوٹے فرقے کے حامیوں نے جس میں کبیر پنتھی منقسم ہو گئے ہیں ' اپنے مخصوص عقائد کو بانیٔ فرقہ سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے - ثالثاً زمانۂ مابعد کے شعرا نے بجاے انفرادی طور پر شہرت حاصل کرنے کے اس دور کے طرز میں لکھنا زیادہ مناسب سمجھا اور جو کچھ لکھا اُسے اپنے استاد کے نام سے دنیا کے سامنے پیش کیا - سولھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک کلام کبیر کے جتنے جامع ' ایڈیٹر اور شارحین گزرے ہیں وہ سب کے سب تمام مجموعے کو کلام الہی سمجھتے تھے اور اس پر تنقیدی نگاہ ڈالے بغیر اس کے ساتھ اظہار عقیدت کرتے تھے—

بہر حال یہ انتخاب ایسا ہے جس پر کبیر کی اعلی ذہانت و قابلیت کا نہ صرف ناقابل تردید نشان موجود ہے بلکہ اس میں ربط و تسلسل اور جامعیت بھی پائی جاتی ہے اور یہ وہ صفات ہیں جن کی وجہ سے یقین ہوتا ہے کہ وہ جعل یا تحریف سے بالکل پاک و مبرا ہے - اس کا نام " بیجک" ہے اور وہ ہندی تصانیف میں زباں زد خاص و عام بھی ہے —

اس کتاب کے متعدد ایڈیشن موجود ہیں' جو یا تو اصل کتاب کے اقتباسات

ہیں یا اس کے مکمل نسخے ہیں - ان کا مقام طباعت بنارس (سنہ ۱۸۶۸ ع)
کلکتہ (سنہ ۱۸۹۰ ع)' لکھنؤ (سنہ ۱۸۹۸ ع)' الہ آباد (سنہ ۱۹۰۵ ع)' اور
بمبئی (سنہ ۱۹۰۶ ع) اور ہمیرپور (سنہ ۱۹۰۸ ع) ہے - ' آدی گرنتھ ' جو
سکھوں کی مقدس کتاب ہے ' بہت سے ایسے گیتوں اور اقوال پر مشتمل ہے
جن میں سے اکثر صحیح طور پر کبیر سے منسوب کئے جاسکتے ہیں - اس طرح کبیر
کے عقائد اور ان کی تعلیمات یا تو زیادہ تر ''بیجک'' میں ملیں گی یا ثانیاً آدی گرنتھ
میں (مگر بڑی احتیاط کے ساتھ) یا ' ساکھیوں ' کے ' بیلوے تیر ' والے ایڈیشنوں
سے اخذ کی جائیں گی - شبد ' اکھراوتی' اور ' گیان گوداری ' ریختے جُھلنے وغیرہ
بھی جنھیں الہ آباد کے پریس نے شائع کیا ہے ' اس قدر غیر مصدقہ ہیں کہ
ان پر بالکل اعتماد نہیں کیا جاسکتا —

اسی طرح جو دوہے یا گیت وغیرہ کبیر کے نام سے مشہور ہو گئے ہیں
وہ نقادانہ تشریح کے سامنے بالکل بے وقعت رہ جاتے ہیں - علاوہ ازیں از منۂ
وسطیٰ میں کبیر کے کلام پر جو شرحیں لکھی گئی ہیں ' وہ محض ناکارہ ہیں -
بالعموم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرقہ دارانہ جذبات سے متأثر ہوکر لکھی گئی
ہیں ' جو بسا اوقات نہ صرف مبہم ہیں بلکہ گمراہ کن بھی ثابت ہوئی ہیں -
مثلاً پاکھنڈ کھنڈینی کی شرح کو لیجئے' جس کی نسبت روایت ہے کہ وہ ' مہاراجہ
وشواناتھ سنگھ ' والی ریوا کے زور قلم کا نتیجہ ہے - یہ شرح آسان سے آسان اور
سادہ سے سادہ متن کی عبارت کو بھی مہمل اور گنجلک بنادیتی ہے - ہمیں امید
تھی کہ سولھویں صدی کے نامور مورخ اور مذاہب مختلفہ کے نقاد یعنی ' ابوالفضل'
کی تحریروں سے کچھ امداد ملیگی مگر وہ بھی تین چھوٹے چھوٹے جملوں میں
ان کا ذکر کر کے چپ ہو جاتا ہے - ' دبستان مذاہب ' بھی کوئی زیادہ مفید
ثابت نہیں ہوئی * —

* نو ساری احمد آباد - ستمبر سنہ ۱۹۲۳ ع —

موجودہ دور میں جن لوگوں نے کبیر کی زندگی اور تعلیمات کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ھے ان میں سب سے پہلا نام ایچ ' ایچ ' ولسن کا ھے جو مستشرقین کی فہرست میں بہت شہرت رکھتے ھیں - جن باتوں نے ان کی شہرت میں چار چاند لگائے ھیں ان میں سے ایک اس امر کا تسلیم کر لینا خصوصیت سے قابل ذکر ھے کہ ھندو مذھب اور تہذیب وتمدن کے مطالعے میں از منۂ وسطیٰ کا علم ادب بہت اھمیت رکھتا ھے۔ اس کے بعد خود بخود بہت سے یورپین اھل قلم نے جن میں گارسن دی تاسی کا نام زیادہ مشہور ھے ' " کبیر اور کبیر پنتھی " کے شائع ھونے کے زمانے تک جس کی ترتیب کا سہرا ایک مشہور مذھبی لیڈر کے صاحب زادے ریورنڈ جی ' ایچ ' ویسٹ کاٹ کے سر رھیگا ' دلچسپی ظاھر کرنی شروع کردی - انھوں نے اس مصلح کی زندگی اور تعلیمات پر اپنے خیالات پیش کرنے کے علاوہ ان کی بعض تصانیف کے حصوں کا ترجمہ بھی شائع کیا ھے - اور اُن کے مذھب کے بارے میں اپنی ذاتی تحقیقات کے نتائج بھی پیش کئے ھیں - بشپ ویسٹ کاٹ کے بعض خیالات اور نتائج سے " اجودھیا سنگھہ اُپادھیائے " نے اپنے " منتخبات کبیر " کے طویل اور فاضلانہ مقدمے میں اختلاف کیا ھے۔ منماتھہ ناتھہ دت نے اپنی تصنیف " انبیائے ھند" میں کبیر کا ذکر کیا ھے۔ اور منوھرلعل زتشی نے بھی اپنے سلسلۂ مضامین " ھندو پروٹسٹنٹزم" میں کبیر کے متعلق قیمتی خیالات کا اظہار کیا ھے۔ سر ولیم ھنٹر اور دوسرے مصنفین نے بھی اپنی اپنی تاریخوں میں مختصراً کبیر کا ذکر کیا ھے - سی ' ایف ' اینڈریوز نے بھی کبیر کے ارشادات اور شاعری پر عام تاریخی تبصرے کے ضمن میں بحث کی ھے - اسی طرح مگر کم کامیابی کے ساتھہ جے ' این ' فارکور نے بھی کوشش کی ھے۔ مصر برادران نے زیادہ تر اس کے ادبی پہلو سے بحث کی ھے۔ اور ریورنڈ احمد شاہ نے اپنے بیجک کے انگریزی ترجمے کے دیباچے میں زیادہ تر اس معلم روحانی کی مذھبی و اخلاقی اور تاریخی حیثیت کو اپنے پیش نظر رکھا ھے ـ سر جارج گریسن نے اس پر اور بشپ ویسٹ کاٹ کی تصنیف پر ریویو کے دوران

میں نیز اپنی کتاب " ماڈرن ورنیکلر لٹریچر " میں مضمون زیر بحث کے سوانحی ' ادبی اور فلسفیانہ پہلووں پر نظر ڈالی ھے - کبیر کے ترجمۂ کلام پر جسے رابندرا ناتھہ ٹیگور نے انگریزی کا جامہ پہنایا ھے ' " ایولن انڈرھل نے اپنے دیباچے میں * گرو کے تصوف سے بحث کی ھے جو حسب توقع نہایت دلچسپ ھے - یہ تمام تنقیدیں ھمدردانہ انداز میں لکھی گئی ھیں اور آریا سماج فرقے کے بانی سوامی دیانند سرسوتی اور دوسرے کم درجے کے مذھبی مصنفین کی کم عالمانہ ' غیر محققانہ اور غیر فیاضانہ تحریروں کے مقابلے میں دلچسپ تضاد پیش کرتی ھیں —

ھمارے لئے یہ ضروری نہیں ھے کہ ایسے کبیر پنتھیوں کی ان بے شمار مگر مختصر غیر تنقیدانہ تحریروں کی طرف کچھہ اعتنا کریں ' جو ھمارے علم اور معلومات میں کچھہ زیادہ اضافہ نہیں کرتیں —

قبل یا ما بعد کے کسی مصلح کے کلام اور تعلیم کی جانب اس قدر توجہ نہیں کی گئی ' جتنی کبیر کے کلام اور تعلیم کی طرف کی گئی ھے اور اس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے - لیکن باوجود اس کے اُن کی شخصیت طرح طرح کے اوھام ' توھمات اور قصص کے گرد وغبار میں چھپی ھوی ھے - ان کی طرز تحریر گنجلک ھوکر رہ جاتی ھے ' ان کے معمے لاینحل رہ جاتے ھیں ' اور ان کو معنی کا لباس پہنانا بسا اوقات نہایت مشکل ھوجاتا ھے - مگر ان باتوں کے باوجود از منۂ وسطیٰ کے مذھبی پیشواؤں ' مصلحوں اور شاعروں پر ان کا بہت بڑا اثر تھا اور ان کی کامیابی اور ناکامی کا راز اس قدر زیادہ دلچسپ ھے کہ ان کی زندگی ' ان کی تعلیمات ' ھندوستانی فلسفہ اور ھندو مذھب پر نظرثانی اور ھندی شاعری کی تاریخ میں ان کے درجے کے متعلق بحث کی گنجائش ھمیشہ باقی رھیگی —

روایتاً مشہور ھے کہ سنہ ۱۴۵۵ وکرمی میں کبیر بنارس میں ماھر تارا تالاب

---

* ھانڈرڈ پوئیمس آف کبیر از رابندر ناتھہ ٹیگور —

کے اِدھر روشنی کی چمک کے ساتھہ بطور معجزے کے خودبخود ظہور میں آے تھے - یا یہ کہ رامانند کی دعا کے اثر سے وہ ایک اچھوتی برھمن بیوہ کے بطن سے پیدا ھوے تھے- یا یہ کہ بیوہ نے اپنے آپ کو لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچانے کی خاطر بچے کو تالاب کے قریب ڈالدیا تھا - وھاں سے انھیں ایک نئے نئے شادی شدہ مسلمان جلاھے ' نیرو ' اور اس کی بیوی ' نیما ' نے اٹھا لیا اور متبنیٰ کرکے پال لیا - جتنے قاضی نام رکھنے کے لئے بلائے گئے تھے انھوں نے قرآن مجید کے اوراق باربار اُلٹے ' مگر اُنھیں صرف اکبر ' کبیر ' کبریا ' حق ' وغیرہ نام ملے جو اسماے الٰہی میں داخل ھیں اوراسی وجہ سے انھوں نے بچے کو قتل کردینے کا مشورہ دیا - لیکن نیرو نے ان اسماے الٰہی سے یہ مطلب نکالا کہ یہ وھی خود بزرگ ترین ذات ھے اور دنیا میں سچے کلام کا پرچار کرنے کے لئے نازل ھوئی ھے - اس کے بعد بچے کا نام کبیر رکھا گیا اور اگرچہ انھوں نے اسلامی گھرانے میں تعلیم پائی تاھم خدا کی عبادت وہ رام نام ھی جپ کر کرتے تھے - ان سے بسا اوقات بہت سی کرامتیں ظہور میں آئیں ' مثلاً جو حجام ان کا ختنہ کرنے کے لئے آتا وہ ڈر کے مارے بھاگ جاتا - وہ بیماروں کو شفا بخشتے تھے اور ذبح شدہ گاے کو پھر از سر نو زندہ کردیتے تھے - بار بار یہ طعنہ سن کر کہ وہ بے پیرے ھیں انھوں نے رامانند جی کا چیلا بننے کا تہیہ کر لیا - لیکن وہ مفروضہ اسلامی نژاد ھونے کی بنا پر مسترد کردیے گئے - بہرحال وہ اس طرح سے مسترد کردیے جانے سے گھبراے نہیں - بلکہ انھوں نے ایک چال چلی اور وہ یہ تھی کہ وہ چھوٹے بچے کا روپ لے کر رامانند جی کے راستے میں لیٹ گئے ' گنگا جی کو جاتے ھوے جب کبیر کے جسم کو رامانند جی کی کھڑاویں لگیں تو وہ لگے چلانے مگر رامانند جی نے انھیں چپ کیا اور آھستہ سے سر پر ھاتھہ رکھہ کر کہا کہ " کہو رام رام " - " میرے آقا ! تو کیا میں رام رام نام جپوں ؟ " رامانند جی نے فرمایا کہ " ھاں ' رام نام جپو " - کبیر نے اُسے اپنی بیعت قرار دیا اور اسے علانیہ شہرت دیدی - حیرت زدہ پیر نے جب وشنوجی کے پرستاروں کے طعنے سنے

تو صاف انکار کردیا کہ میں نے کسی مسلمان جلاہے کو اپنا مرید نہیں بنایا - لیکن بعد میں ان کا دل پسیج گیا اور انھوں نے کبیر کو اپنے روحانی حلقے کا باقاعدہ رکن بنالیا اور بالاخر اپنے ۱۴۸۴ مریدوں کا خلیفہ مقرر کردیا

بہت عرصے تک کبیر اپنی آبائی تجارت میں مشغول رہے - متعدد بار انھوں نے اس کپڑے کو خیرات میں دیدیا جسے وہ بغرض فروخت منڈی میں لےجاتے تھے - لیکن پرمیشور کے مافوق الادراک توسط کی بدولت تجارت میں اُلٹا سوگنا نفع ہوا- روگیوں کے روگ اور دکھیوں کے دکھد کو وہ کھو دیتے تھے، مردوں کو جلادیتے تھے- عناصر اور بعد پر انھیں پورا قابو حاصل تھا، وہ بےرو رعایت سختی کے ساتھہ مولویوں اور پروہتوں کی مذمت کرتے تھے اور اپنے عقائد کا ڈھڑ لے کے ساتھہ پرچار کرتے تھے - انھوں نے راے ' داس ' جہاں گشت شاہ ' اور سرداننند اور سب سے بڑھکر اس دور کے مشہور و نامور درویش اور صوفی گورکھ ناتھہ کو نہ صرف مباحثوں میں بلکہ کرامتوں کے مقابلے میں نیچا دکھادیا - انھوں نے اپنے پیر کو دوبارہ زندہ کردیا، جب کہ وہ سلطان سکندر والی دھلی کے حکم سے اس سے ملاقات نہ کرنے کے جرم میں قتل کردئے گئے تھے اور ساتھہ ھی انھیں شدید جسمانی اذیت سے بھی نجات دلائی - کبیر نے سلطان دھلی کو بھی قریب قریب اپنی طرف مائل کرلیا تھا ' لیکن وہ پنڈتوں اور مولویوں کی (جن میں شیخ تقی کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ھے) ابلہ فریبیوں کے باعث ان کا شدید ترین دشمن بن گیا - مگر سب کو یہ دیکھہ کر تعجب ہوا کہ نہ تو آگ انھیں جلاسکی اور نہ پانی انھیں ڈبو سکا اور نہ خوں خوار درندے اور تیز دھار کے فولادی ھتھیار ھی انھیں کوئی اذیت پہنچانے میں کامیاب ھوسکے —

اسی اثنا میں تقریباً تیس برس کی عمر میں کبیر نے ایک عورت لوئی نامی کو، جو اُن کی مرید تھی، اور ان سے غیر معمولی عقیدت رکھتی تھی اپنے پاک گھر میں داخل کرلیا - اِسے ایک سادھونے عالم طفولیت میں، دریاے گنگا میں، کمل میں لپٹا ہوا پایا تھا - جب وہ آئی تو تین مہینے کا ایک لڑکا ' کمال ' نامی اس کی

حفاظت و سپردگی میں دیدیا گیا - یہ لڑکا بھی دریا پر تیرتا ہوا پایا گیا تھا اور اسے بھی تقی کے کہنے پر کبیر نے زندہ کیا تھا -کمالی کو بھی جو پڑوسن کی نوجوان لڑکی تھی ' کبیر ھی نے اپنی کرامت کے زورسے زندہ کیا تھا - گھر کے لوگ محنت مزدوری سے معمولی روزی کمالیا کرتے تھے- لیکن جوں جوں روحانی مہمانوں کا اضافہ ھوتا گیا ' غائبانہ طور پر ان کی امداد ھوتی گئی - کبیر کی شہرت اب دوردراز مقامات تک پہنچ گئی ' حتیٰ کہ سکھہ فرقے کے بانی بابا نانک نے بھی ان کی مریدی اختیار کرلی —

بڑے بڑے راجہ ان سے دعا کے طالب ھوتے تھے' انہیں میں گجرات کے سولنکی خاندان کا راجہ بھی تھا' جس کے شیر جیسے چہرے والے بیٹےنےر یوا کے باگھل خاندان کی بنیاد ڈالی - کبیر نے ھندوستان کی سرحد کے پرے بلخ اور بخارا تک سیاحت کی' جو اُس زمانے میں علوم و فنون کے بہت بڑے مرکز تھے - دوران سفر میں اِن سے بہت سی کرامتیں ظہور میں آئیں اور جہاں جہاں ان سے مناظرے ھوے' وہ اِن سب میں فتحمند رھے - اور اس طرح سے انہوں نے معرفت کی روشنی پھیلائی—

جب ان کی عمر ۱۲۰ کے قریب ھوگئی تو کبیر نے دیدۂ و دانستہ بنارس کو خیرباد کہا' حالانکہ اس مقدس شہر کی نسبت یہ عقیدہ ھے کہ اگر وھاں موت واقع ھوجاے تو انسان سیدھا سورگ پہنچ جاتا ھے- بنارس سے وہ ضلع بستی کےایک گاؤں مگھر میں آے' جس کے متعلق یہ عام اعتقاد ھے کہ اگر کوئی انسان وھاں مرجاتا ھے تو پھر وہ یقینی طور پر دوسرے جنم میں گدھے کی جون میں آتا ھے - ھندوؤں اور مسلمانوں میں ان کی لاش کے متعلق تنازعہ ھوا اور قریب تھا کہ جنگ و جدل کی نوبت پہنچ جاے کہ اتنے میں کبیر ظاھر ھوگئے اور لوگوں کو حکم دیا کہ دیکھو کفن کے نیچے کیا ھے ؟ - دیکھنے پر معلوم ھوا کہ وھاں تو پھولوں کا ڈھیر پڑا ھے - نصف پھول مسلمانوں نے دفن کردیے اور باقی نصف کو ھندوؤں نے جلا ڈالا - کبیر کی رفیق زندگی لوئی غالباً کبیر سے قبل ھی وفات پاچکی تھی - کمالی کی کسی

برھمن سے شادی کردی گئی تھی - کمال ناخلف نکلا اور اس لئے روحانی بیعت کا سلسلہ دھرم داس نے قائم و برقرار رکھا، جو سب مریدوں کے خلیفہ تھے اور تاجر پیشہ جماعت سے تعلق رکھتے تھے —

کبیر جو ایک غریب گمنام مسلمان جلا ہے ' نیرو ' کے فرزند تھے اور ' نیما ' کے بطن سے پیدا ہوے تھے ' سنہ ۱۳۹۸ ع میں یا اس کے لگ بھگ بنارس میں تولد ہوے تھے - ان کا باقاعدہ ختنہ ہوا تھا اور ان کی تعلیم و تربیت ان کے طبقے کے افراد کے مانند ہوئی تھی - وہ صوفیوں اور فقرا سے حسن عقیدت رکھتے تھے اور بالعموم یہ وہ لوگ ہوا کرتے تھے جو اس پاک شہر میں جس سے کبیر کی قسمت وابستہ تھی ' کچھہ دنوں کے لئے آکر اقامت گزیں ہوجایا کرتے تھے - یہ اسلامی روایت کہ ' شیخ تقی کا کبیر کی شخصیت کی نشو و نما پر بہت گہرا اثر پڑا تھا ' غالباً صحیح معلوم ہوتی ہے - کبیر بالاخر رامانند کے چیلوں میں داخل ہوگئے تھے اور اس کاروائی میں انھیں یقیناً خاص مشکلات کا سامنا ہوا ہوگا - انھیں خدا پر نہایت زبردست اعتقاد تھا اور قرآن اور وید دونوں کو تسلیم کرنے سے انھوں نے انکار کردیا تھا - پیر پرستی سے وہ سخت بیزار تھے اور انھوں نے ظاھری رسوم اور عبادات کو بھی یک قلم موقوف کردیا تھا —

وہ خالص رھبانیت کو مکمل روحانی زندگی کا جز و خیال نہیں کرتے تھے - ان کی ملہمانہ شاعری کے جوش و خروش سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھہ مشکل نہیں ھے کہ انھیں اپنی بیوی لوئی سے غایت درجہ ھمدردی تھی - ان کی روز افزوں شہرت اور اثر ' ان کے مواعظ اور عتاب آمیز کلمات کے باعث ملا اور پنڈت ان کے سخت دشمن ھو گئے تھے اور ھر وقت ان کی ایذا رسانی کی فکر میں لگے رہتے تھے - انھوں نے سلطان سکندر لودھی (سنہ ۱۴۸۸ ع تا ۱۵۱۸ ع) جیسے ظالم بادشاہ تک سے امداد لینے میں پس و پیش نہ کی - اس بادشاہ کے ظلم کا یہ حال تھا کہ اس نے ایک برھمن کو محض اس جرم میں مروا ڈالا تھا کہ اس نے اسلام

اور ہندو مذہب کو برابری کا درجہ دے دیا تھا - مگر اس تعصب کے با وجود اس نے عملاً مداخلت کرنے سے انکار کردیا - ممکن ہے کہ وہ کبیر کو باقاعدہ صوفی قرار دیتا ہو، یا اسے ان کی عمر کا لحاظ ہو، یا یہ کہ اسے کسی فساد کے برپا ہو جانے کا اندیشہ ہو - بہر حال کچھہ ہی وجہ کیوں نہ ہو، اس مصلح قوم کو شمالی ہندوستان اور گجرات میں اپنے مشن کے پھیلانے کا خوب موقع مل گیا - مگر ان کے ' بلخ ' یا ' بخارا ' جانے کی تصدیق نہیں ہوتی - ان کے مرید تمام طبقوں اور جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے - ان کی بیٹی کی شادی برہمن لڑکے سے ہوئی ہے، اور ان کا روحانی سلسلہ دھرم داس نے جو وشنوجی کا پجاری تھا، قائم و بر قرار رکھا۔ خود ان کی عمر بہت طویل ہوئی، اگرچہ یہ کہنا مشتبہ ہے کہ جب ان کا انتقال موجودہ ضلع بستی کے موضع مگھرا میں ہوا تو اس وقت ان کی عمر ۱۲۰ سال کی ہو چکی تھی —

رامانند کے شاگردوں میں جو مذہبی علم ادب میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، گاگرون گڑہ کا ہندو راجہ ' پیپا دھنا ' نامی جاٹ، سائیں نامی حجام، اور راؤ داس موچی سب شامل تھے - مگر ان سب میں بڑہ چڑہ کر کبیر تھے —

کبیر کا کام یہ تھا کہ اپنے گرو کی تعلیمات کو انتہا تک پہنچا دیں اور جس بات کو امر حق جانیں اس کا بے تحرک پرچار کریں - تمام اوہام باطلہ، رسوم قبیحہ اور اُن باتوں کے خلاف جو تہذیب کی برائیوں کے نام سے موسوم ہیں، استقلال کے ساتھہ جہاد جاری رکھیں - کہا جاتا ہے کہ صوفی دنیا کے سب سے بڑے عملی آدمی ہوا کرتے ہیں - کبیر با وجود صوفیوں کے سر تاج ہونے کے نہایت عملی مصلح بھی تھے - انہوں نے قدرتاً اپنی تعلیمات کے پرچار کے لئے ملکی زبان ہی کا استعمال کیا - ایک جانب خیالات کی آمد تھی اور دوسری طرف جذبات تھے کہ وہ اظہار کے لئے تڑپ رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی

قوت گویائی بہت جلد انتہائی عروج کو پہنچ گئی - ان کی شاعرانہ قوت اعلیٰ وارفع تھی اور وہ اُن کے مزاج کا قدرتی نتیجہ تھی - اس میں شبہہ نہیں کہ ان کے زمانے کی اسپرٹ (اقتضا) اور خود ان کی شخصیت ان کی کامیابی کا بہت بڑا وسیلہ تھی - لیکن اس سے قطع نظر 'والٹیر' کی طرح ان کی درازی عمر بھی ان کی کامیابی کی بڑی وجہ تھی —

یہ اعلیٰ درجے کی ذہانت کا نتیجہ تھا کہ کبیر نے اصلاح مذہب کے مرکزی نقطے کوکبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا' یعنی یہ کہ خدائے برتر کی خضوع وخشوع کے ساتھ عبادت کرنا اور اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا - خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور اس کی سلطنت کا مرکز اقلیم دل ہے —

ارشاد ہوتا ہے :—

پھولوں کے باغ میں نہ جا' اے دوست وہاں نہ جا!

خود تیرے جسم میں پھولوں کا باغ پوشیدہ ہے —

" تو کنول کی ہزارہا پتیوں میں اپنی جگہ بنا ' اور وہاں سے حسن لا زوال کا تماشا کر —

" ہمہ اوست ' کے خیال کی سختی کے ساتھ ترویج فرماتے ہیں :—

"مخلوق برھما (خالق) میں ہے اور برھما خود مخلوق میں موجود ہے" —

وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا بھی ہیں اور ملے ہوے بھی —

وہ خود درخت بھی ہے بیج بھی اور نمو بھی وہی ہے وہ خود پھول ہے — میوہ بھی اور سایہ بھی وہی ہے —

وہ خود سورج ہے' روشنی بھی اور ہر وہ چیز بھی جو روشنی سے منور ہو جاے

وہ خود برھما ہے ' مخلوق بھی اور مایا بھی —

وہ خود مختلف صورتوں میں اور لا محدود مکان میں جلوہ کر

ہوتا رہتا ہے —

وہ خود سانس ہے، لفظ بھی اور لفظ کا مفہوم بھی وہی ہے۔

وہ خود حد ہے، خودھی لا محدود بھی ہے، اور محدود اور لا محدود کی حدود سے بالا تر بھی ہے۔

وہ خود پاک ہے اور ہر آلائش سے مبرا ہے، وہ برھما اور مخلوق میں سائر و دائر ہے، —

اس سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ بت پرستی نہ صرف بیکار محض ہے، بلکہ خالصتاً مضرت رساں بھی ہے۔ کبیر فرماتے ہیں کہ " اگر پتھر کی مورتیوں کی پرستش در حقیقت خدائے برتر تک پہنچا دیتی تو میں سارے پہاڑ ہی کو پوجنے کے لئے آمادہ ہو جاتا۔ لیکن پتھر کی مورتی سے تو آٹے کی چکی ہی بہتر ہے جو انسان کے لئے آٹا تو پیدا کرتی ہے۔ اس کی پرستش کرنا نرا اندھا پن ہے۔ پروھتوں نے صرف اپنے ذاتی فائدے کے لئے یہ سب رسم و رواج بنا رکھے ہیں۔ ہم سب کا فرض ہے کہ اصلی نام کو جپتے رہیں"۔

اپنے طعنہ آمیز رنگ میں وہ مندروں اور مسجدوں کی مذمت کرتے ہیں " دنیا مندروں کے آگے جھکتی ہے، لیکن فی الحقیقت خدا کے رہنے کی جگہ تو انسان کا دل ہے۔ کیا خدائے تعالیٰ بہرا ہو گیا ہے کہ ملا کو مسجد کے میناروں پر سے چلانے کی ضرورت پڑتی ہے؟ افسوس صد افسوس دنیا کی حماقت پر! جس نے اندھی تقلید کی پیروی کو ذریعۂ نجات سمجھ رکھا ہے"—

" اے قاضی! اب کونسی کتاب کا وعظ تم کہتے ہو۔ تم تو ہر وقت جھگڑتے اور مباحثہ کرتے رہتے ہو۔ تم کو عقل و دانش کی کوئی بات نہیں آتی۔ تم مجھ سے زور یہ اہجے میں ختنہ کرانے کے لئے کہتے ہو۔ مگر بھائی، میں تو اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ اگر یہ ختنہ خدا کی طرف سے ہے تو فطرتاً انسان کیوں ایسا پیدا نہیں ہوتا؟ اگر ختنے کے ذریعے کوئی شخص ترک بن سکتا ہے تو تمہاری عورتوں

کے بارے میں کیا کہا جائیگا ؟ بیوی کو تم آدھا جسم کہتے ہو - تو بوی تم اس کے بعد ہندو ہی رہے - زنار پہننے سے ایک شخص برہمن بن جاتا ہے' لیکن تم نے پہننے کے لئے عورتوں کو کیا چیز دی ہے ؟ عورت تو پیدائش ہی سے شو در ہے" —

"اے پانڈے ! تو کھاتا کیا ہے ؟ ہندو اور ترک ' یہ کہاں سے آے ہیں - یہ راستہ کس نے نکالا ہے ؟ اپنے دل کی تلاشی لو اور اچھی طرح سے تلاشی لو' بہشت کہاں ہے - کس نے اسے حاصل کیا ہے ؟ اے بیوقوف ! ان خالی خولی باتوں کو ترک کر اور رام نام جپ - تم تو بد معاشی کی باتیں کرتے ہو - اے کبیر ! جس نے آخری وقت میں رام کی حفاظت قبول نہ کی وہ سخت گھاٹے میں رہا " —

جانوروں کے بھینٹ چڑھانے یا قربانی دینے کی رسم کی بھی سخت الفاظ میں مذمّت کی گئی ہے :—

" اے بیوقوفو اور جاہلو ! تم راستے سے بھٹک گئے ہو' کیونکہ تمہیں کسی وقت بھی رام کی خبر نہیں ہوتی - تم گاے پر حملہ کرتے ہو اور اس پر ضرب لگاتے ہو اور اس کی جان لینے کے واسطے اس کا گلا کاٹتے ہو - تم زندوں کی جان لینے کے لئے انہیں مردہ بنا دیتے ہو اور سمجھتے ہو کہ تمہاری قربانی اللہ کے لئے ہے - اے بھائی ! یہ گوشت جسے تم مقدس شے جانتے ہو' تمہیں خبر ہے کہ کس چیز سے بنا ہے ؟ گوشت خون اور نطفے سے مرکب ہے ' لہذا جو گوشت تم کھاتے ہو وہ ناپاک ہے - اے بیوقوفو ! تم اس جہالت کا اعتراف نہیں کرتے' بلکہ کہتے ہو کہ تمہارے بزرگ بھی ایسا ہی کرتے تھے - اس کا خون تمہاری گردن پر ہے اور نیز ان پر جنھوں نے تمہیں ایسی تلقین دی- شہاب کے سیاہ بال جاتے رہے ہیں ' لیکن ابھی تک تمہارے دل میں سفیدی نہیں آئی - تمہارے روزے ' تمہاری نمازیں ' اذانیں ' تمہارا چھوٹی کوٹھریوں میں مرنا ' کس کام آئیگا ؟ ان کے وید اور پرانوں کو پنڈت پڑھتے ہیں اور مولوی اپنے قرآن کی تلاوت کرتے ہیں - لیکن کبیر کا کہنا یہ ہے کہ وہ سب دوزخ کا ایندھن بنیں گے جو رام سے ناواقف رہیں گے "—

کبیر کی نظر میں روزے اور حج غیر ضروری ہیں' بلکہ وہ اس زہریلی بیل کی طرح ہیں جو درخت پر پھیل کر درخت کو تباہ و برباد کردیتی ہے۔ اُن پر اعتقاد رکھنا مہلک دھوکا ہے۔ اصلی نام کو یاد رکھو اور گرو کو بھی۔ نیکی جو اپنے دین کے طریق پر کی جاے' بیکار محض ہے —

وہ مقدس جماعتیں جو مختلف قسم کے اوہام باطلہ کی حامی رہی ہیں اور جن میں متعدد افراد کی زندگیاں' شرم ناک رہی ہیں' کبیر کے غصے کا جائز طور پر نشانہ بنیں اور انہوں نے ان پر نہایت شدید نکتہ چینی کی ہے۔ فرماتے ہیں :—

(۱) " ایک گدھا برھمن سے بہتر ہے۔ ایک کتا مورتیوں سے افضل ہے۔ مرغا ملانے سے بہتر ہے اس لئے کہ وہ سوتے ہوے شہر کو جگا دیتا ہے" —

(۲) کل جگ کا برھمن محض مسخرا ہے۔ اسے خیرات مت دو۔ وہ اپنے بال بچوں سمیت سیدھا دوزخ میں جائیگا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ججمانوں کو بھی لے جائیگا " —

اسی طرح جھوٹے گرو کی بھی انہوں نے بہت مذمت کی ہے۔ سخت سے سخت الفاظ بھی اس کی شیطانی سیرت اور اس کے نقصان رساں اثرات کو پورے طور پر ظاہر کرنے سے قاصر رہتے ہیں —

اچھی اور بری صحبت کے مضمون پر کبیر کے بہت سے ارشادات ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں۔ ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں :—

(۱) " اچھی صحبت خوشی پیدا کرتی ہے۔ بری صحبت تکلیف پہنچاتی ہے۔ جاؤ اور جا کر سادھوؤں کی صحبت میں بیٹھو۔

(۲) کبیر کہتا ہے کہ "اچھوں کی صحبت دوسروں کی تکلیف دور کر دیتی ہے"۔

سب اشخاص کی رہنمائی کے لئے؛ خواہ وہ پر وھت ہوں یا مولوی' نو جوان ہوں یا بوڑھے' کبیر نے چند اخلاقی نصائح کئے ہیں جو اپنی رفعت کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ یا مہاتما بدھ' کنفیو شس یا زر تشت کے نصائح سے ملتی جلتی ہیں۔

اور ان میں سے بعض تو ضرب الامثال کے درجے تک پہنچ گئی ہیں :—

(۱) کبیر کا قول ہے کہ "کبھی غرور نہ کرو - موت تم کو بالوں سے پکڑ لیگی - معلوم نہیں کہ وہ کہاں آ جائے ' گھر میں یا باہر" —

(۲) اس دنیا میں آ جانے کے بعد تکبر نہ کرو - لے لو جو کچھ تمہیں لینا ہے - یہ منڈی بند ہو جانے کے قریب ہے" —

(۳) " انسانی زندگی بلبلے کے مانند ہے' وہ صبح کے تاروں کی طرح آناً فاناً غائب ہو جاتی ہے" —

بلا شبہ کبیر کی تعلیمات میں معاشرتی نظام کے بعض پہلوؤں سے بھی بحث کی گئی ہے - ان میں ایک خدا ' اخوت انسانی اور گرو کی اطاعت پر زور دیا گیا ہے - اور یہی تعلیم ذات پات کے اختلافات کا بطلان کرتی ہے - نہ تو خود انھوں نے اور نہ ان کے بعد چیلوں میں سے کسی نے باقاعدہ تنظیم کے ساتھ معاشرتی مصلح کی حیثیت اختیار کرنے کی کوشش کی - عورتوں کی حالت میں کوئی فرق نہیں ہوا - بیواؤں کی ستی کی رسم کی انھوں نے مذمت نہیں کی - صغر سنی کی شادی یا تعدد ازدواج کو جوں کا توں برقرار رکھا' مگر اتنا تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس زمانے کی حالت معاشرتی نظام میں کسی وسیع تغیر کو قبول کرنے کے خلاف تھی —

یہی کبیر کی انتہائی کمزوری ہے - اس کے عملی نتائج یہ ہیں کہ ان کے بہت سے ماننے والے ابھی تک ہندو مذہب پر اعتقاد رکھتے ہیں اور ہندو عبادت اور ظاہری مذہبی رسوم کے بھی ایک حد تک پابند ہیں - ہندو مذہب میں جذب کرنے کی جو حیرت انگیز قابلیت موجود ہے - اسے اس کمزوری سے ایک گونہ طاقت حاصل ہوئی ہے - آج متعدد کبیر پنتھی اپنے باقی ہندو بھائیوں سے بہت زیادہ اختلاف نہیں رکھتے اور وہ کبیر کو ذات اعلیٰ کا اوتار سمجھتے ہیں اور ان کے گرو کو اس دنیا کے خلیفہ کا درجہ دیتے ہیں —

کبیر کو اوتار قرار دینا بطور خود ہندو اثرات کی بین مثال ہے - گرو کی تعظیم ایسے اشخاص کے لئے لازمی تھی جو جھوٹے جھوٹے دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرنے ' بتوں کی تعظیم کرنے ' روزے اور حج (جاترا) کرنے یا روحانی تسلی کے دوسرے ذرائع سے اپنے دلوں کو اطمینان نہ دے سکتے تھے - بہر حال اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اعتقاد میں پکے تھے اور نیز وہ جو ذرا ڈانواڈول رہتے تھے ' سب کے سب ایک ہی حلقے میں جکڑے رہے —

اُردو کے ان پڑھ شاعر

از

(جناب مرزا فداعلی صاحب 'خنجر' لکھنوی)

—— : o : ——

آباد

ان کا نام محمد یعقوب علی خان بن احسان علی خان اور 'آباد' تخلص تھا - مولد و مسکن دھلی - بڑے وجیہ و خوش منظر جوان تھے- 'تاباں' کی طرح دھلی کے کوچہ و بازار میں اِن کے حسن صورت نے شہرت و مقبولیت حاصل کرلی تھی اور اسی حسن و جمال کی بدولت ہر صحبت میں ہاتھوں ہاتھہ لئے جاتے- باوجود اس شکل و شباھت کے اطوار و عادات اچھے نہ تھے - آوارگی پسند خاطر تھی - بد صحبت نے بے اعتدالیوں کی طرف راغب کر رکھا تھا - ابتدائے عمر سے خصلت بگڑ چکی تھی - ھرچند پڑھنے بٹھائے گئے - سر پرستوں نے تعلیم و تربیت میں کدوکاوش کی' لیکن 'آباد' دولت علم سے محروم رھے - مبدء فیاض سے طبیعت موزوں اور ذھن رسا عنایت ھوا تھا - اگرچہ پڑھنا لکھنا نہ آیا' مگر درس گاہ سخن میں داخل ھوکر رشتۂ نظم میں در مضامین پرونے لگے - کلام صاف و بامزہ ھوتا ھے - ثقیل الفاظ بالکل نہیں ھوتے - آخر وقت میں اپنی غلط کاریوں کا احساس ھونے لگا تھا - جب گذشتہ زندگی کا نقشہ سامنے آتا تو نہایت قلق ھوتا' جذبات شاعری میں ھیجانی کیفیت پیدا ھوتی اور وہ اُسی عالم میں اپنی آوارگیوں پر پشیمان

ہوتے ہوے یوں گُل‌فشاں ہوتے :—

ان خراباتیوں کی صحبت نے   تجھکو 'آباد' کیا خراب کیا

'آباد' کے سنہ ولادت و وفات کا پتہ نہیں چلتا' لیکن بعض تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ ع کے غدر میں جوان تھے - اِن کی طبیعت کا اندازہ ان تین اشعار سے محال ہے - پھر بھی کچھہ نہ کچھہ تو طبیعت کی اُفتاد سے اطلاع ہوسکتی ہے —

اُس کی قامت کی یاد میں ہم نے   مصرع سرو انتخاب کیا

تونے دریا میں اک نگاہ کے ساتھہ   قطرۂ آب کو شراب کیا

اِن خراباتیوں کی صحبت نے   تجھکو 'آباد' کیاخراب کیا

آزاد

یہ اُمی شاعر قصبۂ بدایون میں پیدا ہوا' نہایت وارستہ طبیعت و آزاد مزاج تھا - خاندان میں لوہاری کا کام چلا آتا تھا' اسے بھی یہی پیشہ تعلیم کیا گیا - اہل بدایون فطری طور پر شاعری کے دلدادہ ہیں - 'آزاد' کو گاہ گاہ اُن اِہل ذوق کی حضوری کا شرف ملتا رہتا تھا - وہ اُن کے فیضان سخن سے لطف اندوز ہی نہیں ہوا بلکہ طبیعت کے میلان اور موزونی سے شاعر بھی بن گیا - مزاج میں ظرافت کا عنصر بقدر مناسب موجود ہے' جو اشعار میں نمایاں ہوکر پر لطف شیرینی پیداکردیتاہے۔

افسوس! اس ان پڑہ شاعر کے حالات فراہم نہ ہوسکے' نہ کلام ہی زیادہ دستیاب ہوا جو اس کمی کی تلافی میں پیش کیا جاتا - ۱۸ نومبر سنہ ۱۹۲۷ ع ہفتے کو مسلم ہوسٹل الہ آباد میں صحبت مشاعرہ تھی' جس میں بیرونجات کے شعرا بھی شریک ہوے تھے- لکھنؤ سے بھی بعض بعض حضرات تشریف لے گئے تھے - چنانچہ جناب 'آسی' بھی

بغرض شرکت مشاعرہ گئے تھے - وہاں جناب 'قمر' بدایونی سے ملاقات ہوئی اور 'آزاد' کا تذکرہ چھڑا - جناب 'آسی' کی معرفت ہمیں مذکورہ حالات اور ایک شعر دستیاب ہوا :-

'آزاد' کی ہے خانہ بدوشی کا یہ عالم
کاندھے پہ لئے پھرتے ہیں چھپر کئی دن سے

—— : o : ——

احمد

احمد علی نام 'احمد' تخلص - اصل شریف لیکن غربت و نکبت نے ادنی درجے کی ملازمت پر مجبور کیا - چنانچہ 'احمد' کے والد نواب والا قدر وزیر مرزا بہادر مغفور کی ڈیوڑھی پر چوکیداری کی خدمت انجام دیا کئے اور والدہ محل میں خاصہ برداری کے کام پر مامور رهیں - خود 'احمد' کو صغر سنی سے ملازمت کی ضرورت پڑی اور بعض سرکاروں میں شاگرد پیشہ کی حالت میں بسر کی - خدمت گاری کے سلسلے میں هندوستان کے اکثر بڑے بڑے شہروں کی سیر و سیاحت بھی کی، جس سے خاصہ تجربہ حاصل ہوا، آدمی خوش قطع اور زندہ دل ہے - فی الحال کلکتے میں قیام ہے اور خوانچہ لگانے پر بسر اوقات - عادات و اطوار پر بد صحبت نے پورا پورا اثر کیا ہے، منہیات سے پرهیز نہیں، لہو و لعب میں وقت گزرتا ہے - چالیس بیالیس برس کا سن ہے، مگر نشہ کی چیزوں کے استعمال نے صحت کو بگاڑ دیا ہے —

ابتدائے شباب میں شاعری کا شوق ہوا تھا - لکھنا پڑھنا صرف اسی قدر آتا ہے کہ اپنا نام لکھ لیں یا قصہ کہانیاں جو جلی حرفوں میں لکھی ہوں اُنہیں ہجا کرکے گھنٹوں میں دس پانچ لفظیں پڑھ لیں، مگر جوانی کی ولولہ خیز اُمنگوں نے طبیعت میں ابال پیدا کیا اور گاہ گاہ دو چار شعر نظم کرنے لگے -

اُن دنوں مرزا سجاد علی 'دماغ' مرحوم حیات تھے اور 'احمد' اُن کے یہاں ملازمت کرتے تھے - ایک روز ڈرتے ڈرتے 'دماغ' مرحوم کے سامنے اپنی تصنیف کی ہوئی غزل اصلاح کے واسطے پیش کی - 'دماغ' مغفور کو شاعری کا بے حد شوق تھا اور شاعروں کی کمال عزت کرتے تھے - 'احمد' کو فن سخن کی جانب مائل دیکھا تو خوش ہوے اور ان پر خاص عنایت فرمانے لگے - حوصلہ افزائی کے خیال سے اصلاح کلام قبول کی اور غزلوں کو بنانے لگے' جن میں کی اکثر غزلیں اس زمانے کے رسالوں میں شائع ہوا کیں - ترتیب تذکرہ کے وقت رسالۂ 'پیام یار' میں ایک غزل مل گئی جو درج کی جاتی ہے :-

عارض یار پہ کاکل نہیں لہرائی ہے
صبح سے رات گلے ملنے کو یہ آئی ہے

دامِ اُلفت میں اُسی دن سے مرا دل ہے اسیر
خواب میں جب سے تری زلف نظر آئی ہے

مژدہ اے بادہ کشو! خوب کرو مے نوشی
ٹھنڈی ٹھنڈی ہے ہوا اور گھٹا چھائی ہے

اب تو بچتی نہیں سمجھو توبہ شکن کی توبہ
خوب اُٹھی ہے گھٹا' خوب گھٹا چھائی ہے

کون مارا گیا ناکام تمنا یا رب!
کیوں یہ روتی ہوئی مقتل سے قضا آئی ہے

کون غمخوار ہے میرا شب فرقت 'احمد'
ہمنشیں ایک فقط گوشۂ تنہائی ہے

—— : o : ——

اُمراؤ علی

منشی امراؤ علی خان نام اور 'امراؤ علی' تخلص تھا - کویل کے رھنے والے تھے- کھیل کود کی وجہ سے امی محض رھے' لیکن بلا کی طبیعت پائی تھی' خصوصاً قوت لسانی بہت بڑھی چڑھی تھی - گفتگو میں بند ھو نا تو آتا ھی نہ تھا - ھرموضوع پر تقریر کرنے کو آمادہ ھو جاتے اور اس بے تکلفی سے بحث کرتے گویا پوری معلومات حاصل ھے - ان کی اس خصوصیت پر عام تذکرہ نویسوں کا اتفاق ھے' چنانچہ مولوی عبد الغفور' نساخ' اپنے تذکرے میں تحریر فرماتے ھیں:

> " امراؤ علی خان' ساکن کویل مقیم اکبر آباد ھر چند
> حرف نا آشنا تھا' مگر بڑا ذھین و ذکی تھا - ستر برس
> کی عمر میں انتقال کیا "—

صاحب خمخانۂ جاوید اس عبارت میں ان الفاظ کے اضافے کے ساتھ رقم طراز ھیں:

> " چرب زبان ایسے تھے کہ حریفوں کو سامنے بولنے کی
> مجال نہ ھوتی' اگرچہ امی تھے لیکن قوت بیانیہ' ذھن رسا
> اور تیزی حافظہ کی بدولت کاملوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھتے
> اور کسی سے بند نہ ھوتے " الخ —

مختلف زبانوں کے اکثر بلکہ ھزار ھا الفاظ از بر تھے' اردو فارسی کے علاوہ انگریزی' فرانسیسی' اور ترکی زبانوں کی لفظوں کے بھی حافظ و ماھر تھے' جنھیں دوران گفتگو میں بے تکلف استعمال کر کے سامعین کے قلوب میں اپنی وجاھت معلومات راسخ کر دیتے - آگرے میں زیادہ تر قیام رھتا' سنہ ۱۸۵۷ ع کے غدر سے پہلے ستر برس کی عمر پا کر انتقال کیا - منشی کہنے سے بہت خوش ھوتے تھے' اس لئے ان کے احباب نام کے ساتھ لفظ منشی ضرور استعمال کرتے' تذکروں میں صرف

دو شعر ان کے نام سے دیکھے گئے:-

نزع میں دیکھا تو بولے ضعف آیا ہے اسے

مرگ تک ہم سے رہیں کافر کی تھتے بازیاں

دو پھول گر کسی نے چڑھائے اُڑا دیے

باد صبا کو گور غریباں سے لاگ ہے

—— : o : ——

اُمی

روشن بیگ نام، اُمی تخلص - حمیدالدولہ کے بھائی تھے، جو ابوظفر آخری تاجدار دہلی کی سرکار میں بزمانۂ ولیعہدی داروغہ و منصرم تھے - خاک پاک دہلی سے خمیر ہوے اور وہیں تیرھویں صدی ھجری میں پیوند زمین ہو گئے - اکتساب علوم کی جانب بالکل توجہ نہ تھی، مدرسے میں کھیل کود کا شوق رہا - استاد سے جو کچھہ پڑھا اسے طاق نسیاں پر دھرتے گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم سے بالکل کورے رہے، منتہائے جہالت یہ ہے کہ اپنا نام بھی لکھنے سے معذور تھے، مگر مبدء فیاض نے قیامت کی ذہانت اور بلا کا حافظہ عطا کیا تھا - جس واقعے کو ذہن میں محفوظ کیا، ساری عمر فراموش نہ ہوا - اُن دنوں شاعری کا عروج تھا اچھے اچھے شاعر پیدا ہو رہے تھے، شاہ نصیر کا طوطی بول رہا تھا، اور اردو زبان ان کی گود میں پرورش پارہی تھی - شائقین سخن ان کے روز مرہ، صفائی بندش، حسن ادا، لطافت مضامین اور پاکیزگی تخیل پر سر دھن رہے تھے - شیخ ابراھیم ذوق، (جو بعد کو " خاقانی ہند " کے خطاب سے سر فراز ہوے) حکیم مومن خان، مومن، میر حسین

'تسکین' سے خوش فکر و خوش گو ہونہار شعرا ان کی شاگردی کا دم بھرتے تھے۔ اسی کا عنفوان شباب تھا۔ جذبات کی فراوانی، اُمنگوں کی کثرت نے فن لطیفہ گوئی (شاعری) کی جانب متوجہ کیا۔ استعداد علم تو تھی ہی نہیں، فطری لگاؤ خضر راہ بنا۔ رسائی ذہن اور موزونی طبیعت کی بدولت کچھ کچھ نظم کرنا شروع کیا۔ شرفائے دہلی کی صحبت وہم نشینی نے مذاق سلیم اور ذوق صحیح پیدا کردیا۔ ابتداءً جو کچھ کہا، حلقۂ احباب میں پڑھ کر سنایا۔ اہل دہلی کا تمام تر رجحان صفائی بندش اور لطف زبان کی طرف تھا۔ اُسی کے کلام میں ان چیزوں کی کمی نہ تھی، ایک ایک شعر معاملہ بندی کا دفتر اور لطف روز مرہ کا منبع ہو رہا تھا۔ داد ملی اور امید سے زیادہ ملی۔ اب کیا تھا؛ ذوق سخن دونا ہو گیا، طبیعت نے دریا کی سی روانی اختیار کی، روز ایک دو غزلیں تصنیف ہونے لگیں۔ قدما کا کلام از بر تھا، موجودہ شاعروں کی غزل سرائیاں سننے میں آ رہی تھیں، مشاعروں میں ایک سے ایک زیادہ لطیف شعر سامعہ نواز ہوتا اور اُسی کی معلومات کا ذخیرہ بڑھتا جاتا۔ طبیعت موزوں ہو تو عروض کی چنداں ضرورت نہیں پڑتی، جذبات قلبی خود بخود نظم کے سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔

شعر می گویم بہ از قند و نبات
من نہ دانم فا علاتن فاعلات (مولانا رومی)

الغرض اُسی کا میلان طبیعت اُن کو اُس طرف لے چلا، جدھر اُس زمانے کے شرفا نہایت سرعت و تیزی سے گام زن تھے۔ چونکہ راہ سے نا بلد، رستہ ناہموار، ذرا سی لغزش میں منہ کے بل گر پڑنے کا اندیشہ، اِس لئے ایک راہبر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جب تک کہ اُستاد فن نکات شعر نہ سمجھائے، اُسی کے سے آدمی کے لیے اُن کا سمجھ لینا محال تھا۔ اُن دنوں عام خیالات شاہ 'نصیر' کی شاعری میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اُسی بھی اس اثر سے محفوظ نہ تھے۔ نصیر کی شیوہ بیانی،

دل میں گھر کر چکی تھی - یہی عقیدت وارادت محرک ہوی اور یہ ایک روز اُن کی خدمت میں جا پہنچے ' موقعہ و محل سے اپنا عندیہ ظاہر کیا ' شاہ نصیر بہت ہی خلیق تھے ' کسی کی درخواست مسترد کرنا تو جانتے ہی نہ تھے - راضی تو ہوے لیکن اُمی کی جہالت کا تصور کر کے متفکر ہو گئے - گویا وہ شخص جس کو فن شہسواری سے کوئی علاقہ نہ ہو' منہ زور گھوڑے پر سوار ہو کر فنون سپہ گری اور چوگان بازی دکھانے کا خواستگار ہے - امتحاناً چند اشعار سنانے کا حکم دیا - اُمی نے تعمیل ارشاد کی - شعر سنے تو حیران رہ گئے ' بہت خوش ہوے ' اُسی وقت غزل کو اصلاح دے کر حسن صوری و معنوی سے آراستہ و مزین کردیا —

اُس روز سے اُمی بھی حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے - اُستاد شفیق کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہو کر داد سخن دینے لگے- روز مرہ اور معاملہ بندی ان کے کلام کی جان ہے - ثقیل الفاظ سے قطعاً احتراز کرتے ہیں - بعض اشعار سے جہالت ولا علمی اپنی جھلک دکھاتی ہے - باوجود اغلاط کی موجودگی کے بھی ایسے شاعر کو اُس کی طبع خدا ساز کی جو لانیوں کی داد نہ دنیا غضب ہے ' افسوس ! اُمی مرحوم کا کلام دستیاب نہیں ہوتا - تذکروں کی ورق گردانی اور چھان بین کرنے سے جو اشعار فراہم ہوے' نذر نگاہ شائقین کئے جاتے ہیں :

جہاں زنجیر ہم سنتے ہیں' منگوا مول لیتے ہیں

تری زلفوں کے سودے میں یہ سودا مول لیتے ہیں

جی دھڑکتا ہے کہ پہنچے میں نہ آ جاے لچک

ہاتھ سے چھوڑ دیا میں نے ترا جان کے ہاتھ

گرمی مے سے زباں پر آبلے پڑتے ہیں کیا

اے مغاں ! اس میں مغیلاں کی بھی پڑتی چھال ہے

امیر

میر امیر علی نام امیرؔ تخلص شاہجہاں آباد کے باشندے اور میر مؤمن علی کے فرزند تھے، جو دہلی کے متوسط الحال شرفا میں شمار کئے جاتے تھے اور اُمرائے شہر کی سرکاروں میں ملازمت کرکے کسب معاش کرتے تھے۔ زمانے کو شرفا سے بیر ہے، اکثر خاندان اس جفا پیشہ کی ستمرانیوں سے مغلوب ہوکر دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوے۔ بہتوں نے خستہ حالی اور درماندگی میں عمریں بسر کردیں، لیکن غیرت و حمیت ذاتی نے کسی ایسے فعل کی اجازت نہ دی جو اُن کے دامن خودداری پر بدنما دھبا بن کر نمودار ہوتا —

میر مومن علی کے ساتھ بھی زمانے نے وہی سلوک کیا، جو اور شرفا کے ساتھ کرتا آیا ہے۔ ہمیشہ تنگ دستی اور نکبت و افلاس میں بسر ہوئی، یہی سبب تھا کہ ہونہار فرزند میر امیر علی 'امیر' کو تعلیم نہ دلواسکے، رسم مروجہ کے موافق مسجد میں بیٹھ کر درس و تدریس کرنے والوں میں سے کسی ملّا کے حوالے کردیا، جہاں غریب امیر کو علم حاصل ہونے کے بدلے خدمت گاروں کی طرح سودا سلف خریدنے کی کافی مہارت ہو گئی —

بے چارے مدرسے سے نکلے تو بالکل ویسے ہی تھے جیسے داخل ہوے تھے۔ ملا صاحب کے فیض تربیت نے علمی مفاد سے کلیتاً بے نیاز رکھا۔ اور تو اور اتنا بھی نہ ہوسکا جو ضرورت کے وقت اپنا نام لکھ سکتے —

تحصیل علم کا زمانہ تو ملا صاحب کی خدمت گذاری میں بسر ہوا۔ اُس کے بعد وہ فصل شروع ہوئی جو جوانی دِوانی کے نام سے مشہور ہے۔ جذبات نوجوانوں کو اکثر غلط راستوں پر لگا دیتے ہیں۔ لیکن امیر کے حصے میں وراثتاً شرافت آئی تھی۔ جوان ہوتے ہی علما و صلحا کی صحبت اختیار کی، ہر چند خود تو پڑھے لکھے نہ تھے مگر اُن کے عالمانہ مکالمے سن سن کے اچھی معلومات بہم پہنچالی۔ اس صحبت

نے ایک طرف اخلاق و عادات کی درستی کی تو دوسری جانب جلاے ذہنی کا کام کیا۔ انجام یہ ہوا کہ فن تقریر و خطابت میں دخل ہوگیا - باوجود جہالت کے جس موضوع پر زبان کھولتے بے تکلف بولتے چلے جاتے' کسی مقام پر عجز طبیعت ظاہر نہ ہوتا - اکثر تاریخی افسانے از بر تھے' جنھیں محل و موقع سے بیان کرکے سامعین کے قلوب کو محظوظ و مسرور کرتے - اسی کمال کی بدولت 'امیر' سوسائٹی کی جان تصور ہونے لگے - اُمرا کی دل چسپ و باکیف صحبتیں اُن کی خوش گفتاریوں اور بذلہ سنجیوں سے صحن گلزار بن گئیں' جہاں ترانۂ بلبل اور صوت ہزار کی سی کیفیت طاری رہتی۔ ہرچند اور لوگ علم مجلس سے اطلاع رکھتے تھے' لیکن امیر کی خصوصیت جہل نے اُنھیں ہم عصروں پر فوقیت عطا کردی تھی - جو اُن کی تقریریں اور شیوہ بیانی سنتا حیران و ششدر رہ جاتا - چوں کہ شعر و سخن کا بازار گرم تھا کوئی صحبت' کوئی مجلس اس ذکر' اس فکر سے خالی نہ تھی' ادنیٰ و اعلیٰ برنا و پیر بادۂ سخن کے متوالے ہورہے تھے - شاعری کے بغیر کسی کی دل چسپی ہی نہ ہوتی۔ خصوصاً 'امیر' سے شخص کو' جسے اپنی تقریر دل چسپ و دل پذیر بنانے کے لئے جابجا اشعار کی آمیزش سے رنگینی پیدا کرنے کی ضرورت تھی —

آخرالامر یہ ضرورت محرک سخن سرائی ہوی - خزانۂ قدرت سے طبع موزوں اور ذہن رسا لائے تھے ' اُس پر سخن سنجان دہلی کا فیض صحبت سونے پر سہاگا ہوگیا - شعر گوئی کا سلسلہ شروع ہوا - ذوق صحیح نے رہبری کی' فکر بلند نے ہاتھ تھاما اور 'امیر' شاعر بن گئے - طبیعت نزاکت پسند واقع ہوی تھی' طائر خیال نے فضاے بسیط میں پرواز شروع کی - سامنے کے مضامین پسند نہ آے ' نازک و لطیف خیالات کو لفظوں کے رنگ و روغن سے رنگ رنگ کر مرقعے تیار کئے' مگر کم استعدادی نے جوہر کمال پر پردہ ڈالا - جو مضامین بلند خاطر نشین ہوتے ' اُنھیں الفاظ نہ ملنے سے حسب دل خواہ اور بعنوان احسن نظم نہ کرسکتے - بعض مقامات پر بندش کی سستی پھیکاپن ظاہر کرکے لطف شعر کو گھٹا دیتی'

جو محض کم علمی کا باعث ہے - لیکن ان خامیوں کی وجہ سے ان کا مرتبۂ شاعری پست نہیں ہوسکتا، کیوں کہ وہ معذور تصور کئے جانے کے قابل ہیں - اُنھیں پڑھے لکھے شعرا کی طرح علم سے بہرہ نہ تھا، جو قدما کے دواوین کا مطالعہ کرکے معلومات شعری میں اضافہ کرتے، یا تاریخ و سیر کی بدولت معلومات کے دائرے کو وسعت دیتے- اُن کے علم کی ساری کائنات وہ سنی سنائی روایتیں تھیں، جن میں واقعیت کا عنصر خفیف اور مبالغے کی بھر مار تھی - پھر بھی آفریں ہے اُس طبیعت پر جس نے باوجود عجز علمی ادب اُردو کی خدمت کی —

'امیر' کو فن سخن میں حکیم عزت اللہ 'عشق' سے استفادہ حاصل تھا- جو کچھ کہتے اُسے 'عشق' کی اصلاح سے مزین کرلیتے - مشاعروں میں شریک ہوتے اور حافظے کی مدد سے کلام سناکر شرکاے بزم کو لطف اندوز کرتے - دہلی ہی میں انتقال کیا، جس ارض پاک سے اُٹھے تھے اُسی خطے میں زمین کا پیوند ہوگئے - تذکروں نے کچھ حالات تو بتاے مگر کلام بہت کم نقل کیا، صرف چار شعر ملے جو درج ہوے :

ہم کو حاصل کیونکہ ہو تیرے قد زیبا کی سیر
کب میسر ہوسکے ہے عالم بالا کی سیر

سبزہ رنگوں پہ زہر کھا کے موا   کوئی دیکھے تو اس 'امیر' کا دل

خوب دیکھا ہے ہم نے خوباں کو   پھول خوش رنگ ہیں پہ باس نہیں
بولا وہ دیکھ کر 'امیر' کا حال   اس کے جینے کی اب تو آس نہیں

— : o : —

بدتر

شیخ بلاقی نام 'بدتر' تخلص' باشندۂ لکھنؤ - سبزی فروش تھا - موزوں طبع'

لطیفہ گو، زندہ دل اور حاضر جواب - امیروں، رئیسوں کو مزیدار باتوں، دلچسپ لطیفوں کے اثر سے اپنی جانب متوجہ کرلینے میں کمال رکھتا تھا - آم اور خربزے کی فروخت پر معاش کا دارومدار تھا - خربوزوں کی فصل میں خربوزے اور آم کی فصل میں قلمی اور تخمی آموں کی ڈالیاں لگاکر امیروں اور نوابوں کی ڈیوڑھیوں پر حاضر ہوتا - کچھ اچھے دار باتوں، کچھ اپنے تصنیف کئے ہوے شعروں اور غزلوں کو سنا سنا کر خوش کرتا اور سودا بیچتا - وہ شاعری کے ذوق اور لطیفہ گوئی کی وجہ سے منہہ لگا کر بات کرتے اور خاطر خواہ قیمت دے کر پھل خرید لیتے - دونوں فصلوں میں اتنی یافت ہوجاتی کہ میاں 'بدتر' کو ترکاری کا کاروبار کرنے کی ضرورت نہ پڑتی اور سال بھر فراغت سے بیٹھہ کر شعر شاعری میں بسر کرتے -

اس کا جہل اس حد پر تھا کہ تلفظ بھی صحیح نہ تھا، (ش) کو (س) اور (ق) کو (ک) سے بدل کر استعمال کرتا لیکن طبیعت کی موزونی اور ذہن کی رسائی نے ناظم بنادیا - مشاعروں میں غزل پڑھنے کا شوق بالکل نہ تھا - ایک بات یہ بھی تھی کہ ادنیٰ پیشہ ور ہونے کی وجہ سے شعرائے وقت اپنے ساتھہ بٹھانا مناسب نہ سمجھتے تھے - 'بد تر' کسی کا شاگرد نہ تھا، جو وقت پر مل گیا، غزل بنوالی اور جہاں گیا بے تکلف اشعار سنا آیا - ایک مرتبہ 'مرزا بہادر' مرزا محمد عباس علی خاں 'جگر' مرحوم رئیس لکھنؤ کے حضور میں حاضر تھا - ٹوکرے میں قلمی آم چنے ہوے سامنے رکھے تھے اور پائین فرش بیٹھا ہوا لطائف و ظرائف بیان کررہا تھا - مرزا بہادر اور اہل صحبت 'بدتر' کی دل چسپ باتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے - 'جگر' مرحوم کبھی کبھی مسکرا دیتے تھے اور بیچ بیچ میں اس کی طبیعت داری کے متعلق کوئی گرما گرم فقرہ بھی چھوڑتے جاتے تھے - جسے سن کر وہ نہایت عجز و انکسار کے ساتھہ عرض کرتا "شاعری کیا کرتا ہوں، آم بیچنے کا ڈھنگ نکالا ہے - خدا کی عنایت اور سرکاروں کی بدولت ان دو فصلوں میں سال بھر کے لئے آسودہ

ہوجاتا ہوں'' - ایک دعائیہ شعر بھی تصنیف کیا تھا جو ایسے موقعوں پر پڑھا کرتا تھا :

تم سلامت رھو اے آم کے کھانے والو!
ھم تو دن رات یہي دل سے دعا کرتےھیں

شاید اس زمین میں 'بدتر' نے پوری غزل تصنیف کی توی لیکن حافظے کی بیاض میں کوئی شعر محفوظ نہیں رہا ' یہ شعر مشہور ہو چکا تھا جو ضبط تحریر میں آیا—

بڑا منکسر تھا ' رئیسوں کے منھہ چڑھنے کے زعم میں خودکو نہ بھولا' جہاں جہاں جاتا وھاں کے عملے سے بعجز و مراعات پیش آتا - ایک دفعہ کسی نے مزاح کی راہ سے 'بدتر' تخلص اختیار کرنے کا باعث دریافت کیا تو جواب دیا ''میاں! پڑھا نہ لکھا قوم کا کبڑیا بھی کہیں شاعری کر سکتا ھے ؟ خدا کی قدرت اور لکھنو کی ھوا کا اثر ھے جو کچھہ اوقت پٹانگ بک لیتا ھوں ' جیسا کلام ویسا تخلص ' سچ یہ ھے کہ دنیا بھر کے شاعر خوشتر اور بلاقی بدتر ھے'' —

ایک روز برسبیل تذکرہ بیان کیا کہ " مجھے دلی جانے کا اتفاق ھوا - وھاں کے لوگوں کي خدمت میں حاضر ھوا - شاعري کا ذکر چلا - اُن حضرات کے اشعار سنے' اپنا بکا ھوا گزارش کیا - سب خوش ھوے - تعریفوں سے حوصلہ افزائی فرمائی - ایک صاحب ظریف الطبع بھي تشریف فرما تھے ' میرے چھیڑنے کو یہ شعر موزوں کر کے پڑھا :—

ھمں دلی والے ' لکھنؤ والوں کے سامنے
ھو جیسے کوئی شیر غزالوں کے سامنے

مجھے یہ مذاق پسند نہ آیا - لکھنؤ والوں کو غزال کہہ کر شیران دھلی کا شکار بنایا گیا تھا - سر جھکا کر جواب دینے کی فکر کرنے لگا - فوراً مصرع ذھن میں آیا اور میں نے سر اُٹھا کر دست بستہ التماس کی حضور! میں نے اس شعر کو پہلے بھی سنا ھے - لیکن دوسرے مصرع کی ترکیب بدلی ہو ئي ھے' اجازت ھوتو عرض

کروں ؟ " انھوں نے فرمایا : پڑھو - میں نے پڑھا :

ھیں دلی والے لکھنؤ والوں کے سامنے

ھو جیسے کیچوا کوئی کالوں کے سامنے

اور ھاتھہ جوڑ کر گزارش کی : " سرکار ! آپ لوگ بڑے آدمی ھیں' بندوق سے شیروں بھیڑیوں کا شکار کر سکتے ھیں ' شجاعت و دلیری آپ کی میراث ھے ' میں تکے کا کبڑیا' اتنا دل گردہ کہاں سے لاؤں جو ان خونخوار درندوں سے مقابلہ کروں - میری زندگی تو کھیتوں میں گذری ھے اُن کی مینڈوں پر برسات کی فصل میں اسی قسم کے کیڑے مکوڑوں کو رینگتے دیکھا ھے اور انھیں کو جانتا پہچانتا ھوں-

'بدتر' کو لکھنؤ سے دلی محبت تھی' یہاں کے شعرا کو دنیا بھر کے شاعروں سے بہتر سمجھتا تھا - اسے دھلی و لکھنؤ کے مناقشے و مناظرے بہت زیادہ متأثر کرتے- ان موقعوں پر جہاں تک زبان کو یارا ھوتا وہ اپنی عقل و بساط کے موافق اھل لکھنؤ کی فضلیت ثابت کرتا اور صفت و ثنا بیان کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا - اس کے مزاج میں پر لطف شوخیاں تھیں' کوئی بات ظرافت سے خالی نہ جاتی- اکثر ستم ظریف حضرات 'بدتر' کو چھیڑنے کی نیت سے شعرائے دھلی کا چرچا کرتے ھوے اُن کی فضیلت و فوقیت ثابت کرتے' جس سے بگڑے دل امی شاعر چراغ پا ھو کر الٹی سیدھی تقریر شروع کر دیتا - مگر اتنا ضرور تھا کہ اشتعال کے وقت بھی مخاطب کا ادب و حفظ مراتب فرو گزاشت نہ کرتا —

اخیر عمر میں مرض ضیق النفس میں مبتلا ھو گیا تھا' جس سے نہایت پریشان رھا کرتا - ابتدا سے اکہرے ھاتھہ پاؤں کا آدمی تھا ' اس مرض نے گھلا گھلا کر ھڈیوں کا ڈھانچا کر دیا تھا ' چند سال ھوے (سنہ ۱۹۲۲ ع) کے کچھہ قبل یا بعد فوت ھوا - اپنی یادگار ایک لڑکا چھوڑا ' جو فی الحال کانپور میں اپنا پیشہ کرتا ھے- اس کا کلام تو زیادہ تھا' لیکن وارستہ مزاجی کی بدولت سب ضائع ھو گیا ' چند شعر جو بعض حضرات کے حافظے میں موجود تھے' دریافت کر کے تذکرے میں

تحریر کیے جاتے ہیں۔ ان سے میاں ' بدتر ' کی طبع موزوں کا کچھ حال معلوم ہو سکتا ہے —

تڑپتا ہوں درد جدائی سے کیوں کر
اُدھر جانے والے اِدھر دیکھ لینا
جو سچ مچ ہے یہ عشق صادق ہمارا
تو خود ہوگا تم کو اثر دیکھ لینا

مر گیا وہ اس تمنا میں   نہ سنا تم نے حال " بدتر " کا

وصل سے کردیا انکار ' یہ کیا تم نے کیا
دیکھو ! اک بات میں بس ٹوٹ گیا دل میرا

ڈسا اُس زلف کی ناگن کا بچتا ہے کہیں 'بدتر'
مرے جینے کی' چارہ ساز کیوں تدبیر کرتے ہیں

تم سلامت رہو اے آم کے کھانے والو!
ہم تو دن رات یہی دل سے دعا کرتے ہیں

وفا داری میں کاٹی زندگی' اُس کی سزا یہ ہے
ہماری لاش کو بھی کو بکو تشہیر کرتے ہو

اُس کی آنکھوں میں کب حیا آئی   جان لینے کو یہ ادا آئی
جب سے اُس شوخ کا شباب آیا   دل بیتاب کی قضا آئی

نہیں معلوم ہنسنے والوں کو روںے والوں پہ کیا گذرتی ہے
صاف آتی ہے تیری زلف کی بو جب اِدھر سے صبا گذرتی ہے

—— :o: ——

بشیر

محمد بشیر خاں نام ''بشیر'' تخلص' رام پور کے رہنے والے اور خمخانۂ جاوید جلد اول کی ترتیب کے وقت ساٹھ باسٹھ برس کے تھے - سپاہیانہ وضع کے دل دادہ اور خوش باش آدمی ' شاعری کا کمال شوق تھا - ابتدائے عمر سے لیلائے سخن پر دل نثار کر چکے تھے - خیر سے تحصیل علم کی جانب میلان طبع نہ ہوا' لیکن فنون شناوری و کُشتی میں کافی مہارت حاصل کر لی - شعر و سخن سے مناسبت رکھتے تھے۔ ساتھ ساتھ مشق شاعری بھی جاری رہی - نواب فصیح الملک ' داغ ' جیسے معاملہ رس و شوخ طبع شاعر کے حضور میں زانوے شاگردی تہ کیا ' فکر رسا اور تیس بتیس برس کی متواتر و مسلسل مشق نے معقول استعداد شعر گوئی پیدا کر دی - واردات قلبیہ اور معاملہ بڑی صفائی سے نظم کرتے ہیں - بیان کی روانی اور کلام کی سلاست پر نظر ڈالنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کسی ان پڑھ کے اشعار ہیں - بقول لالہ سری رام مؤلف ہزار داستاں :-

" پڑھا ہر الف کے نام بے نہیں جانتے مگر مبدء فیاض نے
اس فن میں خاصہ حصہ دیا ہے - شعر اچھا کہہ لیتے ہیں اور
یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کسی ان پڑھ کا کلام ہے " —

جن دنوں داغ ' مرحوم ' سرکار رام پور میں اپنے زمزموں سے اہل دربار کو مسرور کر رہے تھے ' ' بشیر ' کا عالم شباب تھا - ہمہ وقت استاد کی حضوری کے شرف نے آئینۂ طبیعت پر صیقل کر دی تھی ' تیغ زباں کے جوہر اُبھرنے لگے تھے '

بالمرہ ایک دو غزلیں تصنیف ہو کر شفیق استاد کے ملاحظے میں پیش ہوا کرتیں۔ حضرت 'داغ' بھی اپنے اس اُمی شاگرد کے حال پر خاص عنایت و توجہ فرما تے اور غزلوں کو زیور اصلاح سے مزین کر تے وقت پورا لحاظ کر تے —

جہاں یہ سب تھا، وہاں بڑی قباحت یہ بھی تھی کہ 'بشیر' معیشت کی جانب سے مطمئن نہ تھے۔ اکثر بے روزگاری کی وجہ سے پریشاں خاطر رہا کر تے' شاعری کے لئے جس فراغت و سکون قلب و دماغ کی ضرورت ہے' وہ اُنھیں میسر نہ تھا۔ آخر انھیں مصیبتوں سے تنگ ہو کر حیدرآباد چلے گئے اور وہیں کسی رئیس کی ملازمت اختیار کر کے کچھ نہ کچھ مطمئن ہو گئے۔ کلام یہ ہے :

گردش چشم سے کب یہ دل مضطر پھر تا
بت وفا کر تے تو اِن سے کوئی کافر پھر تا
یہ اگاوت' یہ کر شمے جو نہ ہوتے تجھ میں
اے صنم کہہ تو خدا سے کوئی کیو نکر پھر تا

نقد دل میں نے چھپایا تو برائی کیا کی
کوئی رکھتا نہیں دولت کو تونگر باہر

اُن کا وہ ناز سے کہنا کہ " عبث رو رو کر
پانی کر نا تمھیں خوب اپنا لہو آ تا ہے"
دھوم رندوں میں ہے' مجلس سے نکل کر واعظ
آج میخانے میں کر نے کو وضو آ تا ہے

تنہا لحد میں چھوڑ گئے آج وہ رفیق
ہوتے نہ تھے جو مجھ سے گھڑی بھر جدا کبھی

وہ چیز تھی شراب کہ اس پر جہان میں
سب فاتحہ دلاتے جو ہوتی روا کبھی

تیغ قاتل پر گلو مقتل میں رکھہ دیں بڑہ کے خود
کر دکھائیں آج ہم بھی جو ہمارے دل میں ہے

بتوں کو بے وفا تونے بنایا، کیا وفا کم تھی
کمی کس کی تھی، کیا شے تیرے گھر میں اے خدا کم تھی
نگاہ غور سے دیکھا تو وہ دونوں برابر تھیں
نہ فرقت تھی قضا سے کم، نہ فرقت سے قضا کم تھی
بنایا آسماں بھی اور اک بھر ستم تونے
الٰہی! تیرے بندوں پر بتوں کی کیا جفا کم تھی

—— : o : ——

بنیاد

اِن کا نام شیخ بنیاد علی اور ' بنیاد ' تخلص ہے۔ شیخ صدیقی- قصبۂ اُلدن ضلع میرٹھہ کے باشندے اور ایک معزز خاندان کے رکن تھے - سارے قصبے میں ان کا گھرانا عزت و وقار کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور زمینداری پر بسر ہوتی تھی - ' بنیاد ' اگلی وضع کے پابند' خلیق' متواضع اور بڑے ہی نیک مزاج واقع ہوے تھے - انھیں میرے دوست مولوی عبدالباری ' آسی' کی ہم وطنی اور قرابت کا شرف حاصل تھا - طبیعت تیز اور فکر رسا پائی تھی - قصبۂ اُلدن جس کی زمین مردم خیزی کے لئے مشہور ہے' اُسی شاعر بھی پیدا کرنے سے عاری

نہ رھی اور ' بنیاد ' جیسی ذھین شخصیت پیدا کی' جس نے بے علمی کے عالم میں اپنی نظمیں الاپ کر اھل قصبہ کو صرف محظوظ ھی نہیں بلکہ حیران و ششدر بنا دیا - چوں کہ اُلدن ' میرٹھ اور دھلی سے قریب تر واقع ھوا ھے - اس لئے ان ھر دو مقامات کی شاعری سے متأثر ھونا بعید نہ تھا - اچھا خاصا اثر ھوا ' اُس کی خاک نے اچھے اچھے ادیب و شاعر پیدا کئے —

' بنیاد ' کو جب گھر کے دھندوں اور زمینداری کے مشغلوں سے نجات ھوتی تو اھل برادری کی صحبت میں جا بیٹھتے اور اُن مجلسوں کے علمی و ادبی چرچے اُن کی ذھانت و طباعی پر جلا کرتے - جب ذی اختیار ھوے تو شباب کے جوش اور ولولے نے غلط راستے پر لگا دیا - زندگی کے بیش قیمت اوقات لہوولعب میں ضائع ھونے لگے " بد کام کا بد انجام " مثل مشہور ھے ' انجام کار آبائی زمینداری تلف ھو گئی اور شیخ ' بنیاد ' کی شخصیت بہ اعتبار دولت و ثروت ادنیٰ حالت پر پہنچ گئی - ادھر خانگی جھگڑوں اور باھمی مناقشوں نے عاجز و پریشان کرنا شروع کیا - خود ' بنیاد ' کے صاحبزادے مخالفت پر کمر بستہ ھوگئے اور شیخ صاحب کو صدمات و آلام روحانی میں مبتلا ھونا پڑا - مصیبت کی گھڑیوں میں جب جذبات و حسیات میں ھیجانی کیفیت پیدا ھوتی ھے تو قدرتاً طبیعت کا رجحان شاعری کی طرف ھو جاتا ھے - جوانی کا زمانہ ختم کرنے کے بعد ابتداے شیب میں ' بنیاد' کو شوق شاعری دامن گیر ھوا' چوں کہ " آلا کے راگ " سننے کا بہت شوق تھا اس لئے پہلے پہل اُسی قماش کے دوھے منظوم کئے - خود تو ایک حرف بھی لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے جو کچھ کہتے دوسروں سے لکھوالیا کرتے - شوق کی ابتدا تھی' طبیعت ھر وقت حاضر رھتی - عالم شباب کی گرم جوشیاں تو سرد پڑ چکی تھیں ' غارت گرو تباہ کن اشغال کا سلسلہ بالکل قطع ھو گیا تھا ' اب یا تو خانگی کام کاج دل بہلانے کا ذریعہ تھے یا ایلاے سخن مونس ود مساز زندگی تھی - تھوڑے ھی دنوں میں دوھوں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ھو گیا - اُس زمانے میں

'آسی' نو عمر تھے لیکن شاعری کا آغاز ہو چکا تھا - شعر و سخن کی بساط بچھی تھی اور مضامین تازہ بتازہ کی چالیں چلی جا رہی تھیں۔ بنیاد کو 'آسی' سے بزرگانہ محبت تھی اکثر اُن کے یہاں نشست رکھتے ' اپنے دوہے سناتے اور اُن کے اشعار سنتے۔ لطف یہ کہ ان موقعوں پر خوردی و بزرگی کا امتیاز بالاے طاق رکھ کر بے تکلف دوست کی طرح داد کلام دیتے اور نذرانۂ تحسین قبول فرماتے۔ اگرچہ 'بنیاد' سن و سال میں حضرت 'آسی' سے بہت بڑے تھے لیکن شوق سخن ساتھ ساتھ شروع ہوا تھا - درمیان سے تکلفات کا پردہ اٹھا دیا تھا - اس نشست و برخاست کا یہ نتیجہ نکلا کہ 'بنیاد' کی طبیعت نے پلٹا کھایا ' دوہے' اشعار اور 'لاونیاں' غزلوں کی صورت میں تبدیل ہونے لگیں - خصوصاً اس دلچسپ مشغلے نے اس وقت اور ترقی کی جب شیخ 'بنیاد' نے اپنے فرزند سے کبیدہ خاطر ہوکر علیحدگی اختیار کرکے اپنی اہلیہ کے ساتھ جناب 'آسی' کے ہاں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی - ان کے انتقال کو چند سال ہوے -

ترتیب تذکرہ کے وقت جناب 'آسی' نے ان کے یہ حالات بیان فرماے تھے جو ناظرین کے سامنے پیش کیے گئے -

ان کے کچھ اشعار جناب 'آسی' کو یاد تھے جو تبرکاً درج ہیں - ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی شاعری معمولی تک بندی سے آگے نہ بڑھ سکی - نہ تو خوش گویان دہلی کی طرح کلام میں سلونا پن ہے نہ زبان کا چٹخارا - حسن تخیل تو بہت دور ہے - ہاں دیہاتی اکھڑپن ہے' جس نے ظرافت کے بدلے اشعار کو مضحک بنا دیا ہے - تاہم ایک اَن پڑھ شاعر کی تک بندی بھی کچھ توجہ کی مستحق ہے - الحال ساڑھے تین شعر 'بنیاد' کی کائنات سخن ہیں :-

ناراض مجھ سے غیر بھی' دشمن ہیں اپنے بھی
دھوبی کا کُتا ہوں' نہ میں گھر کانہ گھاٹ کا

کوئی زهردار ان سے بڑھ کر نہیں ہے   حسینوں کے کاٹے کا منتر نہیں ہے

میں تو اچھا ہوں مگر اے بنیاد   لوگ کرتے ہیں برائی میری

(پہلا مصرع یاد نہ آیا)   گُڑ کھاکے گُلگلوں سے پرہیز ہورہا ہے

—— : o : ——

پیرا

پیر علی نام 'پیرا' تخلص' قوم کا سقہ تھا - یہ شرف خاک پاک دهلی و لکھنؤ کو حاصل ہے کہ اس نے ایسے ایسے صاحب ذہن و دماغ اشخاص پیدا کئے جو باوجود بے علمی اور ادنیٰ خاندان میں پیدا ہونے کے جہاں خیالات عالیہ نام کو نہیں پائے جاتے' تنگ ظرفی اور پست ہمتی کی بہتات ہوتی ہے' زمین سخن میں نہایت دل کش و فرحت بیز چمن آرائیاں کی ہیں - کم استطاعتی اور بے بضاعتی پر جب کہ فکر معیشت میں صبح سے شام اور شام سے صبح تک کولھو کے بیل کی طرح محنت و مشقت کرنے پر مجبور تھے - سکون قلب و آسائش دماغ کا نام و نشان نہ تھا' دن بھر کے تھکے ماندے گھر جاتے تو خرد سال بچوں کی چل پوں سے فکر سخن میں رکاوٹیں پیدا ہوتیں' لیکن اُن کی طبیعتوں کی روانی ان مشکلات کی مطلق پروا نہ کرتی - ہاتھ پاؤں شل ہوتے تو ہوتے مگر دماغ اس وقت بھی افعال لطیفہ سے گریز نہ کرتا اور چلتے پھرتے' اُٹھتے بیٹھتے' لگے ہاتھوں ادب اُردو کی خدمت گذاری میں بدل کوشاں رہتے - چنانچہ 'پیرا' بھی دهلی کے چاندنی چوک میں صبح و شام پانی کی مشک کندھے پر رکھے پھرا کرتا - تشنہ لب راہ گیروں کو سیراب کرنا' اُن کی جود و بخشش اور فیاضی سے مستفیض ہوکر اهل و عیال کا رزق حاصل کرنا معمول تھا - بازار کے دکانداروں سے جان پہچان ہوگئی تھی - وہ لوگ

بھی بقدر ضرور خدمت لے کر سلوک کرتے اور 'پیرا' کی بسر گذر ہوتی چلی جاتی۔ طبیعت موزوں اور حافظہ تیز تھا' شعرائے نغز گفتار کے اکثر اشعار یاد تھے - چاندنی چوک کے چکر کاٹتے ہوئے' شیریں و دلچسپ علوان سے کوئی نہ کوئی غزل گنگنایا کرتا۔ اس مشق کا یہ نتیجہ نکلا کہ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوگیا - فطری لگاؤ نے رہنمائی کرکے باب سخن تک پہنچایا اور 'پیرا' کچھہ کچھہ موزوں کرنے لگا - ذوق سخن کسی کی میراث نہیں' جس کو مبدء فیاض عنایت کرے - ہر چند 'پیرا' بہشتی تھا ' اس کو وہ صحبتیں نصیب نہ تھیں جہاں تبادلۂ خیال کرکے مضمون آفرینی کا مادہ پیدا کرسکتا' پھر بھی وہ اشعار جو از بر تھے اس کے قلب و دماغ میں مختلف مضامین کی شعاعیں ڈالتے جنھیں خاطر خواہ منظوم نہ کرسکتا - کچھہ بندش کا بھونڈا پن' کچھہ بیان کی اُلجھنیں' حسن تخئیل کے ساتھہ وہی ظلم کرتیں جو آئینے کے ساتھہ زنگار کرتا ھے - اب 'پیرا' کو ایک استاد شفیق کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا جو اس کے اشعار کو جملہ نقائص اور عیوب سے پاک کرکے اس قابل بنادے کہ ہر صحبت میں بے تکلف سنانے کے لائق ہوجائیں —

اس خدمت کے واسطے اس کی نگاہوں نے 'مجرم' دہلوی کو منتخب کیا اور ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہوکر اصلاح کلام کی استدعا کی - 'مجرم' نے چند اشعار سنے اور بخیال حوصلہ افزائی' خوشی خوشی اپنے تلامذہ کے دائرے میں داخل کرلیا اور نام کی رعایت سے 'پیرا' تخلص' رکھا —

'پیرا' کے اشعار بالکل صاف صاف اور معاملات حسن و عشق کا سادہ سادہ بیان ہیں - کہتے ہیں بعض اشعار کی لطافت و نزاکت اور حسن تخئیل اچھے اچھے خوش فکر شاعروں سے ٹکر کھا جاتی تھی - مزاج میں انکسار کی صفت کمال درجہ موجود تھی - کبھی اپنی ہستی کو نہیں بھولا' کس و ناکس سے بہ لجاجت گفتگو کرتا ' بات بات میں خاکساری اور عاجزی ظاہر کرتا - 'پیرا' کے اشعار تذکروں میں بہت کم نظر سے گذرے' نہ معلوم کم گو تھا یا کلام تلف ہوگیا - نمونے کے طور پر وہی اشعار لکھے

جاتے ہیں جو مختلف تذکروں کی ورق گردانی کرنے سے حاصل ہوے : ۔

شوق گریہ کو کہو روئیے کس پاس کہ اب
قام کو بھی نہ رہا آنکھ میں قطرا باقی

تاکتے پھرتے تھے پہلے تو بتوں کو 'پیرا'
گھر میں بیٹھے ہوے اب یاد خدا کرتے ہیں

بھلا 'پیرا' کا دل بہلے گا کیوں کر حور و غلماں سے
اسے جنت میں بھی دلی کی گلیاں یاد آئیں گی

اِنسان نے بولنا اور لکھنا کیسے سیکھا

از

(مولوی محمد حسین صاحب ایم - اے ، بی - ای - ٹی
صدر مدرس مدرسۂ فوقانیۂ عثمانیہ ، بیدر)

عامیانہ خیال زبان کی نسبت عام خیال یہ ہے کہ جس وقت انسان کتم عدم سے منصہ شہود پر جلوہ گر ہوا ، معاً اس کا نطق بھی آ موجود ہوا - جس طرح کھانا ، پینا ، سونا ، جاگنا ، چلنا ، پھرنا وغیرہ لوازم حیوانی ہیں جو بغیر کسی زحمت و تکلف کے خود بخود قدرتی طور پر عمل میں آتے ہیں ٹھیک اسی طرح نطق و گویائی بھی انسان کا فطری خاصہ ہے جس کی تخلیق انسانی دماغ سوزی و جگر کاری کا نتیجہ نہیں - زبان قدرت کی ودیعت کردہ نعمت ہے جس میں انسان کے صنع و اختراع کو کچھ بھی دخل نہیں ہے - الغرض عام خیال کے مطابق زبان نے ابتداے تمدن ہی سے انسان کا ساتھ دیا ہے ، مذہبی معتقدات نے اس خیال کو اور تقویت پہنچائی ہے - چنانچہ اہل ہنود برہما کو مبداء آفرینش جانتے ہیں- ان کے اعتقاد کے مطابق ' برہما ' نے اپنے جسم خاص سے ' منو ' اور ' شتروپا ' کو پیدا کیا ، جن سے توالد اور تناسل کا سلسلہ جاری ہوا - خود ' برہما ' نے اس اولین انسانی جوڑے کو سنسکرت زبان کی تعلیم دی -

اور 'منو' اور 'شتروپا' کے ذریات اسی زبان میں متکلم ہوے۔ گویا ابتداے آفرینش ہی سے انسان ایک مکمل زبان سنسکرت کے استعمال پر قادر تھا۔ مجوسیوں کے اعتقاد کے مطابق دنیا میں کئی دور گذر چکے ہیں، ہر دور کے اختتام پر ایک مرد اور ایک عورت باقی رہ جاتے ہیں، جن کے توالد و تناسل سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ موجودہ دور 'مہ آباد' سے شروع ہوتا ہے۔ جب 'مہ آباد' کی اولاد بڑھی تو ان کی ہدایت کے لئے 'مہ آباد' پر ایک سماوی کتاب (اوستا) ملہم ہوئی۔ چونکہ آسمانی کتاب کا خلق کی زبان میں نازل ہونا ضرور ہے تاکہ لوگ اوامر و نواہی سے واقفیت حاصل کر کے ان پر عمل کریں، لہذا مجوسیوں کے اعتقاد کے مطابق دنیا کی پہلی زبان دساتیری یعنی اوستا کی زبان تھی، جس سے بہ امتداد زمانہ مختلف زبانیں مشتق ہوتی گئیں۔ وحدت لسان اور اس کی مابعد تفریق و اختلات کے متعلق یہود و نصاریٰ کا اعتقاد بہ لحاظ غربت و ندرت اپنی نظیر آپ ہے۔ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو افراد انسانی کے سلسلے کا مبدء قرار دیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان کی زبان عبرانی تھی، لیکن بعضوں کے نزدیک ان کی زبان آرامی تھی۔ بہر حال تمام مشاہیر علماے یہود و نصاریٰ اس امر پر متفق الراے ہیں کہ حضرت ابوالبشر کی زبان سامی الاصل زبانوں ہی میں سے کوئی نہ کوئی زبان تھی —

شہر 'بابل' کے آباد ہونے تک تمام سکان زمین اسی ایک زبان میں کلام کیا کرتے تھے۔ 'توریت' کے گیارھویں باب اور پانچویں فصل میں مرقوم ہے کہ پہلے تمام اہلِ زمین کی زبان ایک ہی تھی۔ جس وقت اُنھوں نے مشرق کا سفر اختیار کیا تو اتفاقاً 'شنعار' کی زمین میں دریاے فرات کے پاس ایک کف دست صحرا نظر آیا۔ یہ لوگ وہاں ٹھہرے اور آپس میں صلاح کی کہ آؤ اینٹیں بنا کر پژاوے میں پکائیں اور ان سے اپنے لئے شہر اور برج بنائیں، جس کا سر رفعت اور بلندی کے لحاظ سے آسمان سے ٹکر کھائے اور دنیا

میں ہماری نشانی اور ناموری باقی رہے - خود خداوند قدوس نے اس شہر اور برج کے ملاحظے کے لئے نزول فرمایا اور دیکھا کہ یہ تمام ہم زبان آدمی متفق ہو کر اس کام کو اختتام تک پہنچانا چاہتے ہیں اور اس ارادے سے کسی طرح باز نہیں آتے - پس خداوند تعالی نے اُنھیں اس فرعونیت سے روکنے کے لئے ان کی زبان میں خلل ڈال دیا ' تاکہ وہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھیں- اِس طرح شہر اور برج کی تعمیر سے یہ لوگ باز رکھے گئے - وہ لوگ مختلف بولیاں بولتے ہوے متفرق اقطاع اور ممالک میں منتشر ہو گئے - یہ تو یہود اور نصاروں کے اعتقادات ہیں - مسلمان ملاؤں کے خیالات بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں ہیں - ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام جب جنت میں تھے تو اُن کی زبان عربی تھی - لیکن جب وہ خطاے نافرمانی کی پاداش میں خلد بریں سے نکالے گئے تو حضرت جبرئیل و میکائیل نے اُن کے سر سے تاج اُتارا ' کمر سے پیٹی کھولی اور عربی بولنے کی قدرت سلب کر کے سریانی بولی ان کی زبان پر چڑھادی - چنانچہ ان کی اولاد کی زبان سریانی ہی تھی - ان ملاؤں کا یہ بھی خیال ہے کہ جب آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی تو وہ پھر عربی زبان میں کلام کرنے پر قادر ہو گئے- یہ تمام مذہبی داستانیں اس واقعے کی مؤیّد ہیں کہ ابتداے آفرینش ہی سے انسان کسی نہ کسی مرتب و مکمل زبان کے بولنے پر قادر تھا —

لیکن یہ اختلافی مذہبی مفروضات عقل سلیم کو ضرور کھٹکتے ہیں- لہذا مناسب ہے کہ زبان کی ابتدا دریافت کرنے کے لئے ہم تحقیقات علمیہ کی طرف رجوع کریں - کسی بات کے دریافت کرنے ' کسی امر کا پتا لگانے ' کسی واقعے کی تحقیق کرنے کے دو پہلو ہیں ؛ ایک روایتی یا تاریخی ' جسے منقول کہتے ہیں دوسرا عقلی یا فطری جسے معقول کہتے ہیں - تاریخ زیادہ سے زیادہ صرف چار پانچ ہزار سال کے واقعات پر روشنی ڈال سکتی ہے ' لیکن زبان اور لسان کی

تحقیق میں جس کا دامن قدامت کے لحاظ سے خود آغاز آفرینش کے ساتھہ وابستہ ہے تاریخ ہماری کچھہ رہبری نہیں کرسکتی - اب رہیں مذہبی روایات سو وہ ایک دوسرے کے بالکل متضاد ہیں - ہر مذہب کا پیرو اپنی گاتا ہے جس زبان میں اُس کی مقدس کتاب نازل ہوی ہے اُسی کو وہ اپنی مذہبی عصبیت کے زیراثر انسان کی اولین زبان ٹھیراتا ہے - علاوہ بریں مذہبی روایات بالعموم صرف شایستہ اور مہذب دور کے آغاز و ترقی کا ذکر کرتي ہیں اور اُسی دور اور اُس کے ما بعد کے لوگوں پر لفظ انسان کا اطلاق کرتی ہیں - دور متمدن کے قبل دور بربریت کے جنگلی انسان مذہبی روایات یا صحیفات میں دوسرے دوسرے ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں - مثلاً اہل ہنود کا خیال ہے کہ سنسکرت دیوتاؤں کی زبان تھی - لیکن دیوتاؤں کے قبل آریاورت کا خطہ راکشسوں (غیر مہذب انسانوں) سے آباد تھا - رامایں میں صرف آریاؤں کو انسان یا دیوتا کے نام سے موسوم کیا ہے ، لیکن نا مہذب غیر آریائی اقوام کو راکشس ملیچھہ، ریچھہ ، بندر ، ناگ وغیرہ تو ہین آمیز ناموں سے یاد کیا ہے اور اُن کی زبانیں بھی دوسری بتائی گئی ہیں - مجوسیوں کے خیال کے مطابق موجودہ دور کے انسانوں کی اول زبان اوستا ي تھی- لیکن اس کے قبل بھی کائنات پر کئی دور گذرچکے ہیں ممکن ہے کہ ان ماقبل دوروں میں ' اوستا ی ' نہیں بلکہ دوسری زبانیں بولی جاتی ہوں - مسلمان ملاؤں کا عقیدہ ہے کہ حضرت آدم علیہ‌السلام کے قبل دنیا میں اجنہ بستے تھے - سر سید علیہ‌الرحمۃ نے بڑے شدو مد سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اجنہ سے مراد بادیہ نشیں ، صحرائی اور بدوی انسان تھے - حضرت ابوالبشر کی زبان توخیر ' سریانی ' تھی ' لیکن اجنہ کی بھی آخر کوئی زبان ضرور ہوگی - الغرض ہمیں صرف یہ پتہ لگانا مقصود نہیں ہے کہ مہذب اور شایستہ انسان کے مورث اعلیٰ کی زبان کیا تھی ' خواہ وہ مورث سوئمبھو منو ہوں یا مہ‌آباد یا آدم علیہ‌السلام - اصل تحقیق طلب امر یہ ہے کہ دور تمدن کے قبل دور بربریت کے ابتدائی انسان قوت گویائی سے کہاں تک بہرہ یاب تھے - ظاہر ہے کہ منقولات

اس میدان تحقیق میں لاچار محض ہیں، لہذا ہمیں معقولات کی استمداد سے واقعات کی اس طرح چھان بین کرنی چاہیے کہ عقل سلیم اُسے قرین قیاس سمجھے —

موجودہ تحقیق

موجودہ تحقیق کے روسے یہ خیال کہ گویائی انسان کی سرشت میں داخل ہے اور ابتدائے آفرینش ہی سے انسان ایک مرتب، مکمل اور باقاعدہ زبان بولنے پر قادر تھا بالکل بے بنیاد اور کاواک ثابت ہوا ہے۔ فی الحقیقت زبان کوئی فطري یا وہبی چیز نہیں ہے بلکہ تحصیل و اکتساب کا نتیجہ ہے - چنانچہ ایک تحقیق دوست یونانی بادشاہ نے چند نومولود بچوں کو آبادی سے دور ایک جھونپڑے میں پرورش دلائی تھی اور اہتمام کیا تھا کہ انائیں صرف دودھ پلائیں اور خاموش رہیں تاکہ بچوں کے کان انسانی آواز سے آشنا نہ ہونے پائیں۔ جب یہ بچے بڑے ہوے تو سوائے چیں پیں کے اور کوئی کلمہ زبان سے ادا نہیں کرسکتے تھے - اسی طرح ہندوستان میں خاندان مغلیہ کے سر آمد بادشاہ ' جلال الدین محمد اکبر ' نے انسان کی فطری زبان دریافت کرنے کے شوق میں کئی نوزائیدہ بچوں کو آبادی سے باہر گونگی اور بہری کھلائیوں کے زیر نگرانی پرورش دلائی تھی اور یہ بچے بھی بڑے ہونے پر یونانی تہ خانوں میں پلے ہوے بچوں کی طرح گویائی سے بے بہرہ پائے گئے - وہ صرف وہی آوازیں منہ سے نکالتے تھے جن کو اُنھوں نے جنگل کی چڑیوں سے سنی تھیں - فی زمانہ اخباروں میں کئی بار اس قسم کی خبریں شایع ہوئی ہیں کہ بعض شکاریوں کو جنگل میں انسانی بچے دستیاب، ہوے ہیں جن کو بھیڑیوں نے اپنے بھٹوں میں پالا تھا - ان بچوں میں درندگی کے تمام خصائل موجود تھے - وہ چاروں ہاتھ پانوں پر چلتے اور بھاگتے پھرتے تھے اور انسانی بولی سے یکسر محروم تھے ' البتہ بھیڑیوں ہی کی طرح چلاتے اور غراتے ضرور تھے - انسان کی فطری زبان کے تلاش کرنے والوں کو ان امور پر بھی غور کرنا چاہئیے کہ اگر کسی بچے کا پانو کچل جائے تو صرف ' قیں ' کی آواز اُس کے منہ سے نکلتی ہے - اگر کسی کے زور سے چٹکی لی جائے تو سوائے ' سی ' کے اور اگر کسی کو یکایک

ڈرا دیجئے تو بجز 'ھو' کے اور اگر کسی کو مبتلائے مصیبت دیکھہ کر ترس آے تو صرف 'تہ تہ' یا 'چہ چہ' کے اور کچھہ زبان سے ادا نہیں ھوتا - ان موقعوں پر چونکہ انسان کو غور کرنے اور پھر سوچ کر با معنی الفاظ نکالنے کی فرصت یا مہلت نہیں ملی اس لئے اس کے منہ سے وھی آوازیں نکلیں جو فطری کہلانے کی مستحق ھیں - توتا ھزار " نبی جی بھیجو " یا "سیتا رام" جپا کرے لیکن جب بلی ٹیٹوا آن دباتی ھے تو اُسے بجز اپنی فطری آواز "ٹیں ٹیں" کے اور کچھہ نہیں سوجھتا - یہی حال انسان کا ھے - یکایک خوف ' استعجاب' مصیبت یا خوشی کے موقعوں پر اس کی زبان سے اضطراراً چند مہمل اور بے معنی آوازیں نکلتی ھیں ' یہی انسان کی فطری بولی ھے - مندرجۂ بالا تمام واقعات پر غور کرنے سے ھم اس نتیجے پر پہنچتے ھیں کہ گویائی انسان کا فطری خاصہ نہیں ھے بلکہ کد و کاوش سے حاصل ھوئی ھے —

آج کل علمی دنیا میں نظریۂ ارتقا کا زور شور ھے - اسی نظریے کی روشنی میں ھر شے کے بدو و آغاز کا سراغ لگایا جاتا ھے - حقیقت یہ ھے کہ ارتقا کا مسئلہ معرکۃ الآرا ھونے کے علاوہ اس قدر عام اور ھمہ گیر ھے کہ کوئی علم' کوئی فن' کوئی ھنر بلکہ کوئی شے اس کے اثر و نفوذ سے خالی نہیں- خود انسان کی آفرینش اور تمدن کی عہد بعہد ترقی کا مطالعہ اسی نظریے کی روشنی میں کیا جاتا ھے - اس نظریے کی رو سے انسان کتم عدم سے یکایک معرض وجود میں نہیں آیا ھے اور نہ وہ کسی دیوی یا دیوتا کے جسم اطہر سے پیدا ھوا ھے ' بلکہ اس نے جسم حیوانی سے رفتہ رفتہ ترقی کرکے جامۂ انسانی زیب تن کیا ھے —

یہ امر مسلم ھے کہ تمدن کے ابتدائی دور میں انسان کی حالت صحرائی جانوروں کی سی تھی' گو کہ وہ اُس حالت میں بھی اور حیوانات سے اشرف ضرور تھا - اب ھمیں اس کا کھوج لگانا ھے کہ حیوانات میں بولنے اور اپنی خواھشات و احساسات کے ظاھر کرنے کی کہاں تک صلاحیت ھے - اس کے بعد ھم اندازہ لگاسکیں گے کہ ابتدائی دور کے انسان کی گویائی کی کیا حالت تھی - علاوہ بریں

اس امر پر بھی تمام حکما کا اتفاق ہے کہ ایک فرد بشر کو طفولیت سے لے کر پختہ عمر ہونے تک جسمانی، ذہنی اور اخلاقی ارتقا کے جتنے مدارج طے کرنے پڑتے ہیں اتنے ہی منازل سے نسل انسانی کو دور توحش سے لے کر دور تمدن تک پہونچنے میں گذرنا پڑتا ہے - گویا ابتدائی انسان بمنزلہ طفل شیر خوار کے تھا، اس کی ضروریات خواہشات اور احساسات بھی بچوں کے سے تھے - لہذا بچوں میں رو کر، چلاکر، ہنس کر یا دیگر ذرایع سے اپنی خواہشات اور احساسات کے اظہار کی جتنی صلاحیت ہوگی اتنی ہی یا اس سے کسی قدر بڑھکر ابتدائی انسان کی بھی ہوگی —

ابتدائی انسان کی قوت گویائی

اب ہمیں غور کرنا ہے کہ آیا جانور بول سکتے ہیں یا نہیں ؟ بولی کا اطلاق اس کے وسیع معنی میں ان تمام وسائل پر ہوسکتا ہے جن کے ذریعے دماغی کیفیت اور مافی‌الضمیر اوروں پر ظاہر کیا جاسکے خواہ یہ وسائل آواز کی شکل اختیار کریں یا اشارات و کنایات کی - پہلے لوگوں کا خیال تھا کہ صرف انسان ہی بول سکتا ہے اور تمام جانور گویائی سے محروم ہیں - گویا بولنا ہی انسان اور حیوان کے درمیان مابہ‌الامتیاز تھا - لیکن علمائے یورپ نے دریافت کیا ہے کہ جانور بھی بول سکتے ہیں ' اگرچہ ان کا بولنا وسعت و حلاوت کے لحاظ سے انسانی بولی کا عشر عشیر بھی نہیں ہے - بندر بہت قسم کی آوازیں بول کر ایک دوسرے پر اپنی خواہشات، جذبات، احساسات اور ضروریات کا اظہار کرتے ہیں - کتے یا بلی کو دیکھو یہ جانور بھوک کے وقت، خوف کے وقت، غصے کے وقت، آپس میں لڑتے وقت، اپنے بچوں کو پیار کرتے وقت مختلف قسم کی آوازیں نکالتے ہیں - بایں ہمہ جانوروں میں مرکب یا مسلسل خیالات کے اظہار کا مادہ نہیں ہوتا - وہ انسان کی طرح کسی اصول یا مسئلے کے بیان کرنے سے قاصر ہوتے ہیں - مثلاً وہ ایک دوسرے سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ "زمین گول ہے" یا "ایمانداری بہترین چیز ہے" - جانور محض بھوک، پیاس، خوف، خوشی، درد،

تکلیف، غصے، پیار یا اسی قماش کے دیگر جذبات، احساسات یا ضروریات کا خاص خاص آوازوں سے اظہار کرتے ہیں - اس قسم کا بولنا جس سے ضروریات و جذبات کا اظہار ہوسکے کتے، بلی، بندر یا اور اعلیٰ قسم کے حیوانات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ کیڑے مکوڑے وغیرہ جیسی ادنیٰ اور پیش پا اُفتادہ مخلوق بھی اپنے خاص انداز سے باہم متکلم ہوتی ہے - شہد کی مکھیاں، چیونٹیاں، بھڑ وغیرہ حشرات جو جماعت اور جھنڈ میں رہتے ہیں اچھی طرح اپنا مطلب اور عندیہ ایک دوسرے پر ظاہر کرتے ہیں - اگر وہ اپنی خواہشات و ضروریات کا اظہار نہ کرسکتے تو اُن کی جماعت کا شیرازہ بکھر جاتا - مافی الضمیر کے اظہار کی صلاحیت جماعتی زندگی کا لازمہ ہے - اگر یہ مفقود ہو تو جماعتی زندگی کا قیام غیر ممکن ہو جاے - اکثر کیڑوں کا طریقۂ تکلم عجیب و غریب ہوتا ہے - ان کیڑوں کی لمبی لمبی مونچھیں ہوتی ہیں جو تعداد میں دو یا تین سے زیادہ نہیں ہوتیں- اصطلاح میں اِنھیں ملمس کہتے ہیں. دو کیڑے اپنے ملمسوں (مونچھوں) کو باہم ملا کر ایک دوسرے کا عندیہ معلوم کر لیتے ہیں —

گفتگو سیکھنے سے بہت قبل انسان کے بچے بھی مختلف آوازوں سے اپنی خواہشات و ضروریات کا اظہار کرتے ہیں - بچہ بھوک کے وقت روتا ہے، ماں کو دیکھ کر ہنستا ہے، اچھی اور خوشنما چیزوں کو لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتا اور چلاتا ہے - الغرض وہ بھوک، پیاس، خوشی، تکلیف وغیرہ کو مختلف آوازوں سے ظاہر کرتا ہے - ہم ایک شیر خوار بچے کے چہرے مہرے سے اُس کی خواہشات و جذبات کا پتا لگاسکتے ہیں - بچے کا رونا چلانا اُس کے آئندہ تکلم کا پیش خیمہ ہے رونا چلانا اور بولنا دونوں ہم عنصر ہیں، یعنی وہ ایک ہی چیز سے بنے ہیں جسے ہم آواز کہتے ہیں - دونوں سے ایک ہی قسم کے اغراض بھی پورے ہوتے ہیں - مختلف قسم کی چیخ پکار مختلف معنی رکھتی ہے - گویا بچوں کا رونا، چلانا، چیخنا، پکارنا وغیرہ زبان کا نقش اول ہے —

ایک قابل غور سوال یہ بھی ہے کہ آخر انسان یا حیوان آواز نکالنے پر قادر کیسے ہوئے؟ ان کو بولنا کس نے سکھایا؟ مسئلہ نہایت صاف اور سہل ہے۔ ہر شخص پہلی ہی نظر میں معلوم کرسکتا ہے کہ انسان کی گویائی کا پہلا اُستاد سانس ہے - سانس کیا ہے؟ وہ ہوا ہے جو پھیپھڑوں کی حرکت سے اندرجاتی اور اندر سے باہر آتی ہے اور کانوں کے ذریعے سے محسوس ہوتی ہے - یاد رکھنا چاہئے کہ انسان کا گلا موسیقار یا قنفس پرندے سے کم نہیں ہے - جس طرح انسان تمام حیوانات کے افعال و حرکات کی قدرت رکھتا ہے اُسی طرح اُس کا گلا بھی تمام جانوروں کے گلوں کا کام کرسکتا ہے - قدرت نے اول ہی سے انسان میں ہر ایک آواز کی صلاحیت پیدا کردی ہے اور اس کا اظہار زیادہ تر سانس کی مدد سے ہوتا ہے - ایک حکیم کا قول ہے کہ انسان کا گلا اگر اچھا ہو تو آلات موسیقی سے بہتر ہے - ابتدائی انسان میں بھی آلہ تنفس تو اپنی مکمل حالت میں موجود تھا کیونکہ بقاے حیات کے لئے وہ لازمی شے ہے - لیکن دیگر آلات صوت پورے نمو یافتہ نہ تھے - زبان کی حرکت منہ کی بناوٹ، ہونٹوں کی ہیئت، حلق کی ساخت وغیرہ میں کچھہ ایسا بجوگ تھا کہ آج کل کی طرح انسان بولنے اور بات چیت کرنے پر قادر نہ تھا - ان تمام اُمور سے واضح ہوتا ہے کہ ابتداے تمدن میں انسان کے پاس آلات تنفس اور آلات صوت جو قدرت کی ودیعت کردہ نعمتیں ہیں موجود تو ضرور تھے لیکن تربیت اور مشق کی کمی کے باعث پوری طرح کام نہ دیتے تھے - تمدن کے لحاظ سے اُس وقت انسان ارتقا کی ابتدائی منزل میں تھا اور اس کی حالت جانوروں یا شیر خوار بچوں سے ایک ہی دو قدم آگے تھی - لہذا وہ کسی مرتب اور با قاعدہ زبان کے استعمال پر قادر نہ تھا بلکہ حیوانات یا شیر خوار بچوں کی طرح چند بے معنی اور مہمل اصوات کے ذریعے صرف اپنی ضروریات، خواہشات، جذبات اور احساسات کا اظہار کرسکتا تھا —

عہد رموزی

لیکن انسان دوسرے حیوانوں کی طرح محض جذبات ھی کے اظہار پر قادر نہ تھا بلکہ اس کے علاوہ وہ شروع ھی سے دوسروں پر اپنے خیالات ظاھر کرنے کی بھی قدرت رکھتا تھا جس سے دیگر حیوانات قاصر تھے ۔ غرض اظہار خیالات کی صلاحیت ھی انسان اور دیگر حیوانات کے درمیان مابہ الامتیاز تھی ۔ قدرت نے ابتدائے آفرینش ھی سے انسان کو عقل و تمیز ' حافظہ و متخیلہ ' ادراک و تصور کی نعمتیں عطا کر کے اشرف المخلوقات کا تاج اُس کے سر پر رکھا تھا ۔ لیکن حیوانات ھمیشہ سے اظہار خیالات سے قاصر ھیں ۔ انسان مدنی الطبع واقع ھوا ھے ' وہ جماعت سے الگ رہ کر انسانی زندگی بسر نہیں کرسکتا ۔ ارسطو کا قول ھے کہ جو شخص ھیئت اجتماعی زندگی کے دائرے سے باھر رہ کر تنہائی و عزلت کی زندگی گذارے وہ یا تو فرشتہ ھے یا حیوان مطلق ' وہ ھرگز انسان کہلانے کا مستحق نہیں ھے ۔ جماعت میں رھنے سے لا محالہ تبادلۂ خیالات اور اظہار مطلب کی ضرورت پیش آئی ھوگی تاکہ ابتدائی زندگی کی ضروریات میں ایک انسان کو دوسرے سے مدد ملتی اور سب کے کام بسہولت انجام پاتے ۔ اس مقصد کے لئے اول اول صرف اشارات و علامات ' رموز و کنایات مقرر ھوے جن سے ادائے مطلب کا کام ناقص طور پر انجام پاتا تھا ' یعنی جو لوگ نظر کے سامنے ھوتے اور ان سے کچھہ کہنا ھوتا تو طریقہ یہ تھا کہ ٹوٹی پھوٹی چند مہمل اور بے معنی آوازوں کے ساتھہ جسم کی حرکت ' اعضا و جوارح کی جنبش ' دست و ابرو کے اشارے وغیرہ سے خیالات ظاھر اور مطلب ادا کیا جاتا ۔ لیکن جب نسل بڑھی اور ایک ھی گروہ کے افراد دور دراز اقطاع میں جا بسے تو نظر سے دور اور غائب اعزہ اور احباب پر خیالات کا اظہار مشکل ھو گیا لہذا ان کے پاس کوئی مادی شے بھیج کر ادائے مطلب کا کام انجام پاتا تھا اور اس طرح سے خیالات کو دوسروں پر ظاھر کرنے کی رسم متمدن زمانے میں بھی قایم رھی ۔ کتنے اُمور ایسے ھوتے ھیں کہ اُن کی ضرورت اور ان کا فائدہ مفقود ھو جانے پر بھی وہ بطور رسم و رواج

عرصہ دراز تک قایم رہتے ہیں - مثلاً شادی بیاہ کی رسموں میں اب بھی بعض باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جن میں قدیم طریقوں کی جھلک پائی جاتی ہے - اسی طرح متمدن دنیا میں پڑھنے لکھنے کا رواج عام ہوجانے پر بھی اشیاے مادی کی ترسیل کے ذریعے نامہ و پیام کا کام لیا جاتا رہا ہے جس سے ' عہد رموزی ' کی یاد ہمیشہ تازہ ہوتی رہی ہے - مثلاً سکندرنامہ میں مرقوم ہے کہ ' دارا ' نے سکندر رومی کے پاس رائی کے تھیلے بھیجے تھے لیکن سکندر نے شاہی کبوتر خانے کے کبوتروں کو چھڑوادیا جنھوں نے رائی کا ایک ایک دانہ چگ لیا - ' نظامی ' گنجوی مصنف " سکندر نامہ " نے اس واقعے کی یوں تعبیر کی ہے کہ دارا نے سکندر کو جتانا چاہا تھا کہ میرے پاس رائی کی طرح بے شمار فوج ہے اس لئے تم میرا مقابلہ نہیں کرسکتے - سکندر نے اشارتاً یہ جواب دیا کہ اگرچہ میری فوج تعداد میں کم ہے لیکن ایسی تہوّر شعار اور بہادر ہے کہ تمہاری تمام بز دل سپاہ کو تلوار کے گھات اُتار دیگی - دوسری جگہ بھی مولانا نظامی فرماتے ہیں کہ دارا نے سکندر کے پاس گیند اور چوگاں بھیج کر یہ ظاہر کرنا چاہا تھا کہ تم ابھی طفل مکتب ہو ' ملک‌گیری اور کشور کشائی کے خیال خام سے باز آو اور گیند بلے سے کھیلا کرو - لیکن سکندر نے اُسے فال نیک تصور کیا اور کہا کہ گیند بمنز لہ کرۂ ارض کے ہے میں اپنے چوگان یعنے اسلحہ سے تمام عالم کو مسخر کروں گا - اسی طرح پورس نے سکندر کو تلوار پیش کر کے عاجزی اور شکست کا اظہار کیا - آج بھی تلوار پیش کرنا' علم کو سر نگوں کرنا اطاعت اور مسکنت کی علامت ہے - جلال‌الدین محمد اکبر کے در باری بذلہ سنج و ظریف ملا دو پیازے کے سامنے جب ایرانی مولوی خم ٹھونک کر مقابلے کے لیے آیا تو دونوں میں اشارات و کنایات کے ذریعے بحث مباحثے کا سلسلہ اس طرح چھڑا کہ پہلے ایرانی مولوی نے ایک اُنگلی دکھائی تو ملا دوپیازے نے جواب میں دو اُنگلیاں دکھائیں - پھر اس نے تین تو اُس نے چار' اِس نے پانچ تو اُس نے گھونسا اِس نے انڈا تو اُس نے پیاز دکھائی اور مباحثہ ختم ہو گیااور اِس طرح

ملا کی جیت ہوئی - جب اُس کی تشریح چاہی گئی تو ایرانی مولوی نے نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھہ اُس کی اِس طرح توضیح کی کہ میں نے ایک اُنگلی سے باری تعالیٰ کی وحدت کا اظہار کیا تو ملا نے دو اُنگلیاں دکھا کر کہا کہ خدا کے ساتھہ رسول کا ہونا لازمی ہے - میں نے تین اُنگلیوں سے رسول ' بنت رسول و خویش رسول کی طرف اشارہ کیا تو ملا نے اصحاب اربع کی یاد دلائی - میں نے پانچ اُنگلیوں سے پنجتن پاک کی طرف اشارہ کیا تو ملا نے گھونسا دکھا کر کہا کہ خدا سب پر غالب ہے - میں نے انڈا دکھا کر ظاہر کیا کہ زمین گول ہے تو ملا نے پیاز نکال کر اشارہ کیا کہ نہیں بلکہ زمین پیاز کی طرح تہہ بہ تہہ ہے اور اس کے سات طبق ہیں - لیکن جب اسی واقعے کی تشریح کے لیے بذات سنجے ملا سے فرمایش کی گئی تو اُس نے ظرافت آمیز پیرائے میں اُس کی اس طرح صراحت کی کہ ایرانی مولوی نے ایک اُنگلی دکھا کر کہا کہ تمہاری آنکھہ پھوڑدوں گا میں نے جواب میں دو اُنگلیاں دکھا کر اشارہ کیا کہ تمہاری دونوں آنکھیں اندھی کردوں گا - تب اُس نے تین اُنگلیوں سے گزند پہنچانے کا اشارہ کیا تو میں نے چاروں شانے چت گرانے کی دھمکی دی - اُس نے تھپڑ مارنے کو کہا تو میں نے جواب میں گھونسا مارنے کو کہا - اُس نے انڈا دکھایا تو میں نے اشارتاً کہا کہ اُسے پیاز کے ساتھہ تل کر کھاجاونگا - اگرچہ یہ ایک مسخرے پن کا قصہ ہے' لیکن ایک صاحب بصیرت اِس سے یہ نکتہ اخذ کرتا ہے کہ جب انسان گویائی کی پوری قوت نہیں رکھتا تھا تو اسی طرح اشاروں سے ادائے مطلب کا کام انجام دیتا ہوگا —

سنسکرت زبان کی ایک کہانیوں کی کتاب 'بیتال پچیسی' میں حرکات جسمانی اور اشیائے مادی کے ذریعے اظہار خیال کی ایک عمدہ مثال ملتی ہے - کاشی کے شہزادے ' بجرا مکت' کی آنکھیں مہادیو کے مندر میں ایک نوخیز حسین و جمیل شہزادی سے دوچار ہوئیں اور عشق کی برچھی اس کے سینے کے پار ہوئی - ادھر شہزادی کو بھی پریم کے دیوتا 'کام دیو' نے مسحور کردیا - چلتے وقت شہزادی کو شرم و حیا نے اجنبی شہزادے

کے ساتھہ ہم کلام ہونے سے باز رکھا لیکن جذبۂ عشق نے اشارات اور کنایات کے ذریعے اظہار حال پر اُسے مجبور کردیا - چنانچہ نزدیک کے تالاب سے شہزادی نے ایک کنول کا پھول لیا، اپنے کان پر رکھا، پھر دانت سے کاٹا، اس کے بعد پانو سے کچلا اور آخر میں اُس پامال پھول کو اُٹھاکر سینے سے لگایا - جب وہ پری پیکر شہزادے کی نظروں سے غائب ہوگئی تو ہجراں نصیب عاشق ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا - ہزار چاہا کہ دل پر قابو رکھے لیکن اس کی بے قراری اور بے چینی بڑھتی گئی - بالآخر اس نے سارا ماجرا اپنے قلبی دوست وزیر زادے سے بیان کیا - وزیر زادے نے اسے تسلی دی اور شہزادی کے رموز و کنایہ کی یوں تعبیر کی کہ کان پر پھول رکھہ کر شہزادی نے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ کرناٹک کی رہنے والی ہے، کیونکہ سنسکرت میں کان کو "کرن" کہتے ہیں - پھول کو دانت سے کاٹنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ راجہ دنتاوت کی بیٹی ہے کیونکہ دانت کو سنسکرت میں "دنتا" کہتے ہیں - پانو سے پھول کُچل کر اس نے یہ ظاہر کیا کہ اس کا نام پدماوتی ہے کیونکہ "پد" پانو یا قدم کو کہتے ہیں - پھول کو سینے سے لگا کر اس نے یہ ظاہر کیا کہ اس کا دل بھی پیکان عشق سے گھائل ہوگیا ہے - آج کل بھی ریل گاڑی کا محافظ سبز یا سرخ جھنڈی دکھاکر انجن چلانے والے کو گاڑی چلانے یا ٹھیرانے کی ہدایت دیتا ہے —

مندرجۂ بالا واقعات سے ایک اہل نظر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ تمدن کے ابتدائی دور میں جب انسان زبان کی نعمت سے محروم تھا تو وہ محض اشارات و علامات کے ذریعے اپنا مافی الضمیر دوسروں پر ظاہر کرتا ہوگا - علمائے لسانیات اس دور کو عہد رموزی کے نام سے موسوم کرتے ہیں - چونکہ دور بربریت کے ابتدائی عہد میں ضروریات زندگی محض سادہ اور بالکل تقاضائے فطرت کے مطابق ہوتی تھیں، آبادیاں نہایت قلیل تھیں، پیٹ بھرنے کے لئے بناس پتی، جڑیں، پھل پھلاری یا شکار کا گوشت، تن ڈھانکنے کے لئے چوڑی پتیاں یا جانوروں کی کھالیں، شدائد موسمی سے محفوظ رہنے کے لئے پہاڑ کے غار یا درختوں کے کھوکھلے تنے کافی تھے،

اس لیے عرصۂ دراز تک رموزی زبان یعنی چند مہمل آوازوں کے ساتھہ جسم کی حرکت، دست و ابرو کے اشاروں یا اشیاے مادی کے ذریعے ان کے تمام کام حسب مرضی نکلتے رہے - خلاصہ یہ کہ اشارات و علامات ہی وہ قدیم آلے تھے جن کے ذریعے تبادلۂ خیالات، اظہار مافی الضمیر اور اداے مطلب کا کام بہت دنوں تک انجام پاتا رہا —

عہــد صوتی

لیکن رفتہ رفتہ آبادیاں بڑھنے لگیں، انسان کی ضروریات میں وسعت اور اضافہ ہونے لگا، معاملات گنجلک اور معاشرت پیچیدہ ہوتی گئی، اب خارجی دنیا اور خود انسانی زندگی کے متعلق معلومات کا ذخیرہ اس قدر بڑہ گیا کہ اشارات و علامات اداے مطلب کے لئے بالکل ناکافی ثابت ہونے لگے - علاوہ بریں اشیاے مادی کے ذریعے اظہار خیال میں غلط فہمیاں بھی ہونے لگیں- اوپر دکھایا جاچکا ہے کہ راعی کے تھیلے یا گیند اور چوگان بھیجنے سے دارا کا منشا کچھہ تھا لیکن سکندر نے ان کے معنی کچھہ اور ہی لیے - ملا دو پیازہ اور ایرانی مولوی کے درمیان بذریعۂ رموز و کنایات جو بحث مباحثہ ہوا اس کی تعبیر دونوں نے بالکل جدا جدا بیان کی- اسی طرح عہد "رموزی" میں بھی غلط فہمیاں پیدا ہوجایا کرتی تھیں، جن کی وجہ سے معاملات میں خلل وقع ہوتا تھا - لہذا اظہار خیالات کے لئے دیگر وسائل کی دریافت کی جانب انسان کا ذہن رجوع ہوا —

واضح رہے کہ قواے ذہنیہ کے لحاظ سے ہر زمانے میں، یہاں تک کہ دور بربریت کے ابتدائی دور میں بھی انسان کو دیگر حیوانات پر برتری حاصل تھی - قواے ذہنیہ کا مستقر دماغ ہے، جو کاسۂ سر میں واقع ہے - یہ ایک پیچیدہ عضو ہے، جو متعدد حصوں پر منقسم ہے، ہر حصے کے لئے ایک خاص کام مقرر ہے - مثلاً کوئی حصہ بصارت سے متعلق ہے تو کوئی سماعت سے، کوئی تخیل سے تو کوئی حافظے سے، الغرض تمام قواے ذہنیہ کے لئے کوئی نہ کوئی حصہ مخصوص ہے- کسی بیماری یا چوٹ

یا کسی اور وجہ سے اگر دماغ کے کسی حصے کو گزند پہنچے تو جو ذہنی قوت اس حصے سے متعلق ہوگی وہ معطل ہوجائے گی۔ مغز یا دماغ کا وزن اور بلندیاں، جنھیں اصطلاح میں "تلافیف" کہتے ہیں، جتنی زیادہ ہوں گی، قوائے ذہنیہ اتنے ہی زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہوں گے۔ انسان کا دماغ اس کے مساوی جسم کے تمام حیوانات سے زیادہ بڑا اور وزنی ہوتا ہے۔ قوی الجثہ اور دیو ہیکل جانوروں کے دماغ کا وزن ممکن ہے کہ انسانی دماغ سے زیادہ ہو، تاہم بہ اعتبار عقل و فہم، فراست و ذکاوت انسان کا درجہ سب سے بلند ہے۔ کیونکہ جانوروں کا دماغ مسطح اور ہموار ہوتا ہے لیکن انسان کے دماغ میں بے شمار نشیب و فراز یعنی "تلافیف" پائے جاتے ہیں۔ گویا تلافیف ہی کے باعث انسان کو حیوان پر برتری حاصل ہے۔ بہر حال ہم یہاں دماغ کی ساخت، مخ و مخیخ کے فرائض اور نخاع کے وظائف وغیرہ کا بیان بخوف طوالت نظر انداز کیے دیتے ہیں۔ قارئین کرام عضویات پر کسی کتاب کی طرف رجوع کریں۔ یہاں ہمیں صرف گویائی سے بحث ہے۔ دماغ میں جس طرح مختلف قوائے ذہنیہ کے لئے مختلف مرکز مقرر ہیں۔ اسی طرح اس کا ایک حصہ گویائی سے مختص ہے، جسے اصطلاح میں "مرکزگویائی" کہتے ہیں۔ اسی مرکز کی موجودگی اور بروز و ترقی نے انسان کو تمام حیوانات پر اشرف و ممتاز کیا ہے۔ کیونکہ دوسرے جانوروں میں دماغ کا یہ حصہ بالکل مفقود ہوتا ہے۔ اگر یہ حصہ مع نمو یافتہ "تلافیف" کے جانوروں میں بھی موجود ہوتا تو وہ بھی حیوان ناطق بن جاتے اور پھر حیوان مطلق اورحیوان ناطق کی تفریق ھی اُٹھ جاتی۔ عضویات کوئی قدیم علم نہیں ہےبلکہ معاشیات، ارضیات، معدنیات، اثریات وغیرہ کی طرح دور حاضر کی تخلیق ہے۔ قدما اس علم سے ناواقف تھے، انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ انسانی دماغ کا کوئی حصہ گویائی کے لئے بھی مختص ہے۔ چنانچہ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں ایک فرانسیسی عالم "بروقا" نامی نے پہلے پہل دماغ میں "مرکز گویائی" کی موجودگی اور اس کی جائے وقوع دریافت کی۔ اسی انتساب سے وہ حصۂ دماغ جو گویائی سے متعلق ہے "رقبۂ بروقا" کہلاتاہے۔

اگر ہم دماغ کا مطالعہ ایک دوسرے نقطۂ نگاہ سے کریں اور اس حصے کو تلاش کریں جو اعضا و جوارح کے حرکات و سکنات کو قابو میں رکھتا ہے تو معلوم ہو گا کہ " رقبۂ بروقا " دماغ کے اسی حصے میں واقع ہے جہاں ہونٹ ' دانت' زبان ' حلق اور جبڑوں وغیرہ کے اعصاب و نسیجات منتہی ہوتے ہیں ۔ اور جو آلات گویائی کے حرکات و سکنات کو بس میں رکھتا ہے - لیکن یہ امر ذہن نشین رہے کہ " رقبۂ بروقا " یعنی مرکز گویائی اور وہ حصہ جو آلات گویائی کو متحرک کرتا ہے دونوں جدا گانہ حصے ہیں - یہ حصے ایک دوسرے پر منطبق نہیں ہیں' گو کہ متصل ضرور ہیں ۔ دونوں حصوں کی جاے و قوع مخ کے اگلے حصے میں بائیں جانب ہے ۔ واضح رہے کہ آلات گویائی کا محض متحرک رہنا قوت گویائی کا کفیل نہیں ہو سکتا - اگر کسی وجہ سے " رقبۂ بروقا " میں اختلال واقع ہو جاے لیکن دماغ کا وہ حصہ جو آلات گویائی کے حرکات و سکنات کو قابو میں رکھتا ہے صحیح و سالم رہے تو انسان ہونٹ' زبان ' حلق ' دانتوں اور جبڑوں کو حرکت دے سکتا ہے ' لیکن بول نہیں سکتا ۔ بعض آدمی ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جن کے دماغ کے "رقبۂ بروقا " میں خلل واقع ہو گیا ہے - یہ لوگ اس اختلال کے باعث گویائی سے محروم ہو گئے ہیں - تاہم وہ چند لفظوں کو بے سمجھے بوجھے مثل توتے کے دہرا سکتے ہیں' یا صرف "ہاں" اور " نہیں " بول سکتے ہیں - اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ "ہاں " اور " نہیں " یا اور الفاظ جو ان کے تکیہ کلام تھے بوجہ کثرت استعمال دماغ پر ایسے گہرے منقوش ہو گئے تھے کہ مرکز گویائی میں اختلال واقع ہو نے پر بھی ان کے مٹتے مٹتے سے نشانات صفحۂ دماغ پر باقی رہے - بہر حال دماغ کے حصۂ گویائی یعنی " رقبۂ بروقا " کے متعلق ہمارا علم مکمل نہیں بلکہ ابھی بہت سی باتیں دریافت طلب ہیں - لیکن یہ امر مسلم ہے کہ حصۂ گویائی کا وجود ضرور ہے اور وہ دماغ کے دوسرے حصوں سے آزاد اور بے تعلق ہے - اس کا ثبوت مندرجۂ ذیل واقعات سے ملتا ہے۔ مختلف افراد کی قوت گویائی مختلف ہوتی ہے' گو کہ وہ دیگر قواے ذہنیہ

کے لحاظ سے مساوی درجے ھی کی کیوں نہ ھوں - بعض فلاسفہ اور مشاھیر ادبا آھستہ آھستہ اور رک رک کر تقریر کر تے ھیں، بر خلاف ان کے بعض معمولی دل اور دماغ کے انسان ایسے چرب زبان اور لسان ھو تے ھیں کہ اپنی دلکش تقریر سے مجمع کو مسحور کر دیتے ھیں - اگر کسی شخص میں تحریر و تقریر دونوں کامادہ بدرجۂ اتم موجود ھو تو اسے بڑا خوش نصیب سمجھنا چاھئے- کارلائل اوراڈیسن اعلیٰ درجے کے ادیب اور انشا پرداز تھے لیکن تقر یر کر نے سے عاجز - ان سب باتوں سے ظاھر ھوتاھے کہ دماغ میں مختلف قوتوں کے لئے مختلف حصے مقرر ھیں جو ایک دوسرے سے متا ثر ھوے بغیر تنہا اور آ زادانہ ترقی کر سکتے ھیں - بعض لوگوں کے دماغ کا حصۂ گویائی پوری طرح نمو یافتہ ھو تا ھے لیکن دوسرے حصے خام اور ناقص ھو تے ھیں - ان کے بر عکس بعض اشخاص ایسے بھی دیکھے جا تے ھیں جن کا حصۂ گویائی ھی ناقص اور دوسرے حصے مکمل ھو تے ھیں - چنا نچہ انگلستان کے مشہور شاعر گولڈاسمتھ‌کے متعلق کہا جاتا ھے کہ وہ تحریر اور انشا پردازی کا بادشاہ تھا لیکن تقریر کر نے اور بولنے میں ھیرامن توتے کا بھی مدمقابل نہ تھا —

الغرض اس طومار سے صرف یہ بتانا مقصود ھے کہ شروع سے قدرت نے انسانی دماغ کے ایک حصے کو گویائی کے لئے مخصوص کردیا ھے لیکن ابتداے آفرینش میں چو نکہ یہ حصہ بچوں کے دماغ کے حصۂ گویائی کی طرح ارتقا کی ابتدائی منزل میں تھا اس لئے انسان دوسرے جانوروں یا بچوں کی طرح محض چند مہمل اصوات کے ذریعے سے صرف جذبات اور احساسات کے اظہار پر قادر تھا - چو نکہ حیوانات کے دماغ میں گویائی کا حصہ سرے سے تھا ھی نہیں اس لئے ان کی آواز میں آ ج تک ترقی نہیں ھوئی - لیکن انسان کے دماغ میں ایک حصہ گویائی کے لئے بھی وقف تھا اسی لئے جس طرح اس کے جسم ، ذھن اور اخلاق میں رفتہ رفتہ ترقی ھو تی گئی اسی طرح اس کی گویائی بھی روز افزوں ترقی کر تی گئی - جب تمدن کی ترقی ، خیالات کی وسعت اور معاملات کی پیچیدگیوں کی وجہ سے

انسان نے رموزی طرز اظہار کو بالکل نا کافی پایا تو اس کا خیال ہوا کہ جس طرح جذبات و احساسات کا اظہار آ وازوں سے خواہ وہ کتنی ہی کرخت ، ثقیل اور بھونڈی کیوں نہ ہوں کیا جاتاھے، اسی طرح تمام ضروریات، خواہشات اور خیالات بھی مرتب اصوات کے ذریعے سے ظاہر کئے جا سکتے ہیں - چونکہ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ آوازوں نے بھی ترقی کر لی تھی اس لئے اصوات کے ذریعے متکلم ہو نے اور ہوا کو واسطہ بنا نے میں زیادہ دقت پیش نہ آ ئی - خلاصۂ کلام یہ کہ جب حرکات جسمانی رمز و کنا یہ ، دست و چشم کے اشارے اور علامات اشیاے مادی اداے مطلب کے لئے ناکافی ثابت ہوے تو انسان نے ہوا اور اصوات کے توسط سے تبادلۂ خیالات اور اظہار مافی الضمیر کا اہتمام کیا - تاریخ انسان کے اس دور کا نام " عہد صوتی " ہے- یہ بہت بڑا انقلاب تھا ، جو زبان کی مملکت میں پیدا ہوا ، کیونکہ یہیں سے زبان کی حقیقی تاریخ شروع ہو تی ہے —

زبان کی تدریجی ترقی

اول اول جب انسان نے ہوا کو تکلم کا واسطہ بنایا اور آوازوں کے ذریعے سے اداے مطلب کا اہتمام کیا تو وہ صرف اُنہیں معدودے چند سہل المخرج آوازوں کے نکالنے پر قادر تھا جنھیں بول کر چھوٹے بچے اپنی خواہشات و جذبات کا اظہار کر تے ہیں - لیکن جوں جوں انسان کو آلات گویائی کے استعمال میں مہارت ہو تی گئی، وہ حسب ضرورت انھیں چند سہل المخرج اصوات کے اونچے نیچے سروں میں ادا کر کے یا اُن میں اتار چڑھاؤ پیدا کر کے یا ان کو گھٹا بڑھا کر مختلف معنی پیدا کر تا گیا - صاحب فرہنگ آ صفیہ کا خیال ہے کہ " شروع شروع جب انسانوں نے اصوات کو اداے مطلب کا ذریعہ بنانا چاہا تو اُنھوں نے صرف تین مفرد حرکتوں یا آوازوں کو منضبط کیا ، جنھیں ہم اعراب یا حرکات ثلاثہ کے نام سے نامزد کر تے ہیں — یہ تینوں آوازیں یعنی اَ اِ اُ وہی ہیں جو زمانہ پیدائش سے اُن کے ساتھ سانس کے ہمراہ آئی تھیں اور سہل الخروج

ہونے کے سبب ہر شخص سے بہ آسانی اپنے اپنے موقع پر سرزد ہوجایا کرتی تھیں یعنی درد کے موقع پر درد کا سماں ان میں تھا - دریا کی موجیں' ہوا کی لہریں' گنبدوں کی گونجیں' اُترنے کی سیڑھی' چڑھنے کا زینہ' خدا اور اپنے پیاروں کو پکارنے کی ندا' ہر قسم کی صدا' ہاتھیوں کی چنگھاڑ' شیروں کی دھاڑ' اور بادلوں کی گرج' بھنبیری کی بھنبھناہٹ' مگس کی طنین' قریب اور بعید کی چیزوں کے اشارے' دنیا کے ابتدائی دھندے ' اُن ہی تین آوازوں یعنی ' اَ - اِ - اُ ' میں موجود تھے - اور ہر ایک کیفیت اُن ہی کے گھٹانے بڑھانے سے حاصل ہوجاتی تھی'' - لیکن یہ رائے غلو اور مبالغے سے پر اور حقیقت سے دور معلوم ہوتی ہے - مختلف خیالات' جذبات اور واقعات کو صرف ایک ہی آواز کی تین صورتوں کی مدد سے بیان کرنا اور لوگوں کا متکلم کے منشا کو معلوم کرلینا بعید از قیاس ہے - ننھے بچے بھی مندرجۂ بالا حرکات ثلاثہ کے علاوہ چند اور سہل المخرج آوازیں بولتے ہیں - جیسے : ماما' بابا' دادا' اھا وغیرہ - لہذا انسان بھی عہد رموزی ہی میں اپنے جذبات چند قسم کی آوازوں سے ظاہر کرتا ہوگا - لیکن "عہد صوتی" میں ضروریات و احتیاجات' خیالات و معلومات میں اضافہ ہوجانے کے باعث زیادہ آوازوں کی ضرورت آن پڑی - چونکہ طویل مُدت کے گزر جانے سے دماغ کے حصۂ گویائی کی بھی پہلے سے زیادہ نشو و نما ہوگئی تھی اور اس کے ساتھ آلات گویائی مثلاً ہونٹ' ناک' منہ' زبان' تالو' حلق' دانت وغیرہ کی ساخت اور ہیئت میں بھی کسی قدر ترقی ہوگئی تھی' اس لئے انسان کو اُن کی مدد سے مختلف قسم کے اصوات نکالنے میں سہولت واقع ہوئی - انسان نے آوازوں کو اس طرح ترقی دی کہ کسی کو دونوں ہونٹ ملاکر' کسی کو تالو سے' کسی کو حلق سے' کسی کو زبان کی نوک سے' کسی کو ناک کی شرکت سے نکالا - اب مختلف قسم کی آوازیں انسان کے قابو میں آگئیں - پس مختلف مفرد آوازوں سے مختلف قسم کے خیالات یا اشیا کا اظہار ہونے لگا - لیکن روز افزوں حاجتوں اور ضرورتوں کے سبب سے یہ محدود مفرد آوازیں تمام معلومات کے اظہار

کے لیے ناکافی ثابت ہوئیں - لہذا مفرد اصوات کے اختلاط سے تمام اشیا کے نام رکھے جانے لگے - اول اول جس شے کی جو فطری آواز تھی اُسی کی مناسبت سے اسما بنائے گئے' کیونکہ یہ طریقہ سہل اور قدرتی بھی تھا - جیسے ہوا کے چلنے کو سائیں سائیں اور پانی برسنے کو جھم جھم' کُتے کے بھونکنے کو بھوں بھوں' بلی کی بولی کو میاؤں میاؤں وغیرہ سے تعبیر کیا' اُسی طرح جھیں جھیں کرنے والے جانوروں کا نام جھینگر' ٹرٹر کرنے والے کا ' ٹرو ' بھن بھن کرنے والے کا بھونرا' جھر جھر بہنے والے پانی کا نام 'جھرنا' پڑا - جس شے کے ساتھہ کوئی فطری آواز وابستہ نہ تھی' اس کا جو کچھہ مناسب سمجھا گیا نام رکھہ دیا گیا - اس طرح ایک معقول تعداد اسما کی تیار ہوجانے پر زبان کو غیر معمولی گرانباری سے بچانے کے لیے یہ اصول مد نظر رکھا گیا کہ اگر کسی نئی شے میں دو یا زیادہ اشیاء کی صفات یا مشابہات پائی جائیں تو اُس شے کا ایک نیا نام تجویز کرنے کے بجائے اشیائے معلومہ کے اسما کی آمیزش سے مرکب لفظ بنالیا جائے - مثلاً ' کنسلائی ' اُس سلائی کے مانند باریک کیڑے کو کہا جو کان میں رینگ جاتا ہو - 'کنکھجورا' اُس کیڑے کا نام پڑا جو کھجور کے مشابہ ہو اور کان میں بیٹھہ جائے - 'اجگر' (اج بکرا × گر — نگلنے والا) اُس اژدہے کو کہنے لگے جو بکرے کو نگل جائے - اگر کوئی جانور دو یا زیادہ جانوروں کے مشابہ ہو تو اس کا نام ان ہی مشابہ جانوروں کے اسما کا مجموعہ قرار پایا - مثلاً ' شتر مرغ' گاؤ میش' فیل مرغ' شتر گاؤ پلنگ (زرافہ) وغیرہ - بعض جانوروں کے نام ان کی صفات یا خواص کی مناسبت سے رکھے گئے - مثلاً 'ہاتھی' یعنی ایک ہاتھہ والا جانور' سونڈ ہاتھہ کے بجائے سمجھی گئی - چیتا وہ درندہ ہے جس کی کھال پر چتیاں ہوتی ہیں - سمندر (سام = آگ × اندر = درمیان) اس کیڑے کا نام پڑا' جو آگ میں رہے - بعض چیزوں کے نام ان کے افعال کے باعث رکھے گئے' مثلاً مارخور' چوہے مار' چڑی‌مار' نیولا (نیو یعنی بنیاد کھودنے والا) وغیرہ - الغرض انہی اصول پر تمام اشیا کے اسما قرار دیے گئے - اوپر کی تمام مثالیں فرہنگ آصفیہ سے دی گئی ہیں -

لیکن مندرجۂ بالا بیانات سے ہرگز یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ ابتدائی دور تمدن میں اشیاء کے وہی نام تھے جو اوپر بیان کیے گئے اور دور بربریت کا انسان اردو بولنے پر قادر تھا - محض اصول سمجھانے کے خیال سے ایسے الفاظ کی مثالیں دی گئی ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں - ابتدائی انسانوں نے ان ہی اصول پر اشیا کے نام رکھے - نام کچھ‌ھی کیوں نہ ہوں، لیکن اُن کے مقرر کرنے کے لئے اصول وہی تھے، جو اوپر بیان ہوے - یہی وہ ابتدائی زینے تھے جن پر رفتہ رفتہ گامزن ہوکر زبان نے اعلیٰ زینے تک صعود کیا - واضح رہے کہ افعال کے نام بھی پہلے فطری آوازوں ہی کی مناسبت سے رکھے گئے- مثلاً 'بھونکنا، گڑگڑانا، غرانا، کھٹکھٹانا وغیرہ - جہاں قدرتی آوازوں کا فقدان تھا وہاں جو کچھ مناسب سمجھا گیا فعل کا نام رکھ دیا گیا - اکثر افعال کے نام اسماے اشیا سے بنائے گئے - ' ہتھیانا ' یعنی کوئی شے ہاتھ میں لینا اور اس پر قابض ہوجانا، 'برقانا ' یعنے کسی شے میں بجلی گذارنا - وغیرہ - انگریزی زبان میں اس قسم کی بے شمار مثالیں ملیں گی - اس کے بعد اسما میں باہم نسبت دینے کے لئے روابط قائم کیے گئے-جب اسماء، افعال اور روابط مقرر ہوچکے تو گویا ایک باقاعدہ زبان کا ڈھچر تیار ہوگیا - رفتہ رفتہ اس کالبد کی مناسب عضو بندی ہوتی رہی، یہاں تک کہ بالآخر ایک گٹھا ہوا، سڈول جسد تیار ہوگیا اور علم و فن کی ترقی نے آگے چل کر اس میں جان ڈال دی - تشبیہ و استعارہ کا نقاب ہٹانے پر سیدھا سادھا مطلب یہ ہے کہ معاشرت کی ترقی، احتیاجات کے اضافے، ضروریات کے ہجوم، معاملات کی پیچیدگی، زندگی کی کشاکش کے زیر اثر 'زبان صوتی" دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی گئی، ذخائر الفاظ میں اضافہ ہوتا گیا اور لغات بڑھتی گئیں - جس طرح بچوں کی معلومات محض اشیاے مادی و محسوس و مقرون تک محدود ہوتی ہیں اور اِنھیں مجردات کا تصور نہیں ہوتا، اسی طرح ابتدائی انسان کی واقفیت مادی اور مرئی چیزوں تک محدود تھی - لیکن تمدن کی ترقی اور ارتقاے ذہن کے باعث خیالات میں لطافت اور پاکیز گی

آتی گئی اور مجردات و توصیفات کے لئے بھی نام تجویز کئے گئے- رفتہ رفتہ اداے مطلب کے لئے عمدہ پیرایۂ بیان اور اظہار خیالات کے لئے حسن اسلوب کی جانب ذہن انسانی رجوع ہوا - چنانچہ بمرور زمانہ ایک مرتب اور باقاعدہ زبان کی مستقل ہیئت قائم ہو گئی - آبادی اور تمدن کی ترقی کے ساتھہ ساتھہ زبان بھی ترقی کرتی گئی - جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، پچھلے الفاظ زبان کی رگڑ کھا کھا کر منجھتے، صاف ہو تے اور گُھل گُھل کر سلیس ہو تے گئے - چنانچہ امتداد زمانہ سے الفاظ زبان کی خراد پر چڑہ کر تراش خراش پا تے گئے - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآ خر زبان میں شستگی، حلاوت اور گھلاوٹ پیداہو گئی - لیکن تقریری زبان میں اس حد تک ترقی ہو نے پر بھی رسم خط و طرز تحریر ہنوز پردۂ خفا میں تھی - الفاظ و خیالات ابھی ضبط تحریر میں آکر پابند سلاسل نہیں ہوے تھے - دیوتاؤں کے بھجن، پیشوایان دین کی تعلیم، دانشمندوں کے اقوال، راجاؤں اور سورماؤں کے کارنامے عرصۂ دراز تک محض زبانی طور پر نسلاً بعد نسل منتقل ہو تے رہے —

اختلافات السنہ

کسی زبان کی پیدائش اور اُس کی ترقی کے مختلف مدارج اوپر بیان ہو چکے، لیکن یہ پتا لگانا بہت دشوار ہے کہ ابتداے تمدن میں ایک ہی زبان بولی جا تی تھی یا کئی - جن اقوام کا یہ مذہبی عقیدہ ہے کہ تمامؔ انسان ایک ہی ابوالبشر کی اولاد سے ہیں - خواہ وہ یہود و نصاریٰ و اہل اسلام کے خیال کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام ہوں یا مجوسیوں کے قول کے مطابق " مہ آباد " یا ہندووں کے اعتقاد کے مطابق " سویمبھو منو " - یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ابتدا میں ایک ہی زبان تھی، جس سے دیگر السنہ مشتق ہوے ہیں - لیکن وہ ابتدائی زبان کو نسی تھی اور اس کی ہیئت کذائی کیا تھی ؟ اس کے جواب میں قومیں مختلف الآرا ہیں - ہرقوم اپنے خیالی مورث اعلیٰ کی زبان کو تمام دیگر السنہ کا ماخذ قرار دیتی ہے - کو ئی ' سریانی ' کو، کو ئی ' ارامی' کو کو ئی 'سنسکرت' کو اور کو ئی 'استاوی' زبان کو اُم 'الالسنہ' قرار دیتا ہے - سا سانی

مجوسیوں کا قول ہے کہ ' مہ آباد ' نے جس کی زبان استاوی تھی ' اپنے شاگردوں کو مختلف زبانوں کی تعلیم دے کر مختلف ممالک میں بھیجا - اس طرح مختلف قطعات ارض میں مختلف زبانیں بولی جا نے لگیں - اگر یہ واقعہ سچ بھی ہو تو وہ اختلاف زبان کی وجہ قرار نہیں دیا جا سکتا ' بلکہ اس سے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مختلف قطعات ارض پہلے سے آباد تھے - اور ہر جگہ کی زبان الگ الگ تھی - اس لئے ہر ملک کے لوگوں کو اُنھیں کی زبان میں اصول مذہب کی تعلیم دینے کے لئے ' مہ آباد ' نے اپنے شاگردوں کو مختلف زبانیں سکھا ئیں - توریت کے گیارھویں باب میں زبان میں پھوٹ پڑ جانے کی جو وجہ بتائی گئی ہے ' وہ ہم شروع ہی میں بیان کر آے ہیں - لیکن دور حاضر کے دانایان فرنگ کا خیال ہے کہ انسان کسی فرد واحد کی اولاد نہیں ہے ' بلکہ اُس نے جسم حیوانی سے رفتہ رفتہ ترقی کر کے اور ارتقا کے بے شمار مدارج طے کر نے کے بعد ' جامۂ انسانی زیب تن کیا ہے - لہذا اُن کا خیال ہے کہ ابتداے تمدن ہی میں دور دراز ممالک کے وحشی انسان مختلف زبانیں بولتے ہو نگے - بہر حال اگر یہ مسئلہ غیر فیصل ہی چھوڑ دیا جاے کہ ابتداءاً ' انسان کی زبان ایک تھی یا متعدد ' تو بھی یہ امر مسلم ہے کہ اُس وقت آج کل کی طرح لاکھوں زبانیں نہیں بولی جاتی تھیں - ماہرین عمرانیات نے انسان کے خط و خال ' جسمانی ساخت ' قد و قامت ' چہرے مہرے ' کاسۂ سر اور جبڑوں کی بناوٹ اور رنگ وغیرہ کا مقابلہ کر کے انسان کو سات نسلوں میں تقسیم کیا ہے - یعنی (۱) آریائی (۲) سامی (۳) تاتاری (۴) ملائی (۵) امریکی (سرخ وحشی) (۶) حبشی (۷) آسٹریلیائی - لیکن اس زمانے کی تحقیق نے اس دائرۂ تہذیب و تقسیم کو محدود کر کے سات کے بجاے تین ہی نسلیں قرار دی ہیں - علماے انسانیات اول الذکر دو نسلوں کو ایک ہی وسیع کاکیشیائی نسل کی شاخیں سمجھتے ہیں - ثانی الذکر تین قومیں ایک ہی نسل منگولی کی فروع ہیں - ان کا خیال ہے کہ منگولی نسل کی جو شاخ اپنے قدیم آبائی وطن میں مقیم رہ گئی

وہ تاتاری قوم کہلاتی ہے - جو شاخ جانب جنوب کوچ کر کے سیام ' انام ' ملایا' سماترا ' جاوا وغیرہ میں جا بسی وہ ' ملائی' قوم کہلانے لگی - تیسری شاخ شمال کی طرف بڑھی اور آبنائے بیرنگ' کو جو قدیم زمانے میں خاکنائے تھی' عبور کرکے امریکا کے مختلف حصوں میں آباد ہو گئی - اسی شاخ کا آگے چل کر امریکی یا سرخ وحشی قوم نام پڑا - آخرالذکر دو نسلیں یعنی حبشی اور آسٹریلیائی ایک ہی نسل ایتھیوپی (اسودااللون) سے متفرع ہیں - ماہرین ارضیات کا قیاس ہے کہ قرنوں پہلے دنیائے قدیم کے جنوبی حصے کی شکل ایسی نہ تھی جیسی آج کل ہے' بلکہ افریقہ ' ہندوستان اور آسٹریلیا بذریعۂ خشکی باہم متحد تھے - اس وقت اسوداللون قوم کی شاخیں افریقہ سے چل کر ہندوستان اور آسٹریلیا میں جا بسی تھیں - چنانچہ ہندوستان کی قدیم وحشی اقوام اسی اسوداللون نسل سے تعلق رکھتی ہیں - عرصۂ دراز کے بعد خشکی کا بڑا حصہ زیر آب چلا گیا اور آسٹریلیا ہندوستان اور افریقہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے - الغرض ابتدائے تمدن میں اگر ایک نہیں تو تین یا زیادہ سے زیادہ سات زبانیں بولی جاتی ہوں گی - اور امتداد زمانہ سے اُنھیں سے بے شمار زبانیں نکلتی گئیں - اب ہمیں زبان میں اختلافات پیدا ہونے کی وجوہ پر غور کرنا چاہئے —

مذہبی روایات کا دار و مدار ظنیات پر ہے' لیکن علمی تحقیقات کا تعلق واقعات اور عقلیات سے ہے - لہذا اختلافات السنہ کی جو وجوہ توریت اور انجیل یا مجوسیوں کی کتاب مقدس میں درج ہیں ' انھیں ہم نظر انداز کردیتے ہیں - اور اپنی بحث کو معقولات ہی کے دائرے کے اندر محدود رکھتے ہیں - علمی لحاظ سے اختلاف السنہ کی سب سے بڑی وجہ متفرق ممالک کی آب و ہوا اور دیگر جغرافی خصائص کا اختلاف ہے - جب مادر وطن میں اُس کے تمام فرزندوں کے لئے کافی جگہ اور گنجایش باقی نہیں رہی تو فاضل آبادی دوسرے ملکوں میں ہجرت کرنے لگی - مثلاً آریاؤں کا قدیم وطن وسط ایشیا تھا' لیکن عمران و آبادی کی

کثرت نے انھیں وطن کو خیر باد کہہ کر دوسرے ملکوں میں جا بسنے پر مجبور کیا - ان کا اکثر و بیشتر حصہ مغرب کی جانب تلاش معاش میں چل کر تمام یورپ پر چھا گیا - کچھہ لوگ جنوب کی طرف روانہ ہو کر ایران اور ہندوستان میں آ بسے - یہی حال دوسری نسلوں کا ہوا - الغرض مرکزی وطن سے ہجرت مختلف قطعات زمین کی آبادی کا باعث ہوئی - اُس زمانے میں آج کل کی طرح دور دور ملکوں کے درمیان رسل و ترسیل اور حمل و نقل کے ذرائع موجود نہ تھے - اس لئے ایک ہی نسل کے لوگوں کے جو مختلف بلاد میں جا بسے تھے' باہمی تعلقات منقطع ہو گئے - متفرق ممالک کی آب و ہوا اور دیگر جغرافی خصائص کے زیر اثر نہ صرف مختلف قوموں کے عادات و خصائل' میلانات و رجحانات' ضروریات و خصوصیات رسم و رواج ہی ایک دوسرے سے متغائر ہو گئے بلکہ ان کے قد و قامت' جسمانی ساخت' آلات گویائی کی بناوٹ' منہ' زبان' ناک' دانتوں' حلق' ہونٹوں اور صوتی نلیوں وغیرہ کی ہیئت اور ساخت میں بھی افتراق پیدا ہو تا گیا - لہذا اُن کے لب و لہجہ' آواز و اصوات' مخارج و تلفظ' طرز ادا' اسلوب بیان وغیرہ بھی ایک دوسرے سے متباین ہو گئے - مثلاً پہاڑی علاقوں کے لوگوں کی آواز میں خشونت' میدانی قطعات کے باشندوں کی آواز میں ہمواری' سلاست اور روانی' تری کے رہنے والوں کی زبان میں نرمی اور لوچ' معتدل آب و ہوا میں زندگی بسر کرنے والوں کی بولی میں شیرینی اور حلاوت پیدا ہو گئی - یہ تو لب و لہجہ کا تغیر ہوا' ایسی ہی تبدیلیاں مخارج اور تلفظ میں بھی رونما ہوئیں - مختلف مرز بوم کی آب و ہوا کے زیر اثر بعض قوموں کے آلات گویائی کی ساخت میں کچھہ ایسا بجوگ آ پڑا کہ وہ بعض آوازوں کے بولنے سے قاصر ہو گئے - مثلاً پ - چ - ژ - ڑ - ڈ' گ وغیرہ کا تلفظ عربوں کے لئے نا ممکن ہے - اسی طرح انگریز ت' ع' غ' خ' ق' وغیرہ کا تلفظ نہیں کر سکتے - بھ' پھ' تھ' دھ' کھ' اور ٹ' ڈ' ڑ وغیرہ خاص ہندی النسل اصوات ہیں-

جن کے ادا کرنے سے دنیا کی اکثر قومیں معذور ہیں - اِس اختلاف تلفظ کی وجہ سے
ایک ہی لفظ نے مختلف ممالک میں پہنچ کر مختلف شکلیں اختیار کرلیں '
مثلاً ایران کی دختر ہندوستان میں آ کر " دو ھتر " اور انگلستان میں پہنچ کر
" ڈاٹر " بن گئی - " باپ " کو لاطینی میں " پاتر " فارسی میں " پدر "
سنسکرت میں " پتر " اور انگریزی میں " فادر " کہتے ہیں - اسی طرح گائے
کو فارسی میں ' گاؤ ' سنسکرت میں ' گئو ' اور انگریزی میں " کاو " کہتے ہیں -
ظاہر ہے کہ ابتدا میں یہ ایک ہی لفظ تھے - لیکن مختلف مرز بوم کی آب و ہوا
نے تلفظ اور لب و لہجہ میں تفریق پیدا کردی - پس ایک ہی لفظ کا تلفظ مختلف
قوموں میں جا کر مختلف ہو گیا - علاوہ بریں ایک ہی ملک میں بھی کسی
زبان کے الفاظ بمرور زمانہ منجھے اور شستہ ہوتے اور تراش خراش پاتے رہتے
ہیں - اس لئے زبان کی ہیئت بتدریج بدلتی رہتی ہے - الزبتھ کے عہد کی
انگریزی اور موجودہ انگریزی یا سترھویں صدی کے آواخر کے ریختے اور آج کل
کی اُردو میں زمین آسمان کا فرق ہے - زبان کے اختلاف کی ایک بڑی وجہ نئے
الفاظ کی توضیع و تسکیک ہے - مادر وطن میں جگہ کی قلت اور ذریعۂ معاش
کی تنگی کے باعث ایک نسل کے لوگ ابتدائے تمدن ہی میں ایک دوسرے سے
الگ ہو گئے تھے - چونکہ اُس وقت اُن کی ضروریات نہایت سادہ اور معلومات
محدود تھیں' اس لئے ان کے الفاظ کا ذخیرہ بھی نہایت قلیل تھا - لیکن جوں جوں
تمدن بڑھتا گیا اور ضروریات اور احتیاجات میں اضافہ اور معلومات و خیالات
میں وسعت پیدا ہوتی گئی' مختلف ملکوں میں اشیا کے لئے نئے نئے نام اور
ادائے مطلب کے لئے نئے نئے اسالیب بیان گھڑے گئے - چونکہ اُس وقت سلسلۂ مواصلت
و فامۂ و پیام مفقود تھا - اس لئے ہر جگہ کی بولی اور اسلوب بیان جداگانہ
ہوتا گیا - یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ایک ملک کی بعض نباتی' حیوانی اور
جمادی پیداواریں دوسرے ملک کی پیداواروں سے متبائن ہوتی ہیں - اس لئے

کسی ملک کی مخصوص چیزوں کے لیے جو نام وھاں مقرر ھوے وہ دوسرے ملک کی زبان میں نا پید تھے - جس طرح مختلف ممالک کے باشندے وھاں کی آب و ھوا اور ملکی خصائص کے زیر اثر بہ لحاظ قد و قامت ' خط و خال ' جسمانی ساخت ' صورت شکل ' ایک دوسرے سے نہیں ملتے ' اُسی طرح مختلف قوموں کے خیالات و افکار ' مذاق اور پسند بھی جداگانہ ھوتے ھیں - ھر قوم نے اپنے افکار و آرا کے اظہار کے لئے اپنے مذاق کے مطابق ایک علحدہ طرز ادا اور اسلوب بیان اختیار کیا - بہر کیف مندرجۂ بالا تمام وجوھات کی بنا پر ھزاروں زبانیں معرض وجود میں آئیں اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاے گا آئندہ بھی آتی رھیں گی - دور حاضر میں حمل و نقل کی سہولت اور تجارت کی ترقی کے باعث مختلف اقوام کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور تبادلۂ خیالات کا موقع ھاتھ آتا ھے - آپس میں کار و بار چلانے اور لین دین جاری رکھنے کے لیے ایسے وسائل کی ضرورت پڑتی ھے جنھیں سب سمجھ سکیں - لہذا مختلف زبانوں کے باھمی تصادم سے ان پر اثر و تاثر کا عمل شروع ھوتا ھے - رفتہ رفتہ ان زبانوں کے اختلاط سے ایک نئی زبان معرض وجود میں آتی ھے - اول اول یہ محض کار و باری اور بول چال کی زبان ھوتی ھے لیکن بتدریج مستقل ھیئت اختیار کر لیتی ھے اور اُس کا دامن علمی اور فنی جواھر ریزوں سے بھرنے لگتا ھے - آخرش اُس کا بھی شمار دنیا کی اھم علمی زبانوں میں ھونے لگتا ھے - چنانچہ اردو اسی قسم کی ایک زبان ھے جو مختلف السنہ کے باھمی اختلاط سے پیدا ھوئی ھے - واضح رھے کہ ابھی زبانوں کے اختلافات کا سلسلہ ختم نہیں ھوا ھے بلکہ آے دن نت نئی زبانیں ظہور پذیر ھوتی رھتی ھیں - الغرض تمدن کی ترقی ' عمران اور آبادی کی فراوانی ' معاملات و معاشرت کی پیچیدگی کے باعث ربع مسکون کا ھر حصہ آباد ھو گیا ھے - بہ امتداد زمانہ نہ صرف زبانوں کی تعداد میں اضافہ ھوا بلکہ طرز ادا اور اسلوب بیان میں شستگی اور رنگا رنگی بھی پیدا ھوتی گئی —

تحریر کا ھیولیٰ

اب ہم بتانا چاھتے ھیں کہ رسم تحریر کا خیال کس طرح پیدا ھوا اور شروع شروع لکھنے کا کیا طریقہ تھا۔ عوام کا قاعدہ ھے کہ وہ ھر شے کا موجد کسی نہ کسی دیوتا یا پیغمبر یا دانشمند یا بطل کو ٹھیرا لیتے ھیں جو انھیں کے اسلاف میں سے ھوتا ھے۔ مثلاً نجاری کے استاد اول نوح علیہ السلام، آھنگری کے موجد داود علیہ السلام، خیاطی کے معلم اول ادریس علیہ السلام، پارچہ بافی کے بانی آدم علیہ‌السلام قرار دیے جاتے ھیں۔ اسی طرح فن تحریر کی ایجاد کا سہرا ھر قوم اپنے کسی بزرگوار کے سر باندھ دیتی ھے۔ چنانچہ کوئی قوم "گنیش"، کوئی "جمشید"، کوئی "جوپیٹر" (ناھید) کو کوئی "سلیمان علیہ السلام" کوئی آدم علیہ السلام کو فن تحریر کا بانی خیال کرتی ھے۔ لیکن اگر تحقیق و تلاش اور غور و فکر سے کام لیا جائے تو واضح ھو گا کہ دنیا میں کوئی علم، کوئی ھنر، کوئی فن، کوئی صنعت، شاید ھی ایسی ھوگی جو اپنے وجود کے لئے کسی فرد واحد کی قوت اختراعیہ کی منت پذیر ھو۔ بڑے سے بڑا عاقل یا فن کار کسی شے کو نیست سے ھست، عدم سے وجود میں یا پردۂ خفا سے تماشا گاہ عالم پر نہیں لا کھڑا کرتا۔ بلکہ پہلے سے ھر شے کا ھیولیٰ یا مادہ موجود ھوتا ھے، جسے وہ ترقی دیتا ھے۔ یا اپنے اسلاف کی منتشر معلومات کو باھم مربوط اور ان کی اچھی طرح شیرازہ بندی کر کے اصول و قوانین کی شکل میں مرتب و منضبط کرتا ھے۔ اور موجد، مخترع، مبتدع، مجتہد، مکشف، اور نہ معلوم کیا کیا بن بیٹھتا ھے۔ فی الحقیقت رسم تحریر کسی واحد فرد بشر کی جولانی طبع یا دماغ سوزی کا نتیجہ نہیں ھے اور نہ حروف کی اشکال اور تحریر کے قواعد ممالک متحدہ امریکا کے دستوری آئین و قوانین کی طرح کسی کانگریس یا مؤتمر میں باھمی قرارداد کے مطابق گھڑے گئے ھیں۔ حقیقت امر یہ ھے کہ دور بربریت ھی میں تحریر کا ھیولیٰ یا نقش اول قائم ھو چکا تھا، عہد بعہد اس کی ھیئت بدلتی اور اس میں ترقی ھوتی گئی، یہاں تک کہ ارتقا کا زینہ آج کل کی سہل‌النقش

طرز تحریر تک پہنچ گیا —

اب ہمیں غور کرنا ہے کہ تحریر کے ہیولیٰ یا نقش اول کی ہیئت کیا تھی۔ اس زمانے کی تحقیق کے رو سے یہ امر مسلم ہے کہ قدامت کے لحاظ سے آرایش کا خیال ستر پوشی سے بھی مقدم ہے - بہت سی وحشی قوموں کے افراد سخت جسمانی تکالیف محض اس غرض سے اُٹھاتے ہیں کہ اپنے جسم کو گدوا کر خوبصورت بنائیں - وہ موسم کی سخت سے سخت گرمی سردی کی بھی برداشت کر لیتے ہیں لیکن انہیں رفع کرنے کی کوشش نہیں کرتے - جرمنی کے ایک مشہور فلسفی سیاح ' همبولت ' کا بیان ہے کہ " اوری نو کو ' کے وحشی باشندے جسمانی آرام و راحت کی طرف سے تو بالکل غافل ہیں مگر دو دو ہفتے تک صرف اس غرض سے محنت مزدوری کرتے ہیں کہ اپنے بدن کو رنگنے کے واسطے رنگ خرید سکیں تاکہ ان کو رنگا ہوا دیکھ کر لوگ واہ واہ کریں - وہی وحشی عورت جو اپنی جھونپڑی سے بالکل برہنہ باہر نکلنے میں کچھ پس و پیش نہیں کرتی' اس کی اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ اپنے بدن کو رنگ لگائے بغیر باہر چلی جائے اور اس بدسلیقگی کی مرتکب ہو" - تاریخ انگلستان کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ قدیم برطانیوں میں بھی بدن کو نیلا رنگنے کا عام رواج تھا - تن ڈھانکنے کے لئے کسی جانور کی کھال اور کپڑا میسر آئے یا نہ آئے لیکن جسم کو نیلا رنگنا اور کچھ عرصے بعد گدوانا لازمی تھا - یہ رسم فرنگی سپاہیوں میں ابھی تک پائی جاتی ہے جن کو ہم ہندوستان میں بھی دیکھتے ہیں - یہ گورے سپاہی اپنے گُدے ہوے ہاتھوں کی نمائش کے لئے تقریباً ہر وقت قمیص کی آستینیں چڑھائے رہتے ہیں - بحری سیاحوں نے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ وحشی قوموں سوتی کپڑے اور باڈات کی نسبت رنگین مالاؤں' انگوٹھیوں اور چھلوں وغیرہ کو زیادہ عزیز رکھتی ہیں - راقم الحروف کو عرصے تک چھوٹا ناگپور کے صدر مقام رانچی میں رہنے اور وہاں کے جنگل باسی کولوں کے طرز زندگی کے مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے - وحشی 'کول' آس پاس کی جھاڑیوں اور جنگل سے آ کر دن بھر شہر میں محنت

مزدوری کرتے هیں اور شام هوتے هی جنگل کا راسته لیتے هیں - اس قوم کے ذکورو اناث دونوں نیم برهنه رهتے هیں - مردوں کی کمر پر صرف ایک چهوٹی سی لنگوٹی اور عورتوں کی کمر سے گهٹنوں کے اوپر تک ایک تهمد بندها رهتا هے - لیکن ان وحشیوں میں آرایش کا خیال اس قدر هے که عورت تو پهر عورت هی هے، مرد بهی لمبی لمبی زلفیں رکهتے هیں، جو هر وقت شانه کی هوئی رهتی هیں - دو تین چهوٹے چهوٹے مدور آئینے اور اتنی هی کنگهیاں بالوں میں اٹکائی هوئی رهتی هیں - بندهی هوئی زلف کے گردا گرد پهول کے هار حلقه کیے هوتے هیں - اور گردن مونگے کی سرخ مالاؤں سے مزین هوتی هے - کپتان اسپیک اپنے افریقی رفقا کا ذکر کرتے هیں که مطلع صاف هونے کے وقت تو یه لوگ بکری کی کهال کے کوٹ پهنے اِدهر اُدهر شان سے اکڑتے چلتے هیں، مگر بارش کے وقت اُن کو تهه کر کے رکهه دیتے هیں اور مینه میں تهر تهر کانپتے پهرتے هیں - وحشی باشندوں کی طرز معاشرت کے واقعات در حقیقت اس بات پر دلالت کرتے هیں که جسم کی زینت اور آرایش هی نے ترقی کرتے کرتے لباس کی شکل اختیار کی- اسی طرح مکان کی آرایش نے ترقی کر کے تحریر کی شکل اختیار کی - بیانات مذکورۂ بالا همیں اس نتیجے پر پهنچاتے هیں که دور بربریت کے انسان بهی زینت اور آرایش کے دلداده هوتے تهے - جن جانوروں کا وه شکار کرتے تهے، یا جو چیزیں اُنهیں خوبصورت نظر آتی تهیں، یا جن حیوانات و نباتات کی وه پرستش کرتے تهے، ان کی تصویریں بنانے کی وه کوشش کرتے تهے - پهلے یه تصاویر بچوں کی بنائی هوئی تصویروں کی طرح بهدی اور بهونڈی هوتی تهیں لیکن رفته رفته ان ابتدائی فن کاروں کی مشق و مهارت بڑهتی گئی، وه هڈی اور سینگ کے ٹکڑوں پر انسانوں اور جانوروں کی تصویریں کنده کر کے اُن سے اپنے رهنے کے جهونپڑوں کو آراسته کرتے تهے - یا اگر ان کا بسیرا غاروں میں هوتا تو اُن کے در و دیوار پر وه معمولی منبت کاری بهی کرتے تهے - موجوده دور تمدن میں بهی هندوستان

کے دهقانی اپنے مکان کے در و دیوار پر اکثر هاتهی - اونت - گاے - گهورے - شیر - سپاهی یا دیوتاؤں کی تصویریں خوبصورتی کے لئے بناتے هیں - آگے چل کر معلوم هوگا کہ آرایش مکان کے لئے جو تصویریں بنائی جاتی تهیں، وهی تحریر کا هیولی یا نقش اول تهیں -

تصویر نویسی* دور بربریت کے انسان هڈی اور سینگ کے تکڑوں پر جو تصویریں بناتے تهے اُس سے اول اول وہ محض اپنے رهنے کے غاروں یا جهونپڑوں کو آراستہ کرتے تهے - تمدن کی ترقی کے ساتهہ ساتهہ جوں جوں ذوق نفاست پسندی اور جذبات جمالیہ ترقی کرتے گئے، ان تصویروں کی قدر و قیمت بڑهتی گئی، یہاں تک کہ وہ ایک بیش بہا خزانہ متصور هونے لگیں - جب معاشرت نے اور ترقی کی اور شایستگی کا قدم اور آگے بڑها، لوگ خاندانوں اور قبیلوں پر تقسیم هو گئے تو خاندانوں یا قبیلوں کے سردار ان تصویر دار هڈیوں اور سینگوں کو ایک دوسرے کے پاس بطور تحفۂ و هدیہ بهیجنے لگے - کچهہ عرصے بعد یہ تصویریں بجاے تحفۂ و هدیہ کے نامۂ و پیام کا وسیلہ بن گئیں - الغرض اس وقت تک تصاویر پر تین دور گذر چکے تهے - دور اول میں وہ صرف زیبایش کی چیزیں تهیں، دور ثانی میں وہ بطور تحفۂ و هدیہ استعمال هونے لگیں اور دور ثالث میں ان سے نامۂ و پیام کا کام انجام پانے لگا - اوپر بیان هوچکا هے کہ "عہد رموزی" میں مادی اشیا بهیج کر نامۂ و پیام کا کام نکالا جاتا تها - لیکن بهاری اشیا کی ترسیل زحمت طلب تهی، خصوصاً اُس زمانے میں جب کہ ذرائع حمل و نقل مفقود تهے، لہذا بغرض سہولت خود ان چیزوں کا بهیجنا موقوف کردیا گیا اور صرف ان کی تصویریں بهیج کر خیالات کا اظہار کیا جانے لگا - لیکن چونکہ ابهی تک اداے مطلب کے لیے ان تصویروں کی تخصیص نہیں هوئی تهی، اس لیے اس طریق نامۂ و پیام سے اکثر مافی‌الضمیر سمجهنے اور بهیجنے والے کا عندیہ دریافت کرنے میں غلط فہمیاں پیدا هو جایا کرتی تهیں - مثلاً فرض کرو کہ ایک سردار نے

* Hieroglyphics —

دوسرے کو تصاویر کے ذریعے سے کسی جشن یا ضیافت میں شرکت کی دعوت دی لیکن دوسرے نے غلطی سے اُس کو مبارزت نامہ یا صلائے مقابلہ سمجھہ لیا تو اس کا نتیجہ خطرناک جنگ یا سخت جماعتی تصادم ہوتا - اس قسم کی غلط فہمیوں کے باعث نظام معاشرت میں اختلال واقع ہونے لگا' لہذا قوم کے دانشمندوں نے باہمی قرار داد کے مطابق خاص خاص جانوروں یا دیگر اشیاء کی تصویریں خاص خاص مطالب کے اظہار کے لیے متعین کردیں۔ اس تعین و تخصیص کے بعد غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گیا ' اب لوگ ایک دوسرے کا مافی‌الضمیر آسانی سے سمجھنے لگے - رفتہ رفتہ تصویروں کا استعمال عام ہو گیا - یہی تصویر نویسی رسم تحریر کا اول زینہ تھی - جس طرح چھوٹے بچوں کے معلومات محض اشیائے مادی تک محدود ہوتی ہیں اور انھیں مجردات کا تصور نہیں ہوتا' اُسی طرح ابتدائے تمدن میں انسانی علم صرف مادی اور محسوس چیزوں کے ساتھہ وابستہ تھا ' مجردات اُن کی ذہنی دسترس سے بالا تر تھے - تصویروں کے ذریعے محض مادی اشیا کا اظہار ہوتا تھا - مثلاً انسان' چو پائے ' پرند ' درخت ' پھل ' پھول وغیرہ کا خیال اُن کی تصویروں سے ظاہر کیا جاتا تھا - لیکن جب ذہنی و اخلاقی ترقی کی وجہ سے خیالات و افکار لطیف و مجرد ہونے لگے تو ان کے اظہار کے لیے بھی تصویریں معین کرنے کی ضرورت پڑی - مثلاً عقاب کے پر کی تصویر راستی اور صداقت کی ' شاخ زیتون کی تصویر صلح اور آشتی کی ' ترازو کی تصویر عدل و انصاف کی' سفید لباس کی تصویر معصومیت کی مظہر قرار پائی - تاریخ‌لسان کا یہ دور ''عہدتصویر نویسی''کہلاتا ہے- قدیم مصر میں‌فن‌تصویر نویسی اپنے پورے شباب کو پہنچ گیا تھا - وہاں جب بڑے بڑے فراعنہ تخت نشیں ہوے اور ان کی شہرت ' قوت ' سطوت اور جاہ و حشمت کا ڈنکا تمام اکناف عالم میں بجنے لگا تو اُنھیں‌صرف‌اس بات سے تشفی‌نہیں ہوئی کہ ان‌کےعظیم‌الشان کار نامے محض زبانی طور پر ایک پشت سے دوسري پشت تک منتقل ہوا کریں - انھیں

خوف ہوا کہ ان کے کار نمایاں کہیں گرداب فراموشی میں غرقاب نہ ہوجائیں، یا اُن کے دشمن اُن کے خلاف کوئی جھوٹا قصہ نہ گھڑلیں- لہذا انھوں نے اپنے کارناموں کو طاق نسیاں کا گلدستہ بننے سے بچانے کے لئے اپنی عظیم الشان تاریخ یا تذکرے کو پتھر، اینٹ، کوپرپل، وغیرہ پر کندہ کرایا، جو آج کل زمین کے نیچے سے بر آمد ہورہے ہیں- مصر میں تصویر نویسی کی یادگاریں صرف پتھر کی لاٹوں ہی پر کندہ کی ہوئی نہیں ملتیں بلکہ قدیم مندروں، مقبروں اور محلوں کے شکستہ در و دیوار پر بھی جنھیں امتداد زمانہ نے زیر زمیں مدفون کردیا ہے، رنگی ہوئی پائی جاتی ہیں- علاوہ بریں قدیم اہل مصر نے اپنے عروج کے زمانے میں تصویری تحریر میں پوری پوری کتابیں بھی تیار کی تھیں- جو کتان یا "پپیرس" پر تصویری خط میں لکھی گئی تھیں- پپیرس ایک قسم کا پودا ہے جو قدیم مصر میں بکثرت اُگتا تھا- لیکن آج کل حبش، شام اور جزیرۂ صقلیہ میں بہ افراط پایا جاتا ہے- اس کے ڈنٹھل مثلث نما اور قریب ایک انچ موٹے ہوتے ہیں- قدیم اہل مصر ان ڈنٹھلوں کو پتلے پتلے ورقوں میں تراش کر انھیں ایک دوسرے کے ساتھ گوند سے چپکا دیتے تھے اور دباکر انھیں موجودہ کاغذ کی شکل کا بنالیتے تھے- کاغذ کی ایجاد کے قبل اہل مصر اپنی کتابیں "پپیرس" ہی پر لکھا کرتے تھے- مصر کے بعد جس ملک نے تصویر نویسی میں نمایاں ترقی کی وہ شمالی امریکا کا جنوبی حصہ ہے جو 'میکسیکو' کہلاتا ہے- جب اہل یورپ پہلے پہل امریکا میں داخل ہوے تو انھیں ایک لال رنگ والی وحشی قوم سے مقابلہ کرنا پڑا- یہ قوم آسٹریلیا کی جنگلی قوموں سے بہ اعتبار تہذیب و تمدن کئی قدم آگے تھی- اس قوم کے لوگ آئین حکومت و نظام معاشرت سے روشناس تھے- ان کی سب سے نمایاں ترقیٔ تمدن کی مثال یہ ہے کہ یہ لوگ تصویر نویسی سے واقف تھے- یوروپی قومیں جب میکسیکو میں داخل ہوئیں تو دیکھا کہ وہاں کے سرخ وحشی باشندے شاہ باوط اور صنوبر کی چھال پر تصویریں بناکر تبادلۂ خیالات کیا کرتے تھے- آج کل وہاں کھدائی کا کام جاری ہے اور تصویر نویسی کی بہت سی یادگاریں

زمین کے نیچے سے برآمد ہو رہی ہیں۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا قدیم ہندی قوموں میں فن تصویر نویسی رائج تھا یا نہیں - مصر اور میکسیکو کی طرح یہاں زمین کے نیچے سے اب تک کوئی تصویر نویسی کی یادگار برآمد نہیں ہوئی ہے۔ تاہم بعض دیوتاؤں یا راکششوں کی تصویریں زبان حال سے کہے دیتی ہیں کہ قدیم زمانے میں اہل ہند کو بھی تصویر نویسی میں کچھہ شد بد تھی - سناتن دھرمیوں کا عقیدہ ہے کہ راون کے دس سر تھے' لیکن آریا سماجی اس قسم کی عجیب الخلقت مخلوق کے وجود سے منکر ہیں - ان کا خیال ہے کہ چونکہ راون دیو ہیکل اور قوی الجثہ انسان تھا - اور طاقت جسمانی کے لحاظ سے وہ اکیلا دس آدمیوں پر بھاری تھا' لہذا دانشمندوں نے راون کی تصویر میں دس سر بنادیے تاکہ معلوم ہوکہ وہ اکیلا دس آدمیوں کا مقابلہ کرسکتا ہے - یہی حال چتر بُوج یعنی چار ہاتھہ والے دیوتاؤں یا دیبیوں کا ہے - چار ہاتھہ سے ان کی فوق البشر قوت کا اظہار مقصود تھا - علم کے 'دیوتا' گنیش کو ہاتھی کا بہت بڑا سر عطا کیا گیا تھا - جس کا منشا غالباً ان کی اعلیٰ ذہنی اور دماغی قوت کو ظاہر کرنا تھا - اگر ان خیالات کو صحیح مان لیا جاے تو اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ قدیم اہل ہند کسی حد تک، تصویر نویسی کے ذریعے سے اظہار خیالات کرلیتے ہوں گے -

رموز تصویری کا اکتشاف

آج کل تمام ممالک متمدنہ میں ایک نیا سررشتہ قائم ہوا ہے' جو محکمۂ آثار قدیمہ کہلاتا ہے اور جس کا منشا یہ ہے کہ قدیم تہذیب و تمدن کی یادگاریں قائم اور محفوظ رکھی جائیں اور اسلاف کی شاندار تاریخ اور روایات کو زندہ کیا جاے - قدیم تاریخ کے تسلسل میں جہاں جہاں کھانچے پڑے ہوے تھے وہ اب آثار قدیمہ کی مدد سے پر کیے جارہے ہیں۔ اسی محکمے کي ایک شاخ "حضریات'' بھی ہے - 'حضر' کے معنی زمین کھودنے کے ہیں۔ اس شعبے کے زیر نگرانی زمین کھود کر قدیم شاہی محلوں' مندروں' مقبروں اور دیگر عمارتوں کے کھنڈر اور قدیم تہذیب و تمدن کی متنوع یادگاریں بر آمد

کی جاتی ہیں۔ چنانچہ مصر کی حضریات سے بہت سے پتھر اور تابوت وغیرہ پر منبت کاری کے نمونے دستیاب ہوے ہیں۔ ان کے علاوہ قدیم مندروں، مقبروں اور محلوں کے شکستہ در و دیوار پر رنگی ہوئی تصویریں بھی پائی گئی ہیں۔ بہت دنوں تک لوگوں کا خیال تھا کہ یہ تمام منبت کاریاں اور تصویریں محض آرائش اور زیبائش کے لئے بنائی گئی تھیں۔ لیکن جب چند سر بفلک اہرام مصری توڑے گئے تو ان کے اندر سے بادشاہوں کی لاشیں اور ان کے آس پاس ضروریات زندگی کی مختلف اشیا بر آمد ہوئیں۔ قدیم اہل مصر کو اس قسم کا مسالا معلوم تھا، جس سے وہ لاشوں کو سڑنے گلنے سے محفوظ رکھتے تھے۔ ان لاشوں کو "ممی" کہتے ہیں۔ ممیوں کے پاس پیپرس کے پلندے بھی پائے گئے جو تصاویر سے بھرے پڑے تھے۔ اب لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ پلندے در اصل کتابیں ہیں اور تصویریں محض نمائش اور آرائش کے لئے نہیں بنائی گئی تھیں بلکہ انھیں کے ذریعے پہلے خیالات ضبط تحریر میں لائے جاتے تھے، تصاویر ہی گویا حروف یا الفاظ تھیں، جن کی ترکیب سے جملے لکھے جاتے تھے۔ اس واقعے کے اکتشاف کے بعد بھی لوگ ان تصویری تحریروں کے پڑھنے سے قاصر تھے۔ بڑے بڑے علما نے ان کے پڑھنے کی جان توڑ کوششیں کیں لیکن ناکام رہے۔ عرصۂ دراز کے بعد حسن اتفاق سے سکندریہ کے نزدیک بمقام 'روزیطہ' نپولین اعظم کے ایک فوجی عہدے دار کو پتھر کی ایک بہت بڑی لوح ملی، جو کچھ عرصے بعد انگریزوں کے ہاتھ آئی۔ چنانچہ آج کل وہ پتھر 'نوادر خانۂ برتانی' لندن میں محفوظ ہے۔ جگہ کی مناسبت سے اس پتھر کو "حجر روزیطہ" کہتے ہیں۔ اس حجری لوح پر ایک ہی عبارت تین قسم کی کتابت میں تحریر ہے۔ ایک تو قدیم "تصویری تحریر" ہے، جو بہت مقدس سمجھی جاتی تھی اور صرف پیشوایان مذہب اسے استعمال کرتے تھے۔ دوسری "دیہاتی تحریر" ہے جو مصر کی کاروباری زبان میں لکھی ہوئی ہے، تمام سیاسی، معاشرتی اور کاروباری معاملات اسی طرز تحریر میں لکھے جاتے تھے۔ "دیہاتی تحریر" فی الحقیقت تصویر نویسی ہی کی ایک ترقی پائی ہوئی صورت

تھی - لہذا وہ زیادہ سہل النقش بھی تھی - لیکن پیشوایان مذہب کی قدامت پسندی نے انھیں "تحریر تصویری" ہی کا پابند رکھا - تیسری تحریر یونانی حرفوں اور زبان میں ہے، جسے یورپ کے علما عموماً جانتے ہیں۔ واضح رہے کہ قدیم مصری حکومت کے انحطاط کے زمانے میں ایرانیوں نے مصر پر حملہ کیا اور اس پر قابض ہو گئے - لیکن زمانے نے ایک اور پلٹا کھایا اور ایرانیوں کو سکندر اعظم نے شکست دی اور اپنے نام سے ایک شہر سکندریہ آباد کیا - اب مصر پر یونانیوں کا پورا تسلط ہوگیا۔ چونکہ سکندر کی کوئی اولاد نہ تھی، اس لئے اس کے مرنے کے بعد اس کے فوجی عہدے داروں نے اس کی وسیع مملکت اور علاقہ جات مفتوحہ کا آپس میں حصہ بخرہ کر لیا - چنانچہ مصر میں سکندر کا جانشین 'بطلیموس اول' ہوا اور وہاں کی حکومت اسی کے خاندان میں منتقل ہوتی رہی - مورخین کا قول ہے کہ 'بطلیموس' پنجم کے زمانے میں حجر روزیطہ نصب کیا گیا تھا - یہی وجہ ہے کہ اس کی آخری تحریر یونانی میں ہے - یونانی حروف میں جو عبارت کندہ تھی، اس کو علما نے بہ سہولت تمام پڑھ لیا اور اس کی مدد سے بڑی کد و کاوش کے بعد " دیہاتی تحریر " پڑھنے میں بھی کامیاب ہوے - زاں بعد " دیہاتی تحریر" کی مدد سے ڈاکٹر ٹامس ینگ نے چند تصویری نشانات و علامات کی آواز یا مساوات دریافت کی، لیکن اتنی سی دریافت تصویر نویسی کے راز سر بستہ کو منکشف نہ کر سکی، بالآخر ژین فراں کو ' شمپولین ' نے بڑی دماغ سوزی اور جگر کاوی کے بعد ان نقوش کے پڑھنے کا گُر معلوم کر لیا - اس نے نہایت کامیابی کے ساتھ دریافت کر لیا کہ کونسی تصویر کس آواز یا کس لفظ کی مظہر ہے - مثلاً اس نے معلوم کیا کہ 'حجر روزیطہ' کے کتبے میں عقاب کی تصویر سے (آ) پاؤں کی تصویر سے (ب) اُلّو کی تصویر سے (م) چوزے کی تصویر سے (ی) کی آواز کا اظہار ہوتا ہے - کہیں کہیں کسی تصویر سے مفرد آواز کے بجاے کوئی پورا لفظ ظاہر کیا گیا ہے - جیسے دونوں ہاتھ بلند کئے ہوے انسان کی تصویر سے لفظ عبادت یا پرستش مراد ہے،

اس کے قبل بعض تحقیق دوست ماہرلسانیات و تصویری خط میں لکھی ہوئی چند فہرستوں کو جن میں بادشاہوں ' شہزادوں اور اعیان حکومت کے نام درج تھے پڑھنے میں کامیاب ہو چکے تھے - ان فہرستوں میں بادشاہوں کے نام امتیاز کے لئے بیضوی حلقوں میں درج تھے- بہر حال مختلف فہرستوں اور حجر روز یطہ کا باہمی مقابلہ کر کے علما نے تصویری کتابت کے پڑھنے کا گُر معلوم کر لیا' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آجکل تصویری کتبے یا کتا بیں نہایت آسانی سے پڑھ اور سمجھ لی جاتی ہیں - ' حجر روزیطہ ' کا کتبہ پڑھنے والوں کا بیان ہے کہ اس میں تفصیلی ہدایات درج ہیں کہ ایک جلیل القدر بادشاہ کا جشن سالگرہ کس طرح منانا چاہئے - علاوہ بریں اہرام مصری کے اندر مقابر میں بہت سی تصویر نویسی کی کتابیں پپیرس پر لکھی ہوئی پائی گئی ہیں - ان کے پڑھنے میں بھی علما نے کامیابی حاصل کرلی ہے- ان کتابوں میں سب سے معر کہ آرا وہ مقدس مذہبی کتاب ہے ' جسے ' کتاب الموتی' کہتے ہیں - اور جو آجکل برطانوی نوادر خانے میں محفوظ ہے - اس کتاب کی بہت سی نقلیں کی گئی ہیں-اس کی چند عبارتیں مقبروں کی دیواروں پر لکھی ہوئی ملتی ہیں-کہیں کہیں ممیوں کے نزدیک یہ کتاب کُلاً یا جزءاً رکھی ہوئی پائی جاتی ہے جن میں ہدایات درج ہیں کہ متوفی کو حیات بعد الممات میں زیر زمیں کس طرح زندگی بسر کرنی چاہئے - الغرض اس کتاب سے قدیم مصریوں کے مذہبی اعتقادات اور اور اُن کی طرز بود و باش پر کافی روشنی پڑتی ہے- اس مشہور کتاب کے علاوہ تصویر نگاری کی اور بہت سی کتابیں پپیرس پر لکھی ہوئی ملی ہیں' جو بالعموم دیو پری کے قصوں ' رزمی نظموں ' طب ' ہیئت اور اخلاقیات وغیرہ پر مشتمل ہیں۔آئے دن مصری حضریات سے بہت سی اشیا بر آمد ہو رہی ہیں ' جن کی مدد سے قدیم مصری تاریخ کے کھانچے بھرے جارہے ہیں —

خطوطی تصویر نویسی

بیانات متذکرۂ بالا سے معلوم ہوا کہ قدیم مصر میں فن تصویر نویسی منتہاے کمال کو پہنچ گیا تھا - لیکن تصاویر کے ذریعے

مافی الضمیر کے اظہار کا طریقہ بے شمار دقتوں اور زحمتوں سے مملو تھا - ہر شخص تصویر کھینچنے پر قادر نہیں ہوسکتا تھا، کیونکہ اس کے لئے مشق اور مہارت کی بے حد ضرورت تھی، صرف فن کار ہی اسے انجام دے سکتے تھے - لیکن ان کو بھی چند معمولی باتوں کے اظہار کے لئے بہت سی پیچیدہ اور مشکل تصویریں کھینچنی پڑتی تھیں، جس کے لئے بہت وقت اور محنت کی ضرورت تھی، اس لئے لوگوں کی توجہ سہولت اور اختصار کی جانب مائل ہوئی - بعض مہذب قوموں کے عقلا نے سوچنا شروع کیا کہ کم وقت میں اور آسانی کے ساتھ واقعات قلم بند کرنے اور خیالات ضبط تحریر میں لانے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے - بالآخر سامری قوم کی قوت اختراعیہ نے بہ مصداق " ضرورت ایجاد کی ماں ہے " ایک نیا خط ایجاد کیا، جسے 'تحریر پیکانی' کے نام سے موسوم کرنا مناسب ہے- اس کی وجہ تسمیہ آگے بیان ہوگی - بہر حال سامریوں کی پیہم کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادائے مطلب اور تبادلۂ خیالات کے لئے بجائے پیچیدہ تصاویر کے آسان اور سہل النقش اشکال 'مخطط' استعمال کئے جانے لگے- سامری قوم عراق میں آباد تھی، جو میدانی ملک ہے اور جہاں زمین سنگلاخ نہ ہونے کے باعث پتھر آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا - سامریوں نے بہت سے شاندار اور با رونق شہر بسا لئے، جہاں کی عالی شان عمارتیں بجائے پتھر کے اینٹ سے بنی ہوئی تھیں - سامریوں نے مٹی کی تختیوں اور استوانوں پر کتبات کندہ کرائے - لکھنے کا قاعدہ یہ تھا کہ گیلی مٹی کی تختیوں اور استوانوں پر کسی سخت نکیلے اوزار سے مخطط اشکال کھینچی جاتی تھیں، جن کی وجہ سے مٹی خط کے سرے پر دونوں جانب جمع ہو جاتی تھی اور نشانات تیر کے سرے جیسے معلوم ہوتے تھے - اسی مناسبت سے یہ طرز تحریر "پیکاں نویسی" کہلاتی تھی - اشکال اور خطوط کندہ کرنے کے بعد تختیاں اور استوانے دھوپ میں خشک کرائے جاتے تھے اور پھر پژاوے میں پکالئے جاتے- الغرض تصویر نویسی کا پیچیدہ اور دقت طلب طریقہ رفتہ رفتہ بالکل متروک ہو گیا - اب تحریری علامات چڑیوں اور جانوروں کی

شکلوں اور گنجلک تصاویر کے بجائے آسان اور سادہ اشکال میں تبدیل ہو گئیں - پھر کیف سامریوں سے اہل ' اسوریا ' نے اور پھر ان سے مختلف قوموں نے "پیکان نویسی" سیکھی —

جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں' اُس وقت ایتھنس کا وجود بھی نہ تھا اور روما کی سات پہاڑیاں ابھی گھنے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی تھی - لیکن اس وقت سر زمین عراق میں علم و ہنر کا چشمہ اُبل رہا تھا - وہاں بابل اور نینوا جیسے شہرۂ آفاق شہر آباد تھے - جہاں عظیم‌الشان کتب خانے قائم تھے ' جن کی الماریاں اینٹوں ' تختیوں اور استوانوں پر لکھی ہوئی بے شمار کتابوں سے بھری پڑی تھیں ' تاہم اس زمانے میں لکھے پڑھے لوگوں کا قحط تھا ' پڑھنے والے کمیاب تھے' اور لکھنے والوں کی تعداد تو اُنگلیوں پر گنی جاسکتی تھی - کیونکہ اس وقت تک حروف تہجی کا نظام ایجاد نہیں ہوا تھا ' جن کی ترکیب سے کسی زبان کے ہزاروں لاکھوں الفاظ تحریر میں لائے جاسکتے ہیں - اُس زمانے میں ہر لفظ کے لیے ایک علحدہ علامت تھی اور اہل علم کے لیے ہزاروں الفاظ کی ہزاروں جداگانہ علامات یاد رکھنی پڑتی تھیں - مختلف قوموں نے 'تصویر نویسی' کو ترک کر کے سہل النقش علامات اختیار کرلی تھیں ' لیکن ہر جگہ مختلف الفاظ کے لیے مختلف مفرد علامات تھیں - ہر زبان کے کاتبوں اور محرروں کو ہزاروں علامتیں سیکھنی اور یاد رکھنی پڑتی تھیں - چنانچہ ملک چین تو آج کل کے متمدن دور میں بھی اُسی قدیم زینے پر ہے اور ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھاسکا ہے - آج دنیا کی تمام السنہ میں حروف تہجی مستعمل ہیں ' جن کی تعداد ۱۹ اور ۵۵ کے درمیان ہے - کسی موجودہ زبان میں ۵۵ سے زیادہ حروفی علامات نہیں ہیں' الا چینی زبان' جہاں ۲۱۴ مفرد اصوات اور ۷۹۷۸۶ الفاظ کی علامات مستعمل ہیں' بیچارے رٹنے چینی

طلبه کو هزاروں علامتیں سیکھنی پڑتی هیں ' تب کہیں وہ پڑھنے لکھنے پر قادر هوسکتے هیں —

جس طرح تصویری تحریر کی بے شمار یادگاریں مصر میں زمین سے کھود کر بر آمد کی گئی هیں ' اُسی طرح عراق میں پیکان نویسی کی یادگاریں نکل رهی هیں - یه یادگاریں مٹی کے اُستوانوں ' تختیوں اور اینٹوں کی شکل میں پائی جاتی هیں' جن پر مخطط شکلیں بنی هوئی هیں - یه بابل اور نینوا کی قدیم شوکت و عظمت کا زبان حال سے اظہار کرتی هیں - یورپی محقق همیشه سے اس تلاش اور جستجو میں لگے هوے تھے که یہاں بھی حجرروز طه کی طرح دو تین قسم کی تحریر والا کوئی کتبه مل جاے تو وہ تحریر پیکانی کو پڑھنے اور قدیم معموں کو حل کرنے کی کوشش کریں لیکن کوئی ایسا کتبه دستیاب نہیں هوتا تھا ' لوگ مایوس هوگئے تھے اور پیکانی تحریر کی معما کُشائی ناممکن خیال کی جاتی تھی - آخر حسن اتفاق سے یا تلاش و تفحص کے نتیجے کے طور پر " حجر روز طه " جیسے تین قسم کے کتبات پر مشتمل ایک پتھرکی چٹان ایران میں مل گئی- سرهنری رالنسن نے جو ایران کی سیاحت کر رها تھا ' به مصداق " جو ڈھونڈہ یابندہ " ایک اونچی چٹان پر ایک کتبه دیکھا جو تین قسم کی تحریروں میں کندہ تھا - چونکه یه چٹان بہت بلندی پر تھی اور ارتفاع ڈھلواں هونے کے بجاے عمودی تھا اور کوئی بلند سے بلند سیڑھی بھی وهاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی ' اس لیے هنری رالنسن دوسرے راستے سے پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا اور ایک باهر نکلی هوئی چٹان سے ڈوری باندھ کر نیچے لٹکا اور بڑی مشکل سے اُس جگه پر پہنچا' جہاں کتبه نصب تھا - اُس نے نہایت احتیاط اور هوشیاری سے تینوں کتبوں کا چربه اُتار لیا - یه پتھر بھی " حجر روز طه " کی طرح اُس جگه کی مناسبت سے جہاں وہ پایا گیا " حجر بیستوں " کہلاتا هے - علماے لسانیات بہت دنوں تک اس کے پڑھنے کی کوشش کرتے رهے اور پندرہ سوله محققوں کی محنت اور غور و خوض کا نتیجه

یہ ہوا کہ اس تحریر کی تمام مشکلات حل ہوگئیں - اور نہ صرف سنگ بیستون کا کتبہ بلکہ اسی قسم کے اور کتبے بڑی آسانی سے پڑھ لئے گئے - پیکانی کتبوں کی بدولت کالدانی، سامری اور آشوری قوموں کے کارنامے جو آج تک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوے تھے - روز روشن کی طرح اب دنیا پر ظاہر ہوگئے - اهل بابل کی تاریخ کا بیش قرار مواد ان کتبوں سے مہیا ہوا ہے - قوموں کا تھوڑا بہت تذکرہ کہیں کہیں توریت میں پایا جاتا تھا لیکن اب ان مذہبی روایات نے تاریخی حیثیت اختیار کرلی ہے - ''حجر بیستون'' دیگر نوادرات کی طرح برطانی نوادر خانۂ لندن میں محفوظ رکھا ہوا ہے —

بانیان پیکان نویسی کی مختصر تاریخ

جن قوموں نے پیکان نویسی ایجاد کی، یا جن میں یہ طرز تحریر رائج تھی ان کی مختصر تاریخ دلچسپی سے خالی نہ ہوگی - لہذا ذیل کی چند سطریں ان کے مجمل تذکرے کے لئے وقف کی جاتی ہیں - ان قوموں کی صحیح تاریخ نسیاً منسیا ہوچکی تھی - لیکن پیکانی تحریروں سے جو عراقی حضریات سے بر آمد ہوئی ہیں- ان کے عظیم‌الشان کارناموں پر روشنی پڑتی ہے - پیکان نویسی کی ایجاد کا سہرا قوم سامری کے سر ہے - یہ قوم عراق کے جنوبی حصے میں آباد تھی، جسے توریت میں کالدیا کہا گیا ہے - لیکن انجیل میں یہ خط سامری یا عکادی • ملک سے نامزد کیا گیا ہے- سامری یا عکادی تورانی‌النسل تھے اور توران سے یہاں آکر آباد ہوے تھے- فن زراعت میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا - قابہ رانی و آبیاری کے ذریعے انھوں نے عراق کو اس قدر سرسبز و شاداب بنا لیا کہ وہ ملک باغ ارم بن گیا - فن تعمیر میں بھی انہیں اچھی مہارت حاصل تھی- انھوں نے عظیم الشان قصر و محل، مندر، مقبرے تعمیر کرائے، جن کے کھنڈر آج بھی زیر زمیں مدفون پائے جاتے ہیں - سامریوں کی جو شبیہیں حضریات سے برآمد ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے داڑھی موچھہ بہت کم کم ہوتی تھی، ان کی شکل صورت

• تازہ تحقیقات کی رو سے عکادیوں کا آریائی نسل سے ہونا زیادہ قرین قیاس ہے —

چینیوں اور جاپانیوں سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی - حضرت مسیح سے چار ہزار سال قبل اُن کی زبان بہت ترقی کر گئی تھی اور وہ اس زمانے میں بہ لحاظ فصاحت و و بلاغت اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے - تعمیر و فلاحت کے علاوہ سامری قوم علوم و و فنون کی بھی سرمایہ دار تھی - اہل مصر کی طرح سامری بھی تصویر نویسی سے واقف تھے - پیکان نویسی کی ایجاد کے قبل وہ تصاویر کے ذریعے خیالات و واقعات ضبط تحریر میں لاتے تھے - لیکن زمانے نے پلٹا کھایا - تین ہزار آٹھ سو سال قبل مسیح ان پر ایک دوسری نسل کے لوگ حملہ آور ہوئے' جن کی داڑھیاں بڑی اور گھنی تھیں یہ لوگ سامی النسل تھے - اس فاتح قوم نے سامریوں کے علم و فضل کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور ان کو خارج البلد نہیں کیا بلکہ وہیں رہنے دیا - اور ان کے ساتھ شادی بیاہ بھی کرنے لگے - سامریوں سے سامی فاتحوں نے تہذیب و تمدن کا سبق حاصل کیا - کئی پیڑھیوں کے میل ملاپ سے یہ دونوں نسلیں خلط ملط ہوگئیں۔ یہ مخلوط نسل آگے چل کر ایک نئی قوم بن گئی - جسے "اہل بابل" کہتے ہیں - ان کا پایہ تخت دریائے فرات کے کنارے شہر بابل تھا - سامریوں کی قدیم زبان جس میں اصول مذہب اور قوانین ملکی لکھتے ہوئے تھے عرصہ دراز تک قائم رہی۔ چونکہ فاتح سامریوں کی اپنی زبان شستہ اور فصیح نہ تھی اس لئے انھوں نے مفتوح سامریوں کی زبان کو جس کا دامن علمی اور فنی جواہر پاروں سے معمور تھا بڑے شوق سے سیکھا - سامیوں نے صرف و نحو اور لغت کی عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف کیں تاکہ اجنبیوں کو ان کی زبان سیکھنے میں سہولت ہو - یہ تمام کتابیں پیکانی تحریر میں لکھی گئی تھیں' جن میں سے اکثر آج برطانوی عجائب خانے میں موجود ہیں۔ جس طرح دور حضر میں یورپ کی تقریباً تمام زبانوں کی تحریر لاطینی حروف میں ہوتی ہے اسی طرح اس زمانے میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ عراق کے گرد و نواح کی تمام اقوام اپنی اپنی زبانوں کی تحریر میں سامریوں کی ایجاد کردہ پیکانی علامات استعمال کرتی تھیں' یہ قومیں حسب ذیل تھیں : آسوری'

"عکادی"، "شامی"، "کنعانی"، "عیلامی"، "قستائی"، "ایرانی"، "مادی"* وغیرہ - کچھہ عرصے بعد "شام" اور "کنعان" کے ایک حصے پر بنی اسرائیل مصر سے آ کر قابض ہو گئے - اوپر بیان ہو چکا ہے کہ سامریوں اور سامیوں کے اختلاط سے اہل "بابل" یا بابلی قوم معرض وجود میں آئی تھی - دو ہزار سال قبل مسیح سلطنت بابل پر ایک نامور بادشاہ حکمراں تھا - اس کے عہد حکومت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اعزہ و اقارب کے ساتھہ "کالدیا" کے شہر "اور" کو چھوڑ کر اپنے گلوں کے ساتھہ صحرا کے دوسرے جانب گشت لگاتے ہوے نکل گئے۔

جس وقت "بابل" میں فن تعمیر، زراعت، تجارت، صنعت و حرفت اور علوم و ہنر کو فروغ ہو رہا تھا، اس وقت وہاں آبادي بھی سرعت کے ساتھہ ترقی کر رہی تھی - بالآخر "بابل" میں اس کے تمام فرزندوں کے لئے کافی جگہ اور گنجائش باقی نہیں رہی، لہذا فاضل آبادي بحیثیت نو آباد کار شمال کی جانب ہجرت کر گئی - وہاں "دجلہ" اور "فرات" کے درمیانی خطے میں مستعمرات قائم ہوے اور بڑے بڑے شہر بسائے گئے، جن میں سب سے زیادہ مشہور "نینوا" کا شہر تھا جو دجلے کے کنارے واقع تھا - یہاں بھی "بابل" کی طرح بڑی بڑی عالیشان عمارتیں، وسیع چبوتروں پر انیٹ سے بنائی گئی ہیں - اگرچہ یہاں پتھر افراط سے دستیاب ہوتا تھا، تاہم ان نو آباد کاروں کا جذبۂ قدامت پسندی اس قدر قوی تھا کہ وہ تعمیر کے لئے انیٹ کو پتھر پر ترجیح دیتے تھے - کئی صدیوں کے بعد اہل نینوا اس قدر طاقتور ہو گئے کہ انھوں نے بابلی حکومت کا جوا اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا اور ایک نئی آزاد حکومت کی داغ بیل

---

* Media کی اصل قدیم فارسی میں "ماد" تھی، بعد کی فارسی میں قدیم فارسی کی "د" بدل کر "ہ" ہو گئی یعنی ماد "ماہ" ہو گیا۔ مگر عربوں نے اس تبدیلی سے پہلے ہی اس لفظ کو اپنی زبان میں لے لیا تھا چنانچہ Median Sword کو سیف مادی کہا ہے —

قالی جو حکومت ' آسوری ' کہلانے لگی - کیونکہ ان کا سب سے بڑا دیوتا ' آسور ' تھا آسوری حکومت اٹھارھویں صدی قبل مسیح میں قائم ہوئی تھی - اس کے بعد ' بابلی ' اور آسوری حکومتیں ایک دوسرے کی حریف بنگئیں اور باہم دست و گریباں رہنے لگیں - چودھویں صدی قبل مسیح میں دونوں حکومتوں کے درمیان ایک سخت معرکہ آرائی ہوئی اور دونوں جانب کے ہزاروں آدمی کام آے - اس خونریز جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بابل کی قسمت کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ ہو گیا اور اسوریا کو فتح نصیب ہوئی - چنانچہ بابل کی حکومت آسوری حکومت کے زیر نگیں آ گئی —

حال ہی میں اس مقام کی حفریات سے جہاں کسی زمانے میں قدیم شہر نینوا واقع تھا ایک تختی مع کتبہ بر آمد ہوئی ہے جس میں توریت کا وہ مشہور قصہ درج ہے جس سے انگریزی مدر سے کا بچہ بچہ واقف ہے' کہ کس طرح آسوریا کے بادشاہ ' سناخرب ' نے ' یہودا ' کے فرماں روا حذیقیہ پر ٹڈی دل فوج کے ساتھ حملہ کیا - اس لئے کہ مؤخرالذکر نے شاہ مصر کے ورغلا نے سے خراج بھیجنا بند کردیا تھا - لیکن بغیر کسی لڑائی کے 'سناخرب' کی تمام فوج کسی وبا یا بلاے ناگہانی سے تباہ و برباد ہو گئی - اسی ' سناخرب ' کا نبیرہ ' اشور بنی بعل ' بڑا نامی بادشاہ گذرا ہے - وہ نہ صرف بڑا سورما اور صیدافگن بلکہ علم دوست بھی تھا - اس نے 'بابل کے کتب خانوں اور مندروں سے بہت سی کتابیں فراہم کیں - ان کی ترتیب و تدوین کے لئے وافر عملہ مقرر کیا - ایک تالیف و ترجمہ کا سرشتہ بھی اعلیٰ پیمانے پر قائم کیا - بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں اور غیر زبانوں سے کثیر التعداد کتابوں کا ترجمہ بھی کیا گیا - ' اشور بنی بعل ' کی غیر معمولی مستعدی اور علمی سر پرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے قصر میں ایک عظیم‌الشان کتب خانہ قائم ہو گیا ' جو دنیا کے تمام معاصر کتب خانوں میں سب سے بڑا تھا - آج اس کتب خانے کی بیسیوں کتابیں برطانوی نوادر خانے میں موجود ہیں' جو

عراق سے کھود کر لائی گئی ھیں - یہ تمام کتابیں پیکانی خط میں ھیں ان سے ' بابل ' اور ' نینوا کی قدیم تاریخ کے واقعات معلوم ہوتے ھیں اور ان کی عظمت اور جبروت کی یاد تازہ ہو جاتی ھے - یہ کتابیں کاغذ پر لکھی ہوئی نہیں ھیں بلکہ جیسا کہ اوپر کئی بار بیان ہو چکا ھے' مٹی کی تختیوں ' اینٹوں اور استوانوں پر پیکانی خطوط میں کندہ ھیں - کہا جاتا ھے کہ آسوری زبان میں چھ سو پیکانی علامات مستعمل تھیں ' لیکن جتنی تحریر پیکانی کی یادگاریں اس وقت برطانی نوادر خانے میں محفوظ ھیں ان میں تقریباً تین سو علامتیں پائی جاتی ھیں - چوتھی صدی قبل مسیح میں ماذیوں نے ' نینوا ' پر حملہ کیا ' ملک کو تاخت و تاراج سے برباد کردیا' خاص شہر ' نینوا ' کو دو سال کے لگاتار محاصرے کے بعد تسخیر کیا اور اس کو نذر تیغ و آتش کر دیا- کتب خانے کی عمارتیں بھی جلادی گئیں - اگر کتابیں کاغذ کی ہوتیں تو معاً جلکر خاک کا ڈھیربن جاتیں اور ' بابل ' اور ' نینوا ' کی عظمت ھمیشہ کے لئے مٹ گئی ہوتی' لیکن خوش قسمتی سے کتابیں مٹی کی تختیوں اور استوانوں پر کندہ تھیں ' جنھوں نے آگ کا مقابلہ کیا اور آج صدیوں تک زیر زمین مدفون رھنے کے بعد بر آمد ہو کر اپنے لکھنے اور لکھانے والوں کا نام دنیا میں روشن کر رھی ھیں —

حروف تہجی کی ایجاد

قدیم زبانیں جب ابتدائی حالت میں تھیں تو ان میں الفاظ کا ذخیرہ کم تھا - معاشرت سادہ ' ضروریات زندگی تھوڑی اور معلومات کم تھیں- اس لئے تین چار سو لفظوں سے کام چل جاتا تھا - آسوری جیسی ترقی یافتہ زبان میں صرف چھ سو لفظ تھے اور لکھنے کے لئے اتنی ھی مخطط علامتیں مقرر کر لی گئی تھیں - الغرض لغات کی کمی کے باعث بہت عرصے تک علامات پیکانی یا اشکال مخطط سے تحریر کا کام چلتا تھا - لیکن جب علوم و فنون نے اور ترقی کی ' تہذیب اور تمدن کی رفتار تیز ہوئی ' ضروریات زندگی میں اضافہ ہوا اور اجتماعی زندگی کا نظام بہت پیچیدہ ہو گیا تو

خود حیات انسانی و نیز عالم خارجی کے متعلق ذخیرۂ معلومات اس قدر وسیع ہوگیا اور ہر نئی شے اور نئے خیال کے لئے نئے نئے لفظ وجود میں آئے اور اس طرح الفاظ کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ تمام الفاظ کے لئے علاحدہ علاحدہ علامتیں مقرر کرنا اور کل علامتوں کو دماغ میں محفوظ رکھنا محال ہوگیا - لہذا کسی سہل طریقۂ تحریر کی دریافت کی جانب دانشمندوں کی توجہ مبذول ہوئی - سب سے پہلے اس جانب مصر کے مذہبی پیشواؤں کا ذہن رجوع ہوا - اگرچہ اس وقت مصر نے بھی ترقی کرکے سہل النقش "دیہاتی" طرز تحریر اختیار کرلی تھی، جو تحریر پھکانی سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی - اور سیاسی امور اور معاشرتی اور کارو باری معاملات "دیہاتی" طریقے پر ضبط تحریر میں لائے جاتے تھے - لیکن تصویر نویسی نے اپنی قدامت کے باعث مذہبی تقدس حاصل کرلیا تھا - اس لئے تمام مذہبی اصول احکام و اوامر و نواہی کے لئے تصویر نویسی ہی کا طریقہ کام میں لایا جاتا تھا - چنانچہ حروف تہجی کی ایجاد کے قبل تک مصر کے مذہبی پیشوا قدیم تصویر نویسی ہی کے پابند تھے- اس وقت تک اُن کے لکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ کسی تصویر سے وہ کوئی لفظ یا فقرہ ظاہر کرتے تھے، جیسے دونوں ہاتھ بلند کئے ہوے انسان کی تصویر لفظ پرستش کی مظہر تھی، لیکن اب انھوں نے مفرد اصوات کی ایک فہرست مرتب کی، جن کی ترکیب سے الفاظ اور فقرے بنے ہوے تھے اور بے شمار تصویری علامات میں سے صرف اتنی ہی تصویریں منتخب کرلیں جتنی مفرد اصوات کی تعداد تھی اور ہر تصویری علامت ایک مفرد صوت کی مظہر قرار پائی- جیسے عقاب کے پر کی تصویر سے 'آ' پاؤں کی تصویر سے 'ب' اُلو کی تصویر سے 'م' اور چوزے کی تصویر سے 'ی' کی آواز ظاہر کی جانے لگی - اسی طرح ہر آواز کے لئے ایک تصویر مقرر تھی- اب اِنھیں چند تصویری علامات کے اتصال و ترکیب سے تمام الفاظ لکھے جانے لگے- لیکن باوجود ان تمام سہولتوں کے مصری طرز تحریر مشکل تھی، کیونکہ تصویریں سادہ اور سہل النقش نہ تھیں، اس لئے اُس زمانے کی متمدن قومیں سہل النقش علامات کی دریافت کی

طرف متوجہ ہوئیں —

سہل النقش علامات کی دریافت میں فونیقیوں نے بڑی ترقی دکھائی۔ فونیقی قوم ایشیائے کوچک کے مغربی حصے میں بحر روم کے ساحل پر آباد تھی۔ یہ لوگ جہاز رانی میں بڑے مشاق تھے اور انھیں کے ہاتھ میں ان سب ملکوں کی تجارت تھی، جن کے ساحلوں سے بحر متوسط کی موجیں ٹکراتی تھیں۔ علاوہ بریں بحر اوقیانوس بھی ان کی جہاز رانی کی جولانگاہ اور یورپ کے مغربی ممالک ان کی تجارتی آماجگاہ تھے۔ چنانچہ تاریخ انگلستان اس امر کی شاہد ہے کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں فونیقی تجار قلعی کی تجارت کی غرض سے برطانیہ کے جنوب میں جزیرہ سلی تک جا پہنچے تھے۔ علوم و فنون میں بھی انھوں نے اچھی خاصی ترقی کرلی تھی۔ عام طور پر فونیقی قوم حروف تہجی کی موجد کہلاتی ہے۔ ان کے ہاں بھی پہلے تصویر نویسی کا رواج تھا۔ لیکن کچھ زمانے بعد وہ جانوروں، درختوں، مکانوں اور دیگر مادی اشیا کے اظہار کے لئے نہایت سہل النقش اور سادہ علامتیں استعمال کرنے لگے تھے، جو پیکانی تحریر سے بھی زیادہ آسان تھیں۔ اب انھوں نے اور ترقی یہ دکھائی کہ ان سادہ علامتوں سے چند علامتیں منتخب کرلیں۔ اور اُن سے اشیا یا الفاظ کے بجائے مفرد اصوات مراد لینے لگے۔ اور ان صوتی علامتوں کے مجموعے سے الفاظ ترکیب دینے لگے۔ الغرض ہر صوت کے لئے ایک سہل اور سادہ علامت مقرر کی گئی۔ لیکن علامت کے نام اور صوت میں کوئی مطابقت نہ تھی، بلکہ علامت کا وہی نام رکھ دیا جو تصویر نویسی کے زمانے میں اس چیز کا تھا۔ مثلاً 'الف' کے معنی بیل کے سر کے ہیں۔ فونیقی اس علامت سے 'ا' کی آواز تعبیر کرنے لگے، لیکن اس کا نام الف ہی رہنے دیا۔ اسی طرح 'بیت' یعنی خیمے یا چھولداری کی تصویر نے مختصر ہو کر ایک بڑی لکیر کی شکل اختیار کرلی تھی، اب 'بیت' کی اِسی علامت سے 'ب' کی آواز ظاہر کی جانے لگی۔ لیکن علامت کا نام بیت ہی رکھا گیا۔ اور یونانی زبان میں

بھی 'بیتا' ھی کہلایا - جمل یعنی اونٹ کا اظہار اُس کے سر اور گردن کی تصویر سے کیا جاتا تھا اور قدیم مصری نیز اکثر سامی زبانوں میں اس لفظ کا تلفظ 'گیمل' تھا جس کے مقابل عربی میں " جیمل " ھوا ' جو " جمل " کی اصل ھے ۔ اب اسی علامت سے 'ج' کی آواز ظاھر کی جانے لگی - اکثر سامی زبانوں میں دانت کے لئے 'شین' (عربی میں سن) کا لفظ ھے ۔ تین دندانے بنا کر دانتوں کو قدیم مصری کتابت میں ظاھر کرتے تھے' بعد کو حرف کا نام بھی وھی رھا' جو اب تک چلا آتا ھے۔ 'س' اور 'ش' کا امتیاز کتابت میں بعد کو کیا گیا - لیکن امتداد زمانہ سے حروف کے پرانے ناموں میں مختلف زمانوں میں جا کر کچھ تبدیلی بھی ھوگئی ھے' ممالک مشرقیہ بعیدہ کی زبانوں کو چھوڑ کر دنیا کی بقیہ زبانوں کے حروف کے موجودہ نام قدیم مصری ناموں کی مسخ شدہ صورتیں ھیں- یہ یاد رکھنے کی بات ھے کہ ان سب زبانوں کی کتابت سامی حرفوں سے ماخوذ ھے —

اگرچہ مختلف زبانوں کے حروف مختلف الاشکال ھیں ' لیکن ان سب کی شکلیں ابتداءً اُنھیں تصویری حرفوں سے نکلی ھیں اور اب ایسی بدل گئی ھیں کہ بالکل الگ الگ معلوم ھوتی ھیں- عام خیال ھے کہ فونیقیوں نے حروف تہجی ایجاد کئے' مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاھئے کہ وہ انھیں کتم عدم سے معرض موجود میں لائے' یا انھوں نے کسی بالکل نامعلوم شے کو دریافت کیا' بلکہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ قدیم مصور و مخطط طرز تحریر کو ترقی دیکر اُسے اُصول وضوابط کے تحت لائے اور منتشر علامات کو ترتیب دے کر ایک نظام میں تحویل کیا' جو نظام حروف تہجی کہلایا۔

حروف تہجی کی اشاعت و ترقی

یہ امر مسلم ھے کہ پہلے پہل حروف تہجی کے ذریعے واقعات اور خیالات قلم بند کرنے والے فونیقی ھی تھے ۔ ان سے یہودیوں نے یہ طرز تحریر سیکھی ۔ چنانچہ عبرانی زبان کی تمام کتابیں بشمول احکام عشرۂ حضرت موسیٰ علیہ السلام حروف تہجی کے ذریعے لکھی گئیں - اس کے بعد نظام حروف تہجی عبرانی سے عربی میں منتقل ھوا - کئی صدیوں کے

بعد اسلام کے عروج کے زمانے میں جب عربوں کو ایران پر مذہبی اور سیاسی استیلا حاصل ہوا تو ایرانیوں نے فارسی زبان کے لئے عربی حروف اختیار کر لئے۔ پھر جب زمانے نے دوسری کروٹ لی اور فارسی بحیثیت فاتح ہندوستان میں داخل ہوئی تو ہندی زبان بھی فارسی خط میں لکھی جانے لگی۔ جب ان غیر سامی زبانوں کی کتابت عربی حرفوں سے ہونے لگی تو پہلے پہلے بعض قریب المخرج آوازیں ایک ہی حرف سے ادا کی جاتی تھیں، لیکن آگے چل کے اُسی ایک حرف پر نقطے یا مرکز لگا کر، یا نقطوں کی تعداد گھٹا بڑھا کر، یا اوپر نیچے رکھ کر مختلف اصوات کا اظہار کیا جانے لگا۔ مثلاً ب، پ، ت، ٹ، ث، پانچ اصوات کے لئے پانچ جدا گانہ علامتیں ہونی چاہئے تھیں، لیکن سہولت کی خاطر صرف ایک پڑی لکیر میں نقطوں کے ہیر پھیر سے پانچ اصوات کی نمایندگی ہونے لگی۔ یہی حال ج چ ح خ یا ر ڑ ز ژ وغیرہ کا ہے۔ اردو نظام حروف تہجی میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ یوروپ میں بھی نظام حروف تہجی فونیقیوں ہی سے لیا گیا۔ پہلے یونانیوں نے فونیقیوں سے حروف تہجی سیکھے اور اپنی زبان کی ضروریات کے مطابق بعضے حرف زیادہ کر لئے یا گھٹادیے۔ یونانیوں سے رومیوں نے نظام حروف تہجی سیکھا اور حروف کی شکل وصورت میں مناسب ترمیم کی۔ قرون وسطیٰ میں اساطین مسیحیت کی زبان رومی یا لاطینی تھی۔ چونکہ اُس زمانے میں تعلیم و تدریس زیادہ تر پیشوایان دین ہی کے تفویض تھی۔ اس لیے یوروپ کے تمام ممالک مثلاً فرانس، جرمنی، انگلستان، ہسپانیا وغیرہ میں مسیحی راہبوں اور بطریقوں نے لاطینی حروف تہجی کی اشاعت کی۔ چنانچہ آج کل تمام یوروپی زبانوں میں لاطینی حروف تہجی مستعمل ہیں۔ البتہ قوم 'سلاف' اور 'روسی' کے حروف تہجی رومی حروف تہجی سے کچھ اختلاف رکھتے ہیں، جس کی وجہ حسب ذیل ہے: قوم 'سلاف' پہلے 'موریا' اور 'بوہیمیا' کے صوبوں میں آباد تھی۔ اس قوم کا مفصل تذکرہ 'آسٹریا ہنگری' کی تاریخ میں ملتا ہے۔ نویں صدی عیسوی میں اس قوم کے درمیان سیرل نامی ایک یونانی راہب

نے دین عیسوی کی اشاعت شروع کی - اس کی ان تھک کوششیں بار آور ہوئیں-
اور قوم 'سلاف' حلقہ بگوش مسیحیت ہو گئی - 'سیرل' بڑے پایے کا عالم تھا اور
غیر معمولی ادبی ذوق رکھتا تھا - سلافی زبان کے لیے اُس نے یونانی طرز پر
ایک علحدہ نظام حروف تہجی قائم کیا اور سلافیوں کو اس کی تعلیم دی -
روسیوں نے بھی جن کی نسل قوم سلاف ہی کی تفریع ہے' اسی نظام حروف تہجی
کو سیکھا - یہی وجہ ہے کہ سلافی اور روسی حروف تہجی لاطینی حروف تہجی
سے بالکل مختلف اور یونانی حروف تہجی سے مشابہ ہیں —

آج کل بعض زبانوں میں ایک سے زیادہ قسم کے حروف مستعمل ہیں -
اگرچہ عربی' فارسی' اردو زبانوں میں صرف ایک ہی قسم کے حروف طباعت
و کتابت دونوں میں استعمال کئے جاتے ہیں لیکن اکثر زبانوں کی کتابیں جس
قسم کے حروف میں لکھی جاتی ہیں وہ حروف عام طور پر لکھنے کے کام نہیں آتے -
چنانچہ تقریباً تمام یوروپی زبانوں میں چار قسم کے حروف استعمال کئے جاتے ہیں -
یہاں جن حروف میں کتابیں طبع ہوتی ہیں' وہ لکھنے کے حروف سے بالکل
جداگانہ ہیں - پھر ہر ایک کی دو قسمیں ہیں' بڑے اور چھوٹے - بڑے حروف
سے جملوں کا آغاز ہوتا ہے اور چھوٹے حروف میں پوری عبارت لکھی
جاتی ہے - اب ہم ان چہار گانہ حروف کے معرض وجود میں آنے کی وجہ بیان کرتے ہیں-

خانقاہ جیرو کے مشہور راہب علامہ بیڈ نے اپنی پیرانہ سالی میں یوحنا
کی انجیل کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا - اس کی طرز کتابت موجودہ خط سے
اس قدر مختلف تھی کہ آج کل اس کا پڑھنا مشکل ہے - اس انجیل کا قلمی
نسخہ صرف بڑے حروف میں لکھا ہوا تھا - اس کتاب کی نہ صرف زبان آج کل
کی شستہ اور منجھی ہوئی انگریزی سے بالکل متغائر تھی بلکہ لکھنے کا طریقہ
بھی بالکل نرالا تھا - تمام الفاظ ایک دوسرے سے بالکل ملے ہوئے تھے اور دو لفظوں
کے درمیان مطلق فصل نہ تھا - علاوہ بریں اس کتاب میں اوقاف بھی استعمال

خہیں کئے گئے تھے - ہر انگریزی داں جانتا ہے کہ بغیر اوقات کے انگریزی عبارت کا پڑھنا سخت دشوار ہے - اس کتاب نے اس قدر شہرت حاصل کی کہ اس کی بے شمار نقلیں لی جانے لگیں - راہبوں کو اس انجیل کے پڑھنے میں سخت دقت پیش آتی تھی انھوں نے سوچا کہ اگر کتاب کی ہو بہو نقل کردی جاے تو پڑھنے کی دقت ہمیشہ باقی رہے گی اور معمولی آدمی تو کبھی نہ پڑھ سکے گا - اس لئے کتاب کو سہل القرأت بنانے کے لئے انھوں نے چھوٹے حروف ایجاد کئے اور بڑے حروف کو صرف نئے جملوں کے شروع میں استعمال کرنے لگے، تاکہ ایک جملہ دوسرے سے متمائز ہو - راہبوں اور قسیسوں کی انتھک کوششوں کی وجہ سے بہت سی خانقاہیں علم و فن کا مرکز بن گئیں، جہاں عظیم الشان کتب خانے قائم ہوے، جن میں سب قلمی کتابیں تھیں - یہ قلمی کتابیں آج کل کی چھپی ہوئی انگریزی کتابوں کی سی تھیں، جن میں حروف علحدہ علحدہ لکھے ہوے تھے - قرون وسطیٰ میں راہبوں اور مذہبی پیشواؤں کے علاوہ تاجروں، مقننوں اور دیگر سربرآوردہ لوگوں کے کاتبوں نے بھی پڑھنا لکھنا سیکھا - چونکہ یہ لوگ کاروباری آدمی تھے اور راہبوں کی طرح تارک‌الدنیا نہ تھے، لہذا اُن کے پاس راہبوں کا سا وافر وقت نہ تھا کہ خوش نویسی کا پہلو مد نظر رکھتے اور افتراقی طرز تحریر کے پابند رہتے - اس لئے انھوں نے لکھنے کے لئے دوسرے قسم کے حروف ایجاد کئے تاکہ ایک لفظ کے تمام حروف ایک دوسرے کے ساتھ ملاکر لکھے جاسکیں - سہل‌النقش اور زود تحریر ہونے کے باعث یہی اتصالی طرز کتابت مقبول عام ہو گئی اور لوگ راہبوں کی خوبصورت مگر زحمت طلب افتراقی طرز تحریر کو بھولنے لگے - لیکن جب مطبع کا آغاز انگلستان میں ہوا تو کار پردازان مطابع نے راہبوں کا خوبصورت افتراقی طریقۂ کتابت اختیار کیا - الغرض طباعت افتراقی طرز تحریر کی پابند ہوئی اور کتابت اتصالی طریقۂ تحریر کی - اس طرح انگریزی زبان میں چار قسم کے حروف استعمال ہونے لگے —

ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ ممالک مشرقیہ بعیدہ میں نظام حروف تہجی بالکل صوتی اصول پر قائم کیا گیا - وہاں حروف کے نام اصوات کے مطابق رکھے گئے - مثلاً عربی زبان میں جس حرف سے 'ک' کی آواز پیدا ہوتی ہے' اس کا نام کاف ہے' لیکن سنسکرت میں حرف کا نام بھی آواز کی مناسبت سے 'کَ' ہی ہے - اسی طرح 'ل' کی آواز پیدا کرنے والے حرف کا نام عربی میں لام ہے' لیکن سنسکرت میں اس حرف کا نام بھی 'ل' ہی ہے' وقس علیٰ ھذا - سنسکرت میں مختلف آلات نطق سے تعلق رکھنے والے حروف کے مختلف مجموعے قائم کئے گئے ہیں - مثلاً شفتی اصوات 'پ' 'پھ' 'ب' 'بھ' 'م' کا ایک مجموعہ - اسنانی اصوات 'ت' 'تھ' 'د' 'دھ' 'نھ' کا ایک الگ مجموعہ' کا سی آواز 'ٹ' 'ٹھ' 'ڈ' 'ڈھ' وغیرہ کا ایک علحدہ مجموعہ قرار دیا گیا ہے - الغرض سنسکرت نظام تہجی کی بنیاد بالکل اصوات پر رکھی گئی ہے - اگرچہ یونانی' لاطینی' سنسکرت' فارسی' انگریزی وغیرہ السنہ' نسل کے اعتبار سے آریائی ہیں اور اگرچہ متحدالنسل زبانوں میں بہ لحاظ ترکیب الفاظ' خصائص نحوی' طرز ادا' اسلوب بیان' بہت کچھ مشابہت پائی جاتی ہے' لیکن چونکہ نظام حروف تہجی و رسم خط وغیرہ بعد کی چیزیں ہیں اور اس وقت ظہور پذیر ہوئیں جب کہ ایک نسل کی مختلف اقوام مرکزی وطن کو خیر باد کہہ کر مختلف ممالک میں جا بسی تھیں' اس لئے حروف تہجی کے لحاظ سے ان کی زبانوں میں مماثلت نہیں پائی جاتی - اگرچہ عربی اور یونانی زبانیں مختلف النسل ہیں کیونکہ یونانی آریائی زبان ہے اور عربی سامی' تاہم ان کے حروف تہجی میں بہت کچھ مشابہت پائی جاتی ہے - لیکن یونانی اور سنسکرت زبانیں باوجود متحدالاصل ہونے کے ان کے حروف تہجی بالکل مختلف ہیں —

طرز تحریر

طرز تحریر کے لحاظ سے آریائی زبانوں اور سامی زبانوں میں دو امر بطور خاص مابہ الامتیاز ہیں - پہلا یہ کہ اکثر آریائی زبانوں میں بائیں سے دائیں جانب لکھنے کا طریقہ رائج ہے اور اکثر سامی زبانوں میں تحریر کا

قاعدہ ٹھیک اس کے برعکس یعنی دائیں سے بائیں جانب ہے - دوسرا مابہ‌الامتیاز امر یہ ہے کہ اکثر آریائی زبانوں میں افتراقی طرز تحریر کا رواج ہے' یعنے وہاں پورے پورے حروف ایک دوسرے کے پہلو میں علحدہ علحدہ لکھدینے سے لفظ بن جاتے ہیں- لیکن سامی زبانیں اکثر اتصالی طرز تحریر کی پابند ہیں' یہاں پورے حروف نہیں لکھے جاتے بلکہ محض ان کے اجزا باہم ملادیے جاتے ہیں اور الفاظ لکھنے کے وقت حروف پر قطع و برید کا عمل ہوتا ہے - یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فارسی تو آریائی زبان ہے لیکن وہاں لکھنے کا طریقہ عربی طرز پر دائیں سے بائیں جانب کیوں ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دوقوموں کا تصادم ہوتا ہے اور ایک قوم دوسری سے بر تر ہوتی ہے تو برتر قوم کے خیالات و افکار' جذبات اور احساسات' وضع قطع' رسم و رواج' لباس و پوشاک' تہذیب اور معاشرت دوسري کم مرتبہ قوموں میں رائج ہوجاتے ہیں - اسی طرح ایک فتح مند قوم نہ صرف سیاسی حیثیت سے بلکہ مذہبی' معاشرتی اور روایتی اعتبار سے بھی محکوم قوم پر غلبہ پاتی ہے' یہاں تک کہ ان کی زبانوں پر بھی عمل و تعمّل اور اثر و تأثر کا سلسلہ قائم ہوجاتا ہے - اگر دونوں زبانوں میں اتحاد لسانی کے لوازمات موجود ہیں تو زبان مفتوحہ کی ہیئت فاتح زبان کی ہیئت میں بالکل مد غم ہو جاتی ہے - چنانچہ جب ایران پر عربوں کو مذہبی' حربی' اور سیاسی استیلا حاصل ہوا تو عربی زبان کل حاکمانہ اقتدارات و فاتحانہ ضروریات اپنے ساتھ لائی' فارسی کو مفتوح زبان ہونے کی حیثیت سے اپنا دامن کشادہ کرنا اور عربی الفاظ قبول کرنے پڑے - چونکہ اتحاد لسانی کے لوازم مثلاً مخارج کی ہم آہنگی' اسلوب بیان کی یکسانی' ترکیب نحوی کی یک جہتی' خیالات اور مذاق کی یکرنگی وغیرہ موجود تھی - اس لئے فارسی پر عربیت کا رنگ چڑھتا گیا' یہاں تک کہ اس کی ہیئت لسانی بالکل عربی میں مد غم ہوگئی - حروف تہجی نظام ہجائی' رسم خط' طرز تحریر وغیرہ تو قریب قریب وہی ہوگئیں جو عربی کی ہیں - البتہ چند حروف مثلاً

'پ'، 'چ'، 'ژ'، 'گ'، وغیرہ کا فارسی نظام حروف تہجی میں اضافہ رہا کیونکہ عربی زبان ان کے مخارج سے معذور ہے - الغرض جدید فارسی اسلامی زبان بن گئی ' جو بالکل عربی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے - اسلام سے پہلے بھی ایرانی زبان بوجہ ہمسائگی کے بابلی' آسوری' فونیقی' عبرانی وغیرہ السنہ سے برابر متأثر ہو رہی تھی - اس طرح فارسی زبان کو بھی شروع ہی سے سامی السنہ سے سابقہ رہا اور یہی وجہ ہے کہ ' اوستا ' کی زبان اور پہلوی خط و کتابت بھی دائیں سے بائیں جانب کو ہوتی تھی -

غالباً حروف تہجی کے موجد فونیقیوں کے لکھنے کا طریقہ دائیں سے بائیں جانب تھا - عبرانی زبان میں بھی یہی طریقہ رائج رہا اور پھر عبرانی سے عربی میں یہی طریقہ بلا کسی رد و بدل کے منتقل ہوا - دنیا کی جن جن السنہ میں عربی نظام تہجی داخل ہوا وہاں دائیں سے بائیں جانب لکھنے کا طریقہ اختیار کیا گیا - چنانچہ فارسی اور اردو زبانیں اسی طرز تحریر کی پابند ہیں - اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ان میں سے کس طریقے میں سہولت' روانی اور عجلت کا پہلو زیادہ مد نظر ہے - ہر شخص ذاتی تجربے سے دریافت کرسکتا ہے کہ کسی شے کو اپنی جانب کھینچنے کے بہ نسبت اس کو اپنے سے دور ڈھکیلنے یا جھٹک دینے میں کم زحمت ہوتی ہے - واضح رہے کہ کسی چیز کو اپنی طرف کھینچنے میں ہاتھ کو ویسی ہی حرکت دینی پڑتی ہے جیسی دائیں سے بائیں جانب لکھنے میں اور کسی شے کو دور ڈھکیلنے کی حرکت بائیں سے دائیں جانب لکھنے کی حرکت کے مشابہ ہوتی ہے - پس لکھنے کا اول الذکر طریقہ ثانی الذکر سے زیادہ سہل اور آسان ہے - لہذا جب یونانیوں نے فونیقیوں سے نظام تہجی لیا تو جہاں انھوں نے اس میں حروف علت کا اضافہ کیا وہاں سہولت اور روانی کی غرض سے یہ جدت بھی کی کہ دائیں سے بائیں جانب لکھنے کے طریقے کو بدل دیا اور بائیں سے دائیں جانب لکھنے لگے - یونانیوں سے رومیوں نے اور رومیوں سے یوروپ کے تمام ممالک نے یہی طریقہ اخذ کیا اور اسے قائم رکھا - بلکہ یونانیوں کے اثر سے حبشیوں نے بھی اپنی زبان کے لئے بائیں سے

دائیں جانب کو لکھنے کا طریقہ اختیار کیا - گو کہ حبشی ایک سامی زبان ہے -
لیکن سامی السنہ میں دائیں سے بائیں جانب لکھنے میں جو تھوڑی بہت دقت اور زحمت
پائی جاتی ہے اُس کی تلافی اکثر سامی زبانوں نیز قدیم فارسی اور پہلوی میں اس
طرح کی گئی کہ اختصار ' حفظ وقت ' روانی اور تیزی کی غرض سے افتراقی طرز
تحریر کو خیر باد کہہ کر اتصالی طریقۂ تحریر اختیار کیا گیا - اس اتصالی تحریر
میں صرف یہی نہیں ہوتا کہ حروف ایک ساتھہ ملاکر لکھے جائیں بلکہ اختصار کے لئے
حروف کے صرف سرے یا اخیر کے حصے لے لئے جا تے ہیں اور پورے حروف لکھنے کے
بجائے محض ان کے چھوٹے حصے جزو اتصالی ہو تے ہیں - بلکہ اکثر حرف شوشوں یا
صرف قلم کی گردش سے ظاہر کئے جاتے ہیں - مثلاً لفظ ''منقطع'' کی اتصالی صورت یہی
ہوگی جو ناظرین کے سامنے ہے ' لیکن اس کی افتراقی صورت حسب ذیل ہو گی :
'' م ن ق ط ع '' '' پیچ'' - کا پہلا حرف ایک شوشہ ہے ' دوسرا قلم کی ایک ہلکی سی
گردش سے پیدا ہوا ہے' ظاہر ہے کہ پہلی صورت کو نہ صرف بہ لحاظ خوشنمائی
دوسری صورت پر ترجیح حاصل ہے - بلکہ اس میں اختصار' وقت کی بچت ' روانی
اور تیزی کا پہلو بھی ملحوظ ہے - الغرض اتصالی طرز تحریر کو افتراقی طرز تحریر
پر کئی اعتبار سے برتری حاصل ہے - آریائی السنہ ان خوبیوں سے محروم ہیں - البتہ
اتصالی تحریر میں مبتدیوں کے لئے ایک دقت یہ ہے کہ اُن کو الفاظ دیکھہ کر
اُن کے اجزا یعنی حروف کی شناخت آسانی سے نہیں ہوتی - کیونکہ کسی حرف کا
صرف سرا یا ایک حصہ دیکھہ کر پورے حرف کو پہچان لینا ننھے بچوں کے لئے بہت
دشوار ہے' لیکن اس مشکل کا حل طرز تعلیم میں مناسب اصلاح کر نے سے ہو سکتا
ہے - یہ بحث بجائے خود ہے ' جس کا یہ محل نہیں -

افترا قی طرز کتا بت میں تحر یر کی رفتار بہت سست ہو تی ہے -
چند جملے لکھنے میں بہت سا وقت صرف ہوتا ہے اور جگہ بھی بہت گھرتی ہے -
پرانے زمانے میں یوروپ کے راہب اور قسیس علائق دنیوی سے الگ تھلک تھے

اور اُن کے پاس وقت بہت وافر تھا اس لئے وہ اطمینان سے بیٹھے بیٹھے افتراقی طرز تحریر کے مطابق کتابیں لکھا کرتے تھے - لیکن آج کل کاروبار کے ھجوم اور زندگی کی کشاکش سے انسان کو دم لینے کی بھی فرصت نہیں ملتی - ایسے عدیم الفرصتی کے زمانے میں سست رفتار افتراقی طریقے سے کام نہیں چل سکتا - اسی لئے یورپ والوں کو مجبوراً مختصر نویسی کا ایک الگ فن قائم کرنا پڑا. دیکھا جائے تو اتصالی طرز تحریر فی نفسہٖ اختصار نویسی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ھے - کسی مقرر کی تقریر انگریزی میں قلم بند کرنے کے لئے ایک ھوشیار مختصر نویس کی ضرورت پیش آئیگی کیونکہ تیز سے تیز انگریزی کاتب بھی مروجہ طرز تحریر میں اس کام کو انجام نہیں دے سکتا - اس کے برعکس اردو کا تیز نویس کاتب فن مختصر نویسی سے ناواقف ھونے کے باوجود ھرقسم کی تقریر قلمبند کرنے پر قادر ھوسکتا ھے - ایک اور قابل غور امر یہ ھے کہ جب افتراقی تحریر بھی تیزی کے ساتھ لکھی جاتی ھے تو اس میں اتصالی کیفیت پیدا ھو جاتی ھے - چنانچہ انگریزی کے شکستہ خط میں حروف ایک دوسرے سے اس قدر گُتھ جاتے ھیں اور اُن میں ایسی اتصالی شان پیدا ھو جاتی ھے کہ وہ الگ الگ تمیز نہیں کئے جاسکتے، بلکہ عبارت صرف اٹکل سے پڑھ لی جاتی ھے- اسی طرح مرھٹی زبان کی کتابیں تو افتراقی طرز تحریر کی پابند ھوتی ھیں' لیکن رواں کتابت کے لئے 'موڑی تحریر' مستعمل ھے' جس میں اتصالی شان پائی جاتی ھے- ان واقعات سے واضح ھوا کہ افتراقی طریقۂ تحریر کی پابندی ایک امر محال ھے- خلاصہ یہ کہ سامی السنہ میں اگر دائیں سے بائیں جانب لکھنے میں کچھ دقت بھی ھے تو اس کی تلافی ان کی اتصالی طرز تحریر سے ھو جاتی ھے - لیکن افتراقی تحریر کی سست رفتاری اور بھدے پن کی تلافی محض بائیں سے دائیں جانب لکھنے کی نام نہاد سہولت سے نہیں ھو سکتی --

لکھنے کا سامان

اسی ضمن میں اس امر کا بیان بھی بے محل نہ ھو گا کہ مختلف زمانوں میں لوگ کس شے پر لکھتے تھے - عہد بربریت

کے انسان جیسا کہ اس مضمون کے شروع میں بیان ہوچکا ہے، ہڈیوں یا سینگوں پر تصویریں بناتے تھے اور یہی تصویریں تحریر کا ہیولی یا نقش اول تھیں - ہڈیوں پر لکھنے کا طریقہ محض دور بربریت کے انسان تک محدود نہ تھا بلکہ دور متمدن میں بھی بعض اقوام اپنی مذہبی کتابیں ہڈی کے ٹکڑوں پر لکھا کرتی تھیں - زمانۂ قدیم میں جب کہ آج کل کی طرح ذرائع حمل و نقل اور ڈاک اور تار کا سلسلہ موجود نہ تھا- عام اعلانات، مذہبی اصول و احکام، شاہی فرامین و منشورات وغیرہ بالعموم پہاڑوں یا پتھر کی لاٹوں پر عوام کی آگاہی کے لئے کندہ کر دیے جاتے تھے - چنانچہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں پتھر کی لاٹوں پر 'اشوک اعظم' کے کندہ کرائے ہوے کتبے آج بھی دیکھنے میں آتے ہیں- جن ملکوں میں پتھر کمیاب تھا، وہاں مٹی کی تختیوں، استوانوں، اینٹوں اور کھپریلوں پر عبارتیں کندہ کرائی جاتی تھیں، جیسا کہ ہم سامری قوم کے بیان میں پڑھ چکے ہیں - اگرچہ حضرت موسی علیہ السلام کے احکام عشرہ و دیگر قوانین بالعموم پتھر کو لوح یا چٹانوں ہی پر کندہ ملتے ہیں، تاہم اُسی زمانے میں اہل مصر "پپیرس" پر لکھنا جانتے تھے - تاریخ شاہد ہے کہ موسی علیہ السلام کی بعثت سے پہلے 'پپیرس' پر لکھنے کا طریقہ رواج پاچکاتھا - تاہم عام آگاہی کے لئے پتھر کی لاٹوں اور چٹانوں ہی پر کتبے کندہ کئے جاتے تھے-قدیم یونانی اور رومی قومیں بھی 'پپیرس' سے واقف تھیں-چونکہ 'پپیرس' دیرپا نہیں ہوتا تھا، اس لئے اُن کے قوانین اور احکام پتھر کی تختیوں یا تانبے کے پتروں پر کندہ کئے جاتے تھے - ہر ملک میں چوبی یا فلزی تختیاں بھی لکھنے کے کام آتی تھیں، لیکن اِن تختیوں پر لکھنا زحمت طلب تھا - کیونکہ کئی آہنی اور فولادی اوزاروں سے بہت دیر میں حروف کھودے جاتے تھے - تھے - اس لئے رومیوں نے یہ جدت کی کہ وہ چوبی یا فلزی تختیوں پر لاکھ لیپ دیتے تھے اور ایک نکیلے آہنی قلم سے اُن پر بسہولت لکھا کرتے تھے - قدیم تاریخ روما کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ہر رومی، جو پڑھنے لکھنے سے واقف

تھا ' اپنے پاس اِس قسم کی لاکھ سے ایسی ھوئی تختیاں ضرور رکھتا تھا - البتہ جب سے سلیٹ پر بآسانی لکھنے کا طریقہ رائج ھوا اُس وقت سے تختیوں پر سے لاکھ کا یہ استعمال متروک ھو گیا —

اھل مصر علوم و فنون اور تہذیب و تمدن میں روز افزوں ترقی کر رھے تھے- " پپیرس " چونکہ زیادہ دیرپا نہیں ھوتا تھا ' اس لئے انھوں نے جانوروں کے بچوں کے ملائم چمڑے سے ایک قسم کا کاغذ بنایا (جسے عربی میں " رَقّ " اور انگریزی میں " پارچمنٹ " یا " ویلم " کہتے ھیں اور ھم " چر مک " کہہ سکتے ھیں) اور جھلیاں بھی استعمال کرنے لگے- مصریوں نے "رق"(چرمک) اور جھلیوں پر لکھنا اُسی زمانے میں سیکھہ لیا تھا ' جب بنی اسرائیل وھیں مقیم تھے اور ابھی شام اور کنعان کو ھجرت نہیں کی تھی - الغرض چرمک پر لکھنے کا رواج حضرت مسیح سے پانچ صدیوں پیشتر ھی ھوچکا تھا - یونانیوں اور رومیوں نے بھی اھل مصر سے رق اور جھلیوں پر لکھنا سیکھا - چنانچہ اُن کی بہت سی شہرہ آفاق اور زندۂ جاوید کتابیں جو نسلاً بعد نسلٍ ھم تک پہنچی ھیں' رق ھی پر لکھی ھوئی ھیں - کتابوں کے علاوہ شاھی احکام ' فرامین ' تمثیلات اور وصیت نامے وغیرہ بھی چرمک ھی پر لکھے جاتے تھے - الغرض " پپیرس " بوجہ زود تلفی کم استعمال ھونے لگا اور چرمک پر لکھنے کا رواج بڑھتا گیا - بہر کیف مطبع کی ایجاد تک چرمک اور جھلیاں خوب استعمال ھوتی رھیں - چنانچہ قرون وسطیٰ کی تمام خوبصورت کتابیں جھلیوں اور چرمکوں پر لکھی ھوئی ھیں - کہا جاتا ھے کہ مطبع کی ایجاد کے بعد ھنگیری کا بادشاہ ' متھیا ھنیاوی ' اپنے کتب خانے میں چھپی ھوئی کتابیں رکھنا پسند نہیں کرتا تھا ' اس لئے اُس نے بہت سے کاتبوں اور خوش نویسوں کو ملازم رکھہ کر ان سے کثیرالتعداد کتابیں چرمک اور جھلی پر لکھوائیں - آج کل بھی چرمک اور جھلیوں پر لکھنے کا طریقہ مفقود نہیں ھوا ھے - پار چمنٹ کی ایک نفیس قسم ' ویلم ' ھے ' موجودہ زمانے میں اکثر شاھی اسناد و منشورات

اور بین قومی معاهدات ' ویلم ' هی پر تحریر هوتے هیں - دنیاے متمدن کی اکثر و بیشتر جامعات بھی جو اسناد عطا کرتی هیں وہ چرمک هی پر هوتی هیں -

قدیم اهل عرب کے هاں مختلف اشیا لکھنے کے کام آتی تھیں - بانی اسلام کی بعثت کے بہت دنوں بعد تک جن چیزوں پر اهل عرب اپنی کتابیں لکھتے تھے ' ان میں سے حسب ذیل بہت مشہور تھیں : (۱) " عسیب " یعنی کھجور کی شاخ جس سے پتیاں گر چکی هوں (۲) " سلقة " یعنی پتھر کی پتلی تختی - (۳) قِتب یا قتَب یعنی پالان کی لکڑی (۴) کتف یعنی اونٹ ' گاے یا بکری وغیرہ کے شانے کی چوڑی هڈی (۵) رَقّ یعنی چمڑے کے ورق وغیرہ - لیکن زیادہ تر رواج هڈیوں پر لکھنے کا تھا - کیونکہ اُس میں زیادہ صرفہ نہ تھا - چنانچہ اکثر سیاحوں کا بیان ہے کہ قرون اولی کے مسلمان علما کے دارالمطالعہ میں هڈیوں کا انبار لگا رهتا تھا ' جن پر هر قسم کی کتابیں لکھی هوتی تھیں - لیکن خوبصورتی اور خوشنمائی کے لئے کلام مجید بالعموم ' رق ' پر لکھا جاتا تھا - راقم نے اوری انٹل پبلک لائبریری (کتب خانۂ مشرقیہ عمومیہ) بانکی پور پٹنہ میں نہایت خوبصورت جھلیوں کے پلندے پر کلام مجید خوش خط لکھا هوا دیکھا ہے - مہتمم کتب خانہ کا بیان تھا کہ یہ کلام مجید خاص حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دست مبارک کا لکھا هوا ہے- واللہ اعلم بالصواب - قدیم هندوستان کی فضا ' گوتم بدھ ' کی تعلیم سے اس قدر متأثر هوئی کہ بدھ مت کے هندوستان سے اخراج اور برهمنی مذهب کے عود کے بعد بھی جانوروں کو ذبح کرنا " جیوهنسا " اور ' مہاپاپ' خیال کیا جاتا رها - الغرض هنود کی سبزی خوری نے انھیں رق ' چمڑے' پار چمنت' جھلی ' هڈی وغیرہ پر لکھنے سے باز رکھا - اس لئے یہاں مقدس کتابیں تاڑ کے پتوں پر لکھی جاتی تھیں —

دو هزار برس گذرے کہ ' سائی لون ' نامی ایک چینی صناع نے کاغذ ایجاد کیا - لیکن چونکہ اُس زمانے میں دور دور ملکوں کے درمیان رسل و رسائل اور

آمد و رفت کے ذرائع بہت کم تھے ، کاغذ کا استعمال مدت تک مشرق اقصیٰ ھی میں محدود رھا - پورے ایک ھزار سال کے بعد ایشیا کے مغربی حصے میں لوگ کاغذ سے روشناس ھوے - چنانچہ دسویں صدی عیسوی میں اھل مصر نے کاغذ بنانا سیکھا - گیارھویں صدی میں ' مراکش ' کے مسلمانوں نے فن کاغذ سازی میں بڑی ترقی کی - مراکش سے یہ فن اُندلس پہنچا ، جہاں خلفاے امویہ حکمراں تھے - اُس زمانے میں یورپ کی فضا جہالت سے مکدر تھی ، اسی لئے تاریخ یورپ میں یہ زمانہ " عہد تاریک " کے نام سے موسوم کیا جاتا ھے - لیکن اُندلس کے شہر غرناطہ میں علوم و فنون کا آفتاب نہایت فیاضی سے ضیا بار تھا - حصول علم کے لئے یورپ کے تاریک خطوں کے عیسائی وھاں جوق جوق آتے ، چنانچہ چند اطالوی طلبہ نے جو تلاش علم میں غرناطہ پہنچے تھے ، دیگر علوم و فنون کے ساتھہ ساتھہ فن کاغذ سازی بھی مسلمانوں سے سیکھا اور جب وہ اپنے وطن کو واپس گئے تو وھاں اُنھوں نے گھر یلو کاغذ بنانا شروع کیا - اطالیا سے فرانس اور جرمنی نے کاغذ سازی سیکھی - لیکن انگلستان میں سب کے بعد کاغذ کا رواج ھوا - ھندوستان کے باشندوں کو بدھ مت کے چینی جاتریوں نے پہلے ھی کاغذ سے روشناس کردیا تھا لیکن عام طور پر یہاں کاغذ کا رواج اسلامی فتوحات کے بعد ھوا - زمانے کی نیرنگی دیکھئے کہ جن یورپی ملکوں میں سب کے بعد کاغذ کا رواج ھوا ، آج کاغذ سازی کے بڑے بڑے کار خانے وھیں قائم ھیں اور وھیں سے دنیا بھر میں کاغذ کی سربراھی ھورھی ھے—

اب ایک سوال یہ پیدا ھوتا ھے کہ قدما کے ھاں کس قسم کا قلم رائج تھا - اوپر بیان ھوچکا ھے کہ دور بربریت کے انسان بھی ھڈی یا سینگ کے ٹکڑوں پر بھدی تصویریں بناتے تھے - لہذا حجری زمانے میں پتھر ھی کے نکیلے اوزار قلم کا کام دیتے ھوں گے ، بعد کو جب پتھر ، اینٹ ، ھڈی ، مٹی کی تختیوں اور اُستوانوں ،

چوبی اور فلزی لوحوں پر کتبے کندہ کیے جانے لگے تو پہلے تانبے یا کانسی کے اور پھر لوہے کے اوزار کام میں لائے جاتے تھے - رومیوں اور یونانیوں کے ہاں لاکھ بھری ہوئی تختیوں پر لکھنے کے لیے بھی نکیلے فلزی اوزار استعمال کیے جاتے تھے - لیکن جب مصر میں پپیرس اور پھر رق اور جھلیوں پر لکھنے کا رواج ہوا تو مصری برو (کلک) یا سرکنڈے کے قلم سے لکھنے لگے، جس کی زبان میں روشنائی اُترنے کے لیے شگاف دے دیا جاتا تھا - ہندوستان میں بھوج پتر اور تاڑ کے پتوں پر لکھنے کے لیے بھی برو یا سر کنڈے یا نرکُل یا بانسی قمچیوں کے قلم استعمال کیے جاتے تھے - عربوں اور ایرانیوں کے ہاں بھی اسی قسم کے قلم مروج تھے - خوشنویسی کے لیے یہی قلم موزوں بھی تھے، حروف کی حسب ضرورت موٹائی اور پتلے پن، شو شوں کے اُتار چڑھاو اور نوک پلک کے لیے قلم کی زبان میں لچک کا ہونا ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ برو یا سرکنڈے کے قلم جیسے لچکیلے ہوتے ہیں ویسے آہنی قلم نہیں ہوتے - ہندوستان میں تھوڑے دنوں سے آہنی قلم کا رواج ہوا ہے - یہاں لوہے کے قلم انگریزوں کے قدم بقدم آئے، اسی باعث وہ " کلک فرنگی " کہلاتے ہیں - بہر حال جب پپیرس اور چمڑے پر لکھنے کا رواج ہوا تو روشنائی کی بھی ضرورت پیش آئی۔ پہلے پہل اہل مصر نے روشنائی ایجاد کی - وہ لاکھ یا اُس دانے دار صمغی مادے سے روشنائی تیار کرتے تھے، جو اکثر بیر - پیپل - برگد - وغیرہ کے درختوں کی ٹہنیوں کی جڑوں میں بڑیوں کی شکل میں جمع ہوتا تھا - ہندوستان میں یہ صمغی مادہ بکثرت پیدا ہوتا ہے - اُسے یہاں عرف عام میں " بیری کا میل " کہتے ہیں - اہل ہند اُسے کوٹ کر پکاتے اور صاف کرتے ہیں اور اُس سے ریشم رنگتے، چوڑیاں بناتے، دستے جوڑتے اور وارنش تیار کرتے ہیں - اُس سے غازہ بھی بنتا ہے - نقاشی اور مصوری میں بھی اُس کا رنگ کام دیتا ہے - بعضوں کا خیال ہے کہ لاکھ ایک قسم کے کیڑوں کا لعاب دہن ہے۔ اس کی حقیقت یوں ہے کہ یہ کیڑے جو عربی میں قرمز کہلاتے ہیں،

درختوں کی نرم اور نازک ٹہنیوں میں سوراخ کردیتے ہیں اور درختوں سے ان سوراخوں سے ہو کر جو عرق یا لعاب نکلتا ہے وہ جم کر لاکھ بن جاتا ہے - ہندوستان میں بھی اس کی روشنائی بنتی تھی - لیکن زیادہ تر ہڑے اور کسیس کے آمیزے سے روشنائی بنتی چلی آئی ہے - علاوہ بریں ہر ملک میں کاجل سے سیاہی بنانے کا عام قاعدہ تھا - ہندوستان میں پہلے ناگ پھنی کے پھل سے بھی سرخ روشنائی تیار کی جاتی تھی —

یورپ میں بھی تیرھویں صدی عیسوی تک صرف برو اور سر کانڈے کے قلم مستعمل تھے - تیرھویں صدی کے آخر میں بعض کاتبوں نے دریافت کیا کہ چند قسم کے پرندوں کے پر سے عمدہ قلم بن سکتے ہیں' اس وقت سے انیسویں صدی تک، پر کے قلم یورپی ممالک میں بکثرت استعمال ہوتے رہے - پر کے قلم کے بڑے بڑے کارخانے بھی قائم ہوے تھے - پہلے ایک ماہر عمدہ پروں کا انتخاب کرتا تھا' پھر ان پروں کو گرم اور اُبلتے ہوے پانی میں کچھ دیر تک ڈبو کر خشک کر لیتے تھے - اس عمل سے صفائی کے علاوہ پروں میں پختگی اور سختی پیدا ہوجاتی تھی - پھر کلک کے قلم کی طرح پروں کو قلم تراش سے چھیل کر یا مشین میں دباکر قلم بنالیتے تھے - خوشنویسی کے لئے یہ قلم بہترین خیال کئے جاتے تھے اور اُنیسویں صدی کے اوائل تک انہیں قلموں کا عام رواج تھا - بعض مورخین کا بیان ہے کہ سترھویں صدی کے اخیر میں انگستان میں پیتل کے قلم بھی بنائے گئے تھے - لیکن پر کے قلموں کے آگے اُن کی کچھ قدر نہ ہوئی - سنہ ۱۸۱۹ ع میں انگستان میں ایک شخص 'جیمس پیری' نامی نے آہنی قلم کا کارخانہ کھولا - پہلے آہنی قلم بھی ہاتھ ہی سے بنائے جاتے تھے - اس لئے بڑی محنت اور دقت سے تیار ہوتے تھے اور بہت گراں فروخت ہوتے تھے' لہذا عوام پر ہی کے قلم استعمال کرتے رہے - اس کے کئی سال بعد 'جیمس میچل' نے مشین کے ذریعے قلم بنانا شروع کیا - یہ آہنی قلم پر ہی کے

قلم کے نمونے کے ہوتے تھے۔ اس لئے جب زبان قلم گھس کر خراب ہوجاتی تو پورا قلم بیکار ہوجاتا تھا۔ بالآخر 'جوزف میسن' اور 'جوزف گیلاٹ' نے یہ جدت طرازی کی کہ قلم الگ بنایا اور زبان قلم (نب) علحدہ مشین میں ڈھال کر تیار کی۔ اور یہ اہتمام کیا کہ زبان قلم میں پر کے قلم کی طرح لچک ہو، تاکہ حروف خوشخط لکھے جاسکیں۔ اب ایک قلم مدتوں کام دینے لگا صرف وقتاً فوقتاً زبان یعنی نب بدل دی جاتی تھی ―
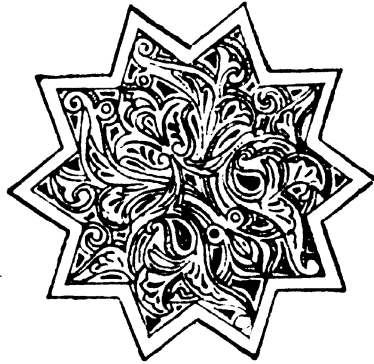
مقدمہ چمنستان شعرا*

(از اڈیٹر)

راے لچھمی نرائن تخلص 'شفیق' و 'صاحب' کے والد راے منسارام نواب نظام الملک آصفجاہ مرحوم کے عہد میں پیشکار صدارت شش صوبۂ دکن تھے† - راے منسارام اپنی ایک کتاب‡ کے شروع میں لکھتے ھیں کہ " بندۂ عقیدت شناس منسارام آصفجاھی ابن بھوانی داس غازی الدین خانی' نبیرۂ بال کشن عابد خانی نے تخمیناً مدت پچاس سال اس سرکار دولت مدار میں اپنی زندگی بڑی اچھی طرح بسر کی' صدارت کل کی خدمت انجام دی اور مورد عاطفت و شفقت رھا" —

'شفیق' کھتری قوم سے تھے اور ان کے بزرگ لاھور کے رھنے والے تھے - ان کے دادا بھوانی داس لشکر عالمگیری کے ھمراہ دکن میں آے اور اورنگ‌آباد میں سکونت پذیر ھوگئے - راے منسا رام کو صغر سنی ھی میں یتیمی کا داغ نصیب ھوا - سن شعور کو پہنچکر ایسی لیاقت حاصل کی کہ نواب مغفرت مآب آصف جاہ اول کے عہد میں پیشکار صدارت صوبجات دکن کی خدمت پر فائز ھو گئے - منسا رام چار پشت سے خاندان آصف جاہ کے نمک خوار تھے —

راے منسارام محض دفتر کے پیشکار یا سررشتہ دار ھی نہ تھے بلکہ تاریخ و

---

* یہ کتاب حال ھی میں انجمن ترقی اردو نے نہایت اھتمام سے شایع کی ھے - اور قابل دید ھے حجم تقریباً ۲۰۰ صفحے —

† شام غریباں' باب آخر — ‡ مآثر نظامی —

انشا کا بھی ذوق رکھتے تھے اور صاحب تالیف و تصنیف ہوے ہیں- ایک کتاب اُن کی 'مآثر نظامی' ہے - یہ کتاب اُنھوں نے اس زمانےمیں لکھی تھی' جب ناموافق حالات کی وجہ سے خانہ نشین ہوگئے تھے - اس کتاب میں نواب نظام‌الملک آصف جاہ اول کے حالات ہیں- ابتدا میں ان کے بزرگوں کا بھی تذکرہ آگیا ہے- یہ حالات کچھہ تو مصنف کے چشم دید ہیں اور بعضے ایسے ہیں جو ثقات سے معلوم ہوے' اور بعض حالات خود نواب آصف جاہ مرحوم کی زبان مبارک سے سننے میں آے - یہ کتاب ۱۲۰۰ھ میں مرتب ہوئی - اور جب اُنیس سال کی گمنامی اور گوشہ نشینی کے بعد "حضرت مرشد زادۂ آفاق مہین پور خلافت و ریاست ...... نواب عالی جاہ بہادر اسد جنگ" نے یاد فرمایا تو یہ رسالہ بطور تحفہ حضور میں پیش کیا - ان کی دوسری تالیف "قانون دربار آصفی" ہے - یہ کتاب بھی زمانۂ گوشہ نشینی کی لکھی ہوی ہے - سنہ تالیف ۱۱۷۵ ھ ہے- اس میں ضوابط دربار کے علاوہ بعض بعض بڑے کام کی باتیں بھی آگئی ہیں - مؤلف نے آخر میں لکھا ہے کہ یہ کتاب میں نے دو روز میں لکھی —

اس سے یہ معلوم ہوگا کہ 'شفیق' ایسے گھرانے میں پیدا ہوے تھے' جہاں علمی چرچا تھا اور خود اُن کے والد صاحب تالیف و تصنیف تھے- 'شفیق' کی ولادت سنہ ۱۱۸۵ ھ میں ہوئي- یہ وہ زمانہ ہے جب کہ شمالی ہندوستان سے لے کر دکن تک ریختہ گوئی کی گرم بازاری ہے اور من‌جملہ دوسرے شہروں کے اورنگ‌آباد بھی مرکز شعر و سخن بنا ہوا ہے - اگرچہ اس وقت ذرائع آمد و رفت کی یہ آسانیاں نہ تھیں جو اس وقت ہیں' لیکن اس پر بھی شمال کے اساتذہ کا تازہ کلام یہاں پہنچتا رہتا ہے ' بڑے اشتیاق سے پڑھا جاتا ہے اور مشہور خاص و عام ہوجاتا ہے' جس سے صاحب ذوق لوگوں کے دلوں میں نئی نئی اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ ان باکمال اساتذہ کی تتبع کرنے کی کوشش کرتے ہیں —

'شفیق' کی تعلیم رواج زمانہ کے مطابق فارسی' عربی' صرف و نحو' انشا وغیرہ میں ہوئی اور جیسا کہ خود اُنھوں نے اس تذکرے میں لکھا ہے' شیخ عبدالقادر صاحب

سے کتب متعارفہ کی سند حاصل کی - بدوسن شعور ھی سے ان میں شعرو سخن کا ذوق پیدا ھوگیا تھا اور گیارا سال کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے - میر غلام علی 'آزاد' بلگرامی جن کا شمار ھندوستان کے جید علما میں ھے اور جو فن شعر گوئی اور تاریخ میں یدطولیٰ رکھتے تھے ، دکن ھی میں تھے - 'شفیق' کو ان سے تلمذ کا شرف حاصل ھوا - لکھتے ھیں کہ " میر عبدالقادر 'مہربان' نے جو حضرت ' آزاد' کے تلامذہ میں سے تھے ، مجھے " صاحب " تخلص عنایت فرمایا - غزلیات کا دیوان جس میں تقریباً دو ھزار بیت تھے' مرتب کیا - لیکن جب ذرا استعداد بڑھی اور اصطلاح شعرا اور قواعد شعرا میں مہارت حاصل ھوئی تو اُسے تقویم پارینہ سمجھہ کر نظر انداز کردیا - اب نہ میری عمر اٹھارا سال کی ھے' مجھے یہ معلوم ھوا کہ ایک صاحب میر محمد مسیح کا تخلص فارسی میں 'صاحب' ھے تو میں نے " میر صاحب و قبلہ " (آزاد بلگرامی) سے تخلص کی التجا کی - آپ نے ازراہ شفقت "شفیق" تخلص عطا فرمایا - چونکہ میرے ریختے عوام و خاص میں مشہور ھو چکے تھے' اس لئے ریختے میں "صاحب" ھی تخلص رھنے دیا اور جن بحروں میں " شفیق " نہیں کھپ سکتا وھاں نا چار " صاحب " ھی رکھنا پڑا - اس نئے تخلص کی خوشی اور شکریے میں وہ ایک قطعہ موزوں کرتے ھیں اور " تخلص نوي " اس کی تاریخ نکالتے ھیں - مہربان" شفیق' کے خاص دوستوں میں سے تھے - ان کے حالات میں ان کی بہت تعریف کی ھے —

میر غلام علی ' آزاد' ١١٥٢ ھ (١٧٣٠ ع) میں اورنگ آباد وارد ھوے اور بابا شاہ مسافر کے تکیے میں قیام کیا اور سات سال یہیں بسر کردئے - ' آزاد ' کی عمر کے اڑتالیس سال دکن ھی میں گزرے اور یہیں وفات پائی اور خلدآباد میں پیوند زمیں ھوے - آپ کے فیض صحبت سے دکن کے اکثر باکمال مستفیض ھوے - انھیں میں ' شفیق' تھے - ' شفیق ' کو ' آزاد' سے کمال عقیدت مندی تھی اور جہاں کہیں ان کے تالیفات میں ' آزاد ' کا نام آیا ھے تو اُن کا ذکر بڑے ادب و احترام اور

خلوص و ارادت سے کرتے ھیں اور ھر جگہ انھیں "میر صاحب قبلہ" "پیر و مرشد" یا قبلہ و کعبۂ بر حق" اور اپنے آپ کو "غلام" لکھتے ھیں - (غالباً اس میں 'آزاد' کے لفظ کی رعایت بھی ملحوظ ھے) ۔ 'گل رعنا' میں 'آزاد' کا تذکرہ تفصیل سے لکھا ھے - اپنے کلام میں جا بجا حضرت کے کمال اور اپنے تعلقات و عنایات کا ذکر کیا ھے - ایک پر زور قصیدہ اُن کی مدح میں لکھا ھے :—

للہ الحمد صبا مژدۂ عشرت لائی	کہ بہار اب کے تجمل سے چمن میں آئی
شاہ گل تخت چمن پر ھے بصد زینت وناز	سرو و شمشاد ھیں استادہ وھاں مجرائی

بہار یہ تشبیب کے بعد گریز کی ھے :—

طبع حضرت سے مگر وام کرے رنگینی	اب جو کرتی ھے بہار ایسی چمن آرائی
یعنے وہ حضرت 'آزاد' کہ خورشید و قمر	آستاں اُس کی پہ رکھتے ھیں جبیں فرسائی
قبلۂ ھر دو جہاں ' مرشد ارباب سلوک	ختم ھے ذات مبارک پہ کرم فرسائی
علم منقول میں اس کو دم عیسیٰ ھےکا	علم معقول میں اُس کو ھے ید بیضائی
قمریان عرب اُس کی ھیں ثناخوانی میں	عندلیبان عجم کی ھے سخن پیرائی
بسکہ رکھتا ھے سخن ہیچ وشیریں کاری	ھند کے طوطیوں کو اُس سے ھے شکر خائی
نگہ لطف مرے پر ھے ھمیشہ مبذول	مجکو زیبا ھے غلامی ' اُسے ھے آقائی

اس کے بعد دعا ھے اور دعا کے بعد یہ مقطع ھے :—

فارسی شعر کہو مدح میں اُس کی "صاحب"	کہ ملے تجکو خطاب ملک الشعرائی

اسی طرح ایک پوری غزل ' آزاد ' کی شان میں کہی ھے - غزل کیا ھے ' گویا اپنے پیر و مرشد کی شان میں چھوٹا سا قصیدہ ھے :—

سرور ھر دو جہاں آزاد ھے	والی کون و مکاں آزاد ھے
کنت کنزاً کے معانی پر خبر	واقف سر نہاں آزاد ھے
مرکز ادوار چرخ چنبری	قطب الاقطاب زماں آزاد ھے

اسم اعظم ھے زباں زد اس کے تئیں   جس کے تئیں ورد زباں آزاد ھے
خورد و بزرگ کے تئیں یہاں ھے رسوخ   مرشد پیر و جواں آزاد ھے
ایک دم میں دین و دنیا بخش دے   جس کے اوپر مہرباں آزاد ھے
دل سے اب 'صاحب' ھوا ھے کا غلام   بادشاہ انس و جاں آزاد ھے

کہاں تک لکھوں ' ' شفیق' کی عقیدت کے اظہار کے لئے یہ بہت کافی ھے -
حضرت آزاد کا ذوق سخن محتاج بیان نہیں ' ایسے صاحب ذوق اور با کمال لوگ کم ھوتے ھیں - ان کا کلام اور ان کی تصنیفات اس کی شاھد ھیں - اس کے ساتھ تاریخ و سیرت کا ذوق بھی اعلیٰ درجے کا تھا - ان کے تذکرے اس فن کے بہترین نمونے ھیں - 'مآثر الامرا' جو تاریخی لحاظ سے بےمثل کتاب ھے' انھیں کے فیض اثر کا نتیجہ ھے' بلکہ بہت کچھہ حضرت 'آزاد' ھی کی قلم کی ممنون ھے - ادب میں ان کی نظر بہت وسیع تھی اور تحقیق و تلاش میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے - اچھا استاد دنیا کی بہترین نعمتوں میں سے ھے - 'شفیق' بڑا خوش قسمت تھا کہ اُسے 'آزاد' سا استاد ملا - اس نے بھی استاد کے قدم بقدم چلنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی - شاعر تو وہ لڑکپن سے تھا' فارسی اور اردو دونوں میں اس کا کلام موجود ھے اگرچہ کم یاب ھے - اس کے علاوہ اس کی تصنیفات و تالیفات دو قسم کی ھیں - ایک تو شعرا کے تذکرے اور دوسری تاریخی کتابیں - یہاں اُن تالیفات * کا مختصر سا ذکر کیا جاتا ھے —

تاریخ

——(حقیقت ھاے ھندوستان)——

'شفیق' اس کتاب کی حقیقت دیباچے میں اس طرح لکھتے ھیں

---

* اس مقدمے میں راے منسارام اور 'شفیق' کی تالیفات کا ذکر آیا ھے' اُن میں سے تلمیح شگرف' حالات حیدرآباد' ریو کی فہرست سے ماخوذ ھیں' باقی کتابیں میرے پاس موجود ھیں —

کہ " راقم کے والد رائے منسارام نے جو چار پشت سے نمک خوار خاندان آصفی ہیں - سنہ ۱۲۰۴ ھ میں اورنگ آباد سے فردوں کے چند طباق میرے پاس حیدرآباد بھیجے - یہ میرے جد ماجد کے لکھے ہوئے تھے ' جو سرکار حضرت کلاں علیہ المغفرۃ و الراضون میں خدمت مستوفی گری اور پیشکاری صدارت امکنۂ ہندوستان پر فائز تھے ' یہ فردیں نواب مغفرت مآب نظام الملک کے دستخط سے مزین تھیں - لیکن ان میں سے بعض بوسیدہ ہوگئی تھیں اور اکثر کرم خوردہ تھیں - ان فردوں میں قدیم زمانے کے مختلف سنین سے سنہ ۱۱۳۹ ت تک کے مداخل و مخارج و جمعیت سپاہ وغیرہ کا حساب بطور سیاق و اصطلاح اہل جرائد میں درج تھے - ان سب کو سادہ عبارت میں تحریر کیا اور رقمی اعداد کو الفاظ میں لکھا اور اس کے علاوہ دوسری معلومات بھی فراہم کر کے مناسب مقامات پر اضافہ کیں —

یہ کتاب ' شفیق ' نے اُس وقت کے رزیڈنٹ اور اپنے سرپرست کپتان ولیم پیٹرک کے لئے تالیف کی - کتاب کے نام سے اس کا سنہ تالیف (۱۲۰۴ ھ) نکلتا ہے ' اس میں چار مقالے ہیں : —

مقالۂ اول میں دفتر قدیمہ کی فردوں کی کیفیت ہے —

مقالۂ دوم میں صوبہ ہائے ہندوستان کا حال ہے —

مقالۂ سوم میں صوبجات دکن کا ذکر ہے —

مقالۂ چہارم میں مسلمان سلاطین ہند کا مختصر حال ' سلطان معزالدین سام سے لے کر شاہ عالم بادشاہ تک ہے —

یہ کتاب اچھی ضخیم ہے اور اس میں ہر سرکار پرگنہ اور حویلی کے مداخل اور سمت اور فاصلہ درج ہے - ضمنی طور پر مختصر تاریخی واقعات بھی آ گئے ہیں - غرض یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے —

—— (تنمیق شگرف) ——

یہ بھی دکن کی تاریخ کے متعلق ہے - مختلف صوبوں کے جغرافی اور تاریخی حال اور اعداد و شمار ہیں اس کے بعد سلاطین بہمنیہ کا ذکر ہے جو تاریخ فرشتہ سے ماخوذ ہے ۔ سلطنت بہمنیہ کے زوال پر جو حکومتیں قائم ہوئیں (یعنی عادل شاہی ، نظام شاہی ، عماد شاہی ، قطب شاہی ، برید شاہی ، اور خاندیس کے فاروقی سلاطین) اُن کا مختصر حال ہے - آخر میں سلاطین تیموریہ کا ذکر سنہ ۱۲۰۰ ھ تک ہے - یہ نام بھی تاریخی ہے ، جس سے سنہ تالیف ۱۲۰۰ ھ نکلتا ہے - یہ کتاب حیدرآباد کے رزیڈنٹ مسٹر رچرڈ جانسن کے نام معنون ہے —

—— (مآثر آصفی) ——

یہ خاندان آصف جاہ کی تاریخ ہے ، یعنے خواجہ عابد (نظام الملک آصف جاہ اول کے دادا) سے لے کر آصف جاہ ثانی تک کے حالات ہیں ، مرہٹوں نے جو ہندوستان پر حملہ کیا تھا اس کا بھی ذکر ہے - نیز اس زمانے کے امرا اور راجاؤں کے حالات بھی لکھے ہیں - یہ کتاب سنہ ۱۲۰۸ ھ میں تالیف ہوئی —

—— (بساط الغنائم) ——

یہ مرہٹوں کی تاریخ ہے - اور یہ کتاب اس نے سر جان ملکم کی فرمائش سے لکھی ، جو اس وقت حیدرآباد میں تھے ، اس میں مرہٹوں کی تاریخ ابتدا سے مؤلف کے وقت تک کی ہے - اس کا ایک حصہ ' شفیق ' نے کسی مرہٹی تاریخ سے ترجمہ کیا ہے - نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۱۴ ھ نکلتا ہے —

—— (حالات حیدرآباد) ——

اس میں بلدۂ حیدرآباد کی مساجد ، محلات و باغات اور شہر کی مختصر تاریخ ہے ، بیدر اور ورنگل کے حالات بھی درج ہیں - یہ کتاب بھی سنہ ۱۲۱۴ ھ کی تالیف ہے —

——

تذکرے

—— (شام غریباں) ——

یہ تذکرہ اُن ایرانی شعرا کا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے ہندوستان میں وارد ہوے - نام بھی مضمون کی مناسبت سے رکھا ہے - اگرچہ حالات بہت مختصر ہیں ' مگر کتاب دلچسپ ہے اور اشعار کا انتخاب خوب ہے - لطائف و ظرائف سے خالی نہیں - بعض بعض جگہ اشعار کے متعلق خاص نکات بھی بیان کر دیے ہیں —

——(گل رعنا)——

یہ ہندوستان کے فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے ' اس میں وہ ایرانی نژاد بھی ہیں جن کے باپ دادا ہندوستان میں آءے اور یہیں رہ گئے اور ہندی نژاد بھی - اس میں دو فصلیں ہیں : ایک میں " شعراے اسلامیاں " کا اور دوسری میں "نکتہ پردازان اصنامیاں" کا تذکرہ ہے - یہ تذکرہ "شام غریباں" سے بہت بڑا ہے ' اور اکثر حالات بھی مفصل بیان کئے ہیں- اپنے استاد 'آزاد' بلگرامی کا تذکرہ تفصیل سے لکھا ہے- 'اکبر' کا حال کوئی ۴۶ صفحوں میں ہے ' مگر سب ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ سے ماخوذ ہے - افسوس کہ 'شفیق' نے اس میں تحقیق سے مطلق کام نہیں لیا- وہ اس مورخ کے ادعاے راست گوئی کو اس کے جذبات تعصب و حسد و رشک سے جدا نہ کرسکے - علامہ ' فیضی ' کے حالات بھی بلا کم و کاست بدایونی سے نقل کردیے ہیں- 'شفیق ' بدایونی کو بالکل نہیں سمجھے —

' شام غریباں ' کے مقابلے میں اس تذکرے میں تاریخی واقعات اور لطائف و ظرائف بھی زیادہ ہیں - بعض بعض مقامات پر اشعار کی شرح بھی کردی ہے اور ان کے نکات بھی بتادیے ہیں- مثلاً میر محمد افضل الہ آبادی ' ثابت ' کے ایک قصیدے میں کثرت سے طبی تلمیحات و اصطلاحات ہیں' اس کے اشعار نقل

کرکے ان تمام تلمیحات و اصطلاحات کی شرح لکھی ھے - اسی شاعر کا ایک دوسرا معرکے کا قصیدہ ھے ' اس کا انتخاب درج کیا ھے اور اس کے مشکل مقامات کا حل بھی لکھ دیا ھے - یہ تذکرہ ھر لحاظ سے قابل قدر ھے —

—— (چمنستان شعرا) ——

یہ ریختہ گو شعرا کا تذکرہ ھے - ' شفیق ' لکھتے ھیں کہ " جب ھندوستان سے تازہ تازہ میر محمد تقی ' میر ' اور فتح علی خاں کے تذکرے پہنچے تو سارے عالم میں غلغلہ پڑگیا اور اشعار ھند کے اشتیاق میں ایک دنیا تہ و بالا ھوگئی ' کیونکہ اھل دکن کو ان اشعار کا بہم پہنچنا دشوار ھے - اس لئے میری فکر ناقص میں یہ بات آئی کہ ان دونوں تذکروں کے اشعار اور اور دوسرے جواھر پارے ان کے ساتھ ملا کر ایک سفینہ تیار کروں - اس تقریب سے بعض احباب سخن داں کے حالات و کلام کے جمع کرنے کا موقع بھی مل جاے گا - دوست احباب نے بھی اس کی تائید کی بلکہ اصرار کیا اور میں اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ ھوگیا '' —

' شفیق ' نے اس تذکرے کی ترتیب میں عجیب جدت دکھائی ھے - اب تک جتنے فارسی اردو کے تذکرے لکھے گئے ھیں (سواے میر صاحب کے تذکرے کے ' جس میں کوئی ترتیب نہیں) ان میں ناموں کی (یعنی تخلصوں کی) ترتیبؔ حروف تہجی کے لحاظ سے ھے ' لیکن ' شفیق ' نے اس تذکرے کی ترتیب حروف ابجد یعنے حساب جمل کے لحاظ سے رکھی ھے - اس میں کوئی خاص خوبی نہیں معلوم ھوتی ' نہ خود مؤلف نے اس کی کوئی وجہ بتائی ھے - سوا اس کے کہ جوانی کی ترنگ کہا جاے اور کیا کہہ سکتے ھیں —

جوانی کا زمانہ ھے ' عبارت میں رنگینی پائی جاتی ھے ' بعض اوقات تشبیہات و استعارات میں باتیں کرتے ھیں - جہاں کہیں موقع ملتا ھے' شاعر کے تخلص یا اس کے پیشے وغیرہ کی مناسبت سے اُسی قسم کے الفاظ اور تشبیہات

میں اس کا حال لکھنا شروع کردیتے ھیں (مثلاً ملاحظہ ھوں : آشنا ' آوارہ ' بہار داؤد ' خاکسار ' زکی ' محمد علی حشمت ' مخلص ' ناطق وغیرہ کے حالات) لیکن عبارت گنجلک نہیں ' بیان صاف اور شستہ ھے اور زبان پر قدرت ھے - کہیں کہیں میر صاحب (میر تقی) کی طرح اصلاح بھی دے دیتے ھیں - یا شعر میں کوئی کنایہ یا خاص نکتہ ھوتا ھے تو اُس کی طرف بھی اشارہ کردیتے ھیں ' جس سے ' شفیق ' کی سخن فہمی اور سخن سنجی کا اندازہ ھوتا ھے —

اگرچہ ' شفیق ' نے اپنے تذکرے کی بنیاد میر صاحب اور فتح علی کے تذکروں پر رکھی ھے لیکن ان کے علاوہ جہاں جہاں سے جو جو حالات مل گئے ھیں حوالے کے ساتھ اُن کا بھی اضافہ کردیا ھے - چنانچہ کتاب کے مطالعے میں بعض جگہ شاہ عبدالحکیم ' حاکم ' کے تذکرۂ ' مردم دیدہ ' اور تذکرۂ ' مجمع النفائس ' تالیف سراج الدین خان آرزو ' سرو آزاد ' اور حاجی علی ' اکبر ' رمّال اور رضا خان ' انوار ' کی بیاضوں کا حوالہ ملے گا —

بعض اوقات اشعار کے متعلق مغالطہ ھوجاتاھے اور یہ دیکھنے میں آیا ھے کہ بعض اشعار خصوصاً مشہور اشعار مختلف شعرا کے کلام میں پائے جاتے ھیں ' ' شفیق ' نے اس باب میں بڑی احتیاط اور تحقیق سے کام لیا ھے - جن اشعار کا پتا نہیں چلا وہ تذکرے کے آخر میں جمع کر دیے ھیں کہ ان کا پتا چلانا دشوار ھے' خصوصاً اھل دکن کے لئے ' کیونکہ ایک ھی تخلص کے کئی کئی شاعر ھیں - ھندوستان سے اشعار اکثر صرف تخلص کے ساتھ آتے ھیں - اور نادان پڑھنے والے سب کو خلط ملط کر دیتے ھیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ھو جاتا ھے کہ یہ شعر حقیقت میں کس کا ھے —

' شفیق ' ھر شاعر کے تذکرے میں انصاف کو ملحوظ رکھتا ھے اور کبھی کسی پر ناگوار نکتہ چینی نہیں کرتا - چنانچہ ' یقین ' کے بیان میں خود لکھتا ھے کہ " جب کسی شاعر کے کلام میں کوئی ثقیل مصرع نظر پڑا تو خود ایک

دوسرا مصرع لکھ دیا ہے اور ساتھ ہی یہ کہہ دیا ہے کہ یہ مصرع بھی خوب معلوم ہو تا ہے"- اپنے مصرع کو ترجیح نہیں دی ' بلکہ پڑھنے والے کی پسند پر چھوڑ دیا ہے —

لیکن ' یقین ' کا تذکرہ مستثنی سمجھنا چاھئے - اس میں اس نے اس قدر مبالغے بلکہ غلو سے کام لیا ہے کہ خلاف عادت ' شفیق ' کو اپنی طبیعت پر قابو نہیں رہا ' وہ اسے اردو کا سب سے بہتر شاعر خیال کرتا ہے اور ہند و دکن میں کسی کو اس کی ٹکر کا نہیں سمجھتا - کہتا ہے کہ " اگر چہ میرزا سودا کا غزل ' رباعی ' مخمس ' مثنوی ' قصیدے ' قطعہ بند وغیرہ میں بڑا رتبہ ہے ' اور وہ بہت عالی تلاشی کرتے ہیں ' لیکن ' یقین ' کے ریختے میں کچھہ اور ہی فصاحت و ملاحت ہے :-

اگر ہزار برس تک یہ میرزا ' سودا '
کرے جو فکر تتبع ' یقین ' کا از دل و جاں
کہے گا معنی باریک و خوب و شیریں تر
ولے نزاکت و یہ لطف و یہ قبول کہاں ؟

وہ یکتائے عصر اور یگانۂ زمانہ ہے اور ایسا معنی آفریں اور نکتہ رس دنیا میں پیدا نہیں ہوا " - میر صاحب نے اپنے تذکرے میں جو ' یقین ' پر طعن و تعریض کی ہے اور اسے " متبدل بند " کہا ہے اور سرقے کا الزام لگایا ہے تو اس پر ' شفیق ' آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور میر صاحب کو خوب سخت سست کہتا ہے ' ' سودا ' نے جو میر صاحب کی ہجو کہی تھی ' اسے نقل کرکے اُس کی داد دیتا ہے - اس کے بعد ' توارد ' و ' سرقہ ' پر بحث کی ہے ' دوسرے علما کے اقوال نقل کئے ہیں اور خود اپنا قطعہ بھی جو اس مضمون پر لکھا ہے نقل کیا ہے - غرض میر صاحب کے خلاف خوب زہر اُگلا ہے اور خود میر صاحب کے ذکر میں بھی اُن کی حرف گیری پر چوٹ کی ہے —

غرض ' یقین ' کی شاعری کا بہت بڑا مداح اور معتقد ہے اور اُس کی تقلید کو فخر سمجھتا ہے - اپنے کلام میں کہیں کہیں اس کا اشارہ کیا ہے - مثلاً ایک غزل کا مقطع ہے :

دیوان ' یقیں ' خوش خط ' صاحب' نے لکھا یاہے
اوراق طلائی پر کھینچی ہیں کی تحریریں

یقین کا تذکرہ اور کلام تقریباً ۹۴ صفحوں میں درج ہے - اسی سے قیاس ہو سکتا ہے کہ وہ اس شاعر کو کیاسمجھتا تھا —

حاجی میر علی اکبر رمال ' حاجی ' سے ' شفیق ' نے رمل وغیرہ کی تحصیل کی تھی - ' حاجی ' کے تذکرے میں خود بھی اپنے اظہار کمال کے لئے ایک زائچہ دیا ہے ' جس سے عام ناظرین کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی ' اِسے ایک نوجوان طالب علم کا شوق نمود و نمائش سمجھنا چاھئے —

'شفیق ' کا تذکرہ میر صاحب اور فتح علی کے تذکروں سے بڑاھے اور بہت سے ایسے شعرا کا تذکرہ درج ہے ' جو ان دونوں میں نہیں پایا جاتا - بہت سے ایسے ہیں جو 'شفیق' کے ہم عصر ہیں اور جن سے اس کی ذاتی ملاقات ہے اور خود ان شاعروں سے اُن کا منتخب کلام لے کر درج تذکرہ کیا ہے - ایسے حالات خاص طور پر قابل اعتبار ہیں —

سب سے قابل تعریف بات یہ ہے کہ 'شفیق' نے یہ تذکرہ ۱۸ برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا اور بغیر کسی کی مدد کے بہت تھوڑے عرصے میں ختم کر دیا - اس عمر میں ایسی اچھی کتاب کا تالیف کرنا اعجاز سے کم نہیں' اس سے ' شفیق' کی غیر معمولی ذھانت اور لیاقت معلوم ہو تی ہے - کتاب کا نام " چمنستان شعرا " تاریخی ہے اور اس سے ۱۱۷۵ھ سن تالیف نکلتا ہے —

جہاں تک تحقیق کیا گیا ' اس تذکرے کا صرف ایک ہی نسخہ ہے' جو کتب خانۂ آصفیۂ سرکار عالی حیدر اباد میں ہے اور یہ بھی کرم خوردہ ' فرسودہ اور

مشکوک ہے - یہ اسی نسخے کی نقل ہے - اس کی تصحیح میں بیحد دقت اُٹھانی پڑی ' بعض عبارتیں اصل کتب ہے ' جو اس کا ماخذ ہیں ' صحیح کرنی پڑیں ' کہیں قیاس سے کام لینا پڑا اور بعض بعض مقام پر کچھ الفاظ جو کتاب کے ازلی کیڑے چٹ کر گئے ہیں' ویسے ہی چھوڑنے پڑے اور اُن کی جگہ نقطے دے دیے ہیں ' بہت سے اشعار جو تذکرے میں مشکوک یا کرم خوردہ تھے ' شعرا کے اصل دیوانوں سے تلاش کر کے لکھے گئے - بعض الفاظ جو مشتبہ تھے اور ان کی صحت نہ ہو سکی' ان کے سامنے استفہام کی علامت لکھ دی گئی ہے - اس کے بعد بھی ممکن ہے کہ غلطیاں رہ گئی ہوں ' اگر دوبارہ اشاعت کی نوبت آئی تو جہاں تک ممکن ہوگا اصلاح کی کوشش کی جاے گی —

ایک کام اس کی ترتیب میں اور کیا گیا ہے' جسے غالباً ناظرین پسند فرمائیں گے ' یعنی ' تحفۃ الشعرا ' تالیف افضل بیگ خاں قاقشال اورنگ‌آبادی (سنہ تالیف ۱۱۶۵ ھ) سے اُن ریختہ گو شعرا کا حال اور کلام جو ' شفیق ' کے ہاں بھی پاے جاتے ہیں حاشیے میں درج کردیا ہے - جن جن شاعروں کا اس میں اُردو کلام نہیں وہاں صرف حالات ہی لکھ دیے گئے ہیں اور جہاں حالات میں کوئی نئی بات نہیں ہے وہاں صرف کلام پر اکتفا کیا گیا ہے - مشترک کلام ہر جگہ خارج کردیا گیا ہے - بعض شاعر ایسے بھی ہیں ' جن کا ذکر ' چمنستان' میں نہیں ہے ' اُن کا حال اور کلام ہر حرف کے آخر میں درج کردیا گیا ہے - اس سے پڑھنے والوں کو ضرور بصیرت ہوگی اور وہ ' تحفۃالشعرا ' کے مطالعے سے مستغنی ہو جائیں گے - یہ تذکرہ 'چمنستان' سے پہلے کا لکھا ہوا ہے- اصل میں یہ تذکرہ فارسی گو شعرا کا ہے' اس میں ضمناً ایسے شعرا بھی آگئے ہیں جو اُردو میں بھی شعر کہتے تھے بعض شعرا کے حالات اس میں کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں —

—— (شفیق کا کلام) ——

'شفیق' کے اُردو کلیات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پر گو شاعر تھا ' زبان پر قدرت تھی اور شاعری کے نکات سے خوب واقف تھا - اور اس کا کلام شعر کی تقریباً ہر صنف میں موجود ہے - اگرچہ وہ اردو کا اعلیٰ درجہ کا شاعر نہیں ہے مگر اوسط درجے کے شعرا میں اس کا پایہ بہت بلند ہے - غزلوں کے علاوہ قصیدوں اور مثنویوں میں خوب زور دکھایا ہے - شہر آشوب ' واسوخت ' مخمس ' مثلث ' رباعیاں اور تضمینیں بھی لکھی ہیں - ان نظموں سے کہیں کہیں ' شفیق ' کے ذاتی حالات کا پتا چلتا ہے - مثلاً ' شفیق ' نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے فرزند میر احمد علی خاں عالی جاہ کے متوسلین میں سے تھے - یہ بڑے قدر داں اور ' مہزور ' رئیس تھے اور ' شفیق' کو انھیں کی سرکار سے تعلق تھا - ان کی مدح میں اس نے کئی قصیدے لکھے ہیں - چنانچہ ایک قصیدے میں صاف صاف نام اور پتا بتا دیا ہے :—

یک زبردست ہے مرا والی

یک قوی دل مرا ہے پشت و پناہ

حق و باطل ہے سامنے جس کے

یوں عیاں جس طرح سفید و سیاہ

یعنے نواب میر احمد خاں

اسدالملک حضرت عالی جاہ

باپ جس کا نظام دولت و دیں

جد ہے جس کا جناب آصف جاہ

ایک دوسرے قصیدے میں لکھتے ہیں :

جناب پاک یعنے میر احمد خاں عالی جاہ

کہ جس کی عمر و دولت کا نگہباں ایزد سبحاں

آگے چل کر سفر میں رہنے کی صعوبت اور اپنے ضعف کی شکایت کی ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی ملازمت ایسی تھی' جس میں دورہ کرنا پڑتا تھا - چنانچہ کہتے ہیں :—

مگر فضل خداوندی مری اب دستگیری کر
نشست شہر فرماوے عنایت کر کے فیم ناں

آخر میں اپنے لڑکے کے لیے درخواست کی ہے :—

مدد خرچ اب مرا دستخط ہوے اس بندہ زادہ کو
تعیں ہو ڈیوڑھی کا بلدہ کی جب تک کہ ہے ناداں

ایک اور قصیدے میں بھی اپنے آقا کا نام اور خطاب کا ذکر کیا ہے :—

چراغ دودۂ حیدر جناب میر احمد خاں
کہ جس کے جد کے تیں چرخ بریں سے ذوالفقار آءی
وو اسدالملک اسداللہ اس کا بانبہ بل ذت ہے
کہ جس کی دھاک سے شیروں کو تب بے اختیار آوی
نظام الدولہ آصف جاہ کا فرزند ارشد ہے
کہ دولت جس کے در پہ جبہہ سا امیدوار آءي

ایک صاحب سے ' شفیق ' کو بے حد الفت ہے اور اکثر غزلوں میں انتہاے محبت سے " میرا میاں میرا میاں " کر کے اُسے یاد کیا ہے - بعض غزلیں کی غزلیں اس کی یاد میں (" میرا میاں " کی ردیف میں) لکھہ ڈالی ہیں - ایک قصیدہ بھی اسی ردیف میں لکھا ہے اور بڑے شوق اور محبت سے اس کا ذکر کیا ہے - جس کے دوچار شعر یہ ہیں :-

ہے مرا ایماں و جاں میرا میاں — مجکو ہے ورد زباں میرا میاں
انتظاری کی نہیں طاقت مجھے — جلد آ میرے میاں میرا میاں
گُل ملے بلبل کو اور قمری کو سرو — میرے تیں میرا میاں میرا میاں

ایک غزل میں معمے کی طرز میں نام بھی بتا گئے ھیں اور وہ نام " شکرو میاں " ھے —

'ذکا' (سید امتیاز خاں) سے بھی اپنی عقیدت کا بار بار اظہار کیا ھے:-

عقیدت ھے 'ذکا' سے میرے تیں از بسکہ اے 'صاحب'

مجھے ورد زباں ھے رات دن یا پیر یا ھادی

ایک دوسری غزل کے مقطع میں کہتے ھیں :

یک آن جدائی نہ ھو 'صاحب' سے 'ذکا' کو

اللہ کرے میری جو نیت ھے بر آوے

'شفیق' کو ادبی تحقیق و نکات سے خاص ذوق تھا۔ توارد پر جو بحث اس نے کی ھے اور ایک غزل کے ضمن میں جو قطعہ توارد پر لکھا ھے وہ سب اس تذکرے میں موجود ھے۔ اردو کلیات میں ایک قصیدہ نظر پڑا جس کا مطلع یہ ھے:-

ساقی اس ابر مشک فام کو دیکھ   اِس طرف دیکھ مے کے جام کو دیکھ

کچھ شعر لکھنے کے بعد گریز کی ھے اور الفاظ کے متحرک و ساکن ھونے کی بحث کا ذکر کیا ھے۔ معلوم ھوتا ھے کہ اُن کے ایک ھم عصر " مفتوں " نے ان کے ایک لفظ پر اعتراض کیا تھا۔ اس کا جواب دیا ھے۔ 'شفیق' نے ختم (بسکون تا) کو ختم (بہ فتح تا) لکھ دیا تھا۔ معترض کی تردید اور اپنی تائید میں یہ اشعار لکھے ھیں:-

گر ختم کہوے ختم کو " صاحب "   ھے روا حرکت مقام کو دیکھ

ریختہ کی زباں میں یہ غلطی   ابتدا سے ھے انتظام کو دیکھ

'آبرو' زلف کو زلف بولا   اور الفاظ نا تمام کو دیکھ

نقل ھے وقت مغرب 'اعظم شاہ'   یوں کہا اپنے یک غلام کو دیکھ

ھووے " اسواری " اس گھڑی تیار   سیر چاھے ھے جی پہ شام کو دیکھ

مولوی 'جیون' اوستاد شاہ   تب کہے یوں تو اس پیام کو دیکھ

لفظ 'اسواری' نیں سواری ہے کچھہ تو اس صحت کلام کو دیکھہ
شاہ نے تب تو یہ جواب دیا: میری طرز سخن تمام کو دیکھہ
یہ عبارت کہا میں ھندی میں اس میں جائز ہے تو نظام کو دیکھہ

'شفیق' کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ عربی کے جو لفظ عام طور پر اُردو میں بہ تبدیل حرکت وغیرہ بولے جاتے ھیں اور جو زبان زد خاص و عام ھوگئے ھیں وہ اسی طرح فصیح ھیں' خواہ وہ اصل لغت کے اعتبار سے غیر صحیح کیوں نہ ھوں۔ ھر زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ داخل ھوتے ھیں تو لہجے کے تغیر سے کچھہ نہ کچھہ تبدیلی ضرور ھوجاتی ہے —

علاوہ غزلوں اور قصیدوں کے 'شفیق' کا زور کلام دیکھنا ھو تو اُن کی مثنوی "تصویر جاناں" دیکھنی چاھیے جو رسالۂ 'تجلی' حیدرآباد دکن میں شائع ھو چکی ہے۔ اس میں بڑا زور سراپا کے بیان میں دکھایا ہے۔ اگرچہ یہ مضمون بہت پامال ہے اور ھمیشہ بھونڈا اور بے مزہ ھو کر رہ جاتا ہے اور یہی حال اس مثنوی کے سراپا کا بھی ہے' تاھم اس سے 'شفیق' کی قادر کلامی کا اندازہ ھوتا ہے —

اگر کوئی 'شفیق' کے نام اور حال سے واقف نہ ھو اور اس کا کلام پڑھے تو کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا لکھنے والا ھندو ہے۔ وہ تمام بزرگان دین اسلام کا ذکر اُسی ادب' احترام اور عقیدت سے کرتا ہے' جیسے کوئی سچا اور پکا مسلمان - اور یہ کوئی تصنع سے نہیں بلکہ در حقیقت دل سے اور عقیدت سے ہے۔ معراج کے بیان میں جو مثنوی لکھی ہے اور جو "اردو" میں شائع ھوچکی ہے' اُسے دیکھئے' کوئی مسلمان اس سے بڑہ کر کیا لکھے گا۔ اردو کلیات میں ان کے متعدد قصیدے حضرت علی کی شان میں ھیں۔ امام آخرالزماں کی منقبت میں کئی قصیدے ھیں۔ ایک قصیدہ حضرت غوث‌الاعظم جیلانی کی مدح میں ہے۔ ایک حضرت گیسو دراز بندہ نواز کی

تعریف میں - علاوہ ان قصائد کے اُن کے تمام کلام میں جہاں کہیں مسلمانوں کے بزرگوں اور اولیا کا ذکر آتا ھے تو وہ اُن کا نام اور ذکر اسی عقیدت اور ارادت سے کرتا ھے جیسے مسلمان - اس کے کلام میں اسلامی تلمیحات کثرت سے آتی ھیں ' بر خلاف اس کے ھندو دیوتاؤں وغیرہ کا ذکر شاذ ھی کہیں آیا ھو تو آیا ھو - یہ تعلیم ' صحبت ' ماحول اور اس زمانے کے اقتضا کا اثر تھا - آج کل کے لوگوں کو شاید یہ چیزیں پڑھ کر حیرت ھو ' لیکن یہ اُس زمانے کی یادگاریں ھیں ' جب ھندو مسلمان بھائی بھائی کی طرح رھتے سہتے تھے اور کسی کو کسی سے پر خاش نہ تھی - یہ خوش حالی ' امن و آزادی اور ترقی کی شان تھی - جب افلاس کا منحوس قدم آیا تو جہالت ' تنگ دلی ' تعصب اور نا عاقبت اندیشی نے ایسا اندھا کردیا کہ وہ اپنے پاؤں پر خود کلھاڑی مارنے لگے - ایک دن آے گا کہ وہ اپنے کئے پر پچھتائیں گے اور گلے مل مل کر اپنے آنسوؤں سے اس داغ کو دھوئیں گے —

' شفیق ' نے " حسب حال زمانہ " کے عنوان سے ایک شہر آشوب بھی لکھا ھے ' جس کے ابتدائی چند شعر یہ ھیں :—

ایک دن دل نے کہا مجھ سے کہ 'صاحب' سن اِدھر
کیوں ریاست دن بدن ایسی ذلیل اور ھے بتر
اس دکن کے بیچ چھہ صوبوں کے چھہ تھے بادشاہ
عادل اور فیاض ' صاحب عزم اور صاحب ھنر
اُن کی دولت میں مرفہ اور سبھی خوش حال تھے
کیا رعیت' کیا سپاھی' کیا امیر نامور
آسماں وو ھی ھے اور وو ھی زمیں ' خلقت ھے وو
پھر ھوئی کس واسطے یہ زندگانی مختصر

شامت نیت ھے یا تدبیر میں ھے کچھہ قصور

تب تو دشواری پڑي ھے ھر کسی کو اس قدر

زمانے کی یہ شکایت ھر عہد میں رھی ھے اور رھیگی - آسمان نے ھزاروں رنگ بدلے' دنیا نے سینکڑوں پلٹے کھائے' مگر انسان کي شکایت کم نہ ھوئی - بے عیب نہ کوئی کتاب ھے' نہ کوئی آدمی ' نہ کوئی نظام ھے اور نہ کوئی زمانہ - یہ نقص کسی نہ کسی صورت میں رھتی دنیا تک رھے گا - بلاشبہ انسان کے کمال کی آزمائش اسی میں ھے —
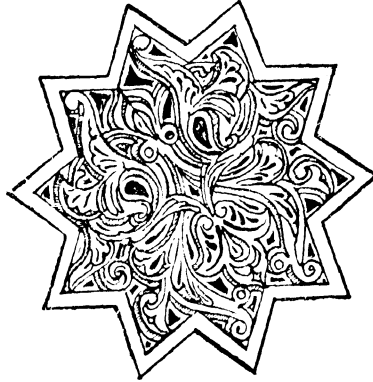
قدیم اردو

حسن شوقی

از

(اڈیٹر)

---

(۱)

حسن شوقی عادل شاہی شعرا میں سے ہے اور سلطان محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ تا سنہ ۱۰۶۷ ھ) کے عہد میں تھا - اس کا پتا اس بات سے لگتا ہے کہ اس نے ایک نظم " میزبانی نامۂ سلطان محمد عادل شاہ " لکھی ہے، جس کا ذکر آگے آے گا - افسوس ہے کہ اس کا حال مجھے کسی تذکرے میں نہیں ملا - لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ اپنے زمانے کے مشہور شعرا میں سے تھا - چنانچہ ابن نشاطی نے اپنے قصۂ پھولبن کے آخر میں جہاں چند مشہور اور نامور دکنی شعرا کا ذکر کیا ہے، وہاں حسن ' شوقی ' کا بھی نام لیا ہے —

حسن شوقی اگر ہوتا فی الحال ہزاراں بھیجتا رحمت منج اپرال

پھولبن کا سنہ تصنیف ۱۰۶۶ ھ ہے - معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حسن شوقی کا انتقال ہو چکا تھا —

علاوہ غزلیات کے مجھے حسن ' شوقی ' کی دو نظمیں ملی ہیں - ایک

"فتحنامۂ نظام شاہ" یا " ظفر نامۂ نظام شاہ" اور دوسری " میزبانی نامۂ سلطان محمود عادل شاہ" ۔ فتح نامے یا ظفر نامے کے میرے پاس دو نسخے ہیں، جن میں سے ایک نسخہ ناقص ہے ۔ ناقص نسخے کے آخر میں اشعار زائد ہیں ۔ ان میں فتح کا سنہ بھی دیا ہے اور نظام شاہ کو بہت بہت دعائیں دی ہیں ۔ جیسے کوئی زندہ شخص کو دعائیں دیتا ہے، مثلاً :

سدا جیو راجے جلم راج کر   بسے لگ دنیا نت نیا کاج کر
مبارک ظفر آسمانی اچھو   تجے فتح نصرت سبحانی اچھو

یہ فتح سنہ ۹۷۲ھ میں ہوی اور ظاہر ہے کہ اس وقت شوقی زندہ نہیں تھا ۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ اشعار الحاقی ہیں ۔ اسی نسخے کے آخر شعر میں شاعر کا تخلص بھی ہے ۔ دوسرے نسخے میں یہ شعر نہیں ہے —

یہ جنگ جس کی فتح اس مثنوی میں منائی گئی ہے، تالی کوٹ کی مشہور لڑائی ہے ۔ اس کا مختصر قصہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں وجیا نگر کی حکومت نہایت شان و شوکت کی تھی ۔ رام راج نے تمام باغی راجاؤں کو مغلوب کر لیا تھا اور اس کی سلطنت کرشنا سے لیکر راس کماری تک پھیلی ہوی تھی اور رفتہ رفتہ گوداوری کے دہانے تک پہنچ گئی تھی ۔ اور بہت سے راجا اس کے باج گزار تھے ۔ اس وقت جنوب میں رام راج سے بڑھ کر کوئی طاقتور اور زبردست راجا نہ تھا اور اس کی دولت اور شان کی کوئی انتہا نہ تھی ۔ بہمنی سلطنت کے زوال پر جو مسلمان حکومتیں اس کی جگہ قائم ہوئیں، ان کی باہمی نزاع سے وجیا نگر کی قوت اور بڑھ گئی اور کرشنا اور تنگ بھدرا کا دوآبہ بھی ایک طرح سے رام راج ہی کے زیر اثر آ گیا ۔ اس قوت اور عروج کے گھمنڈ پر رام راج نے طرح طرح کی دست درازیاں شروع کیں ۔ تالی کوٹ کی جنگ سے چند سال قبل رام راج نے عادل شاہ سے مل کر نظام شاہ کو سخت شکست دی اور اس کے سارے ملک کو تباہ و برباد کر دیا ۔ نظام شاہ مجبور ہو کر اپنے دارالحکومت احمد نگر میں

محصور ہو گیا - یہاں رام راج اور اس کے سرداروں نے بہت بد عنوانیاں کیں - مسجدیں توڑ ڈالیں ، مشائخ قتل کردیے گئے ، عورتوں کی آبرو ریزی کی اور اسی قسم کی شرمناک حرکتوں کے مرتکب ہوے - مسلمان بادشاہ اس سے بہت برافروختہ ہوے - لیکن اس سے بھی بڑھ کر جو بات ان بادشاہوں کو ناگوار خاطر تھی وہ رام راج کا غرور و تکبر تھا - وہ پہلے کی طرح کبھی اُن سے خلوت میں نہ ملتا اور جب کبھی دربار میں بلاتا تو سیدھے منہ بات نہ کرتا اور دیر تک کھڑا رکھتا - سواری کے وقت انھیں ساتھ ساتھ پیدل چلاتا ، جب اجازت دیتا تو سوار ہوتے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی عادل شاہ ، ابراھیم قطب شاہ، نظام شاہ اور برید شاہ نے متحد ہو کر اس پر لشکر کشی کی - رام راج کو اپنی قوت اور دولت پر اس قدر گھمنڈ تھا کہ اس نے اس کی مطلق پروا نہ کی - وہ سمجھتا تھا کہ اِن چھوکروں کو ایک ہی حملے میں پسپا کردوں گا - اگرچہ بہت بڈھا تھا مگر خود میدان کار زار میں پہنچا - بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی - مختصر یہ کہ رام راج اسی میدان میں مارا گیا اور وجیا نگر کی پر شان و شکوہ سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا —

' شوقی ' نے اس جنگ کا حال شاعرانہ طرز پر لکھا ہے - لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا نام " فتح نامۂ نظام شاہ " کیوں رکھا ہے - وجہ یہ ہے کہ ایک تو حسین نظام شاہؒ کو رام راج بہت ذلیل کر چکا تھا اور وہ انتقام کی فکر میں تھا - دوسرے نظام شاہ نے اس جنگ میں بڑی دلیری اور شجاعت دکھائی - قلب لشکر اسی کے زیر کمان تھا - جب ہندوؤں کی فوج نے یمین ویسار سے ایک شدید حلہّ کیا تو مسلمان فوج کے پانو اکھڑ گئے - اس سے علی عادل شاہ اور قطب شاہ پر مایوسی چھا گئی اور انھوں نے بھاگنے کی فکر کرنی شروع کی - مگر نظام شاہ قلب لشکر میں برابر جما رہا اور اس زور سے غنیم کے حملے کا جواب دیا کہ رام راج کے لشکر میں کھلبلی پڑ گئی - شامت اعمال سے یہ

دیکھ کر راجا تخت سے اُتر کر پھر سنگھاسن میں سوار ہو گیا کہ اتنے میں نظام شاہ کا ایک مست ہاتھی غلام علی نامی وہاں آ پہنچا اور آدمیوں کو پامال و ہلاک کرنے لگا۔ کہار (بھوئی) اِس پریشانی میں سنگھاسن پٹک کر بھاگ نکلے۔ اتنے میں کہ راجا سنبھلے سنبھلے مسلمان فوج کا ایک دستہ آ پہنچا اور وہ اُسے پکڑ کر نظام شاہی توپ خانے کے افسر رومی خاں کے پاس لے گئے۔ رومی خاں نے نظام شاہ کے حضور میں پیش کیا۔ نظام شاہ نے فوراً حکم دیا کہ اس کا سر قلم کر کے نیزے کی نوک پر چڑھایا جائے اور مشتہر کیا جائے تاکہ غنیم کو حقیقت حال معلوم ہو جائے۔ اس لحاظ سے بھی فتح کا سہرا نظام شاہ ہی کے سر رہا۔ یہی وجہ ہے کہ 'شوقی' نے اس فتح کو نظام شاہ سے منسوب کیا اور اپنی نظم کا نام "فتح نامۂ نظام شاہ" رکھا —

شروع میں چند شعر حمد میں ہیں:

الٰہی کرم کا کرنہار توں ہے اوّل و آخر رکھنہار توں
سو قادر ہے قائم تو پروردگار توں نادر ہے دائم اپیں برقرار
کیا ہور کرتا کرے کا سو ہوئی ترے باج ہرگز کرے نا کوئی

دو چار اور شعر لکھنے کے بعد دو شعر نعت میں ہیں اور اس کے بعد آغاز جنگ شروع ہو جاتا ہے۔ پہلا عنوان یہ ہے:

"شروع جنگ کردن رام راج و نظام شاہ و عادل شاہ و قطب شاہ و برید شاہ"

ابتدا میں شاعر بیان کرتا ہے کہ دنیا میں کیسے کیسے شجاعت اور دولت اور نام والے لوگ ہوئے ہیں، جن کی شہرت اور کار نامے اب تک یاد گار ہیں۔ اور اس ضمن میں سکندر، نوشیرواں، جمشید، حمزہ، محمود غزنوی، رام چندر، کشن، ارجن، شدّاد، ہامان وغیرہ کے نام گنا تا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ انسان کی خوبی اُس کے افعال سے ہے اور ہر ملک اور قوم میں اچھے لوگ ہوتے ہیں —

سدا ہے سو بھر پور دریا کوں جل شرف ہے سیپی کوں سو موتی بدل

شرف مرد کا ہے چلنت خوب خاص　　جو پھولوں کی خوبی سوں پھولوں کی باس
ہر ایک ملک میں نیک رفتار ہے　　ہر ایک قوم میں نیک گفتار ہے

اس کے بعد ہر ملک کی خاص خاص خوبیاں بیان کرتا ہے اور ملک دکن کو سب سے افضل ٹھیراتا ہے :

خراساں کے شاہاں ہیں شمشیر بند　　روہیلے پٹھاناں و گرزی کمند
عرب ہور عجم ملک لڑنے کو زور　　وو رایل جیتے راج ہیں دزد چور
وو حکمت کرا ملک ہے روم و شام　　طرف کربلا کے شہیداں تمام
وو ایران و توران ہور ملک سند　　اہیں پڑ عقل بادشاہان ہند
ہنر کا جیتا لوک ہے مغربی　　وو جامع اہیں گنج کے مغربی
وو قبطی فراست میں ہیں زور ور　　شمالی جیتے بے فہم گاو خر
سو افضل میانا ہے ملک دکن　　ہوے یاں کے شاہاں جیتے خوش لکھن

اب دکن کے بادشاہوں کا ذکر کرتا ہے :

عادل شہ لکھا ویں علی کے غلام　　نظام شاہ بھوی لکھا ویں نظام
عدل داد ہور دے دھش کو اگل *　　کیا بادشاہی سو بازو کے بل
قطب شہ کے گھر میں سدا راجوت +　　بریدی تھے جزوی جیو کے گھت ‡

اس کے بعد آپس میں عہد و پیمان کرنے اور متحد ہوکر رام راج سے لڑنے کا ذکر کرتا ہے :

اپس میں اپیں دوست سب مل ہوے　　محبت سوں اخلاص یک دل ہوے
نزاع دل میں کا دور کیتے نفاق　　اپس میں اپیں مل کئے اتفاق
یو سب مل کے ایسا کئے یک پنا　　جو اِس کفر کو مار کرنا فنا
کئے بھاگ سوگند و عہد استوار　　یو غازی غزا پر ہوے برقرار

---

* بڑھا ہوا ، سبقت لے جانے والا – 　　+ بادشاہی 　　‡ قوی –

نکو تر بلاتی جو شب در میاں * دیکھیں کیا چرخ پھیر ہے آسماں

اس کے بعد دوسرا عنوان یہ ہے :

"راے اندیشیدن رامراج باوزیران خود براے جنگ کردن بہ نظام شاہ"

اس کی ابتدا شاعر نے سورج کے ڈوبنے، رات کے آنے اور چاند کے نکلنے سے کی ہے اور اپنی شاعری کا کمال دکھایا ہے - یہ نظامی وغیرہ فارسی شعرا کی تقلید کی ہے لیکن ہندی الفاظ اور ہندی خیال کی آمیزش نے اسے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے - یہاں چند شعر نمونے کے طور پر لکھے جاتے ہیں :

وو محبوب نس† کی سنواری اپس مرصع زرینا نکاری‡ اپس

سر کو کم و کیسر چوا ہور چندن لیپے مشک کے اونت چندر بدن

کھولے بال سر کے سو کالے دراز سنواری بیٹھے ایکد اپنا سو ساز

وو موتی کگن کے سو تارے ہوئے وو بیس$ پھول سارے ستارے ہوئے

اس منظر کے بیان میں کوئی چوبیس شعر لکھے ہیں، آخری شعر یہ ہیں :

ڈوبی قاب زریں سو غرقاب میں گئی حور زنگی کر ے§ خواب میں

حبش نے پھولاں چیر سر پر لیا ترک دیکھ پر دار سر تل کیا

حبش تی جو پرگٹ ہوا چند روپ حبش نے جنے ترک چینی سروپ

بیٹھا کاگ کالا اوڑیا راج ہنس اوٹھی سیام سندر سو تاراج اونس

پڑیا پھول پر جب بھنور پنکھ پسار چھپا ترک زنگی کھڑا آشکار

بیٹھا؟ دھن اوپر آؤ کر کال جو ہوا سورتل چاند اوبھراں جو

---

* " مترس از بلاے کہ شب درمیان است " کا ترجمہ ہے -

† رات ‡ نکھاری $ سر § کے

؟ مطلب یہ کہ خزانے پر کالا سانپ آبیٹھا، یعنی اندھیرا ہوگیا. سورج غروب ہوگیا اور چاند طلوع ہوا -

اس سمے میں رام راج تخت پر آکر بیٹھتا ھے اور دربار کرتا ھے

بیٹھیا ' رام تب آ سیاسن* اوپر مکٹ† مال گل‡ گھال$ ابرھن§ اوپر
سو تندوت کئے آؤ کر راے سب جتے راے رایل پڑے پاے سب

اب وہ خلوت میں خاص خاص مصاحبوں اور ارکان سلطنت کو بلا کر مشورہ لیتا ھے اور کہتا ھے کہ نظام شاہ نے میرے دل میں گھاؤ ڈال دئیے ھیں ' تمام دنیا میری حکومت کو مانتی اور مجھے خراج دیتی ھے۔ بڑے بڑے راجہ مجھے تھنے بھیجتے ھیں ' لیکن یہ ترک مجھے خاطر میں نہیں لاتا ' نہ یہ دیو کو مانتا ھے نہ پری کو۔ خراج دینا تو درکنار اور ڈراتا اور دھمکاتا ھے - آج چار دانگ عالم میں میرے نام کا ڈنکا بج رھا ھے - اس کی کیا یہ حقیقت ھے - اب تم مجھے سوچ کر مشورہ دو کہ اس معاملے میں کیا کروں

کیا رام خلوت منے انجمن بلایا جتے راے اور راے زن
چندر بھان یلتمویندکتا دھری¶ جاں بہار سوں دھرتری تھرتھری
رتن جڑت چوکی دھریا سامنے کہا بیس☉ مجھ آمنے سامنے
کہیا رخت دولت کے تم تھامب♄ ھیں تمہیں مرد میداں کے رن کھامب♉ ھیں
تمہیں پانچ تن ملکہ♌ یک بدھ کہو تمہیں پانچ جن ملکہ یک سد کہو
بہوت دن تی چھاتی منے سل♋ اھے نظامیا سوں مجھے آج سوندل♆ اھے

اُس کے بعد کا عنوان یہ ھے :

" راے دادن وزیراں رام راج را درباب جنگ نظام شاہ "

سب وزیر اور مشیر یک زبان ھوکر کہتے ھیں کہ آج دنیا میں تیرا وہ

---

* سنگاسن ' تخت † تاج ‡ گلے کا ھار $ ڈالکر

§ جواھرات ' لباس فاخرہ ¶ رام راج کے بھائی کا نام تھا

☉ بیٹھ۔ ♄ تھم ' ستون ♉ کھم ' ستون یعنی جنگ کے ستون -

♌ ملکر ♋ کرب ' بے چینی ' تکلیف ♆ جنگ

زور ہے کہ کسی راجہ یا بادشاہ کی مجال نہیں کہ تیرے سامنے آنکھ اُٹھا سکے۔
تو وہ شہ زور ہے کہ شیر اور سیمرغ تیرے آگے کبوتر کے بچے ہیں - نظام
شاہ بچارے کی کیا حقیقت ہے —

کہاں رام راجا کہاں شاہ حسین
کہاں بحر قلزم کہاں قلتین

تُوں گرمی منے شاہ تی کم نہیں   تُوں سردی منے ماہ تی کم نہیں
اندھارے اجالے کوں تُوں دھوپ چھاؤں   خرابی کو تُو فکرہ و بستی کو گانوں
وو گرمی کرے تُوں تو سردی سوں ٹال   وو سردی کرے تُوں تو گرمی سوں جال†

یہ سب کچھ کہنے کے بعد یہ رائے دی کہ حسین نظام شاہ کو لکھا جائے کہ وہ
نقد و جواہر، اسلحہ، عود و عنبر اور ملک میدان (توپ) وغیرہ وغیرہ بطور خراج کے
بھیجے۔ اس مشورے کے مطابق اب خط لکھنے اور بھیجنے کی تیاری ہوتی ہے —

"نامہ نوشتن رام راج بہ نظام شاہ و طلب کردن بعضے اشیاے عجائب"
نامے کے شروع میں خدا کی حمد و ثنا ہے، اس کے بعد لکھا ہے کہ کفرو اسلام میں کوئی
فرق نہیں، سب میں اس کا جلوہ ہے اور انسان انسان سب ایک ہیں

تُوں شداد ہور عاد نمرود کوں   جدا کر نہ بوجے تُوں معبود سوں
اگر فیل و مور اژدر و بق اہے   ہر یک شے منے مظہر حق اہے
تُوں کرتا ہے انکار کفار سوں   نہ کفار سوں بلکہ کرتار سوں
اہے کفر و اسلام کرتار کا   جو جینے میں تھا گا سو زنار کا
ولے جو ہوا سو موحد ہوا   موحد ہوانیں سو ملحد ہوا
کہے شیخ سعدی نے عالم کو پند   بنی آدم اعضاے یک دیگرند

پھر ہدایت کی ہے کہ تو گائے کا گوشت کھانا چھوڑ دے - مکے کی جگہ

• چٹان   † جلا -

تومل کو سمجھہ اور عرب کی بجاے جنگموں کی پرستش کر - یلورا اور دولت آباد
کی حفاظت کر

قوی کر یلورے کی بنیاد کوں جو خجلت اچھے قصر شداد کوں
نہ کم مان دے دولت آباد کوں نہ سر پار کر دیکھہ شمشاد کوں

غرض اس قسم کی نصیحتیں کرنے کے بعد یہ کہتا ہے کہ میرے خراج کو
خدا کی ذکات سمجھہ اور یہ یہ چیزیں فوراً بھیج دے۔ اس میں گھنے ، زیور ،
جواہرات ، ہتیار ، طوائف ، رنڈیاں ، تومنیاں ، ساطان فیروز کی زبر جد کی صراحی
اور یاقوت کا پیالا ، دنیا بھر کی چیزیں آجاتی ہیں - اس کے بعد لکھتا ہے کہ
یہ خراج تونے مجھے بھیج دیا تو اس کے صلے میں میں تجھے احمد نگر بخشدوں گا۔
خط کے آخر میں فخر یہ اشعار ہیں جن میں یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اگر تعمیل
نہ کی تو نظام شاہی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا

نہ ترکاں کوں چھوڑوں نہ ترکی کہان اگر گیو رستم ہو حاضر ضمان
نہ چھوڑوں مُلانا نہ چھوڑوں فقیر نہ بڑ کا نہ اڑکا نہ برنا نہ پیر
اوک دور بنیاد اسلام کی جو مانے درا ہی * جگت رام کی

یہ خط لے کر ہری داس ایلچی نظام شاہ کے ہاں پہنچا - بادشاہ خط پڑھ کر
مسکرایا اور مشورت کے لئے وزیروں کو طلب کیا

" طلب کردن نظام شاہ وزیران خود را و بایشاں مشورت کردن "

شروع میں چند اشعار سورج کے ڈوبنے اور چاند کے نکلنے پر ہیں -
شب میں بادشاہ کا دربار ہوتا ہے اور اس دربار کا ٹھاٹ بیان کیا ہے-
جب سب امیر وزیر جمع ہو گئے تو نام لے لے کے سب کو مخاطب کیا اور
رام راج کا خط سنایا اور نہایت جوش اور غصے سے اس کے تمرد اور جبرو تعدی

---

* آقائی

اسلام کی بے حرمتی اور مسجدوں کے انہدام کا ذکر کیا اور کہا کہ مجھے اس وقت تک چین نہیں آے گا جب تک اس مردود کا سر قلم نہ کردوں

نہ مجھہ آس دھن دین کی ریس ہے
مرا کھرک * اور رام کا سیس † ہے

"جواب دادن وزیران نظام شاہ را درباب فکر رام راج"

وزیروں نے جواب دیا :—

نکر فکر کچھہ رام کے کام کی — نہ اس رام کی بل هریرام کی
تجھے فوج بد سکندر ا ہے — اتا قا سو جبریل کا پرا ہے
تجھے چرخ بازو کھرک برق ہے — اُسے سنگ خارا اگر فرق ہے

غرض اسی طرح نظام شام کی تعریف اور رام راج کی مذمت ہے۔

"نامہ نوشتن نظام شاہ بہ رام راج در جواب او"

دبیر شاہی کو جواب لکھنے کا ارشاد ہوا اور اس نے حمد و ثنا سے نامے نامہ شروع کیا - پھر بہت سے مقدس بزرگوں؛ مقدس کتابوں اور چیزوں کی قسمیں کھا کر رام راج کو ہدایت کی ہے:

نہ پتیاو ‡ کچھہ زور کے تیں — نکہ راکھہ وزن ترازو کے تیں
نکر کچھہ بھروسا کہ آپار § مال — گھنا مال جس تس گھنا گو شمال
بتی جال نا جال فانو س کوں — نگہ راکھہ توں اپنے ناموس کوں

یعنے اپنے زور بازو پر گھمنڈ نہ کرو اور ترازو کے وزن کا دھیان رکھو - اپنی بے شمار مال ودلت پر بھروسا نہ کرو ' کیونکہ جس کے پاس دولت زیادہ ہے ' اُسے مصیبتیں بھی زیادہ بھگتنی پڑتی ہیں - بتی جلاتے جلاتے فانوس نہ

* تلوار † شر — ‡ گھمنڈ کرنا § بے شمار —

جلا دینا اور اپنی عزت آبرو کا خیال رکھو - آخر میں دھمکی دی ھے :

سو مشعل جلاؤں سر اندیپ پر اوجالا کروں سب سنگل دیپ پر

دسا سیر کا سیر * چابوں کچا کہ سیمرغ مجھہ کن + کبوتر بچا

قاصد یہ خط لیکر رام راج کی طرف روانہ ہوا

" قاصد فرستادن رام راج بار دیگر بعد از شنیدن نامۂ نظام شاہ "

رام راج نے جل کر جواب دیا اور اپنے خط میں خوب خوب چرکے دیے ھیں' آخر میں کہتا ھے کہ اگرچہ تو شاہ بن شاہ ھے اور گو عماد (عماد الملک) تیرا پیشوا ھے اور اگرچہ تونے خاندیس پر اپنی دھاک بٹھائی اور گونڈ وانے سے خراج لیا' بہادر (بہادر شاہ) کو تونے زیر کیا اور ھمایوں سے بڑی بہادری سے لڑا اور فرنگیوں کو بھگایا اور ملک کو اس شجاعت سے فتح کیا کہ سلطان روم نے بھی آفریں کی مگر رام (راج) کچھہ اور ھی چیز ھے —

سبھی جگ ملے رام ان میل ھے بلے موم آتش کنے تیل ھے

اگر شاہ کاؤس یا کیقباد تو میں رام فرعون و شداد و عاد

... ...

اگر نور و وادی ایمن ھے شاہ وگر سور نوروز بہمن ھے شاہ

کم اندیش ھے چاردہ سال کا پر و بال دھرتا ولے با لکا

سو میں رام دجال کوں اصل ھوں سو شداد بن عاد کی نسل ھوں

نہ میں رام بل رام لکھمن ھوں میں جو یک من ھے بھیری ‡ تو لکھ من ھوں میں

یہی بول قاصد روانہ کیا وو آشہ نزیک § ماجرا سب کھیا

" سوار شدن نظام شاہ برائے جنگ رام راج "

اس میں فوج کی تیاری اور روانگی کا سماں دکھایا ھے - غرض نظام شاہ اپنی

---

* سر + نزدیک ‡ یعنی نظام شاہ بحری § نزدیک -

فوج لے کر کوچ پر کوچ کرتا ہوا میدان جنگ کی طرف روانہ ہوتا ہے

ہوا گرم تر مغز تب رائے کا
سنا جب یو آواز کرنائے کا

(مستعد شدہ آمدن رام راج برائے جنگ نظام شاہ)

رام راج نے نظام شاہ کے کوچ کی خبر سنی تو اس نے بھی اپنی فوج کی تیاری کا حکم دیا اور فرمایا :

کہ میں رام اچھتے * ترک زور کیا
سمندر اچھے حوض کوں شور کیا

مختلف فوجوں کی تیاری اور روانگی کا حال کسی قدر تفصیل اور شان سے بیان کیا ہے - اخری شعر یہ ہے :

خبر گرم تر ہو (ن) بھر گوش میں (ن) ہوی ہر
کہ دریائے (ن) لنکھا ہوا جوش میں (ن) طوفان آتش

(فتح یافتن نظام شاہ بر لشکر رام راج و سرا ورا بریدہ
پیش تفال خاں فرستادن)

لڑائی بڑے زور شور سے ہوتی ہے لیکن شاعر شروع ہی سے حسین شاہ کا غلبہ بتاتا ہے - چنانچہ ابتداہی میں یہ شعر ہیں :

کلاپ + جو کالنگاں کے ورد یکھ عین چلیا فوج رخ باند بھیری حسین
چلیا دل کھندل جوں گرج کھن جیتا دندی بھول اوساں گئے لت پڑتا ‡

غرض یہ کہ

---

* ہوتے ہوے — + ملصوبہ —

‡ فوجوں کو بادلوں کی گرج کی طرح روندتا ہوا چلا اور دشمن کے اوسان خطا اور پریشان ہوگئے —

خلل تھا کفر کا دیا جس خدا کیا رام کا سیس تن سے جدا

وجیا نگر شہر لوٹا گیا، بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا اور بادشاہ نے نماز پڑھی اور خدا کی درگاہ میں شکر ادا کیا —

اس نظم کا جو ناقص نسخہ میرے پاس ہے اس میں فتح اور غنیمت کا حال ذرا بڑھا چڑھا کر لکھا ہے اور نظام شاہ بحری کی خوب دل کھول کے تعریف کی ہے اور آخر میں بہت سی دعائیں ایسی دی ہیں جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاعر اس وقت زندہ تھا - فتح کا سنہ اور اپنا تخلص بھی دیا ہے - نیز شہر وجیا نگر کی رونق اور دولت اور اس کی شان و شوکت کا بھی ذکر کرتا ہے - یہ چیز یں مکمل نسخے میں نہیں ہیں —

اگرچہ واقعہ شاعرانہ پیرایے میں لکھا گیا ہے، تاہم اس سے بعض تاریخی باتوں کا پتا چلتا ہے - مثلاً نظام شاہ اور رام راج میں جو خط و کتابت ہوی ہے، اگرچہ یہ فرضی ہے، لیکن اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے خیالات ایک دوسرے کے متعلق کیا تھے اور وہ ان کی کن کن چیزوں کو ناپسند کرتے تھے - اسی طرح بعض ناموں کی تصدیق اور تصحیح ہو جاتی ہے - چنانچہ اس لڑائی میں جو بعض سردار شریک تھے ان کے نام آگئے ہیں - غرض یہ مثنوی علاوہ شاعرانہ حیثیت کے تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے - اس لئے میرا ارادہ ہے کہ فرہنگ کے ساتھ پوری مثنوی شائع کردوں - اس میں بہت سے غیر مانوس اور اجنبی لفظ آئے ہیں، جن کا سراغ لگانا اس لئے اور دشوار ہو گیا ہے کہ اصل سے بگڑ کر کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں —

(۲)

" میز بانی نامۂ سلطان محمد عادل شاہ "

پہلی مثنوی جس کا اوپر ذکر ہوا ہے " فتح نامۂ نظام شاہ " ہے

اس میں جو نظام شاہ کی تعریف اور شان و شوکت دکھا ئی ہے اس سے معلوم ہو تا ہے کہ 'شوقی' کا تعلق نظام شاہیوں سے ضرور رہا ہے - اگر چہ مثنوی کی ابتدا میں عادل شاہ، قطب شاہ اور برید شاہ کا نام لیا ہے' لیکن دوران جنگ اور اثنائے فتح میں کسی کا کہیں ذکر نہیں - یعنے جو کچھ کیا نظام شاہ نے اور فتح کا سہرا بھی اسی کے سر رہا- گو تاریخی لحاظ سے بھی یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس سے 'شوقی' کی طرفداری صاف ظاہر ہے - اس سے بھی ثابت ہو تا ہے کہ وہ پہلے نظام شاہی دربار سے تعلق رکھتا تھا - یا تو نظام شاہی حکومت کی تباہی پر یا کسی اور وجہ سے اس کا تعلق وہاں سے قطع ہو گیا اور وہ عادل شاہی دربار میں آ گیا - نظام شاہی سلطنت کا خاتمہ سلطان محمد عادل شاہ ہی کے زما نے میں ہوا بلکہ ایک حد تک اس کا الزام عادل شاہی حکومت پر ہے کہ اس نے مغلوں سے ساز باز کر کے اس حکومت کا خاتمہ کردیا اور سلطنت کے حصے بخرے کر لئے - اس لئے یہ قرین قیاس ہے کہ اس تباہی کے بعد 'شوقی' دربار عادل شاہی میں آ گیا ہو —

اس مثنوی میں سلطان محمد عادل شاہ کا حال ہے - اگر چہ کسی تاریخ میں مذکور نہیں لیکن اس مثنوی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کی ایک شادی مصطفیٰ خاں کی لڑکی سے بھی ہوی تھی - مصطفیٰ خاں محمد عادل شاہ کا وزیر اعظم اور سلطنت کے بڑے امرا میں سے تھا اور اُس نے بڑے بڑے کار نمایاں کئے تھے' بلکہ ایک مدت تک سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک رہا - اس مثنوی میں سلطان محمد عادل شاہ کی میزبانی' سلطان کی شہر گشت' مصطفیٰ خاں کی مہمانی اور بیٹی کے جہیز کا ذکر ہے - یہ چند باتیں بھی زیادہ تر مثنوی کے مختلف عنوانات سے ظاہر ہوتی ہیں - مثنوی میں جشنوں کی دھوم دھام' میز بانی اور مہمانی کی شان و شوکت' عیش و عشرت کے سامان کا تو بہت کچھ ذکر ہے مگر اصل واقعات کے متعلق کچھ نہیں لکھا —

مثنوی کا آغاز حمد سے اور اس کے بعد بادشاہ کی تعریف سے ہوتا ہے۔ حمدمیں بھی صرف ایک مصرع ہے اور اس کے بعد ہی بادشاہ کی مدح شروع ہوجاتی ہے۔ ابتدا کے شعر یہ ہیں:

اول یاد کر پاک پروردگار — پچھیں شاد کر شاہ عالی تبار
نبی کا خلیفہ خدا کا خلیل — بالہام و ہاتف نہ با جبرئیل
دم اندر جو عیسی مریم تمام — تکلم میں موسیٰ علیہ السلام
شجاعت میں رستم تی کچھ کم نہیں — سخاوت میں ایسا جو حاتم نہیں
سر سرفرازان بندے نواز — سو گردن فرازاں میں گردن فراز
سو سلطان محمد عدالت پناہ — کہیں خلق جس مکرمت دستگاہ
خداوند تعالی کی وہ چھانوں ہے — عرب ہور عجم میں جسے فانوں ہے
کرے عیش و عشرت جواناں سنگات — ولے مشورت پیر داناں سنگات
بڑا گیان ونتا رتن پا رکھے — رتن پا رکھے ہور بچن پا رکھے
سو میٹھی شہر یار کی بات ہے — سو اس بات کی دھات نا بات ہے
اگر شہ سناوے مجھے بول کر — تونا بات کوں میں سنوں * بول کر
چو من کیست بارے دریں بوستاں — کہیں جس کی طوطی بہندوستاں

اس کے بعد وہ شادی کا ذکر چھیڑتا ہے:

سنیا میں کہ شہ گھر بڑا کاج ہے — کہ جس کاج کا خلق محتاج ہے
جہاں دار نے میزبانی کریا — اسے نانوں میں شاہ مانی کریا

اس کے آگے میزبانی کے ساز و سامان، مکانات کی آرائش اور انتظامات کی کیفیت تفصیل سے لکھی ہے - شروع اس طرح سے کیا ہے:—

صفادار صوفے و مندوے بلند — چھجے شہ نشین پادشاہاں پسند

---

* پھینک دوں

بشنگوت سرخ و بزرنیغ زرد   برزحل و زرنگار * و بالاجورد
صفادار صوفے رنگا رنگ ہوے   نمودار جاے کہ از رنگ ہوے
تکت لال سوں کانج ماڑیاں مڑی   سوزر بات سوں باغ ماڑیاں مڑی

اسی طرح ہر چیز اور سامان کا ذکر کرتا چلا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی "صوفے" کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ انگریزی میں یہ عربی لفظ "صفہ" سے پہنچا ہے۔ فارسی میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے —

دوسرا عنوان یہ ہے:

(مجلس آراستن و بخشش کردن سلطان محمد مردماں را در میز بانی خود)

بادشاہ تخت پر جلوہ فرما ہوتے ہیں اور امرا، وزرا مجرا و آداب عرض کرتے ہیں:

بیٹھا تخت پر آو جمشید سا   زر افشاں کیا دست خورشید سا
سلحدار سردار جیتے وزیر   نہ گھر میں رہیا کوئی بر ناؤ پیر
جیتے سرفرازاں جو درگاہ کے   جیتے محرماں خاص خرگاہ کے
سو سربھویں دھرے شاہ عالم کے تیں   رہے دیکھ کر ماہ عالم کے تیں
کتے سیس کے پاے لشکر کشاں   سوکر جوڑ ٹھارے رہے سرکشاں

اس کے بعد بادشاہ انھیں بیش بہا خلعت اور انعام و اکرام عطا فرماتے ہیں۔ شاعر ہی انعام و اکرام کی تفصیل بیان کرتا ہے، جس میں نفیس نفیس کپڑے، ہاتھی، گھوڑے، جواہرات، عطریات سب کا ذکر آجاتا ہے۔ پانوں کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔ شوقی رام راج کی شان و شوکت نہیں بھولا، چنانچہ کہتا ہے:

یتا خرچ پاناں ہوا راج کاج   نہ سونے میں دیکھا کبھی رام راج

مختلف قسم اور مختلف مقامات کے پانوں کے نام لیتا ہے اور طرح طرح کی تشبیہیں دے کر بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد کھانے کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اور خاتمے پر کہتا ہے:

---

* (ن) یہ لفظ غالباً "زنگار" ہوگا۔ زرنگار سے مصرع غلط ہوجاتا ہے۔

کیتا کوئی کھائے کیتا کوئی لےجائے   مچھر کو ھتے * ھور مکھی کو شکائے †
کئے شکر یکبار عالم تمام   محمد نبی پر درود و سلام

تیسرا عنوان یہ ھے:

(در بیان شہرگشت سوار شدن سلطان محمد عادل شاہ)

شہرگشت کا بیان بہت خوبی سے لکھا ھے شروع یوں ھوتا ھے:

سدا دار پر تجھ منگل‡ گڑ گڑیں   منگل گڑ گڑیں جیوں بدل§ گڑ گڑ یں
ھتی مست پر پیلباں مست ھے   زبردست پر کیا زبردست ھے
سدا دار پر تجھ طبل باجتے   طبل باجتے ھور مندل¶ کاجتے
بہت دیس تی شہ کے گھر کام ھے   شہر گشت کی رات سو آج ھے
شہر گشت کا ساز و ساماں ھوا   نفیریاں تراتے دماماں ھوا

اس کے بعد جلوس کا حال اور اس کی شان و شوکت ھے- بادشاہ کی سواری، طرح طرح کے باجےگاجے، ناچ رنگ، آتش بازی، روشنی غرض ھر چیز کو بہت اچھی طرح بیان کیا ھے - چند شعر ناچ کے متعلق دیکھئے، ناچنے والیوں کے انداز کس خوبی سے ادا کئے ھیں:

ھر کنیاں و کنچنیاں بہوت ساز سوں   بجاویں و گاویں بہوت ناز سوں
خوشی خرمی میں اوبلتیاں چلیاں   اکھرتیاں و پھرتیاں اوچھلتیاں چلیاں
سہیلیاں سہیلیاں میں جھلتیاں و تیاں   لٹکتیاں ٹھمکتیاں و ڈلتیاں و تیاں

آتش بازی کے بیان میں ایک شعرھے:

ھوا یاں نتھیاں و اتھیاں ناگنیاں   ھوا کے اوپر جا سنپولے جنیاں

ھوائیوں کو ناگنوں سے بہت اچھی تشبیہ دی ھے - یعنے وہ ھوائیاں نہ تھیں بلکہ ناگنیں تھیں اور اوپر ھوا میں جاکر جو چھٹیں اور ان سے پھول

---

* سارے   † ڈرائے   ‡ باجے   § بادل   ¶ باجہ

گرے تو وہ پھول نہ تھے بلکہ سپولے تھے جو اُنھوں جنے —

تیسرا عنوان یہ ھے :

(دربیان مہمانی کردن نواب مصطفیٰ خاں سلطان محمد عادل شاہ را و دادن جہیز دختر)

صبح ہوتی ھے :

بیٹھا سور جب نور کا تاج کر بیٹھی رات کوہ قاف میں لاج کر

مصطفیٰ خاں کی مہمانی :

سلیماں کو آصف نے مہماں کیا عجائب غرائب بہوت کچھہ دیا

سلطاں کو اپنی بیٹی دیتا ھے یعنی چاند کو سورج کے حوالے کرتا ھے :

دیا چاند کوں سور کے سات کر دیا نور کوں نور کے سات کر

اس کے بعد جہیز کا ذکر ھے ۔ پھر مجلس کے ناچ رنگ کا ذکر دل کھول کے کیا ھے اور شاعری کی داد دی ھے ۔ گانے اور ناچنے والیوں کا سراپا، ان کے ناز و انداز اور ناچ کا سماں خوب لکھا ھے ۔ اتنے میں سلطان محمد عادل شاہ کے سامنے دسترخوان بچھتا، ھے جس پر طرح طرح کے نفیس کھانے سونے چاندی کے باسنوں میں چنے جاتے ھیں ان کی تفصیل بھی پڑھنے کے قابل ھے، جس سے اس وقت کے کھانوں کی کیفیت معلوم ہوتی ھے ۔ آخر میں دعا پر مثنوی ختم ہوجاتی ھے -

دعائیہ اشعار یہ ھیں :

قلم (گر) کروں راس سب بانس کے سیاھی دریا، کاغذ آکاس کے

لکھئے ھو رکھے بھرے یو تمام صف شہ کی پوری نہوے والسلام

تو بہتر کہ 'شوقی' ز راہ صواب دعا وو کرے جو اچھے مستجاب

سدا جیو راجے جنم راج کر جو دشمن مونڈی تل کرے لاج کر

کرے راج جو لگ گگن دھرتری کرے راج جو لگ پرب استری

پھر یار خاطر کے تیں شاد دار قیامت لگوں یو رہوے یاد گار

(غزلیں)

مجھے شوقی کی کچھہ غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں جن سے اس کی شاعری اور جوہر کھلتے ہیں - ایک غزل اس نے مسلسل لکھی ہے' جس میں شروع سے آخر تک " نین " اور " سوکا " کی تعریف ہے اور ان کو اس نے نئی نئی اور طرح طرح کی تشبیہوں سے مرصع کیا ہے۔ "سوکا" سرمے کا وہ خط ہے جو عورتیں آنکھہ سے لیکر زلف تک کھینچتی ہیں - یہ بھی ایک قسم کا سنگار سمجھا جاتا تھا - اس غزل کے چند شعر یہاں لکھے جاتے ہیں:

دلبر سلونے نین پر کھینچی ہے سوکا خوبتر
خطاط جیوں ماریا رقم چھندوں ثلث کے صاد پر
یا چک دوات ہے سیم کی کیکی سو بھر سیاھی رکھے
سوکا قلم جیوں واسطی کاتب گیا اُس میں بسر
یا نین موتی تھال ہیں سوکا سو تاکا نیل کا
موتی پرو کر کھینچتے تو راھیا ہے ٹوٹ کر
تجھہ زلف ہے جیوں ناگنی سوکا بچا نیکا * جنی
مت کھائے کیں وہ پاپنی اسنیں چھپا نرگس بھتر
یا نین بازیگر اھیں تجھہ حسن کے بازار میں
سوکا سلائی سحر کی بھایا * اُس اپنے آنکھہ بھتر
یا ترنگ اچپل نین ھو سار سو ھندو برن
سوکا لے برچھا نین دھر آیا کسی جیو مار کر
آھو کو بیٹھیا تیریا مکھہ میں کنجن چار یا لیا
یا تل زنگی کوں مارنے لوچن† ترک کنچھیا‡ خنجر

---

*اسے † آنکھہ ‡ کھینچا —

یا پھول ہے گل لالہ کی سوکا تنقتی اس پھول کو
پتلیاں مرتب یوں دیسے جیوں پھول پر بیٹھے بھنور

ایک پوری غزل میں تجنیس لفظی سے کام لیا ہے - ہماری شاعری میں
اس قسم کی صنائع کا شوق ہر زمانے میں رہا ہے - چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

گھب گھب رہی ہے من میں تری زلف کی کھب کھب §
مج جیو کے گلے میں پڑیا ہے طوق غب غب
تپ تپ ہوا ہوں تب سیں تیرے وصال کا رن
جپ جپ کیا ہوں جپنا ہر دم کتاہوں ¶ اب اب
تج وصل کوں درنگ ہے ہو مج نہیں صبوری
جاتی ہے زندگانی آتی ہے موت دب دب ‡
سروے قداں سوں ہاوے * شوقی ہوا ہے مجنوں
کب کب کیا ہوں توبہ کب کب کیا ہوں کب کب

ایک اور غزل کا مطلع اور مقطع لکھ کر مضمون ختم کرتا ہوں

تجھ نین کا ماتا ہے جو اُس جام سیتی کام کیا
تجھ زلف کا کافر اوسے اسلام سیتی کام کیا
شوقی نہ دکلا طمع کچ ....فردوس کی
سنا * جو کرتا ہے اُسے انعام ستی کام کیا

---

§ خم ¶ کہتاہوں ‡ آہستہ آہستہ * درد فراق -

ادب

مذہب

تعلیم

تاریخ

اردو کے جدید رسالے

ادب

سادھو اور بیسوا

(مصنفۂ جناب کشن پرشاد کول صاحب، انڈین پریس الہ آباد، صفحات ۲۰۳، قیمت بارہ آنے)

جناب کشن پرشاد کول صاحب ملک کے سچے خادموں میں سے ہیں - ان کا مقصد ملک کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی کی اصلاح ہے - اس سے پہلے بھی وہ اسی موضوع پر فسانے کے پیرائے میں کئی کتابیں لکھ چکے ہیں - کول صاحب کو لکھنے کا بہت اچھا سلیقہ ہے اور صاف ستھری زبان میں اپنے خیالات بڑی خوبی سے ادا کرتے ہیں - یہ فسانہ بہت دلچسپ اور عبرت خیز ہے - اس افسانے میں اصل اشخاص دو ہیں - ایک سادھو دوسری ایک بیسوا - زمانے کے حالات نے ان کی زندگی میں ایسی کایا پلٹ کی ہے جسے پڑھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور عبرت بھی - سادھو بیسوا کو ناپاک زندگی سے نجات دینے چلے تھے - خود اس کے شکار ہوگئے اور بیسوا ان کی تلقین سے متاثر ہوکر اُس درجے کو پہنچ گئی جو سادھو کو باوجود ریاضت کے کبھی نصیب نہوا تھا -

قصے کے ضمن میں ہندوستانی معاشرت کا چربہ بھی خوب اتارا ہے جو کول صاحب کا اصل مقصد ہے —

جیسا کہ لائق مصنف نے خود ہی لکھ دیا ہے اس کتاب کا خیال انہیں ایک فرنگی ناول سے پیدا ہوا؛ یہ فرانس کے مشہور اور عجیب و غریب ادیب اور ناول نویس اناتول فرانس کا ناول تھائیس ہے - اگرچہ اس افسانے کا خیال اس ناول سے پیدا ہوا لیکن قصہ بالکل ہندوستانی ہے اور قابل مؤلف کے غور و فکر کا نتیجہ ہے —

ناٹک کتھا

(مولفۂ صاحبزادہ محمد عمر نورالہی صاحبان -
محمد برادرز تاجران کتب جدون قیمت آٹھ آنے)
(یہ کتاب انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد - دکن سے بھی مل سکتی ہے)

اس میں قدیم ہندوستانی ڈراموں کی سات کہانیاں اور ایک تاریخی کہانی ہے - یہ بڑی دلچسپ کہانیاں ہیں اور قدیم ہندوستان کے نامور اور مستند ڈراما نگاروں کے شہرۂ آفاق ڈراموں کو اپنی میٹھی اور پاک ستھری زبان میں اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ پڑھ کر جی خوش ہو جاتا ہے - ہندی کے خوبصورت الفاظ جس حسن و خوبی سے ان صاحبوں نے اپنی اُن کہانیوں میں کھپائے ہیں یا تو مولانا حالی کی مناجات بیوہ میں دیکھنے میں آئے یا یہاں - اس چھوٹی سی کتاب پڑھنے کے بعد دل میں یہ خیال آتا ہے کہ " ہندوستانی " جو آیندہ ہندوستان کی عام اور مشترک زبان ہونے والی ہے وہ کہیں یہی تو نہیں - اردو کے نامور ادیب اور شاعر حضرت کیفی نے کتاب کے شروع میں بہت ہی پر لطف تقریب لکھی ہے - امید ہے کہ یہ کتاب شوق سے پڑھی جائے گی اور پڑھنے والے مولفین کی محنت کی داد دیں گے - ایک بڑا فائدہ ان کہانیوں کے پڑھنے سے یہ ہوگا کہ جو لوگ اپنی نارسائی یا کم فرصتی کی وجہ سے اصل ڈراموں کا مطالعہ نہیں کرسکتے وہ " نقل مطابق اصل " کو پڑھکر ضرور محظوظ ہونگے اور کیا عجب ہے کہ بہت سے اصل کی طرف رجوع کریں —

پرواز خیال

(مجموعہ کلام خواجہ حمیدالدین صاحب حمید لکھنوی
نامی پریس لکھنو ' قیمت ایک روپیہ چار آنے)

یہ خواجہ حمید صاحب لکھنوی کی غزلوں کا مجموعہ یعنی دیوان ہے - مجلد جیبی تقطیع نہایت عمدہ کاغذ پر خوبصورت چھپا ہے - غزل گوئی میں قدیم اساتذہ کا تتبع کیا ہے - جو لوگ اس طرز کو پسند کرتے ہیں ' اُن کے لائق ہے - زبان صاف اور روز مرہ درست ہے - کوئی خاص بات ایسی نہیں جو بیان کے قابل ہو چند اشعار بطور نمونے کے لکھے جاتے ہیں —

یوں دفن مجھے کرنا منہ ہو سوے میخانہ
اک ہاتھہ میں ساغر ہو اک ہاتھہ میں پیمانہ
کہنے کو مسلماں ہوں مذہب تو ہے رندانہ
توبہ ہے مرے لب پر نظریں سوے میخانہ
منزل ہے وہی میری جس جا ترا جلوہ ہے
اس سے نہیں کچھہ مطلب کعبہ ہو کہ میخانہ

شیرازہ عناصر کا بکھرا نظر آتا ہے
مشکل ہمیں اب اپنا جینا نظر آتا ہے
سب ایک طرف، مجرم تنہا نظر آتا ہے
اس عرصۂ محشر میں یہ کیا نظر آتا ہے
یہ حال نہ تھا پہلے اس درد محبت میں
جو آج مجھے عالم دل کا نظر آتا ہے
انسان کا چہرہ بھی آئینہ ہے عادت کا
جیسا کوی ہوتا ہے ویسا نظر آتا ہے
دن رات ہے واعظ کو رٹ جنت و دوزخ کی
ہم کو تو کچھہ اس میں بھی دھوکا نظر آتا ہے

دنیاے افسانہ

(موءلفۂ مولوی محمد عبدالقادر سروری صاحب ایم - اے -
مکتبۂ ابراھیمیہ حیدرآباد دکن، صفحات ۲۰۰ چھوٹی تقطیع
قیمت ایک روپیہ چار آنے)

کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے - اس میں بیس باب ہیں - پہلے چودہ باب عام فسانے کی تاریخ، اس کے اقسام، عناصر، خصوصیات، موضوع، فرائض اور مختصر قصوں کے متعلق ہیں - لیکن آخری پانچ باب میں اردو کے فسانوں، ناولوں اور مختصر قصوں سے بحث کی ہے - یعنی اردو زبان اور افسانے؛ ابتدائی دور کے افسانے؛ فورٹ ولیم کالج کی کوششیں؛ اردو ناول، اردو مختصر افسانے اور اردو افسانوں کا مستقبل —

قابل مؤلف نے اردو نثر کا پہلا فسانہ ابن نشاطی کے قصے "طوطی نامہ" کو قرار دیا ہے - ابن نشاطی کا طوطی نامہ منظوم ہے - معلوم نہیں نثر کس بنا پر لکھا ہے، اس کے لئے کوئی سند بھی پیش نہیں کی - اسی طرح شیخ عین الدین گنج العلم کو اردو نثر کا مصنف بتایا ہے، اور یہ بھی بغیر سند اور تحقیق کے - خواجہ بندہ نواز

گیسو دراز کے رسالے " ہدایت نامہ " اور ہفت اسرار " بعد کے ترجمے ہیں ' خواجہ صاحب نے اردو میں نہیں لکھے —
اُردو ناولوں پر لکھنے کی ابھی گنجائش باقی ہے' چونکہ وہ اس مبحث پر الگ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس لئے غالباً یہاں اختصار سے کام لیا گیا - تعجب ہے کہ اردو ناول نویسوں میں منشی پریم چند صاحب کا نام نہیں ہے - اُردو ناولوں اور ناول نویسوں کے متعلق قابل مؤلف نے جو رائیں ظاہر کی ہیں ان سے بھی اکثر اصحاب کو اختلاف ہوگا - لیکن اس میں شک نہیں کہ اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس مضمون پر لکھی گئی اور مؤلف کی محنت اور تلاش بہت قابل تعریف ہے - جو لوگ ناولوں کے شائق ہیں یا جنھیں ناول نویسی کا ذوق ہے وہ ضرور اسے پڑھ کر خوش اور مستفید ہوں گے -

---

اوتاروں کے قصے

(مؤلفۂ سید محمد منظور علی رضوی صاحب نیشنل پریس
(رام نراین لال) الہ آباد قیمت چار آنے)

اس چھوٹی سی خوبصورت کتاب میں رام چندر جی کرشن جی اور مہابھارت کی لڑائی کا حال صاف سادہ زبان میں بیان کیا گیا ہے - لیکن اس کی اور ناٹک کتھا کی زبان میں بڑا فرق ہے - یہ کتاب لڑکوں لڑکیوں کے پڑھنے کے لئے خوب ہے - تین رنگین تصویریں بھی ہیں - رام نراین لال صاحب اپنے نیشنل پریس سے اردو کی بہت سی اچھی اچھی کتابیں صاف ستھری چھاپ کر شائع کر رہے ہیں - ان میں کہانیوں کا بھی ایک سلسلہ ہے اور اس سلسلے کی ایک کتاب یہ بھی ہے —

اُردوے معلیٰ

(از ستمبر سنہ ۱۹۲۸ ع تا جون سنہ ۱۹۲۹ ع مرتبۂ جناب
سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی - کانپور)

یہ مشہور ادبی رسالہ اب رسالہ نہیں رہا بلکہ اس میں با قساط مستقل ادبی

کتابیں شایع کی جاتی ہیں - ایک کتاب "معائب سخن" مسلسل چھپ رہی ہے ۔ علاوہ اس کے بہت سے نایاب اور معروف دیوانوں کا انتخاب بھی شایع کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان پرچوں میں میر محمد حیات حسرت، یقین، احسن اللہ خاں بیان اور خواجہ کمال الدین شاعر (شاگردان مرزا مظہر) ذوق، داغ، رسا (شاگرد داغ) جگر مراد آبادی، فغاں، راسخ، رونق، صمیم، فانی، عزیز لکھنوی اور محشر لکھنوی کے دیوانوں کا انتخاب درج ہے - یہ بہت بڑی ادبی خدمت ہے - کبھی سرورق کے اوٹ میں ایک آدھ تازہ غزل بھی چھپ جاتی ہے - ستمبر تا دسمبر سنہ ۲۸ع کے پرچے میں نہرو رپورٹ پر جامع تبصرہ ہے - اگرچہ بذات خود یہ ایک کام کی چیز ہے مگر اردوے معلیٰ میں اس کا پیوند بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے - بہر حال جواں ہمت حسرت برابر کام میں مصروف ہیں اور اپنے ذوق کو بڑی خوبی سے نبھائے جارہے ہیں - ہم تو یہ سمجھے تھے کہ یہ رسالہ سہ ماہی ہوگیا ہے کیونکہ تین تین نمبر ایک ایک رسالے میں پہنچے تھے - اتنے میں جولائی کا نمبر پہنچا تو معلوم ہوا کہ بدستور ماہانہ ہے - قیمت سالانہ دو روپے چار آنے اور فی پرچہ تین آنے ہے اور معلومات کے لحاظ سے جو اس میں درج ہوتی رہتی ہیں - یہ قیمت کچھ بھی نہیں ہے

هزار داستان، علی بابا اور چالیس چور

مؤلفۂ جناب حامد اللہ صاحب افسر - رام نارائن لال، نیشنل پریس الہ آباد قیمت فی کتاب چار آنے

یہ نیشنل پریس کے قصے کہانیوں کے سلسلے کی کتابیں ہیں- پہلی کتاب میں نعیحت خیز چھوٹے چھوٹے قصے اور سبق ہیں - دوسری میں الف لیلہ کے مشہور قصے کو آج کل کی سادہ اور سلیس زبان میں لکھا ہے - اس میں دو تین رنگین تصویریں بھی ہیں - بچے ان کتابوں کو بہت شوق سے پڑھیں گے —

کروسو سیاح (مؤلفۂ جناب طالب الہ آبادی' نیشنل پریس الہ آباد' قیمت ۴ آنے)

وینس کا سیاح (مؤلفۂ جناب سید محمد منظور علی صاحب نیشنل پریس الہ آباد قیمت ۴ آنے)

یہ دونوں کتابیں بھی نیشنل پریس کے سلسلے کی ھیں - پہلی کتاب انگریزی کی مشہور کتاب رابن سوکروسو کا خلاصہ ھے اور دوسری مارکو پولو مشہور سیاح کے سیاحت نامے کا نہایت مختصر سا خاکا ھے - لڑکے لڑکیوں کے شوق کی چیز ھے' نیشنل پریس بہت اچھا کام کر رہا ھے —

خطلاتین براے فارسی

(خطبۂ جناب آقا سید محمد علی صاحب پروفیسر نظام کالج)

آج کل ایشیائی ممالک میں لاتینی حروف کا بہت چرچا ھے اور جب سے ترکی میں یہ حروف رائج ہوگئے ھیں' یہ بحث اور بھی قابل غور ہوگئی ھے - ھندوستان اور ایران میں اس پر بڑی بڑی گرم بحثیں ہورھی ھیں - جاپان میں بھی بہت دنوں سے اس پر غور ہورھا ھے - چین اور جاپان کے حق میں تو یہ حروف ایک قسم کی رحمت ہونگے اور اگر ان دونوں ملکوں نے یہ حروف اختیار کرلیے تو وہ ایک بڑی زحمت اور جنجال سے بچ جائینگے۔ لیکن ہزارہا سال کے رواج کا یک لخت چھوڑ دینا کچھ آسان کام نہیں ھے —

آغا صاحب نے اپنے لکچر میں فارسی میں لاتینی حروف کے استعمال کے متعلق بحث کی ھے- ان کی راے اس استعمال کے بالکل مخالف ھے- اس کی وجوہ انہوں نے جو بیان کی ھیں ان کا خلاصہ یہ ھے :

۱- حروف ناقص ھیں - ایک ایک حرف کئی کئی آوازیں دیتا ھے -

۲- لاتینی حروف فارسی حروف کی ضرورتوں کو کامل طور پر پورا نہیں کرتے - کیونکہ متعدد حروف اور اصوات ایسی ھیں جن کا وجود لاتینی میں نہیں پایا جاتا —

ان وجوہ کو قابل لکچرار نے فارسی اور لاتینی حروف کو بالمقابل لکھ کر سمجھایا ھے —

اس قسم کے نقص کچھ نہ کچھ ہر زبان کے حروف میں پائے جاتے ہیں ۔ چنانچہ خود قابل لکچرار نے فارسی حروف کا لاتینی حروف سے مقابلہ کر کے فارسی خط کے نقائص بتا دئے ہیں —

فارسی خط کی ایک خوبی یہ بتائی ہے کہ زود نویسی کے لئے یہ بہت کار آمد ہے - لاتینی حروف میں تحریر بہت طویل ہو جاتی ہے - دوسری خوبی یہ ہے کہ نقاشی کا بہترین نمونہ ہے —

موجودہ خط کے بدلنے میں بڑا نقص قابل لکچرار کی رائے میں یہ ہے کہ کچھ دنوں کے بعد مروجہ خط بالکل غیر مانوس ہو جائے گا اور صدھا سال کی محنت سے جو علوم وفنون پیدا ہوے ہیں وہ سب ضائع ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایران پر ایک ایسا سانحہ گزر چکا ہے ' یعنے جب پہلوی خط ترک کر کے عربی خط اختیار کیا گیا تو ایران کے قدیم علوم و فنون سب تلف ہو گئے —

اس لئے آغا صاحب کی یہ رائے ہے کہ موجودہ خط ہی کی اصلاح اس طور سے کرلی جائے کہ ہمیں ایک جدید خط کی ضرورت نہ رہے - وہ اصلاح یہ ہے کہ اعراب میں جزم کو بالکل ترک کردیا جائے یعنے جس حرف پر کوئی علامت نہ ہو وہ ساکن سمجھا جائے - تشدید کی علامت کی جگہ جزم رکھ لیا جائے - غرض یہ کہ مروجہ خط ہی میں کچھ اصلاح کرلی جائے —

اردو خط بھی وہی ہے جو فارسی ہے - اس میں بڑا نقص یہ ہے کہ ہم اس وقت تک الفاظ صحیح نہیں پڑھ سکتے جب تک پورے اعراب نہ ہوں - اور اعراب کا لگانا دقت طلب امر ہے - اور ٹائپ میں تو یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے —

اردو زبان کی حالت جو اس وقت ہے آئندہ یوں ہی نہیں رہے گی - اگر ہم اس کی اشاعت اور توسیع کے خواہاں ہیں تو لازم ہے کہ اس کا ٹائپ بنائیں - مروجہ نستعلیق خط کا ٹائپ بنانا نہایت دشوار ہے - اگر بن بھی گیا تو اس میں وہ سہولت نہیں پیدا ہو سکتی جو لاتینی حروف کے ٹائپ میں ہے - البتہ نسخ اختیار کر سکتے ہیں لیکن تلفظ کی صحت اس میں بھی نہیں ہو سکتی - اگر ہم لاتینی حروف لے لیں تو عمدہ سے عمدہ ٹائپ جو صدھا سال کی محنت اور کوشش سے بنا ہے ' ہمیں بغیر کسی زحمت کے مل جائے گا - رہی یہ بات کہ اس میں بعض آوازیں نہیں ہیں تو ان کا بنا لینا کوئی بڑی بات نہیں' بلکہ پہلے سے بنی بنائی موجود ہیں۔

ہندوستان میں بہت سی زبانیں مروج ہیں اور اکثر کے خط ایک دوسرے سے نہیں ملتے - اگر یہ سب زبانیں لاتینی حروف اختیار کر لیں تو ان کا سیکھنا کس

قدر آسان ہو جائے - اور جو کچھ بھی ہو، اس ملکی اردو بحث کا تو پاپ کٹ جائے گا -

عجیب بات ہے کہ جو خط نہایت خوش نما، اعلیٰ ترقی یافتہ اور مہذب اور نقاشی کا بہترین نمونہ ہے وہ اس زمانے میں جب کہ ٹائپ کی فرماں روائی ہے، ادنیٰ اور ناکارہ ثابت ہوا اور وہ خط جو ابتدائی اور غیر ترقی یافتہ حالت میں تھے، مفید اور اعلیٰ بن گئے -

مجھے اکثر اردو کی قدیم کتابوں کے مطالعے کا اتفاق ہوتا ہے- پرانے الفاظ کے صحیح پڑھنے اور صحیح تلفظ کے دریافت کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے - اگر لاطینی یا ناگری حروف میں یہ تحریریں ہوتیں تو اتنی دقت نہ ہوتی —

بحث اب حسن اور افادے میں آ پڑی ہے - یا تو حسن کی پوجا کیجئے اور ترقی سے ہاتھ دھو بیٹھئے یا پھر چھاتی پے پتھر رکھ کر حسن کو خیر باد کہئے اور ترقی و افادہ کے میدان میں آئیے —

ایک روز ایسا آنے والا ہے کہ ہمیں یہ خط بدلنا پڑے گا، ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کی صورت کیا ہو گی - لیکن جتنی دیر ہوتی جائے گی اسی قدر مشکلات بڑھتی جائیں گی —

فیضان شوق

(دیوان منشی احمد علی صاحب 'شوق' قدوائی لکھنوی مرحوم، حجم ۳۰۰ صفحے، سائز ۲۰ × ۲۶، قیمت دو روپے، لکھائی چھپائی، کاغذ بہت عمدہ، معہ تصویر مصنف، پتہ: خان بہادر شیخ رضی الدین احمد صاحب بیرسٹرایٹ لا، گونڈہ (اودھ)

سحر البیان منشی احمد علی صاحب 'شوق' قدوائی مرحوم اردو زبان کے ان اُستادوں اور مسلم الثبوت شعرا میں تھے، جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر تھے اور جن کی تمام زندگی اس فن شریف کی خدمت میں گزری ہے -:

اس چندسال کے اندر نہایت افسوس ہے کہ ہماری زبان کے کئی گراں پایہ انشا پرداز اور

شاعر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے، اور زیادہ افسوس اس کا ہے کہ اپنی خصوصیات اور کمالات بھی اپنے ساتھ ہی لیتے گئے - حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم، جناب شاد عظیم آبادی، مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی، مولانا شرر لکھنوی، اور جناب شوق قدوائی اس دور میں ادب اُردو کے زبردست ارکان تھے -

حضرت شوق قدوائی ایک قادرالکلام، کہنہ مشق اور رنگ، قدیم و جدید کے مالک تھے - اور یہ عجیب بات ہے کہ وہ بعض خصوصیات کے لحاظ سے مجموعہ اضداد ہستی تھے - ان کا دیوان اور غزلیں اگر دیکھیے تو مذاق جدیداورجذبات نگاری سے بالکل الگ ہیں، قدیم رنگ نمایاں ہے اور وہ بھی خاص ہے - لکھنؤ کا فرسودہ رنگ رعایت لفظی کا تو اتنا زیادہ نہیں مگر محاورات، ضرب لمثال، بول چال نظم کرنے کی خاص کوشش کرتے ہیں، اور آورد کو آمد بنانے کی بھی - یہی ان کے دیوان کا امتیازی رنگ ہے - اس پر بھی شگفتگی اور برجستگی بہت ہے اور یہ کمال مشاقی کی دلیل ہے کہ کلام گنجلک نہیں ہونے پایا - یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کا خاص ذوق رکھتے ہیں - ان کا زور زیادہ تر لفظی صنائع اور فنی خوبیوں تک ہے لیکن شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ شعر کی اصل روح جو اُسے انسان کے دل کی گہرائیوں تک پہنچا دے وہ نہیں ہے اور ہے بھی تو بہت کم - بخلاف اِس کے ان کی نظمیں نہایت پاکیزہ ہیں - اور بعض تو جذبات کی صحیح ترجمانی کے لحاظسے ملک میں بے حد مقبول ہوئی ہیں-خاص کر ''عالم خیال'' جس میں ایک ایسی خاتون کے جذباتوخیالات ظاہر کئے ہیں جو اپنے شوہرسےدور ہے، یہ اپنے گھر میں ہے اور شوہر پردیس میں حقیقت یہ ہے کہ یہ مرحوم کی ایک بے مثل نظم ہے، خصوصاً ہماری تعلیم یافتہ مسلمان خواتین میں اس نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہے- اس کے علاوہ اور نظمیں بھی بغایت دل پسند ہیں اور یہ اتنا ذخیرہ ہے کہ اگر کتابی صورت میں چھپے تو اچھا خاصہ حجم ہوگا - اور ہمارا یہ خیال ہے کہ مرحوم کے دیوان سے زیادہ اس وقت اُن کے مجموعۂ نظم کی ملک کو ضرورت تھی -

زیر تنقید دیوان میں غزلیں ہیں، مگر یہ غزلیں اس رنگ میں نہیں جو آج کل مقبول ہے - اگرچہ زیادہ حصہ آخر عمر اور درمیانی عمر کا ہے، کیونکہ ابتدائی عمر کا کلام زیادہ تر ضائع ہوگیا، اور جو بچ رہا تھا اس کا بھی اکثر و بیشتر حصہ خود مصنف نے اپنے ذوق کے سبب تلف کردیا - آخر دیوان میں چند اخلاقی قطعات اور رباعیاں ہیں، مگر ان میں بھی جان شاعری کی وہی کمی ہے جو غزلیات میں ہے - ایک امتیازی خصوصیت دیوان کی یہ ہے کہ غزلوں میں زبان نہایت صاف و شستہ اور صحیح استعمال کی ہے اور اشعار کی تعداد بہت کم رکھی ہے، جو

متقدمین کی خصوصیت تھی، رعایت لفظی زیادہ نہیں، لیکن صحت زبان اور محاورات و ضرب الامثال بندی کے سوا اور کوئی بات مشکل سے موجودہ دور ادب اور مذاق سلیم کے لئے دل چسپ ہوسکتی ہے ۔

دیوان کے شروع میں مرحوم کے صاحبزادے شیخ طاہر علی صاحب کا ایک صفحے کا دیباچہ ہے، اس کے بعد مولوی معین الدین صاحب بی اے (کاتب) بورسٹو ایڈیٹ لا لکھنو کا ایک بسیط مقدمہ ۲۸ صفحات کا ہے، جس میں مصنف کے سوانح حیات، خصوصیات کلام، خصائل، مزاج، تصانیف و کلام پر تبصرہ اور بہت سی باتیں آگئی ہیں، تاہم ہمارے خیال میں یہ مقدمہ ابھی تشنہ ہے۔ اس میں کئی اور اہم چیزیں رہ گئی ہیں ایک تو ان کے تصانیف کا ذکر تفصیلی نہیں ہے۔ بعض کا نام تک مذکور نہیں۔ دوسرے ان کے تلامذہ کا بالکل ذکر نہیں اس کے علاوہ بعض اور بھی قابل تذکرہ باتیں چھوٹ گئیں ۔

دیوان اس مطلع سے شروع ہوتا ہے :

مرا حق مان کر بن تو مرا حاجت روا ہونا
کہ میں مانے ہوئے ہوں اے خدا تیرا خدا ہونا

پہلے مصرعے کے لفظ بن پر دوران طباعت میں بحث ہو چکی ہے، آخر میں تمام "عقیدت مند" اسی نتیجے پر پہنچے کہ اپنی کوتاہ نظری تسلیم کرلی جائے، اور اُن پر حرف نہ رکھا جائے، مطلع بجنسہ رہنے دیا جائے لیکن یہ ہمارے خیال میں زبردستی ہے، جو بات سچ ہو وہ کہنی چاہیے کہ بن یہاں کسی طرح نہیں کھپتا، ورنہ ردیف بیکار ہوتی ہے، کیا لکھنؤ میں اب کوئی ایسا زباں داں نہیں جو اس معمے کو حل کرتا، یا اسے کم از کم کتابت ہی کی غلطی سمجھ لیا جا سکتا۔ یہ مطلع طبع دیوان کے وقت ہمارے ایک دوست کے پاس بغرض استفسار آیا تھا تو انھوں نے یہ لکھ دیا تھا کہ یہ لفظ (بن) نہیں بلکہ (ہی) یا (بھی) ہے، اس صورت میں مطلع ٹھیک ہو جاتا ہے، اور شعرا نے بھی اپنی اپنی رائیں پیش کیں مگر عقیدت مند کب مانتے ہیں۔ یہ پہلی غزل حمد میں ۷ شعر کی ہے مگر کوئی شعر خاص طور پر قابل ذکر نہیں، دو ایک شعروں میں ناگوار تنقید بھی ہے دوسرے صفحے سے عشقیہ کلام شروع ہوتا ہے، پہلا مطلع یہ ہے:

بکتے بکتے تو، تو اے ناصح مرا سر کھا گیا
دل گیا میرا تو پھر تیری گرہ سے کیا گیا

یہ "تیری گرہ سے کیا گیا" نظم کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ ایسے شعر وہ خود جہت پسند کرتے اور فخر یہ جھوم جھوم کر سناتے تھے۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

کچھ شباب آتے ہی آج اس پر توکل اس پر ستم
اک ذرا سا حسن کیا پایا کہ تو، اترا گیا

اس میں زبان کا جو لطف ہے، وہ تو اہل نظر سے مخفی نہیں لیکن پہلے مصرعے میں (کچھ) کچھ یونہیں سا ہے، اور دوسرے میں "ذرا سا حسن" معشوق کے لیے کہنا صحیح ذوق محبت کے منافی ہے۔ سچ یہ ہے کہ حضرت شوق کی شاعری محبت کی شاعری نہیں بلکہ رسمی غزل گوئی تلازمہ و محاورہ بندی ہے۔ اور فرماتے ہیں:

مرے منہ پر کسی سے لے کے تجھ کو پان کھانا تھا
ترے ہونٹھوں کو میرے خون کا بیڑا اٹھانا تھا
یہ آہیں چند میں نے کھینچ دیں صرف اوپرے دل سے
اثر کی کب تمنا تھی فقط اُس کو ڈرانا تھا

آہیں کھینچ دینا، یا کھینچ لینا، دونوں ٹھیک نہیں۔ آہیں کھینچیں ہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔ پہلے شعر میں "مرے منہ پر" بھی اچھا نہیں ہے۔ اُس زمین میں یہ شعر خوب کہا ہے:

تمہاری، غیر کی، ناصح کی، اب تو سب کی سنتے ہیں
کسی کی ہم نہیں سنتے تھے وہ بھی اک زمانا تھا

حقیقت میں بہت پاکیزہ شعر ہے، یہ حالت ایک وقت انسان پر گذرتی ہے اور پھر ضرور اس کی یاد آتی ہے —

ذیل کے مطلع میں بھی ایک بات نظم کی ہے، یہ اور اس قسم کے کثرت سے اشعار ایسے ہیں، جن پر خود مصنف کو ناز تھا، اور بہت سے احباب و عقیدت مند محض مروتاً شوق سے سنتے اور جوش و خروش سے داد دیتے تھے۔ آخر میں تو وہ صرف لغت و زبان کی ضرورت سند کے لئے شعر کہا کرتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ محاورات نظم میں بندھ جائیں تاکہ لغت کی کتابوں کے لئے سنداً آئندہ کام آئیں فرماتے ہیں:

دل کھوتا ہے، ہم کو اس سے راز عشق نہ کہنا تھا
"گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" اتنا سمجھے رہنا تھا
کیوں ہنستے ہو، میں جو برہنہ آج جنوں کے ہاتھوں ہوں
کچھ دن گزرے میں نے بھی خوش رنگ لباس اک پہنا تھا

خوش رنگ لباس سے غالباً جوگیا لباس مراد ہے جو بعد کو شدت جنوں نے اتار

پھنکوایا اب شاعر ننگا پھر رہا ہے اور لوگ اس فطری لباس پر ہنس رہے ہیں -
یہ مقطع میر تقی کی شاعری اور اُسی دور قدیم کی یاد دلاتا ہے :

ہمت ہاری ' جی دے بیٹھے' سب لذت کھوئی اے 'شوق'
مرنے کی جلدی ہی کیا تھی ' عشق کا غم کچھ سہنا تھا

متقدمین کی طرح چھوٹی اور طویل بحروں میں ' آخر عمر میں بہت طبع آزمائی کی ہے ' مگر دل میں وہ درد ' وہ کسک نہیں ' نہ صحیح مذاق شعری ' اور محبت کی چاشنی ہے - بعض بعض شعر ضرور قابل قدر ہیں ' یہ شعر بھی بڑے مزے کا کہا ہے :

آنکھ اس ادا سے اُس نے دکھائی کہ میں نے ' شوق '
چھکے سے اپنا مے کا بھرا جام رکھ دیا

کوئی نئی بات نہیں ' مضمون پامال و فرسودہ ہے لیکن زبان کی صفائی و سادگی اور بندش کی برجستگی وچستی نے خاص مزہ پیدا کردیا ہے - یہ شعر اُنہیں کے رنگ کا ہے:

وہ بد خو ہے ' اور ٹھکانا ڈھونڈتے ہیں دل بہلانے کا
اب سے آئے گھر سے آئیے ' نام نہ لوں گھر جانے کا

اس کے دوسرے مصرعے میں بھی ایک محاورہ کامیابی کے ساتھ نظم کیا ہے - رامپور کے قیام میں جب کہ حضرت شوق کا آخری دور تھا ' وہ ایسی بحروں میں فکر کرتے تھے ' قدرت کلام حاصل تھی - مگر رعایت لفظی اور محاورہ بندی ہاتھ سے کہاں جاتی ہے - درد و اثر ' جذبات نگاری' محاکات ' جو تغزل اور شعر کی جان ہے' بہت کم پائی جاتی ہے - البتہ کہیں کہیں کچھ جھلک ہے ' مثلاً

بو آتی ہے ساتھ ہر نفس کے   کچھ جلنے لگا کباب کا سا

بیٹھ گیا 'شوق' ایک گلی میں   کیا جانیں کیا جی میں آیا
شباب آیا ' وہ آفت ڈھا رہے ہیں   نئی دولت ملی اترا رہے ہیں
نہ پوچھو غم میں دل کے ضعف کا حال   کہاں کا دل ہمیں اب کیا رہے ہیں
جلتے ٹکڑے ہیں دل ناکام کے   سب نگینے ہیں تمہارے نام کے
پڑتی ہے تجھ پر فرشتوں کی نظر   منہ چھپا او سونے والے بام کے
سن کے میر انام بولے کون 'شوق' ؟   سیکڑوں دنیا میں ہیں اس نام کے

کیا مزیدار شعر کہے ہیں ' زبان کی سادگی قابل داد ہے' اور سنئے :

کچھ دل کی سناؤں کچھ جگر کی   بیٹھو تو کہوں اِدھر اُدھر کی

ذیل کا شعر کیا لا جواب کہا ہے :

دامن کو زرا بچاے رہنا　　دنیا نہیں گرد ہے سفر کی

کٹ گئی عمر لکھتے لکھتے خط　　اور ابھی حال عشق مجمل ہے

بہر حال دیوان شوق جیسا کہ مقدمہ نگار صاحب نے لکھا ہے " زیادہ تر اس غرض کے لئے ہے کہ آئندہ کے طالبان فن اور محققین زبان ان کے نتائج کتب بینی اور پنجاہ سالہ تجربے سے فائدہ اٹھائیں " مگر شاعرانہ دل فریبیاں بھی اس کے صفحات میں ملتی ہیں اور وہ قدیم طرز میں بھی بندش سے بعض اوقات خاص لطف پیدا کر دیتے ہیں ۔ مثلاً :

ہم نہ مانیں کہ کھلی سرخی خواب آنکھوں سے
پھوٹ نکلا ہے ترا رنگ شباب آنکھوں سے
دو گھڑی کے لئے وہ آے تو دو گھر لوٹے
لے گئے چھین کے دل سینے سے خواب آنکھوں سے

کیا مشکل زمین ہے ، جس میں (آنکھوں سے) ردیف ہے ، مگر کیا اچھے اچھے شعر اپنی مشاقی اور قادر الکلامی سے نکال لئے ہیں اور دیکھئے :

اتنی تو اس نے کی مری دل سوزیوں کی قدر
تربت پہ اک چراغ سر شام رکھ دیا
گل ہو کے میں کیا ہنستا ایسا نہ تھا غم میرا
شبنم کی طرح گزرا روتے ہی جنم میرا

اس میں جنم گزرا باندھا گیا ہے ، خدا جانے یہ کہاں تک بلحاظ زبان ٹھیک ہے نئے نئے قافیوں اور ردیفوں میں کثرت سے دیوان شوق میں غزلیں ملیں گی ۔ یہ کیا خوب کہا ہے :

رونے سے میرے کھل گیا ظالم پہ درد عشق
ہچکی جو آئی ، منہ سے کلیجا نکل پڑا

' ذوق وظفر کی طرح ہم لکھ چکے ہیں کہ حضرت شوق محاورہ بندی و مثل بندی کا جیسا ذوق ہے ویسا ہی مشکل زمینوں میں بھی کہنے کا ذوق و ملکہ رکھتے ہیں اور ایسے ایسے شعر نکالے ہیں کہ ان کی قدرت کلام کو ماننا پڑتا ہے مگر اپنا رنگ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ فرماتے ہیں :

میں غیر ہوں اس سے کھٹک جاے تو اچھا
دل اس کا مرے دل سے اٹک جاے تو اچھا

دل مرا ٹوٹا تو اس کو کچھ ملال آ ہی گیا
اپنے بچپن کے کھلونوں کا خیال آ ہی گیا
وصل کی شب مجھے کیا کیا ہوئے دھڑکے اے شوق
اس کی پرچھائیں میں تھا نور سحر ہی کا سا
کچھ ہٹا رنگ اسکی مہندی کا تو لطف آنے لگا
چاند کا ٹکڑا وہ ہر ناخن پہ چمکا نے لگا

دو شعر یہ بھی کیا خوب ہیں :

ہاتھوں سے مہنگے چھپا کر دل مفت لو کسی کا
یوں بھی کہیں ہوا ہے سودا ہنسی خوشی کا
پا مردی جنوں نے کیا کیا دکھائیں سیریں
وارفتہ ہو گیا میں صحرا کی زندگی کا

یہ زمین دیکھئے :

سر کو کسی معشوق پہ وار آؤں تو اچھا
جن عشق کا یوں سر سے اتار آؤں تو اچھا

اس قسم کا ابتذال مذاق ہمارے قدیم استادان فن کے کلام میں اکثر ہے ' اور یہ نتیجہ ہے لفظی شاعری کا - ذیل کے شعر میں ایک بات پیدا کی ہے ---

جبر شیوہ نہیں ارباب وفا کا ورنہ
تو مقید کشش دل کے اثر میں رہتا
حسن خالق نے دیا تھا تو دیا تھا لیکن
یہ بھی کیا اس نے کہا تھا کہ ستم گر ہونا
جان اب نہیں باقی ہے مجھے دفن کرا دو
تم دل پہ نہ جاؤ یہ اچھلتا ہی رہے گا
دل کا دینا مجھے کیا آپ ہی منظور ہوا
پھٹ پڑی اس پہ جوانی تو میں مجبور ہوا
میری قسمت سے ہوا نذر تغافل وہ بھی
میں تو سمجھا تھا کہ جور اب ترا دستور ہوا

ناخن اب کاوش ہر روزہ کے غم سے چھوٹا
مستقل لطف ہوا' داغ جو ناسور ہوا

ضعف میں بھی کام مثل رنگ چل ہی جائےگا
ہو نہ ہو جنبش مرا پہلو بدل ہی جائےگا

ذیل کا شعر بھی آج کل کون پسند کریگا :

یاد آئے کا چھٹی کا دودھ' جس دن اے مسیح
اس لب معجز نما کا سامنا کرنا پڑا

اس زمین میں اور بھی شعر ہیں مگر ہمارے کام کا کوئی نہیں' ابتذال کا ایک شعر اور دیکھیے :

بلبل سے لڑا دیتے ہیں گُل مجھ کو دکھا کر
دیتے ہیں وہ دھوکا کہ یہ ہے گال ہمارا

یہ شعر اچھا کہا ہے :

میں کس امید پہ دیکھوں ستم ظریف کا منہ
جواب ایک تبسم ہے سو سوالوں کا

یہ پوری غزل سلجھی ہوئی اور اچھی ہے - پھر کہتے ہیں :

دل پڑا نظروں کی تیغوں میں تو کٹ ہی جائے کا
ٹکڑے ٹکڑے ہوکے پھر غمزوں میں بٹ ہی جائے کا

ہم وہ نہیں کہ حشر میں قائل ہوں آپ سے
میدان ہی میں اٹھ کے قدم لہلگے دیکھنا

یہ شعر داد طلب نکل گیا ہے :

وہ دن فراق کا کہ نہ لائے خدا جسے
اس عشق میں بدا ہے بہر طور دیکھنا

کچھ سہارا مرے جینے کا رہا ہی کب تھا
ابھی مرنا نہیں تم نے یہ کہا ہی کب تھا

دل ہی قابو میں نہیں تجھ پہ جو قابو ہو تو کیا
پاس دونوں سے ہے اب دل ہو تو کیا تو ہو تو کیا

تب تو مارا مجھے حشر آیا تو گھبرائے نا ؟
میں جو کہتا تھا کہ پچھتاؤگے پچھتائے نا ؟

کوئی مقام نظر آگیا جو بن کا سا کہا جنوں نے کہ یہ ہے مرے وطن کا سا

یہ سب غزلیں مشکل زمینوں میں ہیں' اور یہ زیادہ تر خود حضرت ہی کی

ہی کی اختراع ہیں ۔ شعر تقریباً ایسے ہی ہیں جیسے یہ مطلعے ہیں ' یہ شعر غور طلب ہے :

چمن سے صبر ہے مجھہ تک ہوا تو آنے دے
نہ بستگی کو مرے پنجرے پہ کس صیاد

اس غزل میں کس ' بس قافیہ ہے ۔ اور اس شعر میں ' پنجرا ' بر وزن فاعلن کہا ہے' حالانکہ زبانوں پر تو 'پنجرا' بر وزن فعلن ہے ۔ مقصود شعر صرف بستگی کو باندھنا تھا اور کچھہ نہیں ۔ ایک یہ زمین نکالی ہے :

سبزہ رنگوں پر لہرائے ' شوق کریں وہ تلنگ تو پھر؟
بھنگ کا کھانا سہل ہے لیکن موجیں لائیں رنگ تو پھر؟

عجب زمین ہے ' اس میں شعر کہنا مشکل ہے ۔ کلام موزوں البتہ ہوسکتا ہے ۔ دوسرے مصرعے میں بھنگ کھانا محل تامل ہے بھنگ پینا زیادہ متعارف ہے ۔

کالوں سے عارضی اس کا شباب آیا نظر
گھونگھروں سے حسن رخ پادر رکاب آیا نظر

موت آگئی اب آئے تو کیا دوگے تم آکر
کچھہ نہند نہیں ہے کہ جگا دوگے تم آکر

ہم بھی ہیں ولولوں پہ جو وہ ہیں اُمنگ پر
دونوں تلے ہوئے ہیں برابر کی جنگ پر

یہ سب شعر خاص اُن کے رنگ کے ہیں ۔یہ شعر کیا خوب کہا ہے :

دل پڑگیا کشاکش امید و بیم میں   درپر کبھی نظر ہے کبھی پاسبان پر

مضمون رشک اکثر شعرا نے باندھا ہے ' حضرت شوق فرماتے ہیں :

اس رشک سے لکھا نہ کبھی میں نے ' شوق' خط
آئے گا اس کا نام قلم کی زبان پر

یہ شعر بھی خوب کہا ہے اور ایسی زمینوں میں شعرائے موجودہ کو ضرور فکر کرنا چاہئے بلکہ ان کا عام رواج ہونا چاہئے کہ قید ردیف سے آزاد ہیں ۔ فرماتے ہیں :

وارفتگی عشق میں باقی نہ رہے ہوش
ہستی مری مجھہ کو ہوئی اک خواب فراموش

جس ستم گر نے کیا لاکھوں تمناؤں کا خون
یاد کرتی ہے تمنا پھر اس کو آج کل

"کو آج کل" اس غزل کی زمین ہے، مگر یا کیزہ شعر نکالا ہے ۔ اور فرماتے ہیں

ملنے والے چھوڑتے جاتے ہیں کچھ رو جان کر
جا رہے ہیں ہم دیار بیکسی کو آج کل

یہ کچھ کچھ کہنا نہیں - چند اور منتخب شعر لکھتا ہوں :

ظالم کی جفا کم نہ مرا درد جگر کم
ہے لاگ برابر کی ادھر کم نہ ادھر کم
مل کے ہوئے جو آشنا ہم سے نظر، نظر سے ہم
کٹ کے ہوئے جدا جدا ہم سے جگر جگر سے ہم

وہ ترس کھا کر جو دل سے مجھ حزیں کی سی کہیں
لب نمک پروردہ ان کے ہیں انہیں کی سی کہیں
غرور جور کا بانی ہے اور کچھ بھی نہیں
یہ مقتضائے جوانی ہے اور کچھ بھی نہیں

نفس کی چال ترے گھر سے چل کے جاتے ہیں
یہیں پھر آتے ہیں جب ہم نکل کے جاتے ہیں

ہے آئینے میں اپنا محو دیدار آپ ہی اب تو
وہ اپنی تاک چوتی ہے گرفتار آپ ہی اب تو

گلیوں گلیوں ہم نے لاکھوں کنکرے پھتر کھائے ہیں
لڑکوں نے دیوانہ پا کر ناک چنے چبوائے ہیں

ان دونوں مذکورہ شعروں میں صرف دو محاورے باندھنا تھے، وہ تو بندھ گئے مگر مذاق لطیف کا خون ہو گیا - اور سنئے :

دل ہے فریادی کہ دست ظلم کا گل ہے دراز
باندھ لو جوڑا کہ قصہ مختصر ہی کیوں نہ ہو

یہ غزل کیا خوب کہی ہے:

دل لوٹکے گئی ہے کہ جگر لے کے گئی ہے
کچھ تو مرے پہلو سے نظر لوٹکے گئی ہے

اللہ کرے آج نہ پلٹائے اسے یاس
امید جسے جانب در لیکے گئی ہے
باد سحری ان کو مرا حال دکھانے
سوکھا ہوا اک برگ شجر لیکے گئی ہے

ذیل کا شعر مصنف نے نکالدیا، مگر ہمیں یاد رہ گیا تھا، دیوان میں نہیں ہے:

برچھی سے کبھی میلے چرا یا نہیں پہلو
جب آئی ہے تب لخت جگر لیکے گئی ہے

یہ غزل کیسی مشکل زمین ہے مگر مطلع ہی سے اس کا اندازہ کر لیجیے:

روؤں اے بادل تو جل تھل بھر کے چھوڑ وں تو سہی
تجھہ کو میں پانی سے پتلا کر کے چھوڑوں تو سہی

"تو سہی" کی ردیف میں صرف اپنا کمال اور مشاقی دکھانا تھا۔ ابتذال کی حد ہوگئی

یہ شعر خوب کہے ہیں:

ہر روز ترقی یہ جو ہے حسن کی صورت
ایک ایک سے ملتی نہیں تصویر کسی کی

اس قافیے میں یہ شعر خوب کہا ہے اور مجھے بہت پسند آیا:

پہنچا ہے جنوں تک اثر جوش گل ایسا
بلبل سی چھکنے لگی زنجیر کسی کی

یہ مطلع بھی بہت پاکیزہ کہا ہے:

کیا قیامت ہے کہ چڑھتا ہے نہیں سے کوئی
روز اک دل انہیں دے لا کے کہیں سے کوئی
گر پڑا ہاتھہ سے آئینہ، یہ ہم نے دیکھا
پوچھے اب اُن کے تحیر کو انہیں سے کوئی
ان بلاؤں نے کہاں سے مرا گھر دیکھہ لیا
کہ فلک سے کوئی آتی ہے زمیں سے کوئی

وہ خوش کہ ہے جگر کو نظر میں لئے ہوے
میں خوش کہ ہوں نظر کو جگر میں لئے ہوے
زلفوں سے دل کو پھونک بھی دو ورنہ عمر بھر
بیٹھے رہو گے درد وہ سر میں لئے ہوے

دوسرے مصرعے میں 'درد کو' تھا پھر مصنف نے 'درد وہ' بنایا - لیکن حقیقت یہ ہے کہ 'کو' اور 'وہ' دونوں برائے بیت ہیں - ذیل کا شعر کیا خوب کہا ہے حالانکہ زمین بہت مشکل ہے -

خدا ہی ہے مری توبہ کا جب ساقی کہے مجھ سے
ارے پی بھی کہاں کی پارسائی لے کے بیٹھا ہے

دیکھنا اس کا نہ ہو اے شوق اگر مد نظر
آنکھ میں پتلی تو پتلی میں نظر ہی کیوں بنے

بچپن میں جو اُڑاتے تھے کل پر لگے ہوئے
سر آج اُڑا رہے ہیں وہ خنجر لیے ہوئے

قد جو اوروں سے ہے نیچا تو نہ شرماؤ تم
ناز سے باغ میں نخل گل تر نیچا ہے

دونوں شعر ابتذال ذوق کے گواہ ہیں اور ذیل کے شعر خوب ہیں :

ہماری جان وہ کیا لیں بدن میں جب ہو بھی
بدن بھی کھلکے ملا پیرہن میں جب ہو بھی

غالباً اہل زبان ایسی جگہ 'جب ہو بھی' کی جگہ 'ہو بھی' اب کافی اور فصیح سمجھتے ہیں —

دراز دستی زلف رسا کے ہم قائل
مگر کہاں دل وحشی بدن میں جب ہو بھی

چھری کے وار پہ منہ سے دعا نکلتی ہے
کسی کا ہاتھ، کسی کی زبان چلتی ہے

بتاؤں کیا شب فرقت میں سانس کی حالت
تمام رات چھری سی جگر پہ چلتی ہے

ہوا نہ بگڑے کہاں تک دیار الفت کی
تری زبان تو ہر وقت زہر اُگلتی ہے

ہوا ہو، چاہے زمانہ ہو چاہے، رنگت ہو
زیادہ سب سے تمہاری نظر بدلتی ہے

مذکورہ غزل کیا خوب کہی ہے، مشکل زمینوں میں دو تین شعروں کی اور رحمت فرمائیے—

تیر کو کیوں دوں کہ جس رخ جائے وہ دل لے کے جائے
دوں نظر کو جو پھرے ادر سوئے قاتل لے کے جائے

جھڑکیاں ان کی سہوں میں یہ تو ممکن ہے مگر
مسکرا ہی کیوں نہ دیں غصہ اُتر ہی کیوں نہ جائے

یہ جناب شوق قدوائی مرحوم کے رنگ تغزل پر ایک بسیط نظر تھی، حقیقت یہ ہے کہ اس کے لئے وہ پیدا ہی نہیں ہوے تھے - مگر زمانے کی بد مذاقی کی ادھر بہا لے گئی، اور پھر ایسا رنگ چڑھا کہ طبیعت ثانیہ بن گیا - ورنہ وہ صرف بیانیہ نظموں کے لئے پیدا ہوے تھے - اور ان کی بہت سی نظمیں بے مثل ہیں، بہت مقبول ہیں، کورس میں شامل ہیں، اور ارباب ذوق شوق سے پڑھتے ہیں - ہمیں یقین ہے کہ ان کے بلند اقبال صاحبزادے شیخ طاہر علی اور داماد لائق شیخ رضی الدین صاحب بیرسٹر ان کی نظموں کو بھی اسی شان اور اہتمام سے جلد چھپوا دیں گے - اور مقدمے میں جو کمی رہ گئی ہے وہ پوری ہوجائے گی - تاکہ اس بلند پایہ شاعر کی اصلی کاوش فکر کے نتائج سے دنیا محروم نہ رہے اور یوں دیوان کے مطالعے کے بعد ناظرین مایوس نہ ہوں بلکہ اس کوفت کی پوری تلافی ہوسکے —

عناصر اربعۂ رباعی (فارسی)

مؤلفہ مولوی مسعود علی صاحب بی - اے، ملنے کا پتہ : آقا سید محمد علی
پروفیسر نظام کالج، حیدرآباد - دکن - قیمت ۶ آنے، حجم ۵۶ صفحے۔
سائز ۱۸ × ۲۲ - لکھائی چھپائی، کاغذ متوسط

یہ ایک فارسی لکچر ہے، جو مؤلف صاحب نے " شعبۂ جامعۂ معارف ایران در حیدرآباد" کے ایک جلسے میں ۲۱ جمادی الثانیہ سنہ ۱۳۴۴ ھ کو دیا تھا، اور اب شایع ہوا ہے - اس میں رباعی کی تاریخ، اس کے اوزان مقررہ کے بعد اپنے خیال کے موافق یہ بتایا ہے کہ فارسی ادبیات میں رباعی کے چار نمایاں عناصر بابا طاہر عریاں، ابو سعید ابوالخیر، خیام اور سحابی استر آبادی ہیں - ان نامور شعرا کے مختصر حالات بھی دیے ہیں اور کچھ کلام بھی پیش کیا گیا ہے - رباعی پر یہ ایک اچھا خاصہ چھوٹا سا رسالہ ہے —

غالب اور اس کی شاعری

از مولوی احمد الدین احمد صاحب مارہروی بی - اے، سائز چھوٹا -
قیمت ۶ آنہ حجم ۴۰ صفحے - لکھائی، چھپائی، کاغذ متوسط
ملنے کا پتہ : سفیر بک ایجنسی - سبزی منڈی - الہ آباد -

یہ مسلمہ ہے کہ ہندوستان میں جتنی روشن خیالی، تعلیم، اور سلامت مذاق بڑھتی جاتی ہے، اتنی ہی غالب شناسی بھی ترقی کر رہی ہے اور کرے گی - یہ رسالہ

بھی حالی و بجنوری کی حقیقت کوش نوا کی ایک صدائے باز گشت ہے۔ مؤلف نے مختصراً غالب کے کلام سے اس کا کمال ثابت کیا ہے اور یہ کہ حکمائے یورپ کے نزدیک حقیقی شاعری کیا ہے، شعر کی اصلی روح کیا ۔ اور وہ غالب کے یہاں ایک بدرجۂ اتم موجود ہے۔

مذہب

اسلام اور غیر مسلم

مولفۂ : مولوی محمد حفیظ الله صاحب پھلواروی۔ ملنے کا پتہ : مسلم بک ڈپو پھلواری شریف ضلع پٹنہ (بہار) سائز چھوٹا، لکھائی، چھپائی ، کاغذ متوسط۔ حجم ۷۲ صفحے، قیمت ۸ آنے)

یہ اسلام کے خلاف اعتراضات کا ایک مفید تردیدی رسالہ ہے اور اس قسم کے مفید رسالے جناب مؤلف اور بھی شائع کر چکے ہیں جو نہایت مقبول ہوے ہیں - بعض کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہو گیا ہے اسلام پر یہ ایک عام دشمنان اسلام کا اعتراض ہے کہ وہ تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے ۔ اس کا نہایت متین رد اس مختصر رسالے میں ہے —

تعلیم

بچوں کا دستور العمل (یا) سیرت و کردار

مصنفۂ مولوی محمد عبدالرحمن صاحب رئیس - ملنے کا پتہ: مکتبۂ ابراھیمیہ اسٹیشن روڈ ، حیدر آباد دکن قیمت آٹھ آنے حجم ۶۰ صفحے

یہ چھوٹا سا رسالہ مؤلف نے بچوں کی ابتدائی تربیت اور اصلاح اخلاق کے لیے لکھا ہے قلم جلی ہے اور چھوٹے چھوٹے سبق ہیں - مثلاً : مدرسہ ' لباس ' وقت کی پابندی ' قرض ' حسد وغیرہ - زبان سہل ہے - جسے بچے بخوبی پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں ' اور اُن کے لیے مفید بھی ہے - بعض زبان اور کتابت کی غلطیاں البتہ محتاج اصلاح ہیں قیمت بھی زیادہ ہے اور نام بھی ہمارے خیال سے بھونڈا اور لمبا ہے —

فلسفۂ رنج و راحت

مصنفۂ مولوی عبدالرب صاحب 'کوکب' مولوی فاضل اڈیٹر
رسالۂ اتالیق - حیدرآباد دکن - سائز چھوٹا - حجم ۵۶ صفحے '
قیمت دس آنے - لکھائی ' چھپائی ' کاغذ معمولی —

اس مثنوی میں مصنف صاحب نے یہ بتایا ہے کہ انسان کو ہر وقت خوش و مسرور رہنے کی کوشش کرنا چاہیے اور جو کچھ غم و آلام اُسے ہوتے ہیں ' ان کے اسباب وہ خود پیدا کرتا ہے- ذوق سلیم ہو تو ہر شے سے آدمی انبساط حاصل کرسکتا ہے - مثنوی کا بیان ذرا خشک ہے - اور شعری محاسن و دل کشی کم ہے - قیمت بھی بہت زیادہ ہے —

معیارالاخلاق عربی

از مولوی عبدالرب صاحب 'کوکب' مولوی فاضل مدیر رسالۂ اتالیق
حیدرآباد دکن- قیمت درج نہیں - ملنے کا پتہ : مؤلف' محلہ
شاہ علی بنڈہ - حیدرآباد - دکن سائز ۱۸ × ۲۲ لکھائی'
چھپائی' کاغذ نہایت خراب -

یہ ایک عربی کا مختصر رسالہ ہے - جسے مبتدی عربی پڑھنے والوں اور کم عمروں کے لیے اخلاقی تعلیمی رسالہ سمجھنا چاہئے مختلف عنوانوں اور سرخیوں کو قائم کر کے اخلاق کی حقیقت ' اخلاق شریفانہ ' رذائل اخلاق آسان عربی میں بتائے گئے ہیں —

گاے بیل

(مؤلفۂ جناب محمد نصیر ہمایوں صاحب بی - اے - قومی کتب خانہ ریلوے روڈ ' لاہور) —

یہ صاف اور سلیس زبان میں چھوٹی سی کتاب گاے بیل پر ہے - اس میں گاے بیل کی نسل' دودھ' بیماریوں' خوراک ' ان کی دیکھ بھال وغیرہ کے متعلق تمام حالات بہت اچھی طرح بیان کئے ہیں - تصویریں بھی دی ہیں —

ظریف معلم جلد اول و دوم

مؤلفۂ بابو ادیتہ پرشاد صاحب بی - اے' ال - ال - بی' وکیل لکھنؤ -
قیمت فی جلد ۵ آنے - ادیتہ بھون' لکھنؤ)

قابل مؤلف نے باتوں باتوں' لطیفوں' چٹکلوں اور حکایتوں میں بچوں کو پڑھنے لکھنے کی چاٹ لگائی ہے - اسی کے ضمن میں اخلاقی سبق بھی آ گئے ہیں - اکثر سبق مکالمے کی صورت میں ہیں اور بہت دلچسپ ہیں - آج کل بچوں کے لئے بہت سی کتابیں لکھی جارہی' ہیں' لیکن ایسی پر لطف کتابیں دیکھنے میں نہیں آئیں - زبان بہت صاف ستھری اور بامحاورہ ہے - کہیں کہیں سادہ تصویریں بھی ہیں - بچوں کے لئے یہ بہت اچھا تحفہ ہے —

تاریخ و سیر

مزارات حرمین

مؤلفۂ مولوی علی شبیر صاحب سررشتہ دار انتظامی ہائی کورٹ حیدرآباد ۔ دکن
مطبوعہ انوارالاسلام پریس - قیمت ۳ روپیہ ۸ آنہ - حجم ۳۰۰ صفحات
سے زیادہ - مجلد فل کلاتھ ۲۰ × ۲۶ - لکھائی' چھپائی عمدہ کاغذ متوسط سفید

جناب مؤلف کا یہ سفرنامۂ حرمین بھی ہے اور حقیقت میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مشہور مزارات و مقابر کی ایک جامع اور مفصل تاریخ ہے ۔ جناب مؤلف

مذہب سے محبت اور اسلامی درد اپنے دل میں رکھتے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔
وہ سنہ ۱۳۴۵ھ میں زیارت حرمین اور فریضۂ حج کے لئے گئے تھے اور ابن سعود والی حجاز
و نجد نے ایک عبا بھی مرحمت کی تھا۔ انھوں نے حرمین کے مزارات اور مقابر کا یہ
تذکرہ نہایت قابلیت سے مورخانہ انداز میں لکھا ہے۔ اس خاک پاک میں جتنے
مزار اور قبرستان تاریخی و مذہبی رکھتے ہیں۔ ان سب کو جستہ جستہ موصوف نے
دیکھا اور ان کی موجودہ و سابقہ حالت کو لکھا ہے۔ موجودہ حالت تو وہ ہے جو سعودی
حکومت نے شرعاً مقابر کی بلندی و پختگی کو ناجائز سمجھ کر انھیں ڈھا دیا ہے۔
اور سابقہ حالت کو موصوف نے عربی فارسی انگریزی کی تاریخوں اور یورپ و ایشیا کے
سیاحوں اور حاجیوں کے سفر ناموں سے اخذ کرکے بیان کی ہے۔ اس حیثیت سے یہ کتاب
اپنی موضوع کے لحاظ سے تاریخ کی ایک اہم کتاب ہوگئی ہے۔ اور اب تک غالباً اس خاص
موضوع پر عربی فارسی میں بھی کوئی کتاب نہ تھی۔ بیان میں کہیں مذہبی غلو نہیں
ہونے پایا ہے اور زبان بھی صاف شستہ ہے، جا بجا جغرافیہ و تاریخی نوٹ دے کر اور
زیادہ کتاب کو مفید بنادیا ہے، اب یہ مسلمانوں کے ان مقدس مقامات کے متعلق
تاریخی معلومات کا مفید عمدہ ذخیرہ ہوگئی ہے —

حیات جلیل

یعنی تذکرۂ علامۂ میر عبدالجلیل بلگرامی مؤلفۂ جناب مقبول احمد صاحب
صمدنی۔ دو حصوں میں۔ تعداد صفحات تقریباً چھ سو۔ مطبوعہ
رام نراین لال الہ آباد۔ قیمت تین روپے)

اس کتاب میں ہندوستان کے ایک نامور فاضل علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی
کا تذکرہ ہے۔ لیکن اس کے ضمن میں بہت سے مشاہیر اور مقامات واقعات کا ذکر آگیا ہے جو
تاریخی لحاظ سے بہت ہی قابل وقعت ہے۔ کوئی صفحہ حواشی سے خالی نہیں۔ حواشی
بجائے خود کتاب سے کئی گنا زیادہ ہیں، جو بعض اوقات بہت طویل اور کہیں کہیں
غیر ضروری نظر آتے ہیں، لیکن تاریخ کے شائق کے لئے وہ بہت کار آمد ہیں۔ فاضل
مولف نے اس تذکرے کو نہایت تحقیق، دلی شوق اور کمال محنت سے لکھا ہے۔ صدہا
کتابیں کھنگال ڈالی ہیں اور کوئی ماخذ جسے اس موضوع سے بعید تعلق بھی تھا، ان کی
نظر سے نہیں بچا۔ قابل مؤلف کی نظر اور معلومات بہت وسیع ہیں۔ اس کتاب کو
پڑھ کر سچی خوشی ہوئی، اور حقیقت یہ ہے کہ مؤلف نے لکھنے کا حق ادا کردیا ہے۔

کہنے کو تو علامہ میر عبدالجلیل کا تذکرہ ہے لیکن در اصل اس عہد کا تاریخی مرقع ہے -
جو لوگ اٹھتے بیٹھتے کتابیں لکھ ڈالتے ہیں اور تحقیق و محنت سے جی چراتے ہیں،
ان کے لئے سبق اور جو اس رستے پر چلنا چاہتے ہیں، ان کے لئے اعلیٰ نمونہ ہے - ہر
لکھنے والے کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ بغیر مسلسل محنت اور جانکاہی کے کوئی
اچھی چیز پیدا نہیں ہوسکتی —

جن صاحبوں کو ہندوستان کی تاریخ اور حالات سے ذرا بھی لگاؤ ہے وہ اسے منگا کر
ضرور پڑھیں —

یہ معلوم کرکے اور بھی خوشی ہوئی کہ وہ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے سوانح و
حالات لکھ رہے ہیں - وہ کتاب اس سے بھی زیادہ قابل قدر ہوگی —

اُردو کے جدید رسالے

ادبی دنیا

(ماہانہ - چیف اڈیٹر جناب تاجور نجیب آبادی، اڈیٹر جناب حنیف ہاشمی
لاہور - سالانہ چندہ تین روپے بارہ آنے)

یہ نیا رسالہ بہت آب و تاب کے ساتھہ، بہت بڑی تقطیع پر جناب شیخ سر عبدالقادر
کی نگرانی میں لاہور سے نکلنا شروع ہوا ہے - سر عبدالقادر کو اردو زبان سے خاص لگاؤ
ہے، انھوں نے اردو کی بہت خدمت کی اور کبھی اس سے غافل نہیں رہتے - "ادبی دنیا"
کو ان کی سرپرستی مبارک ہو - چیف اڈیٹر جناب تاجور بھی کسی تعارف کے محتاج
نہیں - وہ نئے نئے ڈھنگ سے اردو کی اشاعت اور فروغ کی کوشش کرتے رہتے ہیں - لاہور
کی سوسائٹی اور وہاں کے اخباروں اور رسالوں میں ان کا اثر کچھہ کم نہیں :

پہلے رسالے میں پہلا مضمون "ادبی دنیا کا مقصد اشاعت" ہے جسے "ایک انقلابی
ادبی پروگرام" سے موسوم کیا گیا ہے اس مقصد یا "انقلابی پروگرام" کا خلاصہ یہ ہے —

۱ - "تصنیفی اردو کو عام بناکر اس کے سمجھنے والوں کی تعداد کو بڑھانا" :

۲ - "اردو ادب کو دوسری علمی زبانوں کے خزانوں سے سرمایہ دار بنانا" —

۳ - "اردو انشا پردازی اور شاعری پر آسان زبان میں تعلیمی زبان کے ذریعے نوجوانوں
اور طلبہ میں صحیح ذوق ادب پیدا کرنا" —

۴ - "اردو شاعری کو بہت سی غیر قدرتی پابندیوں سے آزاد کرکے آزاد زبانوں کی شاعرانہ خوبیوں کا اس میں اضافہ کرنا" ـ

(ب) اردو گرامر میں ضروری تغیر و تبدل اور ایسے نئے قواعد کا اضافہ کرنا جن کی موجودگی میں جدید الفاظ، جدید تراکیب اور جدید محاورات صحیح قرار دیے جائیں جو اردو کی شرائین میں خون کی طرح پھیل گئے ہیں" —

(ج) " دوسری زبانوں کے ایسے آسان اور خوشگوار الفاظ اردو میں داخل کرنا جن کے ہم معنی لفظ اردو میں نہیں ہیں یا جن کا مفہوم ہم معنی لفظ کے مقابلے میں زیادہ وسیع اور خاص معنی کا حامل ہے" —

اخباری تعلی سے قطع نظر کی جائے تو یہ مقاصد، اگرچہ نئے نہیں مگر بہت معقول اور بہت خوب ہیں - ضرورت صرف عمل کی ہے - اردو اور ہندی پر یہ بجا اعتراض ہے کہ ان کے لکھنے والے زبان مشکل بناتے جاتے ہیں، لیکن اس کی وجہ بالکلیہ یہ نہیں ہے کہ ان کے انشا پرداز خواہ مخواہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر عربی اور سنسکرت کے لفظ اپنی عبارت میں داخل کرتے ہیں بلکہ ایک مجبوری بھی ہے - جدید تعلیم اور جدید علوم کی وجہ سے جو نئے نئے خیالات، نئے نئے اسلوب اور نئے نئے مفہوم پیدا ہو رہے ہیں، ان کے ادا کرنے کے لئے ان زبانوں میں سخت دشواری ہوتی ہے - جو لوگ اس سے بے خبر ہیں، وہ اس دشواری کو نہیں سمجھ سکتے اور جنھیں ان چیزوں سے سابقہ ہے وہ جب خون جگر کھا کر کچھ لکھتے ہیں تو ہمارے شاعر اور انشا پرداز اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں - زبان کی سلاست اور صفائی الفاظ پر نہیں، خیال کی صفائی اور سلاست پر ہے - پھر مضمون طرح طرح کے ہیں، ہر مضمون کے لئے ایک سی زبان استعمال نہیں ہو سکتی - اور پھر اپنی اپنی طبیعت ہے، طرز تحریر کا انحصار ہر شخص کی طبیعت پر ہوتا ہے - علاوہ اس کے مشکل اور آسان اضافی چیزیں ہیں - جو چیز کل آسان تھی آج مشکل ہے، اور آج جسے مشکل کہتے ہیں کل آسان خیال کی جائے گی - نئے نئے خیالات کے ادا کرنے کے لئے جب لفظ نہیں ملتے تو انہیں مجبوراً عربی اور سنسکرت کی طرف ہاتھ بڑھانا پڑتا ہے - باوجود اس کے ہم فاضل اڈیٹر سے بالکل متفق ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو صاف ستھری اور سلیس زبان لکھی جائے - مگر اس کا کیا علاج جب خود اڈیٹر صاحب ایسی زبان لکھتے ہیں جو ان کے بیان کردہ مقصد کے خلاف ہے - دو ایک نمونے ملاحظہ ہوں :

" کیا اس تلاش اور گدا گر مغنی کو بھی جو جو نیار نغمہ اندر بھیج رہا تھا ان جذبات کا احساس تھا جو ایک غیر مرئی سامع کے دل میں ماضی کی ایک آواز کی طرح بیدار ہو رہے تھے" —

" اس مرتعش آواز کی المناک یاد تازہ کردی "

" جس سے طبعیت پر ایک سائرفی السلام مغنی کی الجھی ہوی یا جلون خود فراموشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی " —

" بی - اے میں پنجاب یونیورسٹی کا ویکارڈ بہت کیا " - (بہت کا لفظ کس قدر مکروہ ہے)

یہی مضامین نگاروں کے مضامین کی حالت ہے - حالانکہ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر وہ وہ مناسب اصلاح کر سکتے ہیں تا کہ کم سے کم مطلب تو سمجھ میں آ جاے یا بے رابطی قائم نہ رہے - مثلاً ملاحظہ فرمایے :

" مادام رولاں کی شہرت کا سکہ جمنے سے پہلے بھی اس نو عمر لڑکی پر بہت سے نوجوانوں کی نگاہیں اٹھ رہی تھیں " (یہاں مادام رولاں اور نو عمر لڑکی دو الگ معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں ایک ہیں)

" اس سے اس کی انقلابی روح کا معیار معلوم ہوتا ہے "

" وہ اپنی غیر سلاست زبان اور قادر الکلامی سے اعصاب کی آخری مد ہوشی کو بھی بیان کر جاتا ہے "

" آہ ! خوفناک شعور کے طویل وقفوں کے ساتھ میں نے شراب پی "

" اس کا انجام کارکنان قضا و قدر کے ہاتھوں حسرت پرستوں کا انتہاے تمسخر معلوم ہوتا ہے " —

یہ چند جملے اعتراض کی نظر سے نہیں لکھے گئے ، بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس اصول پر عمل کس قدر دشوار ہے - شاید اسی خیال سے اڈیٹر صاحب ہر پرچے کے آخر میں مشکل الفاظ کا فرہنگ بھی لکھ دیتے ہیں ، لیکن اس سے کچھ کام نہیں نکلتا —

سب سے مشکل آخری مقصد ہے - اب تک جتنے پرچے شائع ہوے ہیں ان میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس میں اس مقصد کی تکمیل میں کوشش کی گئی ہو - البتہ مختلف زبانوں کے نظم و نثر کے ترجمے ضرور پیش کئے گئے ہیں لیکن وہ ایسے نہیں جن کی ہمیں ضرورت ہے —

باوجود ان تمام باتوں کے اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ 'ادبی دنیا' اردو رسالوں میں خاص وقعت رکھتا ہے - اس نے غور و فکر اور دلچسپی کا بہت اچھا سامان بہم پہنچایا ہے اور اچھی اچھی تصویروں سے رسالے کی دلکشی میں اضافہ کیا ہے - ہماری راے میں وہ مضمون اور نیرنگ خیال کے بین بین ہے - اس نے جن مقاصد کو پیش نظر رکھا ہے وہ بہت قابل قدر ہیں اور ہماری دلی

تمنا ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہو —

پیام تعلیم

(جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دہلی کا پندرہ روزہ تعلیمی رسالہ ۔
سالانہ چندہ دو روپے)

یہ رسالہ حقیقی طور پر تعلیم کا پیام ہے ۔ بہت سلیقے سے مرتب کیا جاتا ہے ۔ ہندوستان کے تعلیمی حالات اور عام تعلیم پر بہت اچھے اچھے مضمون ہوتے ہیں بچوں کے لئے چھوٹے چھوٹے مضمون اور قصے کہانیاں الگ ہوتی ہیں ۔ طالب علموں ، بچوں اور بڑوں سب کے لئے بہت ہی اچھا پرچہ ہے ۔ اس کے پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کیا ہے اور یہ بڑی بات ہے ۔ چندہ بھی بہت کم ہے —

مبصر

(ماہانہ ، لکھنؤ ۔ مدیر : جناب ابوالعلاء ناطق ،
معاون : جناب حکیم آشفتہ ۔ چندہ سالانہ چار روپے)

انکشاف

(ماہانہ لکھنؤ ۔ اڈیٹر جناب سید محمد نسیم ، چندہ سالانہ دو روپے)

خضر راہ

(ماہانہ لکھنؤ ۔ اڈیٹر جناب حامد علی ، چندہ سالانہ چار روپے)

یہ تینوں رسالے لکھنؤ سے شائع ہوتے ہیں ۔ خوشی کی بات ہے کہ لکھنؤ میں اس قسم کا علمی ذوق پیدا ہوتا جاتا ہے ۔ ان سب میں ' مبصر ' کا پایہ بلند ہے ۔ علمی اور ادبی مضامین بہت اچھے ہیں ۔ نظم اور افسانے کا بھی کافی حصہ ہوتا ہے اور رسالے کو ترقی دینے کی ہر طرح کوشش کی جاتی ہے —

رسالۂ انکشاف لکھنؤ کے محکمۂ عالیہ اسلامیہ ایک آنہ فنڈ کی جانب سے شائع ہوتا ہے اور اس کی آمدنی مساجد کی مرمت اور مدارس کی ترقی میں صرف کی جاتی ہے - یہ مقصد بہت مستحسن ہے - لیکن سوال اس میں ہے کہ آیا یہ رسالہ محکمۂ عالیہ کے لئے آمدنی کا باعث ہوسکتا ہے - ایسا نہ ہو کہ بجائے فائدے کے نقصان ہو - ادبی اور تاریخی مضامین کے ساتھہ مذہبی مضامین بھی درج ہوتے ہیں - اگرچہ تفسیر کلام پاک اور باب الفتاوی کے ساتھہ پیکر عصمت' معصوم عورت اور فریب نظر جیسے ڈرامے اور افسانے اور معمولی غزلیں کچھہ بے جوڑ سے معلوم ہوتے ہیں تصویروں کا بھی اهتمام کیا گیا ہے —

خضر راہ بھی اردو کے عام رسالوں کی طرح اردو ادب کی ترقی کا کوشاں ہے - اس میں بھی دوسرے رسالوں کی طرح نظم و نثر دونوں ہوتی ہیں - کوئی خاص بات ایسی نہیں جو امتیازی ہو -

---

کامیابی

(حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ کا ماهانہ رسالہ
اڈیٹر ڈاکٹر احمدسعید صاحب بریلوی سالانہ قیمت دو روپے دهلی)

حال هی میں ایک لمیٹڈ کمپنی "حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی" کے نام سے دهلی میں قائم هوئی هے جس کا مقصد اردو کتب کی اشاعت' نئی کتابوں کی تالیف هے - یہ خیال بھی خواجہ صاحب کے دماغ کی اپج هے - بہت اچھی سوجھی هے' اگر اس کا انتظام اچھے هاتھوں رها اور کام قاعدے اور اصول سے هوا تو اسے بہت بڑی کامیابی سمجھنا چاهئے - یہ رسالہ اس کمپنی هی کا هے جو اس کے مقاصد کی اشاعت کے ساتھہ ساتھہ بہت اچھے اچھے مضامین شائع کرتا رهتا هے - رسالے کا مقصد "مسلمانوں کی علمی' ایجادی اور اجتهادی قوتوں کو بیدار کرنا اور ان کو ترقی و کامیابی کا بہترین طریقہ بتانا" قرار دیا گیا هے - اگرچہ یہ رسالہ ان مقاصد کو ابھی کماحقہ انجام دینے سے قاصر هے' لیکن بہت سی دلچسپیوں کا مجموعہ هے اور عمدہ مضامین کے ساتھہ معمولی چیزیں اور رطب کے ساتھہ یابس اور متانت کے ساتھہ ظرافت اور چھوٹی بڑی معلومات سب کو اس طرح سمو دیا هے کہ پڑھنے والے کو شکایت نہیں هو سکتی - اس قدر ساز و سامان کے ساتھہ سالانہ چندہ بہت هی کم هے —

امداد باهمی

(ماهانہ ' قادیان - ایڈیٹر شیخ محمود احمد عرفانی صاحب '
سالانہ قیمت چھہ روپے)

امداد باهمی بہت مبارک تحریک هے اور هندوستان میں اب اس کے فوائد ظاهر هوتے جاتے هیں - اس رسالے کا مقصد یہی تحریک هے - اس میں مختلف انجمنوں کے حالات ' زراعت وغیرہ کے متعلق مفید معلومات هوتے هیں - رسالہ اپنے مقاصد کو خوبی سے انجام دیتا هے اور جو لوگ اس تحریک کے قدر داں اور حامی هیں وہ اس کی ضرور قدر کریں گے —

ایجوکیشنل گزٹ

ماهانہ - جالندهر - ایڈیٹر - شیخ محمدجان صاحب بی - اے '
بی ٹی ؛ لالہ دینا ناتھہ دو ساج بی - اے ' بی ٹی ؛
سردار وطن سنگھہ بی - اے ' بی ٹی : سید محسن ترمذی
منشی فاضل و ادیب فاضل - سالانہ چندہ تین روپے)

مقصد رسالے کے نام سے ظاهر هے - اگرچہ یہ رسالہ دو تین سال سے جاری هے لیکن اب خاص اهتمام کیا گیا هے اور اس کے حجم اور مضامین میں بہت ترقی نظر آتی هے - تعلیمی مضامین خاص طور پر بہت مفید هیں اور غور و فکر سے لکھے جاتے هیں - علاوہ تعلیمی مضامین کے ادبی ' معاشرتی تاریخی اور زرعی مضامین بھی درج هوتے هیں - تمام مضامین کا معیار مقاصد کے لحاظ سے بہت اچھا هے - اور رسالہ بہت مفید اور کارآمد هے - تعلیمی رسالے اس حیثیت اور نوعیت کے بہت کم دیکھنے میں آے هیں - رسالے کے آخر میں ایک ضمیمہ "رهنماے اطفال" کے نام سے شامل هے جو جلی خط میں هے اور اس میں بچوں کے لئے بہت سی مفید معلومات اور چھوٹے چھوٹے مضمون آسان' نظمیں اور اُن کے کام کی باتیں هوتی هیں —

رسالۂ کیمیکل سوسائٹی

(مسلم یونیورسٹی علی گڈھ - اڈیٹر جناب محمد لطیف قریشی بی - ایس سی - اسسٹنٹ اڈیٹر ذوالفقار الحسنین صاحب - سہ ماہی - سالانہ چندہ دوروپے) —

یہ رسالہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی جانب سے شائع ہوا ہے - یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی اسی زمانے میں علمی تحقیق اور علمی کاموں کی طرف متوجہ ہے - یہ رسالہ دو حصوں پر مشتمل ہے - ایک حصے میں اردو مضامین ہیں اور دوسرے میں انگریزی - اُردو انگریزی کا میل علی گڈھ کالج میں ابتدا سے چلا آرہا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ شان اب تک قائم ہے - مضامین ایسے ہیں جسے ہر لکھا پڑھا شخص شوق سے پڑھ سکتا ہے اور کچھہ نئی معلومات حاصل کر سکتا ہے - حتی الامکان دقیق اصطلاحات کے استعمال سے احتراز کیا گیا ہے اور مطالب کو صاف اور سہل طریقے سے ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے - یہ دیکھہ کر خوشی ہوتی ہے کہ انجمن ترقی اُردو اور جامعۂ عثمانیہ کی وضع کردہ اصطلاحات نے ملک میں قبولیت حاصل کرلی ہے- چنانچہ اس رسالےمیں بھی جگہ جگہ ان اصطلاحات سے کام لیا گیا ہے- رسالہ بلا شبہ ملک کے لئے مفید ہے اور اس کے ذریعے سے اس علم کے سمجھنے میں عام طور پر سہولت ہوگی - علم کیمیا پر دنیا کی آیندہ ترقی کا بہت کچھہ انحصار ہے اور اسے مقبول بنانا ایک ملکی خدمت ہے —

مسیحاے زماں

(ماہانہ - تجارہ ' الور - مدیر قاضی حکیم سید محمد کرم حسین صاحب - قیمت سالانہ دو روپے) مقام تجارہ (ریاست الور) راجپوتانے کا یہ پہلا ماہوار علمی و ادبی و طبی رسالہ ہے - اس میں ایک آدھ مضمون تجارت پر ہے اور چند مضامین طبی ہیں - کچھہ مجرب نسخے بھی درج ہیں - نوجوانوں کی غلط کاریوں کے متعلق بھی معلومات ہیں اور سب سے زیادہ دواؤں کے اشتہارات ہیں - شاید یہی اس رسالے کی غرض اشاعت ہو —

چمنستان شعرا

ایک قدیم و نایاب اردو زبان کے شاعروں کا تذکرہ ہے، جو انجمن ترقی اردو نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے، اور اس کی تصحیح و ترتیب میں نہایت محنت و کوشش سے کام لیکر ایک دل چسپ و محققانہ مقدمے کے ساتھہ چھاپا ہے۔ تذکرے کے مؤلف (دکن) کے مشہور مورخ و تذکرہ نویس لالہ لچھمی نرائن 'شفیق' صاحب ' ہیں۔ سنہ ۱۱۷۲ ھ میں یہ تذکرہ تالیف ہوا، اور دنیا میں اس کا صرف ایک نسخہ ہی پایا جاتا تھا - عالی جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے - سکریٹری انجمن ترقی اردو کا مقدمہ بھی قابل دید ہے - حجم تقریباً ۴۰۰ صفحے۔ جلد نہایت اعلیٰ قسم کی قیمت مجلد پانچ روپے آٹھہ آنے سکۂ انگریزی غیر مجلد چار روپے بارہ آنے سکۂ انگریزی —

جلد ۹ اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ع حصہ ۳۶

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

یادگار مولانا شرر مرحوم

دو سالانہ انعام

زبان اُردو کے محسن مولانا محمد عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم کی یادگار میں جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے، سکرٹری انجمن ترقی اُردو، اور جناب مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ نے حسب ذیل دو سالانہ انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے —

(۱) "عطائے عبدالحق"

رسالۂ اُردو کے سال بھر کے مضامین نثر میں اول درجے کے سب سے اچھے مضمون پر ۱۲۵ روپیہ کلدار کا انعام جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے، عطا فرمائیں گے —

(۲) "عطیۂ ہاشمی"

کے نام سے دوسرا انعام ۱۰۰ روپیہ کلدار کا، مولوی سید ہاشمی صاحب اُن صاحب کی نذر کریں گے جن کی نظم رسالۂ اُردو کے سال بھر کی نظموں میں سب سے اچھی اور اعلیٰ درجے کی ہوگی —

ہر سال کے اخیر مہینے میں جو حضرات اہل سمجھے جائیں گے اُن کی خدمت میں رقم ارسال کر کے رسالے میں اس کا اعلان ہوتا رہے گا۔ انعام کی اہلیت کا فیصلہ صرف معطیان کی متفقہ رائے پر منحصر ہو گا —

المعلن

مدیر رسالۂ اُردو اورنگ آباد دکن

فہرستِ مضامین

دور تراجم

از

(جناب حاجی احمد فخری صاحب)

ہمارا زمانہ تعلیم و تربیت کا زمانہ ہے ' ہمارا زمانہ تہذیب و تمدن کا زمانہ ہے ' ہمارے زمانے میں علوم و فنون کی کثرت ہے ' ہمارے زمانے میں اختراعات و ایجادات کی بھر مار ہے - آج کل تصنیفات و تالیفات کا بازار گرم ہے - ان دنوں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کے آثار نمودار ہیں - مگر اس دور میں جو شے اوروں سے زیادہ ممتاز اور سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ترجمہ ہے - اس لئے اگر اس دور کو ' دور تراجم ' کہا جاے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ اس زمانے کی تصنیف اور تالیف جو کچھہ ہے وہ ترجمے کے رنگ میں ڈوبی ہوی ہے —

اس امتیاز کی سب سے بڑی وجہ سلطان العلوم اعلی حضرت شہنشاہ دکن کی علم پروری اور اردو نوازی ہے - آپ کی شاہانہ فیاضیوں اور علمی قدر دانی نے ہندوستان میں اردو یونیورسٹی قائم کر کے کم مایہ اور نو عمر اردو کا پایہ عرش اعلی تک بلند کر دیا ہے - اگر چندے یہی لیل و نہار رہے تو وہ وقت دور نہیں کہ یہی سبک مایہ اور نو خیز زبان " السنۂ عالم " کے دوش بدوش نظر آئیگی -

جن لوگوں کو حضرت مولانا مولوی سید وحیدالدین سلیم (مرحوم) پروفیسر جامعۂ عثمانیہ کی زندۂ جاوید تصنیف وضع اصطلاحات کے مطالعے کا موقع ملا ہے

وہ جانتے ہیں کہ اردو کی کیا شان ہے اور اس میں ترقی کرنے اور علمی زبان بننے کی کس قدر صلاحیت مضمر ہے —

یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ جب کوئی قوم علوم و فنون میں ترقی کا پہلا قدم اٹھاتی ہے تو سب سے پہلے علمی زبانوں کے تراجم سے اپنی زبان کو سرمایہ دار بناتی ہے - اور زندہ اقوام کی سعی و کوشش کے نتائج کو اپنے اندر جذب کر کے اپنے علمی خزانوں کو معمور کرتی ہے - چنانچہ قدماے عرب نے اپنی ترقی کے زمانے میں یہی کیا کہ دوسری اقوام کے علمی خزانوں کو اپنی زبان میں منتقل کر لیا اور ان کے جواہر ریزوں کو اپنی زبان کے نقش و نگار میں برتا — یہی باعث ہے کہ علوم قدیمہ میں کوئی علم ایسا نہیں ہے جس سے عربی کا خزانہ خالی ہو - اگر دنیامیں عربوں کا وجود نہ ہوتاتوصدیوں تک اقصاے عالم پر جہل و نادانی کابادل اور اسی طرح محیط رہتا جس طرح عروج اسلام سے قبل تھا - اگر ایک ابن رشد کی ذات عالم وجود میں جلوہ گر نہ ہوتی تو ارسطو اور اس کا فلسفہ دونوں کے دونوں صفحۂ ہستی سے اس طرح معدوم ہو جاتے کہ گویا کبھی عالم وجود میں آے ہی نہ تھے —

جب یہ مرحلہ خاطر خواہ طے ہو چکتا ہے تو قوم ترقی کے میدان میں دوسرا قدم اٹھاتی ہے اور تصنیف و تالیف کا جامہ پہن کر زندہ اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں نظر آنے لگتی ہے - نہ آج تک کبھی اس کے خلاف ہوا ہے اور نہ توقع ہےکہ اس کے خلاف کبھی ہوگا - یہی باعث ہےکہ فرماں رواےدکن کی شاہانہ الوالعزمیوں کے طفیل ہندوستان کے بہترین دل و دماغ اپنی تمام تر توجہ اسی مفید اور کار آمد صنف کی طرف مبذول فرما رہے ہیں - اندریں حالات یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ترجمے کے ماله و ماعلیه پر غور کریں اور یہ دیکھیں کہ ترجمہ کیا ہے اور وہ اصول کیا ہیں جن کی پابندی سے ترجمہ ترجمہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے اور جس کی خلاف ورزی سے ترجمہ اپنے مرتبے سے گر جاتا ہے اور اس قابل نہیں رہتا

کہ اس پر ترجمے کا اطلاق ہو سکے - آخر کچھ تو بات ہے کہ ' معرکۂ مذہب و سائنس' اور ' فلسفۂ تعلیم ' معمولی تراجم سے ممتاز ہیں —

ترجمے کی تعریف

ہمارے نزدیک ترجمے کی تعریف یہ ہے کہ کسی مصنف کے خیالات کو لیا جائے ' ان کو اپنی زبان کا لباس پہنایا جائے' ان کو اپنے الفاظ و محاورات کے سانچے میں ڈھالا جائے اور اپنی قوم کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ ترجمے اور تالیف میں کچھ فرق معلوم نہ ہو —

اس تعریف کی رو سے یہ امر بلا شائبۂ شک ثابت ہوتا ہے کہ ترجمے میں مترجم پر مصنف کے خیالات کی پابندی فرض ہوتی ہے' اس کے الفاظ و محاورات اور اس کے اسلوب بیان کی تقلید فرض نہیں ہوتی - اگر ان باتوں کی پابندی ضروری ہوتی تو اصل زبان میں کیا برائی تھی کہ زحمت ترجمہ گوارا فرمائی جاتی - اگر اس قسم کی لغو اور لایعنی پابندیاں کہیں نبھہ جائیں اور کوئی باکمال مترجم ان بے کار اور غیر ضروری بندشوں سے عہدہ برآ ہو بھی جائے تو اس کو محض اتفاق حسنہ پر محمول کرنا چاہئے اس کو شمع ہدایت سمجھنا اور اس پر فخر کرنا جائز نہیں' اس لئے کہ بسااوقات دو زبانوں کے انداز بیان میں اس قدر مغائرت ہوتی ہے کہ تقلید نا ممکن ہوتی ہے - اگر کوئی خام مذاق اور نومشق مترجم تقلید کے پیچھے پڑتا ہے تو وہ غیر زبان کے الفاظ و محاورات کی بندشوں میں خود گم ہو کر رہ جاتا ہے - پڑھنے والوں پر یہ بھی نہیں کھلتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے - اور کس لئے کہہ رہا ہے - مصنف کا مطلب کچھ ہوتا ہے ' مترجم کے الفاظ سے کچھ اور معلوم ہوتا ہے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تقلید کی بدولت ترجمہ ترجمہ نہیں رہتا بلکہ لفظوں کا گورکھ دھندا بن جاتا ہے - ہمارے نزدیک ترجمے کا اصل اصول وہی بدنام اور مکروہ شے ہے' جسے عرف عام میں تصرف اور پروفیسر حمیداللہ خاں صاحب کی زبان میں خیانت اور بددیانتی کہتے ہیں تصرف کے بغیر ترجمے میں نہ کبھی کام چلا ہے اور نہ آئندہ چلنے کی امید ہے -- اس باب میں

جس قدر آزادی سے کام لیا جائے گا ترجمہ اسی قدر تصنیف کے قریب آ جائے گا - مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ترجمے میں تصرف کرنا کچھ اُن ہی بزرگوں کو زیبا ہے جو دونوں زبانوں کے ماہر ہوتے ہیں اور اُس علم میں ید طولیٰ رکھتے ہیں جس کا ترجمہ کرنے کی وہ جسارت فرماتے ہیں؛ بلکہ دونوں زبانوں میں سے ایک زبان مترجم کی مادری زبان ہوتی ہے۔ آج کل جن دوزبانوں کی ضرورت ہے ان میں سے ایک انگریزی ہے اور دوسری اردو - ایک قدیم اور سرمایہ دار زبان ہے اور دوسری نوعمر اور کم مایہ - ایسی حالت میں مترجم کا فرض ہے کہ انگریزی سے کماحقہ واقف ہو اور اردو اس کی مادری زبان ہو - اگر اردو اس کی مادری زبان نہ ہوگی تو وہ ترجمے کی بندشوں سے عہدہ برآ نہ ہوسکے گا اور اگر انگریزی سے پوری طرح واقف نہ ہو گا تو مصنف کے خیالات کی تہ تک نہ پہنچ سکے گا - الغرض ان اوصاف سہ گانہ میں جس نسبت سے کمی ہوگی ، ترجمے میں اسی نسبت سے خامیاں رہ جائیں گی--

زباندانی کا معیار

اب بحث طلب امر یہ ہے کہ زباندانی کا معیار کیا ہے اور وہ کونسی کسوٹی ہے جس پر کس کر یہ بتایا جاسکتا ہے کہ کون شخص زباندان ہے اور کون نہیں اور کس کے مضمون میں کس قدر الفاظ و محاورات ہیں کہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں اور کس قدر ہیں کہ اپنا سا منہہ لے کر رہ جاتے ہیں - شمالی ہندوستان اور قلمرو نظام میں ایک شخص بھی ایسا نہ ہو گا جو اُردو دانی کا مدعی نہ ہو اور جسے اس امر کا دعویٰ نہ ہو کہ اردو میری مادری زبان ہے اور میں نے اس کو اُس عالم میں حاصل کیا ہے جب میں میں نہ تھا دلی اور لکھنؤ کے رہنے والے تو خالص اہل زبان ہیں ، اُن کا تو کیا کہنا ، ان کے لئے تو یہ امر باعث ننگ و عار ہے کہ اُن کا دامن ادب شرمندۂ تعلیم ہو مگر :

جس پاس عصا ہو اُسے موسیٰ نہیں کہتے   ہر ہاتھ کو عاقل ید بیضا نہیں کہتے

روزانہ بول چال میں اپنا مافی الضمیر ادا کر دینا اور معمولی چٹھی چپاتی لکھ لینا اور بات ھے اور ادیبانہ انداز سے اپنا مطلب بیان کرنا اور اس میں کشش وگیرائی پیدا کر کے ناظرین کے دلوں پر اثر کرنا اور بات ھے - اس باب میں اهل زبان اور بیگانۂ زبان و لسان ، نیم تعلیم یافتہ اور فارغ التحصیل ، سب برابر ھیں؛ جب تک کوئی شخص متواتر اور پے در پے زبان کی نزاکتوں پر غور نہیں کرتا اور جب تک اپنے خیالات مختلف اور گونا گوں انداز سے پبلک کے سامنے پیش کرنے کی مشق و مزا ولت بہم نہیں پہنچاتا اس وقت تک وہ ترجمے اور تصنیف و تالیف کی ذمہ داریوں سے سبک دوش نہیں ھو سکتا ، لیکن دلّی اور لکھنؤ والے اس میں جس قدر جلد اور جس قدر آسانی سے کمال پیدا کر سکتے ھیں اس قدر جلد اور آسانی سے غیر نہیں کرسکتے ؛ خواہ وہ پنجاب کے رهنے والے ھوں یا دکن کے ، خواہ وہ دلی اور لکھنو میں سے کسی کی تقلید کو ضروری سمجھتے ھوں یا دونوں سے آزاد ھونا اپنی شان کے شایاں خیال کرتے ھوں —

اس زمانے میں یہ بات عام طور پر دیکھی جاتی ھے کہ لوگ انگریزی میں فی الجملہ بصیرت حاصل کر لیتے ھیں اور اس کے پروں پر اُڑ کر مملکت اردو کو تسخیر کرنا چاھتے ھیں - ان کے دل و دماغ پر اس خیال خام کا غلبہ ھوتا ھے کہ اردو ھماری مادری زبان ھے ، اس میں کد و کاوش لا حاصل ھے ، اِس میں سعی و کوشش ھماری شان کے شایاں اور ھماری ھمت کے لائق نہیں . اس طرف صرف وھی کوتاہ بیں اور نا عاقبت اندیش لوگ توجہ کرتے ھیں جن کے دماغ عقل سلیم سے عاری ھوتے ھیں - اردو انگریزی کے تابع ھے ، جب انگریزی آ گئی تو اردو خود بخود آ جائے گی - " باندو کو تسخیر کر لو باندی خود بخود حاضر ھو جائے گی " - مگر یہ اُن حضرات کی کوتاہ نظری اور خام مذاقی کی دلیل ھے - اردو کتنی ھی سبک مایہ اور نو عمر سہی ، مگر زندہ زبان ھے ، اس کا وجود انگریزی پر مبنی نہیں . صرف چند بڑے بڑے اصول ھیں کہ انگریزی

سے ملتے جلتے ھیں ' ورنہ دونوں میں کوئی تعلق نہیں - جب تک اردو پر اردو کی حیثیت سے توجہ نہیں کی جاتی' اس وقت تک اردو میں بصیرت نصیب نہیں ھوتی- کسی موضوع کو لینا اور اس کو مؤثر اور دلکش انداز سے پڑھنے والوں کے دلوں پر نقش کرنا ' ایک فن ھے جو مدتوں کی کد و کاوش اور سالہا سال کی سعی و کوشش سے حاصل ھوتا ھے اور جس شے کا نام ادبی سادگی ھے وہ تو ایک ایسا کمال ھے جو تمام کمالات ادب کے بعد نصیب ھوتا ھے - یہی باعث ھے کہ میرانیس جیسے قادر الکلام بزرگ کو کہنا پڑا ھے کہ :

اس سادگی کی قدر کوئی جانتا نہیں جو جانتا ھے اور کو وہ مانتا نہیں

ھمارے نزدیک مترجم اور مصنف میں کچھ فرق نہیں ' دونوں کی حدیں ایک مقام پر جا ملتی ھیں - کامیاب اور قابل تقلید مترجم وھی شخص ھوسکتا ھے جس میں مصنف بننے اور تصنیف کرنے کی صلاحیت مضمر ھوتی ھے اور ترجمے کی گونا گوں ذمہ داریوں سے وھی شخص عہدہ برا ھو سکتا ھے ' جس نے انداز بیان پر اس درجے قدرت حاصل کرلی ھو کہ جس مطلب کو جس پہلو سے چاھے ادا کر جاے - بہترین مترجم وھی بزرگ ثابت ھوے ھیں جن میں یہ قوت بوجہ اتم موجود تھی ' لیکن جن لوگوں میں یہ قوت کم تھی وہ کامیابی اور شہرت کے میدان میں اسی قدر پیچھے رہ گئے جس قدر اس قوت میں کمی تھی - جو لوگ مصنف کے انداز بیان کی تقلید سے انحراف کرنے اور ترجمے میں تصرف سے کام لینے کی قوت نہیں رکھتے اُن کی ادبی زندگی محض عارضی اور چند روزہ ھوتی ھے ' بلکہ مرنے سے پہلے ھی ان کا خاتمہ ھو جاتا ھے - حیات ابدی اور شہرت سرمدی کچھ ان ھی بزرگوں کا حصہ ھے جو منظر عام پر جلوہ گر ھونے سے پہلے کمالات صوری و معنوی سے بہرہ اندوز ھوتے ھیں اور شب و روز کی متواتر اور جانکاہ محنت سے اپنے اندر وہ قابلیت پیدا کر لیتے ھیں جو اداے فرض کے لئے ضروری اور لا بدی ھوتی ھے —

مثال کے طور پر مرزا غالب کو لیجئے اور ان کے ایک شعر پر غور کیجئے - فرماتے ھیں :

محرم نہیں ھے توھی نواھاے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ھے پردہ ھے ساز کا

کیا کوئی شخص اس غیر فانی شعر پر ترجمے کا الزام عائد کر سکتا ھے ' کیا کوئی کہہ سکتا ھے کہ یہ ترجمہ ھے ' کیا اس میں وہ تمام خوبیاں موجود نہیں ھیں جو اعلیٰ درجے کے شعر میں ھونی چاھئیں ' کیا اس میں وہ تمام اوصاف و صفات موجود نہیں ھیں جو شعر کی جان اور ادب کی روح رواں ھیں ؟ اب ذرا 'عرفی' شیرازی کا شعر ملاحظہ ھو :

ھر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ
اینہا ھمہ راز ست کہ معلوم عوام است

کیا مرزا کا شعر عرفی کے شعر پر مبنی نہیں ھے ' کیا مرزا نے اس سے اِستفادہ نہیں کیا ھے ' کیا مرزا نے اس شعر کی روح کو اپنے الفاظ میں جلوہ گر نہیں کیا ھے' اور کیا اپنی طرف سے اس پر ایک گونہ لطیف اور پاکیزہ اضافہ نہیں فرمایا ھے ' اور کیا اپنے انداز خاص میں کد و کاوش اور مذاق سلیم کی داد نہیں دی ھے' کیا اس میں اور تصنیف میں کچھہ فرق ھے' کیا اس میں وہ تمام باتیں موجود نہیں ھیں جو تصنیف کے لئے لازمی ھیں اور کیا مرزا اس میں حق بہ جانب نہ تھے ' کیا اس پر سرقے کا الزام اور چوری کا بہتان عائد ھو سکتا ھے ؟ ھمارے نزدیک اس قسم کے باریک اور لطیف اضافوں پر سرقے کا الزام لگانا اور ان کو خیانت اور بد دیانتی پر محمول کرنا ذوق سلیم کا منہ چڑانا ھے ۔ اور یہ صرف ان ھی لوگوں کا حصہ ھے جو انگریزی کے پروں پر اُڑ کر قلم رو اردو کو عبور کرنا چاھتے ھیں - اس امر سے کوئی صاحب ذوق انکار نہیں کر سکتا کہ اسی قسم کے نازک اور لطیف اضافے کا نام ' تصرف ' ھے اور یہی ترجمے کی جان اور ادب و انشا کی روح و رواں ھے - ھمارے نزدیک ترجمے کی بہترین مثال یہی ھے اور اسی کی تقلید ھونی چاھئے —

اسی طرح شیخ علی حزیں ' کا ایک شعر ملاحظہ ہو ۔ فرماتے ہیں :

چون نفی نفی اثبات است' از مردن نمی ترسم

بقائے من' چو شمع کشتہ باشد د رفنائے من

میر 'انیس' اس کو لیتے ہیں اور اپنے انداز میں یوں ادا کرتے ہیں :

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے

شمع کشتہ ہوں' فنا میں ہے بقا میرے لئے

کیا میر صاحب کا یہ شعر شیخ کے شعر کا ترجمہ نہیں ہے ' کیا میر صاحب نے اپنے شعر کی بنیاد اسی شعر پر نہیں رکھی ہے اور کیا اس میں اپنی غیر معمولی شاعرانہ قابلیت سے تصرف نہیں فرمایا ہے ؟ اگر میر صاحب زحمت تصرف گوارا نہ فرماتے تو یہ شعر اس بلندي پر جلوہ گر نہ ہوتا ' جس پر اس وقت میر صاحب کے ذوق لطیف کے طفیل نظر آ رہا ہے ۔

ملّا طاہر وحید کا ایک شعر ہے :

ز شیخ شہر جاں بردم بہ تز و یر مسلمانی

مدار اگر بہ ایں کافر نمی کردم چہ می کردم؟

ایک شخص نے اس کو لیا اور ان الفاظ میں اس کا ترجمہ کر دیا :

مسلماں بن کے جاں میں نے بچائی شیخ نجدی سے

مداراگر نہ اس کافر سے میں کرتا تو کیاکرتا؟

کیا یہ شعر ملا کے شعر کا صحیح ترجمہ نہیں ہے ' کیا اس میں کہیں کور کسر ہے ' کیا مترجم نے اس میں تصرف سے کام نہیں لیا ' کیا شیخ شہر کی جگہ شیخ 'نجدی' نہیں کردیا ہے اور "بہ تز ویر مسلمانی کا ترجمہ " مسلماں بن کے" نہیں کیا ' کیا اس سے بہتر انداز میسر ہو سکتا ہے ؟ یہ سب کچھہ ہے ' مگر ارباب ذوق جانتے ہیں کہ یہ شعر اس قدر بلند نہیں ہے جس قدر ملا کا شعر ہے ۔ اس لئے کہ تصرف کچھہ زیادہ باریک اور لطیف نہیں ہے اور مترجم اپنی طرف سے کوئی

ایسا اضافہ نہیں کر سکا جس سے تصرف کرنے میں حق بہ جانب سمجھا جاے۔
'عرفی شیرازی' کا ایک اور شعر ہے :

مدہ عنانِ تعلق بہ حسنِ ہر ذرہ   بر آر دستے و برفرق آفتاب انداز

اس کا ترجمہ جناب 'آزاد' انصاری ان الفاظ میں فرماتے ہیں :

ذرّات کی چمک پر کب تک مٹا رہے گا
اٹھ اور اٹھ کے اک دم ہاتھ آفتاب پر ڈال

کیا اس میں جناب 'آزاد' ترجمے کے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے۔ کیا اس میں تصرف کا عمل جلوہ گر نہیں ہے، کیا جناب 'آزاد' پر خیانت اور بد دیانتی کا الزام لگایا جائیگا ؟ اس لئے کہ 'عرفی' کے شعر میں کہیں اٹھنے کا ذکر نہیں ہے —
اسی طرح حزیں کا شعر ہے :

مسی مالیدہ لب را رنگ پان است
تماشا کن تہ آتش دخان است

'سودا' نے اس کو لیا اور ان الفاظ میں ادا کر دیا :

مسی مالیدہ لب پر رنگ پان ہے
تماشا ہے تہ آتش دھواں ہے

اس میں 'سودا' نے کسی قسم کا تصرف نہیں کیا، اسی لئے اصل شعر میں کسی قسم کا اضافہ نہ کر سکا، بلکہ شعر کو اُس بلندی پر نہ پہنچا سکا، جہاں حزیں نے اپنے شعر کو پہنچا دیا تھا —

قرآن مجید میں ایک آیت ہے - انا عرضنا الامانۃ الخ - خواجہ حافظ اس کو لیتے ہیں اور اپنے ناقابل تقلید انداز میں یوں ادا کرتے ہیں :

آسماں بار امانت نہ توانست کشید   قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

حقیقت میں ترجمہ اسے کہتے ہیں اور تصرف کی یہ شان ہے —
اسی طرح مندرجۂ ذیل اشعار و اقوال کو لیجئے اور فرداً فرداً ہر ایک پر غور

کیجئے اور یہ دیکھئے کہ ان میں کوئی شعر یا کوئی قول ایسا ھے جو تصرف کی دست برد سے محفوظ ھو:

بوے یار من ازیں سست وفا می آید گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

(نظیری نیشا پوری)

کیفت چشم' اس کی مجھے یاد ھے سودا 'ساغر' کو مرے ہاتھہ سے لینا کہ چلا میں

(سودا)

در محفل خود راہ مدہ ھم چو منے را

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ھو جاے

دوستو! درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو (خواجہ میر درد)

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بہ تو دادم

باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی (سعدی)

پیار کرنے کا جو خوباں ھم پہ رکھتے ھیں گناہ

ان سے بھی تو پوچھئے تم ایسے کیوں پیارے ھوے (میر تقی میر)

گفتہ بودم غم دل باتو بگویم چو بیائی

چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی (سعدی)

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ھے منہ پر رونق

وہ سمجھتے ھیں کہ بیمار کا حال اچھا ھے (مرزا غالب)

داماں نگہ تنگ' گل حسن تو بسیار

گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

مرے ذوق نظر کو دیکھنا بزم حسیناں میں

وہ گلچیں ھوں بجاے گل بھرو ںنگ داماں میں (وفا رام پوری)

عربی اقوال و ضرب الامثال: "الکلب انجس مایکون اذا اغتسل"

سگ بدریاے ہفت گانہ بشو   چونکہ تر شد پلید تر گردد (سعدی)

الصمت زینۃ العالم و ستر الجاہل :

ترا ' خامشی ' اے خداوند ہوش   وقار است ' و نا اہل را پردہ پوش (سعدی)

راع اباک یراع ابیک :

تو بجاے پدر چہ کردی خیر   تا ہماں چشم داری از پسرت (سعدی)

کُل یوم ہو فی شان :

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے   آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے (درد)

سناء ذکاء لا یزال من دعاء الخفاش :

شپر گر نور آفتاب نہ خواہد   نور بازار آفتاب نہ کاہد (سعدی)

السعید من اکل وارع و الشقی من مات ودع :

نیک بخت آنکہ خورد و کشت و بد بخت آنکہ مرد و ہشت (سعدی)

السطان احوج الی العقلاء من العقلاء الی السطان :

پادشاہاں بہ خرد مندان محتاج تر اند کہ خرد مندان بہ پادشاہاں

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق اس ترجمے سے ہے جو عربی اور فارسی سے اردو میں کیا گیا ہے' اس کے بعد اس ترجمے کا نمبر ہے جو عربی اور فارسی سے انگریزی میں کیا گیا ہے - اگر اس پر ایک سر سری نظر ڈالی جاے تو یہ مضمون بجاے خود ایک مستقل کتاب بن جاے- اس لئے محض چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں اور یہ دکھایا جاتا ہے کہ انگریزی میں مترجم حضرات ترجمے کے باب میں کس قدر آزادی سے کام لیتے ہیں اور اس کو کہاں سے کہاں پہنچادیتے ہیں - مثالیں ملاحظہ ہوں :

(۱) منم ہر سخن را بیان معانی   منم جان و عقل ہنر را قوالب

منم از نژاد بزرگان ساسان   که بودند شاهان چترو کواکب (منوچهری)

I can explain the deepest thought in all sciences,

I am the heart and soul of reason and knowledge.

I am descended from the Imperial House of Saman,

Whose kings bore the power of sovereignty.

(۲)   آب جیحون از نشاط روے دوست . خنگ مارا تا میان آیدهمی (رودکی)

Glad at the friend's return, the Oxus deep,

Up to our girths in laughing waves shall leap.

(۳)   اگر شه روز را گوید شب است این - بباید گفت اینک ماه و پروین

Should he (the king) say "the night is day"

Reply: Behold the moon and the pleides.

(۴)   در شعر سه‌تن پیمبرانند هر چند که لانبی بعدی

ابیات و قصیده و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

The sphere, poetic has its prophets three

(Although there is no prophet after me)

Firdausi in the epic, in the ode

Sadi and in qasida Anwari. (Prof Brown's translation)

(۵)   ز شیر شتر خوردن و سوسمار   عرب را بجائے رسید است کار

که تخت کیاں را کند آرزو   تفو بر تواے چرخ گرداں تفو (فردوسی)

From feeding on camel's milk and desert lizard, so have the affairs of the Arabs prospered

That they covet the throne of the Chosroes.

Shame on thee O circling Heavens, shame,

۶ عاقلے را پرسیدند نیک بخت کیست وبدبخت چیست ' گفت نیک بخت آنکه خورد و کشت و بد بخت آنکه مرد و هشت (سعدی)

They asked of a wise man who is the man of good fortune & who of bad? He said " The man of good fortune is he who ate & tilled ; the man of bad fortune is he who died and left (everything he had),,

۷ اگر جز به کام من آید جواب - من و گرز و میدان و افراسیاب (فردوسی)

If the answer prove contrary to my wish

Then I shall take the mace and the field against afrasiyab,

۸ خروشید و جوشید و جامه درید - بزاری بران کودک نا رسید

برآورد بانگ و غریو و خروش زمان تازمان زوهمی رفت هوش (فردوسی)

She screamed and raved and rent her garment in lamentation

over the unblossomed youth.

She sobbed and wailed and shouted & fainted again & again.

۹ دلیرے که بد نام او اشکبوس همی بر خروشید برسان کوس

The intrepid Ashkboos roared like a drum

۱۰ دلم ازخدمت شیراز بکلی بگرفت وقت آنست که پرسی خبر ازبغدادم

سعدیا حب وطن گرچه حدیثے است صحیح نتوان مرد بسختی که من این جازادم (سعدی)

My soul is weary of shiraz, utterly sick and sad

If you seek news of my doings , you will have to ask at Baghdad

Sadi , that love of one's native land is a true tradition is clear,

But I cannot afford to die of want because my birth was here.

۱۱ آن را که جاے نیست همه شهر جاے اوست

درویش هر کجا که شب آمد سراے اوست (سعدی)

The whole town is the home of him who has no home.

The poor man's house is wherever night overtakes him.

۱۲ بنده چه دعوی کند حکم خداوند راست (سعدی)

What objection can a servant raise? It is for the master to command.

۱۳ بدم گفتی و خورسندم عفاک‌الله نکو گفتی

جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خا را (خواجه حافظ)

Thou didst speak me ill, & I am content, God pardon thee thou didst speak well.

A bitter answer befits a ruby lip which feeds on sugar.

۱۴ اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا

به خال هندوش بخشم سمرقند و بخارا را

If that beauty of Shiraz would take my heart in hand,

I would give for her dark mole Samarqand & Bukhara.

(From Robinson's Persian poetry)

Sweet maid, if thou wouldst charm my sight,

And bid those arms my neck infold, That rosy cheek that lily hand,

would give thy poet more delight

Than all Bukhara's vaunted gold,

Than all the gems of Samarqand. (Sir william Jones)

۱۵ بده ساقی مئے باقی که در جنت نه خواهی یافت

کنار آب رکنا باد و گل گشت مصلیٰ را

Boy bring me the wine that remaineth, for in paradise thou

wilt not see the banks of the waters of Ruknabad, nor the rose bower of our Moselay. (Robinson's Persian poetry)

Boy, let yon liquid ruby flow.
And bid thy pensive heart be glad,
Tell them their Eden cannot show,
A stream so clesr as Ruknabad,
A bower so sweet as Mosalay. (Sir william Jones)

۱۶ فغان کیں لو لیان شوخ و شیریں کار و شہر آشوب
چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوان یغمارا

Alas! those saucy lovely ones' those charming disturbers of our city; bear away patience from my heart as Turkomans their repast of plunder. (Robinson's Persian poetry).

Go boldly forth my simple lay,
Whose accents flow with artless ease,
Like orient pearls at random strung,
My notes are sweet the damsels say,
And oh far sweeter, if they please,
The nymph for whom they are sung. (Sir william Jones)

ز عشق نا تمام ما جمال یار مستغنی است
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روے زیبارا

Yet the beauty of maidens is independent of our imperfect love,
To a lovely face, what need is there of paints and dyes, of mole or down.

حدیث از مطرب و مے گو و راز دهر کمتر جو
که کس نکشود و نکشاید به حکمت این معمارا

Speak of the musician and of wine and search less into the secrets of futurity;

for no one in his wisdom ever hath discoverd or everwill discover that mystery.

من از آں حسن روز افزوں که یوسف داشت دانستم
که عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

I can understand how the deauty of Joseph, which added now luster to the day,

withdraw zalikha from the veil of her modesty.

بدم گفتی و خورسندم عفاک الله نکو گفتی
جواب تلخ مے زیبد لب لعل شکر خا را

Thou hast spoken evil of me, and I am contented - God forgive thee. Thou hast spoken well; for even a bitter word is beseeming when it cometh from a ruby sugar - dropping lip.

نصیحت گوش کن جاناں که از جاں دوست تردارند
جوانان سعادت مند پند پیر دانا را

Give ear O my soul, to good councel, for better than their own souls love youths of happy disposition the admonition of the aged wise.

غزل گفتی و در سفتی ' بیاؤ خوش به خواں 'حافظ'
که بر نظم تو افشاند فلک عقد ثریّا را

Thou hast composed thy ghazal; thou hast strung thy pearls.

Come and sing it sweetly. O Hafiz, for heaven hath shed upon thy poetry the harmony - of the pleiades.

مندرجۂ بالا سطور میں ترجمے کے جو نمونے هدیۂ ناظرین کئے گئے هیں ' ان سے ارباب بصیرت یہ ضرور محسوس کر ینگے کہ ترجمے میں جو زبان برتی گئی هے وہ انگلستان کی ٹکسالی زبان هے ' وہ ایسی زبان هے جو شب و روز وهاں بولی اور لکھی جاتی هے ' وہ ایسی زبان هے جو وهاں کے روز مرہ اور محاورے کے سانچے میں ڈھلی هوی هے' وہ ایسی زبان نهیں جس کو دیکھکر فصحاے انگلستان ناک بھوں چڑھائیں اور ٹکسال باهر سمجھہ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں' بلکہ وہ ایسی زبان هے کہ انگلستان کے آدمیوں اور انشا پردازوں کے لئے باعث ناز اور موجب افتخار هے - هم نے متعدد انگریز حضرات سے سنا هے کہ فٹز جیرالڈ نے عمر خیام سے صرف خیالات کا اقتباس کیا هے اور مشرقی جذبات کو مغربی لباس میں اس خوبی اور خوش اسلوبی سے پیش کیا هے کہ اگر وہ عمر خیام کا نام نہ لے تو کوئی متنفس اس پر سرقے کا الزام نهیں لگا سکتا - سی طرح پروفیسر براؤن کی نسبت علماے ادب کی یہ راے هے کہ " فارسی زبان کے شہ پاروں کو فصیح اور بلیغ انگریزی کا جامہ پہنانا اسی کا حصہ هے "- یہ هے ترجمہ جو مترجم کے لئے مایۂ فخر و ناز اور اس کی شہرت اور ناموری کے لئے چشمۂ آب حیات هے - اس کے بر عکس همارے یہاں کے ترجموں کو لیجئے اور ان پر ایک سر سری نظر ڈالئے ' آپ کو معلوم هو گا کہ همارے مترجم حضرات جو زبان برتتے هیں وہ اردو نهیں هے ' بلکہ اچھی خاصی انگریزی هے - وهی الفاظ و محاورات هیں ' وهی بندشیں اور ترکیبیں هیں ' وهی طرز ادا اور وهی اسلوب بیان هیں کہ بے کم و کاست اردو میں برتے جاتے هیں' اس لئےکہ ان بزرگ زادوں کے یہاں تصرف کا نام خیانت اور اجتہاد کا نام بد دیانتی هے —

موجودہ ترجمے اور تالیف کے نمونے

اب ہم موجودہ ترجمے اور تالیف کے چند نمونے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں، جن کے مطالعے سے معلوم ہو گا کہ ہمارے نو عمر مترجم اور نو خیز مؤلف اس باب میں کیا کیا گل کاریاں فرمارہے ہیں —

(۱) .... ہمارے پاس جو کچھہ ' کافی' معلومات ' ہے' -

(۲) (Ilest) وہ ہے - (Jps Sout) ' وے' ہیں —

(۳) اطالیہ میں آسکن (Oscan) اور امبرین (Umdvian) کی طرح 'جو' دونوں لاطینی زبان سے تعلق رکھنے والی بولیاں تھیں —

(۴) تاریخی ' زمانے کے ' آس پاس ' (قریب)

(۵) زبانیں ' ترسیل خیال ' کے لئے بدلتی ہیں (اظہار خیال)

(۶) انگریزی بولنے والا شخص ایسے شخص کے لئے جو صرف فرانسیسی جانتا ہو ' ناقابل فہم ہے' -

(۷) جس کا تلفظ ' کمزور' ہو گیا ہے ؟

(۸) زبان کی 'کوئی' اچھی خاندان واری تقسیم کرنے کے لئے......الخ (کوئی زائد ہے)

(۹) وہ ' کہیں اور ابھی' ممکن نہیں (انگریزی انداز ہے)

(۱۰) خیام اور حافظ کے بعد کراے دو نے ' سعدی پر' لکھا ہے (پر=متعلق)

(۱۱) سعدی کا مرتبہ بحیثیت ایک 'متفکر اور معلم' کے دکھایا گیا ہے (متفکر غلط)

(۱۲) پہلے اور چوتھے ' بابوں' میں (باب میں)

(۱۳) سعدی ' شیریں فاصح ' اور ' خوشنام شاعر ' مقام شیراز سنہ ۱۱۸۴ ع میں بعہد اتابک پنجم ' فارس' پیدا ہوا -

(۱۴) اسے دس دینار میں ' خرید کیا ' (خریدا)

(۱۵) خداے تعالیٰ کے فضل و کرم کو ' مناظر قدرت کے اندر دکھا یا ' ہے -

(۱۶) یہ نظم فراخ اور باوسعت ہے —

(۱۷) اور پھر 'محکم' اور دل نشین بھی ہے (فراخ اور با وسعت نظم کیسی ہوتی ہے' محکم کے کیا معنی؟)

(۱۶) وہ اپنے ایک دوست سے استدعا کرتا ہے 'کہ وہ اس کے لئے اُس کی ادائیگی سے سبکدوشی حاصل کرے' (کہ میری طرف سے میرا قرض بیباق کردیں)

(۱۷) اس نے مرافعہ کرنے کو ترجیح دی ہے۔ (اس نے مرافعہ دائر کیا ہے)

(۱۸) جس کی تعریف بذریعۂ حدود کی گئی ہے۔ (جس کی حدیں معین کردی گئی ہیں)

(۱۹) تم کو شریر ہونا چاہئے۔ (لازم ہے کہ تم شریر ہو)

(۲۰) برطانیہ اپنے اچھے دفاتر استعمال کریگی۔ (Good office کا ترجمہ ہے)

(۲۱) بیکار لوگوں کی مضبوطی (تعداد)

(۲۲) ملکۂ ثریا عنقریب قید ہونے والی ہے۔ (اس کے بچہ ہونے والا ہے)

(۲۳) جس کی تعریف بطور بیوہ کے کی گئی ہے۔ (جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہ بیوہ ہے)

(۲۴) اگر کوئی چیز فائدہ ہوگئی تھی تو اس سے ٹیکس متعلق تھا۔ (خدا جانے یہ کونسی زبان ہے)

(۲۵) وہ ایک خوش نصیب سپاہی تھا (Sddier of fortune)

(۲۶) نتیجے میں (۲۷) 'بدنصیب الفاظ' (۲۸) 'قابل افسوس عبارت'۔

(۲۹) وہ ان کو 'وقتاً فوقتاً' ٹالتا رہا ہے (From time to time)

(۳۰) مرافع کی سماعت 'ہمارے روبرو' مرافعان کی موجودگی میں کی جائے گی (ہمارے روبرو = جو ہمارے روبرو ہیں)

(۳۱) ملازم میں ایسی بداعمالی بھی ہوسکتی ہے جو معاہدۂ ملازمت کو ایک فریق کے بخلاف مرضی فریق ثانی ساقط کردینے کو جائز بنائے—

(۳۲) وہ مسلمان جو ایک ہی مسجد میں 'عبادت کرتے' ہیں۔ (نماز پڑھتے ہیں)

(۳۳) ہمیں اس بات کا خفیف سا خفیف اندازہ بھی تو نہیں ہوتا کہ زمانۂ تاریخی سے پہلے جو ہزاروں سال گذرے ہیں' یعنی اس قدیم زمانے میں جب انسان نے

پہلے پہل زبان کو حیات اجتماعی اور صنعتی اور ذہنی ارتقا کا وسیلہ بنایا تھا'
کیا واقعات پیش آئے تھے - اگر یہ واقعہ ہے کہ ہم تمام مشترکہ زبانوں کی
درجہ بندی نہیں کرسکتے؛ اور ہماری تحقیق اگر کہیں تھوڑی بہت کام آئی ہے
تو صرف مختلف مجموعوں کی تقابلی صرف و نحو کے مطالعے میں اور اس
صنف میں بھی ہم بجز سامی' فنی' یوگری' ملای' ایشیائی اور بانتو
خاندانوں کے اور کسی کے متعلق کچھ نہیں کرسکے ہیں - تو ان سب باتوں
سے یہ لازم آتا ہے کہ انسانی زبانوں کی وحدت یا کم از کم اُن زبانوں کے
جو آج معروف ہیں' آغاز اور ابتدا کے مسئلے کو انتہائی کچھ زیادہ سود مند
نہیں ہوسکتا - (یہی زبان ہے جس کو " فرنگی اُردو " کہتے ہیں)

(۳۴) وہ شعر جنمیں کسی پادشاہ وقت کی تعریف جو زندہ ہے' پائی جاتی ہو' اڑا دیے گئے
ہیں - (وہ شعر اُڑا دیے گئے ہیں جن میں کسی بادشاہ وقت کی تعریف پائی جاتی ہو)

(۳۵) اب اشعری اور اہل سنت اکثر عقائد میں ——— ملتے ہیں (کب نہ ملتے ہے؟)

(۳۶) انسان اپنے افعال کا ' خود ' مختار ہے (انسان خود مختار ہے - یا اپنے افعال
کا مختار ہے)

(۳۷) دو سب سے اخیر بابوں میں (اخیر کے دو بابوں میں)

(۳۸) اس کے بعد سعدی کو اپنا ہم خیال بناکر دونوں دوست تفریح گناں باہر کو
روانہ ہوے (یہ دونوں دوست کون ہیں جنھوں نے سعدی کو اپنا ہم
خیال بنایا تھا؟) (۳۹) علی الصباح جب واپسی کا ارادہ ہوا تو سعدی
نے دیکھا کہ اس کے دوست نے اپنا دامن گل ریحان اور سنبل و ضمیران سے
بھر رکھا تھا (بھر رکھا ہے) (۴۰) اس تصور کے زیر اثر نظمیں لکھیں

(۴۱) ممکن ہے کہ میں خود خریدار بن جاؤنگا (ممکن ہے کہ میں خود خریدوں)

(۴۲) ہر ممکن طریقے سے (۴۳) ہر ممکن کوشش کرونگا)

(۴۴) شیر خوار بچہ پھول کو دیکھ کر اپنا ننھا سا ہاتھ بڑھائیگا اور اصرار کریگا
کہ یہ اس سے (مجھسے) جدا نہ ہو —

(۴۵) وہ (یعنی آنکھ) فخریہ کہنے لگتی ہے کہ اس کی (میری) پیدائش
حسن کی خاطر تھی —

(۴۶) اس نے کہا کہ اس کے والد صاحب (میرے والد صاحب) اس سے (مجھسے) بہت
ناراض تھے (بہت ناراض ہیں)

(۴۷) اس نے مجھسے کہا کہ وہ لڑکی سے محبت کرنے لگا ہے (میں اس لڑکی سے محبت
کرنے لگا ہوں)

(۴۸) اسی کو سینے سے لگائے رہ کر میں نے زندگی کے دن گزارے ہیں —

(۴۹) مذہبی نقطۂ نگاہ کو چھوڑ کر (اگرچہ یہ ایک مسلمہ کے لئے نا ممکن ہے)
بھی ہم ترکوں کے طرز عمل کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتے —

(۵۰) اگر آپ اس کے ہمراہ اس کے معمل میں جائیں تو وہ یہی تماشا اپنے شیشے
کے آلات یا برقی بیٹری کے ذریعے بتلائیگا (دکھا دیگا)

(۵۱) لیکن یہاں آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ آپ آرام و اطمینان سے آگ کے قریب بیٹھے
ہوئے اور بغیر بجلی سے مضرت پہنچنے یا بارش سے بھیگنے کے خوف سے سب
کچھ دیکھ سکتے اور سن سکتے ہیں —

(۵۲) وینس کی دلہن —— جس کو شاعری، مصوری، نقاشی، بت تراشی اور موسیقی
ہمیشہ سے آراستہ کرتے آئے ہیں (آراستہ کرتی آئی ہیں)

(۵۳) ان بیانات و خیالات کا میں کیا جواب دوں، جس کو سننے کے بعد کیمیاداں
کی نگاہیں اور خیالات مالتن کے اباہس کے خیالات کی طرح جو اس کے مرتبے
کے تنزل کے قبل تھے، بجنسہ پستی کی طرف مائل ہوتے ہیں، اور جو بجائے
کسی مقدس یا پاک شے کے نسبتاً دنیوی نمود و نمائش دولت اور حقیر
سونے کو پسند کرتا - ان کے حصول کی کوشش کرتا ہے -

(۵۴) افگلستان میں دو عاشق و معشوق کی شادی هونے والی تهی (عاشق و معشوق کی شادی هونے والی تهی)

(۵۵) شادی سے ایک روز پہلے عاشق زار نے اپنی هونے والی دلهن کے (منگیتر کے) ایک چاهنے والے کی ایک نازیبا حرکت سے مشتعل هوکر اُسے گولی کا نشانه بنا کے مار ڈالا (اسے گولی کا نشانه بنادیا۔ مگر کس کو؟)

(۵۶) هر وہ شخص نهیں سمجهه سکتا جس نے اقلیدس شروع سے نه پڑهی هو هر فضول هے)

(۵۷) کلیم پونا کے ایک تعلیم یافته نوجوان میں سے تهے ۔ اول ڈویژن میں رہ کر اس نے ایک خاص اعزاز سے انٹرنس کاامتحان پاس کیا —

(۵۸) کچهه مدت‌تک تو متلاون‌مزاج۔متلون‌نواب زادہ اپنی بیوی‌کےساتهه خوش رها (اپنی‌بیوی سے خوش رها)

(۵۹) اور چونکه سوائے اس بیٹی کے دوسرا کوئی اس کے حصے کا مالک نه تها ' اس لئے اپنے خسر کے مرنے کے بعد تمام آلات جغرافیه اور بہت‌بڑا ذخیرہ بهری نقشوں اور دیگر مقامات کا جہاں جہاں اس نےاپنی زندگی میں سفر کیا تها ' معه گهر کے مال و اسباب ' سب کا مالک بیٹی اور داماد هوے ۔

(۶۰) حکمراں شاعر نهیں تهے (نهیں غلط هے ۔ نه تهے چاهئے)

(۶۱) اس کا سبب میر نے شاعرانه طریقے سے بڑا پر لطف پیش کیا هے (شاعرانه انداز میں پر لطف طریقے سے پیش کیا هے)

(۶۲) اس انتخاب میں قدیم طرز کے اشعار میں نے نهیں درج کئے هیں ۔ اگر کوئی ملیں تو مجهے معاف کیجئے (اگر کوئی ملے یا اگر کچهه ملیں)

(۶۳) ان تینوں کے بعض وہ شعر ذیل میں نقل کئے جاتے هیں جن میں اس امر کی طرف اشارہ هے (۱۔ بعض ایسے شعر۔ ۲۔ وہ شعر)

(۶۴) عطار کا کلام خود ان کے اپنے زمانے میں مدون نہیں ہوا (اپنے زائد ہے)

(۶۵) میں نے خود بھی عرصہ ہوا ' پند نامہ' ایک خلاصے کے ذریعے سے جو
براہ کرم میرے لئے حسن فہمی نے تیار کیا تھا مطالعہ کیا تھا - (پند نامے کا
خلاصہ پڑھا تھا وغیرہ)

(۶۶) بعض متداول و معروف تشبیہات کے ساتھہ بعض عالی شان اور جلیل القدر
خیالات پائے جاتے ہیں—

(۶۷) پانچ سو (پانسو) آدمی خیال کرتا ہے کہ وہ بوڑھا ہے (میں بوڑھا ہوں)
اس کی مثال ایسے اونٹ کی ہے جو بندھی ہوئی آنکھوں سے چکی کے گرد
گھومتا ہے- (وہ ایسا اونٹ ہے جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے اور)

(۶۸) یہ حکایات اس روح (Spirit کا ترجمہ ہے) میں نہیں لکھی گئی ہیں جو سعدی
میں پائی جاتی ہے -

(۶۹) جسے میں کسی قدر مختصر پیرایے میں درج کرتا ہوں (مختصر طور پر)

(۷۰) وہ آگ فوراً اس ایندھن میں لگ جاتی ہے' جو ققنس نے جمع کرلیا ہے (جمع
کر رکھا ہے) اور ہلکے ہلکے (آہستہ آہستہ) اسے جلا دیتی ہے

(۷۱) قاضی نے صوفی کو حکم دیا کہ وہ ان الفاظ سے توبہ کرے (قاضی نے حکم دیا کہ
ان الفاظ سے توبہ کرو)

(۷۲) ۱۰-شوال تاریخ وصال قاضی صاحب کا عرس .... کیا جاتا ہے (کیا معنی؟)

(۷۳) اور اس وقت تک شاعری کی ہر صنف میں قسمت آزمائی کرچکے تھے
(طبع آزمائی)

(۷۴) گانوں کے مکھیا نے قاضی صاحب سے اظہار ہمدردی کی (کیا)

(۷۵) قاضی صاحب نے کہا اچھا لیجئے (لیجئے زائد ہے) میں کوشش کرونگا
تمہاری بات نہ ٹالوں گا —

(۷۷) شیخ نے فرمایا کہ تصور شیخ کیا کرو- اور اس کی مشق یہاں تک بہم پہنچاؤ
کہ " من تو شدم تو من شدی " کا قول صادق آجا ے اور مرید اور شیخ میں
وهی رشتہ اور تعلق نہ هوجاے جو جسم کو روح سے هے (فہغلط هے)

(۷۸) کتاب کا آخری حصہ جس میں تاریخ تصنیف کتاب ضرور رهی هو گی
(ضرور هوگی)

(۷۹) ظاهرا شکل و صورت (ظاهری)

(۸۰) اس کي روح ان تمام ردو بدل سے بری هے (اس تمام ردو بدل سے)

(۸۱) اس کا سمجھنا ذ را بہت مشکل هے - (ذرا زائید هے)

(۸۲) دونوں قریب قریب ایک هی هیں (دونوں قریب قریب ایک هیں -
بلکہ یکساں هیں)

(۸۳) ان اشعار میں عشق حقیقی کا اصل ترک دنیا ' ترک آ رزو پر نہا یت
قرینے کے سا تھہ روشنی ڈالی گئی هے (کیا معنی هیں ؟)

(۸۴) اگر تم میری مدد کرو تو میرا دامن معصیت باالکل دهل جاے ' مد د
کیجئے (شتر گر بہ هے)

(۸۵) اظہار معصیت محض اس لئے کر تے هیں تا کہ وہ اپنی عبادت وغیرہ پر
تکیہ‌کر کے نہ بیٹھہ جا ئیں (تا کہ غلط هے کہ چا هیے)

(۸۶) بنگ سبب هے اور محبت اس کا لازمی اثر (نتیجہ)

(۸۷) ایک زمانہ تھا کہ بنگ بنگاب سے بے نیاز تھا (تھی)

(۸۸) اس کی بدولت هم دنیا سمجھنے کی کوشش کر تے هیں (دنیا کو)

(۸۹) بنگاب کے ز یر تحت رهیں ' (ما تحت)

(۹۰) بنگ کے سر بستہ هاے راز کو انهو ں نے منکشف کر د یا هے
(راز هاے سربستہ)

(۹۱) 'ک' کے نیچے تین نقطے رکھنے سے وہ 'گ' ہو جاتا ہے (وہ زائد ہے)

(۹۲) 'ر' کے نیچے تین نقطے رکھنے سے وہ 'ڑ' ہو جاتا ہے (ڑ ہو جاتی ہے)

(۹۳) کہیں سنہ ۱۸۷۰ ع میں جرمن ایک متحد قوم بن پائے -

(۹۴) ان گدھوں کی طرح 'لاطینی' حرفوں سے نہ پوچھنا چاہئیے کہ جرمن زبان کیوں کر بولی جائے ' بلکہ گھر میں بیٹھنے والی ماؤں سے ' سڑک پر کھیلنے والے بچوں سے ' بازار میں پھرنے والے لوگوں سے (خدا جانے کیا مفہوم ہے)

(۹۵) سولھویں صدی کی 'ادبی پیداوار' سوائے مذہبی کتبوں وغیرہ کے اور کچھہ نہ تھی -

(۹۶) (Plays) 'کھیل ڈراما' کی (Spirit) 'روح' سے خالی ہیں-

(۹۷) اس کا سب سے پہلا ناول ایک آوارہ گرد کی خود نوشتہ سوانح عمری کے طور پر (عنوان سے) شائع ہوا —

(۹۸) اس کی غنائی شاعری موسیقی سے خالی ہے (خالص انگریزی انداز بیان ہے)

(۹۹) ایک گروہ اس کا مخالف تھا ' جو اس کی واقعیت پسندانہ کو مخرب اخلاق سمجھتا تھا (واقعیت پسندانہ کیا ؟)

(۱۰۰) وہ ان پردوں کے پیچھے انسانیت کے عین کو دیکھتا ہے (عین کیا معنی ؟)

(۱۰۱) اس کی سعی سے ملک کے نظام و نسق میں کوئی دیر پا خارجی نتائج حاصل 'نہیں ہوے' -

(۱۰۲) تمدن کے نمونے اور کلا سیکی روح کے مجسمے ملے -

(۱۰۳) جرمنی کی اسٹیج پر کھیلوں کا قبضہ تھا - (فرنگی اردو ہے) -

مندرجۂ بالا سطور میں ترجمے اور تالیف کے جو نمونے ھدیۂ ناظرین کئے گئے ھیں وہ ان جوانان ادب کے زور طبع کے نتائج ھیں ' جو شہرت اور ناموری کے پروں پر اُڑے چلے جا تے ھیں - اور انگریزی انشا و ادب کی اعانت و امداد سے سلطنت اردو کو اپنی قلمرو میں شامل کر رھے ھیں - لیکن سوال یہ ھے کہ کیا ان نمونوں پر اردو کا اطلاق ھو سکتا ھے ' کیا کوئی مبصر اور ماھر زبان ان پر اردو کا اتہام عائد کر سکتا ھے ؟ کیا کوئی کہہ سکتا ھے کہ یہ اردو روز مرہ کے نمونے ھیں ؟ کیا کوئی شخص الکھ سکتا ھے کہ ان میں اور انگریزی میں کچھہ فرق ھے ؟ ھرگز نہیں - ھمارے نزدیک تو یہ اچھی خاصی انگریزی ھے 'جو انگریزی داں حضرات کے قلموں سے ٹپک پڑی ھے - سیدھی سادی اردو لکھنی اور دلی اور لکھنو کے روز مرہ کی پیروی کر نی انھیں لوگوں کا کام ھے جو شہرت اور ناموری کے میدان میں پیچھے رھنا چاھتے ھیں -

زندگی کے ھر شعبے میں دو قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑ تا ھے - ایک تو وہ لوگ ھیں جو ترقی کر نا اور آگے بڑھنا اپنا فرض سمجھتے ھیں - دوسرے وہ بزرگ ھیں جو روایات قدیم سے انحراف کر نا اور کسی نامپردہ راستے میں قدم رکھنا خلاف ایمان تصور فرما تے ھیں- اس امر میں سر موشک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ لکیر کا فقیر رھنا اور رسم و رواج قدیم کی بندشوں سے آزاد نہ ھو نا گناہ کبیرہ ھے - لیکن جدت طرازی اور اختراع پسندی کے شوق میں مسلمہ حدود و قیود کو نظر انداز کرنا اور قدیم نمونوں کو توڑ پھوڑ کر رکھدینا کونسی دانائی اور کہاں کی ترقی ھے - ھمارے نزدیک جدت طرازی اور حدودشکنی صرف انھی بزرگوں کا حصہ ھے جو سالہا سال غور وفکر کی داد دیتے ھیں اور مدت العمر کی متواتر اور لگاتار کدو کاوش کے بعد اپنی ذات میں وہ قابلیت پیدا کرلیتے ھیں جو آگے بڑھنے اور جدت دکھانے کے لئے ضروری ھوتی ھے - دنیا عالم اسباب ھے یہاں یکساں اسباب سے یکساں

نتائج نکلتے ھیں - نومشق اور خام مذاق حضرات نہ کبھی ترقی کرسکے ھیں ' نہ قیامت تک کرسکیں گے - دو آن مل اور بے جوڑ لفظوں کو پاس پاس رکھ دینا اور اس کو جدت اور ندرت قرار دینا اُنھی لوگوں کا کام ھے ' جو ذوق سلیم سے بے بہرہ ھیں - جب تک قدامت پرستی اور جدت پسندی ایک جگہ جمع نہیں ھوتیں اس وقت تک اصلی اور حقیقی معنی میں ترقی نہیں ھوتی - ھمارے نزدیک اس دور میں اِس امر کی سخت ضرورت ھے کہ ایک محکمہ قائم کیا جاے اور اس کا نام " محکمۂ احتساب ادب " رکھا جاے - اور اس کو یہ خدمت سپرد کی جاے کہ پہلے ھر مضمون پر نقادانہ نظر ڈال لے اور اس کے بعد اس کو شائع ھونے کی اجازت دے ؛ ورنہ وہ وقت دور نہیں ھے کہ اُردو اُردو نہ رھے گی ' اچھی خاصی انگریزی بن جائے گی —

اس مقام پر ھمارے نام نہاد جدت پسند حضرات کی طرف سے یہ اعتراض ھوگا کہ " ھر زبان کی یہی حالت ھے اور ھر زبان کو کم و بیش یہی مدارج طے کرنے پڑے ھیں - کوئی زبان اس سے مستثنیٰ نہیں ھے - ھر ملک اور ھر قوم کے نوجوان اپنی زبان کی خدمت اپنے دوش ھمت پر لیتے ھیں ' اس میں طرح طرح کے نمونے جمع کرتے ھیں اور اس طرح اپنی زبان کو سرمایہ‌دار بناتے ھیں " - اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ عمل یوں ھی جاری رھا ھے اور یوں ھی رھے گا - مگر محکمۂ احتساب بھی ھمیشہ قائم‌ھوتا آیا ھے اور ھمیشہ قائم ھوتا رھےگا - انگریزی اس قدر وسیع اور سرمایہ دار زبان ھے کہ اس کی تقلید جزو ایمان سمجھی جاتی ھے مگر اس کے باوجود بھی " احتساب " کا یہ عالم ھے کہ بال کی کھال نکالی جاتی ھے اور لفظ لفظ کی قدر و قیمت معین کی جاتی ھے - ' نگار ' ھندوستان میں نہایت مقتدر رسالہ ھے - اُس کے مدیرھمہ‌داں ھیں - اطراف و جوانب‌سےاستفسارات کی بھرمار ھوتی ھے - اور وہ ھمہ داں فاضل اُن سب کا جواب دیتے ھیں - اسی مقتدر رسالے کے

کسی نمبر میں ایک دفعہ ایک قدامت پرست بزرگ نے جناب مدیر سے ذہنیت کے متعلق کچھ سوال کیا تھا - آپ نے فرمایا کہ " یہ لفظ Mentality کا صحیح ترجمہ ہے ' اس لئے آپ کو بڑی اپنی ذہنیت میں تبدیلی کرلی چاہئے " - مگر فاضل ہمہ داں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ انگریزی Mentality کے خلاف اس سے کہیں زیادہ جہاد کیا جاتا ہے ' جس قدر اردو میں ذہنیت کے خلاف روا رکھا جاتا ہے- اگر جناب مفتی ادب کی نظر میں یہ نکتہ ہوتا تو اس فضول اور بیکار لفظ کی حمایت سے پرہیز کرتے - اس کے علاوہ ہم اپنے جدت پسند حضرات سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ اگر اردو کی جگہ فرنگی اردو نے لےلی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا ؟ ہمارے نزدیک اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس اردو کو صرف وہی بزرگ سمجھ سکیں گے جن کی آنکھیں انگریزی علم ادب کے مطالعے سے روشن ہیں اور جن کی نظر میں وہ انداز بیان پہلے سے موجود ہے جس کی تقلید مقصود ہے - لیکن جو لوگ اس نعمت عظمیٰ سے بے بہرہ ہیں ' وہ محروم رہ جائیں گے- اور جب یہ لوگ محروم رہے تو جناب کی جدت طرازیاں اور معنی آفرینیاں کس کام آئینگی - کیا جناب کے سامنے وہ بزرگ زانوے ادب تہ فرمائینگے جو انگریزی تعلیم اور انگریزی اندازبیاں دونوں سے واقف ہیں؟ کیایہ حضرات جناب کی سعی وکوشش کے محتاج ہیں- یا ان بزرگوں کوآپ کی اعانت و امداد کی ضرورت ہے؟ اگرآپ کا یہ خیال ہے تو غلط اور سراسرغلط ہے - جس قدر جلد آپ اس کو نکال ڈالینگے ملک وقوم اور زبان و ادب پر آپ اسی قدر احسان فرمائینگے - ہمارے نزدیک جو لوگ آپ کی خدمت کے محتاج اور آپ کی امداد کے خواہاں ہیں' وہ وہی لوگ ہیں جو آپ کی زبان سمجھنے سے قاصر ہیں- کیا ہندوستان کے طول و عرض میں کوئی اردو داں شخص ایسا ہے جو " اچھے دفاتر" کا مطلب سمجھ سکے اور " بدنصیب الفاظ " اور "قابل افسوس عبارت" کی کنہ تک پہنچ جاے؟ اگر کوئی شخص ان انوکھی اور نرالی ترکیبوں کو سمجھ سکتا ہے تو وہ وہی شخص ہے جس کی آنکھیں "ادبیات انگریزی" سے روشن ہیں - ہمارے

نزدیک "Soldier of fortune" کا ترجمہ " خوش نصیب سپاھی " کرنا اور اس کو دیانت اور امانت قرار دینا دیانت اور امانت کا منہ چڑانا ھے —

اس مقام پر ایک اعتراض اور بھی ھوسکتا ھے وہ یہ ھے کہ ایک زمانہ تھا کہ عربی فارسی وغیرہ سے اردو میں ترجمہ کیا جاتا تھا - اس وقت جو لوگ مشرقی زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرتے تھے وہ عربی اور فارسی ترکیبیں اسی کثرت سے برتتے تھے' جس قدر اس دور میں انگریزی ترکیبیں برتتے ھیں - مثلاً

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ھر اک سے پوچھتا ھوں کہ جاؤں کدھر کو میں ' مرزا غالب '

اس شعر میں " چھوڑا نہ رشک نے " خالص فارسی ترکیب ھے - جو " رشکم نہ گذاشت " کا لفظی ترجمہ ھے - اس کے جواب میں ھم معترض حضرات کی خدمت میں یہ عرض کرتے ھیں کہ فارسی اور انگریزی میں کسی قدر فرق ھے' اگر وہ فرق نظر میں ھوتا تو یہ اعتراض نہ کیا جا تا - وہ فرق یہ ھے کہ جس وقت فارسی سے اردو میں ترجمہ کیاجاتا تھا' اس وقت ھماری زبان فارسی تھی یا کم از کم تعلیم یافتہ گھرانوں میں بے تکلف سمجھی جاتی تھی - اس لئے اردو میں فارسی کی تقلید غیرمانوس اور ناقابل فہم نہ تھی بلکہ کلام میں ایک خاص لطف پیدا کردیتی تھی اور سننے والے کو یہ محسوس ھوتا تھا کہ ھماری ھی چیز ھے- جو مختلف لباسوں میں ھمارے سامنے جلوہ گر ھے'لیکن اس زمانے میں انگریزی ھماری زبان نہیں ھے اور نہ کوئی خاندان ایسا نظرآتاھے جس میں انگریزی مادری زبان کی حیثیت سے بولی جاتی ھو اور اگر کوئی ایک آدھہ خاندان ایسا ھے بھی تو اُس کو اُردو اور ترقی اُردو' دونوں سے کچھہ سروکار نہیں- اس لئے ھم بلاتکلف کہہ سکتے ھیں کہ فارسی سے ترجمہ کرتے وقت ھماری الفاظ پرستی نبھہ گئی ' لیکن انگریزی سے ترجمہ کرتے وقت نہیں نبھہ سکتی - مثال کے طور پر ھم ایک انگریزی نظم پیش کرتے ھیں جس کا پہلا ٹکڑا یاد رہ گیا ھے "The poem hangs on the berry bush"

اس کا ترجمہ ایک صاحب کمال بزرگ ان الفاظ میں فرماتے ھیں کہ " نظم " بیری کی جھاڑی " پر لٹکتی ھے" - ھم جناب مترجم کی خدمت میں نہایت ادب و انکسار سے التماس کرتے ھیں کہ آپ تمام ھندوستان کا سفر کریں اور اس سرے سے اس سرے تک چکر لگائیں اور اردو داں حضرات سے دریافت فرمائیں کہ " بیری کی جھاڑی " کے کیا معنی ھیں: اس کے جواب میں ھر شخص یہی کہے گا کہ بیری ایک درخت ھے جس میں بیر لگتے ھیں - آپ کو ایک شخص بھی ایسا نہ ملے گا جو اس کا مفہوم وھی سمجھتا ھو جو جناب کے ذھن میں ھے - اب مجبور ھوکر جناب فرمائیں گے کہ صاحب وہ "بیری کا درخت" ھے، یہ "بیری کی جھاڑی" ھے، ان دونوں میں فرق ھے، وہ ھندوستانی "بیری" ھے یہ انگریزی "بیری" ھے - اس کے جواب میں وہ عرض کرے گا کہ جناب یہ تو معلوم نہیں کہ انگریزی "بیری" کسے کہتے ھیں اور اس کے معنی کیا ھیں، لیکن "بیری کی جھاڑی" کے جو معنی ھمارے ذھن میں آئے ھیں وہ تو ھندوستانی ھیں انگریزی نہیں، ھم جاھل اور ناخواندہ لوگ انگریزی کو کیا سمجھ سکتے ھیں - اس کے جواب میں جناب فرمائیں گے کہ حضرت 'درخت' اور جھاڑی میں بہت فرق ھے، آپ دونوں کو ایک کیوں سمجھتے ھیں" - اب وہ کہے گا کہ حضور فرق تو ضرور ھے، مگر میں نے اپنے دل میں سمجھ لیا تھا کہ آپ کسی ایسے علاقے کے باشندے ھیں جہاں درخت کو جھاڑی کہتے ھوں گے - بہر کیف "بیری کی جھاڑی" سے ھم جو کچھ سمجھ سکتے ھیں وہ تو یہی ھمارا بیری کا درخت ھے، باقی آپ جانیں اور آپ کی "بیری کی جھاڑی" جانے - اس جواب سے کبیدہ خاطر ھوکر جناب فرمائیں گے کہ اچھا "Berry bush" کا ترجمہ کیا کیا جائے - اس کے جواب میں ھم جناب سے عرض کریں گے کہ بیری کو نکال دیجئے "جھاڑی" رہنے دیجئے، کام چل جائے گا - اگر ادب و انشا کی شان دکھانی منظور ھے تو "اشجار و نباتات" وغیرہ الفاظ موجود ھیں، ان سے کام لیجئے؛ لیکن اردو داں پبلک کو اندھیرے میں نہ رہنے دیجئے اس لئے کہ اس نظم میں "بیری" کی کوئی خصوصیت نہیں، جو

چیز مقصود بالذات ہے وہ سرسبز اور ہرا بھرا درخت ہے، کوئی خاص درخت نہیں کہ خواہی نخواہی اس کا اظہار کیا جائے - خدا جانے وزن اور قافیے کی کیا کیا مجبوریاں ہوں گی جن کے باعث شاعر کو "Berry bush" لکھنا پڑا ہوگا، اگر یہ مجبوریاں نہ ہوتیں تو آپ دیکھ لیتے کہ شاعر صرف "bush" لکھتا - "Berry bush" ہرگز نہ لکھتا ۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ شاعر کی مجبوریوں کی تقلید کریں اور اردو داں حضرات سے ایسا لفظ رو شناس کرائیں جس کا مفہوم وہ غلط سمجھنے پر مجبور ہیں - اس کے علاوہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ لفظ "Berry" نہایت اہم اور ضروری لفظ ہے اور اس کے بغیر کسی طرح کام نہیں چل سکتا تو ہم عرض کریں گے کہ جذبات انگیزی اور شعر آفرینی میں لفظ "Berry" (بیری) کو جو کچھ دخل ہے وہ انگریزی میں ہے اُردو میں نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان میں بیری کو واقعات حیات سے اگر کوئی تعلق ہے تو وہ یاس خیز اور غم انگیز ہے، یعنے اس کے پتے گرم پانی میں ڈالے جاتے ہیں اور ان سے مُردے کو غسل دیا جاتا ہے - اگر اس درخت کو جذبات مسرت و انبساط سے کوئی واسطہ ہوتا تو ادب اردو میں کہیں تو ذکر آتا ۔ ہمارے نزدیک اس نظم کا مفہوم یہ ہے کہ تلامیذالرحمٰن حضرات کی شعر بیں نگاہیں جب کسی تر و تازہ اور سر سبز نو نہال کی نازک پتیوں اور نرم نرم پنکھڑیوں پر پڑتی ہیں تو ان میں شعر و قصائد کے دفتر کے دفتر مضمر پاتی ہیں۔ یعنی جوانان چمن کے خدا داد اور طرب انگیز حسن کو دیکھ کر عاشق مزاج شاعر کے دل میں شعر گوئی اور شعر خوانی کے جذبات موجزن ہوجاتے ہیں - اسی طرح جب شکسپیر کسی بازار میں سے گذرتا ہے تو وہ بازار بازار نہیں رہتا بلکہ تھیٹر بن جاتا ہے - یعنی ملک الشعراے انگلستان کی فطرت شناس نگاہیں بازاروں اور تجارت گاہوں میں فطرت انسانی کے ایسے ایسے اسرار و معارف دیکھ لیتی ہیں جو سطح بیں لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں- یہ خداے سخن ان کو لیتا ہے اور اپنے غیر فانی اور لازوال ڈراموں کی تصنیف میں صرف کرتا ہے - ہمارے نزدیک یہاں بھی شکسپیر کی کوئی قید نہیں ہے -

اس لئے کہ یہاں یہ لفظ حقیقت میں اسم معرفہ نہیں ہے بلکہ نکرہ ہے اور اس سے اعلی درجے کا ڈراما نویس شاعر مراد ہے - یعنی جب کسی اعلی درجے کے ڈراما نویس شاعر کا گذر بازاروں اور تجارت گاھوں میں ہوتا ہے تو اس کی فطرت شناس نگاھیں فطرت انسانی کے گہرے اسرار و معارف تک پہنچ جاتی ہیں اور وہ ان کو ڈراما نویسی میں صرف کرتا ہے، حالانکہ بازاروں اور تجارتگاھوں کو شعر گوئی اور مضمون آفرینی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ چیزیں تو شاعرانہ جذبات کے حق میں سم قاتل ہیں- اگر غور سے دیکھا جاے تو شاعر کا منشا وہی ہے جو 'عرفی' کے اس شعر سے پایا جاتا ہے :

ہر کس نہ شنا سندۂ راز است و گرنہ
ایں ھا ھمہ راز است کہ معلوم عوام است

اب ہم فاضل مترجم سے دریافت کرتے ہیں کہ جناب کے ترجمے سے پڑھنے والوں کے دلوں پر یہی اثر ہوتا ہے کہ نہیں- اگر نہیں ہوتا تو کیا جناب کامیاب ہیں اور جناب کی سعی مشکور ہے ؟ کیا ملک و قوم پر جناب کا کوئی احسان ہے، یا زبان و ادب پر جناب کی کوئی عنایت ہے ؟

اگر یہ کہا جاے کہ جامعۂ عثمانیہ کے طلبا انگریزی جانتے ہیں ، اس لئے ان کے سامنے فرنگی اردو کے نمونے پیش کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟ تو ہم دریافت کرتے ہیں کہ ترجمے کی کیا ضرورت ہے - انگریزی میں علوم کی تعلیم کیوں نہیں دی جاتی ؟ اور برطانی ہندوستان کی اور یونیورسٹیوں کی تقلید کیوں نہیں جاتی ؟ آخر کوئی تو خوبی ہے کہ رسم قدیم سے انحراف کیا گیا اور اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا ہے ھمارے نزدیک اردو سے انحراف کرنا اور اس کی جگہ 'فرنگی اردو' سے کام لینا اس مقصد کو فوت کرنا ہے، جس کے لئے جامعۂ عثمانیہ عالم وجود میں جلوہ گر ہے —

اصول تراجم

اب ہم اپنی ناقص عقل و رائے کے مطابق چند اصول ملک و قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اپنے اولوالعزم نوجوانوں سے درخواست کرتے ہیں کہ ان پر غور کریں اور یہ دیکھیں کہ وہ اصول مذاق سلیم کے معیار پر پورے اترتے ہیں کہ نہیں - اگر انھیں اپنے لئے مفید اور کارآمد پائیں تو ان پر کاربند ہوں ، ورنہ اپنے لئے کچھ اور اصول مقرر کریں اور ان سے شمع ہدایت کا کام لیں ، تاکہ ترجمے کی تنگ و تاریک گھاٹیوں میں سر ٹکراتے نہ پھریں —

---

(۱) اسمائے معرفہ

اسمائے معرفہ کی دو قسمیں ہیں (۱) اسمائے اشخاص (۲) اسمائے مقامات۔

اسمائے اشخاص کے متعلق یہ اصول ہے کہ اصل زبان کے تلفظ کا اتباع نہ کیا جائے بلکہ قطع و برید کرکے اس کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھال لیا جائے - مثلاً Gallon سے جالینوس - ' Socretes ' سے سقراط ' Aristotles ' سے ارسطو اور ' Plato ' سے افلاطون بنانا انہی بزرگوں کا کام تھا ، جنھیں ' دربار ادب ' سے ذوق سلیم عطا ہوا تھا - ورنہ ہمارے زمانے کے نوعمر اور خام مذاق حضرات تو ' Ptolmy ' کو پٹالمی لکھتے ہیں اور اس پر فخر و مباہات کی بنیادیں اٹھاتے ہیں - حالانکہ اب سے صدیوں پہلے بزرگان عرب اس کو ' بطلیموس ' لکھ گئے ہیں - ہمارے نوخیز علمائے ادب کے علم و فضل کا یہ عالم ہے کہ اُن کو یہ بھی معلوم نہیں کہ انگریزی میں اس کا صحیح تلفظ ٹالمی ہے یا پٹالمی ، اگر یہ ' علم برداران ادب ' صرف اتنی زحمت گوارا فرماتے کہ کسی ڈکشنری کو کھول کر دیکھ لیتے تو وہ کم از کم اپنی انگریزی دانی کا پردہ نہ کھلنے دیتے —

اسی طرح انگریزی میں Herschel ایک لفظ ہے ، جس کا تلفظ ہرشل ہے ، مگر

دلدادگان تقلید کا مذاق گوارا نہیں کرتا کہ زبان کے کسی حرف کو بیکار رہنے دے اس لئے وہ اسکو ' ھر سچل ' بنالیتے ھیں - چنانچہ ' شارلمین ' کو چار میگن بنانا اور ' لین ٹین' کو ' لین ٹیگنی' دکھانا انھی کی شان تھھرکے شایاں اور انھی کی ھمت کے لائق ھے' جو محض سرمائے کی بدولت ' سلطنت انشا و ادب' کو فتح کرنا چاھتے ھیں - جن بزرگوں نے ' Pharoah ' کی جگہ فرعون تراشا تھا' ان کا مذاق قابل تقلید تھا ' مگر ھمارا مبلغ علم بھی کچھ کم لائق تعریف نہیں ھے کہ انگریزی تلفظ اردو میں برتنا جزو ایمان سمجھتے ھیں اور فرعون کی جگہ پھیروھا ' اور ' موسیٰ' کی جگہ 'موزیز' لکھنا اپنے لئے ذریعۂ نجات خیال کرتےھیں —

ھمارے نزدیک اس زمانے کے مترجم اور مؤلف حضرات کا یہ فرض ھونا چاھئے کہ انگریزی اسماے اشخاص کو لیں ' اس کا صحیح تلفظ معلوم کریں اور یہ دیکھیں کہ ھماری زبان کی نزاکت اس کی متحمل ھو سکتی ھے کہ نہیں - اگر ھو سکتی ھے تو اس کو اصلی صورت میں لے لیں' ورنہ قطع و برید میں سر مو تکلف نہ کریں - مثلاً ملٹن ' پوپ گرے ' جانسن' ٹینی سن' ولیم' ولسن' کارلائل' گرین' میکالے ' چرچل ' سائمن ' ھکسلے' ریڈنگ ' ھلیی وغیرہ ایسے اسم ھیں کہ اردو میں آنے کی صلاحیت رکھتے ھیں ' اُن کے متعلق کسی قسم کی کد و کاوش کی ضرورت نہیں' ان کو بے تکلف اُن کی اصلی صورت میں لےسکتے ھیں —

(۲) اس کے بعد ایسے اسماے اشخاص کا نمبر ھے جو حروف کے اعتبار سے ثقیل ھیں' مگر تلفظ کے لحاظ سے ثقیل نہیں ھیں ' اس لئے لازم ھے کہ اردو میں ان کو اس انداز سے لیا جاے کہ ثقل دور ھو جاے' مثلاً Vaghan (واگھن) نہایت ثقیل ھے مگر ' وان' ثقیل نہیں ھے اور یہی صحیح ھے - اسی طرح Pugh کا تلفظ 'پگھ' نہیں ھے بلکہ 'پیو' ھے - اس لئے اگر 'وان' اور 'پیو' کو لیا جاے تو ثقل بھی دور ھو جاتا ھے اور مترجم کا دامن سہو و خطا سے بھی

پاک هو جاتا ہے - ریلے ، برلے ، لیسٹر ، گلاسٹر ، بھجٹ وغیرہ بھی اسی قسم کے اسماے اشخاص هیں کہ حروف کے اعتبار سے ثقیل اور تلفظ کے اعتبار سے لطیف هیں —

(۳) اس کے بعد ایسے اسماے اشخاص کو لیجئے جن کے املا و تلفظ میں کچھ فرق نہیں ، مگر هماری زبان کی نزاکت ان کے ثقل کے تحمل سے عاجز هے ، مثلاً Aristotle اس کا تلفظ انگریزی میں بھی یہی هے جو اس کے حروف سے ظاهر هے - اس میں جتنے حرف هیں سب ضروری هیں - نہ کوئی زائد هے نہ ساقط از آواز ، مگر اردو میں آنے کی صلاحیت نہیں رکھتا - یہاں تک کہ قدماے عرب نے بھی اس میں تصرف کیا اور اسے ارسطا طالیس بنالیا جو کم هوتے هوتے صرف ارسطو رہ گیا - اب یہ اس قابل هے کہ اردو میں بے تکلف برتا جاے اسی طرح Socretes (ساک - ری - ٹیز) کا ثقل ناقابل برداشت تھا ، مگر مذاق سلیم کا خدا بھلا کرے ' سقراط ' بناکر هم پر اور هماری زبان پر احسان کردیا - اسی طرح Daniel کا صحیح تلفظ (ڈے - نی - ال) تھا جو ذرا سے تصرف سے دانیال بن گیا - قدماے عرب نے جوزف ' جوفز اور جیکب کو یوسف ' یونس اور یعقوب بنالیا تھا ، مگر واے برحال ما کہ اپنی شے غیروں سے لیتے هیں اور اس انداز سے لیتے هیں کہ اُنهی کا عطیہ معلوم هوتا هے —

اس باب میں همارے زمانے کے مترجم اور مؤلف حضرات کا فرض هے کہ اپنے اجتہاد سے کام لیں اور قطع و برید کرکے الفاظ کو اس قدر لطیف کرلیں کہ هماری زبان پر بار نہ هوں - مثلاً لیہالت ، یا لیهولت ثقیل هے ' لیهال بنالیجئے ' ثقل دور هوجاے گا ' لفظ زبانوں پر پھسلنے لگیگا اور اس انداز میں آجائیگا کہ گویا خالص اُردو زبان کا لفظ هے - اسی طرح لب نٹز کو لب نز بنا لیجئے کہ ثقل سے خجات ملے —

اس مقام پر یہ احتمال ہے کہ کہیں یورپ نواز حضرات کی طرف سے یہ اعتراض نہ ہو کہ جرمنی اور فرانسیسی وغیرہ کی اکثر کتابوں کے ترجمے انگریزی میں شائع ہوتے ہیں، اُن میں اسمائے اشخاص میں کسی قسم کا تصرف روا نہیں رکھا جاتا ، بلکہ اُن کو بے کم و کاست اُسی طرح ہدیۂ ناظرین کردیا جاتا ہے، جس طرح اصلی زبانوں میں لکھے جاتے ہیں - اس کے جواب میں ہم اُن حضرات کی خدمت میں یہ عرض کرتے ہیں کہ اُن زبانوں میں اور اُردو میں ایک گونہ فرق ہے - وہ سب زبانیں رومی حروف میں لکھی جاتی ہیں ' ان کا رسم خط ایک ہے ' اس کے برعکس اُردو کا رسم خط ان سے مختلف ہے ' وہاں ایک زبان کی تقلید دوسری میں ممکن ہے ' یہاں ممکن نہیں ہے - اُردو' فارسی ' اور عربی کا رسم خط قریب قریب ایک ہے ' اس لئے کہ یہ سب کی سب زبانیں عبرانی حرفوں میں لکھی جاتی ہیں - جب عربی یا فارسی کی کسی کتاب کا ترجمہ اُردو میں کیا جاتا ہے تو اسمائے اشخاص کے باب میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آتی ' جس طرح وہ عربی فارسی وغیرہ میں لکھے جاتے ہیں ' اسی طرح اُردو میں حوالۂ قلم کردیے جاتے ہیں - مثلاً عبدالرحمٰن اور عبدالرحیم وغیرہ اُردو میں بجنسہ اسی طرح لکھے جاتے ہیں جس طرح عربی میں لکھے جاتے ہیں لیکن انہی کو رومی حروف میں لکھئے اور ' ال ' کو ساقط نہ کیجئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے - اسی طرح فارسی کے الفاظ ' خود ' و ' خویش ' وغیرہ کو لیجئے اور واو معدولہ کو قائم رکھنے کی کوشش کیجئے ' ایک آن واحد میں آپ کے علم و فضل کی قلعی کُھل جائیگی —

(ب) اسمائے مقامات

(الف) ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ ' روزیٹا ' کیا ہے اور ' ڈیمیٹا ' کہاں ہے - مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ ' رشید ' کہا ہے اور ' دمیاط ' کس کو کہتے ہیں - حالانکہ ' روزیٹا ' اور ' ڈیمٹا ' انہی دونوں کی خرابی ہے

جب کوئی یورپین بزرگ 'مصر' کا جغرافیہ لکھنے بیٹھے ہونگے تو 'رشید' پر ان کی نظر پڑی ہوگی' اس کو انھوں نے اپنی زبان کی نزاکت پر ایک گونہ بار محسوس کیا ہوگا اور اسے 'رشیت' یا 'رشیت' بنا لیا ہوگا اس کے بعد رزیت اور روزیت ہوا ہوگا' اس کے بعد روزیٹا ہوگیا ہوگا۔ جو اب رائج ہے۔ یہی مصیبت 'دمیاط' پر نازل ہوئی ہوگی کہ بالآخر ڈیمیٹا ہوکر رہ گیا۔ جب کوئی ہندوستانی بزرگ (ہندو یا مسلمان) جغرافیہ لکھنے بیٹھے ہونگے تو اُن کے سامنے ضرور کوئی انگریزی تصنیف ہوگی' اس میں دیکھا ہوگا کہ Rosetta لکھا ہے' اٹھایا اور 'روزیٹا' لکھدیا۔ اگر یہ بزرگ ذراسی سعی و کوشش سے کام لیتے اور مصر کا نقشہ اٹھا کر دیکھنے کی زحمت گوارا فرماتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ دریاے نیل کے دہانے پر روزیٹا نہیں ہے' رشید ہے۔ اسی طرح ڈیمیٹا نہیں بلکہ 'دمیاط' ہے۔ مگر اتنی زحمت کون اٹھاے۔ یہ تو اسماے معرفہ ہیں' ان میں کد و کاوش لغو اور تحقیق و تدقیق لا یعنی ہے۔ مکھی پر مکھی ماردی اور کام چلا لیا' مگر کیا یہ بزرگ تصنیف و تالیف کی اہم ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو گئے؟ کیا یہ حضرات اپنے فرض منصبی سے عہدہ برا ہو سکے' کیا علوم و فنون پر ان کا کوئی احسان ہے' کیا ہماری زبان ان کی ممنون منت ہے؟ نہیں نہیں' ہرگز نہیں۔ بلکہ آئندہ نسلوں کی سہولت پسندی اور بد مذاقی کی تمام تر ذمہ داری انھی ناقص التعلیم مصنفوں اور انھی غیر ذمہ دار مؤلفوں کی گردن پر ہے —

اسی طرح عربی داں حضرات جانتے ہیں کہ 'اسود' کے معنی سیاہ فام کے ہیں' اسی سے لفظ سودان بنا ہے' جو ملک حبش کا دوسرا نام ہے۔ انگریزی میں دال کی آواز کہاں کہ صحیح تلفظ ادا کرتی' اس لئے سوڈان ہو گیا۔ انگریزی سے اردو میں آیا' مگر ڈال ساتھ لایا۔ اس وقت اردو کے کسی اخبار یا کسی رسالے کو

اٹھا کر دیکھئے 'سوڈان' ملیکا - 'سودان' کا کہیں ذکر نہ آے گا - کیا اسی کا نام تحقیق ھے؟ کیا اسی کو اجتہاد کہتے ھیں ؟ کیا نام نہاد مؤلفوں اور مترجموں کا یہی فرض ھے کہ انگریزی کی عامیانہ اور سوقیانہ تقلید کریں اور جو کچھہ وھاں پائیں وھی اپنے ھاں لے آئیں ؟

گزشتہ جنگ عظیم میں 'کنٹارہ' اس قدر مشہور ھو گیا تھا کہ ھندوستان کا کوئی اخبار اس سے خالی نہ تھا - اس کی صورت اس قدر مسخ ھو گئی ھے کہ عربی سے اسے کوئی نسبت نہیں معلوم ھوتی - دماغ محو حیرت تھاکہ اس میں (ٹ) کہاں سے آ گئی - اتفاق حسنہ سے ارض مقدس جانا ھوا تو ایک اسٹیشن پر جلی حرفوں میں لکھا دیکھا " قنطرۃالخیر " اب سمجھہ میں آیا کہ 'کنٹارہ' اسی قنطرہ کی بگڑی ھوی صورت ھے - انگریزی میں حروف (ق) و (ط) کی آواز کہاں کہ صحیح تلفظ ادا کرتی - مجبوراً Kantara لکھنا پڑا - جب ھمارے اخبار نویس حضرات کی صحت پسند نگاھیں اس پر پڑیں تو (K) اور (ٹ) کو موجود پایا - اب کیا شے مانع تھی کہ وہ اس کو کنٹارہ نہ بنالیتے اور ان کے روز افزوں مشاغل انھیں اتنی اجازت کہاں دیتے ھیں کہ کم و بیش تحقیق کر لیتے کہ اصل زبان میں وہ لفظ کیا ھوگا جو انگریزی میں کنٹارہ کی صورت میں جلوہ گر ھے - بجنسہ یہی افتاد لفظ 'قط' پر پڑی کہ رفتہ رفتہ کوٹ ھو کر رہ گیا ھے —

اب تک تو ھم نے اُن اسماے مقامات پر ایک نظر ڈالی ھے جو کبھی زمانے میں ھمارے تھے ' مگر اب غیروں کے قبضے میں ھیں اور غیروں کی وساطت سے ھم تک پہنچے ھیں - اب ھم ایسے اسماے مقامات پر غور کرتے ھیں جو غیروں کے ھیں اور غیروں کی وساطت سے ھم تک پہنچے ھیں - اگرچہ توقع تو نہیں ھے کہ ھمارے تقلید پرست حضرات اس باب میں کسی قسم کے تصرت کی تکلیف گوارا فرمائیں گے ' اس لئے کہ جب خود اپنے گھر کے الفاظ کے متعلق ان کی سرد مہری کا یہ عالم ھے تو غیروں کے الفاظ کے متعلق کیا کچھہ نہ ھوگا —

(ب) جن بزرگوں کی آنکھیں عربی ادب سے روشن ہیں اور جن کے مطالعے میں مصری اخبار رہتے ہیں، وہ جانتے کہ Mar-seilles کا فصیح تلفظ کیا ہے اور Brussels کو کیا لکھتے ہیں، مگر ہمارے ابنائے وطن اُن کو جب لکھتے ہیں، مارسلیز اور برسلز لکھتےہیں؛ مارسیل اور بروسیل کے پاس نہیں پھٹکتے، اس لئے کہ یہ جاہلوں اور نا اہلوں کا شیوہ ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اردو میں آنے اور زبانوں پر پھسلنے کی صلاحیت کن میں ہے اور کس کے ثقل سے زبان کی نزاکت اِبا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے صورت پرست حضرات اس حقیقت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں کہ خواہ کتنی ہی کوشش کی جائے مگر اردو داں حضرات ان کا صحیح تلفظ کبھی ادا نہ کریں گے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہماری زبان ان کا صحیح تلفظ ضبط تحریر میں لانے سے قاصر ہے، بلکہ یہ الفاظ اپنی اصلی صورت میں کچھ اس قدر ثقیل واقع ہوےہیں کہ ہمارے گلے کی ساخت انھیں مشکل سے گوارا کرتی ہے۔ جن لوگوں کو انگریزی میں شدہ بدہ ہے وہ تو اس کا صحیح تلفظ ادا کرنا سیکھ جاتے ہیں، باقی حضرات کو ایک گونہ تکلف ہوگا۔ وہ ان کے صحیح اعراب پر غور نہ کریں گے بلکہ اپنے انداز میں مارسلیز اور برسلز کہنے لگیں گے۔ اس لئے صورت پسند اشخاص کی یہ وشش رائگاں جاے گی کہ اسماے مقامات میں کوئی حرف ایسا نہ رہنے پاے کہ اردو میں نہ آجاے۔ بڑھتے بڑھتے یہ لے یہاں تک ترقی کر گئی ہے کہ ہندوستان کے حدود کے اندر بھی اپنے الفاظ اپنے انداز میں نہیں لکھے جاتے، بلکہ انگریزی سے مستعار لئے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں جہلم ایک مشہور دریا ہے، اس کے کنارے پر ایک خوبصورت شہر ہے، صاحب بہادر کی نوک قلم نے اس کو Ghelum لکھدیا؛ اب کیا تھا، ہمارے صورت پرست حضرات کو ایک موقع مل گیا، وہ بھی جہیلم لکھنے اور بولنے لگے۔ اسی طرح سھلی پٹم سے مسولی پٹم اور

منصوری سے مسوری بنگیا۔ یہی افتادہ سہاتو پر پڑی ہوگی کہ ہوتے ہوتے "سو بیٹھو" ہو کر رہ گیا - خدا کا شکر ہے کہ دھلی اس تصرف سے اب تک محفوظ ہے، اگر چند روز یہی حال رہا تو وہ وقت دور نہیں کہ یہ عروس البلاد بھی ڈیلھی ہو جاے گی - اور تو اور جب تک حیدرآباد میں قدم نہ رکھا تھا، اس وقت تک یہ نہ معلوم تھا کہ تلنگی بھی کوئی زبان ہے - Telugo کو دیکھا تھا، اسی کو جانتے تھے، یہ خبر نہ تھی کہ تلوگو تلنگی کی آفت رسیدہ صورت ہے —

آج کل بعض اصحاب کو خالص سنسکرت الفاظ کے احیا کا شوق دامنگیر ہے - مگرا ہم ان کی خدمت میں نہایت ہی ادب و احترام سے التماس کرتے ہیں کہ اردو اور سنسکرت میں فرق ہے، سنسکرت ماں ہے اردو اس کی بیٹی ہے، سنسکرت ایک ضعیف اور سن رسیدہ خاتون ہے، اردو ایک نو خیز نو نہال ہے، مگر اس کے باوجود بھی ماں ماں ہے، بیٹی بیٹی ہے، آج کل بیٹی کا وجود ماں کے وجود پر مبنی نہیں ہے، یہ بیٹی کے ارتقا اور اس کے نشو و نما کا دور ہے، ماں کی ترقی کا زمانہ گذر چکا ہے، اس زمانے میں بیٹی کو اختیار ہے کہ جس طرف چاہے قدم اٹھاے اور جو رستہ چاہے اپنے لئے اختیار کرے - سنسکرت میں ان الفاظ کا تلفظ یہی ہو گا جو ہمارے بعض اہل وطن لکھتے اور استعمال کرتے ہیں، مگر اردو میں جن الفاظ نے ڈھل ڈھلا کر خاص صورت اختیار کرلی ہے وہ یونہی رہنی چاہییے، اس میں کسی قسم کا تصرف نہ ہونا چاہیے - ایسے بیشمار لفظ ہیں جو سنسکرت سے آئے ہیں، مگر اردو میں اس طرح نہیں بولےجاتے جس طرح خالص سنسکرت میں بولےجاتے تھے، ایسے الفاظ کو آج کل خالص اردو الفاظ سمجھنا چاہیے، سنسکرت نہ سمجھنا چاہئے - فہرست ملاحظ ہو :

(۱) ہندی الفاظ : گور (گرھ) کھڑا (گھٹ) اُجلا (اُجل) آدھا (آردھ) اندھیرا (انھکار) آسرا (آشرے) آنکھ (اکھی) آگے (اگر) انگلی (اگرہ) پانی

(پانڑی) برھمن (براھمنڑ) اور تمام اعداد جو اردو میں رائج ھیں۔

اسی طرح عربی کے اکثر الفاظ ھیں کہ اردو میں غلط طور پر استعمال کئے جاتے ھیں ' عربی داں حضرات اُن کو دیکھہ کر ناک بھوں چڑھاتے ھیں اور ھم پر علم کی کمی کا الزام لگاتے ھیں۔ ھم ان کی خدمت میں بھی وھی التماس کرتے ھیں' جو برادران وطن کی خدمت میں کر چکے ھیں کہ جس صورت میں وہ مستعمل ھیں اسی میں رھنے دیں ' ان میں تصرف نہ فرمائیں' اس لئے کہ وہ اردو الفاظ ھیں عربی نہیں ھیں۔ مثالیں ملاحظہ ھوں :

(۲) عربی الفاظ : غش (غشی) مسلمان (مسلم) محافہ (محفہ) زیاتی (زیادت) سلامتی (سلامت) ھدیہ (ھدیّہ) مغیلان (ام غیلان) مدارا (مدارات) وغیرہ۔

(۳) عربی الفاظ جو فارسی میں غلط طور پر مروج ھیں :

صم و بکم (اصم و ابکم) ' حور (حوراء) ' ابدال (بدیل) ' فضولی (فضول) ' حضوری (حضور) ' قران (قرآن) ' مشاطہ (مشّاطہ) ' مواسا (مواسات) ' مفاجا (مفاجات) وغیرہ۔

(۴) غیر زبانوں کے الفاظ جو انگریزی میں غلط طور پر برتے جاتے ھیں :

کیلف	Caliph	خلیفہ
ایڈمرل	Admiral	امیرالبحر
مگ‌زین	Magazine	مخزن
کاٹن	Cotton	قطن
جے کال	Jackal	شغال
شوگر	Sugar	شکر
آٹومن	Ottoman	عثمان
کرمزن	Crimson	قرمزی
سیپاے	Sepoy	سپاھی
ڈرے گو مین	Dragoman	ترجمان
ٹے رف	Tarif	تعریف
پے ۔ رے ۔ ڈائز	Paradise	فردوس(پردیس)
کے ۔ رے ۔ ون	Caravan	کاروان
ڈیس ۔ پاٹ	Despot	داس پتی
مناریٹ	Minaret	منارہ

سائس	Syce	سائیس	سے - ڈان	Maidan	میدان
چٹ	Chit	چٹھی	چیرول	Cheerool	چڑیل

(۵) انگریزی الفاظ جو اردو میں غلط بولے جاتے ھیں :

لاٹ ' جرنیل ' کرنیل ' کپتان ' لفٹین ' سارجن ' پلٹن ' رفل ' کانجی‌ھوز ' کارتوس ' توس ' اردلی ' تپٹی ' کارڈ ' میم ' اجینٹ ' جنوری ' فروری ' مارچ ' اپریل ' مئی ' جولائی ' اگست ' ستمبر ' اکتوبر ' دسمبر ' فراش‌بین ' رس‌بھری ' پلٹس ' پنسل ' پنشن ' اس‌ٹیشن ' انٹرینس ' مڈل ' کمیٹی ' پتلون ' برجس ' واس‌کٹ ' کرکٹ ' تولیہ ' بسکٹ ' کونین ' کوکین ' دریس ' ساٹن ' بوتل ' دراز ' بگل یا بکل ' لال‌ٹین ' پوٹاس ' ٹھیٹر ' سنتری ' پکٹ ' مسکوٹ ' سکٹر ' کہاں افسر —

(۶) غیر ملکی مقامات ' جن میں ہم تصرف کرتے ھیں : روس ' روم ' امریکہ ' افریقہ ' لندن ' قرطبہ ' اشبیلیہ ' قبرس ' غرناطہ ' قسطنطنیہ ' ادرنہ ' انگورہ ' درۂ دانیال —

(۷) غیر ملکی اشخاص کے نام ' جن میں تصرف کیا گیا ھے: ارسطو ' افلاطون ' فلاطون ' سکندر ' اسکندر ' بطلیموس ' قیصر ' بقراط ' سقراط ' جالینوس ' طامس ' فرادریق ' طالیس ' فیلقوس ' پلاطس ' مرقس ' مریم ' متی ' وغیرہ —

الفاظ سازی اور ازالۂ ثقل کے لئے " وضع اصطلاحات " بہترین تصنیف ھے ' جو اُستاذی حضرت مولانا سلیم مرحوم کی مساعی جمیلہ کے ذریعے عالم وجود میں آئی ھے ' اس کی تقلید کیجئے ' ذوق سلیم خود بخود پیدا ھوجائیگا —

(ج) ھمارے نزدیک اُس شخص کا مذاق قابل پرستش تھا ' جس نے انگلینڈ کے لئے ' انگلستان ' تراشا تھا - یہ لفظ اس قابل تھا کہ اس کی تقلید کی جاتی اورجن‌ملکوں کے اخیر میں ' لینڈ ' ھے اُن سب کا ترجمہ " ستان " سے کیا جاتا ' مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ھے کہ اس کی تقلید نہ کی گئی اور اس کے

وزن پر اور اور الفاظ نہ بنائے گئے ' خیر اب بھی کچھہ نہیں گیا ' اگر ارباب ذوق چاہیں تو یورپ کے اکثر ثقیل الفاظ کو لطیف بنا کر اپنی زبان اور ادب پر احسان کرسکتے ہیں - مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اسکاٹ لینڈ کے باشندے ' اسکاچ ' کہلاتے ہیں ' اس سے ' اسکا چستان ' بنالیں ' اسی طرح ' پولینڈ ' کا نام ' پولستان ' اور ہالینڈ کا ' ہالستان ' رکھہ لیں - سوئٹزرلینڈ بذات خود جس قدر خوبصورت اور خوش وضع ملک ہے ' نام اسی قدر ثقیل اور بدنما ہے ' اگر اس سے " سوئستان " بنالیا جاے تو کیا مضائقہ ہے ' اس لئے کہ وہاں کے باشندوں اور اُس ملک کی ساختہ چیزوں کو سوئس کہتے ہیں —

اسماے نکرہ

اسماے نکرہ کے متعلق کچھہ زیادہ کد و کاش کی ضرورت نہیں ' لغت کی کتابیں اور الفاظ کی فرہنگیں موجود ہیں ' اکثر الفاظ کا ترجمہ ہوچکا ہے ' جو باقی ہیں ان کے لئے نئے نئے لفظ تراشے جارہے ہیں ' الفاظ تراشی اور اصطلاح سازی کے اصول منضبط ہوچکے ہیں - ان کی مدد سے ما و شما سب لوگ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق الفاظ تراش سکتے ہیں - رستے کے نشیب و فراز دور ہوچکے ہیں ' اب صرف ہمت مردانہ کی ضرورت ہے کہ اس ہموار اور سیدھے رستے میں گام زن ہو اور منزل مقصود تک پہنچ جاے - آج کل مترجم حضرات کا فرض صرف اس قدر ہے کہ کسی مستند لغت کی اوراق گردانی کی تکلیف گوارا فرمائیں اور لفظ کے مقابلے میں لفظ رکھہ دیں ' اس سے زیادہ سعی و کوشش کی ضرورت نہیں - مگر اتنی بات ضرور ہے کہ جوہر قابلیت موجود ہو اور جو صاحب تالیف و ترجمہ پر اپنی ہمت صرف فرمائیں وہ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں کے ماہر ہوں ' اور فرہنگ و لغات میں سے وہی لفظ انتخاب کریں جو سیاق کے

لحاظ سے موزوں اور سیاق کے اعتبار سے مناسب ہو- اگر اس جوہر میں کمی ہو تو لازم ہے
که یه حضرات اپنی زبان و قلم کو اُردو کی خدمت سے روک لیں اور کسی اور مفید
اور کار آمد شعبے کی طرف توجه مبذول کریں' جو ان کی شان کے شایان اور ان کے
مرتبے کے لائق ہو ' ورنه اُن بزرگوں کی مساعی جمیله کا ستیاناس ہوجائیگا
جنهوں نے سالها سال کی کد و کاوش اور مدت العمر کے غور و فکر کے بعد ایسے
پاکیزه اور لطیف الفاظ تراشے ہیں' جیسے شه پارے ' اور 'اخبار پارے ' عادله اور
مقننه' حزنیه اور طربیه وغیره' اس لئے که استفادے کا یه اصول اعظم ہے که مستفید اور
مستفاد دونوں قریب السطح ہوں' یعنی شاگرد کا دماغ اس حد تک نشو و نما
پاچکا ہو که وه استاد کے اسرار و نکات کی کُنه تک پہنچ سکے اور ان اسرار و
معارف کو اپنے اندر جذب کرلے ' جو استاد اس کے سامنے پیش کرتا ہے - اگر استاد
ہمائے گرم پرواز ہوگا اور شاگرد خرلنگ تو نتیجه جو کچھه نکلے گا وه ظاہر ہے-
یہی باعث ہے که اکثر نو مشق اور خام مذاق بزرگ زادے اُن الفاظ و اصطلاحات
کو ٹھیک طور پر استعمال بھی نہیں کرسکتے جو بزرگان ادب کی جانکاه کوششوں
کے طفیل ہم تک پہنچے ہیں - مثال کے طور پر یوں سمجھئے که انگریزی میں
ایک لفظ Line ہے' اردو میں اسے لائن بھی کہتے ہیں اور لین بھی بول جاتے ہیں-
ڈاکٹر فیلن کی ڈکشنری میں اس کے معنی حسب ذیل ہیں :

(۱) رسی ' ڈور ' دھاگه (۲) لکیر ' خط ' دھاری' ریکھا ' جدول ' کشش
(۳) [ریاضی] خط ' لکیر ' ریکھا (۴) حد ' مینڈ
(۵) جھری ' شکن ' خط و خال ' مکھه ریکھا

Though on his brow were graven lines austere (Byron)

اگرچه اس کے چہرے پر جھریاں پڑگئی تھیں

(۶) قطار ' صف ' پنکتی آلی باڑ' لنگ-

Unite thy forces and attack their lines

اپنی فوج فراہم کر کے ان کی صف پر حملہ کرو

(۷) (فن طباعت) سطر - (۸) رقعہ ' پرچہ (۹) (اصطلاح شاعری) مصرع ' سطر ' پد

(۱۰) ڈھنگ - طور - طریقہ - راستہ - پیشہ - (۱۱) نسل - سلسلہ - 'بنساولی' -
خاندان - گھرانا (۱۲) (جغرافیہ) خط ارضی ' مثل خط استوا وغیرہ —

(۱۳) جریب - (۱۴) (فوجی اصطلاح) پیدل - (۱۵) کھائی - خندق - مورچہ -

(۱۶) انچ کا بارھواں حصہ - سوت - (۱۷) (اصطلاح موسیقی) پردہ —

(۱۸) (ریلوے کی اصطلاح) لوہے کی پٹری - لیک' سڑک' (۱۹) نقشہ' خاکہ

(۲۰) (مثلثیات) سیدھ - درست - (۲۱) ڈاک - سلسلہ - ڈھنگ —

تم کیا کام کرتے ھو -	What line are you in
صف جنگ	Line of Battle
خط حسن' روپ ریکھا	Line of beauty
سطر	Line of writing
رات دن کی برابر لکیریں	Equinoctical lines
خط نصف النہار	Meridian line
جنگی جہاز	Ships of lines

*(نوٹ: خط کشیدہ الفاظ اردو میں مستعمل نہیں ھیں)

ایک معمولی سی ڈکشنری میں ایک لفظ کے اس قدر مترادفات موجود ھیں - اب اس امر کا انحصار مترجم کے علم و فضل پر ھے کہ ان میں سے وھی لفظ انتخاب کرے جو سیاق و سباق کے اعتبار سے بہترین ھو - دنیا میں ایسی کوئی قوت نہیں جو غلط انتخاب کے وقت مترجم کا قلم روک لے اور اس کو صراط مستقیم سے منحرف نہ ھونے دے - اگر کوئی شخص ' صف ' کی جگہ ' سطر ' منتخب کرلے تو اس کا کیا علاج - مثال کے طور پر یوں سمجھئیے کہ انگریزی

میں ایک فقرہ ہے کہ Milton stands in the front line of poets اگر کوئی صاحب کمال اور با مذاق بزرگ اس کا ترجمہ اس طرح فرمائیں کہ ملٹن شاعروں کی پہلی سطر میں کھڑا ہے' تو اُن کے ذوق و کمال کی نسبت کیا رائے قائم جائے گی ؟ حالانکہ اسی قسم کی لغزشیں ہیں' جن پر 'روح تنقید' کے ذو عمر اور نامور مصنف ناز کرتے ہیں اور اسی قبیل کی فروگزاشتیں ہیں' جن پر آپ فخر و مباہات کی بنیاد یں اُٹھاتے ہیں۔

(۲) اس کے بعد ایسے اسمائے نکرہ کا نمبر ہے' جن کا ترجمہ اب تک اردو میں نہیں ہوا ہے ۔ ایسے الفاظ کے متعلق انجمن ترقی اردو اور جامعۂ عثمانیہ کی سرگرم کوششوں سے توقع ہے کہ وہ اس کمی کو جلد از جلد پورا کر دے گی' لیکن جب تک یہ کمی پوری نہ ہو اس وقت تک ' وضع اصطلاحات ' بہترین رہبر اور کامل ترین رہنما ہے - اس کے اصول کی تقلید کریں اور ذوق سلیم کے موافق الفاظ تراش لیں - جب کسی لفظ کا صحیح مفہوم معلوم ہو جاتا ہے تو لفظ تراشی اور اصطلاح سازی کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے۔ مشکل صرف اس وقت تک ہوتا ہے' جس وقت تک دماغ اس کے صحیح مفہوم سے خالی ہوتا ہے اور چشم و گوش اس سے آشنا نہیں ہوتے - مثلاً دوران مطالعہ میں ایک لفظ (Telepathy) نظر پڑا' پہلے یہ لفظ نہ آنکھوں نے دیکھا تھا' نہ کانوں نے سنا تھا' اس کے مفہوم سے دماغ آشنا ہوتا تو کیوں کر اور معنی معلوم ہوتے تو کیسے ؛ بہر کیف ڈکشنری اُٹھائی' اوراق گردانی کی تکلیف گوارا کی' دماغ پر زور دیا' غور اور توجہ سے مطالعہ کیا' یہاں تک کہ دماغ اس کے صحیح مفہوم کی کنہ تک پہنچ گیا ؛ اسی وقت اس کے لئے مندرجۂ ذیل الفاظ تراش لئے :

(۱) قلبی پیغام رسانی (۲) قلبی خبر رسانی (۳) دماغی پیغام رسانی (۴) دماغی خبر رسانی (۵) ذہنی پیغام رسانی (۶) ذہنی خبر رسانی (۷) غیبی پیغام رسانی (۸) غیبی خبر رسانی —

اسی طرح پڑھتے پڑھتے ایک اور لفظ [* mind (Subjective)] نظر سے گذرا، یہ پرانا لفظ ہے، بچپن سے پڑھتے چلے آئے ہیں، لفظی معنی معلوم ہیں، مگر اصطلاح کے معنی سمجھنے سے دماغ قاصر ہے، ڈکشنری دیکھی، پیاس نہ بجھی، احباب و آشنا سے دریافت کیا، تسلی نہ ہوی۔ مجبوراً اس خاص صنف کی کتابیں شروع کیں، وہاں اس کی تعریف یہ دیکھی کہ (Subjective mind) حصول معلومات کے لئے Objective mind کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے ذرائع معلومات لاتعداد و لاتحصی ہیں۔ اب کیا تھا، ایک نکتہ ہاتھ آگیا Subjective mind کا ترجمہ 'نفس باطن' اور Objective mind کا 'نفس ظاہر' کردیا اور کام چلا لیا۔ بالکل یہی کیفیت لفظ Suggestion کی ہوئی، اس کے لئے لفظ تحریک بنالیا۔

جب گردش تقدیر سے حیدرآباد (دکن) جانا ہوا تو مولانا (سلیم) مرحوم سے ذکر آیا، آپ نے ویبسٹر اٹھائی، اشتقاق معلوم کیااور سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے Telepathy کے لئے 'دور پھٹک، دور پھٹکی، دوربیماری اور بالآخر دورتشخیصی، دور تعلقی فرمایا اور نفس باطن اور نفس ظاہر کی جگہ نفسی شعوری اور نفس زیرشعوری تجویز کئے، اس لئے کہ اس صورت میں انگریزی سے تعلق قائم رہتا ہے اور 'ظاہر و باطن' کی پیروی سے اس میں فرق آجاتا ہے۔ اور اسی اصول پر آپ نے 'وضع اصطلاحات' میں بہت زور دیا ہے۔ ہمارے نزدیک مولانا مرحوم کے 'سہقلادی' اصول کی تقلید اُس وقت ہونی چاہئے جب روزمرہ کے معمولی اور سیدھے سادے لفظوں سے کام نہ چلے، اور غیرمعروف اور نا مانوس لفظ اس وقت برتے جائیں، جب معروف اور مانوس الفاظ نہ ملیں۔ دیرینہ تعلقات اور شب و روز کی صحبتوں کے باوجود بھی 'نزدیکنا' اور 'بعیدنا' کاٹے کھاتے ہیں۔۔۔

---

* Suggestion کامعروضی اور Objective، کاموضوعی، Subjective کا اثر آفرینی ترجمہ کیا ہے۔ اڈیٹر

اس امر میں سر مو شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ مولانا مرحوم علم کے پتلے اور ادب کے مجسمے تھے - ان کا دماغ معلومات کا خزانہ تھا - الفاظ تراشی اور اصطلاح سازی میں آپ کو خاص ملکہ تھا - اور یہی ملکہ تھا کہ بڑھتے بڑھتے ' مانئے ' کی حد تک پہنچ گیا تھا جس کا نتیجہ ' قریبنا ' اور ' اطفانا ' جیسے ثقیل اور غیر ضروری الفاظ میں نظر آتا تھا ' لیکن اس علم و کمال اس قدر معلومات کے باجود بھی آپ انسان تھے - آپ کا دماغ محدود تھا ' آپ کا دل محدود تھا ' آپ کے قوا محدود تھے ' غرض آپ کے قبضۂ قدرت میں جو کچھ تھا ' وہ سب محدود تھا - اندریں حالات ایک شخص واحد سے یہ کیوں کر توقع ہو سکتی ہے کہ دنیا کے تمام علوم و فنون پر اس کا احاطہ ہو - جو کچھ ہو ' اس کی نظر میں ہو ' کوئی بات اس سے پوشیدہ اور کوئی شے اس سے چھپی نہ ہو - وہ ہر علم کا مطالعہ بطور خود کرے اور ہر فن کی اصطلاحوں کو سمجھے اور ان کے لیے الفاظ تراشے - یہ تو نا ممکن ہے اور سرا سر نا ممکن' نہ آج تک کسی سے ہوسکا ہے نہ کبھی ہو سکے گا - اس لئے بہترین طریقہ وہی ہے جو مولانا مرحوم نے ایجاد فرمایا ہے - یعنی ڈکشنری کھول کے دیکھ لیں اور سبقلاحی اصطلاحیں گھڑ لیں - لیکن ضرورت تو اس امر کی ہے کہ ہماری قوم میں ایک سلیم نہیں سیکڑوں سلیم ہوں ' بلکہ ہر شخص سلیم ہو کہ پہلے بطور خود غور و فکر کی داد دے ' پھر مولانا مرحوم کے اصول سے مدد لے —

(۳) اس کے بعد ان اسماے نکرہ پر غور کرنا ہے جو اردو میں آ چکے ہیں - مثلاً: بوٹ - کالر - ٹائی - اسٹیشن - اسکول - کالج - سگریٹ - سگار - سوڈا وغیرہ - ان کے متعلق کسی قسم کی کد و کاوش کی ضرورت نہیں - جس طرح یہ الفاظ اردومیں بولے جاتے ہیں' اسی طرح استعمال ہونے چاہئیں - اس حالت میں انہیں اردو کے الفاظ سمجھنا چاہیے غیر نہ سمجھنا چاہیے - مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ موٹر کے لئے عربی میں سیارہ اور ہوائی

جہاز کے لئے طیارہ وضع کئے گئے ہیں - لفظ خوب ہیں مگر اردو میں رائج نہیں ہیں - اس لئے موٹر کے استعمال میں مضائقہ نہیں - ہوائی جہاز ہمارے گھر کا لفظ ہے، اس کا تو کیا کہنا ! ان کو چھوڑنا اور سیارہ اور طیارہ استعمال کرنا اردو کو عربی کا جامہ پہنانا اور اپنی چیز چھوڑ کر اغیار کے آگے ہاتھ پھیلانا ہے - مگر اتنی بات ضرور ہے کہ اس قبیل کے الفاظ میں انگریزی تلفظ کی تقلید جائز نہیں، ان کو اسی صورت میں برتنا لازم ہے، جس صورت میں وہ اردو میں آئے ہیں —

مقام حیرت ہے کہ ایک طرف تو ہمارے انگریزی داں حضرات اس امر کے دلدادہ ہیں کہ انگریزی الفاظ کا صحیح تلفظ بے کم و کاست محفوظ رکھا جائے اور دوسری طرف صراط مستقیم سے اس قدر منحرف ہیں کہ 'رستوران' کو ریستورانٹ بناتے ہیں اور اس طرح اپنی لیاقت و قابلیت کی داد دیتے ہیں - اگر یہ بزرگوار ذرا بھی تحقیق و تدقیق سے کام لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ فرانسیسی لفظ ہے، جہاں 'ٹ' کا نام اور نقل کا نشان نہیں - اس لحاظ سے اس کا تلفظ 'رستورانت' ہونا چاہیے تھا، مگر حرف اخیر بھی ساقط الصوت ہے ؛ اس لئے یہ لفظ 'رستوران' رہ گیا - اسی طرح یہ لفظ عربی، مصری وغیرہ میں لکھا جاتا ہے اور اسی طرح اہل زبان حضرات کی زبان سے سنا گیا ہے —

اب سوال یہ ہے کہ انگریزی میں (ن) اور (ٹ) کیوں قائم ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ انگریزی میں نہ 'ت' ہے نہ نون غنہ، انگریز کریں تو کیا کریں اور بولیں تو کس طرح بولیں، مجبوراً انہیں 'رستوران' کہنا پڑا -

ہمارے گلے سے یہ دونوں آوازیں ادا ہو سکتی ہیں، اس واسطے ہمارے لئے کونسی مجبوری ہے، ہم آسانی سے 'رستوراں' کہہ سکتے ہیں - کیا وجہ ہے کہ ہم انگریزی مجبوریوں کی بھی تقلید کریں اور اس پر اپنی طرف سے بھونڈا اضافہ بھی فرمائیں - اسی طرح انگریزی میں ایک لفظ Seignior آتا ہے، یہ لاطینی

زبان کا لفظ ہے ' اس کا صحیح تلفظ سینیر ہے ' مگر اکثر اخباروں اور رسالوں میں سگنور دیکھا جاتا ہے' خدا جانے ہمارے فاضل مترجموں اور بے بدل مؤلفوں کو یہ تلفظ کہاں سے معلوم ہو گیا - خرافات یونانی میں (Atlas) کرہ بردار دیوتا کا نام ہے ' اسی مناسبت سے مجموعۂ خارطات کو بھی (Atlas) کہنے لگے ہیں - قدماے عرب اس کو اطلس لکھتے چلے آے ہیں ' مگر ہمارے علم و فضل نے اس کو بھی اٹلس بنا لیا ہے —

(۴) اسماے نکرہ کے متعلق یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ بعض اوقات اسماے معرفہ ' اسماے نکرہ کے طور پر برتے جاتے ہیں اور ان سے وہی معنی مراد لئے جاتے ہیں جو اسماے نکرہ کی ذات میں مضمر ہوتے ہیں - اس صورت میں اسماے معرفہ نہیں ہوتے بلکہ حقیقت میں اسماے صفات ہوتے ہیں ' مثلاً ملٹن انگلستان کا ہومر ہے ' یہاں ہومر سے اعلیٰ درجے کا رزم نگار شاعر مراد ہے - یا مولانا حالی مرحوم ہندوستان کے سعدی ہیں - اس میں سعدی کے معنی ہیں ' وہ تمام اوصاف و صفات جن میں مولانا موصوف سعدی سے مشابہ تھے —

اس کی دو صورتیں ہیں - صورت اول تو یہ ہے کہ مشبہ بہ اس قدر مشہور و معروف ہو کہ اردو داں حضرات اس سے واقف ہو چکے ہوں اور اپنے زمانۂ حیات میں جو کچھ اس نے کیا ہے' اس سے کم و بیش ہمارے کان آشنا ہوں - ایسے اسماے معرفہ کو لینے اور مشبہ بہ کے طور پر برتنے میں کچھ مضائقہ نہیں ' اگر کم و بیش شرح کردی جاے تو بہتر ہے ' ورنہ کچھ ضرورت نہیں ' جاننے والے جان لیں گے اور پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر اس کا وہی اثر مرتب ہو جاے گا جو مترجم اور مؤلف حضرات کرنا چاہتے ہیں - صورت ثانی یہ ہے کہ مشبہ بہ غیر معروف اور نامانوس ہے - نہ ہم اس کی ذات و صفات سے واقف ہیں' نہ ہمارے کان اس کے کار ناموں سے آشنا ہیں' نہ ہم نے اس کے متعلق

کچھ پڑھا ہے ، نہ کسی نے اس کے متعلق کچھ لکھا ہے - اس صورت میں شرح اور تفصیل لازم ہے ، اس کے بغیر ترجمہ ترجمہ نہ رہے گا ، بلکہ مہمل اور بے معنی الفاظ کا گورکھ دھندا بن جائے گا - مثلاً مولانا حالی ہندوستان کے کار دوشی تھے - یہاں کاردوشی مستلزم تشریح ہے - اس کے علاوہ ایک اور صورت ہے ، وہ یہ ہے کہ بعض اوقات مشبہ بہ بالکل اجنبی اور غیر مانوس ہوتا ہے ، اس صورت میں تصرف کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے - مثلاً To out Zola Zola کے یہ معنی ہو نگے ' زولائیت میں زولا کو مات کر دینا ، زولائیت میں زولا سے سبقت لے جانا ، وغیرہ - لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زولائیت اور زولا کے معنی کیا ہیں ، اس لئے ان کی شرح کرنی چاہئے اور ذیلی نوٹ میں یہ بیان کرنا چاہئے کہ Zola (زولا) ایک فرانسیسی ناول نگار ہے ، جو سنہ ۱۸۴۰ ع میں پیدا ہوا تھا ، اس کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ جب لکھنے بیٹھتا ہے تو جائز و نا جائز کا خیال نہیں رکھتا ، جو چاہتا ہے لکھہ جاتا ہے اور جوکچھہ دماغ میں آتا ہے ، حوالۂ قرطاس کردیتا ہے ، اس کو اس امر سے کچھ سروکار نہیں کہ پبلک کے دل ودماغ پر اس کا کیا اثر ہوگا اور پڑھنے والے اس سے کیا نتیجہ نکالیں گے - وہ واقعات زندگی کو لیتا ہے اور ان کی عریاں اور پوست کندہ تصویر پبلک کے سامنے پیش کر دیتا ہے - اس کے نزدیک معیار صداقت یہی ہے کہ جو واقعہ پیش آے ، بے کم وکاست بیان کردیا جاے اور گفتنی اور ناگفتنی باتوں میں کوئی امتیاز نہ کیا جاے - اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے ناول خلاف اخلاق اور حیاسوز مضامین کا مجموعہ ہو کر رہ گئے اور وہ مدعا فوت ہو گیا ، جس کے لئے یہ مفید اور کار آمد شے عالم وجود میں جلوہ گر ہوئی تھی -

اس قدر تشریح کرنے سے پڑھنے والوں کو معلوم ہوگا کہ زولا کے معنی ہیں "حیاسوز ناول نگار" اور زولائیت سے مراد ہے "خلاف اخلاق تصنیف و تالیف" - اب ان کی سمجھہ میں اس فقرے کے معنی بھی آجائیں گے کہ فلاں شخص نے زولائیت میں زولا کو مات کر دیا ہے ، یعنی فلاں شخص فحش نویسی میں بڑے سے بڑے فحش نویس سے بڑھ گیا ہے ، یا اس نے

کو کائیت میں کو کا پنڈت کو نیچا دکھا دیا ہے -

اسمائے مجموعہ Collective Nouns

خدا کا شکر ہے کہ آج تک ایسی کوئی لغزش نظر سے نہیں گذری، جو اس باب میں ہمارے مترجم حضرات سے ظہور میں آئی ہو ۔ بظاہر اس کا سبب یہ ہے کہ اس باب میں انگریزی اور اردو دونوں ہم آہنگ ہیں، دونوں میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے، یہاں انگریزی کی عامیانہ تقلید بھی نبھ جاتی ہے - مگر اسی کی ایک شق ہے جسے Noun of multitude کہتے ہیں ۔ اس میں البتہ ہمارے مترجموں سے لغزش ہو جاتی ہے - مثلاً انگریزی میں لفظ کمیٹی مفرد بھی ہے اور جمع بھی - جب مفرد ہے تو Collective اسم مجموعہ کہلاتا ہے اور جب جمع ہے تو - Noun of multitude نام پاتا ہے - مگر اردو میں یہ لفظ ہمیشہ مفرد بولا جاتا ہے، کبھی جمع کے طور پر نہیں برتا جاتا ۔ یہی باعث ہے کہ ہماری گرامر میں کوئی اصطلاح ایسی نہیں ہے جو Noun of multitude کا مفہوم ادا کر سکے اور یہی باعث ہے کہ ہم نے اس کا ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کی - جب لفظ کمیٹی مفرد ہوتا ہے تو اس طرح برتا جاتا ہے کہ The Committee is sitting یعنی کمیٹی اجلاس کر رہی ہے، یہ کمیٹی کا اجلاس ہو رہا ہے، وغیرہ —

اور جب جمع ہوتا ہے تو یوں کہتے ہیں: The Committee is divided in their opinion یعنی ارکان کمیٹی کی رائے میں اختلاف تھا، کمیٹی کے ممبر مختلف الرائے تھے — مگر یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ کمیٹی اپنی رائے میں مختلف تھے، یہ پولیس میرے پیچھے پڑ گئے ہیں، یا پارلیمنٹ اجلاس کر رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ — اس صورت میں ہم مجبور ہیں کہ ترجمے میں تصرف سے کام لیں اور لفظ "ارکان" اپنی طرف سے بڑھائیں —

اسماے مادہ Material Nouns

اس باب میں کسی مبسوط بحث کی ضرورت نہیں ' جو جو اصول اسماے نکرہ کے متعلق عرض کئے گئے ہیں ' وہی یہاں بھی قابل اطلاق ہیں - ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ الفاظ کو اُردو میں اس انداز سے برتا جاے کہ ان کا وجود ہماری زبان کی نزاکت پر بار نہ ہو اور اس کا ثقل اس حد تک دور کیا جاے کہ خالص اُردو الفاظ معلوم ہوں ' مثلاً انگریزی میں ایک لفظ Tin ہے ' اُردو میں اسے ٹین بولنے لگے ہیں - اس لئے اسے ٹین ہی لکھنا چاہئے ' ٹِن نہ لکھنا چاہئے - اسی طرح Canister (کین - اسٹر) کو اُردو میں کنستر بنا لیا ہے ' اس صورت میں اسے خالص اُردو زبان کا لفظ سمجھنا چاہئے —

اسماے مادہ کا استعمال زیادہ‌تر علوم طبیعی ' صنعت و حرفت اور تجارت میں ہوتا ہے - اس لئے ان علوم و فنون کے مترجم حضرات کا فرض ہے کہ اپنے گوشۂ عزلت سے باہر آنے کی تکلیف اٹھائیں ' صنعتی کارخانوں اور تجارتی کوٹھیوں میں جائیں اور یہ معلوم کریں کہ ہمارے ہندوستانی صناع اور مزدور خالص عامی الفاظ کو کس طرح استعمال کرتے ہیں اور بڑے بڑے شاندار لفظوں کو روزمرہ کی سیدھی سادی اور بے تکلف زبان میں کیوں کر برتتے ہیں ' ان حضرات کو چاہئے کہ اُن الفاظ کو لیں ' اُن میں اپنے مذاق کے موافق کم و بیش تصرف کریں اور اُردو میں بے تکلف بولنے لگیں - یہ اُردو زبان کی ساخت اور ترکیب کے لحاظ سے بہترین الفاظ ثابت ہونگے —

اس باب میں یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ اکثر چھوٹے چھوٹے اور خوبصورت الفاظ انھی صناعوں ' مزدوروں اور تاجروں کے دماغ کا اختراع ہیں - اِس باب میں ہماری زبان ماہران علوم کی شرمندۂ احسان نہیں ہے - مثلاً ' فلے نل ' کو فلالین اور ' لین ٹرن ' کو لال ٹین بنانا انھی کے دماغوں کا کام ہے ' جو غرور عام سے

عاری ہوں۔ انگریزی میں ایک کپڑے کا نام سیٹن ہے، عام لوگوں نے ساٹن اور اور دلی والوں نے درمہ بنا لیا۔ اسی طرح ہزاروں لفظ ہیں کہ بے علم اور ناخواندہ لوگوں نے زبان میں شامل کردیے ہیں اور اس انداز سے شامل کردئیے ہیں کہ کہیں حرف گیری اور نکتہ چینی کی گنجائش نہیں۔ اور اگر غور سے دیکھا جاے تو یہ کام ایسے ہی لوگوں کا ہے جن کے دل و دماغ قیود علمی سے آزاد ہوں، خواہ یہ آزادی جہالت اور نادانی کے باعث ہو، یا اس کا راز تبحر علمی میں مضمر ہو۔ یعنی یا تو اسان نوشت و خواند سے بالکل بے بہرہ ہو، یا اس کا علم و کمال اس حد تک ترقی کرگیا ہو، جہاں جہالت اور تعلیم دونوں ایک نقطے پر جمع ہوجاتی ہیں۔ جو لوگ ان دونوں حالتوں کے بین بین نظر آتے ہیں، وہ تعصب اور پاس داری کا شکار ہوتے ہیں، ان سے نہ آج تک کوئی جدت ظہور میں آئی ہے نہ آئندہ آنے کی توقع ہے —

اس مقام پر یہ عرض کرنا غالباً بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے زمانے کے لغت نویس اور فرہنگ نگار حضرات کا یہ فرض ہونا چاہئیے کہ صناعوں، تاجروں، پیشہ وروں اور مزدوروں تک رسائی حاصل کریں اور ان کے پیشوں اور صنعتوں کی جزئیات معلوم کریں۔ اگر یہ علم دوست حضرات یہ تکلیف گوارا فرمائیں گے تو ان کو معلوم ہوگا کہ کسی پیشے میں کوئی جز ایسا نہیں ہے جس کے لئے کوئی نہ کوئی نام موجود نہ ہو۔ مثلاً کسی بڑھئی کے پاس جائیے اور میز، کرسی یا کواڑ، کڑی کے اجزا دریافت فرمائیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سینکڑوں الفاظ ہیں جو وہ برتتا ہے اور جن سے روز مرہ کے کاروبار میں مدد لیتا ہے۔ اسی طرح درزی، لُہار اور سنار وغیرہ کی دربار داری کیجئے اور نوعمر اور نادار زبان کو سرمایہ دار بنائیے۔ اگر یہ جد و جہد آپ اپنے دوش ہمت پر لینگے اور اصلی و حقیقی معنی میں کد و کاوش کی داد دینگے تو کسی معترض کی یہ مجال نہ ہوگی کہ آپ کی زبان کو بے مایہ اور غیر علمی زبان کہہ سکے۔ امید ہے کہ انجمن ترقی اُردو کے

ذی علم اور فرض شناس ارکان اس بارعظیم کو اپنے دوش همت پر لینگے زبان اور معهان زبان کو ممنون منت فرمائینگے - همارے نزدیک اس علم پرور اور اُردونواز انجمن کا سب سے زیادہ اهم فرض یہ هے کہ وہ اُردو میں کوئی ایسی کتاب تصنیف فرمائے جیسی انگریزی میں H . W . Fowler کی Dictionary of Modern English Usage هے —

اس لئے کہ یہ کام اس قدر اهم اور مهتم بالشان هے کہ کسی شخص واحد کی مساعی جمیلہ سے اس کی انجام دهی ممکن نہیں - اس کے لئے لازم هے کہ پرستاران اردو میں سے بہترین دل و دماغ اس طرف توجہ فرمائیں اور هر لفظ اور هر محاورے کی تحقیق و تدقیق میں سعی و کوشش کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کریں اور اس طرح اپنے نوجوان اور نومشق انشاپر دازوں کی هدایت و رهنمائی کا سامان بهم پہنچائیں - اور اس تیرہ و تار رستے میں شمع هدایت روشن کریں' تاکہ علمی اور ادبی کام کرنے والے حضرات اندهیرے میں سر ٹکراتے نہ پھریں بلکہ اس شمع هدایت کی روشنی میں منزل مقصود تک پہنچ جائیں- اگر انجمن مذکور کی توجہ سے کوئی ایسی تصنیف عالم وجود میں آ گئی تو هماری زبان رهتی دنیا تک اس کا احسان نہ بھولیگی' بلکہ قیامت تک اس کی توصیف و ثناکے راگ گائیگی-

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ انگریزی میں ایک لفظ هے ' Any ' بچہ بچہ جانتا هے کہ اردو میں اس کا مرادف ' کوئی ' هے - مگر یہ دونوں لفظ ایک دوسرے پر بالکل منطبق نہیں هوتے - بلکہ ایک مقام ایسا بھی آجاتا هے جہاں ان کی حدیں الگ هو جاتی هیں' یعنی انگریزی میں لفظ ' Any ' واحد اور جمع دونوں میں برتا جا سکتا هے ' مگر اردو میں لفظ ' کوئی ' صرف واحد کے لئے مخصوص هے جمع میں نہیں آ سکتا - مثلاً انگریزی میں آسانی سے کہہ سکتے هیں کہ Have you got any books on history مگر اردو میں هم یہ نہیں کہہ سکتے کہ "کیا آپ کے پاس تاریخ کی ' کوئی' کتابیں هیں" - بلکہ یوں کہہ سکتے هیں کہ "کیا آپ کے

پاس تاریخ کی "کوئی" کتاب ہے "یا آپ کے پاس تاریخ کی کچھ کتابیں ہیں ؟"
اگر ہمارے نوجوان اردو نواز حضرات کو یہ نکتہ معلوم ہوتا تو ان کے قلم سے یہ فقرہ نہ نکلتا کہ " اس انتخاب میں قدیم طرز کے اشعار میں نے درج نہیں کئے ہیں اگر کوئی ملیں تو مجھے معاف کیجئے " - یہاں ہونا چاہئے " اگر کوئی ملے تو مجھے معاف کیجئے " -

اسی طرح حقدار اور مستحق میں ایک خاص فرق ہے ' جو نظر انداز نہ ہونا چاہئے ' ہم اپنے والدین کے ترکے کے حقدار اور بزرگان قوم کی ہمدردی کے مستحق ہیں -

——(۲) ناخواندہ اور عوام الناس کی عملی خدمت کے نمونے)——

اگر ہمارے اردو پرور ' حضرات اپنے کاشانۂ ' عزلت سے نکل کر باہر تشریف لائینگے اور کسی فوج کی بارکوں میں جانے کی تکلیف گوارا فرمائینگے تو ان کو معلوم ہوگا کہ معمولی اور ناخواندہ سپاہی Officer Commanding کو کمان افسر اور Adjutant کو اجیٹن کہتے ہیں ' اسی طرح Barrack کو ' بارک ' اور Sappers & Miners کو ' سفرمینا ' بولتے ہیں - جن بزرگوں کی آنکھیں عربی اور فارسی سے روشن ہیں ' ان کو معلوم ہوگا کہ عربی اور فارسی اخباروں میں ' مانورہ ' اور ' موزہ ' جیسے خوبصورت اور لطیف الفاظ لکھے جاتے ہیں - ہمارے نزدیک یہ الفاظ اسی قدر سبک اور خوشگوار ہیں جس قدر Manouvre اور Museum ثقیل اور ناگوار ہیں —

تذکیر و تانیث

اردو میں صرف دو جنسیں ہیں ' ایک ' مذکر ' دوسری ' مؤنث ' - ہمارے یہاں ایسی کوئی جنس نہیں جسے ' مخنث ' کہا جائے اور جس سے مردہ اور بے جان چیزوں کے اظہار میں مدد لی جائے - اس کے نہ ہونے سے اردو میں اس قدر دقتیں اور دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں کہ ان سے عہدہ برا ہونا قوت بشری سے

بالا تر ہے - اس باب میں اس قدر اختلاف ہیں کہ اتحاد و اتفاق کسی طرح ممکن نہیں - ایک لفظ ہے کہ دلی میں مذکر اور لکھنؤ میں مؤنث بولا جاتا ہے - دوسرا ہے کہ لکھنؤ میں مذکر اور دلی میں مؤنث استعمال ہوتا ہے - یہ دونوں زبان کے مرکز ہیں، دور افتادہ لوگ حیران ہیں کہ کس کی تقلید کریں اور کس کی نہ کریں - ہمارے نزدیک اس باب میں ان دونوں کا فرض ہے کہ وسیع النظری اور کشادہ دلی سے کام لیں اور ایک دوسرے کو حق بہ جانب سمجھیں -
اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جس کا مذاق مسلمہ طور پر قابل تقلید ہو اور جس کے سامنے تمام ادیب اور انشا پرداز حضرات سر تسلیم خم کر دیں اور اس کے اجتہاد سے منحرف نہ ہوں- ایسے بزرگوں میں سب سے اخیر مولانا ' حالی ' مرحوم و مغفور تھے ' چنانچہ آپ کا ارادہ بھی تھا کہ اس صنف پر قلم اٹھائیں اور اپنے خیالات حوالۂ قرطاس فرمائیں ' مگر افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی ' ورنہ خدا جانے اس باب میں کیا کیا نکات و معارف عالم وجود میں جلوہ گر ہوتے ' جن کو مرحوم اپنے ساتھ قبر میں لے گئے - اندریں حالات، مترجم اور مؤلف حضرات کا فرض ہے کہ وہ حتی الامکان دلی یا لکھنؤ میں سے کسی کی تقلید کریں اور اتنی احتیاط برتیں کہ جن الفاظ کی تذکیر و تانیث متفق علیہ ہے ' اُن میں انگریزی کی تقلید کرکے اپنی زبان میں غلطیوں کا اضافہ نہ فرمائیں - مثلاً انگریزی میں Ship مؤنث ہے ' اردو میں جہاز مذکر ہے - اس لئے ترجمے میں انگریزی کی تقلید نہ کرنی چاہئے بلکہ اردو کی پیروی روا رکھنی چاہئے - اس کے متعلق افعال و صفات جس قدر ہیں وہ سب مذکر ہوں ' کسی حالت میں بھی مؤنث نہ ہوں - بجنسہ کیفیت لفظ Moon کی ہے کہ انگریزی میں مؤنث اور اردو میں مذکر ہے - یہاں بھی اردو کی تقلید لازم ہے —

جانوروں میں تذکیر و تانیث اصلی ہوتی ہے اور نر کے مقابلے میں مادہ اور

مادہ کے مقابل نر موجود ہوتا ہے - مگر اردو میں کبھی بعض نر بولا جاتا ہے ' مادہ نہیں بولا جاتا اور کبھی مادہ بولا جاتا ہے نر حذف کردیا جاتا ہے - مثلاً چیل مؤنث ہے اور کوا مذکر ؛ چیلا اور کوی مستعمل نہیں ہیں - اسی طرح اردو میں لومڑی مؤنث ہے مگر انگریزی میں Fox مذکر ہے ' ایسے موقع پر اردو کی تقلید کرنی چاہئے خواہ مخواہ اور بے ضرورت لومڑ نہ تراشنا چاہئے —

بسا اوقات فصحاے انگلستان مردہ اور بے جان چیزوں سے اس طرح خطاب کرتے ہیں کہ گویا وہ زندہ اور صاحب حیات ہستیاں ہیں - اور اس حالت میں انہیں 'مخنث' نہیں رہنے دیتے - بلکہ حسب موقع مذکر یا مؤنث بنا لیتے ہیں - مثلاً اے موت ! اے خواب ! یہ انداز بیان بعض اوقات اُردو کے خلاف ہوتا ہے - اس حالت میں بھی اُردو کی تقلید فرض ہے ' مثلاً انگریزی میں موت مذکر ہے ' اس کے افعال و صفات سب مذکر آئیں گے ' مگر اُردو میں موت مؤنث ہے ' اس کے متعلقات بھی مؤنث ہوں گے - اسی طرح 'خواب' اور اس کے متعلقات مذکر اور 'نیند' اور اس کے متعلقات مؤنث ہوں گے —

Number (واحد و جمع)

اُردو میں دو قسم کی جمعیں مستعمل ہیں (۱) فاعلی اور (۲) غیر فاعلی یا مغیری —

(۱) جمع فاعلی وہ ہے جس کے بعد حروف مغیرہ میں سے کوئی حرف نہیں ہوتا —

(۲) جمع غیر فاعلی یا جمع مغیری وہ ہے ' جس کے اخیر میں حروف مغیرہ میں سے کوئی حرف ہوتا ہے —

(نوٹ حروف مغیرہ ہیں : میں ' سے ' تک ' (تلک) پر ' پہ ' کا ' کے کی ' کو ' وغیرہ)

——(جمع فاعلی بنانے کے طریقے)——

جمع فاعلی بنانے سے پہلے (۱) یہ دیکھنا لازم ہے کہ وہ لفظ مذکر ہے یا مونث جس کی جمع بنانی مقصود ہے —

(۲) اگر وہ لفظ مذکر ہے تو یہ دیکھنا فرض ہے کہ اس کے اخیر میں الف ہے کہ نہیں۔

(۱) اگر الف ہے تو ساقط ہوجائیے گا اور اس کی جگہ یاے مجہول (ے) کا اضافہ کردیا جاے گا۔ مثلاً لڑکا، لڑکے، بیٹا، بیٹے —

(۲) اگر اخیر میں الف نہیں ہے بلکہ کوئی اور حرف ہے تو وہ لفظ اپنی اصلی صورت پر قائم رہے گا، اس میں کوئی تصرف نہ کیا جاے گا۔ مثلاً : گھر، مکان، پتھر، درخت، آلو، صندوق وغیرہ وغیرہ۔

نوٹ : اس قبیل کے الفاظ واحد اور جمع میں یکساں رہتے ہیں، اُن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی - یہی باعث ہے کہ ان میں کم و بیش ابہام ضرور ہوتا ہے۔ مگر یہ ابہام صرف الفاظ تک محدود رہتا ہے، فقرات میں باقی نہیں رہتا - اس میں کچھ شک نہیں کہ مکان، کے لفظ سے بادی النظر میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ واحد ہے یا جمع، مگر اسی کو فقرے میں استعمال کیجئے پھر دیکھیے کہ ابہام باقی رہتا ہے کہ نہیں - مثلاً ' مکان بنا ' اس فقرے میں ' مکان ' واحد ہے - اور ' مکان بنے ' اس میں جمع ' اس ابہام کا ازالہ کبھی افعال و صفات کے ذریعے ہوتا ہے اور کبھی اعداد و ضمائر کے ذریعے - مثلاً ایک مکان واحد ہے ' دو مکان جمع ؛ اچھا گھر واحد اور اچھے مکان جمع ' آپ کا مکان واحد اور آپ کے مکان جمع —

اس باب میں ہمارے نو مشق اور خام مذاق حضرات عربی اور فارسی کی کورانہ تقلید کیا کرتے ہیں اور اسموں کی جمع ' ان ' یا ین ' سے لاتے ہیں - مثلاً آپ فرماتے ہیں: انتظامیہ کمیٹی کے دس ممبران موجود تھے ' یا قدیم مورخین ' لکھتے ہیں - یہاں جمع کی قطعاً ضرورت نہیں - ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ انتظامیہ کمیٹی کے دس ممبر موجود تھے ' اور قدیم مورخ لکھتے ہیں —

ہمارے نزدیک اب وقت آ گیا ہے کہ اس قسم کی ترکیبوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے اور اردو کو اس انداز کے فضول اور غیر ضروری تصرف سے آزاد کیا جائے - ایک دفعہ ایک نو عمر صاحبزادے نے ایک فقرہ لکھا کہ اسٹیشن پر پندرہ ' صنادیق ' پڑے تھے - ان سے دریافت کیا گیا کہ ' صنادیق ' کی کیا ضرورت ہے کیا ' صندوق ' کافی نہیں ہے - فرمانے لگے کہ انگریزی میں Boxes جمع ہے ' اس کے مقابلے میں اردو میں بھی ' صنادیق ' چاہییے ' صندوق نہ چاہییے اس لئے کہ جمع کے مقابلے میں واحد لانا دیانت اور امانت کا منہ کالا کرنا ہے ؛

(ب) اگر وہ لفظ مؤنث ہے (جس کی جمع بنانی مقصود ہے) تو (۱) یہ دیکھنا لازم ہے کہ اس کے اخیر میں یائے معروف (ی) ہے کہ نہیں ' اگر (ی) ہے تو جمع ' اں ' سے بنیگی مثلاً بیٹی سے بیٹیاں ' لڑکی سے لڑکیاں —

اس صنف میں بھی قدرے حزم واحتیاط کی ضرورت ہے - بعض حضرات ایسے الفاظ کی جمع اکثر ' یں ' سے اڑا جاتے ہیں - مثلاً (۱) کرسییں لاؤ ' اور ' جو تیتیں ' پہنو —

اس مقام پر یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ بعض الفاظ ایسے ہیں کہ صورت میں مؤنث اور حقیقت میں مذکر ہیں - یعنی ان کے اخیر میں یائے معروف موجود ہے مگر وہ مؤنث نہیں ہیں مذکر ہیں - مثلاً موتی ' پانی ' گھی ' دھی ' ہاتھی ' جی ' منشی ' آدمی ' قاضی وغیرہ وغیرہ - ان الفاظ کی جمع (اں) نہ آنی چاہییے - بلکہ جمع کی صورت میں بھی ان کو ان کی اصلی حالت پر چھوڑ دینا چاہییے - مثلاً ہاتھی آ یا ' ہاتوی آے وغیرہ - موتی کی جگہہ ' موتیاں ' لکھنا سرا سر غلط ہے —

(۲) اگر اُس لفظ کے اخیر میں ' ی ' نہیں ہے (جس کی جمع بنانی مقصود ہے) تو ' یں ' کا اضافہ کیا جائے گا - مثلاً میز کی جمع میزیں اور عورت کی جمع ' عورتیں ' ہو گی —

جمع غیر فا علی

جمع کی دوسری صورت جمع غیر فا علی یا جمع مغیری ہے - اس کی علامت ہمیشہ (وں) ہوتی ہے - مثلاً گھر کی جمع 'گھروں' مکان کی 'مکانوں' دکان کی 'دکانوں' لڑکی کی 'لڑکیوں' اور میز کی میزوں آے گی - اتنی بات ضرور ہے کہ جب واحد مذکر کے اخیر میں الف ہو گا تو گر جاے گا - مثلاً 'لڑکا' سے 'لڑکوں' بیٹا' سے 'بیٹوں' وغیرہ —

اس قسم کے الفاظ کی جمع اکثر 'حضرات' 'ان' سے لاتے ہیں' مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ یہ مقدمہ تین 'ججان' کے اجلاس میں پیش ہو گا - ہمارے نزدیک وہ بزرگ بھی حق بہ جانب نہیں ہیں جو 'وں' کی جگہہ 'ین' سے جمع مغیرہ بنا جاتے ہیں - مثلاً مورخین نے لکھا ہے اور مدبرین کا قول ہے - اگر مورخین' اور مدبرین' کی جگہہ مورخوں' اور مدبروں' کہا جاے تو زیادہ واضح اور زیادہ فصیح ہو گا - ہمارے نزدیک یہ امر نہایت اہم اور ضروری ہے کہ جمع بنانے کے عربی اور فارسی انداز صرف عربی اور فارسی ترکیبوں تک محدود رکھے جائیں - خالص اردو ترکیبوں میں نہ برتے جائیں - مثلاً شاعران ہند اور شعراے فارس' نہایت عمدہ ترکیبیں ہیں - مگر ہندوستان کے شاعران' اور فارس کے شعراء' ثقیل اور نا گوار ہیں —

ان کے علاوہ جمع بنانے کے اور بھی اکثر قاعدے ہیں کہ عربی میں رائج ہیں مگر ہمارے موضوع سے خارج ہیں' اس لئے نظر انداز کئے جاتے ہیں - لیکن مترجم اور مؤلف حضرات سے اس قدر التجا کی جاتی ہے کہ یہ دیکھہ لیں کہ عربی کی جو جمع اردو میں استعمال کرنی مقصود ہے' وہ اردو میں رائج ہے کہ نہیں - اگر رائج ہے تو اس کے استعمال میں کچھہ مضائقہ نہیں' اگر رائج نہیں تو یہ دیکھنا فرض ہے کہ وہ اردو میں رائج ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے

که نهیں - اگر اس کی ذات میں یہ صلاحیت مضمر پائیں تو بے تکلف لے آئیں ورنہ پرهیز فرمائیں - مثلاً تاج کی جمع ' تیجان ' اور نار کی جمع ' نیران ' ہے - مگر یہ نہ اردو میں آئی هیں نہ آنے کی صلاحیت رکھتی هیں ' ان سے حذر لازم ہے —

انگریزی میں اکثر الفاظ هیں کہ جمع میں برتے جاتے هیں لیکن اردو میں ان کے مرادف الفاظ واحد کے طور پر مستعمل هیں' اس صورت میں بھی اردو کی پابندی لازم ہے ' انگریزی کی تقلید ضروری نہیں ہے - مثلاً Sicssors جمع ہے اور قینچی واحد ' اسی طرح Trousers جمع ہے اور پاجامہ واحد -

بعض اوقات انگریزی الفاظ واحد اور جمع مختلف معنوں میں استعمال هوتے هیں' یعنی کسی لفظ کے واحد میں جو معنی هوتے هیں وہ جمع میں باقی نہیں رهتے' بلکہ اس سے بالکل مختلف هو جاتے هیں - ایسی صورت میں مترجم حضرات کا فرض ہے کہ سیاق و سباق سے بصیرت حاصل کریں اور جمع کے وهی معنی لیں جو انگریزی میں لئے جاتے هیں - واحد پر قیاس کر کے سہو و خطا کا ارتکاب نہ فرمائیں - مثلاً .Good کے معنی هیں : اچھا اور عمدہ وغیرہ - مگر Goods میں کہیں عمدگی کا شائبہ تک نہیں ' اس کے معنی هیں : مال و اسباب - اسی طرح Return کے معنی هیں : ' واپسی ' اور Returns کے معنی : اعداد و شمار - اس لئے Returning Officer کا ترجمہ هونا چاهیے: افسر انتخاب - مگر همارے اخباری مترجم حضرات کرتے هیں : افسر واپسی -

مزید الفاظ کی فہرست

جمع			واحد		
اطلاع	"	Advices	نصیحت	"	Adivce
فوج	"	Forces	قوت	"	Force
خلل دماغ	"	Vapours	بخار	"	Vapour

مناجات شام ” Vespers   شام ” Vesper

اسلحہ ” Arms   بازو ” Arm

اس سے زیادہ حزم و احتیاط کی ضرورت وہاں پیش آتی ہے، جہاں واحد کے صرف ایک معنی ہوتے ہیں اور جمع کے ایک سے زیادہ۔ ان میں سے پہلے معنی واحد سے مشتق ہوتے ہیں، مگر دوسرے مشتق نہیں ہوتے ۔ فہرست ملاحظہ ہو :

معنی بعید (۲)	(۱) معنی قریب	جمع	معنی	واحد
(۲) اثاثہ	(۱) اثرات	Effects	اثر	Effect
(۲) مصائب یعنی حزم و احتیاط	(۱) تکالیف	Pains	تکلیف	Pain
(۲) محصول درآمد	(۱) رسم و رواج	Customs	رسم و رواج	Custom
(۲) نظم	(۱) اعداد	Numbers	عدد	Number
(۲) قابلیت	(۱) حصے	Parts	حصہ	Part
(۲) اوضاع و اطوار	(۱) طریقے	Manners	طریقہ	Manner
(۲) عمارات	(۱) قضایا قصے	Premises	قضیہ	Premise
(۲) چشمہ، عینک	(۱) نظارے	Spectacles	نظارہ	Spectacle

بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن کے معنی واحد میں بھی ایک سے زیادہ ہوتے ہیں اور جمع میں بھی - مثلاً :

(۱) حروف (۲) خطوط (۳) ادب Letters | (۱) حرف (۲) خط Letter .1

(۱) باغ (۲) سبب (۳) تلچھٹ Grounds | (۱) زمین (۲) سبب Ground .2

انگریزی میں بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن کے واحد میں دو معنی ہوتے ہیں مگر جمع میں صرف ایک رہ جاتے ہیں، مثلاً واحد میں Horse کے معنی ہیں (۱) گھوڑا (۲) سوار - جمع میں سوار گر جاتے ہیں، گھوڑے رہ جاتے ہیں - فہرست ملاحظہ ہو :

واحد		جمع	
1. Horse	(۱) گھوڑا (۲) رسالہ	Horses	(۱) گھوڑے
2. Foot	(۱) پاؤں (۲) پیدل فوج	Feet	(۱) پاؤں
3. Practice	(۱) مشق (۲) کام، پیشہ	Practices	(۱) مشقیں
4. People	(۱) قوم (۲) لوگ	Peoples	(۱) اقوام - قومیں
5. Powder	(۱) سفوف (۲) بارود	Powders	(۱) سفوف
6. Light	(۱) روشنی (۲) چراغ	Lights	(۱) چراغ
7. Wood	(۱) لکڑی (۲) جنگل	Woods	(۱) جنگل

نوٹ، لفظ Compass کے واحد میں دو معنی ہیں (۱) حلقہ (۲) قطب نما اور جمع میں صرف ایک یعنی پر کار۔ انگریزی میں بعض الفاظ صورتاً جمع ہوتے ہیں مگر معناً واحد - ایسے الفاظ میں معنی کی تقلید لازم ہوتی ہے، صورت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مثلاً Summons کا ترجمہ سمن یا طلبی نامہ ہونا چاہئے - یہی حال Riches اور Alms کا ہے - ان کا ترجمہ دولت اور خیرات ہونا چاہئے اسی قبیل کا ایک لفظ ہے 'Eaves' اس کا ترجمہ انگریزی انداز بیان کا متحمل ہو سکتا ہے، اس لئے اس کا ترجمہ 'اولتھاں' کرنا محاورے اور روز مرہ کے خلاف نہ ہوگا —

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اس کا تعلق محض لفظوں بلکہ چند اسموں سے ہے - اگر کوئی صاحب ذوق و فرصت بزرگ اس طرف توجہ فرمائیں تو دیگر اصناف کلام پر بھی اسی طرح نظر ڈال سکتے ہیں - اور اپنے الوالعزم نوجوانوں کی رہنمائی کے لئے شمع ہدایت روشن کر سکتے ہیں۔ ہم تو صرف نحو کے متعلق ایک اصول بیان کر کے اس کو ختم کرتے ہیں —

اتنی بات ہر تعلیم یافتہ شخص جانتا ہے کہ انگریزی انداز بیان کی دو صورتیں ہیں۔ ایک Direct اور دوسری Indirect مگر ہمارے اکثر تعلیم یافتہ

حضرات اس نکتے سے بے خبر ہیں کہ اردو میں صرف ایک انداز بیان ہے اور وہ Direct ہے Indirect کا کہیں نام نہیں - اس لئے مترجم اور مؤلف حضرات سے درخواست کی جاتی ہے کہ جب کہیں Indirect انداز بیان پائیں اس کا لفظ بہ لفظ ترجمہ نہ فرمائیں بلکہ پہلے اس میں تبدیلی کر لیں پھر قلم اُٹھائیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

Indirect	Direct	ترجمہ
Akber says that he is ill	Akber says " I am ill".	اکبر کہتا ہے کہ میں بیمار ہوں
Akber said that he was ill .	Akber said " I am ill "	اکبر نے کہا کہ میں بیمار ہوں
Hamid told me that I was ill.	Hamid said to me "I am ill"	حامد نے مجھ سے کہا کہ میں بیمار ہوں
Hamid said that he was ill .	Hamid said " I am ill "	حامد نے کہا کہ میں بیمار ہوں-
Hamid told him that he (zahid) was ill.	Hamid said to him (zahid) " you are ill"	حامد نے زاہد سے کہا کہ تم بیمار ہو -
Hamid told me that I was ill.	Hamid said to me "you are ill"	حامد نے مجھ سے کہا کہ تم بیمار ہو
Abid said that he did not know that man.	Abid said "I do not know this man"	عابد نے کہا کہ میں اِس آدمی کو نہیں جانتا
Abid said that there was no need to go just then	Abid said " There is no need to go just now"	عابد نے کہا کہ ابھی جانے کی ضرورت نہیں ہے
Abid said that this book was his.	Abid said "This book is mine".	عابد نے کہا کہ یہ کتاب میری ہے
Abid asked me why I did not go home	Abid asked me why do you not go home"	عابد نے مجھ سے پوچھا کہ تم گھر کیوں نہیں گئے
Abid asked him whether the mangoes were ripe	Abid said to him "are th e mongoes ripe"	عابد نے اُس سے پوچھا کہ آم پکے ہیں (کہ نہیں)
The master demanded of the boys what they meant by such conduct"	The master said to the boys "what do you mean by such conduct".	ماسٹر نے لڑکوں سے پوچھا کہ اِس رویے تمھارا مدعا کیا ہے –
He enquired of him where he was going	He said to him " where are you going"	اس نے اس سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو
He told him not to talk nonsense.	He said to him " Do not talk nonsense".	اس نے اس سے کہا کہ بیہودہ نہ بکو –

Indirect	Direct	ترجمہ
He requested me to lend him my pen	He said to me " Lend your pen please "	اس نے مجھہ سے کہا کہ مہربانی سے ذرا اپنا قلم دیدیجئے
He cried out what a disaster it was	He said " Good heavens! what a disaster "	اس نے کہا توبہ کیا مصیبت ھے -
Struck with awe he cried out what a disaster it was	"	"
He exclaimed that he wished he could see them	He said "O that I could see them"	اس نے کہا کہ کاش میں اُن کو دیکھہ سکتا
The captive prayed that Heaven might hear his cry	The captive said " May Heaven hear my cry"	قیدی نے کہا کہ کاش خدا میری فریاد سن لے
The captive prayed Heaven to hear his cry.	"	"

:A G:

حافظ عبدالرحمٰن خاں 'احسان'

صمصام الدولہ شہامت جنگ دہلوی

[تاریخ پیدائش : سنہ ۱۱۸۳ ہجری   تاریخ انتقال : سنہ ۱۲۶۷ ہجری]

از

(جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی - اے دہلوی)

بیس یا بائیس برس ہوے جب شیکسپیر کی کسی کتاب میں پڑھا تھا :

for affection

Master of passion; sways it to the mood,

Of what it likes or loathes.

یعنی "جذبات انسانی وجدان طبیعت کے تابع ہیں - طبیعت اپنے حسب دلخواہ ان جذبات کو نفرت یا رغبت جدھر چاہے پھیر دیتی ہے" - "اس مقولے کا عملی ثبوت حافظ عبدالرحمٰن خاں 'احسان' کے حالات لکھنے میں مجھے اچھی طرح مل گیا - مدتوں سے ان کے دیوان دیکھنے کا شوق تھا - ذوق سے پہلے یہی لال قلعہ میں استاد تھے اور استاد بھی کیسے کہ جگت استاد، بادشاہ ان کے شاگرد، ولی عہد ان کے شاگرد، سارے شہزادے اور سلاطین زادے ان کے شاگرد - شاہ نصیر سے ان کے مقابلے ہوے، ذوق سے ان کے مقابلے ہوے، لیکن یہ ایک سے بھی نہ دبے - مرتے دم تک اسی دم خم سے مقابلے پر ڈٹے رہے - خیر سنئے، مجھے ان کے دیوان کی تلاش تھی - دیوان کمیاب کیا نایاب ہے - لالہ سریرام صاحب دہلوی کے پاس ایک نسخہ تھا - اس تک پہنچ مشکل تھی - ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے معلوم ہوا کہ ایک

قلمی دیوان نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں ہے - کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچا - دیوان مانگا - یہ کسی کو کوئی قلمی کتاب نہیں دیتے' اور دینی بھی نہ چاہئے - کیونکہ ان کے ہاں کی ہزاروں کتابیں نصیب دشمناں ہوچکی ہیں - خدا معلوم مجھ پر کیا عنایت تھی کہ مانگتے ہی دیوان دے دیا - گھر پر لایا - نقل کر ڈالی - مگر بجائے بڑھنے کے جوش ٹھنڈا ہوکر رہ گیا - ہر قسم کے صنائع لفظی اور خاص کر رعایت لفظی سے مجھے کچھہ للھی بغض ہے - ان کا سارے کا سارا دیوان اسی سے بھرا پڑا ہے - نقل تو کرلی مگر دل چھوٹ گیا - یہ نقل یوں ہی ایک سال تک پڑی رہی - اب ایک دفعہ ہی خیال آیا کہ جب نقل کرنے کی محنت اٹھائی ہے تو لاؤ اس پر ایک مضمون ہی لکھہ ڈالو - محرم کی چھٹیاں ہیں - لکھنے بیٹھہ گیا ہوں - اگر خدا نے پورا کردیا تو شاید چھپ جائے - نہیں تو جہاں دیوان کی نقل کھتے میں پڑی ہے وہیں یہ ادھورا مضمون بھی پڑا رہے گا —

حالات لکھنے سے پہلے میں ان دیوانوں کا کچھہ ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جن کو میں نے خود دیکھا ہے یا جن کا 'احسان' کے حالات کی تلاش میں مجھے پتہ چلا ہے - ایک نسخہ تو وہ ہے جو نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں ہے اور دوسرا نسخہ 'احسان' کے نواسے آغا حیدر حسن پروفیسر اردو نظام کالج حیدرآباد کے پاس ہے - یہ دونوں نسخے تو میرے دیکھے ہوئے اور اچھی طرح دیکھے ہوئے ہیں - تیسرا نسخہ لالہ سریرام صاحب دہلوی کے پاس اور چوتھا لندن کے انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہے - تیسرے نسخے کا حال خمخانۂ جاوید میں لالہ صاحب نے لکھا ہے اور چوتھے نسخے کا ذکر جیمس فلر بلوم ہارٹ نے اپنی فہرست کتب لندن میں کیا ہے - میری رائے یہ ہے کہ شہزادہ معزالدین 'ثابت' نے جو دیوان مرتب کیا تھا یا تو وہی نواب سالار جنگ بہادر کے ہاں ہے یا اس کی نقل ہے - کیونکہ جو دیباچہ ثابت نے دیوان کے شروع میں لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب عالم نے صرف انہی غزلوں کو ایک جگہ جمع کیا تھا جو ان کی فرمائشی تھیں یا جو 'احسان' نے

مشاعروں میں پڑھی تھیں اور اس طرح اس دیوان کی شکل کلیات کی نہ تھی بلکہ یہ صرف غزلوں کا مجموعہ تھا - نواب سالار جنگ بہادر کے ہاں جو دیوان ہے، اس میں صرف غزلیں ہی غزلیں ہیں۔ دیوان کی ظاہری حالت بتا رہی ہے کہ کسی شاہی کتب خانے کا ہے - نہایت نفیس کشمیری کاغذ ہے، کل ۱۰۱ ورق ہیں اور ہر صفحے میں ۱۱ سطریں - صفحوں پر سنہری اور شنگرفی جدول ہے - خط نستعلیق ہے۔ پختہ ضرور ہے مگر کچھ زیادہ خوب صورت نہیں - البتہ غلطیاں بہت کم ہیں - قلم اوسط درجے کا ہے، نہ بہت موٹا نہ بہت باریک - اگر کسی سطر میں کوئی مصرع پورا نہیں آیا ہے تو بقیہ حصہ حاشیے پر لکھدیا ہے - کاٹ چھانٹ بالکل نہیں ہے - ورق کے نمبر قطعہ کے لئے "ق" اور تخلص سرخی سے دیے ہیں - بہر حال خط ایسا ہے کہ پڑھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ البتہ بعض جگہ لفظوں کو ملا کر لکھنے کی وجہ سے ذرا نکالنے میں دقت ہوتی ہے - یہ دیوان 'احسان' کی زندگی میں مرتب ہوا تھا - اس لئے ہر ردیف کے بعد خالی صفحے چھوڑ دیے گئے ہیں تاکہ اگر کوئی اور غزل مل جائے تو بڑھانے میں دقت نہ ہو —

بقیہ جو تین نسخے ہیں وہ دیوان نہیں کلیات ہیں - ان میں اردو غزلوں کے علاوہ فارسی غزلیں بھی ہیں، تاریخیں ہیں، قصیدے ہیں، مخمس ہیں، مسدس ہیں، مثنویاں ہیں، قطعے ہیں، ہجویں ہیں، غرض سب کچھ ہے۔ آغا حیدر حسن صاحب والے کلیات میں شروع کے پہلے کچھ صفحے غائب ہیں، باقی ساری کتاب مکمل ہے - یہ نسخہ بڑی تقطیع پر ہے اور اس کے ۲۳، ۲۳ سطروں کے ۱۰۲ ورق ہیں - اس کا خط بھی معمولی ہے اور کاغذ بھی معمولی، مگر صحت کا بہت خیال رکھا گیا ہے - ہر غزل وغیرہ کے شروع میں اس کی بحر سرخی سے دے دی ہے - اس مضمون کی ترتیب میں مجھے اس نسخے سے بہت مدد ملی —

آغا صاحب نے بڑی خوشی سے مجھے یہ نسخہ دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ جب تک چاہو اپنے پاس رکھو - اس کے علاوہ 'احسان' کے حالات زیادہ تر مجھے ان

ھی سے معلوم ھوے - ان کے بستے جاکز دیکھو بالکل عمر و عیار کی زنبیل یا مداری کا تھیلا معلوم ھوتے ھیں - جو چیز مانگو انھی بستوں میں سے نکل آتی ھے -
آغاصاحب نے اپنے نانا نواب احمد حسن خاں سے پوچھ پوچھ کر 'احسان' کے حالات لکھ لئے ھیں - وہ کاغذات بھی انھوں نے مجھے دیدئے اور کیوں نہ دیتے' مفت میں ان کے پر نانا کا حال ایک بھلا مانس لکھ رہا تھا - خیر میں ان کا شکریہ ادا کروں' یہ میرا ادا کریں - اور آپ سب پڑھنے والے ان کا اور میرا دونوں کا شکریہ ادا کریں - چلو عوض معاوض گلہ ندارد —

میرا جہاں تک خیال ھے' اسی کلیات کی ایک نقل لالہ سریرام صاحب کے پاس ھے اور دوسری لندن میں- کیوں کہ لالہ صاحب نے جو حال کلیات 'احسان' کے متعلق خمخانۂ جاوید میں اور جیمس فلوبلوم ھارٹ نے اپنی فہرست کتب میں دیا ھے' وہ حرف بحرف آغا صاحب والے نسخے سے ملتا ھے - لندن والے نسخے کی تاریخ تحریر یکم جمادی الثانی ۱۲۵۷ ھجری ھے - لالہ صاحب نے اپنے نسخے کی تاریخ درج نہیں کی اور آغا صاحب والے نسخے میں یہ حصہ جھینگر چاٹ گئے ھیں - لیکن حالات کے لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ھے کہ یہ دونوں نسخے بھی اسی تاریخ یا اس کے زمانۂ قریب میں مرتب ھوے ھیں - جیمس فلوبلوم ھارٹ نے لکھا ھے کہ لندن والے دیوان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں ایک قصیدہ کسی دوسرے شخص کا بھی ھے - لیکن تخلص چھوٹ گیا ھے' اس لئے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ 'قصیدہ کس کا ھے - آغاصاحب والے دیوان سے یہ چیستان حل ھوجاتی ھے —

اس قصیدے کا ابتدائی حصہ نقل کئے دیتا ھوں —

مسدس منقبت حضرت سرور کائنات محمد مصطفی صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم شاگرد مصنف دیوان ھذا محمد قادر بخش 'موزوں'—

السلام اے پیشواے اولین و آخریں — السلام اے بادشاہ اتقیاو مرسلیں
الصلوٰۃ والسلام اے ھادی راہ یقیں — تم کو کہتے ھیں یہی سب حامل عرش بریں

الصلوٰۃ والسلام یا شفیع المذنبین
الصلوٰۃ والسلام اے رحمۃً للعالمین

یہ مرزا قادر بخش 'موزوں' دھلی کے سلاطین زادے اور مرزا قادر بخش 'صابر' کے سالے تھے - 'احسان' کے شاگرد تھے اور اُستاد کی ان کے حال پر خاص نظر تھی - ان واقعات کو میں آئندہ درج کرونگا - یہاں صرف یہ بتا دینا چاھتا ھوں کہ بظاھر یہ معلوم ھوتا ھے کہ جس طرح مرزا معزالدین 'ثابت' نے اُستاد کا دیوان مرتب کیا ' اسی طرح مرزا قادر بخش 'موزوں' نے ان کا کلیات ترتیب دیا - ورنہ اس قصیدے کو اس کلیات میں آنے کی کوئی وجہ نہ تھی - چونکہ اُستاد کا حال دیباچے کی شکل میں مرزا معزالدین 'ثابت' لکھ چکے تھے اس لئے 'موزوں' نے یہ دیباچہ بھی اس کلیات میں شریک کردیا (واللہ اعلم بالصواب) اور آخر میں مولوی امام علی المتخلص بہ 'مقتول' کی تقریظ لگادی —

'ثابت' کا مرتب کیا ھوا جو دیوان ھے ' اس میں غزلیں اس حمد سے شروع ھوتی ھیں :

یہ دو جوہر ھیں یہاں کون ناخدا میرا خدا ھی دونوں جہاں میں ھے ناخدا میرا

لالہ سریرام صاحب والے نسخے کا حال معلوم نہیں - اغا صاحب والے نسخے کے پہلے چند صفحے غائب ھیں - البتہ لندن والے نسخے میں اس حمد سے پہلے تین شعر اور دیے ھیں —

یہی وظیفۂ مجنوں دشت (بدشت؟) عشق رھا فدا ھوں اس پہ کہ اسری بعبدہ لیلا
گرا جوشام کو دست فلک سے ساغر بھر (سے؟) نشے میں عشق کے ھے چور گنبد مینا
جبین عرش معلیٰ ھے سجدہ ساز (گاہ؟) نیاز اس آستان پہ سبحان ربی الاعلیٰ

تینوں نسخوں کے شروع میں شہزادہ معزالدین 'ثابت' کا لکھا ھوا دیباچہ ھے - جس میں پہلے لوگوں کی طرح صرف لفاظی ھی نہیں کی بلکہ اُستاد 'احسان' کا بہت کچھ حال بھی لکھا ھے - دیباچے کی زبان فارسی ھے ' مگر ایسی فارسی ھے کہ

اس کو ایرانی شاید فارسی کہنے میں تامل کریں - کیا اچھا ہوتا کہ صاحب عالم یہ دیباچہ اُردو میں لکھ دیتے - کم سے کم یہ تو فائدہ ہوتا کہ مجھے ترجمہ کرنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی - خیر - جب پڑی ہے تو اُٹھائیں گے - لیجئے دیباچہ ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں :

---

* (دیباچے کا ترجمہ) اس رحمن کا احسان ہے جسنے ہر ایک عبد مؤمن کو اپنی رحمت خاص سے ایمان کی دولت عطا فرمائی اور زبان کو جو صرف ایک گوشت کا ٹکڑا ہے گویائی کی قوت دیکر سخن سنج بنایا - مصرعہ: "حکیمے سخن بر زبان آفرین" — اپنی قدرت کاملہ سے دونوں عالم کی ہستی کی بنیاد رکھی اور شعرا کی زبان کی شیرینی کو شہد کے ساتھ ملایا - دونوں جہان کی ابتدا کا مطلع ، انتہا کا مقطع اور وسعت کا کا قصیدہ اس کی صنعت مختصر ہے —

انسان کی پانچوں انگلیوں کا مخمس ، آنکھ اور کان کی رباعی ، اعضا کے قطعات اور کل مخلوقات (یعنی جن وانس) کی مثنوی اسی سے منسوب ہے —

اے ساختۂ تو پیکر ما   احسان تو ہست بر سر ما
رحمے کہ زرہ بروں نباشم   از حکم تو گہ بروں نباشم
ثابت حمدت چہ سازد انشا   ہستی تو معز دین و دنیا
صد شکر کہ ذات مصطفیٰ را   آن سرور جملہ انبیا را
پیغمبر ما بداں نمودی   رحمے برعاصیاں نمودی

ایسا پیغمبر جس نے ہم عاصیوں کو شفاعت کا مژدہ سنایا اور اپنی عنایت کا دستر خوان ہر طرف بچھایا ، شفیع ، مطاع نبی ، کریم —

ایسا صادق کہ جناب فیض مآب حضرت صدیق کو یارغار بنایا - ایسا عادل کہ حضرت عمر کو ایک مدت تک اپنی تربیت سے نوازا - ایسا جامع (کمالات) کہ حضرت عثمان کی ذات بابرکات کو جامع قرآن کیا - ایسا امیر کہ امیرالمومنین حضرت علی کو ولی کا رتبہ بخشا —

ایسا محسن کہ اس کے طفیل سے حضرت حسنین کے ابر رحمت کا سایہ ہمارے سروں پر ہے ، ایسا قادر کہ اس کی عنایت سے شیخ الارض و السموات شیخ عبدالقادر جیلانی

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

احسان آن رحمن که هر یک عبد مومن خود را از رحمت خاص خود دولت ایمان بخشیده - وزبان را که پارهٔ گوشت است قوت نطق داده وسخن سنج گردانیده مصرعه : ' حکیمی سخن بر زبان آفرین ' - از قدرت کاملهٔ خود بنای هستی دوعالم ریختهٔ و شیرینی لسان شعرا را باشهدآمیخته - مطلع بدایت ومقطع نهایت وقصیدهٔ طول

(بقیہ بر صفحہ گذشتہ)

رنج و تکلیف میں ہمارے دستگیر ہوے - ایسا آقا کہ عبدالرحمن کے نام کو پسند فرمایا اور یہی نام رکھنے کا حکم دیا - اللہم صل علی محمد و آل محمد و اصحابہ و اتباعہ و بارک و سلم —

امابعد یہ عاصی عزلت گزین مرزا معزالدین ابن شاہ عالم بادشاہ غازی انارالله برہانہ کہ ' ثابت ' تخلص رکھتا ہے اور محبت کے رستے میں ثابت قدم ہے ' عرض کرتا ہے کہ مجھ ناکارہ کو بچپن سے فارسی اور اردو شعر کہنے کا شوق تھا - چاہتا تھا کہ کسی ایسے استاد سے اصلاح لوں جسکی استادی مسلم ہو - اسی تلاش میں والد ماجد مغفور کی مجلس خاص میں جایا کرتا تھا - مجلس خاص سے مراد یہ ہے کہ سلامی دیوان خاص میں حاضر ہو کر مجرا بجا لاتے اور چلے جاتے اور حضرت ظل سبحانی خاصہ تناول فرمانے کے بعد سونے کے لئے پھر دیوان خاص میں تشریف لاتے - چونکہ اعلیٰ حضرت ممدوح کو شعر کہنے کا بڑا شوق تھا اس لئے اس وقت ہر روز کوئی مطلع یا رباعی یا غزل فی البدیہ فرماتے چنانچہ حضرت صاحب عالم و عالمیاں برادر صاحب قبلہ یعنی مرزا محمد ایزد بخش بہادر عرف مرزا نولی صاحب دام اقبالہ کے استاد حافظ عبدالرحمن خاں 'احسان' ہمیشہ حاضر رہتے - اعلیٰ حضرت بھی ان کو استاد کہتے اور ان کے حال پر بہت عنایت رکھتے تھے - استاد مذکور فارسی اور اردو غزلیں فی البدیہ کہتے اور اپنی شیرین کلامی سے بادشاہ جم جاہ کو خوش کرتے تھے —

ایک دن بادشاہ سلامت نے میرے سامنے فرمایا کہ حافظ جیو میں نے ریختہ کا ایک مصرعہ کہا ہے دوسرا مصرعہ فی البدیہ لگایئے - خود میرے خیال میں نہیں آتا - کہا جو حکم - فرمایا - مصرعہ: "صبح بھی بوسہ تو دیتا مجھے اے ماہ نہیں" خاں مذکور نے دوسرا مصرعہ فوراً عرض کیا - مصرعہ " نامناسب ہے یہاں وقت سحر گاہ نہیں"

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

دو جہاں صنعت مختصر اوست - مخمس پنج انگشت انسان و رباعی چشم و گوش و قطعہاے اعضا و مثنوی کل مخلوقات منسوب بدوست -

اے ساختۂ تو پیکر ما　　احسان تو ہست بر سر ما

رحمے کہ زرہ بروں نباشم　　از حکم تو گہ بروں نباشم

(بقیۂ صفحہ گذشتہ)

بادشاہ سلامت نے ہنسکر فرمایا: اب غزل پوری کردو - استاد مذکور نے وہیں بیٹھہ کر غزل اتنی جلدی پوری کردی گویا اپنی کہی ہوئی غزل یاد تھی - مجلس میں ابو محمد خاں داروغۂ خاصہ اور نور علی خاں داروغۂ توشک خانہ وغیرہ موجود تھے، سب نے تعریف کی - لیکن میں نے استاد کے کہے ہوے مصرعہ پر اعتراض کیا اور کہا کہ یا تو وقت سحر ہونا چاہئیے یا سحر گاہ - وقت اور سحر گاہ دونوں کے یہاں ایک ہی معنی ہیں اس لئے "وقت سحر گاہ" بے معنی ہے - استاد نے ہنسکر فرمایا: شاید حضرت علم شعر سے ناواقف ہیں - اور یہ بات شعراے کامل کی صحبت کے بغیر حاصل ہونا مشکل ہے - یہاں تک کہ یہ گفتگو بادشاہ سلامت نے بھی سماعت فرمائی اور مجھہ عاصی سے کہا کہ حافظ جیو اپنے وقت کے استاد ہیں، انہوں نے یہ لفظ بغیر سند نہ کہا ہوگا - میں نے عرض کی کہ یہ فارسی لفظ ہے، جب تک کسی ایرانی مسلم الثبوت استاد نے نہ کہا ہو اس پر بھروسا نہیں ہوسکتا - حافظ جیو نے کسی قدر تامل کے بعد مرزا محمد علی 'صائب' تبریزی کا یہ شعر سند میں پڑھا:

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد　　خواب در وقت سحر گاہ گراں می گردد

بادشاہ سلامت نے فرمایا: ہم نہ کہتے تھے کہ انہوں نے غلط نہ کہا ہوگا - میں نے کہا قبلۂ عالم! یہ خود شاعر ہیں، خود ہی کہہ کر شعر پڑھ دیا ہوگا، صائب کا دیوان دیکھہ لوں تو یقین آئے - بادشاہ سلامت اس پر کسی قدر خفا ہوے اور فرمایا: جواب جاہلاں باشد خموشی - قصہ مختصر دوسرے دن استاد نے اساتذہ کے یہ شعر "وقت سحر گاہ" کی سند میں لاکر پڑھے:

حواتی گیلانی کا شعر: فغان بلبل و وقت سحر گاہ　　حواتی و دل نالاں و شب ہا

علی نقی کمرہ کا شعر: وقت سحر گاہ ز خیل دعا　　بر سپہ غصہ شبے خون زنم

اشرف قزوینی کا شعر: دلبرم وقت سحر گاہ بدرخانہ رسید　　ہمچو صبح شفق آلودہ رخش سرخ و سفید

ایک روز اعلیٰ حضرت نے فارسی کا ایک مصرعہ فرمایا تھا، استاد نے فی البدیہہ

(بقیۂ بر صفحہ آئندہ)

ذات حمدت چه سازد انشا هستی تو معز دین و دنیا
صد شکر که ذات مصطفیٰ را آن سرور جمله انبیا را
پیغمبرے ما بداں نمودی رحمے بر عاصیاں نمودی
پیغمبرے که ما عاصیاں را صلاے شفاعت دادہ و خوان عنایت بر هر کران نہادہ ۔
مصرعه : شفیع مطاع نبی کریم ۔

(بقیه صفحهٔ گذشته)

دوسرا مصرعه لگاکر اس کو مطلع کردیا (مصرعه) :

نکردم عشق کس هرگز چو من عاشق سخن گشتم

میں اس وقت موجود تھا ، چپکے سے ان کے کان میں کہا که عاشق کی اضافت کو کیوں حذف کردیا ۔ فرمایا : میں نے صحیح کہا ہے اور مرزا صائب کے یه تین شعر پڑھے :

۱ ۔ سر نمی پیچد بترک سر ز تیغ آبدار این قدر کس چوں قلم عاشق سخن باشد چرا
۲ ۔ چوں سبوتا دست نم از زندگی در پیکرت دستگیری کن مے آشامان عاشق بادہ را
۳ ۔ عالمے روشن بچشمش زود می گردد سیاہ هر که چوں پروانهٔ بیدرد عاشق صحبت است

میں نے بہت تعریف کی اور کہا که شاعری اسی کو سزاوار ہے جو اساتذہ کے کلام کا اس قدر پیرو ہو ۔ سن کر فرمایا " اگرچه میں نے خود کہا ہے اور 'صائب' جیسے زبردست شاعر کی سند موجود ہے لیکن میرے نزدیک بغیر اضافت کے اس طرح کے اشعار فصاحت کے رتبے سے گرجاتے ہیں " ۔ ایک روز بادشاہ سلامت نے یه مصرعه کہا " خدایا ندارم سوا تو کسے را " اور استاد سے پوچھا که " سوا تو " کا لفظ یہاں صحیح ہے یا نہیں ۔ دوسروں نے کہا " سوائے تو " چاهئے ۔ بادشاہ سلامت نے کہا : میں ان سے پوچھتا ہوں ۔ سن کر عرض کی که پیر و مرشد صحیح ہے اور شانی تکلو کا یه شعر پڑھا :

من جان ندهم بکس سوا تو تو دل ندهی بکس سوا من

اور مجھ سے کہا : یه بھی اگرچه صحیح ہے لیکن میرے خیال میں فصاحت سے دور ہے ۔ اور یه بھی ظاہر کیا که جہاں " ها " مختفی ہوتی ہے وہاں شعرا اکثر فک اضافت کرتے ہیں ، چنانچه محسن تاثیر نے کہا ہے (بیت) :

مسکن شوخے بود هر پارہ دل در سینه ام خانه ام چوں کہنداں ماوائے چندین خانه است

الغرض استاد مذکور حضور پر نور کے سامنے ایسے مضبوط اور مربوط شعر فی البدیه

(بقیه بر صفحهٔ آئندہ)

صادقے کہ جناب فیض مآب صدیق رایارِ غار ساختہ، عادلے کہ حضرت عمررا عمرے بہ تربیت خود بنواختہ - جامعے کہ ذات بابرکات عثمان راجامع قرآن کردہ، امیرے کہ امیرالمؤمنین حضرت علی را رتبۂ ولی بخشیدہ —

حسنے کہ از طفیلش ابرِ رحمت حسنین بر فرق ماسایہ فگن - قادرے کہ

(بقیہ حاشیہ گذشتہ)

کہتے تھے کہ سخن فہموں کا دل خوش ہو جاتا تھا - یہاں تک کہ ان کے خرمن صحبت سے خوشہ چینی کر کے میں نے ظاہر کیا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہوں - فرمایا : فارسی اشعار سے عہدہ برا ہونا بہت مشکل ہے - ریختہ میں شعر کہا کیجئے - کیونکہ ریختہ کی اچھی غزل فارسی سے بہتر ہے - میں نے کہا: صحیح ارشاد ہوا جب ہی تو ہدایت نے کہا ہے :

ہدایت کہا ریختہ جب سے ہم نے　　　رواج اٹھ گیا ہند سے فارسی کا

سن کر کہاکہ ریختہ گوکے لئے فارسی جاننا بہت ضروری ہے' بغیر فارسی جانے غلطی ہو جاتی ہے اور غلطی کا علم نہیں ہوتا۔ القصہ اس مسلم الثبوت استادکی صحبت کی برکت سے ریختہ گوئی میں میرا یہ رتبہ ہو گیاہےکہ اس فن شریف کے استاد بھی میرے شعر پسند کرتے ہیں اور میرے اکثر شاگرد جو میرے بھائی اور بھتیجے بھی ہیں' ایسے شعر کہنے لگے ہیں کہ ان کی تعریف ہوتی ہے - اس گفتگو سے میری یہ غرض ہے کہ اس نا چیز بندے کےاستاد حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان نے ریختہ کی بنیاد اس طرح ڈالی ہے کہ ان کے ریختہ کے سامنے کسی ریختہ گو کا کلام مجھے پسند نہیں آ تا اگر میں اس شیریں سخن کو خسرو اقلیم فصاحت و بلاغت کہوں تو درست ہے اور چونکہ سخن سنجی کا ملک ان کے زیر نگیں ہے اس لئے اگر ان کو ملک الشعرا کہوں تو بجا ہے - اول تو ان کی عادت ہی ایسی واقع ہوئی ہے' دوسرے یہ حضور والا کے یہاں حاضر رہتے اور برادر صاحب قبلہ ممدوح کی سرکار فیض آ ثار کے کاروبار میں لگے رہتے ہیں' اس لئے بغیر کسی کی فرمایش کے غزل نہیں کہتے - میں نے ہر چند دیوان ریختہ کی تدوین کا سلسلہ چھیڑا لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا - (لاچار) اکثر اپنی فرمایش اور استاد موصوف کی مشاعروں میں پڑھی

(حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

از عنایتش شیخ السموات والارض شیخ عبدالقادر جیلانی دستگیر رنج و محن - سرورے
که نام عبدالرحمن را پسند فرموده و بایں اسم نهادن امر نموده - اللهم صل علی
محمد و علی آل محمد و اصحابه و اتباعه و بارک و سلم —

اما بعد عاصی عزلت گزین مرزا معزالدین ابن شاه عالم بادشاه غازی انارالله
برهانه که تخلص 'ثابت' دارد و در راه اخلاص ثابت است' میگوید که این هیچمدان را
از صغر سنی شوق شعر فارسی و ریخته کمال بود' و طالب اهل کمال بودم - میخواستم
که اصلاح شعر از استادے بگیرم که استاد مسلم الثبوت باشد - چنانچه در همین تلاش
در مجلس خاص والد ماجد مغفور خود حاضر میشدم و محفل خاص عبارت از آنست
که مجرائیان از دیوان خاص شرف مجرا در یافته میر فتند و حضرت ظل سبحانی خاصه
تناول فرموده بدیوان خاص باز برائے استراحت تشریف ارزانی میفرمودند -
و چون اعلی حضرت ممدوح راشوق اشعار فرمودن بسیار بود ' آنوقت هر روز یا
مطلع یا غزل یارباعی فی البدیه میفرمودند - چنانچه حافظ عبدالرحمن خاں 'احسان'
استاد حضرت صاحب عالم و عالمیان برادر صاحب قبله مرزا محمد ایزد بخش بهادر
عرف مرزا نیلی صاحب دام اقباله مدام حاضر بودند و اعلی حضرت ایشاں را استاد می
فرمودند و بغایت عنایت بحال ایشاں مصروف می داشتند - استاد مسطور فی البدیه

(بقیه حاشیه بر صفحه گذشته)

ہوئی غزلوں کو اکٹھا کر کے یہ دیوان مرتب کیا ' تا کہ ہندوستان کے اس باغ سے جو غیرتِ
بہشت ہے - سخن سنجوں کی طبیعت کی بلبلیں گل مراد حاصل کریں —

بہر کے لئے جا سے خوش کلام — کہ مدام احسان ہے وہ نیکنام
بکیفیت جام پیر مغاں — با ملوت ملک عشق بتاں
معطر ہوا اس سے ہندوستاں — یہہ ہے بوستاں لائق دوستاں
جہاں دیکھو واں یاسمین سخن — خیاباں خیاباں چمن در چمن

اے خدا اس گلزار رشک ارم کو حوادث زمانہ کی باد سموم سے مصئون و محفوظ
رکھیو - بحرمت النبی وآله الامجاد —

غزلہاے فارسی و ریختہ سرانجام می نمود و بادشاہ جم جاہ را از شیریں زبانی خود مسرور میساخت - روزے بادشاہ روبروے می فرمودند کہ حافظ جیو مصرعۂ ریختہ می گویم، مصرع دیگر فی البدیہہ باید گفت کہ بخاطر ما بدولت نمی آید - عرض کرد کہ ہر چہ حکم، ارشاد فرمودند (مصرعہ) :

'صبح بھی بوسہ تو دیتا مجھے اے ماہ نہیں'

خان مذکور بے تامل مصرع ثانی بہم رسانید، و آں این است (مصرعہ) :

'نا مناسب ہے میاں وقت سحر گاہ نہیں'

بادشاہ تبسم نمودہ فرمودند ہمہ غزل باتمام رسانید - ہماں جا اُستاد مذکور غزل آنچناں زود تر سرانجام نمودند کہ گویا کہ غزل گفتۂ خود یاد بود - حاضران مجلس ابو محمد خاں داروغۂ خاصہ و نور علی خاں داروغۂ توشکخانہ خانہ وغیرہ تحسین کردند - مگر این ہیچمداں بر مصرعۂ بہم رسانیدہ مومی الیہ اعتراض نمود - گفتم یا "وقت سحر" باید گفت یا " سحر گاہ " باید داشت ، لفظ گاہ و وقت کہ ہر دو دریں جا یک معنی دارند بے معنی است " - مشارالیہ خندیدہ گفت: حضرت از علم شعر خبر ندارند و آں بدون صحبت شاعر کامل بہم رسیدن بسیار دشوار است - تا آنکہ این گفتگو بادشاہ مسموع فرمودند و این عاصی را ارشاد ساختند کہ حافظ جیو اُستاد وقت خود اند ، بدون سند این لفظ نگفتہ باشند - بندہ عرض کرد کہ این لفظ فارسی است تا آنکہ کسے اُستاد علم الثبوت ولایت زانگفتہ باشد اعتبار ندارد -

حافظ جیو بعد تامل این شعر مرزا محمد علی 'صائب' تبریزی در سند خواندند :

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد   خواب در وقت سحر گاہ گراں می گردد

بادشاہ تبسم فرمودہ فرمودند " ما نمی فرمودیم کہ از ایشاں خطا نخواہد شد - " عرض کردم کہ " قبلۂ عالم ایشاں شاعر انہ خود تصنیف نمودہ خواندہ باشند ، اگر در دیوان صائب بنم غلام را اعتبار آید - " بادشاہ قدرے برہم شدہ فرمودند - " مصرعہ : جواب جاہلاں باشد خموشی - " القصہ اُستاد مذکور روز دیگر این

سه شعراساتذه در سند "وقت سحر گاه" آورده خواندند. حیاتی گیلانی (شعر):

فغان بلبل و وقت سحر گاه   حیاتی و دل نالان و شبها

علی نقی کمره: وقت سحرگاه زخیل دعا   بر سپه غصه شبیخون زنم

اشرف‌قزوینی: دلبرم‌وقت‌سحرگاه‌بدرخانه‌رسیده   همچوصبح شفق آلود رخش‌سرخ وسفیده

روزے اعلی حضرت مغفوریک مصرعهٔ غزل فارسی طرح فرموده بودند.
استاد مسطور این مصرع فی‌البدیه در مطلع بهم رسانیده بود، مصرعه:

"نکردم عشق کس هر گز چو من عاشق سخن گشتم"

آن وقت حاضر بودم، آهسته بگوش گفتم: " اضافت لفظ عاشق چرا محذوف نمودند"
گفته " درست گفته ام " و این سه شعر مرزا صائب خواندند :

سرخی پیچد بترک سر ز تیغ آبدار   این قدرکس چون قلم عاشق سخن باشدچرا

چون سبو تاهست‌نم‌از زندگی درپیکرت   دستگیری کن می آشامان عاشق باده را

عالمے روشن‌بچشمش‌زود‌می‌گردد سیاه   هرکه چون‌پروانهٔ بیدردعاشق‌صحبت است

بسیار تحسین نمودم و گفتم: شاعری کسے راسزاوار است که این قدر متتبع
کلام اساتذه باشد شنیده گفتند اگرچه من هم گفته ام و سند همچو صائب شاعر
زبردست موجود است- لیکن نزدیک من بدون اضافت این چنین اشعار از رتبه
فصاحت می افتند. یکروز بادشاه این مصرعه فرمودند (مصرعه) " خدا یا ندارم
سوا تو کسے را " و از استاد پرسیدند که لفظ "سوا تو " هم درست است یا نے
دیگران گفتند که لفظ " سوائے تو" است. بادشاه فرمود ند "من ازایشان می پرسم.
شنیده عرض کردند که پیر و مرشد درست است و این شعر شافی تکو خواندند:
"من جان ندهم بکس سوا تو " " تو دل ندهی بکس سوا من و"ازمن گفتند، این
نیز اگرچه درست است امابخیال من بعید ازفصاحت است و ظاهر ساختند، جائیکه
"ها" مختفی‌باشد شعرا اکثر فک اضافت نموده اند، چنانچه محسن تاثیر بیت

مسکن‌شوخے بزدهرپار ه دل دوسینه‌ام   خانه ام چون‌کیفدان‌ماوائے چندین‌خانه‌است

الغرض استاد مذکور اشعار فی‌البدیه بدون خطا بحضور پرنور حضور والا مضبوط و مربوط سر انجام میساختند که دل سخن فهم محظوظ می شد - تا آنکه خوشه چین خرمن صحبت ایشان شده ظاهر نمودم که دل من می خواهد که شعر فارسی و ریختہ هر دو گفته باشم - گفتند که از عهدهٔ شعر فارسی بر آمدن خیلے دشوار است، اشعار ریختہ فرموده باشند که غزل ریختہ اگر خوب باشد بهتر از فارسی است - گفتم: بجا است - هدایت شاعر می گوید - (شعر) :

'هدایت' کہا ریختہ جب سے ہم نے رواج اٹھ گیا ہند سے فارسی کا

شنیده ظاهر نمودند که شاعر ریختہ گو را علم فارسی پر ضرور است' بدون علم فارسی خطا می سازد و از خطاے خود مطلع نمی شود - آخرالامر از برکت صحبت آن استاد مسلم‌الثبوت در ریختہ گوئی پایهٔ بهم رسانیدم که اساتذهٔ این فن شریف شعر من پسند می نمایند و اکثر شاگردان من که برادر و برادر زادها اند آن چنان ریختہ می گویند که قابل تحسین و آفرین اند - غرض این گفتگو آنکه حافظ عبدالرحمن خاں 'احسان' استاد این اضعف‌العباد بناے ریختہ آن چنان ریختہ اند که روبروے ریختهٔ ایشان ریختہ کسے ریختهٔ گو پسند خاطر من نمی آید - این شیرین سخن را اگر خسرو اقالیم فصاحت و بلاغت بگویم رواست - چون مملکت سخن سنجی زیر نگین دارد اگر ملک‌الشعراء بگویم بجاست - چون خوے ایشان چنان واقع شده که بدون تحریک محرکے غزل نمی گویند و نیز حاضر باشی در حضور والا و کاروبار سرکار فیض آثار برادر صاحب قبله ممدوح دارند - بران هر چند که سلسله جنبان تدوین دیوان ریختہ شدم صورت نه بست - اکثر غزل هاے فرمایشی طبع زاد استاد موصوف بهم رسانیده' تدوین آن نمودم که تا عندلیب طبع سخن سنجان از این بوستان هندوستان که غیرت ریاض رضوان است گل مراد چینند —

بشیرینی جامی خوش کلام که همنام 'احسان' هے وه نیک نام

بکیفیت جام پیر مغاں با مئیت ملک عشق بگل

معطر ہوا اس سے ہندوستاں یہ ہے بوستاں لائق دوستاں

جدھر دیکھو واں یاسمین سخن خیاباں خیاباں چمن در چمن

الہی این گلزار رشک ارم از صرصر حوادث روزگار مصئون و محفوظ باد

بحرمت النبی و آلہ الا مجاد —

حالات

حافظ عبدالرحمن خاں کے آبا و اجداد کسی زمانے میں بخارا کے حاکم تھے۔ جب مغلوں نے ترکستان کو تاراج کرنا شروع کیا' اس وقت یہ خاندان ہٹ کر ہرات آگیا - مگر وہاں بھی اس کو چین نصیب نہ ہوا - آخر دو بھائیوں نے اپنے گھر بار کو خیر باد کہہ ہندوستان کا رخ کیا - اس زمانے میں خاندان تغلق دہلی میں حکمراں تھا - ان دونوں بھائیوں کی دربار دہلی میں بڑی قدر و منزلت ہوئی - بڑے بھائی کو موسی خاں اور چھوٹے کو عیسی خاں خطاب ملا اور شاہی نوازشوں نے تھوڑے ہی دنوں میں وطن کی مصیبتوں کو ان کے دل سے بھلادیا - خدا معلوم کس نیک ساعت میں یہ خطاب ان بھائیوں کو ملےتھے کہ دہلی میں بیسوں خاندانوں میں بادشاہت بدل گئی - لیکن یہ خطاب اسی طرح باپ سے بیٹوں پر اُترتے چلے آئے اور غدر کے بعد جب دہلی کی سلطنت ہی ختم ہوگئی اس وقت ان کا بھی سلسلہ ٹوٹا—

یہ خاندان ثروت و اقتدار کے ساتھہ علم و فضل میں بھی ہمیشہ مفتخر و ممتاز رہا ہے - اگر ایک طرف یہ لوگ دربار میں امرا کے طبقے میں کھڑے ہوتے تھے تو دوسری طرف خلوت خاص میں علما کے ساتھہ بیٹھے نظر آتے تھے - سلطنت مغلیہ کے زمانے میں شاہزادوں اور شاہزادیوں کو کلام مجید پڑھانے کی خدمت اسی خاندان میں تھی - اور غدر تک قایم رہی' یہی وجہ ہے کہ اس خاندان میں اُس سرے سے اس سرے تک حافظ ہی حافظ نظر آتے ہیں' محمد شاہ اور احمد شاہ کے زمانے میں یہ خدمت 'احسان' کے والد حافظ غلام رسول خاں کے سپرد تھی - ان کا خطاب موسی خاں محب الدولہ بہادر تھا - ان کی شادی قمرالدین خاں وزیر محمد

شاہ بادشاہ کے فرزند بدرالدین خاں کی بیٹی سے ہوئی اور ان کے بطن سے سنہ ۱۱۸۳ ھ میں حافظ عبدالرحمن خاں 'احسان' پیدا ہوے - نادر گردی میں بدرالدین خاں اپنے قاضی کے حوض والے مکان میں شہید ہوے - یہ مکان اس کے بعد ان کی بیٹی کے قبضے میں آیا اور ان سے حافظ 'احسان' کو ترکے میں ملا - اس وقت سے اب تک اس مکان پر اسی خاندان کا قبضہ ہے —

بچپن ہی میں عبدالرحمن خاں 'احسان' نے کلام مجید حفظ کر لیا اور اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کی خدمت پر مقرر ہوے - موسیٰ خاں صمصام الدولہ خطاب ملا اور شہزادوں کی تعلیم ان کے سپرد ہوئی - شاہ عالم ثانی اکبر شاہ اور بہادر شاہ ثانی کے زمانے میں جتنے شاہزادے اور شاہزادیاں حافظ قرآن تھیں، ان سب کو 'احسان' ہی نے کلام مجید حفظ کرایا تھا —

تمول کے لحاظ سے یہ خاندان دہلی بھر میں سب سے زیادہ امیر سمجھا جاتا تھا - اگر ایک طرف خان پور، سنکیڑہ اور اوکھلے کی جاگیر کی آمدنی تھی تو دوسری طرف سکنی جائداد کا کرایہ - اگر ایک جانب باغات تھے تو دوسری جانب حویلیاں - غرض بڑے اچھے امیروں کی طرح گذرتی تھی - سکنی جائداد دو چار دوکانیں یا ۵ - ٦ مکانات نہیں تھے، اجمیری دروازے سے لگا کر رجنا بیگم کی حویلی تک، اور پیپل مہادیو سے میر جملہ کے مدرسے تک سارے کا سارا بازار ان کا تھا -

کھاری باؤلی کے بازار کا کوئی چوتھائی حصہ، سرکی والوں کی محلسرا، میر جملہ کا مدرسہ، حبش خاں کے پھاٹک کا شیش محل، باغ بدیع یارخاں، قاری کی کوئیاں کی باغیچی، قلعے کے نیچے کا انگریزی باغ اور میر کرورا کی حویلی انھی کے قبضے میں تھیں - اس آمدنی کے ساتھ اگر قلعے کی تنخواہ کو ملا لیا جاے تو اس خاندان کی ثروت کا اندازہ ہو سکتا ہے - ان کی محلسرا کا بر نجی پھاٹک ہندوستان کی صنعت کا ایک بہترین نمونہ تھا - افسوس ہے کہ وہ غدر میں تباہ ہو گیا - جائداد بھی غدر کے بعد ایک ایک کر کے ٹھکانے لگ گئی - انگوری باغ

کٹ کر میدان ہو گیا - باغ بدیع یار خاں بک کر پنجا بیوں کا کٹرہ بنا اور ٹوٹ کر دھلی کا ریلوے اسٹیشن ہو گیا۔ کچھہ تو جائداد غدر کے بعد ضبط ہو گئی اور کچھہ ان کے ایک پوتے نے جوے میں ہاردی - اس خاندان میں اگر کوئی سب سے زیادہ قابل قدر چیز تھی تو وہ ان کا کتب خانہ تھا - وہ بھی غدر میں تباہ ہو گیا - پندرہ ہزار قلمی کتابوں میں سے صرف دو تین باقی رہ گئیں اور وہ بھی اس طرح کہ کسی نے لا پرواہی سے ان کتابوں کو دو چھتی میں ڈال دیا تھا - غدر کے بعد جب امن امان ہو گیا اور لوگ پھر آ کر دھلی میں بس گئے تو کسی ضرورت سے دو چھتی دیکھی گئی اور یہ کتابیں وہاں سے نکلیں - قاعدہ تھا کہ بادشاہ کی سواری جب شہر میں سے گزرتی تو امرا اپنے دروازوں پر نذریں لے کر کھڑے ہو جاتے اور وہیں بادشاہ سلامت کو نذریں دکھاتے۔ سارے شہر میں صرف حافظ عبدالرحمن خاں ھی تھے جن کو یہ نذر معاف تھی - ہاں ان کو نذر کی بجاے کوئی قلمی کتاب پیش کرنی پڑتی تھی ــ

حافظ عبدالرحمن خاں 'احسان' کے دو بیٹے تھے - سیف الرحمن خاں اور عبدالحکیم خاں - سیف الرحمن خاں کو پہلے رشید الدولہ کا اور باپ کے انتقال کے بعد موسیٰ خاں کا خطاب ملا - اور عبدالحکیم خاں کو عیسیٰ خاں کا- یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر اردو نظام کالج ' سیف الرحمن خاں کے اور محمد عظمت اللہ خاں مرحوم ' عبدالحکیم خاں کے نواسے ہیں - سیف الرحمن خاں کی شادی ذوالفقار الدولہ نجف خاں وزیر شاہ عالم ثانی سے ہوئی - نجف خاں کے انتقال کے بعد انھوں نے اپنے سسرے کی جائداد یعنی حویلی میر کڑوڑا اور مدرسۂ میر جملہ پر قبضہ کر لیا اور یہ جائداد اس خاندان میں غدر کے زمانے تک رہی ــ

سیف الرحمن خاں کے تین لڑکے ہوے۔ نواب احمد حسن خاں' مولوی عنایت الرحمن خاں' (منجھلے آکا) اور مولوی احسان الرحمن خاں (چھوٹے آکا) نواب شمشیر الدولہ بہادر کی ایک لڑکی کی شادی نواب احمد حسن خاں سے اور دوسری لڑکی زینت محل

کی شادی بہادر شاہ ثانی سے ہوئی تھی - اس طرح نواب احمد حسن خاں اور بہادر شاہ ہمزلف تھے - حبش خاں کے پھاٹک میں جو شیش محل ہے' وہ بیوی ہی سے نواب احمد حسن خاں کو پہنچا تھا - مگر وہ انھوں نے جوے میں مرزا اسفندیار بیگ کے ہاتھ ہار دیا۔ غدر میں اس خاندان پر بڑی تباہی آئی۔ احمد حسن خان قلعے کے تعلقات کی وجہ سے باغیوں سے مل گئے - ہر سرو کی گڑھی میں جو خزانہ تھا اس پر قبضہ کرکے دھلی لاے اور نصیرالدولہ خطاب پایا - لیکن جب باغیوں کو شکست ہوئی تو یہ اور ان کے والد سیف الرحمن خاں الور چلے گئے' مگر وہاں سے اپنے نوسو ساتھیوں کے ساتھ پکڑے ہوے دھلی آے ۹۰۰ کو تو فورڈ صاحب نے گڑگاؤں ہی میں ختم کردیا' بقیہ کو دھلی میں پھانسیاں ہوئیں ' مگر معلوم نہیں کہ یہ دونوں باپ بیٹے کیوں کر بچ گئے - نواب موسی خاں (سیف الرحمن خاں) کے انتقال کے بعد نواب احمد حسن خاں نے تمام خاندانی جائداد جوے میں پھونک دی - آخر آخر میں ان کا ہاتھ بہت تنگ ہوگیا تھا' پھر بھی کسی نہ کسی طرح اپنی گزار گئے - ان کے سوتیلے دونوں بھائیوں نے نہ صرف اپنے حصے کی جائداد کو محفوظ کیا' بلکہ اپنی کمائی سے اس میں بہت کچھ اضافہ کر کے اپنی حیثیت ایسی بنا لی کہ دھلی میں اب بھی ان کے بیٹے اور پوتے رئیس مانے جاتے ہیں —

حافظ عبدالرحمن خاں 'احسان' شاہ عالم ثانی کے منجھلے بیٹے شاہزادہ مرزا فرخندہ بخت ایزد بخش عرف مرزا نیلی کی سرکار میں مختار کل تھے - اپنے دیوان میں انھوں نے صاحب عالم کی جا بجا تعریف کی ہے - چنانچہ لکھتے ہیں :

درۃ التاج شہاں فخر زماں ایزد بخش — فخر ہے فخر تری مدح سرائی مجھکو
جس گھڑی ہووے گہر ریز ترا ابر کرم — ہاتھ پھیلا کے کہے حاتم طائی ' مجھکو
ہے یہی دولت عظمی کہ سدا ہووے نصیب — در دولت کی ترے ناصیہ سائی مجھکو

ایک جگہ مرزا نیلی کے نام کی وجہ یوں بتاتے ہیں :

میرزا نیلی ہے مقصود سپہر نیلی   تجھکو سر سبز رکھے خالق علام مدام
وجہ اس نام کے رکھنے کا یہ ہے تاکہ شہا   نیل چشم بد اعدا رہے یہ نام مدام

ایک اور غزل میں بھی ان کی تعریف کی ہے، ذرا ردیف کو ملاحظہ فرمائیے بالکل نئی ہے اور آخری شعر کا قافیہ تو داد دینے کے قابل ہے :

کہا جو میں نے نہ اہل زمیں کو دے گردش   یہ سن کے مجھکو لگا کہنے آسماں تم کون
کہا یہ میں نے کہ ہوں اس جناب کا استاد   غلام جس کا یہ کہوے شہاں کو ہاں تم کون
طفیل صاحب عالم محمد ایزد بخش   نہ کہہ سکے مجھے ہرگز فرشتہ خاں تم کون

اس قطعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نیلی کے ہاں نوکر ہی نہیں تھے بلکہ صاحب عالم کے استاد بھی تھے -

مرزا نیلی عمر میں اکبر شاہ ثانی سے صرف تین مہینے چھوٹے تھے۔ 'احسان' کا ایک طرف تو صاحب عالم سے تعلق تھا اور دوسری طرف برکت علی خاں 'برکت' خیرآبادی سے دوستی - ہوا یہ کہ ۱۸۲۰ء میں جنرل 'اختر لونی' دھلی کے رزیڈنٹ ہوکر آئے۔ برکت علی خاں ان کے پیشکار ہوئے۔ ان دونوں کی کچھ ایسی بنی کہ رزیڈنسی میں میاں 'برکت' کا طوطی بولنے لگا۔ بھلا ایسا اچھا موقعہ کہاں ملتا تھا۔ احسان نے مرزا نیلی کو ولی عہد بنانے کے لئے اپنی پوری قوت صرف کردی، لیکن کچھ ایسا بل آکر پڑا کہ کامیابی نہ ہوئی اور ولیعہد بہادر کے دل میں فرق آگیا - پھر بھی جب اکبر شاہ دھلی کے تخت پر بیٹھے تو انھوں نے ظاھرداری برتنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی - اور جب ۱۲۴۹ ھجری میں مرزا نیلی کا انتقال ہوگیا تو یہ 'احسان' سے بالکل صاف ہوگئے -

مرزا نیلی کے مرنے کا 'احسان' کو بڑا قلق ہوا، ان کی وفات کی تاریخیں کہی ھیں، مگر افسوس ھے کہ ایک میں بھی درد نہیں ھے، لکھتے ھیں :

شاھزادہ محمد ایزد بخش   در جہاں بود ھمچو آب حیات

چوں سخاوت شعار بد گفتم "ہی اجر عظیم" سال وفات

جناب صاحب عالم محمد ایزد بخش   کہ نقش خاطر آفاق شد کمال وفات
تو فوت گشتی واحسان حیات داد ترا   " بیاب بخشش ایزد " بگفت سال وفات

۱۲۴۹ ھجری

احسان کا انتقال ۱۲۶۷ھ میں ہوا۔ گویاانھوں نے تین بادشاھوں یعنی شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی اور بہادرشاہ ثانی کا زمانہ دیکھا۔ ان تینوں بادشاھوں استاد رھے اور مرتے دم تک ان کی قدر و منزلت میں فرق نہیں آیا اور آخر وقت تک بادشاہ اور شہزادے ان کی تعظیم و توقیر کرتے رھے۔ قلعے میں جو واقعات ان پر گذرے ھیں ان کا پتہ کچھہ کچھہ ان کے اشعار سے ملتا ھے۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ان کی اچھی گزری۔ عید کی خوشی میں ایک قطعہ پیش کرتے ھیں:

درگاہ تری ھے عیدگاہ عالم   عالم یہ کہے ھے اے پناہ عالم
عالم میں ھےرسم عید جب تک تب تک   شاہ عالم ھی رھوے شاہ عالم

دلی والے شاہ عالم کی سلطنت کا حال ان چند الفاظ میں ظاھر کرتے ھیں: " بادشاھی شاہ عالم، از دلی تا پالم " - پالم دلی سے ۵، ۶ میل پر ایک موضع ھے۔ اس فاصلے اور شاہ عالم کے لفظ کو ملا کر دیکھئے کیا لطف دیتا ھے، واقعی یہ فقرہ کسی بڑے خوش مذاق شخص کے دماغ سے نکلا ھے ـــ

باز جسدم سے درعدل شہ عالم ھے   بچۂ قاز بھی کرتا ھے یہاں باز سے رمز

نادرشاہ تخت طاؤس لے گیا تھا۔ کچھہ دنوں تو یونہی کام چلا۔ آخر شاہ عالم ثانی نے دوسرا تخت بنوایا۔ لکڑی کا تھا اس پر سنہری پتر جڑے ھوے تھے۔ تخت طاؤس سے شکل ملانے کی کچھہ کوشش بھی کی گئی تھی۔ جواھرات کی جگہ مینا کاری سے کام نکالا تھا۔ بہر حال تخت تیار ھوا اور تخت طاؤس نام رکھا گیا۔ غدر تک یہ تخت قلعے میں تھا۔ احسان نے اس تخت کی تاریخ کہی ھے:

چه خوش ساخته گشت تخت عجیب بامر تو اے شاہ فرخ نہاد
چه تختے که گشته فلک گرد او برو چشم از چشم انجم کشاد
مزین چو طاؤس خلد برین مرصع چو تخت کے و کیقباد
بجز تخت جد تو شاہ جہاں جہاں ثانیِ این ندارد بیاد
تو باشی و این تاکه باشد اثر ز آب و ز آتش زخاک و ز باد
خبر داد 'احسان' ز تاریخ او سریر شہنشاہ با دین و داد

۱۲۱۳ ھجری

شاہ عالم بادشاہ سے جو ان کے تعلقات تھے وہ آپ دیباچے میں پڑھ چکے ھیں - بھلا ایسے قدر شناس بادشاہ کے مرنے کا کیا کچھ غم ان کو نہ ہوا ہوگا ' ان کی وفات پر کیا ھی درد بھرا قطعہ لکھتے ھیں :

آفتاب فلک سلطنت عز و علا شاہ عالم که وہ تھا مخزن احساں میرا
میں جو دربار معلی میں نہ ہوتا کہتے کیا سبب ھے که نہیں آج جو احساں میرا
اے فلک تو تو رھے اور نہ رھوے افسوس وہ سخن سنج' سخن فہم' سخنداں میرا
مثل شب' گر ھوں سیه پوش مجھے لائق ھے که جدا مجھه سے ھے وہ مہر درخشاں میرا

وفات کی کیا اچھی تاریخ لکھی ھے :

هزار و دو صد و بست و دو بود آہ که بر زد کوس رحلت شاہ عالم
چو در فردوس منزل کرد آن شاہ غمیں شد خلق و جانش گشت خرم
بکش آہ و بگو تاریخ احساں که شد فردوس منزل شاہ عالم

۱۲۲۱ ھجری

اُن کی شاہ عالم کے زمانے میں کسی نہ کسی طرح گزرے گئی - اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں کسی چغلخور نے چغلی کھائی' احسان قلعے سے نکالے گئے ' عرضی بھیجی ' منظور ہوئی اور پھر ان کا قلعے میں وھی زور ہوگیا —

ہوں شہ ہند کا استاد یہ ھے فخر مجھے شہرہ میرا تو شہا تا شہِ ایراں گیا

عرض غمار پذیرا ہوئی حق میں میرے کیا گیا میرا مگر اس کا ہی ایمان گیا
حکم والایہ ہوا قلعے میں 'احسان' نہو سن کےاس بات کو اک شہر کا اوسان گیا
اے شہنشاہ جہاں قدر شناس احساں! خلق کیا کہویگی، گوحکم کومیں مان گیا
شہروہ کیاھےکہجس شہرمیں 'احسان' نہو قلعہ‌وہ کیاھے کہ جس قلعے سے احسان گیا

اس کے بعد بہادر شاہ کا زمانہ آیا، انہوں نے تخت نشینی کی تاریخ کہی :

خسرو خسرواں بہادر شاہ گشت چوں بادشاہ ہندوستاں
سال تاریخ سلطنت گفتم خسر و عہد، والی دوراں

۱۲۵۳ ھجری

بادشاہ کو باری کا بخار آیا، اچھے ہوے تو انہوں نے تہنیت کا قطعہ پیش کیا :

وہ خورشید چرخ شہی تو ہے شاہا کہ تیرے سبب سے ہے گھر گھر اوجالا
بہت بار 'احساں' نے شاہا دعا کی کہ باری کی تپ کھوئے باری تعالا
تو بارے درخت دعا میں لگا بار کہ اک بار اس بار غم سے نکالا
سوا سو برس تک تو جیوے الہی ترا حکم جاری، ترا بول بالا

کسی وجہ سے دربار بند ہوگیا تو، تھوڑے ہی دنوں بعد مجرے کی اجازت ہوئی، اس واقعے کو یوں لکھتے ہیں :

'احساں' کو راہ قطب تو مکے کی راہ تھی ایک آرزو تو تھوڑی ہی مدت میں مل گئی
صد شکر بادشاہ کا مجرا ہوا نصیب دولت جولکھی تھی مری قسمت میں مل گئی

دعا دیتے ہیں اور پر دادا تک نام گنوا جاتے ہیں کہ کہیں کسی دوسرے ابو ظفر کو نہ پہنچ جاے :

ابو ظفر بن اکبر بن شہ عالم! عروس عیش ہمیشہ ترے کنار میں ہو

ایک قصیدہ مدح میں لکھا ہے ۔ اس کا ایک شعر نقل کرتا ہوں ۔ داد دیجئے کہ کیا نیا مضمون ہے اور کس خوب صورتی سے باندھا ہے :

محراب کا عالم ہے یہ اے قبلۂ عالم منہہ تیری طرف اور ہے کعبے کی طرف پشت

سب کچھہ تھا، مگر یہ زمانہ ان کے لئے بڑا سخت تھا ۔ استاد ذوق کے قدم قلعے میں آ چکے تھے ۔ خود بادشاہ اور شہزادوں کا گروہ کا گروہ اِدھر سے ٹوٹ اُدھر جا ملا تھا ۔ ظاہرا ان کی تعظیم و توقیر میں تو فرق نہ آیا ۔ ہاں تنخواہ ملنے میں اوپر سوپر ہوجاتی تھی ۔ بھلا یہ کب چوکنے والے تھے ۔ ذرا تنخواہ ملنے میں دیر ہوئی اور انھوں نے ترّ سے عرضی دی ۔ جب اس سے کام نہ چلا تو غزلوں میں اس کا رونا رویا۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ بادشاہ مچھلی کے شکار کو گئے ہوے تھے، یہ ساتھہ تھے، تنخواہ بند تھی، وہیں فی البدیہ ایک قطعہ کہا اور تنخواہ رکھوالی ۔

صید ماہی و صید دل ، شاہا خوب ہے اور کچھہ نہیں معیوب
جال ہو اور شکار مچھلی کا یعنے توبے کا ہے نکالنا خوب
قطب صاحب تھے جب حضور گئے وہ دو ماہا گیا ہے میرا توب
اس کو بھی حکم ہو نکل آے صبر کب تک کہ ہو میں نہیں ایوب

ایک مرتبہ یہ ہوا کہ تنخواہ کٹ گئی ، انھوں نے قطعہ پیش کیا اور رقم اٹھائی ۔

اگر جنگل میں لٹ جائے جو کوئی کیا تعجب ہے مگر تحقیق ہو تو چور کی مشکل رہائی ہے
مری تنخواہ لوٹی ان لٹیروں نے حویلی میں دہائی ہے بہادر شاہ غازی کی دوہائی ہے

بہر حال سب کچھہ کرتے ، مگر تنخواہ نہ وقت پر ملتی تھی اور نہ ملی ۔ اس کا رونا اس طرح روتے ہیں :

بند و قیں کیوں ہیں چھوڑتے ہو چاند رات کو اس کا سبب جو پوچھو عیاں ہے نہاں نہیں
یعنی نہ اس طرح کا ہو جب تک کہ شور و شر تنخواہ اور وضع سے ملتی یہاں نہیں

ایک جگہ شاعرانہ رنگ میں اسی مضمون کو ادا کرتے ہیں :

دو بھی بو سے مجھے ایک ماہ میں اے ماہ نہ دو　　وضع یہ کیا ہے کہ نوکر رکھو' تنخواہ نہ دو

تنخواہ نہ ملنے کی مصیبت کا جتنا انھوں نے رونا رویا ہے' شاید ہی کسی نے رویا ہوگا - بادشاہ کو عرضیاں دیں' شاہزادوں کو عرضیاں دیں' اُمرا کو عرضیاں دیں' غرض پیروی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا' خدا معلوم اس عرضیوں کی بھرمار سے کوئی نتیجہ نکلتا بھی تھا یا نہیں- اس زمانے میں تنخواہ کی تقسیم نواب ظفرالدولہ اصغر علی خاں بہادر کے ہاتھ میں تھی' اُن کو لکھتے ہیں :

صبا یہ کہہ ظفرالدولہ سے بصد اعزاز　　کہ امر خیر میں تیری رہے قلم جاری

خلاف وعدۂ احساں زبوں ہے اے مشفق　　زباں سے اپنے کہا تھا مجھے کئی باری

کہ جب کہ آئیگی تنخواہ حسب حکم حضور　　دو ماہ وہ بھی' یہ تنخواہ لیجئے ساری

وہ شکر ہو نہ مبدل شکایتوں سے کہیں　　بدل نہووے وہ دلداری با دل آزاری

بسان آئینہ آئین اپنا رکھتا ہوں　　میں صاف گو ہوں نہیں آتی مجھکو مکاری

تو گل ہے گلشن دربار بادشاہی میں　　ولے چو غنچہ زباں درتہ زباں داری

اس کے بعد بہادر شاہ کے بیٹے مرزا شاہرخ کو کچھ دنوں کے لئے وزارت کا کام ملا - یہ تو احسان کے شاگرد ہی تھے' بھلا تنخواہ لینے میں ان سے مدد کیوں نہ مانگتے-اِدھر تنخواہ رکی اور اُدھر انھوں نے عرضی دی - ایک عرضی بڑے مزے کی ہے' وہ نقل کرتا ہوں :

صاحب عالم و حاجی و وزیر شہ ہند　　اس سے بھی تجھکو زیادہ حشم و جاہ ملے

جس طرح مجھ سے تو ملتا ہے بہ لطف و اکرام　　دین میں تجھ سے اسی طرح سے اللہ ملے

حق تعالیٰ کی عنایت سے تجھے دنیا میں　　صحت و عیش ملے' مقصد دل خواہ ملے

چوبدار آپ نے بھیجا تھا دلانے تنخواہ　　کہ حویلی سے مہینہ مجھے ہر ماہ ملے

چوبداروں کی جھڑی سے نہیں ڈرتا مختار　　کیا کریں وہ بھی کہ جب ایسا ہی گمراہ ملے

اب دو فراش ہوں، دو بانس ہوں، دو رسّے ہوں   حکم ایسا ہو تو شاید مجھے تنخواہ ملے
اس پہ بھی جو وہ نہ دیوے اسے لونڈی کی طرح   آج کل اس کی سزا اے مرے اللہ ملے

ان سب عرضیوں میں سب سے زیادہ زور کی عرضی وہ ہے، جو انھوں نے بہادر شاہ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ یہ عرضی اس سبب سے بھی دلچسپ ہے کہ یہ اسداللہ خاں 'غالب' کی عرضی کا نقش اول ہے، وہی زمین ہے، اور وہی طرز سوال۔ ہے تو بڑی ساری مگر پر لطف ہونے کی وجہ سے پوری کی پوری لکھے دیتا ہوں :

اے ملک اے پناہ جملہ ملوک   اے فلک مرتبت، ملک کردار
تجھ سے آباد ہے جہاں آباد   اے جہان کرم جہان وقار
گر تو مہر فلک سے منہ موڑے   تیرے پاؤں پہ وہ رکھے دستار
جو تخلص کو تیرے ورد کرے   نہ شکست اس کو ہو کبھو زنہار
میری طبع غیور کچھ مطلب   نہ کسی سے کہے کم و بسیار
عرض احوال بادشاہوں سے   بادشاہا نہیں ہے لیکن عار
قطب صاحب تھے قبل ازیں جو حضور   بزیارت، برائے سیر و شکار
یہاں شکار اپنی ہو گئی تنخواہ   سیر ہی میں یہ گل کھلا یکبار
کہا جس لالہ سے کہ لا تنخواہ   وہی لالہ ہوا گلے کا ہار
لالہ جی ایسے ہو گئے لے لوٹ   پوست کھینچو تو وہ نہ دیں زنہار
بلکہ دھمکائیں اُلٹا وہ مجھکو   کہ روھیلہ ہے یہاں کا اب مختار
سودیء اہل علم ہے یکسر   لوٹ کی اب ہے گرمیء بازار
اور مختار کا تھا یہ احوال   نہ تو اقرار تھا نہ کچھ انکار
اب تو اس کا پتہ نہیں ملتا   اب کی تنخواہ کا کیا تھا قول و قرار
میری تنخواہ کم بہت ہے مجھے   آج دس بیس اور کل ہیں ہزار

جب دو ماهه هی لٹ گیا میرا (ق) میرے نوکر بھی مجھ سے هیں بیزار
صبح کو میں کہوں کہ آنا تم شام کو آوے گھر سے خدمت گار
آتے هی کہوے کچھ تو دلواؤ بھوک کے مارے نکلے هے آچار
جب کہ پینس کو لے کے چلتے هیں (ق) هیں جو زر غل سے چار پانچ کہار
ان کا معمول هے کہ دوڑتے وقت منہ سے بھرتے هیں اپنے کچھ هنکار
اپنی هوں هوں تو ساری بھول گئے یہی کہتے هیں وہ پکار پکار
وقنا ربنا عذاب الجوع وقنا ربنا عذاب النار
جب یہ صورت بنی تو بنیے سے قرض کے واسطے کہا ناچار
کہ غریبوں کی بانٹ دوں تنخواہ بنیا راضی هوا بصد تکرار
اتنے میں بول اٹھی بنین یہ کیوں گنواتا هے اپنا تو گھر بار
مکھا مورکھ هے تیری عقل گئی قرض دینے کو تو هوا تیار
اس کی تنخواہ هے حویلی میں اے اپونے اسے نہ دے تو ادھار
میرے شاها هیں تجھ سے دو مطلب (ق) بار مجرا و دولت دیدار
یہ کہاروں بغیر هے مشکل وہ کہاروں بغیر هے دشوار
ان کو تنخواہ دوں کہاں سے میں آپ جب اس طرح کا هوں ناچار
دل سے احساں سے هے تجھے رغبت دل احساں هے تیرا شکر گزار
تیرے احساں کو جو نہ دیکھ سکیں اُن بخیلوں پہ هو خدا کی مار
نام احساں رهے نہ دفتر میں چاهتے هیں کئی یہ بد اطوار
اور میں کیا کہوں غریب نواز میں غریب اور یہ غریب آزار
بحر یہ اور ردیف و قافیہ اور اب غزل کے پڑھوں کئی اشعار

—— (غزل) ——

آتے هی بس سنائی جانے کی تجھ کو خو هے مجھے کڑھانے کی

یہاں ہوا ری تو جاں سوکھے ہے　　وہاں پڑی اسکو پان کھانے کی

شوق سے مجھ سے یوں بگڑ بیٹھو　　ایک تھیرے نہ منہ بنانے کی

قیس صحرائی اور دعوے عشق　　بات ہی توی جدا بن آنے کی

وہ نہو میں جیوں جگہ نہ رہی　　آئینہ رو کو منہ دکھانے کی

نام رکھوا نہ اپنا ہر جائی　　نہ قبا پہن چار خانے کی

زلف کو چھیڑتے ہی کہنے لگے　　ہے یہی بات مار کھانے کی

زندگی میں بایں تپاک اخلاص　ق　روز دہشت ہے روٹھ جانے کی

بعد مرگ آہ تجھ سے کسکو امید　　جان من فاتحہ دلانے کی

بیٹھ اے آہ بس خدا نہ کرے　　تجکو فرصت ہو سر اٹھانے کی

مستعد بدی ہوا وہ ہی　ق　جس سے کی ہم نے بارہا نیکی

نیکیاں کر کے ہو بدی حاصل　　ہے تری آخری زمانے کی

یاد مسجد میں آئیگی احسان　　کیفیت اُس شراب خانے کی

کھولوں دروازۂ دعا کو میں　　قافیے پہلے پور ہوے درکار

جب تلک مہر و ماہ چرخ پہ ہوں　　جبتلک ہوں جہاں میں لیل و نہار

دھوپ اور چھاؤں جب تلک رہوے　　جب تلک چاندنی ہو اور شب تار

جب تلک ہیں یہ آسمان و زمیں　　جب تلک دشت ہووین اور کہسار

جب تلک فصل گل ہے سال بسال　　جب تلک ہے جہاں میں نام بہار

گل مقصد بہار پر ہو ترا　　اور نخل مراد لاوے بار

ابر نیساں کی طرح دنیا میں　　تیرا دربار ہو سدا دُربار

یعنی دنیا ہو اور بہادر شاہ　　بطفیل محمد مختار

آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس قصیدے میں بھی کہیں کہیں رعایت لفظی کو برتا ہے لیکن جو روانی اس عرضی میں ہے لو جس طرح واقعات کو بیان کیا ہے وہ احسان

ہی جیسے استاد کا کام تھا ۔ صرف یہ قصیدہ ان کی استادی منوادینے کو کافی ہے ۔

دلوں میں جو فرق پڑ گئے تھے ، ان کا خیال کر کے بادشاہ اگر ذراسی بھی عنایت فرماتے تو یہ خوش ہو جاتے اور جھٹ قطعہ یا قصیدہ لکھہ گزران دیتے ۔ چنانچہ شاید بادشاہ نے کبھی یہ کہہ دیا ہوگا کہ "ہم تمہیں جانتے ہیں ، تم ہمیں کیا جانتے ہو" یہ اسی پر خوش ہو گئے —

فرطالفت سے یہ فرمایا ظفر نے 'احسان' ہم تمہیں جانتے ہیں تم ہمیں کیا جانتے ہو
عرض کی میں نے کہ میں ذرہ ہوں اور تم خورشید فخر ذرہ ہے کہ ذرے کو ذرا جانتے ہو
اور یہ اور عنایت ہے گدا پر اپنے گو چہ استاد ہو ، شاگرد شہا جانتے ہو

یہی وہ زمانہ تھا کہ اس غریب پر عرصہ تنگ ہو گیا تھا ۔ بیچارا (۸۰) برس کا بوڑھا مقابلے کے لئے کھڑا ہوتا ، سخت سے سخت زمینوں میں دو دو اور تین تین غزلیں لکھہ جاتا ، مگر یار لوگ مشاعرے میں رنگ نہ جمنے دیتے ، آخر کہاں تک ، بڈھے کو بھی جوش آگیا اور تو کچھہ بن نہ پڑی ، غزلوں ہی میں سب کو خوب لتاڑ ڈالا —

میں نے کہا مشاعرے میں چلئے گاہ گاہ کہنے لگے کہ چلیے ؟ ہماری بلا چلے
مضمون اپنے باندہ کہ کاھک ہو ایک خلق چوری کی جنس ہو تو وہ دوکاں کیا چلے

کچھہ شعر پہ میرے ہی نہ چشمک ہیں ہزاروں طعن اس پہ ہے گو بلبل آمل نے کہا ہو
دنیا میں نہ کس طرح سے مغرور ہوں احمق ہاں ان کی ہی جب شان میں لولا الحمقا ہو
ہے تربیت بیہودہ گو یاں مجھے منظور واللہ اگر مجکو کبھی عزم ھجا ہوا
گر میری غزل میں ہو خطا کہدو ھدر سے جو منہ پر نہ کہوے تو وہ سادر بخطا ہو

بس جینے سے جی لہنا ہوا سیر کہ 'احسان' ہم بزم یہاں تھوڑے ہمارے سفہا ہم

یہ مجلس میں جاتے، لوگ تعظیم نہ دیتے، یہ شعر پڑھتے، لوگ تعریف نہ کرتے، آخر جل کر کہا :

یاد ہے اس رخ کی سجکو مجوہ سے ناصح تو نہ بہک   بھٹنا ترک ادب ہے حافظ قرآں کے ساتھ
کب اُٹھے تعظیم کو منعم، اسے تم سو کہو   سی دیے اُس کے سریں ہیں مسند ایواں کے ساتھ

اپنی غزل جو پڑھتے ہیں، کہتے ہیں دوستاں   حضرت بغور سنئے کہ بسیار گرم ہے
جب میں پڑھوں ہوں شعر تو بیچے ہیں کھریاں   کیا ان دنوں میں پھوٹ کا بازار گرم ہے

سخن حضرت احساں پہ، عدو سے کہدو   پھر اگر ناک چڑھائی تو بچا کان نہیں

زمانے کی بے قدری کا یوں رونا روتے ہیں :

جو پوچھا میں نے یہ 'صائب' سے میرزا صاحب   کہ میں ہوں بے ہودہ گو یا نہیں یہاں انصاف
کہا کہ تو ہے مدار سخن ولے 'احساں'   "مدار چشم ازیں کور باطناں انصاف"

یقینی تو نہیں کہہ سکتا، مگر بظاہر اس قصیدے میں استاد ذوق کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ قلعے میں ان کو یا تو استاد کہا جاتا یا شیخ صاحب، یہ میں مانتا ہوں کہ استاد ذوق بڑے خلیق تھے، مگر بعض وقت وہ اپنے خیال میں ایسے محو ہو جاتے تھے کہ دنیا و مافیہا کی ان کو کچھ خبر نہیں رہتی تھی - چنانچہ ایک دن چلم ہاتھ میں لئے اپنے کابلی دروازے کے مکان سے نکل قلعے چلے آے - ممکن ہے کہ 'احساں' کے ساتھ بے رخی کی ہو اور انہوں نے یہ واقعہ لکھ مارا ہو، یہ ماننا پڑیگا کہ قطعے کے الفاظ کسی واقعے کی طرف ضرور اشارہ کر رہے ہیں —

کل شیخ کے گھر میں ہی ملا دختر رز سے (ق)   کچھ منہ سے نہ بولا مجھے مہمان سمجھکر
تعظیم نہ کی اس خر مغرور نے میری   ہم شاعر و ہم حافظ قرآن سمجھکر

تقصیر نہیں اس کی یہ ہے اپنی حماقت   کیوں آیا گدھے پاس میں انساں سمجھکر

بڑھتے بڑھتے غصہ یہاں تک بڑھا کہ اپنے شاگردوں سے بھی بگڑ بیٹھے- کہتے ہیں:
بیٹا نواب بن کر شاعری نہیں آتی' "حلوا خوردن را روے باید" کچھہ محنت بھی
کرنی پڑتی ہے :

میں نے 'احساں' سے کہا خسرو شیریں سخناں   دل سے تم رکھتے نہیں مجھہ پہ عنایت شاید
میں تو اصلاح کو لیتا ہوں باميد کہ ہو   بزم شیریں سخناں میں مجھے ثروت شاید
سن کے فرمانے لگے "میں تو ہوں حاضر لیکن   عشق شیریں دہنی باید و محنت شاید"

اس زمانے میں جو کشمکش مرہٹوں اور سلطنت مغلیہ کے درمیان ہو رہی
تھی' اس کا بھی پتا ان کے اشعار سے چلتا ہے' اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شہر مرہٹہ
گردی سے بالکل تباہ ہوگیا تھا' آسودگی نام کو نہیں رہی تھی' نفسانفسی کا عالم تھا-

اے اہل دل خدائی دل نے یہاں دکھائی   دلی میں تھا جو دیکھا کوے بتاں میں دیکھا

میں تو اس شعر کے یہی معنی سمجھتا ہوں کہ اہل دل! آج کل دلی کا یہ حال ہے
کہ یہاں بتوں کی طرح ہر شخص دعوے خدائی کرتا ہے اور تباہی و بربادی کے لحاظ
سے دلی کو اگر کسی سے مشابہ کہا جاسکتا ہے تو وہ "کوے بتاں" ہے- ایک اور غزل ہے:

بصد کرشمہ وہ اکدم جو انجمن میں رہے   نہ تاب نالہ ہو دل کو' نہ دم دہن میں رہے
وہ زلف دیکھہ کے زاہد تو ماؤمن میں رہے   جو کاٹ جاے یہ ناگن تو من کی من میں رہے

اس میں دہلی کا حال لکھتے ہیں :

یہ دلی مردم قابل کا بن تھا' اب لیکن   یہ بن گئی ہے کہ بن مانس ایسے بن میں رہے

اور دہلی کی اشرات گردی کا رونا اس طرح روتے ہیں :

یہ دور آیا کہ مختاری کو دوڑے   شہ دوراں کی' ہم بقال و بزاب
نہ ہر ذرہ کو دیں ہر وہ میں حایک   بنے ہر سلخ کو قصاب نواب
بس اب توبہ گناہوں کی کہ تو ہے   الہ العالمیں غفار و تواب

قلعے کی تباہی کو پردے ہی پردے میں یوں ظاہر کرتے ہیں :

دکھایا زلف کا عالم تو اس میرا یہ عالم ہے　　اساس صبر برہم ہے ' بنائے عقل درہم ہے
نہیں ہے خرمی زیر نگین تاجداراں بھی　　اگر شاہ جہاں یوں ہے برائے نام خرم ہے

اس شعر میں لطف یہ ہے کہ شاہجہاں بادشاہ کا نام خرم تھا۔

شاہ عالم ثانی کا زمانہ عجیب مصیبت کا زمانہ تھا۔ سکھوں کا زور ہوا ' پٹھانوں کا زور ہوا ' مرہٹوں کا زور ہوا' انگریزوں کا زور ہوا - غرض آئے دن کے حملوں سے دہلی کے انجر پنجر ڈھیلے ہوگئے' امیر امت الاکر فقیر ہوگئے' حویلیاں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہوگئیں' شہر پناہ سے باہر جانا گویا دنیا سے جانا تھا - اس زمانے میں امیرالامرا ذوالفقارالدولہ مرزا نجف خاں بہادر غالب جنگ وزیر تھے - یہ ایران کے شاہزادے تھے' مگر زمانے کی گردش سے دہلی آگئے تھے ' وہ گردش یہاں بھی ان کے ساتھ آئی ' بادشاہ نے ضابطہ خاں کو علحدہ کرکے ان کو وزیر بنایا تھا - ضابطہ خاں نمکحرام مرہٹوں سے جا ملا - تکوجی ہلکر نے دلی پر حملہ کیا اور سنہ ۱۱۸۶ ھ میں نجف خاں کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا - اب کیا تھا' ضابطہ خاں امیرالامرا بنے ' نجف خاں اِدھر اُدھر چھپتے پھرے - اسی زمانے میں 'احسان' نے یہ شعر کہے ہیں :

گر تیغ کھینچئے گا' کھنچ جائے گا میاں　　ہے گنپتی کا زور' نجف خاں کا ہوچکا

فوج غم ہلاکر کر دل پر مرے' اے جان من　　کیا ستم ہے آپ اب ہلکر کے لشکر جائیں گے

نجف خاں کی لڑکی کی شادی 'احسان' کے بڑے لڑکے سیف الرحمن خاں سے ہوئی تھی - اس طرح 'احسان' اور نجف خاں سمدھی تھے - لڑائی میں نجف خاں کی بہادری دیکھکر ہلکر نے اُن کو اپنے لشکر میں رکھ لیا اور بڑی قدر و منزلت کی شاید اسی واقعے کو 'احسان' نے دوسرے شعر میں ظاہر کیا ہے'

پنجاب میں سکھوں کا زور ہوا' اس کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں :

چشم و دل، جان و جگر، میں، بحر الفت، ہیں یہ پانچ
ان پہ زلف و خال و خط ہر اک تسلط یاب ہو
صد ہزار افسوس ہے یا پنجتن، آٹھوں پہر
پنجۂ کفار میں یوں کشور پنجاب ہو

آخر لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر مرہٹوں کا زور توڑا، بادشاہ کو کمپنی کے زیر حمایت لیا، جب کہیں جا کر چین چان امن آمان ہوا۔ اس کا ذکر اس طرح اپنے اشعار میں کرتے ہیں:

ابرو کے بھی اشارے میاں بھول تم گئے — ہاں کمپنی کا دور ہے تلوار کیا چلے

مذہب اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ عقیدے کے لحاظ سے سنی اور ارادت کے لحاظ سے قادری تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی نعت میں ایک قطعہ کہا ہے اور خوب کہا ہے:

عید کے دن فلک نے مجھکو کہا — آؤ ہم تم بھی ہوویں ہم آغوش
میں نے غصے سے یہ کہا اس سے — کیا تو بکتا ہے بے ادب خاموش
میں غـلام محـمـد عربی — مجھ سے تو ہو سکیگا دوش بدوش؟
سن کے سن ہوگیا فلک یہ سخن — اور جاتے رہے یکا یک ہوش
بعد اس کے سمجھ کے کچھ دل میں — بولا بیجا ہے تیرا جوش و خروش
وہیں دکھلا کے پھر ہلال عید — یہ لگا کہنے چرخ اطلس پوش
تو فقط ہی نہیں غلام 'احسان' — میں بھی اس کا ہوں دیکھ حلقہ بگوش

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

غلام کمتریں کس کا ہوں دیکھو اے ملائک تم — گلہ میرے نہ دیکھو، جانب خیر البشر دیکھو

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں لکھتے ہیں:

خکر شراب دل میں ذکر بتاں ہے لب پر   میری دعا الٰہی ہو مستجاب کیونکر
وقت مدد ہے شاہا! کوہ گنہ ہے سر پر   سر خاک سے اُٹھاؤں یا بو تراب کیونکر

رتبہ اعلیٰ ہے اس کا صلّ علیٰ   ذات مولیٰ علی عجب شے ہے

میں کون ہوں، کیا چیز ہوں، یا شاہ تمھارا   جبریل سزاوار ہے گر مدح سرا ہو
ہے حکم خدا سے وہ ترا حکم کہ وہ ہیں   پھر جائے ترے حکم سے گر حکم خدا ہو
حل کیجیے مرے عقدے عنایات سے اپنی   شاہ دوسرا، شیر خدا، عقدہ کشا ہو

دیکھنا کس خوبصورتی سے خلیفۂ چہارم کی تعریف کی ہے اور کس خوبی سے آپ کی فضیلت بیان کی ہے :

پنچھ بر تاب خوارج ہے وہ یار چار میں   ہو زماں، ہفت آسماں ہوں جسکو ششدر دیکھکر
پربھا ہوتا ہے 'احسان' میوۂ فصل اخیر   میں یہ سمجھا رتبۂ والائے حیدر دیکھکر

اسی طرح خلفائے اول و دوم کی فضیلت کا ایک نیا پہلو نکالا ہے :

مدفن مومن اگر ہو شاہ مرداں میں تو پھر   اور ہی رتبہ ہے اس کا خالق اکبر کے پاس
قدر بو بکر و عمر وہ ہے کہ بعد مرگ بھی   منکرو دیکھو کہ آسودہ ہیں پیغمبر کے پاس

دلی میں صفدر جنگ کے مقبرے کے سامنے ایک احاطہ ہے، جس میں تعزیے دفن ہوتے ہیں، اس جگہ کو "شاہ مرداں" کہتے ہیں - لوگوں کا خیال ہے کہ جو یہاں دفن ہوا وہ یقیناً جنتی ہے - اسی خیال پر مضمون بالا لیا گیا ہے -

حضرت شہید کربلا کی شان میں کہتے ہیں :

'احسان' خدا کہ دل سے 'احسان'   قربان شہید کربلا ہے

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃاللہ علیہ سے ان کو خاص عقیدت تھی - اور اسی لئے میرا خیال ہے کہ یہ سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے - آپ کی شان میں کہتے ہیں :

سو بار گر مسیح جلائے تو یوں کہوں بندہ غلام عیسیٰ جیلاں کا ہو چکا

شہ جیلاں کے مرقد کو نہ دیکھوں اک دن اور فرقت کی ہمیشہ شب تار آئے نظر
جسکے دیکھے سے مرے بخت سیہ ہوویں سپید یا الٰہی مجھے وہ سبز مزار آئے نظر

کیا کروں سلطنت جم کو کہ جم جم ہو نصیب آستاں شہ جیلاں کی گدائی مجکو
نثار خاک پاک شاہ جیلاں کیوں نہ ہو احساں نواسہ وہ نبی کا اور پوتا وہ علی کا ہے

ایک مشہور رباعی ہے :

اے خالق ہر بلند و پستی شش چیز عطا بکن زهستی
علم و عمل و فراخ دستی ایمان و امان و تندرستی

اس رباعی پر ان کی بھی ایک رباعی ہے :

شاہ جیلاں مدد بہ حق حیدر حاصل ہوں یہ سات مجکو مقصد یکسر
ایمان و امان و جنت و حور و قصور دیدار خدا ' شفاعت پیغمبر

یہ تو میں نے چند اشعار نقل کردیے ہیں' ورنہ دیوان میں جا بجا یہ مضمون آیا ہے —

معلوم ہوتا ہے کہ اهل اللہ سے ان کو خاص عقیدت تھی - کرنال میں سید علی المتخلص بہ حسینی کوئی فقیر کامل تھے ' ان کو لکھتے ہیں :

صبا گزر ہو اگر تیرا جانب کرنال یہ عرض کیجو حسینی سے تو پس از آداب
کہ میں ہوں تشنہ' تو فرزند ساقی کوثر شراب کو ہوں ترستا جہاں تہاں ہے سراب
تو کر شراب حقیقت ہزار خم داری سبک بیا و مئے خاکسار را دریاب

یہ وہ زمانہ تھا کہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ دهلی میں مرجع خلائق بنے ہوے تھے - حافظ 'احسان' کو بھی ان سے خاص تعلق تھا ' ان کی تعریف

میں لکھتے ہیں :

اے خامۂ پختہ کار احساں — اے کلک گہر نثار احساں
آں بہ کہ گہر نثار سازی — ہر سالک ملک دل نوازی
اسمش عبد العزیز خوانند — در مصر وفا عزیز دانند
آنانکہ کنند عزم عزت — خوانند عزیز در عزیمت
ابن ولی و ولی مولا — تاج عرفا، عزیز دلہا
سر دفتر اصفیاے افضل — سر کردۂ اتقیاے اکمل
شمس العلماو بدر اسلام — فخر الفضلا و صدر ایّام
صدرش زعلوم دیں لبالب — جامش زمئے یقیں لبالب
حسان عرب زتر زبانی — سحبان عجم بہ خوش بیانی
دہلی دہ بود ما چو دہقاں — زاں گل گشتہ ہمہ گلستاں
زاں ماہ منور است ایں شہر — در دہر ندیدہ کس چنیں شہر
چوں او شدہ تکیہ گاہ دہلی — ہمسنگ بکوہ، کاہ دہلی
ز آوازۂ اوست کام بردہ — دہلی کہ دہل بہام بردہ
علمش ہمہ داں نمودہ ما را — ہم راہ خدا نمودہ ما را
زاں باغ صفا کسے کہ بر خورد — از نخل حیات خویش بر خورد
خورد است کسیکہ بوسہ زاں پا — آداب خضر نہ خوردہ اصلا
خوردہ نہ شہاں جہان فانی — او خوردہ بہشت جاودانی
حرفیکہ از آں دہن بر آید — کج باز براستی در آید
تیغ آختہ از زبان کفار — ما اعظم شانک اے نکوکار
پیشش چہ بود کمال طوسی — چوں مور بطاس، حال طوسی
از منطق خوش بخوش عیانی — ذات تو نتیجۂ معانی
یک غنچہ زباغ تو ریاضی — اے گل تو بہار ابن رازی

آنانکه عقول عشرہ خوانند ۔ پس یازدہم ترا بد انند
اے وارث انبیاے اصدق ۔ اے نائب اولیاے بر حق
دارم ز عنایتت رجائے ۔ للہ بہ حق من دعائے

اس مدح کو تقریباً پورے کا پورا میں نے اس لئے لکھ دیا ہے کہ 'احسان' کے فارسی کلام کا بھی اندازہ ہو سکے —

پیران طریقت کی صحبت میں ان کو یہاں تک غلو تھا کہ وہ سجدۂ تعظیمی کو جایز سمجھتے تھے - ذرا دیکھیے کا' کیا خوبصورت وجہ قائم کرتے ہیں اور اس سجدے کے منکروں کو کس خوبی سے شیطان بناتے ہیں :

تعظیم جناب اولیا ایہاں ہے ۔ ہے مظہر حق وہیں جہاں انساں ہے
کر سجدۂ تعظیم بزرگوں کو ضرور ۔ آدم کو جو سجدہ نہ کرے شیطاں ہے

قادریہ سلسلے میں تھے ' اس لئے حال قال کی مجلسوں سے ذرا پرہیز کرتے تھے' چنانچہ ایسی مجلسوں پر یوں چوٹ کرتے ہیں :

راگ سنتا ہے دل سے اے مرغے ۔ نہ سنا دھیاں سے اذاں کو حیف

مجلس کا حال ہم کو ہے معلوم شیخ جی ۔ اب ناچ ہے زمانۂ ماضی میں حال تھا

دیوان دیکھنے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ شاہ 'ابوسعید' کوئی بزرگ تھے' اُن کے مرید تھے ' چنانچہ اپنے پیر کے انتقال کی تاریخ یوں لکھتے ہیں :

از حج فراغ یافتہ در رہ وفات یافت ۔ در روز عید مرشد من شاہ بو سعید
احساں چو ذات بابرکاتش سعیدہ بود ۔ تاریخ گفت در عربی " ذاتہ سعید "

۱۲۵۰ ھجری

یہ وہ زمانہ تھا کہ غیر مقلدین کا دلی میں زور تھا ادھر حضرت سید احمد

شہید ۱۲۴۶ھ میں سکھوں کے خلاف جہاد پر کھڑے ہوے' اُدھر ان کے خلیفہ حضرت شاہ اسمٰعیل نے دلی میں مقلدین کے لباس' طرز و روش اور خیالات پر حملے شروع کئے ' کچھ لوگ ادھر ہوگئے ' کچھ لوگ اُدھر - حکیم مؤمن خاں ' مؤمن' نے جہاد کی تاریخ کہی :

وہ شاہ مملکت ایماں کہ جس کا سال خروج   امام بر حق مہدی نشان علی فرہے
۱۲۴۷ھ

ان مجاہدین نے پشاور فتح کرلیا ' پنجاب کی طرف بڑھے' سکھوں نے ان سے سرحدیوں کو توڑ لیا' سید صاحب کو شکست ہوئی اور وہیں شہید ہوے - مخالفین تو موجود ہی تھے' انھوں نے تاریخیں کہیں' مذاق اُڑایا ' چنانچہ شاہ نصیر دہلوی کا قطعہ ہے :

کلام اللہ کی صورت ہوا دل اُن کا سیپارہ   نہ یاد آئی حدیث اُن کو' نہ کوئی نص قرآنی
ہرن کی طرح میدان وغا میں چوکڑی بھولے   اگرچہ تھے دُم شملہ سے وہ شیر نیستانی

عبدالرحمن خاں 'احسان' بڈھے ہوچکے تھے' انھوں نے جہاد یا شکست پر تو کچھ نہیں لکھا ' ہاں ان کو مجاہدین کی ظاہر پرستی بری معلوم ہوئی ' اسی پر ایک چھوٹا سا حملہ کردیا :

واعظا میرا تکفر بہ تعصب مت کر   کہ تشہد کا بدل کرتا ہوں اقرار مدام
نخوت و جبہ و عمامہ سے کیا کام مجھے   مجھے ان کاروں سے البتہ ہے انکار مدام

مخالفت کی انتہا تو اس شعر میں کردی ہے ' شاہ محمد اسمعیل (رح) نماز پر بہت زور دیتے تھے' مسلمانوں کو پکڑپکڑ کر مسجدمیں لےجاتے' کسی کی لبیں بڑھی ہوئیں تو زبر دستی سر بازار قینچی سے کتر دیں ' پیجامہ ٹخنے سے نیچا ہوا تو وہیں پھاڑ کر برابر کردیا - ایسی حرکتوں پر ' احسان ' نے جل کر کہا ہے :

ہمیں تو روزہ اس ایام نحس میں ہے ضرور   نماز پڑھتے ہیں جب ہم کہ بےنماز ہو تم

ذرا اس قطعے کو سنیے - غیر مقلدوں کو کیسی کھری کھری سنائی ہے اور حکیم مؤمن خاں مؤمن پر کیا صاف ہاتھ مارا ہے :

جو اهل تسنن پر آوازے کسے' نا کس شاگرد هے شیطاں کا ابلیس مقرر هے
مردود هے' ملعوں هے' مطعون خلائق هے مسلم نہیں' مشرک هے' مؤمن نہیں' کافر هے

تلمذ | یہ پتہ نہیں چلا کہ یہ کس کے شاگرد تھے' معلوم هوتا هے کہ یہ بھی غالب کی طرح کسی کے شاگرد نہیں هوے' صرف مطالعے کے بل پر شاعری کی اور استاد هوگئے - غالب نے ایک خیالی شخص عبدالصمد کو اپنا استاد بنایا اور اِنھوں نے حضرت امیر خسرو (رح) کی روح سے مدد لی' چنانچہ فرماتے هیں :

طوطی هند کی وہ روح سے هے فیض تجھے تجھے 'احساں' نہ کبھی بلبل آمل پہنچے

میں نے سلسلۂ تلمذ معلوم کرنے کے لئے بہت سی کتابیں دیکھیں' لیکن ان کے استاد کا کہیں نام نہ ملا' هاں اتنا ضرور پتا چلتا هے کہ ریاضی میں دهلی کے مشہور ریاضی داں مولوی مرتضی کے شاگرد تھے - ان کی وفات کی تاریخ لکھی هے اور خوب لکھی هے' مادۂ تاریخ تو ایسا هے کہ سبحان اللہ۔ قطعۂ تاریخ رحلت استاد خود گوید :

اے چرخ فتنہ گر یہ ستم تو نے کیا کیا رنج و غم و الم کا مجھے مبتلا کیا
دل کا مرے چراغ ستمگر بجھا دیا داغ فراق مولوی مرتضی دیا
وہ یادگار دورۂ ماضی کہاں گیا طاؤس باغ علم ریاضی کہاں گیا
وہ عالم و محدث و حافظ کدھر هے آہ کس طرح کھینچوں آہ کہ بیٹھا جگر هے آہ
قہر خدا میں تو هو گرفتار اے اجل اٹھ جائے یوں جہاں سے وہ فاضل اجل
اے تم همارے درد کے درماں کدھر گئے 'احساں' کو چھوڑ قبلۂ 'احساں' کدھر گئے
ماہ صفر میں گرچہ سفر سے حذر کیا آخر سفر هوا تو پھر آخر سفر کیا
جس ماہ میں گئے تھے* محمد خدا کے پاس پہنچے اسی مہینے میں وہ مصطفی کے پاس
تاریخ میں نے یہ کہی 'احساں' وفات کی یوم الوفات ان کا هے پہلی وفات کی

---

* مادۂ تاریخ میں رعایت لفظی ضرور هے مگر ایسی هے کہ تعریف نہیں هوسکتی ۔
دهلی میں ربیع الاول کو وفات یا وفاتوں کا مہینہ کہتے هیں ـــ

احسان کا لکھنؤ جانا

خمخانۂ جاوید میں لکھا ہے کہ حافظ عبدالرحمن خاں ' احسان' بزمانۂ وزارت نواب اعتماد الدولہ سید فضل علی خاں دہلوی لکھنؤ بھی گئے تھے ' مگر وہاں ان کے کمال کی قدر نہیں ہوئی' اس لئے نا کام واپس آے - مجھے بڑا تعجب تھا کہ ایسا بڑا امیر دہلی چھوڑ کر نوکری کی تلاش میں لکھنؤ کیوں گیا - کوئی شاعری پر تو اس کا گزارہ تھا ہی نہیں ' پھر بلا وجہ وطن سے آوارہ ہونے کی اس کے دل میں کیوں سمائی ' آخر ڈھونڈتے ڈھونڈتے پتہ لگ ہی گیا - اس واقعے کو میں ذرا وضاحت سے لکھتا ہوں اور یہ بھی اچھی طرح بتا دیتا ہوں کہ یہ سید فضل علی خاں کون تھے ' ان سے کیا توقعات تھیں اور انھوں نے کیا کیا —

جب غازی الدین حیدر کو بادشاہ بننے کا شوق ہوا تو انھوں نے رزیڈنٹ کے ذریعے سے کمپنی کو گانٹھنا شروع کیا - کمپنی تو خدا سے چاہتی تھی کہ کسی طرح اودھ کا دہلی سے رشتہ ٹوٹے - وہ فوراً ان کو بادشاہ بنانے پر راضی ہو گئی' ساتھ ہی اکبر شاہ ثانی کو لکھا کہ آپ شاہنشاہ ہیں' اگر آپ کا ایک وزیر بادشاہ ہوجاے تو کیا ہرج ہے - بھلا بچارے اکبر شاہ کیا اور ان کی راے کیا ' جو کمپنی بہادر نے کہا وہ انھوں نے قبول کیا - غرض ۱۸ ذیحجہ ۱۲۳۵ ھ مطابق ۱۸۱۸ ع کو غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ بن گئے - انھوں نے اکبر شاہ کو بہت کچھ تحفے تحائف بھیجے اور اسی نامۂ و پیام میں سید فضل علی خاں لکھنؤ پہنچ گئے —

فضل علی خاں سید اور پکے سید تھے - جب شاہ جہاں نے شاہ جہاں آباد بسایا تو چار خدمتوں کے لئے مکہ معظمہ سے چار نجیب الطرفین سید بلواے - ایک کو جامع مسجد دہلی کا امام کیا ' دوسرے کو امام عیدگاہ بنایا ' تیسرے کو فیلبانی کا پیشہ اور چوتھے کو حجامت بنانے کا کام سکھایا - پہلی تین خدمتوں کے لئے تو سیدوں کی یوں ضرورت پڑی کہ بادشاہ کو ان کے پیچھے کھڑے ہونا یا بیٹھنا

چڑ تا تھا - اور چوتھی خدمت کے لئے سید کی اس لئے حاجت ہوئی کہ بادشاہ کو اس کے سامنے سر جھکانا ہوتا تھا —

جن سید صاحب کو فیلبان کیا گیا تھا ' ان کی اولاد میں سید فضل علی خاں تھے - بھلا یہ بادشاہ سلامت کی سفارش لے کر جائیں اور لکھنؤ میں ان کی آؤ بھگت نہ ہو ' جاتے ہی وہاں داروغہ ہو گئے اور تھوڑے ہی دنوں میں انھوں نے معتمد الدولہ وزیر کو کچھ اس طرح ہاتھ میں لیا کہ سب جزو کل کے مالک بس یہ ہی تھے - یہ اس بلا کے سخت تھے کہ خدا کی پناہ ' اور ساتھ ہی جوڑ توڑ کا وہ مادہ ان میں بھرا تھا کہ توبہ ہی بھلی - ایک دن ولیعہد بہادر نے سات روپے میں ایک کبوتر کا جوڑا خریدا اور ان کو لکھ بھیجا کہ روپیہ ادا کردو - انھوں نے روپیہ دینا تو کیسا رقعے کا جواب تک نہیں دیا - ایسی ہی باتوں سے محل والوں نے ان کی اکھاڑ پچھاڑ شروع کی - آخر ۱۹ - محرم ۱۲۳۸ ھ کو لکھنؤ سے بھاگ سیدھے دہلی آ ے اور کچھ دنوں یہاں رہ کر بنارس چلے گئے - نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ان کی قسمت نے پھر پلٹا کھایا ' بلائے گئے ' اعتماد الدولہ خطاب ملا اور وزیر کردیے گئے - 'ناسخ' نے ان کی وزارت کی تاریخ ''دھت دھت بری بری'' (۱۲۴۲ ھ) سے نکالی - (ہاتھی کو چلانے کے لئے مہاوت ' دھت دھت ' اور روکنے کو ' بری بری' کہتے ہیں) - ان کے تعلقات رزیڈنسی سے بہت اچھے تھے' ہر بات میں بادشاہ کو دبا تے اور جو کاغذ رزیڈنٹ ان کو دیتا اس پر بادشاہ کے دستخط لے آتے - نتیجہ یہ ہوا کہ تمام شاہزادے اور امرا ان کے خلاف ہو گئے اور سوچتے سوچتے یہ ترکیب نکالی گئی کہ اکبر شاہ کے ذریعے سے سید صاحب کو کچھ افہام وتفہیم کی جاے - چپکے چپکے کاغذی گھوڑے دوڑاے گئے اور حافظ عبدالرحمن خاں ' احسان ' جواب کی شکل میں لکھنؤ آے - چونکہ رزیڈنٹ کے خاص الخاص آدمی کے خلاف یہ کارروائی ہو رہی تھی ' اس لئے حافظ صاحب نے اپنی اصل غرض کو چھپا کر یہ مشہور کیا کہ میں نوکری کی تلاش میں آیا ہوں ' مگر سید فضل علی خاں بھی دلی والے

تھے ' وہ ان ھتکنڈوں کو خوب سمجھتے تھے - ان کی صرف ایک لڑکی تو ان کے ساتھ لکھنؤ میں تھی ' باقی دو بیٹیاں اور سارے کا سارا خاندان دھلی میں تھا - اگر اکبر شاہ کا کہا نہیں مانتے تو مشکل اور مانتے تو مشکل - انھوں نے ترکیب یہ کی کہ حافظ عبدالرحمن خاں سے ملاقات کر نے ھی سے انکار کر دیا - حافظ جی بھی بڑی چلتی رقم تھے ' انھوں نے سید صاحب کے والد سید غلام حسین کو گانٹھنا شروع کیا ' اِسی زمانے میں سید غلام حسین نے ایک مسجد مفتی گنج میں بنوائی تھی ' انھوں نے اس کی تاریخ کہی ' وہ تاریخ میر صاحب کو ایسی پسند آئی کہ کندہ کرا کے مسجد کی رو کار میں لگوادی ' تاریخ یہ ھے :

جناب سید عالی نسب غلام حسین — خدا ز فضل علی مقصدش قبول کند
بساخت مسجد وتاریخ آں بگفت 'احسان' — نماز بندہ در یں‌جا خدا قبول کند
۱۲۴۳ ھ

یہ سب کچھ ھوا' مگر سید فضل علی خاں‌سے ملنا نصیب نہ ھوا - جب اس طرح کام نہ چلا تو سید صاحب کے خسر نواب صادق علی خاں پر ڈورے ڈالنے شروع کئے - وہ بھی اپنے داماد سے کم نہ تھے ' وھاں بھی دال نہ گلی اور انھوں نے بھی ملنے سے انکار کر دیا - حافظ جی ان کو ایک رقعے میں لکھتے ھیں :

کہیو نواب سے اے مخلص صادق میرے — شہر میں تیرے عجب طرح کادیکھا ھےرواج
نام احسان سے یہاں ننگ ھے آتا سب کو — تنگ ھوں' میری ملاقات نہ کل ٹھہری نہ آج
غرض کردم کہ بیاد تو دلم خو سنداست — لیکن ایں دیدۂ دیدا وطلب راچہ علاج

آخر جب ملنے کی کوشش کر تے کر تے تھک گئے تو صلواتوں پر اتر آ ے - ذرا دیکھنا کس طرح اپنے جلے دل کے پھپو لے پھوڑے ھیں اور کس طرح ان کی فیلبانی پر چوٹ کی ھے :

صبا یہ کہیو تو فضل علی سے اے نواب — کہ قدر نعمت احساں نہ تم نے سمجھی حیف
جو اپنی فیل سواری کا آپ کو ھے گھمنڈ — شروع کر تا ھے بندہ بھی پھر الم ترکیف

سید فضل علی خاں نے اِس پر بھی ان کو نہ بلایا ' اب کیا تھا' انھوں نے واقعی

"الم ترکیب" پڑھنی شروع کی، یعنی یہ کیا کہ نصیرالدین حیدر سے مل سید صاحب کے کرتوتوں کا کچا چٹھا جا سنایا، اب کیا تھا، نواب آگ بگولا ہوگئے. ادھر انھوں نے کان بھرے ادھر محل والوں نے شکایتوں کے دفتر کھولے، نتیجہ یہ ہوا کہ بچارے سید فضل علیخاں عتاب شاہی میں آگئے اور چند ہی روز میں اسی صدمے سے ۱۹ شوال ۱۲۴۵ ھ مطابق ۱۸۲۹ ع کو دنیا سے رخصت ہوے اور حافظ عبدالرحمن خاں 'احسان' اس طرح ایک "صاحب فیل" کو ٹھکانے لگا دہلی آگئے - اس واقعے سے نہ صرف ان کے لکھنؤ جانے کا حال معلوم ہوتا ہے، بلکہ مسجد کی تاریخ اور سید فضل علی خاں کے انتقال کی تاریخ ملا کر دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہاں ان کا قیام کوئی سال بھر کے قریب رہا اور یہی وجہ تھی کہ لکھنؤ کے بعض الفاظ ان کی زبان پر چڑھ گئے تھے اور بلا ارادہ ان کی قلم سے نکل جاتے تھے - ان کا ایک شعر ہے :

بوسہ مانگا ہم نے دھمکا کر تو یوں کہنے لگا ۔۔۔ اے تو دھمکی سے تمھاری کیوں نہ ہم ڈر جائیں گے

ایسے موقعے پر "اے تو" کا لفظ صرف وہی لوگ استعمال کرسکتے ہیں جو کچھ دنوں لکھنؤ میں رہے ہوں - لفظ تو لفظ دوسرے مصرع کی پوری بندش اور ترکیب خاص لکھنؤ والوں کی ہے ـــ

شاگرد | یوں تو سارا قلعہ ہی ان کا شاگرد تھا، مگر ان کے دو شاگردوں نے استادی کا درجہ حاصل کیا - ایک شاہزادہ معزالدین 'ثابت' اور دوسرے صاحب عالم مرزا قادر بخش 'صابر' - 'ثابت' تو وہی ہیں جنھوں نے ان کے دیوان کا دیباچہ لکھا ہے اور ان کے متعلق خود 'احسان' کے بعض شعر دیوان میں موجود ہیں - مثلاً :

غزل نہ کیونکہ پڑھوں دوسری کہ اے 'احساں' ۔۔۔ معرکہ آج ہے 'ثابت' سا میرزا میرا

اور صابر وہ ہیں، جنھوں نے ان کے مرنے کی تاریخ کہی ہے اور اپنے تذکرۂ "گلستان سخن" میں استاد کی سچی تعریف کرکے حق شاگردی ادا کیا ہے -

صابر کو ایک خط کا جواب اور عیدالضحیٰ کی تہنیت اس طرح دیتے ہیں:

صبابہ صابر رشک صبوری و صبری ۔۔۔ یہ کہیو میری طرف سے کہ اے بلند مقام
وہ قطعہ قاطع صفر اے غم جو بھیجا تھا ۔۔۔ پڑھا ہے اس ترے مخلص نے حرف حرف تمام
پسند خاطر 'احساں' نہ کیوں ہوں تیرے سخن ۔۔۔ کہ تو سلیم طبیعت ہے اور کلیم کلام
یقین ہے، تو وہ تیرے سخن کا درد آلود ۔۔۔ بسان 'فدوی' و 'تاباں' ہیں تیرے چند غلام
اگرچہ کام دو صد ہوویں ملحق یک تن ۔۔۔ جو کام کا ہے وہ اک دل کو کب رکھے نا کام
حقیقتاً ہے کہ اصلاح رو برو ہے خوب ۔۔۔ یہ خوب سمجھو کہ ہے خوب کا تو خوب انجام
نہیں ہے شبہہ کہ استاد بھی ہے مثل پدر ۔۔۔ شفیق و خیر طالب ، باعث نکوئی نام
نصیب تجھکو ہو یارب سعادت ابدی ۔۔۔ سعید تجھکو یہ عیدالضحیٰ عایک سلام

عبدالرحمن خاں 'احسان' واقعی اپنے شاگردوں کو اپنے بچوں کی طرح چاہتے تھے اور بعض خاص خاص شاگردوں سے تو یہاں تک یگانگت تھی کہ ان کے گھر میں ان سے پردہ تک نہ رہا تھا - ان کے چار شاگرد مرزا معزالدین 'ثابت' مرزا قادر بخش 'موزوں' مرزا پیارے 'رفعت' اور مرزا قادر بخش 'صابر' ان کے گھر میں بلا تکلف آتے جاتے تھے - استاد نے بھی شاگردوں کی تربیت میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی اور ان چاروں کو صاحب دیوان ہی نہیں، استاد کردیا -

اپنے بیٹوں کو نصیحت

ان کو جس طرح اپنے شاگردوں کا خیال تھا ، اسی طرح اپنے گھر والوں اور خاص کر اپنے بیٹوں کا بھی تھا - اپنے دونوں بیٹوں سیف الرحمن خاں اور عبدالحکیم خاں کو نصیحت کرتے ہیں :

اے نور دو چشم و جان 'احساں' ۔۔۔ اے عبد حکیم و سیف رحمن
چوں حفظ کلام حق نمودید ۔۔۔ از خلد درے برخ کشودید
ہر ہفتہ کنید ختم قرآں ۔۔۔ ہر ہفت چنیں کنند مرداں
سیپارۂ اوست چارۂ دل ۔۔۔ چوں ہشت بہشت ہفت منزل
باشید نہ در جہاں ملوث ۔۔۔ گردید مفسر و محدث

اپنے اعمال کی شکایت اور شعر گوئی کی مذمت کرتے ہیں :

بر خود کردم ز جہل بیداد	جدے بکنید ہم چو اجداد
در علم و عمل چو من مباشید	محو شعر و سخن مباشید
خاطر نہ کنید زیں پریشاں	دیوانگی است جمع دیواں
کو قدر شناس آں نماندند	عیسیٰ رفت و خراں بماندند
ہر طور سخن منم کلیمے	بخشند نہ ایں خساں گلیمے
کو شاہجہاں بزر کہ سنجد	عیب است ہنر، ہنر کہ سنجد
سنجیدہ سخن بگفتم اے وا	مداح شہے شوم کہ حقا
در خلد بیک نفس رساند	صد قصر ز مردم دہاند
بر تخت بہشت جا گزینم	صد تاج شرف بسر ببینم
ایں مژدہ دگر کہ لا شنیدی	فرمود کہ لا تخف مریدی

یہاں سے حضرت غوث پاک کی مدح شروع ہو جاتی ہے —

احسان کی شکل و صورت و دیگر حالات

'احسان' کی شکل و صورت کے متعلق اب تک بڑی غلط فہمی رہی ہے - شاہ 'نصیر' کے اس شعر کو ان سے متعلق کر کے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بڑے کالے کلوٹے تھے :

اے خال رخ یار تجھے ٹھیک بناتا — جا چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر

مگر اب جو ان کی تصویر دیکھی اور آغا حیدر حسن صاحب کی یاد داشتوں سے اس کا مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ 'احسان' نہایت خوبصورت آدمی تھے - بہت سرخ و سفید رنگ تھا - نیچی سفید داڑھی تھی مگر چھدری - گھر میں سفید نیچا کرتا، ایک بر کا سفید پیجامہ اور سفید چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے - جب دربار میں جاتے تو کھڑکی دار پگڑی اور چپکن پہن کر اور کمر سے پٹکا لپیٹ کر جاتے —

آغا صاحب کی یاد داشتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کچھ دنوں یہ دہلی کے

وزیر بھی رہے ہیں۔ دی تاسی کے تذکرۂ شعرا کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۴۷ ع میں ان کو دہلی کے دربار میں ایک بہت بڑی انتظامی خدمت سپرد ہوئی تھی۔ شاید یہی زمانہ ان کی وزارت کا ہو۔ جس کو دی تاسی نے 'بہت بڑی انتظامی خدمت' کہا ہے، لیکن یہ وزارت تھوڑے ہی دن رہی اور اس کے بعد حکیم احسن اللہ خاں وزیر ہو گئے —

انتقال عبدالرحمن خاں 'احسان' صمصام الدولہ شہامت جنگ نے ۸۵ برس کی عمر پاکر سنہ ۱۲۶۷ ھجری مطابق سنہ ۱۸۵۱ ع میں دنیا سے کوچ کیا۔ اور درگاہ خواجہ باقی باللہ کے اندرونی احاطے میں دفن ہوئے۔ ان کے ایک لڑکے سیف الرحمن خاں اور پوتے احمد حسن خاں بھی ان کے پہلو میں آسودہ ہیں —

عبدالرحمن خاں اور سیف الرحمن خاں کی قبروں پر کوئی کتبہ نہیں ہے، البتہ سنگ سرخ کے تعویزوں سے بآسانی پہنچانی جا سکتی ہیں —

مرزا قادر بخش 'صابر' نے 'احسان' کے انتقال کی تاریخ کہی ہے اور خوب کہی ہے :

تنگ نائے دہر فانی سے ہوں دل برداشتہ ہے جنوں انگیز و حسرت خیزیہ وحشت سرا
رفتہ رفتہ ساکنان خاک ہیں گرم سفر راہ چلنے میں نہ دن کا فکر' نے تر رات کا
حضرت احساں کہ وہ تھے گلستان دہر میں طوطی شکر مقال و عندلیب خوش نوا
قدوۂ ارباب فضل و اسوۂ اہل کمال قبلۂ اصحاب علم و کعبۂ اہل صفا
معدن فرزانگی' استاد شاہنشاہ عصر عمدۂ ارکان دولت پیشوائے اصفیا
نسخۂ ارشاد و عرفاں' آیت لطف و کرم معنی تلہید رحمن' صورت جود و سخا
ہائے اس مصباح ظلمت سوز بزم دہر کو صرصر جور اجل نے کس طرح گل کردیا
اس کے مرنے سے جدھر دیکھو ادھر کس کس طرح حسرت و اندوہ کا ہنگامہ برپا ہو گیا
عین ہنگام الم میں 'صابر' دلگیر نے اپنے دل کو تھام کر باصد غم و باصد بکا

کی رقم اس معدن "احسان" کی تاریخ وفات   دل گیا بیٹھ آہ جب عالم سے احسان اٹھ گیا

کلام | ان کے کلام کے کیا کہنے، استادانہ کلام ہے، روانی غضب کی ہے، الفاظ ایسے بیٹھتے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ استادوں کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں اور خوب کہی ہیں۔ عمر ایسی بڑی پائی تھی کہ میر سے لگا کر ذوق تک کے اہل کمال سے صحبت رہی۔ مرتے دم تک کوئی مشاعرہ نہ تھا جو ان سے ناغہ ہوا ہو۔ اس زمانے کے منہ پھٹ لوگ، ذرا غلطی ہوئی اور انھوں نے ٹوکا، ایسوں کے مقابلے میں غزل پڑھنا آسان کام نہ تھا، پوری طرح تیار ہو کر جانا ہوتا تھا، اسی لئے اساتذہ کے کلام پر پورا عبور حاصل کرنا پڑا۔ ادھر اعتراض ہوا اور ادھر سند دی۔ ذرا چپکے ہوے اور گئے گزرے ہوے۔ بہر حال اس زمانے کا جو رنگ تھا اس میں استاد کامل تھے۔ ان کا قلعے سے واسطہ تھا۔ قلعے کا یہ حال تھا کہ وہاں دو رنگ ہو گئے تھے۔ ایک وہ لوگ تھے جنھوں نے دلی کبھی نہیں چھوڑی تھی۔ دوسرے وہ تھے جو لکھنؤ کا چکر لگا کر آے تھے۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے سے دلی کے شاہزادوں کا لکھنؤ آنا جانا شروع ہوا۔ کچھ تو وہیں رہ گئے، کچھ ایسے تھے کہ کبھی یہاں رہتے کبھی وہاں۔ آپس کے شادی بیاہ سے آمد و رفت کا یہ سلسلہ اور بڑھ گیا۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں رعایت لفظی کا بڑا زور تھا۔ اس کا اثر انہی شاہزادوں کی وجہ سے قلعے کی زبان پر ہوا۔ احسان کا تعلق قلعے سے تھا۔ شاہزادے ان کے شاگرد تھے، یہ خود بھی لکھنؤ میں سال بھر رہ کر آے تھے۔ نئی چیز سب کو پسند آتی ہے۔ انھوں نے بھی صنائع لفظی کو اختیار کیا، یا یوں کہو کہ اختیار کرنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے کا سارا دیوان لفظی صنعتوں کا مینا بازار ہو گیا۔ استاد ذوق پر بھی اس صحبت کا اثر ہوا ہے، لیکن ان سے کم۔ مومن بھی اس چکر میں آے ہیں۔ غالب کی زبان سے بھی ایسے مصرعے نکل ہی گئے:

ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیر زن کے پاؤں

میں تو میں خود ان کے شاگرد بھی اس لفظی الجھاؤ کو اچھا نہیں سمجھتے ہیں - چنانچہ مرزا قادر بخش صابر اپنی کتاب گلستان سخن میں لکھتے ہیں :

" کلام قدما کی مزاولت سے صنائع لفظی کی طرف اکثر عنان توجہ معطوف اور طبیعت فیض طویت ایسے امور غرابت دستور کی جانب نہایت مالوف تھی - اور ارباب ذوق جانتے ہیں کہ اس طرح کے قیود صفائی کلام اور آمد سخن سے مانع اور ابائی سیاق اور روانی عبارت سے عائق ہوتے ہیں " -

مرزا صاحب یہ سب کچھ کہہ گئے مگر آخر تھے شاگرد ' اس قدر کہنے کے بعد بھی استاد کا پایہ گرنے نہ دیا ' آگے چل کر فرماتے ہیں ·

" لیکن اهل انصاف کہ طبیعت کو جوں آئینہ صاف اور ضمیر آفتاب تنویر کو بے اعتساف رکھتے ہیں ' بے شائبہ تکلف فرمائیں گے کہ اتنے تکلف پر سخن کتنا بے تکلف ہے " —

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بھی اپنے گلشن بیخار میں ان کی صنائع لفظی کو ضرورت سے زیادہ بتایا ہے ' چنانچہ لکھتے ہیں —

" اشعار عاشقانہ اش ناخن بدل زن است - در صنائع لفظی مانند جناس و اشتقاق و طباق وغیرہ آں از حد فزوں دارد " —

ان کے کلام کے متعلق لالہ سریرام صاحب کی وہی رائے ہے جو مرزا قادر بخش صابر کی ہے - یعنی " الفاظ کی شستگی اور بر جستگی میں بڑی کوشش کرتے اور مغلق الفاظ ' پیچیدہ ترکیبوں اور تکرار اضافت سے پرهیز کرتے تھے - رعایت لفظی کے بڑے شائق تھے' تاهم طرز بیان نہایت صاف' سهل اور بے تکلف ہے " —

رعایت لفظی

آگے کلام دیکھنے سے اس رائے کی پوری تصدیق ہو جائے گی - یہاں صرف نمونے کے طور پر چند اشعار دیتا ہوں ' تاکہ معلوم ہوسکے کہ باوجود رعایت لفظی کے ان کے اشعار نہ پیچیدہ ہوتے ہیں اور نہ روانی میں فرق آتا ہے - ہاں پھسپھسے ضرور ہو جاتے ہیں —

لب بلب - لب سے ترے جب لب پیمانہ ہوا   جاں بہ لب تو ہی مجھے کہہ میں ہوا یا نہ ہوا

دیکھیے کیا غم کا زور ہے :

بے غم ہیں ہر ایک غم سے نہیں غم کا ہمیں غم   کیا غم ہو کہ غم تیرا ہے غم خوار ہمارا

اور اس شعر میں پیر کو کیا چکر دیا ہے :

تو اپنے پیر سے ' بے پیر! پیر پیر نہ کر   کہ تیرے پیر کے وعدے نے مجھکو پیر کیا

اور اس شعر میں دیکھیے بار کتنی بار آیا ہے :

بار غم بتاں سے نجات اب کی بار ہو   بار دگر نہ ہو گا یہ بار خدا گناہ

اور اس رعایت لفظی میں جوے کی بازی کو ملاحظہ کیجیے :

بازی عشق وہ جیتا نہ جیا جو کہ یہاں   جو کہ جیتا ہے مری جان وہی ہار میں ہے

اس شعر کو دیکھیے کیا ہنگامہ مچایا ہے :

محتسب ہنگامہ آرائی یہ بے ہنگام ہے   ہے یہ ہنگام قدح نوشی و ہنگام شراب

تجنیس خطی کی مثال بھی ملاحظہ ہو :

تجھکو خبر نہیں یہ نتیجہ ہے جاہ کا   تیجہ بھی تیرے عاشق بیجاں کا ہو چکا

پس فاقہ آتا ہے اک شخص گریاں   یہ محمل سا کہہ دیجو محمل نشیں کو

سخت زمینیں

ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے کہ سخت زمینوں میں غزلیں کہنا استادی کی شان سمجھا جاتا تھا ' شاہ نصیر اس رنگ کے بادشاہ تھے ' وہ ٹھہرے ان کے مد مقابل - یہ کیا چپکے رہنے والے تھے - ایسی ایسی سخت زمینیں لی ہیں کہ خدا کی پناہ - لطف یہ ہے کہ باوجود اس دقت کے نہ کبھی ان کا شعر مغلق ہوا اور نہ کبھی تعقید کی ایسی الجھنوں میں پھنسا کہ ان کا سلجھانا مشکل ہو - اب رہا ان کا اصلی رنگ یعنی صنائع لفظی تو وہ یہاں بھی موجود ہے - پوری کی پوری غزل لکھے دیتا ہوں ؛ انصاف شرط ہے ' بھلا ایسے کو استاد نہ کہیے تو کس کو کہیے—

۱- سنگ بیقدری سے دل کو مرے یکسر توڑا   مول اس لعل کا تو نے بت کافر توڑا

۲- تیری دیوار سے سر اپنا سراسر توڑا   نخل الفت سے ثمر ہم نے یہ دلبر توڑا

۳- دل صد چاک کی پوچھی جو خبر ہم نے وہیں   گل صد برگ مرے سامنے لاکر توڑا

۴- نالۂ وآہ بھی اب تو ہیں نکلنے سے رہے   خانۂ دل پہ لگا تیرا ستم گر ٹوڑا

۵- سادگی ہی نے تری قتل کیا تھا کافر   تیرے زیور نے ستم اور ہی دلبر توڑا

۶- مرکیاں تیری غضب اور یہ بالا ہے بلا   قہر زنجیر، ستم جگنی ہے کافر توڑا

۷- جب سنا مرھی گیا آج مرا حلقہ بگوش   گوھر حلقۂ بیلی وھیں رو کر توڑا

۸- تیری دولت سے مرے کشور دل میں اب تو   مشک و عنبر کا نہیں زلف معنبر توڑا

۹- تجھکو توڑا دے طلائی وہ کہاں سے مفلس   تور کا جس کو نہیں یار میسر توڑا

۱۰- یاد مژگاں میں دم فصد ترے عاشق نے   دم ھی نشتر کے نکلنے کے برابر توڑا

۱۱- ھاتھ پہنچے نہ ترے پاؤں تلک میرے کبھو   حیف یوں لپٹے ترے سر سے ستم گر توڑا

۱۲- ھاتھ افسوس سے ملکر وھیں فصاد نے آہ   پاے تدبیر جو ٹوٹا، سر نشتر توڑا

۱۳- گوے گل میں نے جو پھینکی کہیں پہنچے کو لگی   ق اس ادا نے تو پھر ایک قہر ھی مجھپر توڑا

۱۴- پہنچے کو ھاتھ پہ رکھ کر بہ نزاکت بولے   ھاتھ ٹوٹے نے مرے ھاتھ کو آکر توڑا

۱۵- گریۂ وآہ جگر سوز سے پھوڑا دل کو
آتش و آب سے ' احسان' نے یہ پتھر توڑا

غرض ۱۵ شعروں میں توڑے کے جتنے مختلف معنی ھیں سب لکھدیے ھیں - غزل کیا ھے ، فرھنگ آصفیہ کا خاصہ ایک ٹکڑا ھے —

اس سے زیادہ سخت زمین ملاحظہ ھو:

استخواں سے تو عبث رکھتا ھے چڑاے برھمن   دانت اپنے دیکھ، ھیں تیرے دھن میں استخواں

گل ھزاروں عندلیبیں باغ میں تھیں نغمہ سنج   آہ صد افسوس انکے ھیں چمن میں استخواں

یہ تمنا ھے کہ رھوے شمع فانوسی کی طرح   آتش الفت سے روشن پیرھن میں استخواں

آخری شعر میں غضب کی تشبیہ ھے—

ایک گرما گرم غزل اور سن لیجئے ' اس میں بھی وہ گرم گرم شعر نکلے ھیں کہ معترض انگلی رکھے تو جل جائے —

اس شعلہ رو کی ایک تو رفتار گرم ھے
اس پر کڑوں کی اور بھی جھنکار گرم ھے

زلفیں دھواں ھیں' حسن بھبھوکا پری ھے چال
کیا سر سے پاؤں تک وہ طرحدار گرم ھے

اس سوختہ جگر کے ابھی تن پہ ھے لگی
اس دم تو رکھ دے ھاتھ بھی تلوار گرم ھے

اپنی غزل جو پڑھتے ھیں کہتے ھیں دوستاں (ق)
حضرت بغور سنئے کہ بسیار گرم ھے

جب میں پڑھوں ھوں شعر تو بیچے ھیں کچریاں
کیا ان دنوں میں پھوٹ کا بازار گرم ھے

گاھک ھے تیرے سر کی یہاں شمع اے پتنگ
ھے بیچنا صلاح خریدار گرم ھے

بیٹھا تھا کون سوختہ تکیہ لگا کے یہاں
اب تک جو تیرے کوچے کی دیوار گرم ھے

قربان ایسی تپ کے جو تو آن کر کہے
کیوں تیرا جسم عاشق بیمار گرم ھے

یہ رنگ بالکل شاہ نصیر کا ھے ' مقابلے کی غزل کہی ھے اور خوب کہی ' ۲۰ شعر ھیں ' دوچار سن لیجئے :

خاک میں ملتے ھیں تجھ سے روز گور دوچار کے
ڈھر ھو رھتے ھیں تیرے در پہ سر دو چار کے

مجھ کو مت چھیڑو معاذ اللہ میرے اب تلک
نالے گر آئیں تو پھٹ جائیں جگر دوچار کے

چارہ سازو اس سے جاکر حال دل میرا کہو
کہنے میں البتہ ھوتا ھے اثر دو چار کے

ھر طرف کوچے میں تیرے شور ھے ھنگامہ ھے
خون ھو رھتے ھیں وھاں اے بیخبر دوچار کے

ذرا دیکھئے کیا سخت اُڑان ھے ' کیا روانی ھے ' اور کیا عمدہ مضمون ھیں :

ایک پرواز کی طاقت نہیں اس جا سے مجھے
اور جو حکم ھو صیاد سوائے پرواز

دیکھیو نامہ نہ لایا ھو کبو تر اس کا
کچھ مرے کان میں آتی ھے صدائے پرواز

اپنے نزدیک تو اس دام سے پھنس کر صیاد
کسی کمبخت کو ھووےگی ھوائے پرواز

بے پروبالی پہ خوش ھوں کہ یہ ھر دم ھیں رفیق
تھی پروبالی ھی تک ھم سے وفائے پرواز

ایسی ہی سخت زمینوں کے کچھ اور شعر لکھ کر 'احسان' کی شاعری کے اس پہلو کو ختم کرتا ہوں، ورنہ دیکھا جائے تو ان کا دیوان سخت ردیف اور قافیوں سے بھرا پڑا ہے —

زاہدو سے یہ نہیں ہیں یہ بہم آتش و آب　یعنی یہ ہم ہیں کہ پیتے ہیں بہم آتش و آب
آب دریا میں نہیں پائے حنا بستہ ترے　شعلہ رو چومنے آتے ہیں قدم آتش و آب

اسی غزل میں ایک قطعہ ہے، اس میں ظاہر کیا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی تسبیح میں دونوں جہان مشغول ہیں، اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو، کیا موتی جڑے ہیں:

مہروماہ، ارض و سما، حورو ملک، شاہ و گدا　خاروگل، خاک وہوا، تیغ وقلم، آتش وآب

اپنی پوشاک کا کوچے میں ترے حال ہے یہ　آستیں وہ ہے، گریباں یہاں واں، دامن
درپہ کیوں اہل دول کے در حق سے آیا　اس لئے کھینچے ہے درویش کا درباں دامن

جو مجھ سے پوچھو یہ عشق کیا ہے بہار پیرائے باغ دانش
چراغ دانش، فراغ بینش، فراغ بینش، چراغ دانش
فلک پہ پہنچے دماغ دانش قبول درگاہ عشق گر ہو
قبول درگاہ عشق گر ہو، فلک پہ پہنچے دماغ دانش
گدائے میخانۂ محبت مدام رکھتا یہی صدا ہے
صدائے جام جلوس الفت، شراب بینش ایاغ دانش

شجر کوہ جائے، آہوے ہاموں ٹھہرے　ٹھہر ہے ایسی کہ مرے دل میں ہیں مضموں ٹھہرے
کوہ ودریا میں ہے تاثیر برودت یہانتک　سنگ میں لعل، صدف میں در مکنوں ٹھہرے
ہاتھوں سے ٹھہر کے دم گرم ہے بھرتی اوابل　کہ بیاباں میں مرا آہ نہ مجنوں ٹھہرے

چل بے تھور، بل بے ھوا، بل بے برودت 'احسان'   مجھ کو تو رہے نہ مرا نالۂ موزوں تھترے

بل بے کا لفظ بتا رھا ھے کہ یہ پرانے زمانے کی غزل ھے —

بعض عجیب قافیے

خواجہ الطاف حسین 'حالی' مرحوم نے اپنے دیوان کے شروع میں جو مقدمہ لکھا ھے، اس میں قافیے کی بحث میں یہ بھی ظاھر کیا ھے کہ قافیے کو اس قدر تنگ کرنا مناسب نہیں کہ جب تک حرف کی جگہ حرف نہ آے اس وقت تک قافیہ صحیح نہ سمجھا جاے - بہتر تو یہ ھے کہ اگر کسی لفظ کی آواز بھی قافیہ جیسی ھوجاے تو اس لفظ کو قافیہ بنالینے میں تامل نہ کرنا چاھئے، اس بحث کی تائید میں انھوں نے شوق کی مثنوی کا ایک شعر دیا ھے :

کوئی مرتا ھے کیوں بلا جانے   ھم بھو بیٹیاں یہ کیا جانیں

'احسان' کے ھاں اس کی بہت مثالیں ھیں، وہ اس قسم کے قافیے بلا تامل استعمال کرتے تھے دو تین مثالیں لکھے دیتا ھوں - غزل ھے :

خفا مت ھو مجھ کو ٹھکانے بہت ھیں   مرا سر رھے آستانے بہت ھیں

اس میں ایک شعر ھے :

کماں تیری ابرو سے کم ھے وگرنہ   کمی کیا ھے یوں تو کمانیں بہت ھیں

ایک اور غزل ھے :

ھمارا جگر اس "نہیں" نے جلایا   الٰہی لگے آگ تیری "نہیں" کو

ترے جاتے ھی تفرقہ پڑگیا یاں   گیا دل کہیں کو، گئی جاں کہیں کو

اس میں ایک شعر ھے :

سنا ھوگا احوال فرعون تم نے   ڈبوتا ھے آخر غرور آدمی کو

کمزوریاں

ان کے دیوان میں بہت کم ایسے شعر نکلیں گے جن میں شاعری کی کوئی کمزوری پائی جائے، جن میں محض قافیہ پیمائی ھو، یا جن میں بھرتی کے الفاظ استعمال ھوے ھیں، البتہ ان کے ھاں لفظ "ھم" بمعنی "بھی" بہت آیا ھے - اس زمانے میں یہ عیب نہ ھوا، اب تو بڑا کھٹکتا ھے —

۴ک تری ذات کو ہے اے مرے قیوم قیام　　نے سدا خاک ہے، نے باد، نہ ہم آتش و آب

کچھ اپنے ہی گریے کا نہیں زور اُٹھا اب　　بدلی نظر آتی ہے زمانے کی ہوا ہم
مت میری طرف گھورئیے بس مہرھی رکھیے　　مردم کو ذرا چاہئے آنکھوں میں حیا ہم

خیر مردم کا لفظ تو آنکھوں کی رعایت سے لے آئے، مگر یہ ہم چہ معنی دارد—

بعض جگہ ایسے لفظ استعمال کرگئے ہیں جو لغت میں تو ضرور ہیں مگر عام طور سے استعمال میں نہیں آتے - ایک غزل ہے :

فالۂ آتش عذاں ہے برق اس کو مت سمجھ　　دود آہ عاشقاں ہے یہ گھٹا کالی نہیں

اس میں ایک شعر ہے :

سر بسر پامال غم ہوں کیوں نہ اس صورت سے آہ　　دسترس مجھکو کف پاتک بھی جوں قالی نہیں

عام طور سے قالین بولتے ہیں ' قالی بھی صحیح ہے، مگر زبان پر کم آتا ہے ' خود ان سے سند مانگتے تو کھٹ سے دیدیتے ' خیر سند ہو یا نہ ہو، جو سچی بات تھی وہ میں نے لکھدی - نیچے جو شعر دیتا ہوں اس میں "وجب" کا لفظ ایسا ثقیل آیا ہے کہ خدا کی پناہ - خود ان کے دیوان بھر میں ایسی کمزوری کہیں نہ ملے گی —

هزار باغ میں کھینچے ہے سرو سر بفلک　　زیادہ تو یہی کہوں کا کہ یک وجب تم ہو

ہمارے ہاں بالشت بھر اونچے یا بڑے ہوے یا مٹھی بھر اونچے ہونے کا محاورہ ہے - "یک وجب زیادہ" ہونا بس ان ہی کے ہاں دیکھا —

فارسی ترکیبیں

ان کے ہاں فارسی ترکیبیں بھی ہیں، مگر بہت کم - ان کی شاعری کا دار ومدار سلاست عبارت پر ہے، پھر بھی کہیں کہیں خوبصورت فارسی ترکیبیں استعمال کرگئے ہیں -

۱احساں، لب اس کے وہ ہیں کہ جن کا ہر ایک سخن　　شرمندہ ساز عیسی گردوں نشیں ہوا

مژدۂ سودۂ الماس تجھے زخم جگر   یعنی بیزار ہوئے مرہم کافور سے ہم

اس شعر کو غالب کے دیوان میں بڑھادو تو ذرا مشکل سے پہچانا جائے :

کام رہتا ہے سدا گردن کشوں سے ہی مجھے   پیچ و تاب حلقہ ہائے جوہر شمشیر ہوں

جان دل حزین جگر خستگاں پہ رحم   میں نے کہا ثواب ہے، کہنے لگا گناہ

ذرا اس قطعے کو دیکھئے، غالب کا دھوکا ہوتا ہے اور ان کا ایک قطعہ یاد آجاتا ہے جو اس طرح شروع ہوا ہے :

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل   زنہار اگر تمہیں ہوس نا و نوش ہے

وہی بندشیں ہیں، وہی ترکیبیں ہیں اور وہی زور ہے -

دوش بدوش دوش تھا مجھ سے بت کرشمہ کوش   پردۂ در خیام عقل رخنہ گر حریم ہوش

غازہ بروے مسی بلب پاں بدہن، حنا بکف   سلک در عدن بہ سر، طرۂ عنبریں بدوش

پل میں حریف وہ کرے دم میں شفایہ دے مجھے   آہ وہ چشم می پرست، واہ وہ لعل بادہ نوش

منکر می تھا شیخ کل، آج یہ حال ہے کہ ہے   جام بدست و خم بسر، شیشہ بغل سبو بدوش

اس غزل میں بجائے 'احسان' کے 'محسن' تخلص ڈالا ہے، سارے دیوان میں یہ تخلص بس اسی جگہ آیا ہے ، اس لئے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ یہ 'محسن' بھی تخلص کرتے تھے، پھر بھی ایک یاد رکھنے کے قابل بات ضرور ہے -

نغمہ سرا ہو محسنا تاکہ ہو باغ باغ باغ   سوسن صد زبان ہو گل کی طرح تمام گوش

عربی کے فقرے

فارسی اور عربی کے فقرے 'احسان' کے ہاں شعر میں کپا آتے ہیں، بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ نگینے جڑے ہوے ہیں ۔ فارسی کے نمونے تو آپ دیکھ چکے اور کچھ آگے دیکھیں گے، عربی کے دو چار نمونے درج کرتا ہوں

یہی وظیفۂ مجنوں بدشت عشق رہا فدا ہوں اس پہ کہ اسرا بعہدہ لیلیٰ
جبین عرش معلیٰ ہے سجدہ گاہ نیاز اس آستان پہ سبحان ربی الاعلیٰ

مونس شام غم ہے زلف رسا اصلح اللہ شانہ ابدا
سالہا اس کے در پہ 'احسان' نے قال سل ما ترید یا سلویٰ

پرانی زبان حافظ احسان کا زمانہ میر سے لگا کر غدر کے کچھ پہلے تک، گزرا ہے - زبان نے ہزاروں پلٹیاں کھائیں، پرانے الفاظ متروک ہوے، نئے داخل ہوے - ان کو بچپن ہی سے شعر کہنے کا شوق تھا، کچھ پرانے زمانے کے الفاظ بھی ان کے دیوان میں موجود ہیں -

اودی پوشاک عجب تم نے سجی واچھڑے جی اس بناؤ سے اجی قصد کہاں کیجئے کا

یہ غزل بہت پرانی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس کے بعض شعر ایسے ہیں کہ اس کو زبردستی کی ٹھونسم ٹھانس کہا جاسکتا ہے اور یہ بات ان کے آخری زمانے کی غزلوں میں نہیں ہے -

رخ نہ پھیروں کا ترے کہنے سے سن اے شہ حسن گر مجھے روبروے پیل دماں کیجئے کا
دشت پر خوف محبت میں کہاں جاے اماں مسکن اپنا دہن شیر زیاں کیجئے کا

ہم ہیں اور کوچہ یار جانی کا زور ہے زور ناتوانی کا

پہلے زمانے میں زور بمعنی بہت آتا تھا، غدر سے پہلے تک اس کا زور رہا، اب اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا - میر صاحب کہتے ہیں :

تا بمقدور، انتظار کیا دل نے اب زور بے قرار کیا

آنکھوں میں موج گریہ اسطرح سے رواں ہے پتھروں پہ جسطرح سے زنجیر کھینچتے ہیں

مضمون نہایت نفیس ہے، تشبیہہ بڑی پاکیزہ ہے، مگر پتھروں کی "ت" کو سکون کے ساتھ جس طرح استعمال کیا ہے وہ سودا اور میر کے زمانے کی زبان ہے -

شاید اسی زمانے کی یہ غزل ہو' سودا فرماتے ہیں :

سودا نکل نہ گھر سے کہ اب تجھ کو ڈھونڈتے
لڑکے پھرے ہیں پتھروں سے دامن بھرے ہوئے

مجنوں کے گرد لڑکے پتھرے لئے نہیں ہیں
تنہا یہ آج نکلا حشمت مآب کیونکر

میر کے زمانے میں پتھروں کی جگہ پتھرے بھی بولتے تھے' چنانچہ میر صاحب فرماتے ہیں :

لگوائے پتھرے اور برا بھی کہا کئے
تم نے حقوق دوستی کے سب ادا کئے

چشم تر' سوز جگر' آہ سحر' نالۂ شب
تیری دولت سے ہے ہر چیز مہیا مجھکو

"بدولت" اور "دولت" سے دونوں کے ایک ہی معنی ہیں' مگر اب "بدولت" برتا جاتا ہے' ذوق نے تو صرف " دولت ہی استعمال کیا ہے ۔

نہ دیکھ لی کیسی کیسی آفت جہاں میں ہم نے تمہارے باعث
اور آگے کیا کیا غم و الم ہم تمہاری دولت نہ دیکھ لیں گے

اگر احساں دل اپنا دے تو لے لیجے مبارک ہو
کسی سے کہا تو ہیں حضرت سلامت اپنا گھر دیکھو

گھر دیکھنا اب کوئی محاورہ نہیں ہے' اس زمانے میں ہوگا - یا تو اس کے معنی ہیں اپنے گھر کا رستہ لو یا یہ ہیں کہ اپنے فائدے پر نظر رکھو ۔

دلبر یہ وہ ہے جس نے دل کو دغا دیا ہے
اے چشم دیکھ' تجھکو میں نے سجھا دیا ہے

سررشتۂ وفا سے کیا شمع رو ہیں واقف
ہم نے پتنگ ان سے ملنا اُڑا دیا ہے

دغا کا لفظ غدر سے پہلے بھی مؤنث تھا ۔ مؤمن کا شعر ہے :

دیا علم و ہنر حسرت کشی کو
فلک نے مجھ سے یہ کیسی دغا کی

معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس سے بھی پہلے کا شعر ہے ۔

آشنا کس کے ہیں' بے دید ہیں یہ دیدۂ ودل (ق)
ہیں یہی دیدۂ و دانستہ ڈبانے والے

ان کے رونے پر ہنسی آتی ہے مجھکو' احساں'
دوڑے پانی کو ہیں کیا آگ لگانے والے

ڈبانے کا لفظ عامیانہ ہے' بول چال میں کبھی کبھی آجاتا ہے' مگر تحریر میں بہت کم دیکھا گیا ہے ۔ 'احسان' کے ابتدائی زمانے میں دیکھنا ہو تو جرأت کا یہ شعر دیکھ لو :

سمجھ کے دیکھا تو بھیجا تھا سب گلہ دل کا — کہ چشم نم نے ڈبویا معاملہ دل کا

ان کے آخر زمانے میں دیکھنا ہو تو غالب کا یہ شعر ملاحظہ ہو

کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر — اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھکو ڈبو آئے

بی نور کے روضے میں ہے مچلا ہوا بیٹھا (ق) سنتا ہی نہیں یہ دل مہجور کسو کی

میں سورۂ نور آج ہی بی نور کو بخشوں — گر آئے نظر صورت پر نور کسو کی

پوری غزل کی غزل ہے، جس کی ردیف "کسو کی" ہے۔ بی نور کا روضہ قطب کے راستے میں ہے، بی نور حضرت نظام الدین اولیا (رح) کی والدہ تھیں۔

انگریزی حکومت کا اثر

لارڈ لیک کے دهلی فتح کرنے کے بعد بس قلعہ ہی قلعہ بادشاہ کے قبضے میں رہ گیا تھا، سارے شہر میں کمپنی کی حکومت تھی، انگریز آکر بس گئے تھے، اس طرح انگریزی کے بہت سے الفاظ لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے۔ اس زمانے کے اکثر شاعروں نے یہ الفاظ اپنے ہاں باندھے ہیں۔ اس ہوا سے 'احسان' بھی نہ بچ سکے اور کیسے بچتے؛ ان کا دوستانہ برکت علی خاں 'برکت' خیر آبادی سے بہت تھا، ان کی غزلوں پر غزلیں کہتے تھے، ان کے مصرعوں کی تضمین کرتے تھے۔ چنانچہ برکت کا شعر ہے:

اشکوں کو بہا دیدۂ گریاں سمجھ کر — گھبرائے نہ عالم کہیں طوفاں سمجھ کر

احسان پہلے مصرعے پر یوں گرہ لگاتے ہیں:

احساں کہا مان تو 'برکت' کی طرح سے — اشکوں کو بہا دیدۂ گریاں سمجھ کر

ایک قطعے میں لکھتے ہیں:

جا کے اس در پہ یہ احساں نے کہا بندہ نواز — کھول دروازے کو، آ اپنے گرفتار سے مل

اُس نے جب در کو نہ کھولا تو وہ برکت کی طرح — خوب جی کھول کے رویا در و دیوار سے مل

یہ میاں برکت نصیر الدولہ جرنل اختر لونی کے پیشکار اور دست راست تھے۔ انہی کے ذریعے سے 'احسان' جرنل اختر لونی سے بھی ملے۔ اسی میل جول میں اگر انگریزی کے کچھ الفاظ زبان پر چڑھ گئے ہوں تو کیا تعجب ہے۔

کلکتے میں الفت کا گورنر ہے سدا عشق — آمادہ ہو تو رستم دستاں سمجھ کر
مچھر نے جلوں کے ہے یہ تیار کی پلٹن — ہاں دیکھ صف خار مغیلاں سمجھ کر
جرنیل تو صحرا میں ہے اور کوہ میں کرنیل — ہے شہر میں چھوڑا مجھے کپتان سمجھ کر

شیخ سے بولا خفا ہوکر وہ یوں شوخ فرنگ — ول نہ ہم بیٹھے کا ایسے پاگل اور لوفر کے پاس
غائب ہے جب سے چشم سے وہ اعہت فرنگ — واقف نہ حاضری سے نہ ہرگز تنفن سے ہم

قلق کی ہجو میں لکھتے ہیں:

قلق ابن قلندر ناسی — ایک بو گر ہے ایک گداسی

پنسلیں نکل آئی تھیں، ہر شاعر مختلف پہلو سے ان کو باندھتا تھا۔ ذوق لکھتے ہیں:

خط جو اس نے قلم سرمہ سے لکھا ہم کو — لکھا ایماے خموشی ہے یہ گویا ہم کو

'احسان' اس کا دوسرا پہلو لیکر لکھتے ہیں:

'احسان' برنگ خامۂ اہل فرنگ ہاں — محتاج توتیا مژۂ نو خطاں نہیں

انگریزی عملداری ہوئی، مجرموں کو قید کی سزا دی جاتی تھی، قیدیوں سے سڑکیں بنوائی جاتی تھیں، برقنداز نگرانی کرتے تھے، انھوں نے یہ رنگ دیکھا نیا مضمون ہاتھ آگیا، باندھ گئے۔

دل عشاق سدا زلفوں کی زنجیر میں ہے — اور نگہبان، نگاہ بت عیار مدام
مانگ کی راہ کو یہ حکم ہے یوں صاف رکھیں — جوں بناتے ہیں سڑک آ کے گنہگار مدام

احسان کا معشوق

مجھے ان کے دیوان میں ان کا معشوق سب سے زیادہ پسند آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کا جوش نہیں رہا تھا۔ اس لئے آخر زمانے کی غزلوں میں معشوق کی وہ وہ خبر لی ہے کہ خدا کی پناہ، ایسا ڈانٹتا ہے کہ کوئی نوکر کو بھی کیا ڈانٹے گا۔ ہر جگہ طعن کرتے ہیں کہ میاں تم تو روپیے پر مرتے ہو، ہم غریبوں کی طرف کیوں دیکھنے لگے۔ ذرا معشوق سے ان کی تو تکار دیکھئے، فرماتے ہیں:

جوں نکہۂ زر ہم کو گلے تک نہ لگا یا   جب سیمبروں نے ہمیں زردار نہ پایا
یہ بے زری ہی عجب بد بلا ہے سیمبرو   تمہاری آنکھوں میں اسلئے مجھے دکھیرکیا
کب تلک تجھسے کہوں یار نہ اغیار سے مل   تجھکو ہی شرم نہیں تو مری پیزار سے مل
گر وفا چاہئے تو ہم سے وفادار سے مل   زر ہے در کار تو جاکر کسی زردار سے مل

کسی کے معشوق کے چہرے پر داد نہ ہوا ہوگا، ہوا تو حافظ جیو کے معشوق کے ہوا
چہرے پر آپ کے بیوجہ نہیں داد ہوا   داد دو میری کہ یہ باعث بیداد ہوا

داد کا لفظ ایک جگہ میں نے اور دیکھا ہے ' داغ کے مرنے کے بعد مرزا خدا داد بیگ مرحوم نے اعلیٰ حضرت غفران مکان کے پاس مثنوی "گل و صنوبر" پیش کی تھی اس کے آخر میں لکھا تھا :

ہے داغ کی جا خدا داد خالی   ہو داد کے نام پر بحالی

اور دیکھئے کیاکھری کھری سناتے ہیں' معشوق کو ظالم سبھی کہتے ہیں' قصائی کوئی نہیں کہتا ' انھوں نے قصائی بنانے میں بھی کمی نہیں کی :

ہر دم نہ گلے کاٹ غریبوں کے ستمگر   تو اپنے تئیں شہر میں قصاب نہ ٹھیرا
جب چھری پھیری غریبوں پر تو کیا نواب ہو   ہم تو منہہ پر یہ کہینگے تم بڑے قصاب ہو

دیکھئے کا معشوق کو کس زور سے ڈانٹتے ہیں :

کیوں بولتے ہو ہو کے طرحدار بیطرح   میں ایک طرح کاہوں نہ کہو یا ربیطرح
اگرچہ خلق کے چرچے سے منہہ دکھا نہ سکے   تڑکا تھا حلق کہ آواز بھی سنا نہ سکے

معشوق بھی کچھ دبیل نہ تھا ' وہ کب چپ رہنے والا تھا :

بوسہ مانگا ہم نے دھمکا کر تو یوں کہنے لگا   اے تو دھمکی سے تمہارے کیوں نہ ہم ڈر جائینگے

معشوق کو ایک قطعے میں بگڑ بگڑ کر سمجھاتے ہیں :

اچھے نہ لیجو تو میں اک بات کروں عرض   تم تو ہو بولے کیو نکہ کہیں تم کو برا ہم
سمجھا چکے تم ہم کو ولے ہم ہی نہ سمجھے   ویسی ہی گرفتاری میں رہتے ہیں سدا ہم
کوچے میں ہمارے ہی تو بیٹھے ہیں ہمیشہ   ہم ہی تو سدا رکھتے ہیں واں سجدے با ہم

القصہ یہ قصہ تو نہیں ، قصہ کوتاہ کچھ اور نہیں سمجھے ہیں یہاں اسکے سوا ہم
اغیار کا ملنا نہ ہوا ہم کو سزاوار جو ہم نے کیا پاتے ہیں اب اسکی سزا ہم
منہ میری طرف گھورتے بس بہر ہی رکھئے مردم کو ذرا چاہئے آنکھوں میں حیا ہم

ہاں صاحب ، بات یہ ہے کہ معشوق ایسے ہی عاشقوں سے دبتے ہیں ، جنھوں نے پہلے تو خوشامد درآمد کی ، نہ مانا تو ڈانٹ دیا ۔

جب کسی نے کہا مرتا ہے تمھارا عاشق تم جو چاہتے ہو تو آجاے وہ جینے کے قریب
کوٹ کر سینے کو ایک ناز سے بولے ، ہے ہے کس کی کمبختی جو بیٹھے وہ کمینے کے قریب

شاید ہی کسی عاشق نے اپنے معشوق کے سر میں جوئیں ڈالی ہوں ، یہ 'احسان' کا معشوق ہے ، اس کے سر میں جوئیں کیوں نہ پڑینگی ، لکھتے ہیں :

خدا سارے جوں کی طرح کیوں دل نزار کو آج جوئیں لگی ہیں تری زلف تابدار کو آج

جوئیں لگنا پرانا محاورہ ہے ، اب سر میں جوئیں پڑ نا کہتے ہیں ۔

اس سے بھی زیادہ تیز سنئے ، اس شعر میں تو یار پر لعنت ہی بھیجی ہے :

پونچھے منہ تو اور مل اغیار سے رنگ منہ کا اڑگیا پھٹکار سے

شوخی اور مذاق

'احسان' کے کلام میں شوخی بھی ہے اور مذاق بھی ۔ بعض جگہ یہ مذاق بہت لطیف ہے اور بعض جگہ رکیک ۔ دونوں طرح کی مثالیں لکھتا ہوں ، کیا اچھی غزل ہے :

بس ترے آتے ہی مجکو چین سا کچھ آگیا اب وہ بیچینی ، وہ بیتابی ، وہ بیحالی نہیں
دو ہی دن کے عشق میں احسان یہ صورت بن گئی منہ پہ وہ رونق نہیں ، چہرے پہ وہ لالی نہیں

اس غزل میں شیخ جی پر حملہ کرتے ہیں ۔ شاید شیخ جی ادھار پی گئے تھے ، رند اس کی عوض ان کا عمامہ لینے آے ہیں ۔ قطعہ ہے :

شیخ اپنی گفتگو سے قلتبان بنتا ہے آپ ورنہ اپنی طبع مائل سوے ہزالی نہیں
رند عمامہ طلب کرتے ہیں وہ خانہ خراب گھر سے باہر آن کر کہتا ہے گھر والی نہیں

اس قطعے میں شیخ جی پر کئی پہلووں سے حملہ کیا ہے ۔ ایک یہ کہ اس کا

عمامہ بھی جورو کے قبضے میں رہتا ہے، دوسرے یہ کہ بیوی کا دوپٹہ ان کے عمامے کے کام آتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان کی زوجہ بغیر ان کی اجازت کے جہاں چاہے نکل جاتی ہے اور ان کو خبر تک نہیں ہوتی کہ وہ گھر میں ہے یا کہیں با ہر گئی ہوئی ہے:

کیا شیخ جی کی جورو رہتی ہے کشمکش میں گاہے وہ کھینچتا ہے، گہ پیر کھینچتے ہیں

اس شعر میں شیخ کے ساتھ ان کے پیر کو بھی لے مرے ہیں:

نچھوڑ زوجۂ شیخ اب تو شیخ کا اخلاص اگرچہ پیر ہے، پر ہے مرید باا خلاص

پیر کے یہاں دو پہلو ہیں، ایک تو یہ کہ واقعی پیری مریدی کرتا ہے دوسرے یہ کہ بڈھا ہے اور بڈھے ہمیشہ زن مرید ہوتے ہیں۔

اب شیخ جی کو خطاب دینا رہ گیا تھا، وہ ہولی کے زمانے میں پورا ہو گیا۔ پھاگن کا مہینہ ہے، موسم اعتدال پر ہے، لوگ ہولی منا رہے ہیں، نظیر اکبرآبادی کہتے ہیں:

ہر آن خوشی میں آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں
رخسار گلالوں سے گلگوں، کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ راگ اور رنگ جھمکتے ہیں کچھ مے کے جام چھلکتے ہیں
کچھ کودے ہیں، کچھ اچھلے ہیں، کچھ ہنستے ہیں، کچھ بکتے ہیں
ہر طور یہ نقشہ عشرت کا ہر آن دکھایا ہولی نے

بھلا ایسے موقعے پر نئے سال کے خطابوں کی طرح شیخ جی کو کیوں خطاب نہ ملے اور لوگ بھی اس خطاب سے سرفراز ہو چکے ہیں۔ چنانچہ نظیر کہتا ہے:

بیٹھے ہیں سب آپس میں نہیں ایک بھی کڑوا پچکاری اٹھاکر کوئی جھمکاوے ہے کھڑوا
بھرتے ہیں کہیں مشک کہیں رنگ کاگڑوا کیا شادوہ ہوتا ہے جسے کہتے ہیں بھڑوا

سنتے ہیں یہاں تک نہیں اب تنگ زمیں پر — ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

جب دوسرے اس خطاب سے برا نہیں مانتے تو بھلا شیخ جی کیوں برا مانیں۔
احسان نے شیخ جی کو خطاب دیا ہے، مگر کنایے ہی کنایے میں دیا ہے :

نہ جاؤ شیخ جی، آؤ قریب ہے ہولی — خفا نہ ہو کہ چلے آتے ہیں خطاب کے دن
کیوں ہم سے ہو بگڑتے، ہم نے تو شیخ صاحب — ہولی سے پیشتر ہی تم کو بنا دیا ہے

اس کے بعد شیخ صاحب کو چھوڑکر محتسب کے پیچھے پڑتے ہیں :

جب جوانوں سے مدد پیر مغاں نے چاہی — لے کے رندوں کو وہیں ہم بہ تجمل پہنچے
محتسب کے سر نا پاک پہ رکھوا خم مے — اس طرح سے در میخانہ پہ ہم گل پہنچے
یہاں تلک محتسب شہر ہے لرزاں اب تو — رند کشمیر میں ہوویں تو وہ کابل پہنچے

سبحان اللہ کیا قطعہ ہے داد دیجئے گا :

پکڑ لیا مجھے ہمراہ دختر رز آج — شتاب آؤ کہ یہ محتسب ستا نہ سکے
یہ کہدو پیر مغاں سے یہی ہے وقت مدد — وہاں چھڑا چکے، دنیا میں جب چھڑا نہ سکے

محتسب کا خطاب ملاحظہ ہو :

نہ میکدے میں کرو ذکر محتسب رندو! — خدا نہ وہ شتر بے مہار دکھلاوے

یہ دو خطاب سن چکے، اب زاہد کا خطاب بھی سن لیجئے :

زاہدا دل میں نہ رکھ زہد ریائی کا خیال — کیوں تو اے کاردی مسجد میں آدھا باندھے
کوچے میں تیرے کانچ خرد سب اٹھا چلے — کعبے میں زاہد آے تو سر کو منڈا چلے

اس سے بھی تیز سنئے :

زاہد آیا تو، گوارا نہیں رندو ہم کو — اپنی اس بزم میں مکار اٹھے اور بیٹھے
دونوں کانوں کو پکڑ کر، یہ سزا ہے اس کی — کہہ دو سو بار یہ عیار اٹھے اور بیٹھے

ذرا مقطع ملاحظہ ہو، کیا خوب کہا ہے :

بیٹھتے اٹھتے اسی طرح کی لکھہ اور غزل — جس میں احسان نہ ہو، بے کار اٹھے اور بیٹھے

قاضی رہ گئے، وہ کیوں خالی ہاتھ جائیں، ان کو بھی دو دو سنا دیں :

قاضی سے گلگوں کی حرمت ہے کتابوں میں   لیکن بڑی دقت ہے رشوت کا پچا جانا

محتسب اور زاہد پر تو سب ہی آوازے کستے ہیں' ہاں ملا کو اب تک کسی نے نہیں لپیٹا تھا ' اس پر انھوں نے ہاتھ صاف کیا :

سفارش مری یہ ہے پیر مغاں سے   کوئی ساغر مل تو ملّا کو بخشو

شوخی | شوخی کی مثالیں ان کے ہاں بہت ہیں - چار پانچ لکھے دیتا ہوں :

چھیڑ تو دیکھو' سناکر مجھ کو' غیروں سے کہا   آج عاشق ہم کو صدقے کے لئے درکار ہیں

کہتے ہو کیا رقیب کو بھیجوں بتا صلاح   لعنت ہی بھیجئے گا یزید لعین کو

بعد مردن دیکھکر مجھکو' جھجک کر یوں کہا   میں یہ ڈرتا ہوں مبادا اب بھی عیاری کرے

مجھکو مسجد سے نکالا تو بس اب لے یہ ثواب   زاہدا تو ہی بتا خانہ خمار مجھے

اور یہ قطعہ بھی ملاحظہ فرمائیے' نیا رنگ ہے :

شعر یہ کندہ تھا اس شیریں بیاں کی قبر پر (ق) خوب روئے دیکھکر فرہاد کی تربت کو ہم

اہ واہ اے بادشاہ عشق تیری منصفی   راحت اوروں کے لئے خدمت کو ہم محنت کو ہم

اس کے مقابلے میں یہ شعر دیکھئے کیا رکیک مضمون ہے :

جب زرہ تن پر سجی 'ہاتوں میں دستانے لگے   دیکھکر یاروں کی سج غیروں کو دہشت آنے لگے

دیکھ کر چاک جیب عاشق کو   یہ لگے کہنے وہ بہ عیاری

ان دنوں خیر سے ہے پھر 'احسان'   جیب کتروں کی گرم بازاری

ایک قطعہ لکھتا ہوں' ذرا سمجھنا مشکل ہے' ایک کہانی کی طرف اشارہ ہے - پہلے قطعہ لکھتا ہوں' بعد میں قصہ بیان کروں گا -

سن کے وصف اس کی چشم کا نرگس   رشک سے بولی: میں نہ کوئی تھی

بھو لگی کہنے چشم باغ ہوں میں ختم مجھ پر ہے جونکوئی تھی
ہے بجنسہ مثل یہ نرگس کی سب تو بوئے تھے میں نہ بوئی تھی

بچوں کی کہانی تھی، مثل ہوگئی - کہانی یہ ہے کہ ایک تھے میاں توتلے، ان کی بیوی بھی توتلی اور بیٹا بھی توتلا - شادی جو ہوئی تو خیر سے بہو بھی توتلی آئیں - سسرال جاتے وقت ماں نے بیٹی سے کہا : دیکھو سسرال میں زیادہ نہ بولیو، نہیں تو تیری توتلی زبان پر ہنسی اُڑے گی - تھوڑے دنوں تو یہ منہ سے نہ بولیں - ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ شام کو سسرے آے، کیا دیکھتے ہیں کہ گھر میں اندھیرا گھپ ہے، کہنے لگے "ڈیوا ٹوں نہیں ڈلایا" - (دیوا کیوں نہیں جلایا) بیوی نے جواب دیا "ٹوھا بٹی لے ڈیا" (چوھا بتی لے گیا) بیٹے صاحب بولے : ٹل بھی ٹو لے ڈیا ٹھا (کل بھی تو لے گیا تھا) بولا اتنی باتیں سن کر بہو سے کہاں رہا جاتا تھا، یہ سوچ کر کہ اچھا ہوا میں نے کچھ نہیں کہا نہیں تو میرا بھی توتلا پن کھل جاتا، کہنے لگیں "سب بوئے میں نہ بوئی" (سب بولے میں نہ بولی) معلوم ہوتا ہے بڑے میاں نے بچوں کو یہ کہانی کہتے سنا تھا، مضمون دھیان میں آگیا، قطعہ لکھ مارا - یہ مثل اس وقت بولی جاتی ہے جب کسی کی بے تکی باتوں کا مذاق اُڑانا ہوتا ہے —

ھجویں احسان کے ہاں ھجویں جس مزے کی ہیں، سودا کے سوا شاید ہی کسی کے ہاں ہوں گی - بعض تو ایسی ہیں کہ ذرا تہذیب سے گرگئی ہیں، مگر بعض میں صرف چٹکیاں لے کر چھوڑ دیا ہے - جی میں تو آتا ہے کہ سب لکھدوں مگر ہوائی قانون سے ڈر لگتا ہے، کہیں مقدمہ قائم نہ ہوجاے - خیر کچھ نہ کچھ تو ضرور لکھوں گا - ہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑے گا - نواب ظفرالدولہ کا قطعہ کہیں اوپر لکھ آیا ہوں، کیا نازک چوٹ کی ہے :

بساں آئینہ، آئیں اپنا رکھتا ہوں میں صاف گو ہوں، نہیں آتی مجھکو مکاری
تو گل ہے گلشن دربار بادشاہی کا ولے جو غنچہ زباں در تہ زباں داری

ایک حکیم صاحب کے متعلق فرماتے ہیں :

ہیں ایک حکیم جی بشکل طاءون　　ہے رقص تقیہ ' بغل ان کا قانون
پڑھتےہیں نفیسی اور خود ہیں وہ کثیف　　نسخے ہیں عجیب اور تحفہ معجون

کوئی صاحب بندو نامی تھے ' تخلص قلق تھا اور قلندر شاہ کے بیٹے تھے ' خبر نہیں میاں احسان سے کیا گستاخی کر بیٹھے ' جو انہوں نے ایسی لمبی چوڑی ہجو لکھ ماری ہے :

فکر میرا ہے آسماں پر واز　　لا مکاں سیر ولا مکاں پرواز
مجھ سے اُڑ کر عدو کہاں جائے　　جس جگہ جاے جوتیاں کھائے
شہرہ اپنا عدو کو ہے منظور　　چل قلم نام اس کا کر مشہور
آپ جنجال میں پڑا وہ پلید　　ریسمانے برائے خود تا بید
ہجو میری زباں پہ آنے لگی　　روح سودا کی تھر تھرانے لگی
قلق ابن قلندر نامی　　ایک بوگر ہے ' ایک کتا می
ایک مچھندر ہے شہر کے اندر　　ہے قلندر کے گھر میں وہ بندر
نام بندو ہے اسم زن بندی　　وہ تو خندہ ہے اور یہ خندی
میر خاں کا ہے شہر میں بازار　　جوتیاں گانٹھتا ہے وہاں یہ چمار

(اس کے بعد کا شعر نہیں لکھتا)

قطعہ

حکم انگریز ہے کہ سگ ہیں پلید　　ایک رہوے نہ مثل نسل یزید
کنجروں کو عجب دیا پٹا　　شہر میں وہ کیا ہے یہ کتا
کیا قلم ہاتھ سے اپنے ڈالوں　　تیرے استاد کو بھی لے ڈالوں
ہجو کیا کہہ کے میں اسے دوں کل　　پاپگل ہے وہ آپ ہی پاگل
عیب پوشی تہاے مردانست　　خشم خوردن غذاے مردانست

نہ پسند آے اس کو کو سری بات　　خر چہ داند بہاے قند و نبات
قدر ے میری کب عدو کو خبر　　قدر عیسے کجا بدا ند خر

میں دعا دوں اسے بصدق و یقین　　میری خاطر سے سب کہو آمین
رہوے یارب قلق میں وہ ابلیس　　جب تلک ہیں قلق کے دو سو تیس

آپ نے دیکھا ' اردو ' فارسی ' انگریزی سب زبانوں میں گالیاں دی ہیں - پرانے زمانے کے بڈھوں کے منہ پر انگریزی کے یہ دو الفاظ ' بوگر ' اور ' ڈیڈامی ' بہت چڑھے ہوے تھے ' ڈیڈامی کی دوسری شکل ان کے ہاں ' ڈیڈا میر ' بھی تھی - مجھے اس کے ظاہر کرنے کی تو ضرورت نہیں کہ بوگر بگر کی اور ڈیڈامی گو ' ڈیم ' یو " کی بگڑی ہوئی صورت ہے 'اس بات کی تو آپ بھی داد دینگے کہ دعا ایسی خوبصورتی سے دی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی —

دہلی کی دیوانی کی کچہری میں کوئی صاحب محمد بیگ صیغۂ لا وارثی کے حاکم تھے ' ان کی ہجو کرتے ہیں :

کسی نے پوچھا یہہ شیطاں سے ہاں اے لعیں سچ کہہ
جو تو مر جاے شاید ' کون ہے تیرا پتا وارث
لگا کہنے کچہری میں دیوانی کے ہے دلی میں
مرا سالا مرا وارث ' محمد بیگ لا وارث

مجھے ان کے ہاں اگر کوئی ہجو پسند آئی تو وہ الٰہی بخش خاں 'معروف' کی ہے دونوں میں بڑا دوستانہ تھا ' یہاں تک کہ جب بعض شعرا کی بیہودہ گیوں سے 'معروف' نے شعر کہنا چھوڑ دیا تو اس پر 'احسان' نے نواب صاحب کو ایک قطعہ لکھہ کر بھیجا - پہلے وہ لکھتا ہوں ' کسی قدر دلکش ہے' مگر اس سے 'احسان' کی شاعری کا یہ رخ بھی ظاہر ہو جاے گا ۔ اس کے بعد وہ ہجو لکھوں گا -

صبا تو کہیو آہنگ خدمت ' معروف' 　یہ اس سے کہیو کہ اے عندلیب خوش آہنگ

تورنج شورش زا فاں سے اس گلستاں میں نہ کبھو ترک ترنم کا ایک شب آهنگ
وہ شہسوار ہے تو عرصۂ فصاحت کا مقر ہیں اہل صفاہاں و روم و ہند و فرنگ
عناں اشہب معنی ہے تیرے کف میں سدا صدائے سگ سے نہو نا تو زینہار بتنگ
ہر آنکہ خاطر تو بے سبب برنجانند زقعر ہفت زمیں تاباوج ہفت اورنگ
ز ترک تاز در خانۂ تناسل او شکستہ باد بگوپال قاضی کیرنگ

قاضی کیرنگ کا حال معلوم کرنا ہے تو 'انوری' کی ہجویں دیکھئے - ہاں '
تو اب وہ ہجو ملاحظہ ہو - ہجو نہیں ہے ' چٹکی لی ہے اور ایسی چٹکی لی ہے کہ
نواب الہی بخش خاں کو بھی مزا آگیا ہوگا - ایسی خوبصورت ہجو شاید ہی آپ کی
نظر سے گزری ہو ' شاعر نے پہلے ساری برائیاں اپنے اوپر لیں اور پھر سب کی سب
نواب الہی بخش خاں ' معروف ' پر اُلٹ دیں - شاید یہ تو مجھے بتانے کی ضرورت
نہیں کہ معروف ریاست چھوڑ فقیر ہو گئے تھے ' قطعے کے آخری شعر میں اسی طرف
اشارہ ہے :

تلوّن ' زود رنجی ' بد مزاجی یہ خو تیری مجھے احساں نہ بھائی
نہ ہو تو بحرالفت کا شناور جو تیرا تو تو تو ہی سب خدائی
جہاں میں وہ ہوا ہے تو بھی معروف جہاں جائیگا ' با ایں بیوفائی
کہیگی خلق یہ دیکھو وہ آیا الہی بخش خانصاحب کا بھائی
الہی بخشیو مجھکو کہ غیبت زباں پر میری نادانی سے آئی
الہی بخش خاں سے کسکو نسبت نثار فقر چتر بادشاہی

ہم مضموں اشعار

حضرت امیر خسرو (رح) کے اس شعر سے خدا معلوم کتنے شاعروں
نے مضمون لیا ہے ' مگر بڑھنا تو کیا کوئی برابر بھی
نہ پہنچ سکا :

ناخدائے کشتی ما گر نباشد گو مباش ما خدا داریم ما را ناخدا درکار نیست

انھوں نے تو یہ کہا کہ اگر ناخدا نہ آئے تو بلا سے نہ آئے' ہمیں اس کی ضرورت ہی نہیں' خدا ہمارا ناخدا ہے۔ احسان نے اس پر ایک اور اضافہ کیا' ان کی کشتی میں ناخدا ہے' وہ خدا کے بھروسے پر اس کو نکال رہے ہیں۔ کہتے ہیں:

خدا خود ہے مری کشتی کا حافظ   خدا کے واسطے اے ناخدا جا!

شاہ مبارک 'آبرو' کا ایک شعر ہے:

جہاں اس خو کی گرمی تھی' نہ تھی وہاں آگ کو عزت
مقابل اس کے ہوجاتی' تو آتش لکڑیاں کھاتی

'آزاد' مرحوم نے اس شعر کا مقابلہ حافظ عبدالرحمٰن خاں 'احسان' کے ایک شعر سے کرکے 'احسان' کی بہت تعریف کی ہے' وہ شعر یہ ہے:

دخت رز سے کہا میخانے میں شب رندوں نے   آج تو خوب ہی ختکے تری سوکن کو لگے

یہاں تک تو ٹھیک تھا' مگر 'احسان' کے شعر کے جو معنی کئے ہیں وہ ذرا قابل غور ہیں۔ فرماتے ہیں: "بھنگر خانے میں بھنگروں نے خوب سبزیاں گھونٹیں اور طرے اڑائے۔ تم بھی یاروں پر نظر عنایت کرو"۔ میری رائے میں اس شعر کے یہ معنی ہیں کہ رندوں نے دخت رز کو یہ خوش خبری آکر سنائی کہ تیری سوکن یعنی بھنگ کی آج بڑی ٹھکائی ہوئی۔ (ختکے لگنے کے معنی لکڑی سے پٹنے کے ہیں اور بھنگ بھی چونکہ سونٹے سے گھونٹی جاتی ہے' اس لئے اس کو ختکے لگنے سے تعبیر کیا ہے)۔ یہ خبر سنا کر رند منہ سے تو کچھ نہیں کہتے مگر انہیں یقین ہے کہ سوکن کے پٹنے کی خبر سن کر دخت رز ضرور خوش ہوگی اور ان کو شاد کام کریگی —

خیر یہ تو میں نے 'احسان' کا وہ شعر نقل کردیا جو 'آزاد' مرحوم نے آبحیات میں لکھا تھا' مگر دیوان میں یہ شعر قطعہ بند ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے محض اپنی یاد پر اس کو کچھ الٹ پلٹ کر لکھ دیا ہے۔ اصل میں قطعہ یوں ہے:

دخت رز کہتی ہے' سبزی مجھے لگتی ہے زہر   ہائے تم چاہنے اس سوت کو بیرن کو لگے
ساقیا اس کی تسلی ہے بہرکیف' یہ کہہ   پس گئی' ایسے ہیں ختکے تری سوکن کو لگے

اس غزل میں ایک شعر کیا اچھا ہے ' بے موقع سہی مگر سن لیجئے :

تیری دولت سے ہے جو روگ لگا دل کو مرے   ارے دشمن ' کسی دشمن کے نہ دشمن کو لگے

" خدا کے گھر سے پھرنے" کے محاورے کو ' احسان ' اور ذوق دونوں نے باندھا ہے اور خوب باندھا ہے —

ذوق : گر اب کے پھرے جیتے وہ کعبے کے سفر سے
تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

احسان : جو کوئی جان بچا کر تمہارے در سے پھرا
یہ جانتا ہوں مرے جاں خدا کے گھر سے پھرا

ذوق کے ہاں کعبے کے لفظ نے شعر میں جان ڈال دی ہے ' کیونکہ وہ تو خدا کا گھر ہے ہی ۔ مگر احسان نے یہ کمال کیا ہے کہ دریار کو خدا کا گھر بنا دیا ہے اور اس سے شعر کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے —

اسی طرح ذوق کا ایک شعر ہے :

مرے حسن عمل سے معصیت بھی عار کرتی ہے   مری توبہ سے توبہ ' توبہ استغفار کرتی ہے

اس مضمون کے ' احسان ' کے ہاں کئی شعر ہیں ' ایک شعر تو ایسا ہے کہ لا جواب ہے :

توبہ اس توبہ سے اکدم نہ نبا ہی توبہ   میری توبہ ہے وہ توبہ کہ الٰہی توبہ

کیا مری توبہ ہے توبہ کیجئے اس توبہ سے
توبہ بھی توبہ سے مری پڑھتی استغفار ہے
مے سے میں توبہ کروں استغفر اللہ سب غلط
نام توبہ سے سدا ہم پڑھتے استغفار ہیں

کیا تعجب ہے کہ اکبر الہ آبادی نے اپنا یہ مضمون کہ :—

" دب گئی آخر مسلمانی مری پتلون سے "

حضرت احسان سے لیا ہو، ان کا شعر ہے :

ڈھب پہ اس بد کیش کو لایا ہی تھا پر کیا کروں ڈر گیا طرز مسلمانی وہ کافر دیکھ کر

اکبر کا ایک بڑا مشہور شعر ہے :

ڈاڑھی موچھوں کا سب صفایا ہے فارغ البال ان کو کہتے ہیں

انھی معنوں میں فارغ البال کا لفظ 'احسان' نے بھی استعمال کیا ہے:

خواب میں بوی دل خیال زلف سے خالی نہیں

جب سے دیکھے بال تیرے فارغ البالی نہیں

احسان اور غالب کا ایک ہی زمانہ تھا، اس لئے کہیں کہیں احسان اور غالب کا رنگ مل گیا ہے۔ اس شعر میں احسان کی جگہ غالب رکھ دو دیکھوں تو کون پہچان سکتا ہے۔ غالب کا رنگ ہی نہیں، غالب کے الفاظ ہیں اور غالب ہی کا طرز ادا ۔

نام عنقا سے مجھے رشک ہے آتا احسان شہرۂ نام کو کیوں اہل فنا نے چاہا

بعض جگہ ذوق کا رنگ ایسا آگیا ہے کہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے، مجھے تو ان شعروں پر شبہ ہوا تھا کہ ذوق کے ہیں۔ تمام دیوان ڈھونڈ مارا، جب اس میں نہ ملے اس وقت کہیں جاکر اطمینان ہوا کہ احسان ہی کے ہونگے :

شب عجب تھی تاب جگنو کی کہ جسکے سامنے ماہ عالم تاب بھی ایک کرمک شب تاب تھا

میں جو مے پینے پہ آؤں تو سبو پی جاؤں گر محتسب منع کرے اسکا لہو پی جاؤں

کھٹے کیا کیوں طفل اشک اپنے گلے کا ہار ہیں اس زمانے کے تو چھوکرے ہی ناہموار ہیں

اس شعر کو دیکھئے، انشا کا کلام معلوم ہوتا ہے، وہی شوخی ہے وہی چہل اور وہی الفاظ :

گھر سے کسطرح سے یوں حضرت منعم نکلیں دی نہ بو بو نے اجازت نہ ددا نے چاہا

مومن کا رنگ دیکھو :

گرد دل، احسان، ہم، معشوق وسے صد آفریں پیرومرشد واہ یہ بدعت خدا کے گھر کے پاس

کیا احسان کے اس شعر کو دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ میر کا نہیں ہے :

ہم ساتھ ہوا گلی سے تیری اک آے تھے اور دو گئے ہم

ہمطرح غزلیں | احسان نے اتنی بڑی عمر پائی کہ میر سے لگا کر ذوق تک کا زمانہ ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا - ان سے کوئی مشاعرہ نہیں چھوٹتا تھا - ممکن نہیں کہ طرح کی غزلیں نہ کہی ہوں ' مگر ان کا دیوان دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ میر ' جرات ' انشا ' مصحفی' نصیر ' غالب ' مومن ' اور ذوق کی غزلوں پر ان کی صرف ایک ایک دو دو غزلیں ہیں' بلکہ دیوان دیکھنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے جان کر پہلو بچایا ہے ' کہیں ردیف بدلدی ہے ' کہیں قافیہ بدل دیا ہے' ذوق اور یہ تو ایک دوسرے کے مدمقابل تھے ' یقین ہے کہ دونوں نے اس کا التزام رکھا ہو کہ ایک ہی طرح میں دونوں کی غزلیں نہ ہوں اور اگر ہوں بھی تو ایک کا قافیہ دوسرے کے ہاں حتی المقدور نہ آے تاکہ مقابلے سے کسی کی استادی پر حرف نہ آ سکے —

ذوق کی ایک غزل ہے :

ہے جی میں اپنے غرہ جو ہر کو توڑدوں آئینۂ خیال مکدر کو توڑ دوں

اس کے کل ۱۲ شعر ہیں '' احسان' نے اسی زمین میں ۳۴ شعروں کا دو غزلہ لکھا ہے۔ مقابلتاً صرف وہ اشعار لکھ دیتا ہوں جن کے قافیے ایک ہیں۔ آگے چل کر صرف ایک غزل میں ان دونوں استادوں کے اشعار کے متعلق اپنی راے ظاہر کروں گا' بقیہ کے بارے میں آپ خود فیصلہ کر لیجئے :

ذوق : دنیا سے میں اگر دل مضطر کو توڑ دوں
سارے خیال وہم مکدر کو توڑ دوں

احسان: کیوں تار گریۂ دل مضطر کو توڑ دوں
گوہر کو توڑوں رشتۂ گوہر کو توڑ دوں

ذوق: میں کاٹ دوں پہاڑ کو پتھر کو توڑ دوں
پر کیوں کہ غیر سے بت کافر کو توڑ دوں

احسان: وہ آگ اور وہ آب ہوں، پتھر کو توڑ دوں
پر بس نہیں کہ میں دل کافر کو توڑ دوں

ذوق: نازک کلامیاں مری توڑیں عدو کا دل
میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں

احسان: دل میں ہے اب کے ایسی غزل گرم میں کہوں
پتھر کا دل جو اس کا ہو پتھر کو توڑ دوں

ذوق کا یہ شعر بیت‌الغزل ہے:

احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا کشتی خدا پہ چھوڑ دوں، لنگر کو توڑ دوں

اور احسان کا یہ قطعہ بہت مزے کا ہے۔

گر ذکر بحر رحمت حق حشر میں کروں کوہ گناہ ہر صف محشر کو توڑ دوں
از بہر تشنگان قیامت بہر طرف تسنیم و سلسبیل کو، کوثر کو، توڑ دوں

یہ شعر بھی اچھا ہے:

مسجد میں یاد آئے جو نام خدا وہ بت سر پٹکوں اس طرح سے کہ منبر کو توڑ دوں

ذوق کی ایک اور سات شعر کی غزل ہے:

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے یہ نصیب اللہ‌اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اس زمین میں احسان کی ۲۴ شعروں کی دو غزلیں ہیں۔ ذوق کے مطلع بالا کا جواب ہوا ہے:

محتسب بھی پی کے مے لوٹے ھے میخانے میں آج
ھاتھ لا پیر مغاں یہ لوٹنے کی جا ے ھے

ذوق: رخصت اے زنداں، جنوں زنجیر در کھڑکائے ھے
مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ھے

احسان: عشق کی دولت سے جب غش سا مجھے آجائے ھے
آپ وہ روئے ھے اور تلوا مرا کھجلائے ھے

ذوق کا بہترین شعر اس کا مقطع ھے :

نزع میں بھی ذوق کو تیرا ھی بس ھے انتظار
جانب در دیکھ لے ھے جب کہ ہوش آجائے ھے

احسان کا سب سے اچھا شعر یہ ھے، ذرا دیکھئیگا، نیا مضمون ھے :

گرمیء الفت سے آنسو چشم تر برسائے ھے   پہلے گرمائے ھے پیچھے جس طرح مینہ آئے ھے

مہاراجہ چندو لعل مدارالمہام حیدر آباد دکن نے اُستاد ذوق کے پاس اپنے ھاں کے مشاعرے کی طرح بھیجی تھی، انھوں نے دو غزلہ کہہ کر روانہ کیا۔ احسان کا بھی اس زمین میں دو غزلہ ھے :

ذوق: کل گئے تھے تم جسے بیمار ھجراں چھوڑ کر
چل بسا وہ آج سب ھستی کا ساماں چھوڑ کر

احسان: قیس مت جا، بند و غل، زنجیرو زنداں چھوڑکر
کس طرح جاتا ھے دیوانے یہ ساماں چھوڑ کر

ذوق: کام یہ تیرا ھی تھا، رحمت ھے اے ابر کرم
ورنہ جائے داغ عصیاں میرا داماں چھوڑ کر

احسان: دامن صحرا و جیب کوہ کو کر چاک چاک
اے دل دیوانہ اپنے جیب و داماں چھوڑ کر

ذوق: دیکھئے کیا ہو کہ ہے اب جان کے پیچھے پڑی
دل کو اے کافر تری زلف پریشاں چھوڑ کر

احسان: درہم و برہم ہوئی جمعیت خاطر تمام
کون آیا منہ پہ شب زلف پریشاں چھوڑ کر

ذوق: میں وہ ہوں گم نام - جب دفتر میں نام آیا مرا
رہ گیا بس منشی قدرت جگہ وہاں چھوڑ کر

احسان: دشت میں مجنوں کو چھوڑا کوہ کن کو کوہ میں
زانب اپنے ہم چلے یہاں چھوڑ کر وہاں چھوڑ کر

ذوق: سایۂ سرو چمن تجھہ بن ڈراتا ہے مجھے
سانپ سا پانی میں اے سرو خراماں چھوڑ کر

احسان: سرو سے قمری پھرے ہے بگڑی بگڑی باغ میں
کیا شگوفہ تو گیا سرو خرا ماں چھوڑ کر

ذوق: اہل جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک
لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

احسان: لعل لب پر غش ہوں گو دست حنائی بھی ہیں خوب
کون لے سرجان کو لعل بدخشاں چھوڑ کر

ذوق: وصل میں کر مجھ کو ہووے رویت ماہ رجب
روے جاناں ہی کو دیکھوں میں تو قرآں چھوڑ کر

احساں: اس فرنگی زادے کا منہ تکتے گزرے ہے انہیں
اب لگے انجیل پڑھنے یار قرآں چھوڑ کر

احسان نے کئی جگہ اور بھی روے یار کو بجاے قرآن کے انجیل سے تشبیہ دی ہے - ذرا اس مضمون کو دیکھئے کیا عجیب و غریب ہے:

نہیں لب پہ تیرے خط اے یار جانی مسیحا ہے مصروف انجیل خوانی

ذوق کی ایک اور مشہور غزل ہے:

مے پلاکر ساقیاں سامری فن آب میں کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں

اس غزل کے بعد انہوں نے اکبر شاہ ثانی کی تعریف میں ۳۰ - ۳۲ شعر کا ایک قصیدہ بھی اسی زمین میں کہا ہے —

احسان کے صرف دو شعر اس زمین میں مجھے ملے ہیں، لیکن ان دونوں شعروں میں جو قافیے ہیں، وہ ذوق کے ہاں نہیں ہیں - ایک قافیہ تو ایسا عجیب و غریب ہے کہ کسی شاعر کے ہاں نہ یہ قافیہ ہوگا اور نہ یہ مضمون —

عکس پرویں دیکھ کر بولا وہ پر فن، آب میں
کس نے پھینکی موتیوں کی میری سمرن آب میں
جوسیہ روے ازل ہیں وہ سپید اصلا نہ ہوں
آ اگر ہے شبہ کچھ، دھو دیکھ جامن آب میں

اب تک یہ مضمون "کہ زنگی بشستن نگردد سپید" سے ادا کیا جاتا تھا - انہوں نے خاص ہندوستانی رنگ میں اس کو باندھا ہے - یہی چیزیں ہیں جن سے زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے - "جامن" کا قافیہ کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں اسکتا اور آ بھی جاے تو اس کا باندھنا دشوار ہے —

احسان اور ذوق کے بعض شعر تو ایسے ہیں کہ ایک ہی قلم سے نکلے ہوے

معلوم ہوتے ہیں - بھلا ایسے اُستادوں کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ ایک نے دوسرے کی نقل کی ہے —

حسان: پلاؤں میں تجھے، گو کاٹے ہاتھ تو میرا
جو اب کے تو نہ پئے مے پئے لہو میرا

ذوق: کہے ہے خنجر قاتل سے یہ گلو میرا
کبھی جو مجھ سے کرے تو پئے لہو میرا

احسان: دوست کیا کیا مر گئے اہل کمال افسوس ہے
پر جو تھے اہل کمال ان کا کمال افسوس ہے

ذوق: یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

احسان: میل کباب دل اسے دل کی تلاش ہے
اس کی معاش دیکھ بڑا بد معاش ہے

ذوق: دل کی معاش غم، اسے غم کی تلاش ہے
ڈرتا ہوں دل سے میں کہ بڑا بدمعاش ہے

ذوق کی ایک غزل ہے :

کب وہ گزرتے ہیں سرلات و گذات سے   جن کی کہ آشنا ہے زباں لام و کات سے

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشاعرے کی غزل ہے - کیونکہ احسان کی بھی ایک بڑی لمبی چوڑی غزل اسی زمین میں ہے - مگر یہاں بھی دونوں شاعروں نے کوشش کی ہے کہ ایک کا قافیہ دوسرے کے ہاں نہ آئے - میں صرف وہ شعر نقل کرتا ہوں جو ہم قافیہ ہیں —

کب وہ گزرتے ہیں سرلات و گذات سے
جن کی کہ آشنا ہے زباں لام و کات سے

احسان : دشنام اور دے تو مجھے انحراف سے
عاشق کو لک وصول ھیں اک لام و کاف سے

بھلا میں کیا اور میری رائے کیا - پھر بھی میں یہ ضرور کہوں گا کہ شاعری کے لحاظ سے ذوق کا شعر کمزور ھے - لام و کاف ' لعنت کرنے اور کافر کہنے ' کے سر حرف ھیں اور اس کے معنی ' گالی گلوج کرنا ' لئے جاتے ھیں - لاف و گذاف کے معنی ' تعلی اور بیہودہ سرائی' کے ھیں-ذوق نے لام و کاف کولاف و گذاف کا سر حرف قرار دیا ھے - یہاں تک تو بالکل ٹھیک ھے اور واقعی ایک اچھی بات نکالی ھے - اب شعر کے یہ معنی ھوے کہ جن کی زبان پر گالی گلوج چڑھی ھو تی ھے وہ اگر شیخی ماریں تو کیا تعجب ھے - اس میں دو کمزور یاں ھیں - ایک تو یہ کہ صفت نے بجاے ترقی کے تنزل کیا ھے - بس یہی صورت ھوئی جیسے کہیں کہ وہ رستم ھے ' چوھا بھی مار سکتا ھے - دوسرے یہ کہ وجہ سے جو نتیجہ نکالا ھے وہ لازمی نتیجہ نہیں ھے- یہ کیا ضرور ھے کہ جو شخص گالیاں بکتاھو وہ شیخی خورا بھی ھو-

اب اس کے مقابلے میں احسان کا شعر دیکھئے - اس نے بھی لام و کاف کے دوسرے معنی لئے ھیں اور لاکھ روپے کی بات نکالی ھے - کہتا ھے : تو بگڑ بگڑ کر مجھے گالیاں دئے جا ' تیرا ھر لام و کاف مجھے لاکھ روپے کے برا بر ھے- مگر اک کا لفظ ذرا کھٹکتا ھے - مجھے تو دونوں شعروں میں سے ایک بھی پسند نہیں -

ذوق : اول ھی سے بشر کو ھے رغبت خلاف سے
لیتا تھا کام منہ کا شکم میں یہ ناف سے

احسان : عنبر خجل ھے زلف سے' پر ھے نئی یہ بات
شرمندہ مشک نافہ ھوا بوے ناف سے

ایک کا حکیمانہ شعر ھے' دوسرے کا عاشقانہ - ایک منطقی وجہ قائم کر کے انسان کی فطرت بیان کر تا ھے ' دوسرا صرف واقعہ بیان کر تا ھے - ایک پیٹ کی

بات کہتا ہے کہ دوسرا آنکھ دیکھی (آنکھ دیکھی نہیں ، ناک سونگھی)
بات کہتا ہے —

ذوق : چل میکدے میں شیخ بسر کر مہ صیام
مسجد میں تنگ بیٹھا ہے کیوں اعتکاف سے

احسان : ماہ صیام میں تجھے ہر روز عید ہے
احسان عجب ہے کل ، نہ نکل اعتکاف سے

احسان کے ہاں ' کل ' کے معنی آرام کے ہیں - دونوں شعر معمولی ہیں ، پھر
بھی ذوق کا شعر بہتر ہے —

ذوق : نالوں نے دی چڑھا جو تپ لرزہ مہر کو
کھولی نہ آنکھ ابر سیہ کے لحاف سے

احسان : سوتے میں کس کا روئے منور ہے کھل گیا
یہ منہ نہیں ہے ، چاند ہے نکلا لحاف سے

دونوں شعر بھرتی کے ہیں-

ذوق : ہو جوہر کمال پہ ننگا جو خاکسار
ایک تیغ ہے کہ ننگ ہے اس کو غلاف سے

اسی قافیے میں ذوق کا دوسرا شعر ہے :

جوں تیغ خوش غلاف نگہ تیری اے پری
ہے دمبدم نکل کے چمکتی غلاف سے

احسان : اس بانکپن پہ میں ہوں تصدق کہ اے میاں
شمشیر نکلی پڑتی ہے ہر دم غلاف سے

ذوق کا پہلا شعر غضب کا شعر ہے ، کیا باعتبار شوکت الفاظ اور کیا بلحاظ
مضمون اس شعر کا جواب ہونا مشکل ہے - احسان کے ہاں رعایت لفظی نے کمزوری
پیدا کردی ہے - دوسرا مصرعہ واقعی لاجواب ہے ، مگر پہلے مصرعہ کی اول تو بندش

کمزور ہے، دوسرے "میاں" کے لفظ نے اس کو اور بھی گیا گزرا کردیا -

ذوق : گردش ہے اس کی چشم کی کیوں میرے دل کے گرد
کافر کو کام کعبے کے ہے کیا طواف سے

اس قافیے میں ان کا دوسرا شعر ہے :

طوف سیاہ خیمۂ لیلیٰ ہوا نصیب
مجنوں، سمجھیو کعبے کے بہتر طواف سے

احسان : آؤں گا میں بھی کعبے کو، تم جاؤ شیخ جی
فرصت اگر ہوئی مجھے دل کے طواف سے

احسان کا شعر یقیناً ذوق کے دونوں شعروں سے بڑھا ہوا ہے اور طرز ادا ایسا بانکا ہے کہ سبحان اللہ -

ذوق : اڑتے ہیں گہ نصیب سے گاہے ذاک سے ہم
فرقت کی رات کم نہیں روز مصاف سے

احسان : بے فائدہ نہ تیغ و سپر کو سنبھالئے
انصاف کیجے، فائدہ کیا ہے مصاف سے (ق)
ہے صاف صاف یہ کہ نہ لوں بوسے کس طرح
یہ گورے گورے گال ہیں کیا صاف صاف سے

ذوق : گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق جہاں
اے 'ذوق' اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

احسان : دل میرا زلف کو ہی دے، اے خال، مت جھگڑ
سو سو بلائیں اٹھتی ہیں ایک اختلاف سے

ذوق ایک شعر میں وہ فلسفہ بیان کرگیا ہے جو ایک کتاب میں آنا مشکل ہے -

ایسے ہی شعروں نے آخر اس کو ملک الشعراء بنادیا تھا ۔

شاہ نصیر کی بھی دو چار غزلوں پر احسان کی غزلیں ہیں۔ ایک مشاعرے میں طرح کا مصرعہ تھا: "خدا جانے کیا اس کا انجام ہوگا" دونوں نے اس کی تضمین کی ہے۔

نصیر : نہ سمجھو کہ آغاز خط عارضی ہے
خدا جانے کیا اس کا انجام ہوگا

احسان : سنو! جب کہ آغاز الفت ہے یہ کچھ
خدا جانے کیا اس کا انجام ہوگا

شاہ نصیر اور احسان کی ایک طرحی غزل کے ہم قافیہ اشعار بالمقابل لکھتا ہوں، اس سے ان دونوں استادوں کے کلام کا اندازہ ہو جائیگا۔ بعض جگہ تو یہ حالت ہوئی ہے کہ مضمون تو مضمون الفاظ بھی مل گئے ہیں ۔

نصیر : میں ہی تھا جو کہ دل کو رہا تھام اب تلک
غم کر چکا تھا ورنہ مرا کام اب تلک

احسان : نکلا نہ اس کے لب سے مرا کام اب تلک
اللہ وہ صنم نہ ہوا رام اب تلک

نصیر : ہمچشمی اس کی چشم سے جو کی تھی اسلئے
ہم پھوڑتے ہیں دیدۂ بادام اب تلک

احسان : رتبہ وہ تیرے چشم کے کشتے کا ہے کہ خلق
لاتی ہے اس کی قبر پہ بادام اب تلک

نصیر : ہے یاد اس کی دل میں ہمارے کہ جسنے آہ
بھولے سے بھی لیا نہ کبھی نام اب تلک

احسان
احساں میں جسکے نام پہ دیتا ہوں اپنی جاں
وہ جانتا نہیں ہے مرا نام اب تلک

نصیر :
یاں چھت سے آنکھیں لگ گئیں اور واں وہ ماہرو
آیا نہ حیف تا بہ لب بام اب تلک

احسان :
گزرا تھا رشک ماہ کہیں ایک شب وہاں
اک روشنی سی ہے بلب بام اب تلک

نصیر :
مر کر بھی ہم نے اس دل مضطر کے ہاتھ سے
پایا نہ زیر خاک کچھ آرام اب تلک

احسان :
گو مر چکا ہوں، پر دل مضطر کے ہاتھ سے
میرے نصیب میں نہیں آرام اب تلک

نصیر :
کھا کھا کے داغ سرو چراغاں میں بن گیا
ہر گز ملا نہ، پر، وہ گل اندام اب تلک

احسان :
ہوتی تھی جن کو بستر گل پر بھی بیکلی
ہیں خاک میں پڑے وہ گل اندام اب تلک

نصیر :
ظاہر میں اس کے گو ہے رکاوٹ پر اے نصیر
جاری ہے رسم نامۂ و پیغام اب تلک

احسان :
پیغام بوسہ پر ہے تسلی کسے یہاں
تیرا وہ ہی ہے بوسہ بہ پیغام اب تلک

اب دونوں غزلوں کو آپ خود ملاحظہ فرما لیجئے - احسان کی غزل کس طرح

شاہ نصیر سے دبی ہوئی نہیں ہے —

میر نظام الدین ممنون اور احسان کی اکثر غزلیں ایک ہی زمین میں ہیں، لیکن خدا معلوم کیا بات ہے کہ جو قافیہ ایک نے باندھا ہے وہ دوسرے نے چھوڑ دیا ہے - بعض میں قافیے ملتے ہیں، وہ بالمقابل لکھے دیتا ہوں :

ممنون : گماں نہ کیونکہ کروں تجھپہ دل چرانے کا
جھکا کے آنکھہ سبب کیا ہے مسکرانے کا

احسان : ہماری جان پہ گرتی ہے برق غم ظالم!
تجھے تو سہل سا ہے شغل مسکرانے کا

ممنون : واے بیکاری وحشت کہ رکھیں مشغلہ کیا
نہ تو داماں ہے ثابت نہ گریباں درست

احسان : سینہ اسطرح کھلا، بند ہے وا، بندہ نواز
کچھہ بھی موقع ہے ذرا کیجے گریباں درست

نمونہ کلام

جب مضمون بڑہ جاتا ہے تو لکھنے والا لکھتے لکھتے اور پڑھنے والا پڑھتے پڑھتے اُکتا جاتا ہے - ایسی صورت میں یہی بہتر ہوتا ہے کہ کسی طرح لپیٹ سمیٹ کر مضمون ختم کر دیا جاے - یہی طریقہ اب میں بھی اختیار کرتا ہوں اور 'احسان' کے کلام کے کچھہ نمونے اور بعض غزلیں لکھہ کر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ ہر شخص کی پسند جدا جدا ہوتی ہے، کیا ضرور ہے کہ جو شعر مجھے پسند ہو وہ آپکو بھی پسند آے، یہی تو وجہ ہے کہ جتنے شعرا کے تذکرے ہیں سب میں انتخاب کلام مختلف ہے، ایکو کیا کروں چونا نقنا مجھے ہی پڑیگا، آپ ہوتے تو آپ سے بھی مشورہ لے لیتا - انتخاب میں میں نے دو تین چیزوں کو پیش نظر رکھا ہے - ایک جدت مضمون، دوسرے محاورہ اور تیسرے روانی - اگر ہر عنوان کے شعر علحدہ علحدہ کر دوں تو بعض صورتوں میں سلسلہ ٹوٹ کر مزا جاتا رہیگا - اس لئے بلا لحاظ

مضمون سب کو ایک ھی جگہ لکھہ دیتا ھوں ' آپ کو ضرورت ھے تو تھوڑی سی تکلیف گوارا کر کے ان اشعار کو بہ لحاظ مضامین خود تقسیم کر لیجئے —

رکھا ھے عشق کے دریا میں اب قدم میں نے ــــ معاف کیجیو یارو! کہا سنا میرا
سیری ھمارے زخم کو مطلق نہیں ھوئی ــــ جتنا تھا زور شور نمکداں کا ھوچکا
دریا بھی کیا ھے' گرم توے پر ھو دیسے بوند ــــ ھم سے علاج سینۂ سوزاں کا ھوچکا
مر جائیگا فراق میں کہتا ھے مجھکو تو ــــ ق اس منہ پہ وصل اس مہ تاباں کا ھوچکا
فی الواقعہ یہ تونے کہا ایک ناصحا ــــ یہاں کل ھی واقعہ شب ھجراں کا ھوچکا

تجھہ کو کبھی نہ دیکھا' دیکھا جہان سارا ــــ گرچہ تجھی کو میں نے سارے جہاں میں دیکھا

کہا جو میں نے کہ اے رشک ماہ گھر میرے ــــ ق تو مہربانی سے کیوں ایک ذرا نہیں رہتا

لگا یہ کہنے کہ ھاں ھاں ھے یہ بھی اپنا شوق
نہیں' نہیں' نہیں رھتا ھوں' جا نہیں رھتا

داد دیجئے کا' کیا خوبصورت تکرار ھے —

ھماری چھاتی پہ پھرتا ھے سانپ یہاں احسان
وھاں ھے شغل اسے زلف کے بنانے کا

یہ شام ھجر آئی شامت زدہ کہاں سے ــــ ھو رو سیاہ ایسے ناخواندہ میہماں کا
پیک اجل تھہر جا' جاتا ھوں میں بھی یعنے ــــ پیغام خود سنونگا یاران رفتگاں کا

کیا خوبصورت شعر ھے اور کیا لطیف مضمون ھے - سبحان اللہ —

مرگ کے پہلچا ھوں نزدیک' تری جان سے دور
مجھہ پہ کیا کیا کہوں فرقت میں کہ کیا کیا نہ ھوا

کیا ھی کوچہ ھے مرے دوست کا اللہ اللہ ــــ بوھوں آن کے وھاں دشمن بتھاتہ ھوا

سرا تو ناک میں دم تونے چرخ پیر کیا　　پہ تیری ناک میں آ کر سا نے تیر کیا

تو کیوں ہے گریہ کناں اے مرے دل محزوں
نہ رو نہ رو کہ نہ تجھہ کو کبھی رلائے خدا
بتو! بتاؤ تو کیا تم خدا کو دوگے جواب
خدا سے بندوں پہ یہ ظلم بندہ ہائے خدا
رضا میں تیری ہوں دن رات اے صنم مصروف
اور اس پہ تو نہیں راضی نہ ہو، رضائے خدا
بتوں کے کوچے میں کہتا تھا کل یہی احسان
یہاں کسی کا نہیں ہے کوئی سوائے خدا

تیرا مریض عشق تو جی سے گذر گیا　　کل پہلا دن تھا آج میری جاں ہے دوسرا

محاورہ ہے "آج مرے کل دوسرا دن" —

میری بغل سے دل کو نکالو کسی طرح　　جراح سے یہ کہہ دو کہ پیکاں ہے دوسرا

لاجواب شعر ہے، پیکان سے دل کو تشبیہ دی ہے۔ جس نے خدا نخواستہ کبھی پیکان دیکھا ہے وہ سمجھہ سکتا ہے کہ کیسی خوبصورت تشبیہ ہے اور اس کے ساتھہ یہ دیکھئے کہ کس طرح جراح کو دھوکا دینا چاہتے ہیں - جانتے ہیں کہ دل کے نکلے بغیر درد نہ جائیگا اور جراح اس ڈر کے مارے دل نہ نکالیگا کہ دل نکالا اور یہ مرا - یاروں سے کہتے ہیں کہ اس کو دھوکا دیدو کہ یہ دل نہیں ہے دوسرا پیکاں ہے —

ہوا ہوں عشق سے ناچار یہاں تلک، احسان　　جو مجھہ کو ہائے نہ کرنا تھا ناگزیر کیا

یارو! سبھی کو میرے گریباں کا فکر ہے　　ناصح کے منہ کو آنکے کوئی نہ سی گیا

مری آہ آتش فشاں دیکھتے ہی لئے گھر سے ہر ایک قرآن نکلا
کیا میں نے مجرا تو جھنجلا کے بولے کہاں کا مرا جان پہچان نکلا
مجھے شیخ الفت سے مانع ہے احسان' ولی جس کو سمجھا تھا شیطان نکلا

بجھی جو شمع تو پروانوں پر ہوا روشن کہ بعد مرگ کوئی آشنا نہیں رہتا

تم آئے ورنہ ہجر میں بچنا محال تھا ہمکو شب فراق ہی روز وصال تھا

کبھی شادی کبھی غم ہے' یہی عالم ہے عالم کا
مہ عید الضحیٰ گزرا تو چاند آیا محرم کا

کہا میں نے مرے گھر بھی کبھو آؤگے' یہ بولے:
میں کیوں آؤں مجھے کیا واسطہ' کیا کار' کیا باعث

سبک کہینگے تجھے لوگ ہاتھ نہ بالیں سے
کہ رات اس ترے بیمار پر ہے بھاری آج
تمہارے آج کے وعدے کو میں سمجھتا ہوں
کہ تا بحشر نہ نبڑیگی یہ تمہاری آج
خاک میں مل کر تماشا مزرع دنیا کا دیکھ
ساتھ ہے ہر قفل کے کنجی یہاں دانے کی طرح

فائدہ؟ تم جو مجھے نزع میں یار آئے نظر
ہے نہ یارائے سخن اور نہ یارائے نظر

نظر آتی ہے تری مانگ میں یوں سلک گہر
ابر میں جیسے کہ بگلوں کی قطار آے نظر

نئی تشبیہ ہے اور لا جواب ہے - میں شعر لکھے جاتا ہوں' آپ تعریف کرتے جائیے - اگر میں نے ہر شعر کی تعریف کرنی اور اس کی خوبیاں دکھانی شروع کیں تو یہ مضمون کبھی ختم ہی نہ ہو گا - اچھا' آگے چلئے :

دیکھیو میری طرف' سچ کہیوا ے اختر شناس
کیوں فلک کو تو نے دیکھا میرے اختر دیکھکر

کیا غضب کا شعر ہے - ارادہ تھا کہ کسی شعر پر کوئی نوٹ نہ دونگا' لیکن کیا کروں' اس شعر کی تعریف کئے بغیر بھی تو نہیں رہا جاتا - شعر کیا ہے نو تو ہے - معشوق کے ہاتھوں پریشان ہو کر فال کھلوانے جاتے ہیں کہ قسمت میں وصل لکھا ہوا ہے یا نہیں - نجومی ہاتھ دیکھتا ہے' زائچہ کھینچتا ہے' ستاروں کے چکر دیکھتا ہے اور بجاے ان سے کچھ کہنے کے آسمان کی طرف دیکھتا ہے - اس کا جو اثر بچارے عاشق کے دل پر ہوا وہ ایک دفتر میں بھی بیان نہیں ہو سکتا - اور جو الجھنیں اس کے دل میں پیدا ہوئیں ان کی تشریح محال ہے - یہ شاعر کا کمال ہے کہ اس نے کچھہ نہ کہا اور سب کچھہ کہہ دیا - کیا بلحاظ زبان' کیا بلحاظ طریقۂ ادا اور کیا بلحاظ مضمون' علم ادب میں ایسے شاید چند ہی شعر نکلیں؛ یہ وہ شعر ہے جس پر ہزاروں دیوان قربان کر دئیے جائیں تو سزاوار ہے -

اگرچہ میں فغاں سے نیند اک عالم کی کھوتا ہوں
تری خاطر ہے مجھکو اے اجل بس آج سوتا ہوں
اندھیرا چھا گیا آنکھوں میں جب سے تو گیا یہاں سے
کوئی آنکھوں سے روئے اور میں آنکھوں کو روتا ہوں

چاہئیے بھر خجالت میں وہ سب ڈوب مریں
اپنے معشوق کو جو جان جہاں کہتے ہیں
ایک نقطہ بھی زیادہ جو زباں پر آیا
وہ زیاں ہی نہیں پھر اس کو زیاں کہتے ہیں
میں تڑپتا ہوں غم عشق بتاں میں 'احسان'
حکما ' فضل الہی ' خفقاں کہتے ہیں

مجھکو مت چھیڑو کہ میں سر تاپا تاثیر ہوں
برق ہوں ' آہ سحر ہوں ' نالۂ شبگیر ہوں
کام رہتا ہے سدا گردن کشوں سے ہی مجھے
پیچ و تاب حلقہ ہائے جوہر شمشیر ہوں
درد دل کو میرے جانا اُس نے افسانہ مگر
چپ جو رہتا ہوں تو پھر کہتا ہے وہ بے پیر ہوں
فی المثل آب بقا بر سے تو کیا حاصل مجھے
مزرع دنیا میں 'احساں' دانۂ زنجیر ہوں

پلا ئی مے رمضاں میں نہ مجھکو اے ساقی
بڑے عذاب سے کٹتے ہیں یہ ثواب کے دن

بہت کم ہے سچ اس زمانے میں 'احسان'   یہاں جھوٹ کے کارخانے بہت ہیں

تاب کس کو ہے جو پھر بھر تقابل آ سکے   (ق)
گرم آہ گرم ' اپنا جب دل بیتاب ہو

خاک کو بھی چاٹ کر کہتا ہوں اے بادسموم
تو تو کیا ہے آتش دوزخ کا زہرہ آب ہو

میں یہ کہتا ہی نہیں تجھکو رہ الفت میں تو
رستم و افراسیاب و بہمن و سہراب ہو

بیدل و بیتاب و بے آرام و بیخود، بیخبر
بے سرو بے صبر و بیجاں، بیخور و بیخواب ہو

کیا نہ رد خط سے خطرہ، کیوں مکدر تو ہوا
اے الف قامت وہ مصحف کیا جو بے اعراب ہو

جب میںنے کہا چاہتا ہوں میں تجھے واللہ
بولا وہ صنم: تم مجھے للہ نہ چاہو

جنت کا یہ سب ذکر فراموش ہو واعظ
گر حضرت من آپ کا دوزخ نہ بھرا ہو

گیا نہ ہمراہ اس کے میں کل، گیا وہ گھر کو کیا بہانہ
دریغ یہ ہے دروغ گو کو نہ میںنے پہنچایا تا بخانہ

جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کا محاورہ باندھا ہے —

غرور سے نہیں خاطر میں اپنے لاتے ہو سلام لیتے ہو یا مکھیاں اُڑاتے ہو
کیا ٹھکانا تیرے وعدے کا بت بے پیر ہے آج ہفتہ اور کل انوار پرسوں پیر ہے

غم بھی آگیا دل میں یوں لپٹا ہوا ہمراہ عشق
جس طرح کوئی طفیلی آتا ہے مہماں کے ساتھ

اے وفا دشمن یہ تیرے عشق سے ثابت ہوا
سربسر جی کازیاں ہے دوستی ناداں کے ساتھ

محاورہ ہے " نادان کی دوستی جی کا زیاں " 'غالب' نے بھی اس محاورے کو باندھا ہے

غالب: فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی ہے دانا اسد   دوستی نادان کی جی کا زیاں ہو جائے گا

قسمت کا بلی زلف گرہ گیر سے چھوٹے   ہاتھی بھی نہ جکڑا ہوا زنجیر سے چھوٹے

کی تو اغیار سے سازش ہے ' ولے غنچہ دہن!
چٹکیوں میں ہیں یہ جو بن کے اُڑانے والے
ان کے ہنسنے پہ نہ جا ' ان کے ہنسانے سے نہ ہنس
تیرے ہنسنے پہ یہ ہنستے ہیں ہنسانے والے

رخ پہ جب خال کو دیکھا تو کہا میں نے کہ یار!
ربط کس طرح بہم کافر و دیندار میں ہے
بولا سررشتہ یہ کچھ آج کی ایجاد نہیں
رشتہ اک عمر سے یہاں سبحۂ و زنار میں ہے

چشم مست اس کی یاد آنے لگی   پھر زباں میری لڑکھڑانے لگی
آگ اس دل لگی کو لگ جائے   دل لگی آگ پھر لگانے لگی
کس کی آواز پاسنی کہ مجھے   نزع کے وقت نیند آنے لگی

مستعد بدی ہوا وہ ہی ق جس سے کی ہم نے بارہا نیکی
نیکیاں کر کے ہو بدی حاصل   ہت تری آخری زمانے کی

اسی مضمون کو 'غالب' نے یوں ادا کیا ہے :

کہوں کیا خوبیٔ اوضاع ابنائے زماں غالبؔ!
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

وہ بھر حسن شاید باغ میں آئے گا اے احسان
کہ فوارہ خوشی سے آج دو دو گز اُچھلتا ہے

الف قامت ترا، میم دہن، جوں نون تنویں ہے
کہ سننے میں ہے آیا، پر نہیں دیکھا کسی رو سے

جو میں نے کل کی خوشامد کہا یہ درباں سے
خوشامدی مری محفل میں کوئی آ نہ سکے

نہ زاہد ہوں، نہ میکش ہوں، نہ میناساز ہوں احسانؔ
نہ مجھکو کام مینے سے نہ مینا سے نہ مینو سے

تسبیح کے ایسے دانوں کو جو شیشے کے ہوں "مینے" کہتے ہیں۔ مگر زاہد اور میکش کے ساتھ میناساز کا لفظ بہت بے جوڑ آیا ہے۔ "مینے اور مینا" کے ساتھ "مینو" کا لفظ لانا تھا، اس لئے زبردستی "مینا ساز" کو ٹھونس دیا —

اسی غزل میں دوسرا قطعہ کہا ہے، واقعی لاجواب ہے۔ مجھے اس لئے اور بھی پسند ہے کہ عربی اور ایرانی عاشقوں کے ساتھ ہندوستان کے عاشقوں کو بھی شریک کردیا۔ سسی اور پنو کے عشق کا حال پنجاب والوں سے پوچھو —

ہوا دشت محبت طے عزیزو، دوستو! ہر گز
نہ عشاق جفا کش سے نہ معشوق جفا جو سے

نہ خسرو ہے، نہ شیریں ہے، نہ مجنوں ہے، نہ لیلیٰ ہے
نہ وامق ہے، نہ عذرا ہے، نہ سسی ہے، نہ پنو ہے

چین تجھکو بھی نہو مجھکو ستانے والے
تو بھی تڑپتا نہ رہے جی کے جلانے والے

پیر مغاں کی ہے یہ کرامات ساقیا یوں میکدے میں ساغر بے دست وپا چلے

اب دو غزلیں پوری پوری لکھکر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ ان غزلوں کے دیکھنے سے آپ کو احسان کی شاعری کا اور اچھی طرح اندازہ ہوجائیگا۔ فال کھولنے کی طرح دیوان کھولتا ہوں، جو دو غزلیں پہلے نکلیں وہی نقل کردونگا۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

دل کو چرا کے عشق کا مجھ پر رکھا گناہ
انصاف کیجیے میرا ہے یا آپ کا گناہ

جان دل حزیں جگر خستگاں پہ رحم
میں نے کہا ثواب ہے کہنے لگا گناہ

جب تم سے بولتا ہوں برا مانتے ہو تم
کچھ جرم، کچھ قصور، بھلا کچھ خطا، گناہ

بار غم بتاں سے نجات اب کی بار ہو
بار دگر نہوگا یہ بار خدا گناہ

میں نے کہا کہ زلف میں دل کو اسیر کر
بولا کہ سر پہ لیوے یہ میری بلا گناہ

پایا رواج بخل نے اب تو یہاں تلک
سمجھے ہیں اس زمانے میں جود و سخا گناہ

جنت میں مجھکو اس کی گلی سے ہیں لے چلے
کیا جانئے کہ مجھ سے ہوا، آہ کیا گناہ

'احسان' پر گناہ کے فضل و کرم سے بخش
یا رب بحق حضرت خیرالورا ' گناہ

ہم ہیں کو چہ ہے یار جانی کا	زور ہے زور ناتوانی کا
نام تیرا ہے ورنہ اے عنقا	ہے نشاں ہم سے بے نشانی کا
غم سے ہوتا ہے غم غلط اپنا	کس کو یہاں غم ہے شادمانی کا
میں تو اس نوجوان پرغش ہوں	ہائے عالم تری جوانی کا
تو نہ ہووے تو جان مرجاؤں	تو ہی باعث ہے زندگانی کا
نیند اُڑجائے سنتے ہی اسکے	یہ اثر ہے مری کہانی کا
اسی زلف دراز سے ہے خضر	سلسلہ عمر جاودانی کا
نہیں احساں تجھے سلیقہ کچھہ	شعر گوئی کا' شعر خوانی کا

کئی رباعیاں اوپردے آیا ہوں' شاید نکالنے میں دقت ہو' اسلئے ایک یہاں بھی لکھے دیتا ہوں:

جس طرح بنے عمر کا کیجیوا کہیدا	پڑ جائیگا آخر کو تو لینا دینا
دے نام خدا اور تو لے نام خدا	دنیا میں عجب چیز ہے دینا لینا

لیجئے مضمون ختم ہوگیا' محرم کا زمانہ ہے' طبیعت خود پژمردہ ہے' مضمون میں بھی اگر افسردگی ہو تو کچھہ تعجب نہیں - مضمون لکھنے سے نہ میری کبھی یہ غرض تھی اور نہ ہے کہ آسمان کے تارے توڑلاؤں' یا ایسا مضمون لکھوں کہ دھاک بیٹھہ جائے میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جو کچھہ گزشتہ اور پاہرکاب بزرگوں سے معلوم ہوجائے' اسکو محفوظ کردوں - بعد میرے کوئی نہ کوئی بھلا آدمی ان واقعات و حالات کو سلیقے سے جما لے گا - اگر مضمون کی ترتیب اور الفاظ کے انتخاب کو لیکر بیٹھا تو نہ مجھہ سے کچھہ ہوا ہے اور نہ ہو گا - مضمون ہاتھہ سے جائیگا اور پرانے زمانے کے حالات ان بزرگوں کے ساتھہ قبر میں چلے جائینگے - میاں بات یہ ہے کہ جو بندہ گیا سو موتی —

ایثار (فسانہ)

از

(جناب کشن پرشاد صاحب کول ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی، لکھنو)

ساوتری— یہ ان کی بڑھاپے میں کیا مت بھنگ ہوئی، چھپن برس کی عمر میں شادی کرنے بیٹھے، اُنیس برس کی لڑکی سے اور پھر گھر میں بیوی موجود۔ بڑے بڑے جوان لڑکے سامنے۔ پوتے نواسے والے —

ومِلا— جی ہاں اور سوشل رفارمر بنتے تھے۔ سوشل رفارم کے نام سے جب ہی تو لوگ بھڑکتے ہیں، یہ تو آپ کے رفارمروں کا حال ہے - بدھوا آشرم کھول کر بیٹھے۔ لوگوں نے بھروسا کرکے اپنے یہاں کی بھولی بیٹیوں کو آشرم میں بھیجا کہ کچھ پڑھینگی، لکھینگی، سیکھینگی، وہاں یہ گُل کھلا۔ بھلا اب اگر لوگ ان باتوں سے دور بھاگیں اور سوشل رفارم کو بدنام کریں تو ان کو کس منہ سے الزام دے سکتے ہو —

ساوتری— کچھ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آیا کہ دیوان صاحب کو ہوا کیا - کیسا نورانی چہرہ، فرشتہ سیرت، آج تک سوائے تعریف کے کسی کی زبان سے کوئی کلمہ برائی کا نہیں سنا - عمر بھر پرا و پکار کی زندگی بسر کی - پھر کیسے قابل، سمجھدار، بردبار، دفعتاً یہ ہوا کیا - کیا بڑھاپے میں سب ہی کی عقل ماری جاتی ہے!

ومِلا— بہن جی - میں نے تو جب سے یہ سنا، سچ کہتی ہوں شرم کے مارے سر نہیں اُٹھایا جاتا - اُنہوں نے اپنی سپید داڑھی میں تو سیاہی لگائی ہی، مگر قوم

والوں کا منہ بھی کالا کیا۔

شانتی۔ اس کو قاتل ہونہ آدمی شریف ' فرشتہ صورت اور پرا اپکاری ہے۔ کل تک تم سب کی زبانیں اُس کی تعریف کرتے کرتے نہیں تھکتی تھیں اور جب سے یہ حادثہ گزرا ' بلا سوچے سمجھے تم سب کے سب ہاتھ دھوکر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ تم لوگ حیرت ظاہر کرتے تو بات سمجھ سکتی تھی! لیکن تم نے تو لعنت ملامت کا وہ طومار باندھا ہے کہ توبہ ہی بھلی —

ملا — بہن جی! یہ تم نے خوب کہا۔ تم اس بات کی حمایت کرنے کے لئے تیار ہو؟ سنو تو برادری والوں میں کیسا طوفان برپا ہے۔ اس کو بھی جانے دو۔ اخبار والے کیا لکھ رہے ہیں — لاہور بھر میں تہلکہ مچا ہوا ہے اور دیوان صاحب خود منہ چھپائے چھپائے پھرتے ہیں۔ جو بات جیسی ہوگی ویسی کہی جائے گی —

ساوتری۔ یہ حرکت تو واقعی بڑی نازیبا ہوئی — ایسے شخص سے ایسی حرکت کا سان گمان بھی نہ تھا — بدھوا آشرم کے تو پاس بھی اب کوئی نہ جائے گا —

ملا — یہ بھی صاحب دل لگی کی بات ہے ' غصہ بھی آتا ہے ' شرم بھی آتی ہے ' پھر ہنسی بھی۔ دیوان صاحب کو تو بڑا بھس لگی تھی ' اس لڑکی کو کیا ہوا۔ شادی بھی کی تو کس سوکھے اچھور سے ' ایک پیر قبر میں لٹکائے — آج مرے کل دوسرا دن —

ساوتری — اے اور بھی سنا ' شادی دیوان صاحب کی بیوی کی مرضی سے ہوئی ہے ' سنا کہ رکمنی کو بڑے پیار سے رکھتی ہیں —

ملا — میرا میاں ایسے کام ایسے کرے پر اس طرح سے مونگ دلے تو میں تو داڑھی نوچ لوں اور اس موئی سوت کو لگاؤں اوکا —!

ساوتری — (ہنس کر) اے تیرے میاں کے داڑھی موچھ ہی کہاں ہے جو نوچے گی —

شانتی — تم نے اس پر نہیں غور کیا کہ رکمنی نے سارے جہاں کو چھوڑ کر ایسے شخص

سے جو ایک پیر قبر میں لٹکائے ہے، شادی کرنی کیوں پسند کی اور دیوان صاحب کی بیوی رکمنی کو بیٹی کی طرح کیوں پیار کرتی ہیں - کچھ تو راز ہوگا - تم نے غور کرنے کی تکلیف تو گوارا کی ہوتی —

وملا - راز سارا طشت از بام ہوچکا، راز کیا ہوگا خاک، میری سمجھ میں تو یہ سارا اواں کا اواں بگڑا ہوا ہے —

ساوتری - کیا راز ہے؟ تمہیں کچھ معلوم ہے؟ بتاؤ —

شانتی - تم لوگ تو مذاق اڑا رہے ہو، سنجیدہ باتوں میں مذاق مجھے نہیں اچھا لگتا -

ساوتری - اچھی شانتی بتاؤ کیا بات ہے - تم سے تو رکمنی سے بڑی اپنا ہٹ ہے - اس نے تو سب دل کا حال تم سے کہا ہوگا - کیا بات ہے بتاؤ —

شانتی - وعدہ کرو کہ سنجیدگی سے سنوگی اور جو کچھ میں کہوں اسے یقین کروگی - دیکھو وملا نے ابھی سے مسکرانا شروع کیا - میں اس کے آگے نہیں کہونگی -

وملا - بہن جی! تم تو خفا ہوتی ہو - میں وعدہ کرتی ہوں کہ سنجیدگی سے سنوں گی اور تمہاری بات برابر مانوں گی، کہو کیا بات ہے —

دیوان جے رام دوارکا داس لاہور کے ایک معزز اور متمول خاندان سے تھے - غدر کے زمانے میں پیدا ہوے اور لڑکپن لاہور ہی میں گزرا - آپ شہر کے ان معدودے چند اصحاب میں سے تھے جنھوں نے انگریزی کی تعلیم سے اس زمانے میں فیض اٹھایا تھا - کچھ عرصہ پیشۂ وکالت میں صرف کیا، بعد ازاں محکمۂ عدالت میں مختلف عہدوں پر پنجاب کے مختلف اضلاع میں مامور رہے - چونکہ آدمی ذہین اور قابل تھے، بہت جلد سشن جج کے عہدے پر سر فراز کئے گئے - آخری زمانہ سشن ججی کا خاص لاہور میں صرف ہوا، چونکہ تندرستی کچھ خراب رہتی تھی اور لاہور کے باہر نہیں جانا چاہتے تھے، کسی قدر قبل از وقت پنشن لے لی - دیوان جے رام دوارکا داس پرانے زمانے کے ان چیدہ اصحاب میں تھے جن کا نہ صرف دماغ انگریزی تعلیم کی نئی روشنی سے منور تھا، بلکہ جنھوں نے پہلو میں دل اور دل میں درد

چایا تھا - قوم کے تعلیمی اور سوشل معاملات میں نمایاں اور عملی حصہ لیتے رہتے تھے۔ نیشنل کانگرس میں بھی بہ حیثیت تماشائی ضرور جاتے - پنجاب میں سوشل کانفرنس کے روح رواں تھے اور بالخصوص لاہور میں آپ کی بڑی وقعت اور مرتبہ تھا - گزشتہ بارہ سال سے آپ نے لاہور میں ایک بدھوا آشرم اپنے صرف سے قائم کیا تھا، جس میں ہندو بدھواؤں اور لڑکیوں کی تعلیم کا نہایت معقول اور اعلیٰ پیمانے پر انتظام کیا تھا، دس پانچ بدھواؤں کی شادی بھی اُن کی اور اُن کے ماں باپ کی مرضی سے کرادی تھی - علاوہ اس آشرم کے اور بھی کئی درسگا ہیں آپ کی فیاضی سے مالامال ہوتی رہتی تھیں - اسی لئے آپ شہر میں ہردل عزیز تھے اور اپنے صوبے میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ آپ کے راست باز اور فرشتہ سیرت ہونے کا ہر کہ و مہ معتقد تھا۔ آپ کے دامن شہرت پر کبھی کوئی چھینٹ بھی اُڑ کر نہیں پڑی تھی - اس لئے جب یہ خبر دفعتاً مشہور ہوئی کہ آپ نے آشرم کی ایک نوجوان بیوہ سے شادی کر لی تو نہ صرف آپکی برادری بلکہ تمام شہر میں تہلکہ مچ گیا اور لوگ متحیر رہگئے -

مسٹر بھگت رام سوری کے ڈرائنگ روم میں مسز اوری یعنی شانتی اور اُس کی دو اور سہیلیاں بیٹھی چاے پی رہی تھیں اور اسی حادثے کا چرچا ہو رہا تھا، جسکا ذکر اوپر آچکا ہے - جب وملا اور ساوتری نے شانتی سے افشاے راز پر اصرار کیا تو شانتی نے دونوں سے اس بات کا دتھی وعدہ لیا کہ علاوہ ان دو کے بات اور کسی تیسرے کے کانوں تک نہ پہنچے، اسطرح سے اطمینان کر کے شانتی نے رکمنی کی واردات یوں بیان کرنی شروع کی: —

رکمنی پرانے خیال والے لیکن شریف اور امیر گھرانے کی لڑکی تھی، گیارہ برس کی عمر میں شادی ہوئی، سال بھر بعد وہ لڑکا جو اسکا خاوند ہوتا چند روز بیمار رہکر مر گیا - بچپن کے کھیل تماشے عارضی طور سے طبیعت میں جوش مسرت پیدا کرتے ہیں لیکن اسیقدر جلد یاد سے اتر بھی جاتے ہیں۔ رکمنی شادی اور موت کے دونوں حادثوں کو بہت جلد بھول گئی اور میکے میں حسب معمول

رہنے سہنے لگی۔ دیوان جیرام دوارکاداس اور رکمنی کے والد میں علاوہ ہم قوم ہونے کے ربط و اتحاد تھا' ان کے کہنے سننے اور سمجھانے سے رکمنی آشرم میں داخل کی گئی اور اسکے درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہوا - رکمنی بچپن میں بڑی خوبصورت لڑکی تھی' اب شباب جو آیا تو اسنے اسے اور چار چاند لگادئیے - اٹھارھویں سال یہ کلی چٹک کر گلاب کا پھول ہو گئی - طبیعت کے بھولے پن' شباب کی شوخی اور تعلیم وتربیت کی جلا نے اسکو یکتائے روزگار بنا دیا - بچپن کی شادی اور موت کے حادثے کے معنی وہ اب سمجھنے لگی تھی' لیکن اُس کی فطرتی خندہ پیشانی پر ابھی بل نہیں پڑے تھے' چونکہ زمانے کی ٹھوکریں اُس نے ابھی نہیں کھائی تھیں' وہ مایوسی کے خیال سے بیگانہ تھی - اس کے دیکھتے دیکھتے آشرم کی کئی بال بدھوا سکھیوں کی شادی ہو چکی تھی؛ اس لئے شباب کی امنگوں اور امیدوں سے منہ چھپانے کی مجبوری وہ کبھی محسوس نہ کرتی تھی - دیوان صاحب رکمنی کے والد کو اس کی دوسری شادی کرنے پر رفتہ رفتہ آمادہ کر رہے تھے' گو یہ آمادہ نہ ہوئے تھے' لیکن اب اس خیال کی پہلی سی مخالفت بھی نہ کرتے تھے - ان باتوں کی بھنک رکمنی کے کانوں تک بھی پہنچتی رہتی تھی - اسی زمانے میں رکمنی کی آنکھیں جانکی سے چار ہوئیں - جانکی بائیس تیئیس برس کا خوشرو جوان لڑکا تھا - جیسا خوشرو تھا ویسا ہی ذہین' ہوشیار اور تعلیم یافتہ بھی تھا - رکمنی اور جانکی کے گھرانوں میں دوردراز کا رشتہ تھا' اور میل جول ہونے کی وجہ سے آنا جانا بھی تھا - جوانی دیوانی ہوتی ہے اور اس عمر میں محبت کا آزار مہلک ہوتا ہے' بالخصوص سیدھی سچی طبیعتیں اس آزار سے جان بر نہیں ہوتیں - چنگاری لگتے ہی شعلے بھڑک اٹھے - عورت جب اپنے محبوب پر دل اور جان فدا کرنے لگتی ہے تو قانون اور رواج کی پابندیاں ڈھیلی ہونے لگتی ہیں اور پھر قدموں کی لغزش کرنے میں دیر نہیں لگتیں - بھولی بھالی رکمنی کو جانکی شادی کی امید اور بھروسا دلاتا تھا اور غالباً اس وقت اس کا وعدہ اور

بھروسا نیک نیتی اور سچائی پر مبنی تھا - رکمنی شادی ہو جانے کو یقینی امر سمجھتی تھی ، لیکن شوق کی بیتابی اور شدت انتظار بلاے جان تھے - ضبط وبے تابی کی کشمکش کچھ روز تک تو قابل برداشت رہی ، لیکن تابہ کے - بالآ خردیا کا پردہ اٹھہ کر آنکھوں پر پڑ گیا اور نتیجہ جو ایسی حالت میں ہوا کرتا ہے ہوا -

وملا : ہے ہے - غضب یہ دیدہ دلیری، ماں باپ کا منہ کالا کرنے سے بھی نہ ڈری —

شانتی : وملا - بات ذرا سونچ کر کیا کرو ، میں مانتی ہوں کہ اس سے غلطی ہوئی اور بڑی غلطی ہوی، وہ اپنے کئے کو بھوگ رہی ہے اور بری طرح بھوگ رہی ہے، لیکن کون سا انسان ہے جس سے غلطی نہیں ہوتی - میری اور تمہاری گود بھری ہے - جیتے رہیں دو دو تین تین بچے سامنے کھیل رہے ہیں - تمہارا سہاگ ہمیشہ قائم رہے، زندگی کی مسرتوں اور آرزووں کا دروازہ کھلا ہوا ہے ، کسی بات کی کوئی کمی نہیں - شادی کے وقت تم پندرہ اور میں سولہ برس کی تھی - کون جانتا ہے کہ میں اور تم اگر اس حالت میں ہوتے ، جس میں وہ تھی اور جو صورتیں اس کو پیش آئیں ، اگر ہم کو پیش آتیں تو ہمارے قدم کہاں تک ثابت رہتے - بڑا بول نہیں بولنا چاہئے - اس کی حالت قابل نفریں نہیں، قابل رحم اور قابل ہمدردی ہے —

ساوتری: بہن جی ! تم بات کو پورا کرو، اس کو تو بیچ میں بولنے کا مرض ہے - ہاں پھر کیا ہوا ؟

شانتی : جو کچھہ ہوا برا ہوا - مہینہ بیس روز تو خمار عیش باقی رہا، لیکن جب رکمنی کو حمل کے آثار ظاہر ہوے تو نشہ ہرن ہونے لگا - اس پر طرہ یہ کہ جانکی بزدلی اور بے حیائی سے بغلیں جھانکنے لگا اور چند روز بعد ہی اس نے آنا جانا بھی ترک کر دیا - ایک روز دفعتاً رکمنی نے سنا کہ جانکی بیرسٹری کا امتحان دینے کی غرض سے ولایت روانہ ہو گیا - دل تو

پہلے ہی سے لرز رہا تھا ' یہ سنتے ہی ہوش و حواس بالکل جاتے رہے - ننھی سی جان بے یار و مددگار ' بات منہ سے نکالنے کی نہیں ' اندر ہی اندر گھلنے لگی ' جب کرتے دھرتے کچھ بنتا نہ دکھائی دیا اور زندگی اجیرن معلوم ہونے لگی تو افیون کھا کر سو رہنے کی ٹھانی - اس زمانے میں رکمنی آشرم میں ہی رہتی تھی - آشرم کی مہری کو کچھ دے کر اسے افیون لانے بھیجا ; وہ بیوقوف تھی ' لیڈی سپرنٹنڈنٹ نے اسے افیون لےجاتے پکڑا ' راز کھل گیا - دیوان صاحب کو اطلاع ہوئی ' معاملہ سنگین معلوم ہوا ' انہوں نے اپنی بیوی سیتا دیوی سے جو آشرم کے کاروبار میں ان کا بہت کچھ ہاتھ بٹاتی تھی ' مشورہ کر کے انہیں رکمنی کے پاس بھیجا کہ پتہ چلائیں کیا معاملہ ہے - رکمنی پہلے تو پہلو تہی کیا کی بالاخر بہت کچھ سمجھانے بجھانے سے اس نے تمام کیفیت رو رو کر بیان کی - سیتا دیوی نے جن کو اس کے ساتھ بہت محبت تھی ' اس کی تسلی اور تشفی کی ' جو کچھ ماں کرتی اس سے زیادہ کرنے کا یقین دلایا اور واپس ہو کر سارا کچا چٹھا دیوان صاحب کے گوش گذار کیا - دیوان صاحب عجب مخمصے میں پڑے ' پریشان ہوئے ' لڑکی کے باپ سے سب حال کہا ' وہ پرانے خیال کے آدمی ' سنتے ہی چراغ پا ہو گئے ' اپنا منہ پیٹ لیا ' دیوان صاحب کو بھی لعنت ملامت کی اور تمام ذمہ داری آشرم کی تعلیم و تربیت پر ڈالی - اپنی ماں ہوتی تو چاہے جو کچھ ہوا تھا ' لڑکی کے کام آتی اور سہولت کی سبیل سوچتی - سوتیلی ماں تھی اسے صرف بدنامی کا خیال تھا ' اس نے شوہر کے اور کان بھرے ' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ماں باپ دونوں نے لڑکی سے قطع تعلق کرنے اور اسے تن بہ تقدیر چھوڑنے کا فیصلہ کر کے دیوان صاحب کے سر منڈھا کہ تمہارا ہی سب کچھ کیا ہوا ہے ' اب جو چاہو کرو ' ہم سے کچھ واسطہ نہیں —

دیوان صاحب نے ان کے یہاں سے واپس ہو کر یہ سب گفتگو سیتا دیوی کو سنائی اور پوچھنے لگے کہ اب کیا کیا جائے :

سیتا دیوی : کچھ سمجھ میں نہیں آتا، ماں باپ ڈھنگ کے ہوتے تو سو ترکیبیں ہو سکتی تھیں، لڑکی کو کچھ دنوں کے لئے یہاں سے ہٹا دیا جاتا - بچہ ہو جانے پر اس کی غور و پرداخت کا بھی کچھ نہ کچھ انتظام ہو ہی جاتا، لیکن یہ تو اسطرح سے الگ ہو کر دور بھاگے کہ گویا کوئی واسطہ ہی نہیں —

دیوان صاحب: یہی تو مصیبت ہے، میرا خیال نہ تھا کہ یہ ایسی خود غرضی اور نالائقی سے کام لیں گے - اب اگر کوئی دوسرا اس معاملے میں ہاتھ ڈالے بھی تو کس برتے پر - بات بالکل چھپی تو رہیگی نہیں، جو اس میں دخل دیگا، اسی کی روسیاہی ہوگی اور لوگ طرح طرح کی باتیں بنائینگے -

سیتا دیوی : پھر حال جو کچھ بھی ہو، دیدہ و دانستہ تو لڑکی کو افیم کھاکر سونے دونگی نہیں، نیک نامی ہو یا بد نامی —

دیوان صاحب: تو تم نے کیا سوچا ہے —

سیتا دیوی : میں ارادہ کر چکی اور اس سے کہہ چکی ہوں کہ ساتھ لے جا کر اپنے گھر رکھوں گی —

دیوان صاحب: دنیا مجھکو اور تم کو کیا کہیگی، یہ بھی تو سوچ لو —

سیتا دیوی : تو تم لڑکی کو سڑک پر نکال باہر کرنے کے لئے تیار ہو ؟

دیوان صاحب: یہ کیسے ہو سکتا ہے —

سیتا دیوی : تو پھر اس کے علاوہ اور کیا چارہ ہے —

دیوان صاحب: یہ بھی سہی، پھر بھی تو گمنام باپ کے بچے کی پرورش اور زندگی ماں اور بچے دونوں کے لئے سوہان روح ہو گی - ہماری سوسائٹی میں ایسے بچے اور ماں کے لئے کہیں گنجایش ہے ؟

سیتا دیوی: یہ ٹھیک ہے ' میں تو تین روز سے اسی اُدھیڑ بن میں دن رات لگی ہوی ہوں ' کوئی ڈھنگ کی بات سمجھ میں نہیں آتی - ایک بات سوچی ہے' پر کہتے ہوے جھجکتی ہوں کہ تم کہیں خفا نہ ہو -

دیوان صاحب: خفا کیوں ہوں گا -

سیتا دیوی: خفا ہو نے کی کوئی بات تو نہیں' بشرطیکہ سمجھ میں آ جاے -

دیوان صاحب: کہو —

سیتا دیوی: بچہ گمنام باپ کا کیوں رہے' اگر تم اس کے باپ بننے کی قانونی ذمہ داری لے لو تو یہ دشواری بھی حل ہو سکتی ہے —

دیوان صاحب: (چونکر) کیا معنی ؟ —

سیتا دیوی: معنی بالکل صاف ہیں - دو جانوں کے ضائع ہو نے اور دو زندگیوں کے سنور نے کا سوال ہے - بڑی ہمت کا کام ہے' لیکن تمھارے سے ہمت والے آدمی سے بعید نہیں —

دیوان صاحب: تمھاری تجویز یہ ہے ....

سیتا دیوی: کہ تم رکمنی کو عقد میں لے آؤ - آنند بواہ کے طریق سے یہ شادی ہوسکتی ہے - تم دو جانوں کو ضائع ہونے سے بچا سکتے ہو اور دو زندگیاں ٹھکانے لگا سکتے ہو -

دیوان صاحب: (سوچ کر) ہاں یہ ہوسکتا ہے' لیکن لوگ مجھے کیا کہینگے اور میں لوگوں کو کس طرح منہ دکھاؤنگا —

سیتا دیوی: تم نے تو روز اول سے اس کی پروا کی نہیں' آج لوگ تمھیں بھلا کہتے ہیں' جب آشرم کھولا تھا' لوگوں نے مطعون کر نے میں کوئی کسر اُٹھا رکھی تھی ؟ پر تم نے پروا نہ کی —

دیوان صاحب: آشرم کا کیا حشر ہوگا' سوشل رفارم کی تحریک کیسی بدنام ہوگی —

سیتا دیوی: میرے سامنے ان دلیلوں کی کوئی وقعت نہیں ' جب تم نہیں ہوگے آشرم کیسے چلے گا' اگر تم ہمت کرنے کو تیار ہو تو

میری نگاہ میں اس سے بڑا اور اس سے زیادہ پراُوپکار کا کام اور دوسرا نہیں ہوسکتا۔

دیوان صاحب: (سوچ کر) سوچوں گا۔ کل تک کی مہلت دو۔ دیوان چہرام دوارکاداس بڑے دل گردے کے آدمی تھے، ان کی نگاہیں ہمیشہ اُونچی رہتی تھیں، ہمت اور ایثار اب ان کی طبیعت کا خمیر ہو گیا تھا، ان کی ذات اب لوگوں کی تعریف و تحسین سے مستغنی تھی۔ انھوں نے چوبیس گھنٹے معاملے کے سب پہلوؤں پر غور کیا، پھر خوش خوش اپنی بیوی کے کمرے میں گئے، اُن کی آنکھیں جوش مسرت سے نمناک تھیں، بیوی کی پیشانی پر بوسہ دے کر بولے: "تم نے جو کچھ کہا مجھے منظور ہے، اگر اس وقت میں اپنے فرض انسانی کے ادا کرنے کی ہمت کر رہا ہوں، تو یہ ہمت تمہاری دی ہوئی ہے اور تمہارے ہی بوسوں کا صدقہ ہے، مرتے دم تک مجھے اس بات پر ناز رہیگا کہ میری سی بیوی دوسرے کو نصیب نہ ہوئی ہوگی، جاؤ اب رکمنی کو معاملہ کی تمام صورت سمجھا کر راضی کرو"—

ایک مہینہ ہوا کہ شادی ہو گئی، رکمنی قانون اور قوم کی نگاہ میں دیوان چہرام دوارکا داس کی نئی نویلی دلہن ہے لیکن خود اُن کی اور سیتا دیوی کی نگاہ میں اُن کی پوتی اور نواسی کی حیثیت رکھتی ہے، قوم کے آگے اُسکی نگاہیں نیچی نہیں ہوتیں، اپنے پیدا ہونے والے بچے کو اب چھاتی سے لگانے میں اُسے شرم کرنے کی کوئی وجہ نہوگی، لیکن شباب کے اُن اُمنگوں اور ارمانوں کی طرف جنھیں اُس نے اب ہمیشہ کے لئے دفنا دیا ہے، جب کبھی اُس کا خیال آجاتا ہے، تو دل میں ایک ٹیس اٹھتی ہے، جس کا صرف ایک سرد آہ سے پتہ چلتا ہے اور بس۔ دیوان چہرام دوارکاداس کا لوگ اپنی اپنی صحبتوں میں طرح طرح سے مذاق اُڑاتے ہیں اور بری طرح مطعون کرتے ہیں۔ اُن کے کانوں تک بھی یہ چرچے پہنچتے ہیں، لیکن اس مردخدا کی

پیشانی پر لمحہ بھر کے لئے بھی بل نہیں پڑتا —

ساوتری : شانتی بہن تم تو یہ واقعات بیان کررہی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا میں کوئی افسانہ سن رہی ہوں اگر یہ واقعات تمہاری زبان سے نہ سنے ہوتے تو میں ان کو ہرگز یقین کرنے کے لئے تیار نہ ہوتی —

شانتی : ساوتری ! بعض واقعات زندگی افسانے سے بھی عجیب تر ہوتے ہیں دیکھو انسان بھی کیا طرفہ تماشا ہے کوئی ذلیل سے ذلیل ایسی حرکت نہیں جو اس سے سرزد نہ ہوتی ہو اسی کے ساتھ یہ بھی انسان ہی کا جوہر ہے کہ ایسے ایثار اور حوصلے کی ہمت کرسکتا ہے کہ فرشتے بھی اس کے دامن پر نماز پڑھیں —

سسي پنوں

از

(جناب نور الهي و محمد عمر صاحبان)

یوں تو سسی پنوں کی داستان عشق کئی زبانوں میں سنی جاتی ہے۔ مگر پنجاب اور سندھ سے اسے خاص تعلق ہے - جہاں اس کے قبول عام کا یہ عالم ہے کہ بچے سے لے کر بوڑھے تک اس پر سر دھنتے ہیں - سندھ اس ٹریجڈی کا محل وقوع ہے - وہاں اسے مذہبی تقدس حاصل ہونا کوئی بات نہیں، مگر پنجاب میں اسے جو حسن قبول ملا وہ حیرت انگیز ہے - افسانے کی جزئیات میں پنجاب اور سندھ کو اختلاف ہے - اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی اور سندھی روایتوں کو الگ الگ بیان کریں —

پنجاب

پنجابی بولی میں جو قصے عوام الناس کے دل بہلانے کے لئے نظم میں بیان کئے گئے، ان میں بلحاظ چند خصوصیات سسی پنوں کو درجۂ امتیاز حاصل ہے - اس کے علاوہ پنجابی میں ہیر رانجھا، سوھنی مہینوال، سیف الملوک اور شاہ بہرام کے قصے مشہور ہیں - ہیر رانجھا کی کہانی کو وارث شاہ اور فضل شاہ دو شاعروں نے آسمان پر پہنچا دیا۔ مگر لاھورا سنگھ اور مقبول کی تصنیفات بہت ادنی درجے کی کاوشیں ہیں - یہ قصہ صرف پنجابی بولی میں ہے اور اس کی قبولیت صرف پنجاب

تک محدود رہی - ہندوستان کے دیگر صوبوں میں اس کا بہت کم چرچا ہوا -
رسالۂ مخزن کے دور اول میں اس قصے کو "ہندوستان پسند" بنانے کی کوشش کی گئی'
لیکن یہ مساعی بار ور نہ ہوئیں - اس سے قبل دہلی اور لکھنو میں جو اس وقت
پایۂ تخت ہونے کے باعث علم و فضل کے مرکز تھے' ثقات اس قصے کو مبتذل اور
عامیانہ مذاق کی چیز خیال کرتے رہے اور شاید اسی کی بدولت پنجابی ذہنیت ان
مقامات میں چنداں رفعت کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی تھی - چنانچہ دہلی اور
لکھنو کے دو نامور شاعروں کے دو شعر اس حقیقت پر بلا واسطہ روشنی
ڈالتے ہیں :-

(انشاء) سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

(بحر) سن کے میری سرگذشت احباب یہ کہنے لگے :
'بحر' کا قصہ بھی افسانہ ہے رانجھے ہیر کا

قصہ مختصر شعرائے فارسی و اُردو نے اس قصے کی طرف بنظر التفات نہیں
دیکھا - ورنہ ایک خوبصورت دلفریب مثنوی آسانی سے تیار ہوجاتی - دیگر
قصص مذکور صرف "صوبیانہ"* شہرت رکھتے ہیں اور پنجاب سے باہر شاید ہی کسی
نے ان کا نام سنا ہو - یہ کہنا صحیح نہیں کہ دارالخلافے والے پنجابی سے نا آشنا
تھے' اس لئے وہ اس سے حلاوت اندوز نہ ہوسکے - انشا کے چند پنجابی شعروں کو گو
آپ صرف ظرافت خیال کریں' پھر بھی اس بات پر تو دلالت کرتے ہیں کہ سید انشا
پنجابی سے نا واقف' نہ تھے اور سودا کے کلیات میں تو پنجابی زبان میں مرثیہ
موجود ہے - دور کی باتیں جانے دیجئے' خود پنجاب میں فارسی شعرا کا قحط نہ
تھا - در اصل بات یہ ہے کہ ان حضرات نے ان قصوں کو در خور اعتنا خیال

---

* Provincialism کا ترجمہ "صوبیت" مقبول ہوچکا ہے' اس لئے Provincial کا
ترجمہ "صوبیانہ" وضع کیا جاتا ہے —

نہ کیا - اب سسی پنوں کے قصے کو لیجئے تو فارسی، اُردو، سندھی، پشتو اور پنجابی میں اس پر کئی کتابیں ملیں گی —

میر محمد پھکری نے اس قصے کو اپنی مثنوی "حسن و ناز" میں موزوں کیا۔ اس کے بعد محمد شاہ کے عہد میں قاضی مرتضیٰ سورتی نے اس کی بنیادوں پر ایک مثنوی "شہید ناز" کا قصر بلند کیا۔ اس کہانی کو مولانا شرر مرحوم نے اپنے رسالے میں بڑی نوک پلک سے شائع کیا - متداولہ کتب کی رو سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ پنجابی میں سب سے پہلے حافظ رانجھا برخوردار نے سنہ ۱۱۷۶ ھ میں اس قصے کو کتاب کی صورت میں پیش کیا - یہ نسخہ نا پید تھا اور اس کا ایک محرف ایڈیشن حافظ برخوردار کے نام سے منسوب ہوا - آخر مولوی احمدالدین نامی حافظ صاحب کے ایک عزیز نے اصلی نسخہ نکالا، جو سنہ ۱۳۲۲ ھ میں افدر پریس سیالکوٹ میں شائع ہوا - اس کے بعد ہاشم کی مقبول عام نظم عالم ظہور میں آئی - لیکن اس کی تاریخ تصنیف کا پتہ نہیں ملتا - چودھری شہباز سیالکوٹی نے سنہ ۱۲۵۰ ھ میں ہاشم کی روایت کے مطابق "وقائع پنوں" پر تکلف زبان اور رعایت لفظی میں ڈوب کر فارسی میں منظوم کیا - اس کے ایک شعر سے پایا جاتا ہے کہ بوقت تحریر ہاشم اور برخوردار کی تصنیفات اس کے سامنے تھیں :

زمین پیش بسے شعرا گفتہ این قصہ بہ پنجابی زبان
چوں حافظ رانجھا ہاشم ہم برجستہ سخن جو بستہ میاں

یہاں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ وقائع پنوں میں پنوں کے بیہوش ہوجانے کے بعد کا حال منشی محمد حسین کے قلم کا مرہون منت ہے - یعنی اس کی تکمیل میں دو شاعروں کا حصہ ہے - اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہاشم کا قصہ سنہ ۱۲۵۰ ھ سے قبل موجود تھا - پھر مولوی غلام رسول کی کتاب سنہ ۱۲۹۴ ھ میں تصنیف ہوئی اور سنہ ۱۲۸۰ ھ میں فضل شاہ نے داد سخن دی - آخر میں میاں محمد بوٹا گجراتی نے اس قصے کو سنہ ۱۳۲۰ ھ میں نظم کیا۔

برخوردار کے قصے کی کتھا سیدھی سادھی، الجھاؤ سے پاک اور تصنع سے معرا ہے اور یہی بات اسے فخر تقدم کا مستحق قرار دیتی ہے۔ ہاشم نے چند باتیں اضافہ کر کے داستان کو زیادہ حیرت انگیز اور عوام کے مذاق کی چیز بنا دیا ہے۔ غلام رسول نے ہاشم کے پلاٹ کا رنگ اور چوکھا کر دیا ہے۔ اور زبان ایسی لکھی کہ اردو کے بہت قریب پہنچ گئی۔ پنجاب کے حلقۂ مشائخ و صوفیا میں یہ کتاب وجدان پیدا کرتی ہے اور اس سے بہت سے رموز تصوف وابستہ کئے جاتے ہیں *
فضلشاہ نے اتنی سی بات کو ایک ضخیم فسانہ کر دیا ہے۔ موعظت کا پہلو اس قدر نمایاں ہے کہ انیس الواعظین سے التباس پیدا ہوتا ہے۔ رعایت لفظی کا اس قدر التزام ہے کہ شہباز بھی ماند ہوگیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امانت، نسیم، بحر، اور رشک کی ارواح عالم امکان میں آنے سے پہلے فضلشاہ کے کالبد میں جمع ہوگئی تھیں۔ بوٹا کی کاوش محض لہو لگا کے شہیدوں میں شامل ہونا ہے، فضلشاہ کی صدائے باز گشت ہے، کوئی جدت یا ندرت اس میں نہیں پائی جاتی —

پنجاب میں اس قصے کے باوا آدم حافظ برخوردار ہیں۔ نام رانجھا، تخلص برخوردار، حافظ قرآن تھے۔ حافظ بھی تخلص کرتے تھے، وطن مالوف ہزارہ ہے۔ جوان ہو کر وہاں سے نکلے اور لاہور آ کر تعلیم میں مشغول ہو گئے۔ لیکن اس زمانے تک سیالکوٹ مرکز علم و فنون تھا، جس کی خاک سے سعداللہ خاں وزیر اعظم شاہجہاں، تفضل حسین خاں مدار المہام اودھ اور مولانا عبدالحکیم جیسے باکمال پیدا ہوے۔ اس لئے سیالکوٹ کا رخ کیا۔ اور وہاں ایسے آئے کہ پھر جانے کا نام نہ لیا۔ یہیں کسی اچھے گھرانے میں شادی ہو گئی اور بال بچوں کی محبت پانوں کی زنجیر بن گئی۔ اب درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا، جس کے دوران میں

---

* یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی کے امتحان پنجابی کے نصاب میں داخل ہے —

قصہ سسی و پنوں تصنیف ہو کر حیات جاوداں کا موجب بنا -

بر خوردار بعد مختصر حمد وثنا کے قصے کو یوں بیان فرماتے ہیں :

شہر بھنبھور کا راجہ آدم جام بڑی شان سے حکومت کرتا تھا - کوئی چیز نہ تھی جو اُسے میسر نہ ہو' لیکن اولاد سے محروم تھا - آخر رانی کے آثار حمل نمودار ہوے - اور راجہ نے جو تشیوں کو بلا کر جنین کی قسمت کا حال پوچھا - انہوں نے زائچھ دیکھ کر کہا کہ رانی کے بطن میں جو لڑکی ہے اس پر ہزاروں مصیبتیں پڑینگی - کسی مسلمان کے ساتھ آنکھ ملا کر اٹھ جائیگی - اور ریگستان میں محبت کی بھینٹ چڑھیگی - لاج اور راج کی سلامتی اس میں ہے - کہ پیدا ہوتے ہی اسے یا تو دریا میں بہا دیں ' زہر دیدیں' یا گلے میں رسی باندھ کر لٹکا دیں - لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے - یہ سنکر راجہ بہت دلگیر ہوا اور رانی بھی کانپنے لگی - جب لڑکی یعنی سسی پیدا ہوئی تو رانی اس کا حسن دیکھ کر حیران رہگئی - آخر یہ فیصلہ ہوا کہ اس مانک موتی کو دریا کے نذر کیا جاے' اسے صندل کے صندوق میں ڈالا اور اس میں تین حصے زرو جواہر کے رکھ دیے' ایک حصہ اس کی پرورش کے لئے' دوسرا تعلیم اور تیسرا شادی کے اخراجات کے لئے - لڑکی کا حسب و نسب اور اخراجات کی تفصیل ایک کاغذ پر لکھ کر اس کے گلے میں بطور تعویذ کے باندھ دیا - یہ انتظام کر کے صندوق کو منجدھار میں ڈالا - آخر حضرت خضر کی رہنمائی سے یہ صندوق اس مقام پر پہنچا ' جہاں آتا نامی دھوبی کپڑے دھورہا تھا - دھوبی نے صندوق کو پکڑ لیا - گھر لے جاکر عورتوں میں کھولا تو ایک جیتی جاگتی پیاری پیاری لڑکی کے ساتھ زرو جواہر کا ڈھیر نکلا - انہیں تو صندوق میں ڈالکر اندر رکھا اور لڑکی کی پرورش میں مصروف ہو گئے - جب سسی نے لڑکپن کے کوچے میں قدم رکھا تو اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا - اس کے حسن کا چرچا ہونے لگا - دھوبیوں کے ہاں سے پیغام آنے لگے اور کپڑے دھونے میں کمال کو انہوں نے ذریعۂ کامیابی بنایا - مگر اتا ٹالتا رہا -

ایک شب کو سسی جوانی کی نیند کے مزے لے رہی تھی کہ اس نے خواب میں ایک شکیل وجمیل جوان رعنا دیکھا اور اسے دیکھتے ہی دل ہاتھہ سے جاتا رہا - دوسری بار پھر ایساهی اتفاق هوا - تیسری بار خواب میں آیا تو اس نے بتایا کہ وہ کیچ شہر کا شہزادہ ہے اور اس کا نام پنوں ہے - سسی اٹھی تو برسوں کی بیمار معلوم ہوتی تھی - چہرہ زرد ، لب پر آہ سرد ، نہ کھانا نہ پینا ، گھنٹوں الگ چپکے بیٹھے رہنا - یہ حالت دیکھہ کر سسی کی ماں یعنی دھوبی کی بیوی نے خیال کیا کہ جوان لڑکی شادی کے لئے کڑہ رہی ہے - اس لئے اسے تسلی دینے کی غرض سے کہا کہ بیٹی غم نہ کر، جلدی کوئی اچھا سا دھوبی ڈھونڈہ کر تیری شادی کئے دیتی ہوں - سسی نے کہا کہ راجوں مہاراجوں پر بھی کڑے وقت آیا کرتے ہیں، لیکن وہ رذیل اور اجلاف کے ساتھہ شادی نہیں کیا کرتے - دیکھنا سفید چادر میں داغ نہ لگا دینا ، جو مٹائے نہ مٹے - جب تخت پر کوئی جوتی سیہت چڑھتا ہے تو عرش میں زلزلہ آ جاتا ہے - ماں نے کہا : اری تو جوان ہو کر کیا باتیں بنارہی ہے- ابھی کل کی بات ہےکہ تجھے کھانے تک کی تمیز نہ تھی اور اب تو راجاوں کے نسب نامے کھول کر بیٹھہ گئی راجاؤں وزیروں کے رنگ محل کبھی دیکھے بھی ہیں- سسی نے کہا: مجھے کیا پڑی ہے جو راجاؤں اور وزیروں کے گھروں میں جھانکتی پھروں- آنکھیں وہ مانگتے ہیں جو بینائی سے محروم ہوں - جواہرات اپنی جگہ پر آپ پہنچ جاتے ہیں، انہیں اپنے لائق مقام تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی - رذائل کے سر پر چتر شاہی زیب نہیں دیتا - بلبل و بوم کا رشتہ نہیں ہوا کرتا - اس دانتا کلکل کے بعد سسی خیال یار میں مگن ہو گئی اور عملی طور پر اسے گرد و پیش کے حالات سے کوئی علاقہ نہ رہا - تھوڑے دنوں بعد وہ زندگی سے مایوس سی ہو گئی اور صرف اس آرزو سے بر آنے کے خیال سے دل بہلاتی رہی کہ شاید دم واپسی پنوں کی شکل دیکھہ لے —

ایک دن سسی کپڑے لے کر راجہ کے محل میں گئی تو راجا اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ راجا نے سسی کو ایک نو لکھا باغ عنایت کیا اور گھاٹوں کا محصول اسے بطور مقرری بخشا - سچ ہے، جب خدا دینے پر آتا ہے تو اسباب آپ سے آپ پیدا ہوجاتے ہیں - ساون کے مہینے میں چمن خود بخود رونق پر آجاتے ہیں - سسی نے تمام گھاٹوں پر اپنے آدمی بٹھادئے اور حکم دیا کہ جو کوئی دریا عبور کرے پہلے اپنی جنم بھوم درج کرائے- پھر سسی نے اس نولکھے باغ میں رنگ محل تعمیر کرایا، گویا بہار کے اندر ایک دوسری بہار پیدا ہو گئی۔ مگر سوز فراق میں کوئی کمی نہ ہوئی اور آنسو بہاتے بہاتے اس کی آنکھیں سوجھ گئیں —

اس عرصے میں ایک دن شہر کیچ سے ایک قافلہ آیا، جس کے ساتھ کئی اونٹ مشک کے تھے - وہ مختلف رنگوں کے کپڑے پہنے ہوے تھے - حسن و جوانی میں ایک سے ایک بڑھ کر تھا - کثرت خوشبو سے جنگل تا تار بن گیا - گویا قدرت پنوں کے خیر مقدم کی تیاری کر رہی تھی - اس قافلے کے سالار ببن اور بیبا نامی دو شخص تھے - سسی کو جب معلوم ہوا کہ وہ شہر کیچ سے آ رہے ہیں تو اس نے ان قافلہ کےسالاروں کو اپنے پاس بلایا - اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد سسی نے کہا کہ کسی طرح پنوں کو یہاں بلاؤ - اس یوسف نے مجھے زلیخا کی طرح دیوانہ بنا رکھا ہے - اُنھوں نے بہت عذر اور منت کی مگر سسی نے ایک نہ مانی - آخر صلاح و مشورہ کے بعد ببن شہر کیچ کو روانہ ہوا، جب وہاں پہنچا تو دربار میں جا کر فریاد کی کہ پنوں کے لئے سسی نے ہمیں باندھ رکھا ہے - وہ وہاں جاے تو ہمیں آزادی ملے عالی خاں فرما رواے کیچ یہ قصہ سن کر حیران ہوا - پنوں نے جب ساری داستان سنی اور اُسے سسی کے حسن و جمال کا حال معلوم ہوا تو وہ بھنبور جانے پر تیار ہو گیا - عالی خاں اور اس کی بیگم نے لاکھ منع کیا لیکن وہ سنی ان سنی کر کے روانہ ہو ہی پڑا - جب یہ خبر عام ہوئی تو شہر میں کہرام مچ گیا - بیگم کی فرط غم سے بھوک پیاس بند ہوگئی- عالی خاں یعقوب وار اپنے یوسف کے لئے دھاڑیں

مار مار کر رویا ' لیکن سب بیکار - پنوں پر خاک اثر نہ ہوا - بھلا جب حضرت عشق ڈیرے ڈالیں تو عقل و شعور وہاں کیسے ٹھیر سکتے ہیں - اونٹوں پر محمل رکھے گئے اور وہ ہوا کی خبر لانے لگے —

یہ قافلہ ریگستان کو طے کر کے شہر بھمبور میں پہنچا اور نولکھے باغ میں جا اُترا - صحرانورد اونٹوں نے مہینوں سے گھاس کا تنکا نہ دیکھا تھا ' سرسبز اور شاداب باغ کو دیکھ کر اُن کے منہ میں پانی بھر آیا ' انھوں نے خوب ہاتھ صاف کئے اور تھوڑی دیر میں باغ کو برگ و بار سے سبکبار کر دیا - باغبانوں نے جا کر فریاد کی تو سسی سہیلیوں کے دل بادل جھرمٹ سے بجلی کی طرح چمک کر اٹھی اور ایسا معلوم ہوا کہ یہ برق بلا عاشق تنوں کے خرمن حیات کو جلا کر خاک کردے گی - لیکن پنوں کو دیکھا تو قہر و غضب کے بادل چھٹ گئے اور وہ پھولی نہ سمائی - پھر حکم دیا کہ پنوں رہے اور باقی سب لوگ کیچ واپس چلے جائیں - پنوں نے ماں باپ کے نام پیغام دئے اور اُنھیں الوداع کہکر سسی کے پہلو میں جابیٹھا۔ اب سسی نے پنوں سے کہا کہ گو میں راجا کی بیٹی ہوں مگر دیکھنے کو میرے والدین دھوبی ہیں اور بغیر دھوبی کے وہ کسی سے میری شادی پر رضا مند نہ ہوں گے - اس لئے تم تھوڑی دیر کے لیے دھوبی بن جاؤ - پنوں نے بقول "رشتۂ در گردنم افگندہ دوست "- دھوبیوں کا بانا پہنا اور سسی کے ساتھ گھاٹ پر گیا - سسی نے ماں کو تو دو چار باتوں میں راضی کر لیا لیکن دھوبی نے اپنی تسلی کے لئے پنوں کا امتحان لینا چاہا کہ وہ دھوبیوں کے کام میں کس قدر ماہر ہے - اللہ کو اس کی عزت رکھنی منظور تھی ' پنوں نے اندے کی طرح کپڑے اُجلے کر دکھائے - یہ سب حضرت عشق کے کھیل ہیں ' انھیں کے طفیل صنعان نے سور چرائے ' یہ شہزادہ ذرا دھوبی بن گیا تو کیا ہوا - اب اتا دھوبی نے بڑے پیمانے پر دعوت کی اور سسی کا نکاح پنوں کے ساتھ کر دیا - اور اچھا جہیز دے کر رخصت کیا - سسی پنوں فلک بے مہر کی چالوں سے بے پروا ہو کر چین کی زندگی بسر کرنے لگے —

اب اُدھر کا حال سنیے ۔ بھن اور بیبا روتے پیٹتے کیچ شہر میں پہنچے اور عالی خان کو ساری واردات سنائی ۔ اس کے ہوش اُڑ گئے اور بیگم پچھاڑیں کھانے لگی ۔ آخر وہ بھن پر برس پڑا اور اُس کی بری گت بنائی اور پنوں کے تینوں بھائیوں کو حکم دیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، جاکر پنوں کو لے آؤ ۔ یہ تینوں شہزادے بڑے کار آزمودہ اور ریگستان کی راہوں سے خوب آگاہ تھے اور جلد بھمبوز پہنچ گئے پنوں سے ملے ۔ گھر کا حال بیان کرکے پند و نصیحت کا دفتر کھولا ۔ مگر پنوں نے کچھ توجہ نہ کیا ۔ جس کے دل و دماغ کا محافظ عشق ہو، وہ کسی کے فریب میں کس طرح آسکتا ہے ۔ اب پنوں کے بھائیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ سیدھی اُنگلیوں گھی نہیں نکلتا ، پنوں کو بیہوش کرکے عالم بے خبری میں نکال لے جائیں ۔ وہ پنوں کے پاس گئے اور اُس سے کہا کہ ہم صبح وطن جائیں گے ، پھر خدا جانے کب مل بیٹھنا نصیب ہو، اس لئے آئیے ذرا جام و صراحی سے دل بہلائیں ۔ چنانچہ سسی کی شرکت سے بزم عشرت منعقد ہوی اور مئے ارغوانی کا پیالہ گردش میں آیا ۔ جب سسی اور پنوں دونوں مدھوش ہوگئے تو اُنھوں نے پنوں کو محمل میں ڈالا اور روانہ ہوگئے —

صبح کو سسی جاگی تو آغوش خالی دیکھ کر اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑگئے ، دیوانہ وار چاروں طرف ڈھونڈھنے لگی ۔ باغ کا کونہ کونہ چھان مارا ، کوئیں میں بانس ڈالے مگر کچھ پتا نہ چلا ۔ آخر بھانپ گئی کہ یہ کیچ والوں کی شرارت ہے ۔ اور وہ اُسے جُل دیکر پنوں کو لے اُڑے ہیں ۔ ماں اور سہیلیوں نے بہت سر مارا ، مگر سسی نے ایک نہ سنی ، پنوں کی تلاش میں تن تنہا نکل کھڑی ہوئی اور ریگستان میں تلکے چننے لگی ۔ پاؤں میں چھالے پڑگئے ، چلنے کی سکت نہ رہی ، پیاس کے مارے ہونٹ خشک ہوگئے ۔ سسی کی حالت ایسی درد ناک تھی کہ وحوش و طیور اُس پر رحم کھاتے تھے اس بیابان میں اُسے ایک گڈریا دکھائی دیا ۔ اور وہ گرتی پڑتی اس کے پاس پہنچی ۔ وہ حیران ہوگیا کہ یہ دھان پان دوشیزہ یہاں کس طرح آگئی ۔ آخر کار اس نے حال پوچھا تو سسی نے اپنی رام کہانی کہہ سنائی ۔ گڈریے نے کہا : ہی ہی تین دن

ہوے ایک قافلہ یہاں سے گذرا ' جو اونٹوں کو بگ ٹٹ دوڑائے جاتا تھا - ایک محمل میں ایک شخص پڑا اُونگ رہا تھا - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نشے میں ہے' اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے' مگر اُسے سر پیر کی خبر نہ تھی - وہ اب سیکڑوں کوس نکل گئے ہونگے ' تو پا پیادہ اُنہیں قیامت تک نہیں پاسکتی - میرا کہا مان واپس ہوجا - ناحق جان پر نہ کھیل - سسی نے کہا : بھائی تو دل کی لگی کیا جانے ' محبت سے منہ موڑنا اپنا شیوہ نہیں - جان جاتی رہے تو جائے' مگر تلاش چھوڑدوں یہ محال ہے - گڈریا اپنا فرض ادا کرکے چلاگیا اور سسی وہیں تڑپتی رہگئی —

دوسرے دن گڈریا پھر وہاں آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس حوروش کی بجاے ایک لاش پڑی ہے - ادھر جو پنوں کا نشہ اُترا اور صورت حال معلوم ہوئی تو وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا - اُس نے بھائیوں کو بہت ڈانٹا اور اونٹ کی مہار موڑکر بھمبور کی طرف چل پڑا - چلتے چلتے اس مقام پر پہنچا جہاں گڈریے نے سسی کی قبر بنائی تھی تو وہ ٹھیرگیا اور گڈریے سے پوچھا یہ کس کی قبر ہے جس کی مٹی سے مجھے کسی کی خوشبو آرہی ہے - گڈریے نے کہا : ایک خوبصورت عورت تھی ' نام اُس کا سسی تھا ' پنوں پنوں پکارتی تھی ' میں نے اُسے بہت کہا کہ آبادی میں چل کر آرام کرے ' مگر اُس نے قدم تک نہ اٹھایا - یہ سنکر پنوں غش کھاکر گرا ' قبر پھٹ گئی اور پنوں اُس میں جاگرا اور یہ محبت کے پتلے ایک دوسرے سے مل گئے —

اس خاکے میں ' ہاشم ' نے رنگ آمیزی کرکے اسے اور شوخ کردیا ہے - اس کے کلام میں شاعرانہ تکلف زیادہ ہے مگر ' برخوردار ' کے بے ساختہ اور بلا تکلف اشعار کا لطف کہاں - پلاٹ میں دو ایک جگہ تصرف کرکے قصے کو طویل اور زیادہ دلکش بنانے کی کوشش کی ہے' داڑھی کو بڑہ گئی مگر مولوی ' مدن ' کی سی بات پیدا نہ ہوئی - ' ہاشم ' کے اہم تصرفات حسب ذیل ہیں :

(۱) دھوبی راجہ بھمبور کے پاس فریادی ہوئے کہ ' آتا ' دھوبی کی بیٹی جوان ہوگئی ہے' مگر وہ برادری میں کسی سے رشتہ نہیں کرتا - راجہ نے سسی کو طلب

کہا - اس نے حاضر ہوکر وہ تعویذ پیش کیا' جو راجہ نے اُس کے گلے میں ڈالا تھا —

(۲) غزنی سے ایک سوداگر تصویریں لے کر آیا اور شہر بھمبور میں تصویر خانہ سجایا - اِن تصویروں میں پنّوں کی تصویر دیکھ کر سسی نے اصل کا حال پوچھا اور سوداگر سے پتہ نشان لے کر سسی اس پر نادیدہ عاشق ہوگئی —

(۳) اس گڈریے کا نام 'کاکا' تجویز کیا ' وہ سسی کو دیکھ کر ڈر گیا -

(۴) کاکا سسی کی قبر کا مجاور بن گیا -

(۵) شہد کی مکھیوں نے سسی کا حال زار دیکھکر پنّوں کو ہوشیار کیا -

(۶) پنّوں خودکشی پر آمادہ ہوگیا تھا' اس لئے بھائیوں نے اسے نہ روکا -

سادگی اورمعاکات کے لحاظ سے گو برخوردار کادرجہ بہت بلند ہے' مگرجو قبول عام اور ہمیشہ بہار ہاشم کو نصیب ہوئی وہ متقدمین و متاخرین میں سے کسی کے حصے میں نہ آئی' پنجاب میں لوہڑی کے دن ہندو مسلمان ملکر سسی پنّوں کا سوانگ نکالتے ہیں اور اس میں ہاشم کی سسی گاتے ہیں۔ اس لئے اس کے شعر پنجاب میں بچے بچے کی زبان پر ہیں —

سوانگ میں ایک اونٹ پر پنّوں اور سسی ہمردیف ہوتے ہیں اور ایک ساربان اونٹ کی مہار پکڑے رہتا ہے ' یہ سب کسی قدر مکالمے کی صورت میں ہاشم کے شعر پڑھتے ہیں - افضل شاہ نے قصہ تو ہاشم سے لیاہے مگر ہر بات کو طول دیکر بتنگڑ بنا دیا ہے۔ قصے میں دلاویزی پیدا کرنے کے بجائے دادسخن دینے کی طرف توجہ کی۔ البتہ یہ زیادتی کی ہے کہ راجہ آدم جام سسی پر فریفتہ ہو جاتا ہے' اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسکی بیٹی ہے تو عرق ندامت میں غرق ہوجاتا ہے' "ایجاد بندہ مگر سراسر گندہ" اسی کو کہتے ہیں —

سندھ

مولانا شرر لکھنوی بیان فرماتے ھیں کہ سندھ میں اس واقعے کو تاریخی منزلت حاصل ھے - عوام نے سسی پنوں کو اولیا کا مرتبہ دیا ھے - دلگداز بابت ستمبر سنہ ۱۸۹۸ میں تحفۃالکرام سے اخذ کر کے یہ قصہ اسطرح بیان کیا گیا ھے :

راجہ دلورائے کے زمانے میں سندھ کے ایک قدیم شہر بھام براھ میں نانیا نام برھمن رھتا تھا، جو ایک متوسط درجے کی عزت و حرمت سے اپنی بیوی سندر کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا - دونوں میاں بی بی کو مدتہائے دراز کی امیدوں کے بعد خدا نے ایک لڑکی عنایت کی، جس کا حسن وجمال آفتاب پر چشمک زنی کرتا تھا - بدنصیبی سے نجومیوں نے زائچہ بناکے پیشگوئی کی کہ یہ لڑکی کسی مسلمان سے بیاھی جائیگی - ماں باپ کو یہ سن کے نہایت صدمہ ھوا اور اُنھوں نے اپنی عزت و آبرو بچانے کے لئے سنگدلی سے کام لیا - مگر ان کا یہی بےرحمانہ کام اس پیشگوئی کے پورا ھونے کا موجب بنا، جس کی بنا پر اُنھوں نے اپنے لخت جگر کو اپنے دامن شفقت سے جدا کیا تھا —

پیشگوئی سن کر سسی کے والدین کو عزت و آبرو کے خطرے نے اس قدر خوف دلایا کہ انھوں نے اپنے اس جگر گوشہ کو ایک چھوٹے سے صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیا - تقدیر نے اس صندوق کی حفاظت کی اور موجیں بہا کر اسے شہر بھمبور میں لے گئیں —

شہر بھمبور میں ایک دھوبی رھتا تھا جس کا نام تونھیا تھا - مگر عام طور پر لالہ کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا - اس دھوبی کے پانچ سو شاگرد دریا کے کنارے کپڑے دھویا کرتے تھے - اگرچہ یہ سب بیٹوں کی طرح اس کی خدمت میں موجود تھے - مگر خدا نے حقیقت میں اسے اولاد سے محروم کر رکھا تھا، جس کی اسے بڑی تمنا تھی - وہ صندوق بہتے بہتے جب بھام براھ سے بھمبور پہنچا تو لالہ کے کسی شاگرد کے ھاتھ پڑا اور وہ اس صندوق کو اسی طرح بند اپنے مالک کے سامنے اُٹھا لایا -

لالہ نے جو صندوق کھولا تو ایک چاند کے ٹکڑے کو اس میں دیکھ کر متحیر ہوگیا، فوراً نکال کے اپنے کلیجے سے لگایا - چونکہ اس کا چہرہ چاند کی طرح دمکتا تھا اس رعایت سے سسی نام رکھا اور اپنی بیٹی بنا کے پرورش کرنے لگا —

لالہ کے دامن شفقت میں پرورش پا کے سسی بڑی ہوئی تو اس کا حسن و جمال زمانے کے لئے ایک فتنہ ہوگیا - جس کی نظر اس پر پڑی دل و جان سے فریفتہ ہوگیا - ہر صحبت میں اس کا تذکرہ ہونے لگا - اور مسافر اس کی یاد کو دل میں لے کے دور دراز ممالک میں پہنچے - الغرض اس طرح اس کے حسن عالم فریب کی شہرت ہر طرف پھیل گئی اور جا بجا لوگ اس کے نا دیدہ عاشق ہوگئے —

اس زمانے میں چند قافلے سندھ سے مکران کو روانہ ہوے - جن کے پہنچتے ہی بعض تاجروں کے ذریعے سے سسی کے حسن کی تعریف شہر کش کے امیر کے بیٹے پنوں کے گوش گزار ہوئی - وہ یہ تذکرہ سنتے ہی دل و جان سے عاشق ہوگیا اور جب کامیابی کی کوئی تدبیر نظر نہ آئی تو سوداگروں کا بھیس کر کے بے کسی سے کیچ سے سندھ کو روانہ ہوا - بھمبور میں پہنچ کے جب سسی کی دلربا صورت دیکھی تو حضرت عشق کی آگ نے اس کے دل و دماغ پر اثر کیا - شوق وصل ایک سے دہ چند ہوگیا - جب کوئی اور صورت بنتی نظر نہ آئی تو مجبوراً پنوں کو سسی کے حسن سے فائدہ اُٹھانے کے لئے یہ تدبیر کرنی پڑی کہ دھوبیوں کی صورت بنا کے سسی کے باپ کے شاگردوں میں داخل ہوگیا اور دریا کے کنارے روز جا کے کپڑے دھونے لگا - اس طریقے سے پنوں کو یہ موقع مل گیا کہ روز سسی سے ملا کرتا تھا - آخر دونوں طرف سے محبت نے جوش کیا اور دونوں کے دل میں عشق کے شعلے مشتعل ہوگئے -

یہاں ایک سنارن رہتی تھی جو ان دونوں کی پاک محبت کو دیکھ نہ سکی - اُسے آتش حسد نے اندر ہی اندر جلا دیا - اس بنا پر اس نے آخر کار ایسی

فتنہ پردازیاں کیں کہ پنوں کے دل میں سسی کی طرف سے کچھ بدگمانی سی پیدا ہوگئی - مگر سسی نے اپنی پاک دامنی کا ثبوت نہایت ہی سخت اور کڑے امتحان میں کامیابی حاصل کرکے دیا - چنانچہ وہ آگ میں کود کر خالص سونے کی طرح اس میں سے پاک و صاف نکل آئی - اس کے تھوڑے دنوں بعد ان عاشق و معشوق کی آپس میں شادی ہوگئی - اور وہ دونو اس شہر میں رہ کر کامیابی اور مقصد بری سے اپنی زندگی بسر کرنے لگے —

جب یہ حالات امیر کش کو معلوم ہوے تو اسے اپنے بیٹے کی اس فریفتگی اور از خود رفتگی پر نہایت طیش آیا - اس نے چند آدمی روانہ کئے کہ جس طرح بنے، پنوں کو خواہ برضا و رغبت، خواہ بجبر و اکراہ کش میں لے آئیں - یہ لوگ گئے اور خود پنوں کے گھر میں اترے اور اس کے مہمان ہوے - لیکن رات کو جب پنوں اور سسی دونوں محو خواب تھے، ان لوگوں نے پنوں کو سوتے ہی میں اونٹ کی پیٹھہ پر ڈال کے رسیوں سے باندھ لیا - اور سسی کو ویسے ہی سوتا پڑا رہنے دیا اور خود مکران کی راہ لی —

صبح کو جب سسی خواب ناز سے بیدار ہوئی تو پنوں اور رات کے مہمانوں کو غائب دیکھہ کے رونے پیٹنے لگی - تمام کپڑے پھاڑ ڈالے، زیور اتار کے پھینک دیا اور تن تنہا شوہر کی جستجو میں نکل کھڑی ہوئی - محبت نے پاؤں میں اتنی طاقت دے دی کہ گھر سے بہت دور تک اپنے یوسف گم گشتہ کی تلاش میں قدم اٹھائے چلی گئی - کوئی چالیس کوس گئی ہوگی کہ پاؤوں نے جواب دے دیا اور تشنگی کی یہ شدت ہوئی کہ لق و دق بیابان اور برہنہ پہاڑیوں میں گر کے زمین میں ایڑیاں رگڑنے لگی اور بالکل نزع کا سا عالم طاری ہوگیا - خدا کی قدرت سے وہاں ایک پانی کا چشمہ نمودار ہوا جس سے پانی پی کر سسی خوب سیراب ہوئی - سیاحوں کا بیان ہے - کہ وہ چشمہ آج تک اسی جگہ پر موجود ہے اور صحرا نوردوں کے کلیجے ٹھنڈے کیا کرتا ہے وہ ہر موسم میں موجود رہتا ہے، نہ گرمیاں اسے خشک کرتی ہیں اور نہ بالو اس کے پانی کو جذب کرتی ہے -

کہتے ہیں کہ یہ واقعات مصیبت سسی نے اس شب کو خواب میں دیکھہ لئے تھے جس رات وہ دلہن بنائی گئی تھی اور اس کے ہاتھہ حنا آلود کئے گئے تھے —

وہاں رسم تھی کہ شب زفاف کو دلہنیں مہندی کی ایک ٹہنی ہاتھہ میں لے کے سویا کرتی تھیں - سسی جو ٹہنی ہاتھہ میں لے کے سوئی تھی، اسے اس نے محبت کی نشانی سمجھہ کے حفاظت سے رکھہ چھوڑا تھا ۔ اس سفر غربت میں بھی وہ اس ٹہنی کو اپنے ساتھہ لیتی گئی - اس پہاڑی علاقے اور صحرا میں جب خدا نے اسے آب نوشیں سے سیراب کیا تو اس نے وہ ٹہنی اس چشمہ کے کنارے گاڑ دی تھی خدا کی قدرت سے وہ ٹہنی جم گئی - وہی مہندی کی جھاڑی اس چشمے کے کنارے آج تک سسی کے خوں چکاں دل کو یاد دلا رہی ہے —

تھوڑی دیر ستا کے سسی پھر آگے بڑھی - چھہ ہی سات کوس چلنے پائی تھی کہ پھر پیاس کا غلبہ ہوا، چہرہ کملا گیا اور تھک کے بیٹھہ گئی - اتفاقاً یہاں ایک گڈریا اپنی بکریاں چرا رہا تھا- اس نے جو سسی کی صورت دیکھی اور پھر اسے تن تنہا پایا تو بے اختیار ہوگیا - دیر تک مبہوت کھڑا دیکھتارہا - آخر اس نے تجویز کی کہ سسی کو اپنے قابو میں لائے اور جہاں جی چاہے لے جائے - چنانچہ اس ارادے سے وہ قریب آیا اور سسی کو مخاطب کرکے کہنے لگا - چلو تم میرے ساتھہ چلو اور میری معشوقہ بنو - سسی نے ایک آہ گرم کھینچ کے کہا - تم یہ کتنا بڑا ظلم کررہے ہو میں اپنی جان سے مر رہی ہوں اور تم ایسی ناجائز خواہش ظاہر کرکے میرا دل دکھا رہے ہو - گڈریے نے زیادہ اصرار کیا اور کہا : کہ یہ ممکن نہیں کہ تم میری خواہش پوری نہ کرو- تب سسی نے عاجز ہوکے کہا اچھا اگر تم مجھے مجبور ہی کرتے ہو تو کوئی ایسی تدبیر کرو جس سے میری جان میں تو جان آے ۔ مارے پیاس کے میرا دم نکلا جاتا ہے، کوئی ایسی چیز لادو کہ ذرا حلق تو تر کر لوں - اتنا سنتے ہی گڈریا خوش خوش اپنے گلے کی طرف دوڑا کہ تھوڑا سا دودہ لائے - گڈریے کے جاتے ہی سسی نے درگاہ الٰہی میں التجا کی وہ اپنے معشوق کی ملاقات کے آب حیات پانے

سے مایوس تو ہو ہی چکی تھی، ظالم گڈریے کے پنجۂ ظلم و ستم سے مخلصی کی کوئی صورت اسے نظر نہ آتی تھی، اس لئے تنگ آکے اس نے دعا کی: بار الٰہا مجھے اس صحرائی دیو کے پنجے سے نجات دے۔ اتنا کہنا تھا کہ وہ چٹان جس پر بیٹھی ہوئی تھی بیچ سے شق ہوگئی اور سسی کو اپنی گود میں لے کے پھر بند ہوگئی - سسی تو لعل بے بہا کی طرح پتھر کے کلیجے میں جا چھپی اور اس کی ساڑھی کا آنچل اس کی بیکسی یاد دلانے کے لئے باہر نکلا رہ گیا —

گڈریے نے جب واپس آکے یہ حال دیکھا تو اسے بڑی عبرت ہوئی، اپنی زیادتی پر بہت پچھتایا، خدا کی درگاہ میں توجہ کی اور اپنی ندامت مٹانے کے لئے اسی جگہ جہاں سسی پیوند کوہ ہوئی تھی، مقبرہ بنادیا —

اب پنوں کا حال سنئے کہ وہ ستم رسیدہ، درد ہجراں کشیدہ، جب زنجیروں میں جکڑا ہوا اپنے باپ کے سامنے پہنچا تو اس کی بیتابی و حسرتناکی اس شدت پر نظر آئی کہ باپ کو بیٹے کے مرجانے کا اندیشہ ہوگیا - اس لئے مجبور ہوکر اس نے پنوں کے بھائیوں کو بلا کے کہا: تم پنوں کو ساتھ لے کے سندھ جاؤ اور جہاں ملے اور جس طرح ممکن ہو اس کی معشوقہ کو ساتھ لے آؤ —

اپنے باپ کے حکم کی تعمیل میں پنوں کے بھائیوں کا ایک قافلہ اسے ساتھ لے کے سندھ کی جانب روانہ ہوا۔ جب یہ لوگ اس مقام پر پہنچے جہاں سسی پہاڑ میں زندہ دفن ہوگئی تھی تو پنوں اپنے سواری کے اونٹ سے اترا اور کسی انسان کے تازہ نشان قبر کو غور کی نگاہوں سے دیکھنے لگا - دل کے تعلقات کچھ ایسے بڑھے کہ وہیں بیٹھ کے سوچنے لگا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا:

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

پنوں کو وہاں بیٹھے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہی گڈریہ نمودار ہوا اور پنوں کے پاس آ کے جب دیکھا کہ وہ ان آثار کا متجسس ہے تو اس نے سسی کی ساری حقیقت اس سے کہہ سنائی - پنوں فوراً سمجھ گیا کہ یقیناً یہ میری

ھی معشوقہ کا تذکرہ ھے - اپنے ساتھیوں سے کہا: میں ذرا اس قبر کی زیارت کر آؤں'
اس شہید عشق کی تربت پر مجھے فاتحہ ضرور پڑھنا چاھئے - اتنا کہہ کے مقبرے کے
اندر گیا اور قبر سے لپٹ کے دعا مانگنے لگا کہ یا اللہ مجھے میری معشوقہ سے ملا دے
فوراً وہ چٹان پھر شق ھوئی اور پنوں بھی اس میں سما گیا —

پنوں کے بھائیوں کو سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ رھا کہ روتے پیٹتے اپنے
وطن کو واپس گئے اور وھاں جاکر والد کو ساری کیفیت سے اطلاع دی - وہ بھی اس
درد و حسرت بھرے واقعہ سے نہایت محزون ھوا' مگر صبر کئے بغیر اور کر ھی
کیا سکتا تھا —

لیکن مسٹر کن‌کیڈ نے جوسنہ ۱۹۱۸ ءمیں کرانچی میں‌متعین‌تھا- مسٹرھوم‌شیل
کی مدد سے جو کہانی سندھی مثنوی اور گیتوں سے اخذ کی ھے وہ تحفۃالکرام سے
بہت مختلف ھے - سندھ گزیٹر میں اس کہانی کا ذکر بر سبیل تذکرہ ھے مگر شاید
بخوف طوالت کہانی بیان نہیں کی گئی - صاحب موصوف کی کہانی جو ٹائمز
آف انڈیا میں شائع ھو کر بہت مقبول ھوئی - عوام میں متداول ھے جسے ھم اپنے
الفاظ میں مختصر طور پر پیش کرتے ھیں :

" ایک مدت کی بات ھے کہ سندھ میں تاورائے نامی ایک راجا راج کرتا
تھا - اس راجہ نے نانوں برھمن کو اپنا منتری بنایا - نانوں کے گھر دھن دولت
کی گنگا بہتی تھی' ھیرے موتی کے انبار لگے تھے' پر بال بچہ کوئی نہ تھا -
جس کے لئے یہ میاں بیوی بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپتے تھے - یوگی' سادھوں
مہنت کی سیوا میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی - ھون ھوے' یگ کرائے' کنگالوں
کو جھولیاں بھر بھر کر روپیہ پیسہ دیا' کچھہ نہ بنا - آخر نراس ھو گئے - تو
ایک دن نانوں کی بیوی نے سن پایا کہ ایک بڈھا جوتشی کہیں سے آیا ھے- جو
ھندوستانی اور یونانی دونوں ملکوں کی ودیا میں کامل ھے - نانوں گھر آیا تو
بیوی نے اس جوتشی کا ذکر چھیڑا بچے کے بغیر زندگی اندھیری رات کے سمان

ہوتی ہے ، آئیے اس جوتشی کو بھی آزما دیکھیں - کیا معلوم کہ اس اندھیرے میں اُجالا ہو جاے- لوگ تو اس کی بڑی تعریف کرتے ہیں کہ اس جیسا پہنچا ہوا دنیا بھر میں کوئی نہیں ، آگے رام جانے "- ناروں نے اس تجویز کی اونچ نیچ پر بہت سوچ بچار کیا، اور جب تسلی ہو گئی کہ اس میں کسی نقصان کا اندیشہ نہیں تو بیوی کو ہمراہ لے کر جوتشی کے آشرم کی طرف چل پڑا —

جوتشی نے راج منتری کی بڑی آؤ بھگت کی، اُنھیں کٹیا میں لے گیا اُنے کا کارن پوچھا- منتری نے جوتشی کے قدم لئے اور ہاتھ باندھ کر کہنے لگا : " مہاراج ' بھگوان کا دیا سب کچھ ہے، پر لڑ کا بالا کوئی نہیں - اس پھانس نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے" جوتشی نے کچھ دیر سوچ کر پانسا پھینکا - اور رمل کے سارے قاعدے پورے کر کے بتایا : " منگل اور برھسپت کا سنجوگ ہے - مہاراج آپ کے ہاں ایک کنیا جنم لے گی پر اس کے لیکھ میں ایک مسلمان خاوند بدا ہے " - یہ سن کر منتری کے دل کو بڑا دکھ ہوا - اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آے اور اس نے جوتشی کی بڑی منتیں کیں ، کہ وہ اس کی بیٹی کی قسمت کو بدل دے - جوتشی کو اپنے معزز مہمان کی بہت خاطر منظور تھی ، مگر وہ قسمت کے لکھے کو نہیں بدل سکتا تھا - ناچار منتری اور اس کی بیوی روتے دھوتے گھر گئے - دارو کے لیے گئے اور نیا روگ لے آے - کچھ عرصے کے بعد لڑکی پیدا ہوئی - اس نے ارادہ کیا کہ یا تو پتھر سے لڑکی کا سرکچل دے یا آگ میں ڈالدے - برھمن کی بیوی لڑکی کی جان لینے کی روادار نہ ہوئی اور کہا کہ اگر اس سے کنارا ہی کرنا ہے تو صندوق میں بند کر کے سندھ میں ڈالدیجے - برھمن نے ایک صندوق منگوایا اور سوتے ہوے بچے کو صندوق میں رکھا - ایک تھیلی اشرفیوں اور موتیوں کی ڈال کر تالا لگا دیا - پھر اسے دریا میں پھنکدیا - صندوق بہتا بہتا شہر بھمبور میں پہنچا - وہاں محمد نامی ایک دھوبی صندوق کو باھر لے گیا - کھولا تو اس میں ایک لڑکی پڑی تھی - لڑکی کو صندوق سے نکالا تو اشرفیوں اور موتیوں کی ایک تھیلی ہاتھ لگی - اس کی خوشی کی کوئی

دہ نہ رہی اور لڑکی اور تھالی کو اٹھا کر گھر دوڑا ' اس کی بیوی جو دن رات اولاد کے لئے دعا مانگتی رہتی تھی ' نہال ہو گئی اور انھوں نے اس لڑکی کو اپنی بیٹی بنا لیا اور اس کا نام سسی رکھا - (جیسے ماہ لقا سمجھیے یا بدرالنسا کہئے) چند سال گذرے تو سسی جوان ہو گئی - بچپن کا حسن نکھر کر شباب کے سانچے میں ڈھلا - جدھر جاتی اُنگلیاں اٹھتیں اور لوگ گھنٹوں گھور تے ' اپنا کام کاج چھوڑ کر گھاٹ پر پڑے رہتے - دھوبی نے اشرفیوں کی تھیلی سے سسی کے لئے اچھے سے اچھا کپڑا اور عمدہ سے عمدہ زیور خریدا ' ایک دو منزلا مکان تعمیر کیا ' جس کے گرد ایک دلکشا باغ احاطہ کئے تھا - یہاں سسی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلا کر تی تھی -

اس زمانے میں ایک بلوچ سردار جام علی کی بہادری اور فتحمندی کی بڑی دھوم تھی - اور اس کی قوم نے اسے کیچ اور کوہستان کا بادشاہ تسلیم کر لیا تھا - جام علی کے چنوں ' پنوں ' ھو تو ' نکرو ' اور نوڑو ' پانچ بیٹے تھے - اگر چہ یہ سب بہادر اور شکیل نوجوان تھے ' مگر پنوں سب سے بڑھ چڑھ کر تھا ' اس بلوچ سردار کی دور دور تک دھاک بیٹھ گئی تھی ' کاروان محصول ادا کر تے تھے ' اور ارد گرد کے علاقے میں اگر کوئی سر اٹھا تا تھا تو اس کے بیٹے اسے ٹھیک بنا دیتے تھے - سسی کی خوبصورتی کی شہرت اس دور دراز ملک میں بھی جا پہنچی اور اس کے خیال نے پنوں کے دل میں گھر کر لیا - ایک دن بہو نامی ایک سوداگر کوہستان میں آ یا - جام علی نے اس کی بڑی خاطر مدارت کی اور اس کی باتوں اور ادب و آداب سے اس قدر خوش ہوا کہ تمام محصول معاف کر دیا - تھوڑے دنوں میں بہو نے تمام مال فروخت کر لیا اور دوسری جگہ جا کر بیچنے کے لئے نیا مال خریدا - اس نے جام علی سے رخصت چاہی تا کہ بھمبور شہر جا کر اپنا مال بیچ سکے - جام علی بڑی مشکل سے اس کے جا نے پر رضا مند ہوا - لیکن جب پنوں کو الوداع کہنے آیا تو پنوں نے اسے چپکے سے کہا کہ : بھمبور میں سسی کو ڈھونڈ ھنا اور مجھے خفیہ اطلاع دینا کہ آیا واقعی وہ

ایسی ہی حسین ہے —

پنہو نے مسکرا کر اس کام کی حامی بھری اور اس کا کاروان بھنبھور روانہ ہوا، جب وہاں پہنچا تو پنہو نے ایک مکان لے کر وہاں اپنا مال سجایا۔ چند دنوں میں اس کے مال، اس کی خوبصورتی اور جوانی کا شہر بھر میں شہرہ ہوگیا اور اس کے مکان پر عورتوں مردوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک دن پنہو کا اس مکان کے پاس گذر ہوا، جہاں سسی رہتی تھی۔ اس وقت سسی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی، اس نے بالا خانے کی کھڑکی سے پنہو کو گلی سے گذرتے دیکھا۔ پنہو کی خوبصورتی نے اس کے دل پر بڑا اثر کیا اور اس نے اپنی سہیلی سے جس کا نام سکھی تھا کہا کہ جاکر اسے اوپر لے آئے۔ پنہو کو پیغام ملا تو وہ تھوڑا سا قیمتی مال لے کر سکھی کے ساتھ سسی کے پاس گیا۔ وہ مال کھول کر دکھا رہا تھا کہ سسی نے اس کے کان میں کہا: "اے سوداگر تونے میرا دل چھین لیا۔ اب میرے دل میں تم ہی بس رہے ہو"۔ پہلے تو پنہو نے کچھ جواب نہ دیا، لیکن جب نظر بھر کر سسی کو دیکھا تو اس کے حسن کا قائل ہوگیا۔ اس نے دل میں کہا کہ گو یہ لڑکی دھوبن ہے مگر حسن کے لحاظ سے پنوں کے لائق ہے۔ سوچ کر اس نے سر ہلایا اور جواب دیا کہ "مجھ پر اپنی محبت ضائع نہ کیجیے، میں ایک شخص پنوں کو جانتا ہوں جو مجھ سے زیادہ خوبصورت اور آپ کے قابل ہے۔ میں تو ایک معمولی آدمی ہوں اور وہ ایک فیاض شہزادہ ہے۔ میں ایک ادنی تاجر ہوں اور سارا کیچ اور کوہستان اس کی اطاعت کا دم بھرتا ہے۔ وہ پاس سے گذرے تو بھکاری کے گھر میں دھن برسنے لگے اس کے پاس گھوڑے، اونٹ، چاندی سونے کے خزانے، سپاہی، دربان اور منشی متصدی ہیں اور سچ پوچھئے تو میں بھی اسی کا ایک نوکر ہوں۔ میں نے اسکی خوبصورتی کا اسلئے ذکر نہیں کیا کہ مجھے اس کے لئے لفظ نہیں ملتے اسے دیکھ کر ہی آپ اس کے حسن کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ خدا کرے کہ آپ

کی اس سے ملاقات ہو " —

سوداگر کی زبان سے پنوں کی اس قدر تعریف سن کر سسی کا دل اُس کی طرف مائل ہوا ۔ اور اُس نے بھو سے کہا کہ وہ اس خوبصورت نوجوان کو بلا کر اسے دکھائے ۔ بھو سسی سے رخصت ہو کر گھر پہنچا تو اس نے ایک منشی بلوا کر اس سے دو خط لکھوائے ۔ ایک خط میں یہ لکھا تھا کہ " میں نے سسی کو دیکھا ' بے شک وہ چاند کا ٹکڑا ہے ۔ اگرچہ دھوبن ہے' مگر خدا نے اسے دولت حسن سے مالا مال کردیا ہے ۔ ایک سوداگر کے بھیس میں جلد تشریف لائیے اور عطر و عنبر کے بوجھ ساتھ ہونے چاہیئں " ۔ دوسرے خط میں یہ تحریر تھا کہ " میری مدد کیجیے بھمبور کے لوگوں نے میرا سارا مال چھین لیا ہے اور مجھے قید کر رکھا ہے ' وہ مجھ سے محصول طلب کرتے ہیں ۔ شہزادہ پنوں ! یہ خادم صرف آپ کے بھروسے پر جی رہا ہے ' مایوس نہ فرمائیے اور جلد تشریف لائیے —

یہ خط اُس نے ایک شتر سوار کو دئے' جو جلد پنوں کے ملک میں پہنچ گیا ۔ قاصد نے پنوں سے زبانی کہا کہ پہلا خط صرف اس کی ذات کے لیے ہے اور دوسرا وہ اپنے باپ کو دکھا سکتا ہے ۔ پہلا خط پڑھ کر پنوں کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی ' دوسرا اس نے اپنے باپ کو سنایا تو وہ غصے سے بیتاب ہو گیا ۔ اس کی زندگی میں اس کے دوست بھو سوداگر کی یہ گت بنے اور وہ بیٹھا دیکھا کرے' یہ کیسے ہوسکتا تھا ۔ اُس نے پنوں کو حکم دیا کہ " فوراً جاؤ ' اس کے دشمنوں کو تلوار کے گھاٹ اتارو اور اسے آزاد کرو " —

پنوں نے قاصد کو یہ پیغام دے کر رخصت کیا کہ اسے پہنچا سمجھو اور آپ سفر کی تیاری کرنے لگا ۔ عطر و عنبر سے بہت سے صندوق بھرے' انہیں چھکڑے سے اونٹوں پر بار کیا ۔ گنگا جمنی مخمل دھوپ میں چمک رہے تھے اور اونٹوں کے گلے میں مالا اور گھنگرو پڑے تھے ۔ پنوں اور اس کے ہمراہیوں نے زر دوزی کپڑے پہنے ' سروں پر بڑے گھیر کی پگڑیاں باندھیں ۔ ان کے پاجامے سبز رنگ کے تھے ۔

کندھوں پر سفید ریشمی رومال پڑے تھے' جن پر سنہری رپہلی لیس ٹکی تھی۔ جب پنوں کی جماعت روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گئی تو جام علی اپنے بیٹے چنوں کو لے کر الوداع کہنے کے لئے آیا - اور پنوں سے کہا کہ چنوں کو ساتھ لیجاؤ' کام آئے گا اور پنوں کو جلد واپس آنے کی تاکید کی - پنوں ماں باپ سے رخصت ہو کر روانہ ہوا - رات ہوئی تو پنوں نے کھیربیلہ میں قیام کیا - صبح ہوئی تو سارا گاؤں اس قافلے کو دیکھنے آیا - اس موضع کھیربیلہ میں سجن نامی ایک البیلی چھبیلی سنارن رہتی تھی' جب اس نے پنوں کو دیکھا تو وہ دل و جان سے اس پر فدا ہوگئی اس نے ایک بوڑھیا کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ وہ اس کا مال جواہرات کے عوض خریدنا چاہتی ہے - مگر پنوں نے کہا کہ یہ مال بکاؤ نہیں' مجھے اس کی بھمبور میں ضرورت ہے - اصرار کرنے پر سجن کی دعوت قبول کی اور ایک رات اور ٹھیرنے پر رضا مند ہو گیا - دوسرے دن سجن دامنگیر ہوئی مگر پنوں نے روانگی کا حکم دیدیا —

جب شہر کے قریب پہنچے تو پنوں نے ببو کو بلایا اور اس کے مشورے سے شہر کے جنوب میں ڈیرے ڈالے اور سوداگروں کی طرح دکانیں لگائیں - جب سسی کو معلوم ہوا کہ ایک بہت بڑا سوداگر آیا ہے تو وہ بھانپ گئی کہ اس سوداگر کے پردے میں پنوں جلوہ دکھا رہا ہے اور ببو کے کہنے پر وہ جھٹ اپنی سہیلیوں کے ساتھ نئے سوداگر کے بازار کی سیر کرنے کے لئے چل پڑی - جب وہاں پہنچی اور سسی اور پنوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو اُنھیں کوئی سدھ بدھ نہ رہی اور وہ ایک دوسرے کے لیے وقف ہو گئے - دونوں کے دلوں میں آتش عشق پر بھڑک اٹھی - جب سسی گھر واپس گئی تو اُس نے اپنی محرم راز سہیلی سکی سے کہا : آنکھیں اشکبار ہیں' کلیجے میں ہوک اُٹھ رہی ہے - اگر کسی طرح پنوں کو لے آؤ تو خیر' نہیں تو سمجھو کہ میری جان کی خیر نہیں " - سکی نے اس کو باتوں میں بہلانا چاہا لیکن سسی نے اُس وقت تک دم نہ لیا' جب تک سکی نے یہ وعدہ نہ کیا کہ وہ اس کے والدین کو اسبات پر راضی کرے گی کہ سسی کی شادی پنوں سے ہوجائے -

دوسرے دن سکی نے سسی کی ماں سے یہ ذکر چھیڑا اور کہا کہ سسی کے لیے اس سے بہتر بر ملنا محال ہے - خوبصورت گبرو جوان اور اس پر مال دار اور کیا چاہئیے - سسی کی ماں نے کہا : یہ تو خیر ہوا ' پر یہ تو بتاؤ کہ اس کی ذات کیا ہے - اتنے میں محمد آ گیا اور سسی کی ماں نے ساری بات کہہ سنائی - یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتفاق سے ببو گلی سے گذرا - اسے دیکھکر سکی نے کہا : " وہ دیکھو سوداگر کا منشی جا رہا ہے ' اُسے بلا کر ذات پات پوچھہ لیجیے " - محمد گیا اور اسے لے آیا - ببو نے سوال کا مطلب پا کر جواب دیا - " اُس نے مجھہ سے بار ہا کہا ہے کہ وہ کسی زمانہ میں دھوبی کا کام کرتا تھا لیکن اپنے وطن سے بھاگ آیا اور یہاں سوداگری شروع کر دی " - یہ سن کر محمد نے ببو سے کہا کہ پنوں کو اپنے گھر بلا کر اُس سے ملائیے - پنوں خوشی سے ببو کے مکان پر آکر محمد سے ملا - محمد نے پنوں کا امتحان لینے کے لئے کہا - " میں نے سنا ہے کہ تم ذات کے دھوبی ہو ' ذرا ان کپڑوں کے دھونے میں میرا ہاتھہ بٹاؤ " یہ کہہ کر محمد نے شہزادے کو کچھہ ریشمی کپڑے اور صابون دیا - ببو نے شہزادے کو بتادیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو دھوبی ظاہر کرے - اس لئے اُس نے کپڑے لے لئے اور گھاٹ کو چل پڑا - وہ حیران تھا کہ یہ کام کس طرح سرانجام ہوگا - رستے میں اُس کا بھائی ' چنوں ملا اور کہنے لگا : یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں ' کیا تم سچ مچ ایک دھوبن سے شادی کرکے ہمارے خاندان کا ٹیکا لگاؤ گے " - پنوں نے جواب دیا : "بھائی یہ تو من بھاتے کا سودا ہے ' جب دل آگیا تو کہاں کی دھوبن اور کہاں کی رانی " - چنوں یہ جواب سن کر دم بخود کھڑا رہا اور پنوں نے گھاٹ کا رخ کیا - کپڑے دھونے میں اس نے ایسا زور لگایا کہ ان کے پرخچے اُڑ گئے - ان دھجیوں کو پنوں حیرت کی نگاہ سے دیکھہ رہا تھا کہ سسی مسکراتی ہوئی اُس کے پاس آئی اور کہا : کوئی فکر کی بات نہیں ' ہر ایک کپڑے کی جیب میں ایک اشرفی ڈالدو ' کوئی بولے گا بھی نہیں - پنوں نے ایسا ہی کیا ' اور جب ان کے مالکوں کو کپڑے دینے گیا تو اُنھوں

کہتا آیا کہ بھائی کپڑوں کے ساتھہ اُن کی جیبوں کو بھی دیکھہ لینا - کپڑوں کا حال دیکھا - وہ بگڑنے کو تھے لیکن اشرفی دیکھہ کر اُن کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا - جب محمد کو معلوم ہوا کہ پنوں نے کپڑے دھوکر لوگوں کے پہنچا دیے - اور کسی نے شکایت نہیں کی تو اُسے اطمینان ہوگیا کہ پنوں واقعی دھوبی ہے - اُس نے بڑی دھوم دھام سے سسی اور پنوں کی شادی کر دی - لیکن چنوں اس میں شریک نہ ہوا اور ناراض ہو کر وطن کو چلا گیا - وہاں جاکر اس نے سارا قصہ جام علی ' کو سنایا تو وہ آگ بگولا ہوگیا - اس نے پنوں کے تین بھائیوں ' چنوں ' ' ہوتو ' اور ' نوتو ' کو حکم دیا کہ فوراً پنوں کولے آئیں - یہ تینوں شہزادے بھمبور پہنچے اور دل میں کھوٹ رکھہ کر خندہ پیشانی سے پنوں سے ملے اور بھائی اور بھابی پر سے صدقے اُتارے - پنوں اور سسی کو اُن کی نیت پر کوئی شک نہ ہوا - چنوں نے اس سے کہا کہ ' جام علی ' نے شادی منظور کرلی ہے اور اس خوشی میں وہ سب مل کر رات دن رنگ رلیاں منائیں گے - ایک شب کو شہزادوں نے شراب میں داروے بے ہوشی ملائی اور پنوں اور سسی کو پلادی - آدھی رات کے وقت جب ان پر نیند غالب آئی تو انھوں نے پنوں کو سسی کے آغوش سے نکال کر اونٹ پر ڈالا اور فوراً کیچ کو روانہ ہوے - جب صبح کو سسی بیدار ہوی اور پنوں کو نہ پایا تو وہ دھاڑیں مارکر رونے لگی - ہمسائے اکھٹے ہوگئے اور دم دلاسا دینے لگے - سسی پنوں کو ڈھونڈھنے کے لئے تن تنہا چل پڑی - ' سکی ' کے سوا سب نے اس کے روکنے کی کوشش کی مگر اس نے ایک نہ سنی —

اونٹوں کے پاؤں کے نشانوں پر سسی پاپیادہ روانہ ہوی - دن بھر چلتی رہی مگر اس کا پتہ نہ ملا - شام کو ایک گڈریے کی جھونپڑی پر پہنچی اور اس سے پوچھا کہ ادھر سے کوئی قافلہ تو نہیں گذرا - گڈریا سسی کے حسن کو دیکھہ کر مبہوت سا ہوگیا اور جواب دینے کے بجاے گھسیٹ کر اندر لے جانے کی کوشش کرنے لگا - سسی نے اس مصیبت میں پہلے پنوں کو یاد کیا ' پھر بلند آواز سے یہ دعا مانگی

"یا رحیم و کریم! زمین کو حکم دے کہ پھٹ جائے اور مجھے اپنے آغوش میں لے لے"۔ خدا کا کرنا دھرتی ماتا کا منہ پھٹ گیا اور سسی گڈریے کی گرفت سے نکل اس میں جا پڑی۔ شگاف مل گیا مگر سسی کے دوپٹے کا دامن باہر رہ گیا۔ گڈریا یہ دیکھ کر مارے خوف کے اپنی جھونپڑی میں جا چھپا —

اب پنوں کا حال سنئے۔ دوپہر کو اُسے ہوش آیا تو وہ اپنے آپ کو اُونٹ کی پشت پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پہلے تو خواب سمجھا ' لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ یہ عالم بیداری ہے تو اُس نے 'چلوں' سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ جب اُس کے بھائیوں نے اُسے بتایا کہ وہ اُسے 'جام علی' کے حکم سے کیچ لیجا رہے ہیں تو وہ اونٹ سے کود پڑا۔ اُس کے بھائیوں نے اُس کے پکڑنے کی کوشش کی۔ تو اُس نے تلوار نکال لی۔ سب الگ کھڑے ہوگئے۔ پنوں بھمبور کی سمت چل پڑا۔ چلتے چلتے اس جگہ پہنچا ' جہاں سسی گم ہوئی تھی۔ وہاں سے گڈریا ملا۔ اس نے دریافت کیا کہ اس نے کسی عورت کو سرگردان پھرتے تو نہیں دیکھا؟ کیونکہ اسے یقین تھا کہ سسی نچلی نہ بیٹھیکی۔ گڈریے نے کہا کہ اس کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ایک عورت یہاں ماری پھر رہی تھی اور اسے زمین نگل گئی — اور اسکے ثبوت میں سسی کا آنچل دکھایا ' جو قبر سے باہر ہوا میں اُڑ رہا تھا۔ شہزادے نے فوراً پہچان لیا اور اللہ سے دعا کی کہ وہ بھی زمین میں سما جاے۔ اللہ نے اس کی دعا قبول کی۔ زمین پھٹی اور پنوں سسی کے پہلو میں جا پڑا۔ شگاف پھر بند ہوگیا۔ اس طرح شہزادہ اور دھوبن ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے مل گئے —

یہ ہے سسی پنوں کی داستان ' جو سندھ اور پنجاب میں مختلف طور پر بیان کی جاتی ہے۔ چونکہ یہ سندھ کی سرزمین کا واقعہ ہے ' اسلئے روایات سندھ حکایات پنجاب پر مرجح ہیں۔ لیکن پنجابی میں جو قصہ برخوردار نے تیار کیا ہے؛

وہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے - قصے کے دلچسپ ہونے میں کلام نہیں - لیکن اسے حضرت شرر مرحوم کی طرح تاریخی واقعہ تسلیم کرنے میں تامل ضرور ہے - مشرقی تاریخوں میں ایسے قصے اکثر زیب داستان کے طور پر بیان ہوئے ہیں - لیکن ان چیزوں کو امر واقعہ کی منزلت حاصل نہیں ہوسکتی- لفٹنٹ برٹن اور مسٹر اوسٹن کی رائے میں اس قصے کی اصلیت کچھ بھی نہیں - اور یہ فرضی ایک کہانی ہے - مولانا شرر کا یہ فرمانا کہ خلاف قیاس حاشیے کو چھوڑ کر اگر غور کیا جائے تو اصل قصے کے صحیح ہونے میں شک باقی نہیں رہتا - محض تکلف ہے - ورنہ تاریخ سندھ کا یہ مصنف اس پر مزید روشنی ڈالتا —

ہاں صاحب تحفۃالکرام وثوق سے فرماتے ہیں کہ اس کے آثار و نشان ان کے عہد تک موجود تھے اور ان شہیدان عشق کا مزار مرجع خاص و عام تھا - لیکن صرف انکے کہنے کو کون باور کرے جب تحقیق و تدقیق سے انکی تائید میں نہ ہو —

عوام کی رائے میں سسی اور پنوں ہنوز زندہ ہیں اور جو بھولا بھٹکا مسافر انکے مقبرے کے پاس آتا ہے، اسکی خبر گیری کرتے ہیں اور غیب سے انہیں کھانا بھی مل جاتاھے-ان میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ اسمعیل نام ملتان کے ایک درویش نے سسی اور پنوں کو زندہ دیکھا- کئی شخصوں نے اس قسم کے واقعات بیان کئے ہیں - مگریہ باتیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں اور تحقیق کے معیار پر پوری نہیں اترتیں —

اس قصے میں اظہار محبت کی ابتدا عورت کی طرف سے ہوتی ہے جو خالص ہندی اسلوب ہے، اسکے بر عکس عرب اور عجم میں اسکا آغاز مرد کی طرف سے ہوتا ہے - اسلئے قیاس یہ ہے کہ اس قصے کی بنیاد کسی ہندوستانی نے ڈالی اور یہ قصہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جبکہ ہندو عورت اور مسلمان مرد میں ازدواج نے رواج نہ پایا تھا اور ہندو ایسے تعلقات کو جائز نہیں سمجھتے تھے اس سے زیادہ اس قصے کی تحقیق پر مزید روشنی نہیں پڑتی —

سنیما کی چادر پر

تھیٹر والوں نے اس قصے کی جو مٹی پلید کی ہے' بیان سے باہر ہے مگر سنیما کے ڈھب کی چیز تھی وہ اسے لے اُڑا- آجکل سنیما نواز حضرات کی نگاہ میں سسی پنوں کا فلم ہندوستانی صنعت فلم سازی کی بہترین پیداوار ہے سنیما میں یہ قصہ دھوبی کے دریا سے صندوق پکڑنے سے شروع ہوتا ہے - اس سے قبل کے واقعات کو بجاطور پر نظری کردیا ہے - اور سسی کی علالت کے سلسلے میں ایک طبیب آکر سامان مذاق پیدا کرتا ہے' یہ تصرف مذاق سلیم برداشت نہیں کرتا - بھلا اس زور کی ٹریجڈی میں ہنسی مذاق کو کیا دخل - اتحاد جذبات کا فقدان آرٹ کے منافی ہے -

ادب

مذهب و اخلاق

تاریخ و سیر

متفرق

اُردو کے جدید رسالے

ادب

سیرالمصنفین جلد دوم

(از جناب محمد یحییٰ صاحب تنہا، بی اے، ال ال بی۔
جامعۂ ملیہ پریس دہلی — قیمت تین روپے)

سیرالمصنفین کی یہ دوسری جلد ہے۔ پہلی جلد اس سے قبل شایع ہوچکی ہے اور ان اوراق میں اس پر تبصرہ بھی ہوچکا ہے۔ اس جلد میں سر سید احمد خاں، مولوی چراغ علی، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی ذکاءاللہ، مولوی سید علی بلگرامی، مولوی نذیر احمد، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی، مطبع منشی نولکشور، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی عبدالحلیم شرر کے حالات اور ان کی تالیف و تصنیف کا ذکر ہے۔ مؤلف نے مختلف ماخذوں سے سلیقے کے ساتھ ان بزرگوں کے حالات ایک جا جمع کردئے ہیں، اُن کی تالیفات و تصنیفات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور آخر میں ان کی تحریر کے نمونے بھی لکھ دیے ہیں۔ ہر مصنف کے طرز تحریر اور اس کی تالیف و تصنیف پر تنقیدی راے بھی لکھی ہے۔ تنقیدی حصہ ایسا ہے کہ اس میں اختلاف کی بہت گنجائش ہے لیکن حالات بہت خوبی سے اور صاف اور اچھی عبارت میں لکھے ہیں۔ یہ جتنے مصنفین ہیں اردو پر ان کا بڑا احسان ہے اور ان پر جس قدر ایسی کتابیں لکھی جائیں قابل قدر ہیں —

تاریخ ادب اُردو

(مصنفۂ جناب بابو صاحب سکسینہ ایم اے' ال ال بی۔ مترجمۂ
جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی اے۔ مطبع نول کشور)

—•—

اصل کتاب پر جو انگریزی میں شایع ہوئی تھی' تبصرہ ہوچکا ہے۔ یہ اس کا ترجمہ ہے۔ اردو ترجمے میں بعض باتوں اضافہ کی گئی ہیں۔ جس سے کتاب زیادہ خوشنما' دلچسپ اور مکمل ہوگئی ہے۔ مثلاً انگریزی کتاب میں کلام کا نمونہ درج نہ تھا اور نہ اس میں ضرورت تھی' لیکن ترجمے میں بعض بعض مصنفین و شعرا کے کلام کا نمونہ بھی درج ہے۔ کہیں کہیں حذف و اضافہ سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اکثر شعرا اور مصنفین کی تصویریں بھی دی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قابل مصنف نے بعض خامیوں پر نظر ثانی فرمائی ہے اور بعض غلطیوں کی تصحیح کی ہے۔ مگر اب بھی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں۔ مثلاً شیخ عین الدین گنج العلم کی اردو تصانیف کا ذکر جو محض فسانہ ہے۔ اس طرح سے یقین سے نہیں کرنا چاہئے۔ اب تک ان کی کوئی تصنیف ایسی نہیں معلوم ہوئی ہے جو اُردو یا کسی دیسی زبان میں ہو۔ یا دہ مجلس کو مشہور شاعر ولی سے منسوب کرنا' حالانکہ یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ گیا ہے کہ دہ مجلس کا مصنف اسی نام کا دوسرا شخص ہے۔ یا میر صاحب (میر تقی) کے والد کے نام کے متعلق یہ کہنا کہ چونکہ ذکرمیر میں میر صاحب نے کہیں اپنے والد کا نام نہیں لکھا اس لئے ان کا نام میر عبداللہ ہی ہوگا۔ یہ صحیح نہیں۔ میرصاحب اپنے والد کو ہر جگہ علی متقی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور دوسروں کی زبان سے بھی یہی نام کہلوایا ہے۔ البتہ جب میر صاحب اپنے والد کے مرنے پر امیرالامرا صمصام الدولہ بہادر کی خدمت میں حاضر ہوے تو امیرالامرا نے اپنے برادر زادہ خواجہ محمد باسط سے جو انہیں نواب کے پاس لے گئے تھے' پوچھا کہ یہ لڑکا کون ہے؟ تو خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ " از میر محمد علی است " ۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ غالباً میر صاحب کے والد کا نام میر محمد علی تھا۔ اس قسم کی بعض غلطیاں اور بھی ہیں مگر اس سے کتاب کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اردو ادب کی تاریخ پر اس وقت اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں اور بابو صاحب کی محنت اورکوشش بہت قابل قدر ہے۔

ہم بابو صاحب کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انہیں مترجم بھی مرزا محمد عسکری

صاحب جیسے قابل شخص ملے ہیں ۔ مرزا صاحب نے ترجمہ ایسا اچھا کیا ہے کہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا ۔

کتاب بہت اچھی چھپی ہے، کاغذ بھی عمدہ لگایا گیا ہے اور مجلد ہے ۔ غرض سب خوبیاں موجود ہیں ۔

منتخبات عود ہندی

(از جناب مولوی حافظ شاہ علی احسن صاحب مارہروی، اُردو لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈہ ۔ صفحات مع مقدمہ وغیرہ ۳۶۱ ۔ قیمت دو روپے) ۔

یہ انتخاب جناب احسن صاحب کا ہے ۔ اس میں کل ۱۵۸ خط ہیں اور ہر ایک کے نام کے الگ الگ کردیے ہیں ۔ چونکہ یہ انتخاب یونیورسٹی کے ایف ۔ اے کے نصاب میں ہے لہذا ایسی بحثیں خارج کردی گئی ہیں جن کا تعلق خالص فارسی ادب سے ہے ۔ شروع میں احسن صاحب نے ۶۶ صفحے کا مقدمہ مرزا غالب کے حالات اور اُن کے کلام کی خصوصیات پر لکھا ہے ۔ اور آخر میں ۸۷ صفحے پر حواشی ہیں جن میں مشکل مقامات اور مشکل الفاظ کا حل درج ہے ۔ یہ انتخاب یونیورسٹیوں کے نصاب کے لئے بہت موزوں ہے ۔

ادبی خطوط غالب

(مرتبہ مرزا محمد عسکری صاحب بی ۔ اے لکھنوی، مصنف یا نول کشور پریس سے مل سکتی ہے ۔ قیمت دو روپے، صفحات ۳۰۴)

یہ مرزا غالب کے ایسے خطوں کا مجموعہ ہے جن میں مرزا صاحب نے ادبی نکات حل کئے ہیں، اشعار کے معنے سمجھائے ہیں اور شعرا کے متعلق رائے زنی کی ہے ۔ شروع

میں ۵۳ صفحے کا دیباچہ قابل مرتب صاحب نے لکھا ہے ' جس میں مرزا صاحب کی طرز تحریر اور ان کے خطوط کی خصوصیات پر بحث کی ہے - ہر رقعے میں جو جو ادبی نکتے یا مباحث آے ہیں' ان کے عنوان الگ الگ لکھ دیے ہیں' جس سے پڑھنے والے کو بڑی آسانی ہوجاتی ہے - ان تمام رقعوں کی تعداد ۹۹ ہے - آخر میں ۱۲۴ صفحے کا ضمیمہ ہے' جس میں اُن تمام اصحاب کے حالات ہیں' جن کے نام یہ رقعے لکھے گئے تھے - یہ ضمیمہ بہت دلچسپ اور کار آمد ہے - مرزا محمد عسکری صاحب کی یہ ادبی سعی بہت قابل شکریہ ہے —

اُردو محاورات و ضرب الامثال

[مؤلفۂ مولوی محمد اسمعیل صاحب سابق اسسٹنٹ گورنمنٹ آف انڈیا سکریٹریٹ پی ڈبلیو ڈی شملہ- ملنے کا پتہ: حاجی عبدالقیوم صاحب تاجر کتب کلکتہ ویلسلی اسکوائر نمبر ۱۹-قیمت ایک روپیہ ایک آنہ-لکھائی' چھپائی متوسط تقطیع ۱۸ × ۲۲ حجم ۲۰۰ صفحے]

—•—

یہ کتاب اردو زبان کے محاورات اور ضرب الامثال اور بحث تذکیر و تانیث پر ایک متوسط درجے کی اسکولی لغت ہے جسے مولوی اختر جمیل صاحب بی اے نظر ثانی و اضافے کے بعد تیسری بار چھپوایا ہے —

پہلی فصل میں تین ہزار سے زیادہ اردو محاورات ہیں' جو روز مرہ کے استعمال میں ہیں - اشعار بھی سند و مثال کی طور پر دیے ہیں ' دوسری فصل میں تقریباً چارسو ضرب الامثال ہیں- ہر مثال کے نیچے اُس کے معنے بھی بتادیے گئے ہیں — تیسری فصل مؤنث و مذکر کی بحث میں ہے اس میں حقیقی ' غیر حقیقی' قیاسی ' سماعی مرکب اضافی' توصیفی وغیرہ کی کار آمد بحثیں آگئی ہیں اور چار ہزار الفاظ کی فہرست دے دی ہے غرضکہ طلباے اردو کے لئے مختصر سی کارآمد اور مفید لغت ہے اور اس کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اب بار سوم چھپی ہے جناب مؤلف کی قابل قدر کوشش لائق تحسین ہے —

فغان درد

(مصنف : جناب عطا محمد خان صاحب 'درد' درانی قلیپھاری -
حجم ۱۰۵ صفحے' سائز ۲۰×۲۶ - لکھائی' چھپائی متوسط - قیمت
ایک روپیہ - ملنے کا پتہ : مصنف صاحب - محلہ نظام پورہ' گجرات' پنجاب)

—•—

یہ جناب مصنف کے کلام کا مجموعہ ہے' یا دیوان - جس میں ردیف وار ترتیب سے وہ غزلیں یادگار کے طور پر جمع کرکے چھپوا دی ہیں' جو درد صاحب نے اپنے تاثرات سے مجبور ہوکر وقتاً فوقتاً کہی ہیں - کلام اچھا خاصا اور صاف ہے - شروع میں مصنف کا فوٹو اور مختصر حالات بھی خود اُنہوں کے لکھے ہوئے ہیں - کلام کا نمونہ یہ ہے :

دام صیاد میں بلبل کو چمن یاد آیا
قید ہستی میں مری جاں کو وطن یادآیا

سوز ہجراں نے تو کیا جوش پیدا کردیا
پل میں اشکوں نے مرے صحرا کو دریا کردیا

آنکھ اے آنسو' دل پر 'درد' سے نکلی ہے آہ
اُس بت بے مہر کی الفت نے رسوا کر دیا

مجھے سیر گُلشن کی پروا نہیں   کہ داغوں سے سینہ چمن بن گیا

کلام میں کوئی خاص ندرت و جدت یا تازگی نہیں معلوم ہوتی - وہی قدیم تخیل ہے اور وہی انداز بیان ہے' بہر حال جناب مصنف نے خود کہدیا ہے کہ "میری شاعری عالمانہ فاضلانہ نہیں اور نہ میں اعلیٰ پایے کی نظم لکھنے (کہنے) کا مدعی ہوں' قدرت نے مجھوں سے درد دیکر آہ و فغاں کا سوز عطا کیا تھا' جس کا اثر یہ مجموعہ ہے" اُمید ہے کہ شعر و سخن کے قدر داں جناب درد کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے اور ان کے کلام سے لطف اندوز ہوکر داد دیں گے —

——•——

عروض

النجمۃ اسائرہ

(ترجمۂ محیط الدائرہ مترجمۂ جناب مولانا محمد سبط حسن صاحب ملا فاضل ' مولوی فاضل ' ممتاز الافاضل - ملنے کا پتہ : انجمن مؤیدالعلوم مدرسۃالواعظین لکھنؤ - قیمت ایک روپیہ ' حجم تقریباً ۲۰۰ صفحے- لکھائی ' چھپائی ' کاغذ متوسط سائز ۲۰ × ۲۶)

—•—

محیط الدائرہ علم عروض و قافیۃ کی مشہور اور نہایت مقبول عربی کتاب ہے ' جو مصر میں کئی بار چھپی اور ہندوستان کے کئی سرکاری و غیر سرکاری مدارس کے نصاب عربی میں شامل ہے - یہ ایسی کتاب کا ترجمہ ہے جو لکھنؤ کے مشہور ' عالم نے کیا ہے ' ترجمہ صحیح عمدہ ہے لیکن انداز قدامت لئے ہوے ہے -اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا نے بالکل لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے - اس سبب سے لطف عبارت جاتا رہا ہے - چونکہ یہ فن ہی نہایت خشک بے مزہ اور غیر ضروری ہے پھر اس کی اصطلاحات نہایت ہی غیر دل چسپ اور اس کے قواعد میں گنجلک اور اُلجھاؤ ہے - تاہم طلباے عربی اور ان طلبا کے لئے خاص کر جو سرکاری یونیورسٹیوں میں عربی کے امتحانات دیتے ہیں - یہ ترجمہ بہت کار آمد اور معین ثابت ہوگا - بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ حامل المتن ہے - اوپر کے نصف صفحے میں اصل عربی ہے - اور نیچے کے نصف صفحے میں ترجمہ - ضرورت مند طلبہ اور عروض کے شائقین ضرور اس سے فائدہ اُٹھائیں -

—•—

آل انڈیا مشاعرہ

(مرتبۂ احسن صاحب مارہروی- لکچرار اردو انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ-لکھائی چھپائی عمدہ-سائز ۲۰ × ۳۰-قیمت بارہ آنے-حجم ۱۰۰ صفحے)

—•—

خیابان اُردو' انٹر میڈیٹ کالج علی گڈھ میں اردو کی ایک ادبی انجمن ہے

جس کے روح رواں کالج کے اردو پروفیسر جناب احسن مارہروی ہیں - اس کی جانب سے سالانہ ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوتا ہے - جس میں باہر کے شعرا اور دیگر ارباب ذوق بھی شریک ہوتے ہیں - یہ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ ع کے سالانہ مشاعرے کے کلام کا مجموعہ ہے' ابتدا میں جناب مرتب نے مختصر حالات اور ضرورت مشاعرہ و شعر و سخن پر تمہید لکھی ہے' اسی کے بعد جناب ملا رموزی صاحب بھوپالی نے اپنی خاص انداز میں مشاعرے کے حالات بہت تفصیل سے اور نہایت دلچسپ پیرائے میں لکھے ہیں پھر مشاعرے کی دونوں طرحوں اردو فارسی پر جو غزلیں پڑھی گئی تھیں اُن کا انتخاب ہے - اس سال یہ جدت کی گئی تھی کہ مصرع طرح کے علاوہ "عزت" - نفس و جذبہ قولی کا عنوان نظمیں لکھنے کے لئے دیا گیا تھا - چنانچہ یہ نظمیں بھی شامل ہیں کلام عمدہ اور آج کل کے مذاق کا ہے اور مجموعی طور پر یہ گلدستہ دلچسپ اور دلپذیر ہوگیا ہے —

مذہب و اخلاق

نغمہ اور اِسلام

(مؤلفۂ مولوی محمد علی شاہ صاحب 'میکش' - میوہ کٹرہ آگرہ - قیمت بارہ آنے' سائز ۱۸ × ۲۲' لکھائی' چھپائی' کاغذ' متوسط - حجم ۷۴ صفحات)

—•—

" یہ مختصر سا رسالہ جیساکہ اُس کے نام سے ظاہر ہے' اس موضوع پر جناب مؤلف نے لکھکر شائع کیا ہے کہ اسلام میں گانا اور گانا سننا جائز ہے یا نہیں' اور اسے ارباب دل و شریعت کیا رتبہ دیتے ہیں جناب مؤلف نے نہ صرف احادیث و آیات قرآنیہ سے اپنے مفید مطلب نتائج نکال کر نغمہ اور سماع کا جواز ثابت کیا ہے بلکہ اور بزرگان دین کے اقوال اور علماء کے تصانیف کے حوالے بھی دیکر نغمہ کو مباح اور جائز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے آخر میں تقلید اور وجد وحال پر بحث ہے' جن حضرات کو اس موضوع سے اختلافی یا اتفاقی حیثیت سے دلچسپی ہے وہ اس رسالے کو پڑھیں -

—•—

تاریخ و سیر

افغان بادشاہ

مصنفہ جناب محمد حسین خان صاحب بی اے - [علیگ] سابق رئیس تدریسات عمومی افغانستان یعنی ڈائرکٹر جنرل پبلک انسٹرکشن - مطبوعہ فیروز پرنٹنگ ورکس، سرکلر روڈ، لاہور - قیمت دو روپے آٹھ آنے]

—•—

یہ کتاب غازی امان اللہ خاں سابق شاہ افغانستان کے حالات میں ہے، جو محمد حسین خاں بی - اے [علیگ] سابق صدر ناظم تعلیمات افغانستان نے تالیف کی ہے۔ خان موصوف نہایت قابل اور فاضل شخص ہیں اور انہوں نے امیر حبیب اللہ خاں مرحوم اور شاہ امان اللہ خاں کے عہد میں قابل قدر خدمات کی ہیں، خصوصاً تعلیم کی اشاعت و ترویج میں لائق تعریف کام کیا ہے۔ فاضل مؤلف نے امان اللہ خاں کے خصائل و عادات، اُن کی روز مرہ کی باتوں، اُن کے مختلف ارشادات اور ان کی کارگزاریوں کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے - اس میں شبہ نہیں کہ انسان کی طبیعت اور دماغ کا اصلی جوہر جس طرح ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے کھلتا ہے وہ بڑے بڑے کاموں سے نہیں معلوم ہوتا - اس کتاب کے پڑھنے سے امان اللہ خاں کے حالات اور خیالات کی سچی قدر ہوتی ہے - معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص میں اپنے ملک کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور اس کی یہ تمنا تھی کہ جس قدر جلد ہوسکے افغانستان دنیا کے اعلیٰ متمدن ممالک میں سے ہو جائے - اس آرزو کے پورا کرنے کے لئے اُس نے ہر طرح کے سامان کئے اور شب و روز ایک مزدور کی طرح سے کام کیا —

امان اللہ عجیب دل و دماغ کا آدمی ہے - ملک کے ہر شعبے اور ہر محکمے میں خود کام کرتا اور کوئی جزوی سے جزوی چیز بھی اس کی نظر سے نہ بچتی تھی - خصوصاً تعلیم کی اشاعت سے اُسے خاص شغف تھا۔ مدارس میں جاتا، خود پڑھاتا، امتحان لیتا اور تعلیم کے سہل طریقے ایجاد کرتا - ممالک غیر سے ماہرین فنون بلاکر مختلف فنون کے مدرسے قائم کئے - تعلیم نسواں کی اشاعت کی بھی اُسے ایسی ہی دھن تھی جیسی مردوں کی تعلیم کی - اس کے علاوہ افغان لڑکوں کو ممالک غیر میں تعلیم کے

لئے بوجھا اور اُن کے لئے وهی انتظام کیا جو اپنی اولاد کے لئے —

باوجودیکه وہ سچا مسلمان تها مگر کبهی مذهب و ملت کی تفریق روا نه رکھا تھااور هندو، مسلمان، یہودی سب سے یکساں برتاؤ کرتا تھا۔ اگر وہ مولانا محمودالحسن مرحوم کی فاتحه خوانی میں شریک هوتا هے تو ملک مهاراج کی موت پر اُن کے جلسهٔ ماتم داری میں بھی اظہار غم کے لئے جاتا هے اور اسی طرح محرم کی مجلسوں میں شریک هوتا اور حالات شہادت سنکو آنسو بہاتا هے —

اگرچه امان الله خاں اس وقت اپنے ملک سے جدا بہت دور پڑا هے مگر اپنے ملک کے لئے جو مخلصانه کوششیں اس نے کی هیں وہ رائگاں نہیں جائیں گی اور وہ بد نصیب قوم جس نے اُسے جلا وطنی پر مجبور کیا ایک روز اپنے کئے پر پچھتاے گی اور اس کی صداقت، ایثار اور حب وطن کی قدر کرے گی —

فاضل مؤلف کو چونکه زمانهٔ دراز تک افغانستان میں رهنے کا اتفاق هوا هے اور شبانه روز بادشاہ سلامت کی صحبت کا شرف حاصل رها هے، اس لئے جس قدر واقعات اس میں درج هیں وہ ان کی آنکھوں کے سامنے گزرے هیں اور بالکل صحیح هیں —

جن صاحبوں کو موجودہ افغانستان اور اس کے سابق بادشاہ امان الله کے حالات سے ذرا بھی دل چسپی هے وہ اس کتاب کو شوق سے مطالعه کریں گے اور اس کے مطالعے سے انکو خوشی هوگی —

فاضل مؤلف بعض بعض جگه عربی فارسی کے ثقیل اور غریب الفاظ لکھ گئے هیں، جو غالباً ان کے قیام کابل کا نتیجه هے —

ایشیا

(از جناب ابرار حسین قادری صاحب ایم - اے، ایل ٹی
لکچرار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ- قیمت ایک روپیه آٹھ آنے)

یه کتاب ایشیا کے طبعی، سیاسی اور اقتصادی جغرافیے پر هے - اب تک جو جغرافیے کی کتابیں عام طور پر اُردو میں لکھی گئی هیں اور مدارس کے نصاب میں شریک هیں، اُن میں اور اس کتاب میں بہت بڑا فرق هے - یه کتاب محض جغرافی اسما اور بعض خشک معلومات کا مجموعه نہیں هے جو رٹنے اور امتحان پاس کرنے کے لئے کار آمد هوتا هے بلکه اس میں ایشیا کے هر ملک کی طبعی، سیاسی اور معاشی

حالات بہت ہی شستہ زبان میں' دلچسپ طریقے سے' اس طرح بیان کی گئی ہے کہ طالب علم اور عام پڑھنے والے دونوں مستفید ہوسکتے ہیں - جغرافیے کو بہت خشک کہاجاتا ہے مگر اس کتاب نے اسے دلکش بنا دیا ہے —

کتاب کے آخر میں ایک نقشہ شامل ہے جس میں ایشیا کے خشکی اور تری کے رستے اور تقویم‌الاوقات کا حال معلوم ہوتا ہے - اس کے علاوہ چند ضمیمے اور نقشے بھی ہیں - پہلے ضمیمے میں دنیا کی طبعی خطوں کی تقسیم ہے جس سے دنیا بھر کی طبعی تقسیم نظر کے سامنے آجاتی ہے - دوسرے ضمیمے میں علامہ ابن خلدون کے مقدمۂ تاریخ سے اس حصے کا اقتباس دیا ہے جس میں علامہ ادریسی (چھٹی صدی) نے ایشیا کی جغرافی کیفیت بیان کی ہے - اس کے بعد ذرائع آمد و رفت' سکہ جات' گوشوارۂ تجارت' جدول عرض البلد و طول البلد کے نقشے ہیں -

---

عصر قدیم

(مرتبۂ مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی مرحوم - ملنے کا پتہ : دلگداز پریس' کٹرہ بزن بیگ خان لکھنؤ - حجم ۲۲۰ صفحے - قیمت ایک روپیہ چار آنے - لکھائی' چھپائی' کاغذ متوسط - تقطیع ۲۰-۲۶)

مولانا شرر مرحوم کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں - ان کی تمام تر زندگی علم ادب اور زبان کی خدمت میں گزری ہے اور آخر وقت تک وہ برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے ہیں' یہ کتاب اُن کی مشہور اور مستند تاریخی تالیف ہے جسے عہد سلف کی مختصر اور جامع تاریخ کہنا چاہئے - اس میں مولانا نے تخلیق عالم کی ابتدا سے لیکر حضرت مسیح کی ولادت تک کے دنیا کی تمام فاتح اور متمدن و ترقی یافتہ قوموں کے واقعات نہایت سلیقے اور ترتیب کے ساتھ بیان کیے ہیں - سیریا' بابل مصر' فلسطین' یونان' روم وغیرہ اقوام قدیم کے اجمالی حالات درج ہیں - غرض کہ یہ کتاب ایک بیش بہا تاریخی ذخیرہ ہے' ہر لائبریری اور کتب خانے میں ہونا چاہئے بلکہ ہر پڑھے لکھے کے مطالعے کی چیز ہے - کتاب کی خوبی کے لئے خود مؤلف کا نام کافی

ہے - اس کے علاوہ یہ ملک میں کافی مقبولیت حاصل کر کے اب دوبارہ شائع کی گئی ہے - تاریخی ذوق رکھنے والوں کے لئے از بس دل چسپ اور قدیم تاریخی حالات کے لئے اچھی چیز ہے —

مسلمان تاجداران ہند

مؤلفہ حکیم محمد سراج الحق صاحب ایڈیٹر سخن سنج ، مطبوعۂ دلگداز پریس لکھنؤ- قیمت فی جلد آٹھ آنے- لکھائی چھپائی ، کاغذ ادنیٰ درجے کا سائز ۲۰-۳۰ - ۱۶ ضخم حصۂ اول جلد دوم ۱۲۰ صفحات- ضخم حصۂ سوم جلد اول ۹۶ صفحات

حکیم سراج الحق صاحب ، مولانا شرر مرحوم کے دلگداز پریس کے منیجر اور مرحوم کے کتابوں کے ناشر و طابع کی حیثیت سے مدت سے اردو کی قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں ، اور اب انہوں نے خود بھی تالیف و تصنیف کے خارزار میں قدم رکھا ہے - اُن کی دو کتابیں جو جدید شائع ہوئی ہیں ہمارے پیش نظر ہیں یہ ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں - پہلا حصہ ، دوسری جلد کا ہندوستان کے مشہور و نامور شہنشاہ جلال الدین اکبر کے سوانح حیات پر مشتمل ہے - ہمایوں ابن بابر کے حالات سے شروع ہوتا ہے - بیان صاف و سادہ ہے - اور حالات کے انتخاب میں سلیقے سے کام لیا گیا ہے ، تیسرا حصہ جلد اول کا ، کتاب کے ساتویں باب سے شروع ہوتا ہے اس میں تیمور کے حملے کے بعد سے خاندان شیر شاہ کے آخر عہد تک کے تمام واقعات ہیں - ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے اور حکومت کرنے کی مجمل مگر کارآمد تاریخ ہے -مدارس میں ہندوستان کی تاریخ کے نصاب میں داخل کی جائے تو بہتر ہے ، ہمارے خیال میں یہ پورا سلسلہ مفید ہوگا اور مکمل کتاب نہایت کار آمد و ضروری ہوگی —

متفرق

رپوٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ منعقدۂ ڈسمبر سنہ ۱۹۲۸ع

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں - یہ رپوٹ اسی کے اکتالیسویں سال کے جلسے کی روداد ہے۔ جو ڈسمبر کے آخر میں بمقام اجمیر شریف منعقد ہوا تھا اور سکریٹری صاحب کے حسب ہدایت رپوٹ اب شائع ہوئی ہے، کانفرنس کا یہ پہلا اجلاس تھا جو صوبۂ اجمیر و میواڑ میں ہوا - ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان ایم اے - جج ہائی کورٹ الہ آباد اس کے صدر تھے - تقریباً سات صفحوں میں جناب صدر کا معرکہ آرا اور زبردست خطبۂ صدارت ہے جس میں بیش قیمت مشورے مسلمانوں کی بہبودی اور تعلیمی ترقی پر دیے گئے ہیں، پھر اس کے رزو لیوشن (تجاویز) ہیں، تجاویز کے بعد سال بھر کی رپوٹ اور چندہ دینے والوں کی فہرست ہے - ان سب کو ملا کر یہ رپوٹ دو تین سو صفحات تک پہنچ گئی ہے - لکھائی چھپائی عمدہ، کاغذ متوسط، حجم تقریباً دو سو صفحات۔صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڈہ سے ملتی ہے —

اُردو کے جدید رسالے

مجلۂ مکتبہ

(از مجلس امداد باہمی مکتبۂ ابراھیمیہ حیدرآباد دکن - قیمت سالانہ چار روپیہ)

مکتبۂ ابراھیمیہ حیدرآباد اردو کتب کی اشاعت کا بہت اچھا کام کر رہا ہے اور یہ ماہوار رسالہ بھی اسی مکتبہ کی جانب سے شایع ہوتا ہے - اس رسالے میں زیادہ تر ادبی اور علمی مضامین ہوتے ہیں - دکنی تصانیف کے متعلق اکثر مضامین درج ہوتے رہتے ہیں حیدرآباد کے ممتاز علمی رسالوں میں سے ہے اور بعض مضامین اس میں عالمانہ شان کے شایع ہوے ہیں- اس کے مدیر مولوی محمد عبدالقادر صاحب سروری ایم-اے، ال ال-بی ہیں جو اسے سلیقے اور محنت سے مرتب کرتے ہیں —

چمنستان

(از امرتسر، ایڈیٹر محمد افضل خان ، و سید ظفر ہاشمی- جلد۲سالانہ دو روپے فی پرچہ تین آنے حجم۴۴ صفحات سائز ۲۰ × ۲۶ لکھائی چھپائی متوسط-باتصویر)

لاہور سے جس قسم کے اُردو ادبی رسالے آئے دن نکلتے رہتے ہیں - یہ بھی اسی طرح کا ایک ماہانہ رسالہ ہے - جس میں زیادہ تر فسانے ، غزلیں اور نظمیں ہیں- ایک آدھ اور مضمون بھی ہے - اور دو تصویریں ہیں - ایک رنگین " نخچیر صیاد " نہایت دلفریب تصویر ہے اور دوسرے جون آف آرک کی ہے، جو بہت پامال ہے اور بارہا چھپ چکی ہے - مضامین متوسط درجے کے ہیں- کوئی اہم اور قابل تذکرہ نہیں - افسانوں سے جو حضرات ذوق شوق رکھتے ہیں وہ یہ پرچہ بھی منگواکردیکھیں -

---

الہادی

(ایڈیٹر سید محمد حسین صاحب ' کوثر ' کانپوری ' ملنے کا پتہ بازار رام نرائن کانپور - قیمت سالانہ تین روپے - حجم ۳۲ صفحے ' سائز ۲۰ × ۲۶ کاغذ اور لکھائی چھپائی متوسط)

—*—

یہ مذہبی رسالہ بھی نیا نکلنا شروع ہوا ہے- اور پہلا ہی نمبر ہمارے سامنے ہے اس کے مقاصد یہ ہیں کہ اہل اسلام اُن نکات و رموز حکیمانہ سے واقف ہوں جو قرآن مجید اور احادیث میں موجود ہیں ' کسی فرقۂ اسلام کی دل آزاری مقصود نہیں'' ہمارے یہاں ایسے رسالے کم نکلتے ہیں جنہوں نے اپنا کوئی خاص مقصد قرار دیا ہو بلکہ زیادہ تر نقیر کے کچکول کی حیثیت رکھتے ہیں مگر یہ خالص مذہبی رسالہ ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ دل آزاری سے اس کا دامن پاک ہے- اس نمبر میں پانچ مضمون ہیں - علوم الدہ خاص ایڈیٹر صاحب کا دوسرا الاخلاق- تیسرا امام پنجم امام باقر پر چھٹا اور ساتواں احسان اسلام و خصوصیات اسلام پر ہیں - اپنے مقاصد کے لحاظ سے پرچہ غنیمت ہے اور شیعیت غالب ہے -

———

اردو

نویں جلد

سنہ ۱۹۲۹ ع

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

اردو

نویں جلد　　　　　　　　　　　　　　　　　　سنہ ۱۹۲۹ ع

فہرست مضامین

(الف) مقالے

(ب) نظمیں

——:۞:——

اخلاق و مذہب

تاریخ و سیر

تعلیم

متفرق

اردو کے جدید رسالے

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

انجمن کے مطبوعات

—— (چمنستان شعرا) ——

ایک قدیم و نایاب اردو زبان کے شاعروں کا تذکرہ ہے ' جو انجمن ترقی اردو نے نہایت اہتمام سے شایع کیا ہے ' اور اس کی تصحیح و ترتیب میں نہایت محنت و کوشش سے کام لیکر ایک دل چسپ و محققانہ مقدمے کے ساتھ چھاپا ہے - تذکرے کے مولف (دکن) کے مشہور مورخ و تذکرہ نویس لالہ لچھمی نرائن ' شفیق و صاحب ' ہیں - سنہ ۱۱۷۲ ھ میں یہ تذکرہ تالیف ہوا ' اور دنیا میں اس کا صرف ایک نسخہ ہی پایا جاتا تھا - عالی جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے - سکریٹری انجمن ترقی اردو کا مقدمہ بھی قابل دید ہے - حجم تقریباً ۴۰۰ صفحے - جلد نہایت اعلی قسم کی ' قیمت مجلد پانچ روپے آٹھ آنے سکۂ انگریزی' غیر مجلد چار روپے بارہ آنے سکۂ انگریزی —

—— (مخزن نکات) ——

یہ اردو شعرا کا نایاب تذکرہ ہے - مصنفۂ شیخ محمد قیام الدین ' قائم ' چاند پوری- شروع میں مولوی عبدالحق صاحب بی- اے آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو کا ایک مقدمہ ہے' جس میں اس تذکرے پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور آخر میں قائم کے کلام کا انتخاب بھی دیدیا ہے - قیمت فی جلد مجلد ڈیڑھ روپیہ —

—— (ذکر میر) ——

ہندوستان میں کون ایسا صاحب ذوق ہوگا جو اردو کے خداے سخن حضرت ' میر ' کے نام اور کلام سے نا آشنا ہو' ان کے کلام کا پاکیزہ انتخاب عرصہ ہوا کہ انجمن

المشتہر ——————————————

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

نے شائع کیا تھا جو ملک میں بہت مقبول ہوا اور کئی بار چھپ چکا ہے - اب خاص اہتمام سے میر صاحب کی یہ نادرۂ روز گار سوانح عمری طبع کی گئی ہے جو خود انھوں کے پر سوز و گداز قلم کی تراوش ہے - جس میں انھوں نے اپنے حالات زندگی اور اس وقت کی فضا نیز آخری دور مغلیہ کی تصویر نہایت دل کش انداز سے کھینچی ہے - اور انجمن نے اپنے مخصوص و خوش نما ٹائپ میں چھاپی ہے - شروع میں جناب مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ معتمد انجمن کا مقدمہ بجائے خود قابل دید اور کتاب کی جان ہے - جلد خوب صورت، حجم ۱۸۰ صفحے، قیمت دو روپے —

—— (بزم مشاعرہ) ——

گذشتہ سال ماہ تیر (مئی و جون) میں عالی جناب مہاراجہ کشن پرشاد، شاد، مدظلہ العالی صدر اعظم دولت آصفیہ دکن نے اورنگ آباد میں شرف ورود فرمایا تھا - جناب محتشم کی تشریف آوری پر اور دل چسپ ہنگاموں کے علاوہ ایک نہایت پر تکلف، شاندار مشاعرہ بھی حضرت موصوف کی صدارت میں بمقام مقبرہ ہوا - اس مشاعرے کا گلدستہ نہایت خوش نما، نظر فریب دو رنگوں میں طبع کیا گیا ہے - شروع میں جناب صدر مدظلہ کی پاکیزہ تصویر اور جناب معنوی صدیقی کے قلم کا دل پذیر دیباچہ بھی قابل دید ہے - سر ورق بھی خوب صورت اور شاندار ہے - آخر میں وہ قصائد بھی شامل کر دیے گئے ہیں جو اورنگ آباد کالج میں پڑھے گئے تھے - نفاست پسند ارباب ذوق کے لئے بہت تھوڑی تعداد میں یہ گلدستہ طبع ہوا ہے - قیمت آٹھ آنے —

—— (تاریخ اخلاق یورپ) ——

اس کتاب کے اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم و تبحر، تحقیق و صداقت کا مرادف ہے - یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن، اصول اخلاق، مذاہب و خیالات کا مرقع ہے - مترجمۂ مولوی عبدالماجد صاحب بی - اے، جلد اول مجلد ۳ روپے، جلد دوم مجلد دو روپے ۸ آنے —

المشتہر ——————————————

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

—— (ہماری شاعری) ——

مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ، ایم - اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی نے رسالۂ اردو میں شاعری پر ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جو عام طور پر بہت پسند کیا گیا تھا - اب رضوی صاحب نے اس میں بہت کچھ اضافہ کر کے کتابی صورت میں کردیا ہے - اور انجمن ترقی اردو نے نہایت عمدہ طور پر یہ کتاب طبع کرائی ہے - پورے کپڑے کی خوشنما جلد ہے - حجم دو سو صفحے ، قیمت دو روپے ——

—— (کلیات ولی) ——

ولی دکنی کے نام سے کون اردو داں واقف نہ ہوگا - اسے اردو شاعری کا باوا آدم کہتے ہیں اور یہی گویا ہماری شاعری کا قدیم اور ممتاز ترین علم بردار ہے - اس کا کلام اس زمانے کی زبان اور شاعری کا بہترین اور کامل مرقع ہے ——

یہ کلیات جناب ' احسن ' مارہروی نے نہایت محنت اور قابلیت سے مرتب کیا ہے - اور انجمن ترقی اردو کے جدید ترین مطبوعات میں ہے - اب تک ولی کے جو دیوان کہیں کہیں چھپے اور ملتے ہیں - اکثر غلط اور نا مکمل ہیں - یہ کلیات ۱۷ - ۱۸ قدیم ' قلمی ' نایاب نسخوں سے مقابلہ اور تصحیح کر کے کئی سال کی لگا تار محنت و کاوش سے مرتب کیا گیا ہے ——

اس نادرالکلام استاد کا کلیات تقریباً تمام اصناف سخن پر حاوی اور چار سو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے - شروع میں مرتب صاحب کا ایک بسوط اور قابل قدر مقدمہ ہے جس میں موصوف نے صاحب دیوان کے حالات و سوانح نہایت تحقیق اور کمال محنت سے فراہم کر کے جمع کئے ہیں اور کلام پر تبصرہ بھی فرمایا ہے ——

کلیات کے آخر میں ایک بسیط فرہنگ ہے ' جس میں ان تمام قدیم ' متروک ' اجنبی ' ہندی ' دکنی الفاظ کا حل ہے جو کلام ولی میں جا بجا آے ہیں - آخر میں پورے دو سو صفحے کا ایک ضمیمۂ اختلاف نسخ ہے ' جو نہایت محنت و عرق ریزی سے مرتب کیا گیا ہے ' اس میں تمام نسخوں سے مقابلہ کرنے پر جو جو اختلاف نظر آیا ہے '

المشـــ تہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

دیوان کی ہر غزل کے نمبر کا حوالہ دے کر بتا دیا ہے - یہ ضمیمہ ارباب فن و تحقیق کے لئے خاص طور سے قدر کی چیز ہے - اور کئی ماہ کی مسلسل محنت سے تیار ہوا ہے - ان تمام خوبیوں کے علاوہ انجمن نے اپنے مشہور عمدہ ٹائپ میں مضبوط سفید چکنے کاغذ پر طبع کیا ہے ' قابل دید اور اس لائق ہے کہ ہر لائبریری اور قدر دانان اردو کے ہر کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ موجود رہے - حجم تقریباً آٹھ سو صفحات ' قیمت مجلد ۵ روپے ' غیر مجلد ۴ روپے —

—— (مثنوی خواب و خیال) ——

حضرت میر درد دھلوی (رح) کے چھوٹے بھائی میر اثر کی یہ لا جواب مثنوی نایاب تھی ' بہت کوششوں کے بعد خوش نصیبی سے انجمن ترقی اردو کو دستیاب ہو گئی ' اور اب خاص اهتمام کے ساتھ عمدہ ٹائپ میں اعلی درجے کے کاغذ پر ' طبع کی گئی ہے ' جس پر انجمن کے فاضل معتمد جناب مولوی عبدالحق صاحب نے ایک زبردست ناقدانہ مقدمہ تحریر فرما کر اس مثنوی کے خصوصیات اور محاسن کو نمایاں کیا ہے - یہ مثنوی آج تک نا پید تھی ' تذکروں میں کہیں کہیں اس کا ذکر آ جاتا ہے ' حضرت میر درد کے اشعار اور کلام کے علاوہ اس میں مصنف کی غزلیں بھی جا بجا ہیں ' جو قابل دید اور نہایت پاکیزہ ہیں - یہ مثنوی اردو میں ایک قابل قدر اضافہ اور قدر دانان اردو کی خدمت میں انجمن کا جدید علمی ہدیہ ہے ' جلد بھی مضبوط عمدہ اور جدید طرز کی بنوائی گئی ہے ' حجم دو سو صفحے سے زائد ' قیمت مجلد ڈیڑھ روپیہ -

—— (انتخاب کلام میر) ——

ملک‌الشعرا میر تقی میر کے نام اور کلام سے کون قدر دان اردو واقف نہیں ' یہ انہیں کے کلام کا بہترین انتخاب ہے جو جناب مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سارے کلیات کا عطر کھینچ لیا ہے ' یہ انتخاب ملک میں بہت مقبول ہو چکا ہے اور کئی یونیورسٹیوں نے اپنے نصاب تعلیم میں شامل کر لیا ہے —

المشتہر ——————————————————

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اب تیسری بار انجمن ترقی اردو پریس نے اپنے مشہور ، نفیس ٹائپ میں چھاپ کر شائع کیا ہے ۔ کاغذ چکنا ، نہایت عمدہ ۔ حجم دو سو صفحات سے زیادہ ، جلد نفیس اور مضبوط ۔ شروع میں فاضل مرتب کا زبردست و دلچسپ مقدمہ ہے ۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے —

—— (قواعد اردو) ——

یہ کتاب جناب معتمد صاحب انجمن ترقی اردو کی بیش بہا تالیف ہے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ زبان اردو کے قواعد پر اب تک اس سے بہتر ، سہل ، جامع کتاب تصنیف نہیں ہوئی ۔ ملک میں بیحد پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی اور نہایت مقبول ہوئی ہے ۔ جامعۂ عثمانیہ کے نصاب ایف اے میں داخل ہے ۔ اب جناب مؤلف و مرتب کی بیحد کاوش اور غور سے نظر ثانی ، ترمیم و اضافہ کے بعد دوبارہ چھاپی گئی ہے ۔ شروع میں اردو زبان اور اس کے ادب پر لا جواب بسوط مقدمہ بجائے خود قابل دید ہے ۔ انجمن نے اپنے پریس میں عمدہ ٹائپ میں چھپوائی ہے ، کاغذ بہت عمدہ ، جلد نہایت نفیس اور مضبوط ۔ قیمت مجلد دو روپے ۸ آنے ۔

—— (جاپان اُس کا تعلیمی نظم و نسق) ——

سرکار نظام نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات ممالک محروسۂ سرکار عالی کو جاپان کے تعلیمی نظم ونسق کے مطالعے اور تحقیق کے لئے بھیجا تھا ۔ نواب صاحب موصوف نے وہاں رہ کر اس عجیب و غریب ملک کے حالات اور خاص کر تعلیمی نظم و نسق کو نہایت غور و تحقیق سے مطالعہ فرمایا ۔ کتاب کے ابتدائی حصے میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دلچسپ اور فاضلانہ بحث کی ہے ، جو ہمارے اہل وطن کے لئے سبق آموز ہے ۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو جاپان پر اس طرز میں لکھی گئی ہے ۔ ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھے جو علاوہ دلچسپ ہونے کے پر از معلومات بھی ہے ۔ خاص کر ان لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے جو ملک کی تعلیم سے دلچسپی اور تعلق رکھتے ہیں ۔ حجم ۴۸۲ صفحے قیمت فی جلد مجلد تین روپے —

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

—— (سر گزشت حیات (یا) آپ بیتی) ——

اس کتاب میں حیات کے آغاز اور اس کے نشو و نما کی داستان نہایت دلچسپ طرز پر بہت ہی سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے - حیات کی ابتدائی حالت سے لیکر اس کا ارتقا انسان تک پہنچایا گیا ہے اور تمام تاریخی مدارج کو اس سہل طریقے سے بتایا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سمجھ سکے - اگرچہ جدید سے جدید علمی تحقیقات بھی اس میں آگئی ہے مگر بیان کی سلاست میں فرق نہیں آیا - یہ کتاب جدید معلومات سے لبریز ہے اور ہر شخص کو اس کا مطالعہ لازم ہے - حجم ۳۰۰ صفحے ' قیمت فی جلد مجلد ۲ روپے ۸ آنے -

—— (تذکرۂ شعراے اردو) ——

میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں - ان کی مثنوی ' بدر منیر ' کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ہی اردو کی کسی اور کتاب کو نصیب ہوا ہو - یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف ہے - یہ کتاب بالکل نایاب تھی ' بڑی کوشش سے بہم پہنچا کر طبع کی گئی ہے - میر صاحب کا نام اس تذکرے کی خوبی پر کافی شہادت ہے - شروع میں مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کا ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ ہے - قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ ۱۴ آنے غیر مجلد ایک روپیہ ۶ آنے —

—— (تاریخ تمدن) ——

سر تامسن بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے - الف سے (ی) تک تمدن کے ہر مسئلے پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ہے - اس کے مطالعے سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے - حصۂ اول غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنے - مجلد دو روپے - حصۂ دوم مجلد دو روپے —

المشتہر ______________________

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

——— (مقدمات الطبیعات) ———

یہ انگلستان کے مشہور سائنس داں حکیم ھکسلے کی کتاب کا ترجمہ ہے جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے - اس میں بظاہر فطرت کی بحث ہے ' لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے - قیمت غیر مجلد ۲ روپے - مجلد ۲ روپے ۸ آنے —

——— (القول الاظہر) ———

امام مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف (فوزالاصغر) کا اردو ترجمہ ہے - یہ کتاب فلسفۂ الٰہیین کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انہیں اصول کو منطبق کیا گیا ہے - قیمت غیر مجلد ۸ آنے ' مجلد ایک روپیہ —

——— (القمر) ———

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ہوے ہیں ' ان سب کو جمع کر دیا ہے - طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے - قیمت غیر مجلد ۱۰ آنے ' مجلد ایک روپیہ —

——— (فلسفۂ تعلیم) ———

ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلۂ تعلیم کی آخری کتاب ہے - غور و فکر کا بہترین کار نامہ - والدین و معلم کے لئے چراغ ہدایت - تربیت کے قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے - اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے - قیمت مجلد ۲ روپے ' غیر مجلد ایک روپیہ ۱۲ آنے —

——— (دریائے لطافت) ———

ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاءاللہ خاں کی تصنیف ہے - اردو صرف و نحو اور محاورات اور الفاظ کی پہلی کتاب ہے ' اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں - قیمت مجلد ۲ روپے ' غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنے —

——— (طبقات الارض) ———

اس فن کی پہلی کتاب ہے - (۳۰۰) صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلم بند

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

گئے ہیں - کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور ان کے مرادفات کی فہرست بھی سلسلک ہے - قیمت غیر مجلد ۲ روپے - مجلد دو روپے ۸ آنے —

—— (مشاہیر یونان و روما) ——

ترجمہ ہے - سیرت نگاری اور انشا پردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم چلا آتا ہے - ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمے سے فیض حاصل کیا ہے - وطن پرستی اور بے نفسی، عزم و جواں مردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے - قیمت جلد اول غیر مجلد ۳ روپے - مجلد ۴ روپے جلد دوم ۲ روپے ۸ آنے —

—— (اسباق النحو) ——

ملک کے ادیب کامل مولانا حمیدالدین صاحب بی - اے کی تالیف ہے - اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے - قیمت حصۂ اول غیر مجلد ۶ آنے - حصۂ دوم ۴ آنے —

—— (علم المعیشت) ——

اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم - اے نے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے - معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے - مبہم و مشکل مسائل کو پانی کردیا ہے، اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں - اشتراکیت کا باب قابل دید ہے - حجم ۸۸۵ صفحے، قیمت مجلد ۵ روپے آٹھ آنے —

—— (تاریخ یونان) ——

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ - اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے - ایف اے کلاس کے طلبا جو یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں، اس کتاب کو حد درجہ مفید پائیں گے قیمت مجلد ۲ روپے —

المشتہر ———————————— المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

—— (رسالۂ نباتات) ——

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے- علمی اصطلاحات سے معرا - طلبائے نباتات جس مسئلے کو انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اس رسالے میں مطالعہ کریں قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے ——

—— (دیباچۂ صحت) ——

اس کتاب میں مطالبات صحت پر (مثلاً ہوا ' پانی ' غذا ' لباس ' مکان وغیرہ) مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے - زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دلپذیر ہے ' ملک کی بہترین تصنیف ہے - اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا - حجم ایک ہزار صفحے - قیمت مجلد چار روپے ——

—— (نکات الشعراء) ——

یہ اردو کا تذکرہ استادالشعرا میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ہے - اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں - نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں- مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدرالصدور امور مذہبی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے - قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے ——

—— (فلسفۂ جذبات) ——

کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے - جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھہ بحث کی گئی ہے- متعلمان نفسیات بہت مفید پائیں گے- قیمت مجلد دو روپے آٹھہ آنے- غیر مجلد دو روپے ——

—— (وضع اصطلاحات) ——

یہ کتاب ملک کے نامور انشا پرداز و عالم مولوی وحیدالدین ' سلیم ' مرحوم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعے کے بعد تالیف کی ہے

المشتہر ———————————————

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

بقول فاضل مؤلف " یہ بالکل نیا موضوع ہے - میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی زبان میں " - اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں - مخالف و موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی ، مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے سابقوں اور لاحقوں - اردو مصادر اور ان کے مشتقات - غرض سیکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آ گئی ہیں - اردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان میں ان کی نظیر نہیں - لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کردی ہیں - اور ہمارے حوصلے بلند کردیے ہیں - اس سے پہلے ہم اردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور اس کی آئندہ ترقی کے متعلق دعوی کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے - مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا - اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے - تعداد صفحات (۳۰۵) قیمت مجلد تین روپے ۱۲ آنے —

—— (محاسن کلام غالب) ——

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کا معرکۃ الآرا مضمون ہے - اردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہے - یہ مضمون رسالۂ اردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا - صاحب نظر قدر دانوں کے اصرار سے الگ طبع کیا گیا ہے - قیمت مجلد ایک روپیہ

—— (ملل قدیمہ) ——

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے - اس میں بعض قدیم اقوام ، سلطنت کلدانی آشوری ، بابل ، بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت - عقائد - اور صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھ دیے ہیں - اردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات مسلسل طور سے معلوم ہو سکیں اس لئے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے - حالات کی وضاحت کے لئے جا بجا تصویریں دی گئی ہیں - صفحہ ۲۸۴ - قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے —

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) —

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

—— (بجلی کے کرشمے) ——

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی ' اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعے کے بعد لکھی ہے - برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی گئی ہے - ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے ' کہاں سے آتی ہے ' کیا کام آ سکتی ہے - یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے - لڑکوں لڑکیوں کے لئے بھی مفید ہے - قیمت ایک روپیہ بارہ آنے —

—— (البیرونی) ——

مصنفۂ مولوی سید حسن برنی صاحب بی اے - اس کتاب میں علامہ ابو ریحان بیرونی کے حالات ہیں اور ان کی مشہور و معروف تصنیف کتاب الہند اور دیگر تصانیف پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے - انجمن ترقی اردو نے اب دوسرا ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی اور اضافۂ مضامین کے ساتھ نہایت عمدہ کاغذ پر چھپوایا ہے - قیمت فی جلد مجلد دو روپے - غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ —

—— (تاریخ ہند) ——

ہندوستان کی یہ تاریخ مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی نے محکمۂ تعلیمات سرکار نظام کی فرمائش پر لکھی ہے اور مڈل اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے - اس وقت تک کوئی اور مختصر تاریخ ہند اس نقطۂ نظر اور ایسی خوبی سے نہیں لکھی گئی ہے - تعلیمی حلقوں کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اسے بہت پسند کیا ہے - چھوٹے سائز کے ۲۸۴ صفحے - قیمت ایک روپیہ ایک آنہ —

—— (لغت اصطلاحات علمیہ) ——

جملہ اہم علوم کی اصطلاحوں کا ترجمہ ' جس میں حسب ذیل علوم داخل ہیں

Astronomy, Botany, Economics, History, (Constitutional, Greece

المشتہر ——————————

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

England, etc,) Logic, Algebra, Conics, Solid Geometry, Trigonometry, Differential Equations, Statics, Metaphysics, Psychology, Physics, Political Science, Archæology –

کئی سال کی مسلسل محنت اور مختلف ماہرین زبان کی کاوش و کوشش کا نتیجہ ہے - مصنفین و مترجمین کے لئے ناگزیر ہے —

حجم ۵۳۸ صفحے - قیمت مجلد چھہ روپے —

یہ بیش بہا کتابیں بھی انجمن ترقی اورنگ‌آباد دکن سے مل سکتی ہیں

(دیوان غالب جدید و قدیم)

یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بے حد انتظار تھا - اس میں مرزا غالب کا قدیم و جدید تمام کلام موجود ہے - مرزا صاحب کا قدیم کلام ملنے کی کسے توقع تھی - یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہاتھہ آ گیا اور ریاست بھوپال کی سرپرستی میں چھپ کر شائع ہوا ہے - مع مقدمۂ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم- مجلد ۵ روپے غیر مجلد ۴ روپے (بلا مقدمہ مجلد ۳ روپے غیر مجلد دو روپے آٹھہ آنے) —

(حقیقت اسلام)

یہ کتاب جناب نواب سر امین جنگ بہادر کے ' سی' آئی ' ای ' سی ' ایس ' آئی ' ایم ' اے ' بی ' ایل ' ایف ' آر ' ایس ' چیف سکریٹری گورنمنٹ نظام و صدرالمہام پیشی کی بے نظیر تصنیف نوٹس آن اسلام کا با محاورہ اور سلیس ترجمہ ہے۔

المشتہر ————————————————————————————— المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

اس کتاب میں مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھ موجودہ خیالات سائنس سے اسلام کی تطبیق اور اس کی صداقت کا بیان کیا ہے - فاضل مصنف نے ان تمام مشکل مسائل کی حقیقت کو جن میں اکثر تعلیم یافتہ جوانوں یا غیر مسلموں کو شبہات واقع ہوتے ہیں، زمانۂ حال کے ترقی یافتہ خیالات کی روشنی میں نہایت دلاویز طریقے اور حکیمانہ استدلال سے بیان کیا ہے، جس سے مصنف ممدوح کے وسیع مطالعہ فلسفیانہ طبیعت اور غور و خوض کا پتہ ملتا ہے —

کتاب بہت عمدہ کاغذ پر چھپی ہے - قیمت مجلد بارہ آنے —

——— (تاریخ زوال روما) ———

یہ گبن کی مشہور تاریخ کے ابتدائی (۷) ابواب کا ترجمہ ہے - اصل کتاب اپنی خوبیوں کے اعتبار سے محتاج تعریف نہیں - قیمت فی جلد غیر مجلد سوا روپیہ —

——— (تاریخ عرب) ———

مصنفۂ موسیو سدیو فرانسیسی - عربوں کے متعلق یہ کتاب ان تمام تاریخوں کا نچوڑ ہے جو یورپ و ایشیا کے کتب خانوں کی زینت ہیں مسلمانوں کی ترقیوں اور عربوں کے کمالات کا آئینہ ہے - ساتھ ہی یورپ کے کذب و افترا کا بہترین جواب - قیمت مجلد چرمی ۷ روپے ۸ آنے —

——— (یاد گار غالب) ———

یعنی مرزا اسداللہ خاں 'غالب' دہلوی کے مفصل حالات زندگی اور ان کے نظم و نثر ' اردو' فارسی پر تفصیلی ریویو اور انتخاب - مولفۂ شمس العلما مولانا الطاف حسین صاحب ' حالی' مرحوم - قیمت مجلد ۳ روپے —

——— (شعر و شاعری) ———

شمس العلما خواجہ الطاف حسین ' حالی ' مرحوم کے اردو دیوان کا لاجواب مقدمہ جس میں شعر و شاعری پر نقادانہ بحث کی گئی ہے - تنقیدی حیثیت سے اردو زبان میں اب تک ایسی کتاب نہیں لکھی گئی ہے - قیمت مجلد ۲ روپے' غیر مجلد سوا روپیہ —

المشتہر ———————— مہتمم

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ: کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

——(موازنۂ انیس و دبیر)——

میر انیس کی شاعری پر تفصیلی ریویو اور میر انیس و مرزا دبیر کا موازنہ - مولفۂ مولانا شبلی نعمانی، قیمت فی جلد مجلد چار روپے - غیر مجلد تین روپے —

——(وکرم اُروسی)——

کالیداس کے مشہور ناٹک کا اردو ترجمہ مع ایک بسیط مقدمے کے جس میں ہندی ڈرامے کی تاریخ اور نوعیت پر مفصل بحث کی گئی ہے - مرتبۂ مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی، اے مرحوم - قیمت مجلد دو روپے - غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ —

——(خطوط شبلی)——

علامۂ شبلی مرحوم کے یہ وہ لا جواب اور نادر خطوط ہیں جو موصوف نے بمبئی کی مشہور تعلیم یافتہ خواتین عطیہ بیگم صاحبہ فیضی اور زہرا بیگم صاحبہ فیضی کے نام وقتاً فوقتاً کمال اخلاص و محبت اور انداز خاص کے ساتھ لکھے تھے - یہ جواہر پارے اردو میں مولانا کے کمال انشا پردازی کی نایاب یادگار ہیں - طرز نگارش اس قدر لطیف اور پاکیزہ ہے کہ شروع کر کے ختم کئے بغیر کتاب کو چھوڑنا دشوار ہے- شروع میں جناب مولوی عبدالحق صاحب، بی - اے معتمد انجمن ترقی اردو کا ایک نہایت لطیف و سخن گسترانہ مقدمہ بھی شامل ہے، جس نے ان خطوط کے جذبات اخلاص و محبت اور نکات ادبی کو بے نقاب کردیا ہے - مرتبۂ مولوی محمد امین صاحب مارہروی و جناب قیصر بھوپالی - قیمت ایک روپیہ —

——(دیوان غالب طبعۂ جرمنی)——

غالب کے کلام کی جو قدر اور مانگ ہے ہر صاحب ذوق جانتا ہے، ان کے دیوان کا ایک اڈیشن نفاست پسند طبائع کے لئے جرمنی کے مشہور کاویانی پریس میں جامعہ ملیہ نے چھپوایا تھا جو ہاتھوں ہاتھ نکل گیا - دوسری بار پھر اسی اہتمام و نفاست سے طبع ہوا ہے - ٹائپ، کاغذ، چھپائی، جلد، سائز، ہر چیز دیدہ زیب و دلفریب ہے - قیمت چار روپے —

المشـــــــــتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

—— (محشر خیال) ——

یہ سید سجاد انصاری مرحوم وکیل بارہ بنکی کے چلد دلکش ادبی و اصلاحی مضامین اور نظموں کا مجموعہ ہے جو شرکت ادبیہ دہلی نے خاص اہتمام سے چھپوایا ہے۔ سجاد انصاری صاحب خوش فکر و خوش گفتار ادیب تھے ' ان کے مضامین میں خاص قدرت و ادبیت اور کلام میں خاص کیف اور بلند خیالی و جذبات نگاری ہوتی ہے - یہ مجموعہ مرحوم کی جوانمرگی کی یادگار ہے ' جس کو سید منظور حسین صاحب نے مرتب کیا ہے - لکھائی چھپائی بہت پاکیزہ ' سائز مختصر ' جلد نہایت نفیس ' اوپر سنہری حروف میں کتاب کا نام بھی لکھا ہے - قیمت دو روپیہ آٹھ آنے —

—— (چمن) ——

یہ نہایت چھوٹا سا حسین و جمیل مجموعہ اساتذۂ اردو کے پاکیزہ کلام کا انتخاب ہے کارڈ سائز پر نہایت اعلیٰ طباعت و کتابت کے ساتھ عید کے موقعہ پر دوست احباب کو پیش کرنے کے لئے بہترین ادبی تحفہ ہے - قیمت ۵ آنے —

—— (دیوان حالی) ——

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی مرحوم کے قطعات غزلیات ' قصیدے ' مرثیے ' ترکیب بند ' رباعیاں ' تاریخیں اور متفرق اشعار قیمت ڈیڑھ روپیہ —

—— (متریکولیشن کا نصاب اردو) ——

مجلس نصاب اردو جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی ہدایت کے مطابق مولانا مولوی عبدالحق صاحب بی - اے (علیگ) آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو نے مرتب کیا - قیمت دو روپے —

—— (معراج العاشقین) ——

حضرت مخدوم ابوالفتح صدرالدین سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نواز (رح) کی تصنیف ہے - اس میں حضرت کے بعض مواعظ و ارشادات قدیم اردو یعنی الهش —————————— قہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ھیں)

دکنی اردو میں لکھی ھیں - مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کی تصحیح و ترتیب اور مقدمے کے ساتھہ چھپی ھے - قیمت ۶ آنے —

—— (وقائع عالمگیر) ——

حضرت اورنگ زیب سلطان ھند عالمگیر کے وقائع زندگی جو خود ان کے مکاتیب اور مستند مورخین کی روایات پر مبنی ھیں - اور جن سے ان کے حقیقی کیریکٹر، رواداری، عدل جوئی اور تشریع مذھبی کا کافی ثبوت ملتا ھے - مرتبۂ چودھری نبی احمد صاحب سندیلوی مجلد ۲ روپے —

—— (افغان بادشاہ) ——

اعلی حضرت غازی امان اللہ خاں کی عظیم الشان چشم دید داستان حیات ھے - اس لاجواب کتاب کو محمد حسین خاں بی - اے (علیگ) ڈائرکٹر جنرل پبلک انسٹرکشن افغانستان نے بڑی عرق ریزی سے مرتب کیا ھے، شائقین سیر و تاریخ کے لئے خصوصاً اور کافۂ مسلمین کو عموماً لازم ھے کہ اس کتاب کو غور سے مطالعہ فرما کر استفادہ کریں - قیمت فی جلد دو روپے آٹھہ آنے —

—— (عروس ادب) ——

مولوی سید ناظرالحسن صاحب ھوش بلگرامی کے اخلاقی ادبی تاریخی اور سیاسی مضامین کا مجموعہ - حجم ۲۲۴ صفحہ - سائز ۲۶ × ۲۰ کاغذ عمدہ سفید، لکھائی چھپائی بہت خوشنما - قیمت فی جلد دو روپے —

—— (خیالات اورنگ) ——

مشہور امریکن مصنف واشنگٹن اورنگ کے بعض دلچسپ مضامین کا بامحاورہ اردو

المشتہر —————————————————

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

ترجمہ از مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا وکیل غازی آباد ضلع میرٹھ قیمت ۸ آنے —

—— (سیر المصنفین) ——

جس میں نثاران اردو کے حالات زندگی اور اردو زبان کی عہد بعہد کی ترقی و تبدیلی کا ذکر کیا گیا ہے - مصنفۂ مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی - اے (علیگ) قیمت دو روپے —

—— (مصنوعی بیوی) ——

مشہور ہر دلعزیز مغربی ناولسٹ آر ، ایچ ، بول کے ایک نہایت دلچسپ انگریزی ناول " مزیک بی لیو وائف " کا اردو ترجمہ از مولوی عباس حسین صاحب ' لطفی ' قیمت ۱۲ آنے —

—— (خواتین انگورہ) ——

مولفۂ سلا توحیدی صاحب - ترکی کی مشہور و معروف خواتین کے کار نامے - اس کتاب سے آپ کو معلوم ہو گا کہ موجودہ جد و جہد میں ترکی خواتین نے کس جوش اور قابلیت سے حصہ لیا ہے - قیمت ایک روپیہ —

—— (جہاں آرا بیگم) ——

جہاں آرا بیگم بنت شاہجہاں کی سوانح عمری جو نہایت مستند تاریخوں سے لکھی گئی ہے - مولفۂ مولوی ضیاءالدین احمد برنی صاحب بی اے قیمت ۸ آنے —

—— (ناٹک کتھا) ——

مولفۂ محمد عمر نور الٰہی صاحبان قدیم ہندوستانی ڈراموں کی کہانیاں نہایت دلچسپ پیرایے میں اس چھوٹی سی کتاب میں جمع کردی گئی ہیں - قیمت فی جلد آٹھ آنے —

—— (سفیر اودھ) ——

آخری بادشاہ اودھ سلطان عالم واجد علی شاہ کے سفیر مولوی محمد مسیح الدین خاں بہادر مرحوم کے خود نوشت حالات - مطبوعۂ الناظر پریس لکھنو قیمت فی جلد ایک روپیہ —

المشـــــــــــــــــــــــــــتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

(دارالمصنفین اعظم گڑھ)

تاریخ فقہ	۴ روپیہ
خلفاے راشدین	۳ روپے ۸ آنے
مہاجرین	۴ روپے
سیرۃ النبی حصۂ اول	۴ روپے
سیرۃ النبی حصۂ دوم	۳ روپے ۸ آنے
سیرۃ النبی حصۂ سوم	۶ روپے
شعرالعجم مکمل ۵ حصے	۱۳ روپے
الکلام	۲ روپے
اسوۂ صحابہ مکمل دو حصے	۸ روپے
انقلاب الامم	۲ روپے
مکالمات برکلے	ڈیڑھ روپیہ
سیر الصحابیات	۲ روپے ۴ آنے
روح الاجتماع	۲ روپے
ابن رشد	۳ روپے
گل رعنا	۵ روپے
سیر الانصار حصۂ اول	۳ روپے ۸ آنے
سیر الانصار حصۂ دوم	۳ روپے ۸ آنے
شعرالہند حصۂ اول	۴ روپے
شعرالہند حصۂ دوم	۴ روپے

(جامعۂ ملیہ دہلی)

تاریخ نجد	۱ روپیہ
عربوں کا تمدن	۲ روپے ۸ آنے
تاریخ فلسفۂ اسلام	۲ روپے
تاریخ الدولتین	۲ روپے
سیرۃ الرسول	ڈیڑھ روپیہ
خلافت راشدہ	۲ روپے
خلافت بنی امیہ	ڈیڑھ روپیہ
خلافت عباسیہ	۲ روپے
خلافت عباسیۂ بغداد	۲ روپے
خلافت عباسیۂ مصر	۲ روپے
مبادی معاشیات	۱ روپیہ
دنیا کے بسنے والے	۴ آنے
قواعد عربی	۲ روپے
اسلامی تہذیب و قومی تعلیم	۴ آنے
ترکوں کی کہانیاں	۴ آنے
تاریخ ہند قدیم	۱ روپیہ

(الناظر پریس ۔ لکھنؤ)

فسانۂ جوش	۱ روپیہ
مجموعۂ قصائد مومن	۱۲ آنے
گوتم بدھ	۴ آنے
مسالک النظر فی نبوت	
سید البشر	۴ آنے
حکایۂ لیلیٰ و مجنوں	۴ آنے
مقاتل فریب مغربی معمل خانے	۴ آنے
وکرم اروسی	۱ روپیہ ۸ آنے
فلسفیانہ مضامین عبدالماجد صاحب	۱ روپیہ ۸ آنے

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

تاریخ عرب مجلد — ۷ روپے ۸ آنے
موازنۂ انیس و دبیر — ۳ روپے
مقدمۂ شعر و شاعری — ۱ روپیہ ۴ آنے
اصول الدسع — ۶ آنے
مسلمانان اندلس — ۱ روپیہ
اسرار و نکون — ۱ روپیہ
خوان دعوت — ۱ روپیہ
مصدرعی شوہر — ۲ آنہ
الاحسان — ۸ آنے
ارض نہرین — ۴ آنے
حیات نظامی — ۴ آنے
خطاب — ۴ آنے
مولاد نبوی — ۴ آنے
قربان امت — ۳ آنے

(نظامی پریس بدایون)

قاموس المشاہیر جلد اول — ۴ روپے
قاموس المشاہیر جلد دوم — ۶ روپے
فکات غالب مجلد — ۱ روپیہ
دیوان غالب مشرح مجلد — ۲ روپے ۸ آنے

دیوان جان صاحب مجلد — ڈیڑھ روپیہ
دیوان درد — ۱ روپیہ ۴ آنے
دیوان غالب (لائبریری ایڈیشن) — ڈیڑھ روپیہ
خطوط سر سید قسم اول — ۳ روپے
خطوط سر سید قسم دوم — ۲ روپے
لکھنو گرافی مجلد — ۱ روپیہ ۸ آنے
انتخاب زرین مجلد — ۲ روپے
قصائد ذوق — ۲ روپے
مراثی میر انیس جلد اول مجلد — ۱۰ روپے
مراثی انیس جلد دوم قسم دوم — ۸ روپے

(تصانیف نور الہی و محمد عمر صاحبان)

موجودہ لندن کے اسرار — ۱ روپیہ ۴ آنے
ناٹک ساگر (یعنی دنیا کے ڈراما کی تاریخ)
مجلد ۳ روپے ، غیر مجلد ۲ روپے ۸ آنے
تین ٹوپیاں — ۸ آنے
ظفر کی موت — ۳ آنے
قزاق — ۸ آنے
بگڑے دل — ۸ آنے

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

اپنے ان مہربان معاونین کی فہرست مرتب کر رہی ہے جو اس بات کی عام اجازت دیدیں کہ آئندہ جو کتاب انجمن سے شائع ہو، وہ بغیر ان سے دوبارہ دریافت کئے، تیار ہوتے ہی ان کی خدمت میں بذریعہ وی پی روانہ کردی جایا کرے۔ ہمیں امید ہے کہ قدر دانان زبان اردو ہمیں عام طور پر اس قسم کی اجازت دیدیں گے کہ ان کے اسمائے گرامی اس فہرست میں درج کر لئے جائیں اور انجمن سے جو نئی کتاب شائع ہو، فوراً بغیر دریافت کئے روانہ کر دی جایا کرے۔ یہ انجمن کی بہت بڑی مدد ہوگی اور آئندہ اسے نئی نئی کتابوں کے طبع کرنے میں بڑی سہولت ہوجائے گی۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے وہ معاونین جو اردو کی ترقی کے دل سے بہی خواہ ہیں، اس اعانت کے دینے میں دریغ نہ فرمائیں گے۔

ان معاونین کی خدمت میں کل کتابیں جو آئندہ شائع ہوں گی وقتاً فوقتاً چوتھائی قیمت کم کر کے روانہ ہوں گی۔

رسالۂ اردو کے خریداروں کے ساتھ خاص رعایت

رسالۂ اردو کے خریداروں کو انجمن ترقی اردو کی شائع کی ہوئی کتابیں فی روپیہ چار آنے کمی قیمت کے ساتھ دی جائیں گی۔ امید ہے کہ ناظرین اس رعایت سے فائدہ اٹھائیں گے۔

دیگر مقامات کی کتابیں جو بطور ایجنسی انجمن میں فروخت ہوتی ہیں ان کی قیمتوں میں کوئی کمی نہیں کی جا سکتی۔

المشتہر
منیجر انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد (دکن)